

۱۹۷۳ء

۵۰ پیسے

اِس شمارے میں

مفتی محمد رضا انصاری • تسنیم مسیح الزماں • ڈاکٹر اکبر حیدری
خالد جاوید شمسی • امیر حسن • کاظم علی خاں • فضل حسنین
صدف حیدرآبادی • حُرمت الاکرام • شوکت پردیسی • سعادت نظیر
کاوش بدری • اقبال ماہر • جوہر ہاشمی اور دوسرے لکھنے والے



صدر جمہوریہ شری وی وی گری نے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کو ۱۸ فروری ۱۹۷۴ء کو خطاب کیا
اوپر تصویر میں شری گری راشٹرپتی بھون سے پارلیمنٹ کے لیے روانہ ہو رہے ہیں

جلد نمبر ا

اپریل ۱۹۷۴ء

چیتر ۱۸۹۶ شک

زرِ سالانہ پانچ روپے

قیمت پچاس پیسے

ایڈیٹر

خورشید احمد

پبلشر

شرومنی شرما

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اُتّر پردیش

پروڈکشن

شوکت دل

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ

گورنمنٹ پریس، عیش باغ، لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات۔ اُتّر پردیش

عنوانات

اپنی بات

ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور اسمگلنگ کو سختی سے روکنے اور عوام کو ان سماجی لعنتوں کے باعث پیش آنے والی زبردست مشکلات اور پریشانیوں سے بچانے کے لیے ریاستی حکومت نے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے اور ضروری اشیاء ایکٹ ۱۹۵۵ء میں ترمیم کرکے اسے زیادہ سخت اور موثر بنا دیا ہے۔ اس ضمن میں ضروری اشیاء اتر پردیش ترمیمی بل ۱۹۷۴ء ریاستی اسمبلی میں پیش کیا تھا جسے ایوان نے حال ہی میں منظوری دے دی ہے اور اس طرح اب یہ بل ایکٹ بن گیا۔ اس کی رو سے ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور اسمگلنگ کے الزامات میں پکڑے جانے والوں کا جرم ناقابل ضمانت قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اسمگلنگ بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اب اسمگلنگ کا الزام ثابت ہونے پر کم سے کم دو سال اور زیادہ سے زیادہ ۷ سال کی سزا ہو سکے گی۔ سزا کے ساتھ رکھی گئی ہے۔ جرمانہ اسمگل کیے جانے والے سامان کی مالیت کے دوگنے سے کم نہ ہوگا۔ اس ایکٹ کی رو سے غلے یا دوسری ضروری اشیاء کی اسمگلنگ میں استعمال کاریں، بیل گاڑیاں اور جانور ضبط کیے جا سکتے ہیں۔ اسمگلنگ کے سلسلے میں گرفتار ہونے والوں کے مقدمات کی سرسری سماعت کا بھی ایکٹ میں بندوبست ہے۔ میں مقرر کرنے ... ڈائرکٹر اور صدر کی ریاستی ... نے بتایا تھا کہ ریاست کے جن علاقوں سے غلے یا دوسری ضروری اشیاء کی اسمگلنگ زیادہ ہے کی سرسری سماعت کے لیے اسپیشل مجسٹریٹ بھی مقرر کیے جائیں گے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت نے اس ایکٹ کے ذریعہ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری کی موثر روک تھام کے لیے جامع بندوبست کیا ہے۔ اب عوام کا فرض ہے کہ وہ ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کی ان کی ریشہ دوانیوں اور رذالتوں میں بالکل اور طرح ... یہ کہ ہمت افزائی نہ کریں بلکہ ایسے معاملوں کے علم میں آنے کے بعد ان کی اطلاع متعلقہ ذمہ داروں کو دیں تاکہ مجرموں کے خلاف فوری کارروائی کی جا ... تعاون ہی سے ان جرائم کی موثر روک تھام ہو سکتی ہے اور عوام کو غلے اور ضروری اشیاء مناسب داموں پر منضبط فراہمی میں مدد مل سکتی ہے۔

● حکومت اتر پردیش کی جانب سے ہر سال علمی، ادبی، سائنسی موضوعات پر ہندوستان بھر کے ہندی، سنسکرت اور اردو کے مصنفوں کو ان کی اعلیٰ و ... تصانیف اور تالیف ... پر نقد انعامات دئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ۷۴-۱۹۷۳ء کے لیے ہندی، سنسکرت اور اردو کے ۹۶ مصنفین کو ۲۰۰ انعامات منظور کیے گئے ہیں۔ ان انعامات میں پانچ پانچ ہزار روپے کے دو خصوصی انعامات بھی شامل ہیں جو سنسکرت کے مصنف ... اور اردو کے مصنف ... رضا لائبریری رام پور کے ڈائرکٹر مولانا امتیاز علی عرشی کو ملے ہیں۔ باقی ۹۴ انعامات کی رقم ۲۵۰ روپے سے ۵۰۰ روپے تک ہے جو ہندی اور اردو تینوں زبانوں کے مصنفین کو ملی ہے۔

اردو کے مصنفین میں ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری (سری نگر) کو ان کی کتاب میر حامی ... ۱۵۰۰ روپے کا غالب انعام اور شری مشتاق احمد ... کی تصنیف انیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعراء پر ۱۲۰۰ روپے کا اکبر الہ آبادی انعام ملا ہے۔

ان کے علاوہ پانچ پانچ سو کے ۶ متفرق انعامات بھی اردو مصنفین کو ملے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ مصنفین کے ناموں کے سامنے ان کی تصنیفات ... درج ہیں۔ ... شبنم ... قدوائی (لکھنؤ)، ... سنگھ، شری کمار پاشی (دہلی) پہلے آسمان کا زوال، شری جاوید ... (بھوپال) ... شری محمود جاوید (حیدرآباد) ... شری امام مرتضیٰ نقوی (امروہہ، مراد آباد) باغ و بہار کا تنقیدی ... لکھنؤ ... روشنی سی رہی۔

حکومت اتر پردیش کے علاوہ اردو کے مصنفین کو اتر پردیش اردو اکاڈمی بھی انعامات دیتی ہے اس لیے انعامات کے سلسلے میں حکومت نے ... اردو اکاڈمی کے انعام یافتگان کو ریاستی حکومت کے انعامات نہیں دیے جائیں گے۔

ادارہ نیا دور ان مصنفین اور شاعروں کو جن کے علمی، ادبی، تحقیقی اور شعری کارنامے انعام کے مستحق قرار پائے ہیں، تہنیت پیش کرتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ یہ حضرات آئندہ بھی اپنی فکری اور تخلیقی قوتوں کو صالح اور تعمیری ادب کی تخلیق میں صرف کریں گے یہی نہیں بلکہ نئے لکھنے والوں کے لیے بھی یہ انعامات تحریک کا سبب بنیں گے اور وہ ادب اور تحقیق و تنقید کے میدان میں پیش پیش دکھائی دیں گے۔

——— ایڈیٹر

مختصر نظمیں

حرمت الاکرام

بوند اور ریت

نشاطِ احساس کی جو اک بوند
شیشۂ وقت سے چھلک کر
سُلگتی تنہائیوں کے دامن تک آ گئی تھی
گزرنے پائیں نہ چند گھڑیاں
کہ ریت میں جذب ہو گئی ہے

سعیِ رائگاں

کہاں کہاں میں تجھے پکاروں
کہ ایک صحرائے بیکراں میں
تو اس طرح کھو گیا ہے جیسے
شکستہ زنجیر کا وہ حلقہ
جو زنگ کھا کر مفارقت کو بنا چکا ہو نصیب اپنا

تقدیرِ سفر

جیون پتھ پر چلتے چلتے
پیچھے مڑ مڑ کر کیا دیکھوں
ڈرتا ہوں تقدیرِ سفر سے
دیکھ چکا ہوں میں کتنوں کو پتھر ہوتے !

ایک آواز

دن کی خاطر ہے کون سی قدغن
اک مسافر ہے یہ بھی، سورج بھی
کیا پنہائے انھیں کوئی زنجیر
(مسکرائی چراغِ شام کی لَو)
روشنی کو بنا لو زندانی
اپنے ذہنوں کا ــــ اپنے سینوں کا

مفتی محمد رضا انصاری

سیّد سجّاد ظہیر

نجی خطوط کے آئینے میں

انگارے کے مصنفین میں شامل سید سجاد ظہیر کا نام ہی سنا کرتے تھے جب (غالباً ۳۳-۱۹۳۲ء میں) اس کتاب کے خلاف مسلمانوں کے احتجاجی جلسے ہوتے تھے، مسلمانوں کے احتجاج پر حکومت نے انگارے (کتاب) ضبط کرلی، نہ کتاب ہمارے دیکھنے میں آئی نہ اس کے مصنفین! یہ زمانہ میری طالب علمی کا تھا! سجاد ظہیر کے گھرانے میں، میں سید علی ظہیر صاحب کو بس جانتا تھا وہ یو۔پی لیجس لیٹیو کونسل کا الیکشن ۳۳-۱۹۳۲ء میں لڑ چکے تھے۔ ان کے خاص حمایتی میرے دادا اور استاد مولانا مفتی محمد عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی مرحوم تھے، علی ظہیر صاحب ان کے شاگرد بھی تھے کیننگ کالج میں (جو اب لکھنؤ یونی ورسٹی ہو گئی ہے) انھوں نے مولانا سے عربی پڑھی تھی، سید صاحب کا الیکشن کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی ہمارے یہاں آنا جانا رہتا تھا، سجاد ظہیر کے بارے میں، میں اتنی ہی واقفیت تھی کہ وہ علی ظہیر صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ۱۹۳۶ء میں پڑی اور اس کی پہلی کانفرنس لکھنؤ ہی میں ہوئی سجاد ظہیر ہی انجمن کے بانی اور کانفرنس کے کرتا دھرتا تھے مگر میں اپنے مدرسہ میں (مدرسہ نظامیہ فرنگی محل) ہنوز طالب علم تھا، ادب یا ترقی پسند ادب وغیرہ سے بے تعلق، عربی درسیات ہی اس وقت میرا اوڑھنا بچھونا تھے، سیاست کا چسکا ضرور لگ چکا تھا اس لیے کہ آنکھ ہی ان بزرگوں کی گود میں کھولی تھی جو تارکین موالات تھے، بدیسی راج سے نفرت اور بیزاری ہی میری کل سیا[ست] اس وقت تھی، ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس [میں نہیں] گیا اور سجاد ظہیر سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔

۱۹۳۷ء میں کانگریس کا ہفتہ وار اخبار ہندوستان نکلنا شروع ہوا اس کے ایڈیٹر میرے عزیز حیات اللہ انصاری تھے، اخبار کا دفتر اس کے منیجنگ ڈائرکٹر پروفیسر ڈاکٹر عبدالحلیم کے مکان کے ایک حصے میں تھا، ڈاکٹر صاحب اس وقت لکھنؤ یونی ورسٹی کے عربی شعبہ میں لکچرر تھے اور حضرت محل پارک کی اس سڑک پر جدھر ٹیلی فون ایکسچینج ہے (اس سڑک کو اب رانی لکشمی بائی مارگ کہتے ہیں) رہتے تھے۔ ہندوستان کے دفتر جاتا اور تبادلے میں آنے والے اردو [اخبار] دیکھا کرتا تھا، وہیں ایک شام کو ایک ادبی نشست ہوئی جس [میں] شرکت کے لیے حیات اللہ صاحب نے مجھے بھی روک لیا، یہ ترقی پسند مصنفین کی صوبائی یا مرکزی کمیٹی کی نشست تھی جس [میں] زیادہ تر تنظیمی امور پر اردو اور انگریزی میں تبادلۂ خیال ہوتا رہا [میں] خاموش بیٹھا رہا اس لیے کہ یہ مسائل اور ان کا پس منظر نیز انگ[ریزی] میں گفتگو، یہ سب میرے فہم و ادراک سے باہر کی چیزیں تھیں۔ [میں نے] پہلی بار سید سجاد ظہیر کو دیکھا، تعارف اور ملاقات کا [موقع] کہ اس وقت میرے لیے کوئی محل نہ تھا۔

حیات اللہ صاحب نے جو اس وقت کانگریس فرنگی محل میں اپنے مکان میں ایک اسٹڈی سرکل ...

ماحبس کا ایک رکن میں بھی تھا، اسٹڈی سرکل میں پنڈت
ل نہرو کی خود نوشت "میری کہانی" (اردو) کا سبقاً سبقاً
یا جاتا تھا اور شری بیجے پر کاش نرائن کی انگریزی کتاب
م کیا ہے؟ کا ترجمہ سنایا جاتا تھا، اور بعض کانگریسی اور
ند رہنما بھی کبھی بلائے جاتے تھے، ان میں حضرات میں پنڈت
ل نہرو، ڈاکٹر کنور محمد اشرف، ڈاکٹر عبدالعلیم، پنڈت
من ناتھ کول اور منظر رضوی وغیرہ شامل تھے، ایک دن سید
ظہیر بھی مدعو کیے گئے، اس موقعہ پر مجاز مرحوم نے اپنی تازہ
"میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں" سنائی، سجاد ظہیر
قی پسند ادب پر اپنے خیالات پیش کیے، سجاد ظہیر یہی سوچ کر
ل آئے تھے کہ علمائے فرنگی محل کے خاندان کے نوجوانوں
ں گے، وہ فرنگی محل جو خلافت اور ترک موالات تحریکوں کا بہت
امرکز رہا ہے، مگر اسٹڈی سرکل میں انھیں صرف ایک ہی
بارسٹر پیرزادہ" نظر پڑا اور وہ یہی خاکسار تھا۔ یہ تو اس وقت
علوم ہوا جب ان کی کتاب روشنائی چھپی کہ میری حاضری کو
نھوں نے خاص طور پر محسوس کیا تھا جیسا کہ اپنی کتاب میں انھوں
نے لکھا ہے:

"اس مجمع میں (جو حیات اللہ صاحب کے یہاں فرنگی محل
میں ہوا) علیم (ڈاکٹر عبدالعلیم سابق وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی
علی گڑھ) سردار جعفری، سبط حسن (مدیران ماہنامہ نیا ادب
لکھنؤ) اور میرے علاوہ فرنگی محل کے خاندان کے اور بھی کئی نوجوان
شامل تھے ان میں رضا انصاری بھی تھے انھوں نے بعد کو ترقی پسند
ادب کی تحریک میں کافی حصہ لیا ...... نیا ادب کے چلانے میں
رضا انصاری (فرنگی محلی) کی مدد بہت کچھ شامل تھی طباعت اور
اشاعت اور مینجری کے کاموں میں جو غیر دلچسپ محنت اور
باقاعدگی ضروری ہے اس کی صلاحیت فرنگی محل کے اس
نوجوان بارسٹر پیرزادے" میں پوری طرح موجود تھی وہ فرنگی محل
کے دینی مدرسے میں معلم تھے اور خود ان کی تعلیم وہیں پرانے طرز پر ہوئی تھی"
ت سید سجاد ظہیر فرنگی محل آئے تھے اس وقت مسلم لیگ اور کانگریس

تناتنی شروع ہو چکی تھی اور کانگریس میں بائیں بازو کی سرگرمیاں بھی تیز
ہو چکی تھیں میں بائیں بازو کی سیاست سے دلچسپی لینے لگا تھا
کبھی مزدوروں کے جلسوں میں شرکت، کبھی مسلم ماس کنٹیکٹ"
کے پروگراموں میں حصہ لینا اور کبھی ترقی پسند ادب کے جلسوں میں
شرکت کرنا، یہاں تک کہ دوسری عالم گیر جنگ چھڑ گئی، ۱۹۳۹ء
میں بائیں بازو کی سیاست سے دلچسپی رکھنے والے ممتاز حضرات
کی تدارک کی طور پر گرفتاریاں ہونے لگیں، سجاد ظہیر بھی گرفتار ہو گئے
ڈاکٹر عبدالعلیم بھی، سردار جعفری بھی، اور علی جواد زیدی بھی اور
کھدر پہننے کے جرم میں میری بھی نگرانی ہونے لگی۔ جن ہم خیال دوستوں سے
ملنے ملانے ان کے سرکاری دفتروں میں پہلے بے روک ٹوک چلا جاتا
تھا وہاں اب دربانوں نے روکنا شروع کر دیا۔ نیا ادب جنگ
شروع ہونے سے سات ماہ قبل نکلنے لگا تھا، جنگ شروع ہوتے
ہی جوش ملیح آبادی کی مشہور نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام"
نیا ادب میں چھپی اگست و ستمبر ۱۹۳۹ء کے مشترک شمارے میں
اور حلقہ نیا ادب میں رہنے والوں کے پیچھے جاسوس لگ گئے،
گرفتاری کے بعد سجاد ظہیر صاحب لکھنؤ جیل میں رہے، وہیں بیمار
ہوئے اور جیل کے اسپتال میں علاج کے بعد انھیں لکھنؤ میڈیکل کالج
کے یوروپین وارڈ میں زیر حراست منتقل کر دیا گیا، وہ حراست میں
رکھے ضرور گئے مگر ملنے ملانے پر کوئی پابندی نہیں تھی، فرنگی محل سے
چند قدم کے فاصلے پر میڈیکل کالج ہے۔ اب ان سے زیادہ ملاقاتیں
ہونے لگیں، نیا ادب کا دفتر میرے ہی گھر پر فرنگی محل میں آچکا تھا
تبادلے میں آنے والے رسائل اور تبصرے کے لیے آئی ہوئی کتابیں
میڈیکل کالج لے جایا کرتا تھا، اور سجاد ظہیر صاحب سے جنھیں اب
"بنے بھائی" کہنے لگا تھا، رسائل کے مضامین اور موصولہ کتابوں پر تبادلہ
خیالات ہوا کرتا تھا، جیل میں بھی ان کو کتابیں بھیج دی جاتی تھیں
وہیں سے انھوں نے مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے نئے مجموعہ
جہاراں پر تبصرہ لکھ کر بھیجا تھا، جو سراج مبین کے قلمی نام سے
نیا ادب اکتوبر ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا۔ میڈیکل کالج میں
وہ کئی مہینے رہے اور وہیں سے ان کی رہائی عمل میں آئی،

یہ ۱۹۴۱ء کا آخر تھا، اس وقت کمیونسٹ پارٹی کا نظریۂ جنگ کے بارے میں بدل گیا تھا، سوویت روس کے جنگ میں شریک ہو جانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی اسے 'عوامی جنگ' کہنے لگی تھی ترقی پسند ادیب بھی اس نظریہ کے ہم خیال تھے، جوش ملیح آبادی جو نیا ادب میں ان کے ماہنامہ کلیم کے شامل ہو جانے کے بعد نیا ادب اور کلیم کے مدیر اعلیٰ ہو گئے تھے 'عوامی جنگ' کے نظریے سے متفق نہ تھے، اور انگریز دشمنی میں میں بھی جوش صاحب کی طرف جھکا ہوا تھا اس لیے کہ میری سیاست جذباتی تھی نظریاتی نہیں مگر نیا ادب اور کلیم کی پالیسی 'عوامی جنگ' کی تھی، بنے بھائی میں ہم خیال بنانے کا بڑا ماہر تھا، وہ تبادلۂ خیال میں نہ برہم ہوتے تھے نہ طنز اور چوٹ کرتے بلکہ دوسرے کے نقطۂ نظر کے احترام کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے، کوئی تند جملہ اگر وہ کہنا بھی چاہتے تو پہلے سے اس کی معذرت کر لیتے اور ہنس ہنس کر ہی بات جاری رکھتے تھے۔

'عوامی جنگ' کے بعد بنے بھائی اور سردار جعفری بمبئی چلے گئے جہاں اس وقت کمیونسٹ پارٹی کا صدر دفتر باضابطہ کھل گیا تھا، ایک ہفتہ وار "قومی جنگ" (اردو) بھی نکالنے لگے تھے، کچھ ہی دنوں کے بعد سید سبط حسن بھی، روزنامہ نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ چھوڑ کر اس لئے کہ ۴۲ء میں حکومت نے اسے بند کر دیا تھا بمبئی چلے گئے، جوش صاحب بھی ایک فلم کمپنی میں ملازم ہو کر پونے چلے گئے،" نیا ادب اور کلیم" لکھنؤ میں بند ہو گیا یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے، کمیونسٹ پارٹی جو پہلے "غیر قانونی جماعت" تھی اب "قانونی" قرار پا گئی مختلف زبانوں میں اس کے اخبارات اور لٹریچر شائع ہونے لگا، اور ۱۹۴۳ء میں پہلی پارٹی کانگریس بمبئی میں ہوئی۔ ان ہی تاریخوں میں بمبئی ہی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس بھی ہوئی جس میں شرکت کے لیے لکھنؤ سے ڈاکٹر عبد العلیم کے ساتھ میں بھی بمبئی گیا وہ انجمن ترقی پسند مصنفین یو۔پی کے صدر تھے میں مقامی شاخ کا سکریٹری تھا، ہمارے ساتھ ڈاکٹر رام بلاس شرما (ہندی ادیب) بھی تھے، میرے آنے جانے کا بندوبست بنے بھائی ہی نے کیا تھا، وہ ہم لوگوں کو لینے وکٹوریہ ٹرمنس (بمبئی) آئے اور یہ لطیفہ بھی سنایا کہ پہلی پارٹی کانگریس میں بحیثیت وزیٹر شریک ہونے کے لیے، انھوں نے بحیثیت پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے میرے اور ڈاکٹر علیم کے لیے داخلہ ٹکٹ جاری کرنے کی سفارش کی تھی، میرے بارے میں تو سفارش مان لی گئی اور داخلہ ٹکٹ دے دیا گیا اور ڈاکٹر علیم کے بارے میں سفارش نامنظور ہو گئی، بنے بھائی یہ واقعہ بیان کر کے خوب ہنسے اور ہنسنے کی بات بھی تھی کہاں ڈاکٹر علیم اور کہاں میں؟ انھوں نے بتایا کہ علیم صاحب کے لیے دوبارہ کوشش کر کے پاس، حاصل کیا تھا،

انجمن ترقی پسند مصنفین کی سالانہ کانفرنس اور پارٹی کانگریس میں شرکت کے سلسلے میں، دو ہفتہ کے قریب بمبئی میں رہا، سردار جعفری کے فلیٹ میں ڈاکٹر علیم کے ساتھ ٹھہرا تھا، بعد میں ڈاکٹر صاحب دوسری جگہ اپنے جامعی دوست کے یہاں منتقل ہو گئے، اور کچھ زیادہ دنوں قیام پذیر رہے۔

یہاں قیام کے دوران میں ایک اور نظریہ ہماری حلق کے نیچے اتارا گیا، اس سلسلے میں بنے بھائی سے میں جھگڑ بھی مگر کچھ نہ ہوا۔ وہ یہ کہ مسلم لیگ باوجودیکہ فرقہ وارانہ جماعت ہے مگر چوں کہ عام مسلمان اس کے ساتھ ہیں اور ترقی پسندوں کو عوام میں کام کرنا ہے۔ ان کے لیے اب کوئی چارہ کار نہیں سوائے اس کے کہ وہ کانگریس اور مسلم لیگ میں شامل ہو کر ان کے ذریعہ ہندو مسلم عوام تک اپنا نقطۂ نظر پہنچائیں گے اس لیے پارٹی سے ہمدردی رکھنے والے ہندو حضرات کانگریس میں اور مسلم حضرات مسلم لیگ میں شامل ہوں (یعنی وہ لوگ جو پارٹی کے ممبر نہیں ہیں مگر پارٹی سے ہمدردی رکھتے ہیں)

مسلم لیگ میں شامل ہونے کا خیال بہت شاق محسوس ہوا اس لیے کہ بیشتر فرنگی محلی اعزا ہم عصر اور بزرگ مسلم لیگ میں شامل تھے اور لیگی سیاست کی بے توازنی اور بے لگامی کا ذاتی تجربہ ہم ان چند لوگوں کو ہو رہا تھا جو فرنگی محل میں لیگ مخالف تھے اور اس کی سیاست کے تیر عزیزوں کو براہ راست جھیل رہے تھے، بنے بھائی اور سردار جعفری نے بہت سی سیاسی دلیلیں دیں، آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کے اس وقت کے جنرل سکریٹری مسٹر پی۔سی جوشی کے سامنے بھی پیشی ہوئی وہ آدھ گھنٹے تک ایسی فراٹے دار گفتگو کے ذریعہ سمجھاتے رہے ان کی "تیز رفتار"

...ت جیت کا سمجھنا ہی مشکل تھا چہ جائیکہ ان کے دلائل کے وزن کو تسلیم
...نا، بہرحال جوشؔ صاحب کے سامنے خاموشی اختیار کر لینا پڑتی مگر حامی
...نہیں بھری، پھر مجھے جھانسی کے ایک ریلوے مزدور لیڈر، شرا جودھیا پرشاد
...کے حوالے بنّے بھائی نے کر دیا کہ لکھنؤ جا کر وہ مجھے اور سمجھائیں اور مسلم لیگ
...میں بھرتی کرائیں۔

'نیا ادب' لکھنؤ میں بند ہو کر بمبئی سے نکلنے لگا تھا۔ میں نے ۱۹۴۳ء
میں ایک ماہنامہ "منزل" لکھنؤ سے نکالا، جس میں دارالعلوم ندوۃ العلما
کے طلبا کی اسٹرائک پر جو اس زمانے میں چل رہی تھی، ہڑتالیوں کی تائید
میں ایک نوٹ شائع ہوا جس میں علامہ سید سلیمان ندوی (نگران اعلیٰ
دارالعلوم ندوۃ العلما) پر بھی کچھ چھینٹیں تھیں۔ فرنگی محل کے مدرسہ کے
ذمہ داروں کو جو میری لیگ مخالفی سے ناراض تھے ہی موقع ہاتھ آ گیا اور
مجھے نوٹس دے دیا کہ سید صاحب سے معافی مانگو، اگلے شمارے میں اس
مضمون کی تردید کرو ورنہ ملازمت سے استعفا دے دو۔ اور بنّے بھائی کو
واقعہ کی اطلاع کی نیز مسلم لیگ میں بھرتی ہونے کے نظریہ سے اسی خط میں
اختلاف بھی ظاہر کیا۔ انھوں نے جو جواب دیا وہ ان کی سیرت کا پوری طرح
آئینہ دار ہے انھوں نے لکھا۔ میں نے استعفا دے دیا۔

"بمبئی، ۱۸ اگست ۱۹۴۳ء۔ بھائی رضا! تمھارا ۹ اگست کا خط
مجھے ملا، اس درمیان میں بیمار پڑ گیا تھا اس لیے تمھیں جواب دے
نہیں سکا معاف کرنا۔ اب اچھا ہوں، بس یہ باتیں تو بعد کو ہوں
گی، یہ خبر سن کر کہ تم کو مدرسہ سے علیحدہ ہو جانا پڑا، بہت تشویش ہوئی
خاص طور پر اس وجہ سے کہ تمھارے سر پر اتنی بہت سی ذمہ داریاں
ہیں۔ ابھی مجھے ان جھگڑوں کی تفصیل تو معلوم نہیں جو مدرسے کے انتظام
کے سلسلے میں پیدا ہو گئی ہے لیکن ادھر ادھر 'مدینہ' اور "آزاد ہند"
وغیرہ میں پڑھ کر اور کچھ دوسروں کی زبانی سن کر کسی قدر اندازہ ضرور ہوا
ہے، اور میری اپنی رائے یہ ہے کہ تمھارا اس جھگڑے میں اس حد تک
پڑ جانا موجودہ حالات میں جبکہ اور بہت سے ضروری کام کرنے ہیں غلط
تھا۔ میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ تم نے جو کیا یا لکھا وہ غلط ہے۔
ہندستان کے تعلیمی نظام میں ان گنت خرابیاں ہیں لیکن ہم سب
مل کر اگر اس وقت "انجمن اصلاح تعلیم" کی بنیاد رکھ دیں تو کسی قدر
بے موقع اور فضول بات ہوگی۔ ہندستان میں فاقہ کشی بڑھ رہی ہے
دشمن کی فوجیں ہماری سرحد پر کھڑی ہیں ملک میں پست ہمتی کا دور
دورہ ہے اور ہم بحث معاف کرنا بے چارے سید سلیمان ندوی کی
داڑھی میں دیاسلائی لگا رہے ہیں۔ میں نے ایک ہفتہ تک
اس معاملہ پر غور کیا اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بڑے گون کو بیچ
میں ڈال کر اس معاملے کو رفع دفع کر ڈالو۔ سید سلیمان سے معافی
مانگ لینا بری چیز نہیں، وہ عالم ہیں اور بزرگ ہیں ہمارے ان
کے خیالات میں بہت اختلاف سہی پھر بھی ان کی بزرگی داشت
کرنا ہمارا فرض ہے۔ آپ ایسا کریں گے تو آپ کے مخالفین کو شکست
ہوگی اور آپ کو فتح، مدرسہ کی نوکری پر بحالی کے بعد پھر آپ مسلم لیگ
میں شامل ہو کر وہ ضروری کام کر سکتے ہیں جس کی ملک کو مسلمانوں
کو اور ہم کو یعنی آپ کے رفیقوں اور ساتھیوں کو ضرورت ہے ایسا نہ
کرنے کے معنی بے انتہا پرستانیوں میں پھنس کر اپنے عمل کی قوت کو
کھو دینا ہے۔ سبطے اور سردار کی بھی یہی رائے ہے میری بیوی رضیہ
کو جب سے یہ معلوم ہوا ہے وہ بھی بہت پریشان ہیں اور کئی بار کہہ
چکی ہیں کہ "رضا صاحب کے لیے کچھ کیجیے" میں نے ان سے کہا کہ یہاں
بیٹھے بیٹھے سوا اس کے اور کیا کر سکتا ہوں کہ "ناصح مشفق" کی غیر
دلچسپ اور تکلیف دہ ڈیوٹی بجا لاؤں!

یہ سن کر کہ ترقی پسندوں کے جلسے وہاں ہو رہے ہیں بہت خوشی
ہوئی نور (۲) میاں کا خط آیا، ترقی پسندوں کی طرف سے اردو کے رسالے
کی تجویز ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ "نیا ادب" اپنی موجودہ شکل
میں بھی یہی خدمت انجام دینے کی کوشش کرے گا، اور ہم لوگ
تو اپنی ساری ادبی کاوش اسی کی نظر کریں گے اس سے زیادہ نہ کر سکتے ہیں
اور نہ مفید ہے اس لیے لکھنؤ سے رسالہ شائع کرنے کے ہم تینوں مخالف
ہیں، سلیم (۳) صاحب کا یہ حال ہے کہ انھوں نے چار مہینے سے وعدے کے
باوجود ایک مضمون تک نہیں بھیجا۔ احتشام (۴) کا بھی ابھی تک وعدہ
ہی وعدہ ہے نور (۵) سے لکھنے کو کہو تو وہ مضمون کی نوعیت پوچھ کر ہی
رہ جاتے ہیں تو پھر لکھے گا کون؟ یہ سہ ماہی (۶) رسالے کے لیے لکھنے والوں
کی کیفیت ہے! ماہوار کا تو پھر کیا کہنا، ملا (۷) بیچارے البتہ اپنی نظم یا

منزل دے دیتے ہیں، یہ بھی مان سکتا ہوں کہ آپ کچھ نہ کچھ لکھتے رہیں گے لیکن، اس طرح رسالہ چل نہیں سکتا فی الحال تو ہمیں "نیا ادب" کے لیے مضمون حاصل کرنے لکھوانے، نئے لکھنے والوں کو اس طرف راغب کرنے اور اس کی اشاعت بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اب رہی ہماری آپ کی سیاسی بحث۔ ہم تمام ان لوگوں کو پانچواں دستہ⁽⁸⁾ نہیں کہتے جو برطانوی حکومت کی مخالفت میں اسی حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ حفاظت وطن کے وسائل کو تباہ کرنے لگتے ہیں ان میں گمراہ محبان وطن بھی ہیں جو یا تخریبی دستہ کی پالیسی پر نادانستہ عمل کر رہے ہیں، ایسے لوگ اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ زیادہ تر کانگریسی اب سمجھنے لگے ہیں کہ نو اگست کی پالیسی غلط تھی، وہ کانگریس کی پالیسی نہیں بلکہ سوشلسٹوں اور فارورڈ بلاک والوں کی پالیسی تھی۔

اور "قومی جنگ" سے آپ کی دوسری شکایت[9] تو قبلہ جب تک ہماری تحریروں میں وہ کیفیت ہوگی اور وہ اثر پیدا ہو جائے گا جو چودہ سو برس پہلے ان الفاظ نے پیدا کیا تھا جن کے مجموعہ کو قرآن کہتے ہیں اس وقت ہمارا مقام کتنا بلند ہوگا؟ افسوس تو یہی ہے کہ ہماری زبان میں اب تک "امی" نبی کی زبان کی جھلک نہیں تھی تو وہ ابھی تک عوام کو متحرک نہیں کر سکتی، اگر اس میں اس کی جھلک آ جائے جیسا کہ آپ کہتے ہیں تو پھر اب شاید ہم اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں! خط ضرور لکھیے جس میں اپنے اور لکھنؤ کے سب حالات ہوں۔

نیازمند

سجاد ظہیر

(۱) مسلم لیگ میں شامل ہونے کی بحث (۲) پروفیسر ڈاکٹر نور الحسن مرکزی وزیر برائے تعلیم (۳) پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلیم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۴) مرحوم پروفیسر سید احتشام حسین سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی (۵) پروفیسر ڈاکٹر نور الحسن مرکزی وزیر برائے تعلیم (۶) ماہنامہ نیا ادب "بمبئی میں سہ ماہی ہو گیا تھا (۷) پنڈت آنند نرائن ملا سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ (۸) میں نے شکایت کی تھی کہ انگریز حکومت کی مخالفت کرنے والوں اور اس کے نظم ونسق میں خلل ڈالنے والوں کو پانچواں دستہ کہنا زیادتی ہے (۹) "قومی جنگ" کا انداز تحریر میری نظر میں خطیبانہ تھا اور لب ولہجہ الہامی کتابوں کے لب ولہجہ سے ملتا جلتا، اس کی طرف توجہ دلائی تھی۔!

خیر معافی مانگنے اور مدرسہ کی ملازمت بحال ہونے کی نوبت نہیں آئی اور میری سیاسی سرگرمیاں بڑھ گئیں، مسلم لیگ میں شامل ہونے پر بھی طبیعت راضی نہیں ہو رہی تھی، اسی اثنا میں بنے بھائی لکھنؤ آئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی مقامی شاخ کے سکریٹری کی حیثیت سے ان سے ملاقات کے لیے ایک نشست پنڈت آنند نرائن ملا کے مکان واقع جگت نرائن روڈ گولہ گنج میں میں نے بلائی۔ اس میں بنے بھائی آئے تو "جناح کیپ" پہنے ہوئے میں نے چھیڑا کہ کیا آپ بھی مسلم لیگ میں بھرتی ہو گئے یہ جناح کیپ کب سے شروع کر دی؟"

بگڑے کہ آپ لوگ تعصب نہیں چھوڑیں گے تو محنت کشوں کے مطالبات کبھی پورے نہ ہو سکیں گے" یہ بھی کہا" ابھی پی۔ سی جوشی کی ایک پریس کانفرنس بمبئی میں ہوئی تھی" کیمون "کے جس کمرے میں ہوئی، اس میں گاندھی جی مسٹر جناح اور پنڈت نہرو کی تصویریں لگی تھیں تو خواجہ احمد عباس نے (بمبئی کرانیکل کے اس وقت کے اسٹاف رپورٹر، مسٹر جناح کی تصویر پر اعتراض کیا پھر یہ اعتراض کہ مولانا آزاد کی تصویر کیوں نہیں لگی ہے؟ آپ لوگ حقائق کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور تعصب کو نکالیے" وغیرہ وغیرہ

جناح کیپ کے بارے میں انہوں نے انکشاف کیا کہ یہ ٹوپی انھوں نے ڈنمارک میں نو شلنگ کی اس وقت خریدی تھی جب انگلستان میں وہ پڑھتے تھے۔

مسلم لیگ میں شمولیت سے میرے اعراض پر اس مسئلے پر کچھ دنوں وہ خاموش رہے "منزل" (لکھنؤ) سے وہ اس لیے دلچسپی لیتے رہے کہ وہ "نیا ادب" کا جانشین تھا، اس سلسلے میں ان کا ایک خط ۲۴ دسمبر ۱۹۴۳ء کا لکھا آیا جو لکھنؤ میں ملاقات کے بعد کا ہے۔

"بمبئی ۲۳ دسمبر برادرم رضا صاحب، آداب عرض ہے، مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کے دو خط آئے اور میں نے ایک کا بھی ابھی تک جواب نہ دیا گزشتہ چار دنوں سے تو میں علیل تھا نزلہ بخار اب اچھا ہوں۔

(۱) "منزل" کے ریویو نہ شائع ہونے کا افسوس ہے، میں خود آج کل سیاسی کاموں میں بے حد مصروف ہوں، ہندی مسلمانوں کی سیاست پر ایک مختصر سا رسالہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں سبطے سے اصرار کر دیا ہے، ان کا وعدہ ہے آئندہ ہفتے ریویو نکل جائے گا۔

(۲) سردار کہتے ہیں کہ آپ کو مضمون انھوں نے بھیج دیا ہے (وہی جس کا میں نے ذکر کیا تھا) تعجب ہے کہ آپ کو نہیں ملا۔

(۳) قومی جنگ کے ایک مضمون [1] پر آپ کی نکتہ چینی ہمارے لیے بہت مفید تھی اسے پڑھ کر ہمیں اپنی جہالت کا شدید احساس ہوا، غلطی تو خیر ماسکو کے اخبار کے راوی کی تھی لیکن بہ حیثیت مسلمان ہونے کے ہمیں تو اس کا احساس ہونا چاہیے۔ اب تو یہی دعا مناتے ہیں کہ ہمارے مخالف اس کی طرف توجہ نہ کریں۔

(۴) نیا ادب کا دوسرا نمبر شائع ہو گیا آپ کو ایک نسخہ ریویو کے لیے بھیج دیا گیا ہے اس کے بکوانے کا بھی بندوبست کیجیے تو مہربانی ہو، دیے مل گئے [2]

(۵) رندہ روس [3] کا کیا ہوا؟ پرانے خریداروں کو بھیجا گیا یا نہیں سبطے کہتے ہیں کہ نیا ادب کے پرانے خریداروں کی ایک مکمل فہرست بنا کے بھیج دیجیے۔

میں بیماری کی وجہ سے کراچی نہ جا سکا سردار گئے تھے ترقی پسند مصنفین کا اور کوئی جلسہ ہوا؟ اگر ہوا ہو تو اس کی رپورٹ بھی بھیج دیں لکھنؤ میں ہمارے مخالف تحریک کس منزل پر ہے؟ آپ کا مزاج کیسا ہے؟

نیازمند

سجاد ظہیر

(۱) 'قومی جنگ' میں ماسکو میں نماز عید کی ایک تفصیلی خبر چھپی تھی جس میں درج تھا کہ "پھر جب موذن نے منارۂ مسجد سے اذان کہی ۔ " میں نے توجہ دلائی تھی کہ عید کی نماز کے لیے اذان نہیں ہوتی اور طنزاً لکھا تھا کہ روسی مسلمان تو عبادت میں دنیا بھر کے مسلمانوں سے آگے معلوم ہوتے ہیں (۲) یہ روپے 'نیا ادب' کے چندے کے میرے پاس جمع تھے (۳) رندہ روس نیا ادب کا ایک خاص نمبر تھا جسے سبط حسن اور میں نے مرتب کیا تھا چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ سبطے حسن اور نیا ادب سب بمبئی چلے گئے۔ بعد میں ایک مقامی ناشر نے اسے چھپوا دیا تھا۔

بہرحال ۱۹۴۴ء کے ختم ہوتے ہوتے بنے بھائی اور پی سی جوشی کا حکم چل گیا اور چند ساتھیوں کے ساتھ میں مسلم لیگ میں بھرتی ہو گیا حکم یہ تھا کہ مسلم لیگ میں ترقی پسند رجحانات والے گروہ کے ساتھ ہو جاؤ (ایسے گروہ کا بس فرضی وجود مسلم لیگ میں تھا) اور فرقہ پرستی کی سخت مذمت کرو، سرمایہ داری کی مخالفت کے ساتھ محنت کشوں کے 'کاز' کو آگے بڑھاؤ۔ "پاکستان" کی نہیں بلکہ حق خود ارادیت کے مسلمہ اصول کی اصولی تائید کرو، یہ سب کچھ کرنا چاہا مگر لیگ کی مخصوص قیادت کے آگے سب بے بس تھے، یہاں تک ملک بٹ گیا اور پاکستان بن گیا۔

بنے بھائی، ۴۸-۱۹۴۷ء میں لکھنؤ آئے وہ خود سراسیمہ تھے کہ یہ سب کیا ہو گیا مگر ہماری طرح انھوں نے ہمت نہیں ہاری تھی، ترقی پسند مصنفین کا اجتماع لکھنؤ میں کیا ۱۹۴۸ء میں وہ کمیونسٹ پارٹی کے حکم پر پاکستان چلے گئے، پھر وہاں "راولپنڈی سازش کیس" میں جیل میں بند کر دیے گئے اب ان سے ملاقات اور مراسلت کی کوئی سبیل نہیں رہی پاکستانی جیل سے رہائی کے بعد غالباً ۵۵-۱۹۵۴ء میں بنے بھائی ہندستان واپس لوٹے، اسٹیشن چارباغ پر ان کو لینے میں بھی گیا تھا، ان کے ہندستان لوٹنے سے دو تین مہینے پہلے میں نے لاہور کا سفر کیا تھا اور وہاں کے ترقی پسند ساتھیوں سے ملاقات کی تھی، بنے بھائی نے اسٹیشن پر معانقہ کرنے کے بعد ہی کہا "لاہور میں آپ کا بہت ذکر ہوا، کبھی تفصیلی بات چیت ضرور ہو"

میں اخبار (قومی آواز) کی ملازمت میں تھا اور سیاسی سرگرمیوں کی' خبروں کی کھوج اور جوڑ توڑ میں ایسا پھنسا رہتا تھا کہ تفصیلی بات چیت ان کے قیام لکھنؤ کے دوران میں نہ ہو سکی اور وہ دلی چلے گئے پھر وہیں بود و باش اختیار کر لی، وہ دلی میں، میں لکھنؤ میں ملاقاتوں کا امکان کم ہی نہیں بلکہ موہوم ہو کر رہ گیا۔ بس ایک دوسرے کی خیر معلوم کرنے ہی پر قناعت کرنا پڑ گئی، خط و کتابت بھی نہیں ہو پائی۔

۱۹۵۹ء میں اپنے چچا مفتی محمد عبدالقادر فرنگی محلی مرحوم کی وفات پر اخباروں اور رسالوں میں شائع ہونے والی خبروں اور مضمونوں

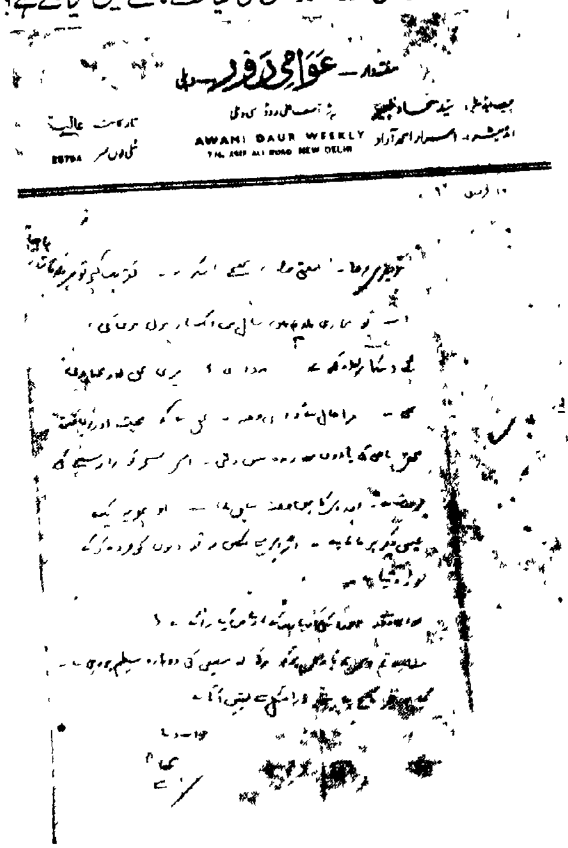
پر مشتمل ایک مختصر سا مجموعہ میں نے مرتب کیا تھا جو بنّے بھائی کو بھی بھیجا ۔ اس کا جواب انھوں نے اس طرح دیا ۔

ہفتہ وار " عوامی دور " دہلی

۱۶ فروری سنہ ۱۹۶۰ء

عزیزی رضا ، " مفتی صاحب " بھیجنے کا شکریہ " تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے " اب تو ہماری ملاقاتیں سال میں ایک بار ہوں گی ، مجھے اس کا بڑا دکھ ہے ذمہ داری ؟ میری بھی اور تمہاری بھی ، میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ محبت اور رفاقت محض ماضی کی یادوں سے زندہ نہیں رہتی ، اس سحر کو برابر سینچنے کی ضرورت ہے اور اس کا ہمیں وقت نہیں ملتا اور پھر ایک جیسی جگہ ہو جاتا ہے اگر اس سے نکلیں نہ تو دلوں کو مردہ کر کے چھوڑ دیتا ہے

" عوامی دور " اور اس کی سیاست کے بارے میں کیا رائے ہے ؟


عوامی دور دہلی
AWAMI DAUR WEEKLY

سنا ہے تم اس پر ناراض ہو کہ ترقی پسند مصنفین کی دوبارہ تنظیم ہو رہی ہے ، کیا یہ خبر صحیح ہے ——— ذرا مشکل سے یقین آتا ہے

جواب دینا

تمہارا بنّے

یاد نہیں آتا کہ "میری ناراضی" کی اطلاع صحیح تھی یا نہیں ، یہ ضرور خیال پڑتا ہے کہ " ترقی پسند مصنفین " کے نام پر بعض ایسے عناصر بھی اکٹھا ہو رہے تھے ، جن کے ماضی کے بارے میں مجھے بخوبی واقفیت تھی جب یہ تاریخ کٹھن دور سے گزر رہی تھی تو عناصر عزب مخالف میں تھے ۔ اب جد دشواریاں ختم ہوگئیں تو خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے لگے ۔ غالباً یہی " ناراضی " کا سبب تھا ، بہرحال یہ صحیح ہے کہ انجمن کی دوبارہ تنظیم میں میں نے عملاً کوئی حصہ نہیں لیا ۔ اخبار کی ملازمت نے پورا ذہن گھیر لیا تھا ، ایک جلسے میں بھی شرکت نہیں کر پاتا تھا ۔

اس خط کے بعد اس کی فکر ضرور رہی کہ جب بنّے بھائی لکھنؤ آئیں تو ان سے ملاقات ضرور ہو ، میرا دلّی جانا ہوتا ہی نہیں تھا ، ہاں ! خط کبھی کبھی بھیجا کرتا تھا اسی طرح کے ایک خط کا جواب انھوں نے دفتر قومی آواز میں آ کر اور مجھے موجود نہ پا کر میری میز پر لکھ کر رکھ دیا ، تاریخ تو ہے مگر سن نہیں ہے :

عزیزی رضا ، کل دہلی سے روانہ ہوتے وقت مجھے تمہارا خط ملا ، میں آج صبح لکھنؤ آیا ، اگر مجھ سے مل لو تو اچھا ہو ویسے بھی دل چاہتا ہے

۲ر جولائی — سجاد ظہیر

اب تک ہماری ان کی رفاقت سیاسی ہم خیالی ، اور ماضی میں دوش بدوش کام کرنے کے سہارے چل رہی تھی ، لیکن بنّے بھائی دراصل علمی اور تحقیقی مزاج رکھتے تھے ، ان کا مطالعہ وسیع اور گوناں گوں تھا وہ ان تحریروں کو بھی استفادے کے لیے پڑھتے تھے جن کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ ان کو ان سے دلچسپی ہو سکتی ہے مثلاً مولانا آزاد کے " ترجمان القرآن " کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا ، مجھے ان کا یہ جملہ کبھی نہیں بھولتا کہ باوجود مذہب سے دلچسپی نہ ہونے کے انھوں نے ' ترجمان ' کی دونوں جلدیں پڑھنے کے بعد مجھ سے

کہا "بھئی مولانا آزاد کی تحریر کا کوئی جواب نہیں، ایسے دل نشین انداز میں اپنا مطلب ادا کر جاتے ہیں کہ چوں و چرا کی گنجائش نہیں رہتی، میں ان کی تفسیر یہ سوچ کر، اور پنسل لے کر پڑھنے بیٹھا تھا کہ جہاں جہاں مجھے اختلاف ہوگا نشان لگاتا جاؤں گا، مگر ایک نقطہ بھی پکڑ میں نہیں آیا کہ نشان لگا سکوں۔"

تصوف اور اس کی تاریخ سے، کم از کم آخری دس بارہ برس میں انھیں خاصی دل چسپی پیدا ہوگئی تھی غالباً ۱۹۶۰ء میں وہ فرنگی محل ملنے آئے اور تصوف کی کتابوں ہی پر باتیں کرتے رہے۔ اس موضوع پر وہ پروفیسر محمد حبیب سے تبادلۂ خیال کر چکے تھے اور ان کی بعض ہدایتیں اس سلسلے میں انھوں نے نوٹ بک میں درج کر لی تھی میں نے جب ان سے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ صوفیاء کے بارے میں مستند لٹریچر حضرت نظام الدین اولیاء کے وقت سے ملتا ہے اس سے پہلے کا تمام لٹریچر اگر جعلی نہیں تو مشکوک ضرور ہے تو انھوں نے اپنی رپورٹ نکال کر بتایا کہ پروفیسر حبیب نے سیر الاولیاء، فوائد الفواد اور خیر المجالس کو معتبر اور مستند بتایا ہے، میں نے عرض کیا کہ اولین دونوں کتابیں حضرت نظام الدین اولیاء ہی کے بارے میں ہیں اور تیسری کتاب ان کے جانشین حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کا ملفوظ ہے، کہنے لگے "یہ کتابیں کہیں مل سکتی ہیں، میں انھیں خریدنا چاہتا ہوں۔"

میرے پاس فوائد الفواد کے دو نسخے تھے، ایک نسخہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا، کہنے لگے "اس پر اپنے دستخط کر کے دو تمھاری کوئی کتاب تمھارے دستخطوں کے ساتھ میرے پاس نہیں ہے۔"

ان کے مطالعہ کی گوناں گونی نئے معلومات حاصل کرنے کا شوق نیز بعض علمی معاملات میں اپنی ناواقفیت کا بے جھجک اعتراف ان کے سیرت کے اہم خصوصیات تھے، میرا ایک سرسری مضمون "مولانا عبد الحی فرنگی محلی" پر قومی آواز کے جمہوریہ نمبر میں شائع ہوا تھا، جس سے دل چسپی اگر ہو سکتی تھی تو عربی بلکہ دینیات سے دل چسپی رکھنے والوں کو، مگر بنے بھائی نے اس کو دل چسپی سے پڑھا اور پہلی فرصت میں مجھے تحریر کیا:

"حیات" ویکلی نئی دہلی

۲۷ رجنوری ۱۹۶۵ء

عزیزی رضا۔ ابھی ابھی قومی آواز میں تمھارا مضمون مولوی عبد الحی کے بارے میں بڑی دل چسپی سے پڑھا اور مجھے پسند آیا البتہ اس میں ایک کمی محسوس ہوئی (جو غالباً میری اپنی کم علمی کے سبب سے ہے) یعنی یہ کہ تم نے جہاں پر مولانا مرحوم کی تصانیف کا ذکر کیا ہے یا ان کے متعلق اقتباسات دیے ہیں وہاں پر مختصراً یہ نہیں لکھا کہ ان کا موضوع کیا ہے اور ان میں کس سے بحث کی گئی ہے، اگر تم ایک اور مضمون اس کے متعلق بھی لکھ دو تو اچھا ہو۔

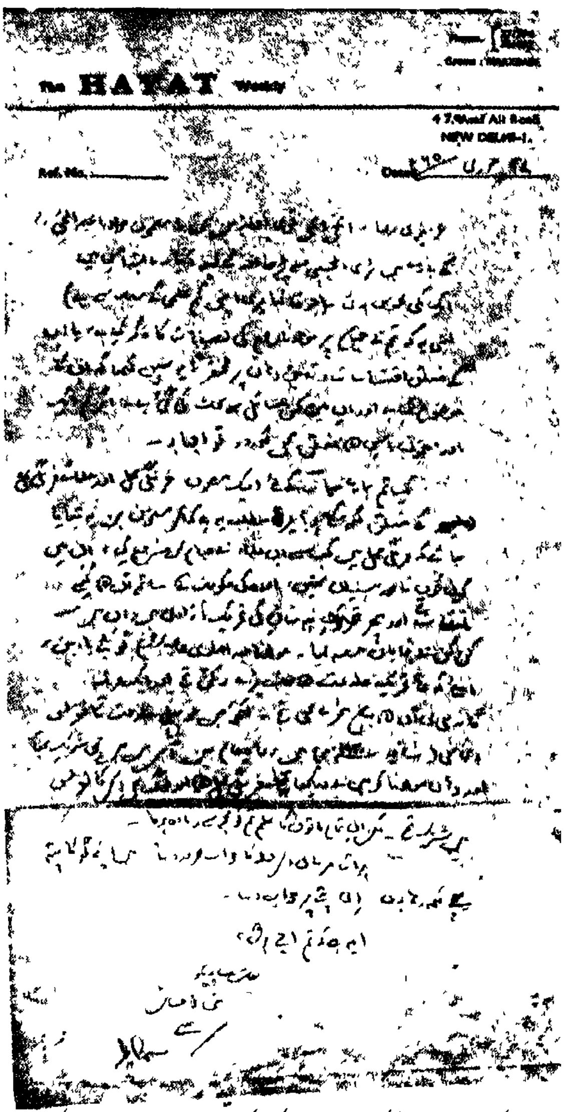
کیا تم ہمارے حیات کے لیے ایک مضمون فرنگی محل اور علمائے فرنگی محل کے متعلق لکھ سکتے ہو؟ میرا مطلب یہ ہے کہ اس مضمون میں یہ بتایا جائے کہ فرنگی محل میں کب سے ان علماء نے قیام شروع کیا ان میں کون کون نامور ہستیاں تھیں اودھ کی حکومت کے ساتھ ان کے کیسے تعلقات تھے اور پھر ہندوستان کی تحریک آزادی میں ان میں سے کن کن نے نمایاں حصہ لیا، مولانا عبد الباری مرحوم تو مجھے یاد ہیں اس لیے کہ وہ تحریک خلافت کے ایک بڑے رکن تھے اور ایک مرتبہ گاندھی جی ان کے یہاں ٹھہرے بھی تھے لکھنؤ میں جو پہلی خلافت کانفرنس ہوئی تھی (شاید سنہ ۱۹۲۰ء) میں رفاہ عام میں، اس میں میں بھی شریک تھا۔ اور وہاں مولانا کو میں نے دیکھا تھا فرنگی محل کے اور لوگ بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔ لیکن ان تمام باتوں کا علم تم کو مجھ سے زیادہ ہوگا۔

براے مہربانی اس خط کا جواب ضرور دینا میں اپنے گھر کا پتہ نیچے لکھ رہا ہوں، اس پتے پر جواب دینا امید ہے کہ تم اچھے ہوگے۔

بہت بہت پیار

تمھارا بھائی

بنے سجاد ظہیر



The HAYAT Weekly

4 7, Asaf Ali Road,
NEW DELHI-1.

Ref. No.

Date

افسوس کہ نیے بھائی کی اس فرمائش کی تعمیل میں اس وقت نہ کرسکا
اور اب جب کہ ان کے بیشتر استفسارات کے جوابات پر مشتمل میری
ایک کتاب اسی سال شائع ہوئی ہے تو وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔
ان سے آخری ملاقات دسمبر ۱۹۷۲ء میں علی گڑھ میں ہوئی

تھی جہاں وہ جامعہ اردو کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ دینے
آئے تھے۔ یہ ملاقات بھی چار سال کے بعد ہوئی تھی، بڑی شفقت
سے گلے ملے، بڑا شاندار خطبہ دیا، چند باتیں مجھ سے کہیں۔

اور پھر جب اُن کے انتقال کی اچانک خبر چار بجے سہ پہر کے آل انڈیا
ریڈیو کے بلیٹن میں علی گڑھ میں، اپنے کمرے میں ایسے سُنی کہ کمرے میں تن تنہا
تھا، تو بدحواس ہو گیا، علی گڑھ میں جہاں گئے مجھے چار سال
ہوئے تھے ایسے لوگ خال خال ہی ہیں جن کو نیے بھائی سے میری
دیرینہ نیازمندی کا حال معلوم ہو، ایسا محسوس ہوا کہ نہ کوئی غم گسار
میرے پاس ہے نہ کوئی مجھ سے تعزیت کرنے والا، کمرے سے نکل
کر نیے بھائی کے بھانجے ڈاکٹر عمار حسن اور بھتیجی بیگم عمار کے یہاں
گیا، ان بچاروں کو بھی میری ہی زبان سے یہ خبر سننی پڑی۔

نیے بھائی، کمیونسٹ تھے ترقی پسند ادیب تھے، ان دونوں
صفتوں کا عام نتیجہ یہی نکالا جاتا ہے کہ ایسا آدمی، مذہب بیزاری
اور خدا دشمنی میں بے باک اور ہر قدیم روایت سے باغی ہوگا، نیے
بھائی کے خطوط کے عکس دیکھئے اور متن پڑھنے کے بعد ان کی
سیرت کا اندازہ کرنے والا سوچ سکتا ہے کہ وہ وہی تھے جو اس
رجحان کے لوگ عام طور پر ہوتے ہیں؟ وہ سید سلیمان ندوی
کے عالم اور بزرگ ہونے کے نہ صرف معترف تھے بلکہ ان کے
احترام کی تلقین کرنے والے بھی، وہ اپنے کو "بحیثیت مسلمان ہونے
کے" پیش کرتے تھے، تفسیر کا اور تصوف کا مطالعہ کرنے والے،
اور قدیم دستور و روایت کے مطابق کسی بزرگ مرحوم کے نام پر
"رح" (مولانا عبدالحیؒ) لکھنے کے ادب پر عمل کرنے والے، اور کسی
بڑے سے معافی مانگ لینے میں کوئی برائی نہ سمجھنے والے نیے بھائی
کو میں روشن خیالی کا مثالی نمونہ سمجھتا ہوں جن کی ذات میں تبدیلی
کی زبردست خواہش کے ساتھ ساتھ صحت مند روایات کا پورا
پورا احترام پایا جاتا تھا، ایسے معتدل و متوازن، جدت و انقلاب
پسند، اگر کہیں ہوں گے تو میں ان سے ناواقف ہوں۔

★

نذرِ عقیدت

سعادت نظیر

شاعرِ مشرق ڈاکٹر محمد اقبال کی خدمت میں

یادِ ایام کہ مسموم تھی مشرق کی فضا
شاعری نام تھا الفاظ کی صناعی کا

نقشِ بے رنگ تھی اربابِ سخن کی محفل
عقل و دانش پہ تھا اک خوابِ گراں سا طاری

تو نے وہ بربطِ نو چھیڑ دیا، اے اقبال
تیری آواز سے اقوام و ملل جاگ اٹھے

سن کے نغمے ترے اربابِ وطن جھوم اٹھے
گونج اٹھے تیرے ترانے کچھ اس انداز کے ساتھ

تیری آواز ہے یا ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
اللہ اللہ! ترا اسلوبِ بیانِ گل کار

درد دل تھا جو تری سعیٔ خوش انجام کے ساتھ
تیرے افکارِ جواں نے وہ مسیحائی کی

کس بلندی پہ تجھے لے گیا عرفانِ کمال!
یہ تری فکر کا جادو ہے، یہ اعجازِ کلام

زندگی جس سے ملی دل کو، وہ شاعر تو ہے
تیری لے میں ترے نغمات جو سن پاتے ہیں

تیری باتوں سے ٹپکتا ہے خرد ساز فسوں
تو نے آئینۂ امروز میں فردا دیکھا

زندگی بخش حقائق ترے اشعار میں ہیں
تیری ہر نظم میں ہے روشنی سیاروں کی

ہر سخنور کی صدا دیتی تھی پیغامِ قضا
جس میں فقدان تھا مضمون کی رعنائی کا

لیلیٔ حکمت و معنی سے تھا خالی محمل
بختِ خوابیدہ کہاں، اور کہاں بیداری؟

جس کے تاروں میں ہے فطرت کا جمال اور جلال
نئے انداز سے جذباتِ عمل جاگ اٹھے

اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ سخن جھوم اٹھے
نطق مربوط ہو جیسے لبِ اعجاز کے ساتھ

درد میں، سوز میں ہے ڈوبی ہوئی تیری نوا
نظر آنے لگے ویرانے میں آثارِ بہار

جاگ اٹھا قوم کا اقبال ترے نام کے ساتھ
روح سی پھونک دی ہر جسم میں برنائی کی

پایۂ عرش کو چھونے لگی پروازِ خیال
شاعری بن گئی اک حسنِ عمل کا پیغام

فلسفہ جس پہ ہے نازاں، وہ مفکر تو ہے
ولولے زیست کے کچھ اور بھی بڑھ جاتے ہیں

فکر کی حد سے کچھ آگے ہے ترا ذوقِ جنوں
جو نہ اوروں کو نظر آیا، وہ جلوا دیکھا

کیا حکیمانہ اشارے تری گفتار میں ہیں
تیرے ہر گیت میں خوشبو ہے سمن زاروں کی

تیرے ہر شعر میں اک عالمِ تابندہ ہے
تو ہے زندہ کہ ہر اک تیرا سخن زندہ ہے

خالد جاوید

لانجی نس — عظمت کا متلاشی

افلاطون وارسطو نے یونان وروما میں جو ادبی روایات اور تنقیدی اقدار قائم کی تھیں لانجی نس (LONGINUS) کی کتاب "عظمت کے درباتے" (ON THE SUBLIME) نے ان کا رُخ بدل کر ادب العالیہ کا ایک بالکل نیا اور متوازن میلد مقرر کیا۔

لانجی نس کے حالات زندگی، عرصۂ حیات اور وطنیت وغیرہ کے مسائل ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ دریافت شدہ قدیم دستاویزوں میں باہم اختلاف ہونے کی وجہ سے یہ مسائل پیچیدہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ کتاب کے تین قدیمی مخطوطات میں سب سے زیادہ مستند اور وقیع پیرس کا نسخہ ہے جس کا سال تحریر سنہ ۱۰۰۰ء ہے۔ اس نسخے میں بھی تین مختلف مقامات پر مصنف کے تین مختلف نام ملتے ہیں:

(۱) DIONYSIUS (۲) DIONYSIUS LONGINIUS (۳) LONGINUS - بہرحال لفظ لانجی نس دو ناموں میں مشترک ہے اس لیے عظمت کے دریافت کے مصنف کو لانجی نس نام سے یاد کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ لیکن یہ لانجی نس کون تھا کہاں کا باشندہ تھا اور کس زمانہ میں حیات تھا یہ سب مسائل متنازعہ ہی ہیں۔ مشہور انگریزی نقاد اسکاٹ جیمس اُس پالمیرا کے باشندے لانجی نس کو "عظمت کے درباتے" کا مصنف قرار دیتا ہے جو تین سو سال قبل مسیح میں ملکہ زنوبیا کا مشیر اعلیٰ تھا۔

"عظمت کے درباتے" کو عہد قدیم اور عہد وسطیٰ میں عمومیت حاصل نہ ہو سکی سب سے پہلے BASLE نے ۱۵۵۴ء میں اس کا اصل یونانی متن شائع کیا۔ لیکن کتاب کی اصل حیثیت اور عظمت اس وقت ابھری جب کہ BOILEAUS نے ۱۶۷۴ء میں اسکا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔

الیزبتھ کے دور میں اس کے بہت سے انگریزی ترجمے مختلف ناموں سے ہوئے۔ ہال نے "فصاحت کی معراج" پلٹنی نے "گویائی کی برتری" اور اسمتھ نے "عظمت کے دریافت" (ON THE SUBLIME) کے ناموں سے ترجمے کیے جن میں آخر الذکر مقبول عام ہوا۔

مصنف کے سوانحی پہلو واضح نہ سہی لیکن یہ کتاب اس حیثیت سے انتہائی اہم ہے کہ اس کی مقبولیت کا دارومدار شخصیت پر نہیں بلکہ سراسر نفس مضمون کی اس اہمیت پر ہے جسے عالمگیر سطح پر قبول کیا جا چکا ہے اور اس کتاب کی بدولت لانجی نس کو ارسطو کے بعد دنیا کا سب سے بڑا نقاد ادب مان لیا گیا ہے۔

لانجی نس نے ادب کی ماہیت سے متعلق چند ایسے مسائل صاف کیے جن تک ارسطو اور افلاطون کی رسائی نہ ہو سکی تھی

یہ عجیب بات ہے کہ لانجی نس ہر حلقۂ ادب میں مقبول اور محبوب ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ادب کے ان بنیادی مسائل کو صاف کیا جو دنیا کے ہر ادب پر منطبق ہوتے ہیں

عقائد کے اعتبار سے وہ افلاطون سے قریب تھا۔ افلاطون کے ماورائی نظریہ کو وہ تسلیم کرتا تھا۔ لیکن اپنے ادبی اور تنقیدی نظریات میں وہ افلاطون کے احترام کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ شعراء کی جلاوطنی کے افلاطونی فلسفہ کو اُس نے حسین انداز میں نبھایا ہے:

"ہم سب ایک لامحدود علم کے لیے بے تاب ہیں ہماری اس بیتابی کو پناہ دینے والی چیز وہ شاعری ہے جس میں جذبات، وجدان اور محویت مجتمع ہوں۔ افلاطون نے شاعروں کو اپنی جمہوریت سے جلا وطن کر دیا لیکن شاعرانہ کیفیات اس کی تحریروں میں بہ نفس نفیس موجود ہیں"

اگرچہ لانجی نس نے ادب کا معیار متعین کرنے میں ایک بالکل انوکھا اور حقیقی اندازِ فکر اختیار کیا لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اس کی معرکتہ الآرا تصنیف کے محرک افلاطون و ارسطو ہی ہیں۔

لانجی نس کا زیادہ تر زورِ قلم ادیب کے ذاتی کردار پر صرف ہوا ہے اس کا خیال ہے کہ عظیم روح کا وجدان عظیم معنویت کو ابھار سکتا ہے تنگ روح کے حامل لافانی قدروں کے خالق نہیں ہو سکتے۔

آیئے لانجی نس کی عظیم ادبی فتوحات سے کچھ واقفیت حاصل کریں

عظمت کی تعریف

لانجی نس سے پہلے عام طور سے یہ نظریہ بن چکا تھا کہ شاعری کا مقصد "رہنمائی اور مسرت رسانی" اور نثر کا مقصد "ترغیب و تلقین" ہے۔ لانجی نس نے فلسفیانہ تجزیہ کے ذریعہ اس نظریہ کو بالکل ناقابل ثابت کر دیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اگرچہ دنیا کے بڑے بڑے شاعروں اور نثر نگاروں نے رہنمائی و مسرت زائی، ترغیب و تلقین کے اصول پر اپنی کاوشیں صرف کیں لیکن ان کی بڑائی، آفاقیت اور شہرتِ دوام کا اصل راز ان تینوں چیزوں میں نہیں بلکہ ان کی ذاتی عظمتِ روح، رفعتِ ذہن اور شانِ عرفانیت میں ہے لہٰذا عظیم ادب دراصل ایک عظیم و رفیع روح کی بازگشت ہے جو ایک اعلیٰ و ارفع دماغ سے ادبی قالب میں ڈھل جاتی ہے۔

عظمت کے بارہ میں اس کے مندرجہ ذیل نکات غور کرنے کے قابل ہیں:

(۱) عظیم شہپارہ ایک عظیم روح اور وسیع دماغ کی گونج ہے نیز

(۲) یہ ایک نغمۂ روح ہے جو بے ساختہ طور پر ایک عالی دماغ سے پھوٹ پڑتا ہے۔ نیز

(۳) یہ زبان و بیان کی پاکیزگی اور برتری کا مظہر ہوتا ہے نیز

(۴) عظمت کا راز ایک عالی و عارف روح کی نظری بصیرت میں پنہاں ہے اور

(۵) اظہار کا جادو ہی لافانی عظمت کا حامل ہو سکتا ہے۔

لانجی نس کے خیال میں کسی شہپارہ کا لافانی تاثر سامع کو معقول کر دینے میں نہیں بلکہ اسے کیف میں لانے میں ہے۔ اکثر ایک جادو اثر بیان ہمارے عقلی مطالبات پر حاوی ہو جاتا ہے۔ لانجی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"کارنامہ کی معراج ترغیب و تلقین پر نہیں بلکہ عارفانہ وجدان (ECSTASY) پر موقوف ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ سامع کو خود فراموش کر دینے والی قوت پر۔ اس کا اعجاز چونکا دینے والا اور اس کی رسائی اور مرعوبیت دلائل و براہین سے زیادہ نفوذ کرنے والی ہوتی ہے۔ دلیل کو قبول کرنا یا نہ کرنا ہمارا اختیاری فعل ہے لیکن اعجاز کلام سے مرعوب ہونے میں ہم بے بس ہیں اس کا عمل ناقابلِ تسخیر ہے۔ اگرچہ کسی تخلیق میں مغز ہی مغز ہو اور اسے انتہائی جانفشانی سے مرتب کیا جائے لیکن جانفشانی اور مغز سے تخلیق تابناک نہیں ہو سکتی۔ اس کے برخلاف ایک عارف روح کا اعجاز کلام بجلی کی طرح دھوئیں دماغ پر گرتا ہے اور ایک چمک کی طرح مصنف کی قوتوں کا مظہر بن جاتا ہے

عظیم و لافانی تاثر دراصل مصنف کی وجدانیت اور محویت کا ردعمل ہوتا ہے۔ یہ تاثر عظمت دلائل و براہین سے نہیں بلکہ روشن ضمیری اور خود شناسی سے حاصل ہوتی ہے۔ عظیم و لافانی تاثر وقتی یا یکبارگی نہیں ہوتا بلکہ ہر بار پڑھنے یا سننے میں ایک انکشاف کی طرح طاری ہوتا ہے عظیم و لافانی تاثر ذہن کے ذریعہ نہیں بلکہ تخیل کے ذریعہ نفوذ کرتا ہے

عظمت کی علامت کے طور پر لانجی نس مندرجہ ذیل معیار بتاتا ہے۔

"عرفانِ روح کے وہ پیرائے جو ہمیشہ، ہر بار اور ہر کسی کو مسحور کر دیں"

عظمت کا مغالطہ

اس عنوان کے تحت لانجی نس نے حقیقی اور غیر حقیقی عظمت میں امتیاز پیدا کیا ہے غیر حقیقی عظیم شہپارہ پر اکثر حقیقی عظیم شہپارہ ہونے کا دھوکا ہوتا ہے لانجی نس کہتا ہے کہ یہ بے حقیقتی دو خامیوں سے واقع ہوتی:

(۱) جذبہ اور خلوص کی کمی اور

(۲) ابلاغ کی کوتاہی اور اظہار کی خامی

چنانچہ لانجی نس ادب و شعر کے قاری کو چار چیزوں سے خبردار رہنے کی بار بار تلقین کرتا ہے:

(۱) الفاظ و معانی کی ٹھونسم ٹھانس

(۲) زبان و بیان کا چھچھورا پن

(۳) نمود و نمائش کی ہوس

(۴) رسمی انداز اور جذبہ کی سرد مہری

یونانی زبان کے کچھ نمونوں سے وہ ثابت کرتا ہے کہ کس طرح لفاظی، رسمی انداز، دور از کار اور غیر حقیقی اظہار جذبہ اور نقص کلام غیر حقیقی عظمت کا قالب اختیار کر لیتے ہیں۔

سب سے پہلا رومانوی ناقد

لانجی نس چونکہ جذبۂ دل، عرفان روح، ابلاغ TRANSPORT، تخئیل، بصیرت اور شرافت نفس پر زیادہ زور دیتا ہے اس لیے کچھ تنقید نگار اس کا تعلق رومانوی تحریک سے قائم کرتے ہیں یہ غلط فہمی دراصل لانجی نس کے مذکورہ بالا عظمت کے نظریہ سے ہی پیدا ہوتی ہے کہ

"جو قاری کو فراوانی جذبہ و اظہار سے خود فراموش کر دے وہی عظیم کارنامہ ہے۔"

لیکن درحقیقت یہ ایک مغالطہ ہے۔ شاعرانہ نظریہ میں وہ رومانوی نظریہ سے کہیں کہیں قریب ضرور ہے لیکن ضبط تحریر کے اصولوں میں وہ کلاسکل قواعد کی سختی سے پابندی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا کہنا ہے کہ ادیب کے لیے جتنا شدید جذبہ درکار ہے اتنا ہی اپنے جذبہ کو برداشت کرنے کی قوت بھی ضروری ہے۔

"شدید جذبات کو اثر لگانے سے زیادہ لگام لگانا ضروری ہے۔"

رومانوی ناقدوں کی طرح وہ اس بات کا قائل نہیں کہ "حسن" (BEAUTY) کی سیر ہوا شاعر کے بادبانوں میں بھر کر از خود اور بلا ارادہ اسے بہا لیجاتی ہے۔ رومانوی ادیب اسے دلائل میں لانجی نس کی داخلیت (SUBJECTIVENESS) کو بطور سند پیش کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت اپنے داخلی نظریہ میں لانجی نس جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ ہے صاحب تحریر کی رفعت کردار۔ لانجی نس اور اس کے پیش روؤں میں ما بہ الامتیاز شے صرف یہی ہے کہ وہ ارادی کاوش "مسرت زائی و رہنمائی" سے زیادہ صاحب کلام کی روحانی بلندی اور رفعت نفس کا قائل ہے۔ لانجی نس کے نظریۂ داخلیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ادیب بلند کردار کا حامل ہے اور کردار کے ساتھ ساتھ اس نے عرفانِ

(باقی صفحہ ۶ پر)

غزل

کاوش بدری

چلتے چلتے جو کبھی تیری گلی آوے ہے
مرے سنبھلے ہوئے قدموں کو غشی آوے ہے

اور کیا چاہیے اخلاص و محبت کا ثبوت
غم کے باوصف ہمیں خندہ لبی آوے ہے

ابر آلود ہے شاید کہیں یادوں کا جہاں
ورنہ کیا بات ہے پلکوں پہ نمی آوے ہے

کچھ نہ آوے نہ سہی محفلِ خوباں میں مگر
کم سے کم درد کی تصویر کشی آوے ہے

کتنی صبحوں کا جنازہ ہے سکوتِ شب غم
کیوں خیالوں میں چراغ سحری آوے ہے

اب کے رستے بھی بھٹکتے ہیں بلندی کی طرف
اب کہاں خضر کو بھی راہبری آوے ہے

رفتہ رفتہ ہی بہنے کا خیال آتا ہے
دھیرے دھیرے ہی سنورنے کی گھڑی آوے ہے

بھیڑ کو چیر کے پہنچا ہے کوئی منزل تک
ہانپتے کانپتے کچھ تازہ دمی آوے ہے

تیرگی پھیل کے سمٹی تو بنی گیسوئے یار
ڈوب کے ابھری تو چہرے پہ خوشی آوے ہے

گاہ شبنم، گہے شعلہ، گہے شیشہ گہے سنگ
تجھ کو کیا کیا نہ یہاں جلوہ گری آوے ہے

بزم عشاق میں کاوش نہ سہی اور سہی
کون سی میرے نہ ہونے سے کمی آوے ہے

شمیم مسیح الزماں

کہانی

راہی

رکشے سے اتر کر بائیں طرف مڑتے ہی اس کی نگاہ پڑی۔ قطار سے کھڑے صاف ستھرے مکانوں پر۔ ہر کھڑکی میں روپہلی سلاخیں، جھولتے ہوئے رنگین پردے۔ ہر برآمدے میں بوگین ویلیا کی بیلیں۔ سنسان سڑک۔ دو ایک آدمی پٹری پر سے گزر رہے ہیں۔

وہ آدمی سیدھا چلتا چلا گیا۔ پیچھے چھوٹتا گیا۔ سنگیت کالج، پرچون کی دکان، جنرل اسٹور، ریسٹوران، سبھی کچھ۔ اور آگے جا کر ایک سفید رنگ کے چار منزلہ مکان کے دروازے پر وہ جا کر کھڑا ہوا۔ دروازے پر دائیں طرف ایک کال بیل لگا تھا۔

اس نے بٹن دبایا۔ اندر گھنٹی بج اٹھی۔

وہ کھڑا رہا ــ انتظار میں۔

تھوڑی دیر بعد پیروں کی آہٹ دور سے دروازے تک آ کر رک گئی۔ چٹخنی کھولنے کی آواز ہوئی۔ دروازہ کھلا۔ ایک بوڑھا آیا۔ جسم کا رنگ میلا۔ بنیائن اور دھوتی پہنے ہوئے۔

"کس سے ملنا ہے؟"

اس نے نام بتایا۔ بوڑھا اندر لوٹ گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد واپس آیا۔

"آئیے۔"

وہ اندر گیا۔ جاتے ہی بائیں طرف زینہ، دائیں طرف کمرہ ملا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

"یہاں بیٹھیے۔"

بوڑھا اندر آیا۔ زینے سے اوپر چلا گیا۔ وہ نیلا پردہ ہٹا کر اندر گیا۔ اندر صوفہ سیٹ بچھا تھا۔ میز پر پیتل کا ایش ٹرے رکھا تھا۔ جس پر مینے کا کام تھا۔ کمرے میں چار کھڑکیاں تھیں۔ ایک دروازے کے سامنے، ایک اس کے پاس اور دو سڑک پر کھلتی تھیں۔ ہر کھڑکی پر نیلا پردہ لٹک رہا تھا۔ وہ سڑک پر کھلنے والی کھڑکی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ سامنے کی دیوار پر جیمنی رائے کی ایک پینٹنگ لگی تھی۔ تصویر کے نیچے تین خانوں والی لمبی سی الماری۔ الماری کے سب سے اوپر کے حصے پر کرشن نگر کا کھلونا، بانکوڑا کا گھوڑا رکھا تھا۔ پہلے خانے میں ٹیگور کی تخلیقات، دوسرے اور تیسرے میں انگریزی کتابیں سجی تھیں۔ ان کے بیچ کہیں کہیں ایک آدھ بنگالی کتاب بھی پڑی تھی۔

زینے پر اچانک چپل کی آہٹ ہوئی۔ اس نے دروازے کی طرف آنکھیں موڑ لیں۔ آواز زینے سے آہستہ آہستہ اترنے لگی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر لمحہ بھر کے لیے وہ آواز رک گئی۔ اس کے بعد سونے کی چوڑی والی ایک کلائی نظر آئی۔ پردہ ہٹا۔ ایک گوری سی عورت اندر آئی۔ لمبا قد، خوبصورت چہرہ، دوہرا جسم، عمر تقریباً چالیس سال۔ مانگ میں سیندور ہے یا نہیں۔ اس کا اندازہ نہیں ہوا۔ وہ ہینڈلوم کی ساری پہنے تھی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ عورت کا اشارہ پا کر پھر بیٹھ گیا۔ وہ بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ دونوں کے بیچ میں تھی سنٹر ٹیبل۔

اس آدمی نے پہلے باتیں شروع کیں۔
"آپ تو ۔ ۔ ۔ ۔"
"ہاں۔"
"بالکل بدل گئی ہیں۔ فوٹو میں جیسا دیکھا تھا ۔ ۔ ۔"
"کیسا فوٹو؟"
اس آدمی نے جیب سے ایک پاسپورٹ سائز کا فوٹو نکالا
ایک لڑکی فراک پہنے کھڑی تھی۔ فوٹو عورت کی طرف بڑھا دی
"پہچانتی ہیں؟"
"یہ تو میری ہی تصویر ہے۔ آپ کو کہاں ملی؟"
"مل گئی ۔ ۔ کون دے سکتا ہے؟"
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تصویر دیکھنے لگی۔
اسی وقت کوئی پردہ ہٹا کر کمرے میں آیا۔ اس نے پلکیں
ہٹا کر دیکھا۔ عورت جیوں کی توں بیٹھی رہی۔ فوٹو دیکھتی رہی۔
وہ ذرا آگے بڑھا۔ تصویر پر اس کی نظر گئی۔
"کس کی تصویر ہے؟"
عورت نے گردن اٹھا کر پھر جھکا لی۔
"میری دوست کی۔"
اس نے رک کر پھر پوچھا۔
"وہاں جاؤ گی نا؟"
"سوچوں گی۔"
"ارے!"
"ہاں۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔"
"ایک سیریڈون لے لو۔ میں ابھی بھیجتا ہوں۔"
وہ کمرے سے نکل گیا۔
اس آدمی نے پوچھا:
"آپ کے شوہر ہیں۔؟"
عورت نے کوئی جواب نہ دے کر پھر پوچھا:
"تصویر کس سے ملی؟"
آدمی نے پھر پہلے کی طرح جواب دیا۔

"کون دے سکتا ہے؟"
"رجت؟"
"جی ہاں"
ذرا رک کر اس نے پھر پوچھا:
"یہ تصویر کہاں اتاری گئی تھی بتائیے نا؟"
"اس مکان کی چھت پر۔"
کچھ رک کر اس نے پھر پوچھا:
"کس نے اتاری؟"
"رجت نے۔"
"سب یاد ہے آپ کو؟"
"ہاں۔"
اس آدمی نے اب اوپر کی جیب سے ایک قلم نکالا۔
"اسے پہچانتی ہیں؟"
"دیکھوں۔"
عورت تصویر میز پر رکھ کر قلم گھما پھرا کر دیکھنے لگی۔
"اسے ٹھیک پہچان نہیں سکی۔"
"ذرا پھر یاد کیجئے۔"
اسی وقت بوڑھا پردہ ہٹا کر اندر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں
تھی سیریڈون کی ٹکیا اور دوسرے میں پانی کا گلاس۔
"یہ لیجیے۔"
"رکھ دو۔"
بوڑھا میز پر ٹکیا اور گلاس رکھ کر چلا گیا۔
"قلم کس کا ہے؟"
"ذرا اور سوچیے۔"
"کچھ یاد نہیں آتا ۔ ۔ ۔ ۔ رجت کو تحفے میں دیا تھا لیکن آپ کو
یہ کیسے ملا؟"
"رجت نے دیا۔"
"کیوں؟"
"لوٹانے کے لیے۔"

"مجھے؟"

"ہاں"

عورت کا چہرہ اتر گیا۔

"اور کیا دیا ہے؟"

اس آدمی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"سیریڈون لے لیجیے۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟ لے لینے سے درد مٹ جائے گا۔"

"میرے سر میں درد نہیں ہے۔"

"ان سے تو کہا تھا آپ نے ..."

"چھوڑیے۔ رجت نے اور کیا دیا ہے؟"

اس آدمی نے جیب سے ایک رومال نکال کر سینٹر ٹیبل پر رکھا۔

"پہچانیے!"

رومال تہ کیا ہوا تھا۔ عورت نے قلم رکھ کر رومال اٹھا لیا۔ تہوں کو کھولا۔ رومال کے کونے میں ایک پھول کڑھا ہوا تھا۔ پھول کے نیچے ایک حرف کڑھا تھا — "م"

آدمی نے پوچھا:

"اسے تو پہچانتی ہیں؟"

"ہاں۔"

عورت نے رومال رکھ دیا۔

"بہت پہلے ... کب، یاد نہیں۔ ایک دن رجت آیا، بولا..."

وہ چپ ہو گئی۔

"کیا؟ کہیے نا!"

"چھوڑیے — اور اس نے کیا دیا ہے؟"

وہ آدمی ہنسا، پھر بنیٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی لال رنگ کی ڈبیہ نکالی اور اسے کھول کر عورت کی طرف بڑھا دیا۔ ڈبیہ میں تھی ایک سفید پتھر کے نگ کی انگوٹھی۔

عورت ڈبیہ سے انگوٹھی نکال کر دیکھنے لگی۔ پھر اسے بھی سینٹر ٹیبل پر رکھ کر پوچھا:

"اور کیا لوٹایا ہے اس نے؟"

"خط"

اس نے بنیٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور بڑھا دیا۔ عورت نے لفافہ کھولا نہیں، رکھ دیا۔

"اور؟"

"اور ایک تحفہ۔"

"کیا؟"

"ایک ڈائری۔"

"کس کی؟"

"اپنی لکھی۔"

اس نے ہپ پاکٹ سے ایک چھوٹی سی ڈائری نکالی۔

عورت ڈائری لے کر صفحے الٹتے پلٹتے ایک جگہ آنکھیں گاڑ کر غور سے پڑھنے لگی

اس آدمی نے پڑھنے میں رکاوٹ ڈالی۔

"پھر پڑھ لیجیے گا۔ ابھی ایک چیز دیکھنا ضروری ہے۔ اس کے بارے میں رجت نے بار بار کہا ہے۔"

عورت نے میز پر ڈائری رکھ دی۔

"وہ کیا؟"

اس نے بغیر جواب دیے سوال کیا:

"اس مکان کے پیچھے کوئی باغیچہ ہے؟"

"ہے۔"

"چلیے ذرا وہاں چلیں۔"

"کس لیے؟"

"کوئی بات ہے۔"

"کیا؟"

"آپ بھول گئی ہیں لیکن رجت کو سب یاد ہے کتنی با کتنے طریقوں سے اس نے اس کا ذکر کیا ہے۔"

"آپ اس کے کون ہوتے ہیں؟"

"کوئی نہیں۔"

"تو یہ ساری باتیں آپ سے . . . . ."

اس آدمی نے جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔

"اس باغیچہ میں چلیے نا! کوئی حرج ہے؟"

"نہیں۔"

"تو اٹھیے۔ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"چلیے۔"

عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔ سینٹر ٹیبل پر چیزیں پڑی رہیں۔ اور وہ کمرے سے نکل کر دائیں طرف مڑ گئے۔ سیدھے چل کر وہ ایک بند دروازے کے پاس پہنچے عورت نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک معمولی باغیچہ تھا، لوہے کی سلاخوں سے گھرا ہوا۔ باغیچے کی گھاس اور پودے بے ترتیبی سے بڑھے تھے۔ ایک عرصہ سے چھنٹائی نہیں ہوئی تھی۔ دونوں طرف قطار سے گلاب، جوہی اور رات کی رانی لگی تھیں۔ ایک گلاب کا پیڑ سفید گلابوں سے بھرا تھا۔ باغیچہ کے آخر میں بالکل سرے پہ دو ناریل کے پیڑ تھے۔ دونوں پیڑوں کے بیچ ایک بنچ پڑی تھی۔

وہ آدمی ناریل کے پیڑوں کی طرف بڑھتا ہوا بولا:

"یہ تو وہی پیڑ ہیں۔ رجت انھیں کے بارے میں کہہ رہا تھا۔"

وہ بے چین ہو اٹھی۔

"کیا ہے ان میں؟"

"بتاتا ہوں۔"

وہ دائیں طرف کے پیڑ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور پھر اس کے چاروں طرف تیزی سے کچھ ڈھونڈھنے لگا

عورت نے پھر پوچھا۔

"کیا ڈھونڈھ رہے ہیں؟"

"بتاتا ہوں۔"

وہ پیڑ کے چاروں طرف چکر لگاتا رہا۔ ایک بار جھکا، سر آگے بڑھایا اور پھر اچانک اچھل پڑا۔

"مل گیا . . . ."

"کیا؟"

"آئیے۔ دیکھیے۔"

عورت پیڑ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ جھکی۔ اس آدمی نے انگلی سے اشارہ کیا۔ عورت نے دیکھا۔ چاقو سے کھرچ کر لکھا ہوا ایک حرف ــ "م"

وہ آدمی اس کے بعد بائیں طرف کے پیڑ کی جانب لپکا۔ اسکے چاروں طرف بے چینی سے گھومنے لگا۔ بار بار جھکا پھر پہلے کی طرح اچھل پڑا:

"مل گیا!"

عورت پیڑ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ذرا جھک کر۔ اس آدمی نے انگلی سے اشارہ کر کے دکھایا۔ چاقو سے کھرچ کر لکھا ہوا تھا ایک بڑا سا حرف ــ "ر"

اب اس نے کہا:

"میرا کام ختم۔ اب میں چلا۔"

"ٹھہریئے۔"

"عورت کچھ کہتے ہوئے رکی۔

"بیٹھ جائیے ذرا۔"

"نہیں مجھے دیر ہو جائے گی۔"

"ارے ــ بیٹھیے تو۔"

"اب نہیں رکوں گا۔ کچھ کہنا ہو تو جلد کہہ ڈالیے۔"

عورت نے کچھ ٹھہر کر پوچھا:

"رجت آج کل کہاں ہے؟"

"کیوں؟"

"کچھ کہنا ہے۔"

"کیا؟"

اسی وقت کوئی باغیچہ میں داخل ہوا۔ باتیں سن کر رک گیا۔ وہ چپ ہو گئے۔ کوئی آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھا اور اسی رفتار سے عورت کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

ستمبر ۱۹۷۶ء تک

"دردِ سر ٹھیک ہوا؟"
"نہیں۔"
"تو؟"
"آج کہیں نہیں جاؤں گی۔ تم اکیلے چلے جاؤ۔"
وہ ذرا رک کر اچانک پوچھ بیٹھا:
"ٹیبلٹ لے لی تھی؟"
"نہیں۔"
"کیوں؟"
"بھول گئی۔"
"ٹیبلٹ لے لو۔ بھیج دوں۔"
"نہیں، رہنے دو۔"
"کیوں؟"
"کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"
اس نے پھر کچھ نہیں کہا۔ چند لمحے کھڑا رہا۔ پھر باغیچہ پار کر کے اندر چلا گیا۔
وہ آدمی پھر پرانے موضوع پر لوٹ آیا۔
"رجت سے کیا کہنا ہے؟"
"کہیے گا — مجھے معاف کر دے۔"
"اور کچھ؟"
"اور کہیے گا — میں اسے بھولی نہیں ہوں۔"
"یہ جھوٹ ہے — بالکل جھوٹ۔"
عورت حیران سی ہو گئی۔ کچھ افسردہ بھی۔
"مطلب؟"
"بتائیے تو رجت کیسا ہے؟"
"گورا، لمبا چہرہ، سر کے بال گھنگھرالے . . . ."
اس آدمی نے بیچ میں ہی روک دیا۔ زور سے ہنسنے لگا۔
"ہنس کیوں رہے ہیں؟"
"یوں ہی۔ اچھا چلوں۔"
"ٹھہریے۔ میں بھی چلوں گی۔"
"نہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے۔"
"کیوں؟"
آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عورت کے چہرے پر کچھ لمحے نظریں گاڑے رہا۔ پھر مڑ کر کھڑا ہوا اور آگے بڑھ گیا۔
"میں چلوں گی۔ آپ ذرا ٹھہریے۔"
"نہیں۔"
"کیوں؟"
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے باغیچہ پار کیا اور دروازے سے نکل کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

★

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ "نیا دور" کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کیے جاتے ہیں

(۱) مقام اشاعت — لکھنؤ
(۲) وقفۂ اشاعت — ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ — شری اشوک کمار۔ ہندوستانی۔ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ اتر پردیش، الٰہ آباد۔
(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ — شری شرومنی شرما۔ ہندوستانی۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش۔ لکھنؤ۔
(۵) اڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ — شری خورشید احمد۔ ہندوستانی۔ اڈیٹر "نیا دور" محکمۂ اطلاعات۔ لکھنؤ
(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمایے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔ — نیا دور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں شرومنی شرما اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔
(دستخط) شرومنی شرما (پبلشر)

★

غزل

صمدنی حیدآبادی

افتادِ دل پہ ہے بھی تو مبہم ہے، کیا کروں؟
جانِ عزیز و کشمکشِ غم ہے کیا کروں ؟

اب اس کا قرب و بُعد ہے دونوں ہی وجہِ غم
اور اک ذرا سا غم بھی مجھے سم ہے کیا کروں ؟

وہ دن بھی تھے کہ اک نگہِ ناز تھی بہت
اب فرطِ التفات بھی کچھ کم ہے کیا کروں ؟

شوق و فسردگی کے منازل تو طے ہوئے
مائل بہ یاس اب دلِ پُرغم ہے کیا کروں ؟

ممتاز حُسن میں ہے نہ اخلاق ہی میں فرد
جاں سے سوا عزیز وہ تاہم ہے کیا کروں ؟

آبِ حیات تھی کبھی اور رشکِ غیر سے
اس کی نگاہِ لطف بھی اب سم ہے کیا کروں ؟

جامِ صفا کو تم نے مکدر بنا دیا
آبِ حیات بھی مجھے اب سم ہے کیا کروں ؟

کس کو سناؤں اپنی تباہی کی سرگزشت
جس سے امید تھی، وہی برہم ہے کیا کروں ؟

اب مجھ میں غم کی تاب کہاں فرطِ ضعف سے
پیشِ نگاہ موت کا عالم ہے کیا کروں ؟

اس کا خیال و گوشہ نشینی ہے مغتنم
زخمِ جگر کو اب یہی مرہم ہے کیا کروں ؟

ہوتی نجات غم سے مجھے اور اسے خوشی
لیکن امیدِ مرگ بھی تو کم ہے کیا کروں ؟

قطعِ نظر بھی اُس سے اک امرِ محال ہے
دِل میرا اک وفائے مجسّم ہے کیا کروں ؟

صمدنیؔ کسی سے کوئی شکایت نہیں مجھے
قسمت میں میری، آٹھ پہر غم ہے کیا کروں ؟

کاظم علی خاں

غالب کی اردو مکتوب نگاری

آغاز و اشاعت

غالب اپنی عمر کے طویل عرصہ تک خط و کتابت فارسی میں ہی میں کرتے رہے۔ یہ فارسی سے ان کے نظری لگاؤ کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس امر میں عہدِ غالب کے عام مذاق و مزاج کی بھی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس زمانے میں عام طور پر خطوط اردو کے بجائے فارسی میں لکھے جاتے تھے لیکن عمر کے آخری حصہ میں غالب مکتوب نگاری کے لیے اردو کی جانب متوجہ ہوئے۔ غالب کی اردو مکتوب نگاری کی ابتداء مولانا حالی نے ۱۸۵۰ء کے بعد بتائی ہے[1]۔ مولانا حامد حسین قادری[2] اور ڈاکٹر مسیح الزماں[3] وغیرہ نے بھی مولانا حالی کے قول کو صحیح مانا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مرزا غالب کی اردو مکتوب نگاری کی ابتدا ۱۸۴۹ء کے آس پاس متعین کرتے ہیں[4] لیکن تلاش و جستجو سے غالب کا ۹ مارچ ۱۸۴۸ء کا ایک اردو خط روشنی میں آچکا ہے۔ جس کے مکتوب الیہ منشی نبی بخش حقیر ہیں[5]۔ اس کے علاوہ، ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۰ء کے متعدد اردو خطوط بھی ہمارے سامنے ہیں۔

غالب کی اردو مکتوب نگاری کا سبب مولانا حالی نے مہر نیم روز کی تالیف کے سلسلے میں غالب کی مصروفیت کو قرار دیا ہے[6]۔ مہر نیم روز تاریخ حکومت مغلیہ سے متعلق فارسی کتاب ہے جو غالب نے مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر کے حکم پر ۴ جولائی ۱۸۵۰ء سے لکھنا شروع کی تھی[7]۔ مہر نیم روز کی مجموعی ضخامت ۱۱۶ صفحات تک رہی ہے۔ فارسی کی اس مختصر کتاب کی تالیف میں غالب کی مصروفیت کی مدت ۴ جولائی ۱۸۵۰ء سے اگست ۱۸۵۴ء تک ثابت ہے[8]۔ چار سال کی مدت میں محض ۱۱۶ صفحہ کی کتاب لکھنا غالب جیسے مشاق فارسی نثر لکھنے والے

---

[1] مولانا الطاف حسین حالی: یادگار غالب۔ شائع کردہ رائے صاحب رام دیال اگروال، الہ آباد ۱۹۵۸ء ص ۱۶۶
[2] مولانا حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو۔ لکشمی نرائن اگروال آگرہ ۱۹۶۶ء۔ ص ۲۱۷
[3] ڈاکٹر مسیح الزماں: معیار و میزان: رام نرائن لال بینی مادھو الہ آباد ۱۹۷۰ء ص ۲۵۷
[4] ڈاکٹر سید عبداللہ: میر امن سے عبدالحق تک۔ چمن بک ڈپو دہلی۔ ص ۳۷۳
[5] مالک رام (مرتب): خطوط غالب: انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۲ء ص ۱۰۱
[6] مولانا حالی: یادگار غالب: الہ آباد ۱۹۵۸ء ص ۱۲۵ و ص ۱۲۶
[7] مالک رام (مرتب): عیار غالب۔ علمی مجلس دہلی فروری ۱۹۶۹ء ص ۱۱
[8] مالک رام: ذکر غالب: مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۶۴ء ص ۱۸۴

کے لیے کچھ زیادہ دشوار کام نہ تھا۔ منشی نبی بخش حقیر وغیرہ کے نام غالب کے خطوط خود بتاتے ہیں کہ یہ کتاب کافی اطمینان سے رک رک کر لکھی جاتی رہی ہے اور کتاب کے لیے حصول مواد میں خود غالب کی تلاش و تحقیق سے زیادہ دوسروں کی مدد شامل رہی ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر غالب کی اردو مکتوب نگاری مہر نیم روز میں ان کی مصروفیت کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ غالب کی مہر نیم روز کے سلسلے میں مصروفیت سے قبل اور بعد کے زمانوں کے اردو خطوط بھی مولانا حالی کے نظریے کی نفی کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں خود غالب کی حسب ذیل عبارت اس سلسلے میں زیادہ قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔

شاکر کے نام غالب، اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے برابر سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہوا اور یہ حال ہے ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں[1]

اسلوب احمد انصاری نے غالباً اسی لیے لکھا ہے:

"....انھوں نے فارسی میں مکتوب نگاری اس لیے ترک کی کہ ... وہ حسن اہتمام و انصرام اور جگر کاوی اور محنت پژوہی کا مطالبہ کرتی تھی، اسے غالب اپنی زندگی کے آخری دور میں پورا کرنے کی خاطر خواہ سکت نہ رکھتے تھے......
غالب کی زندگی کی شام میں فارسی مکتوب نگاری کا چلن قریب قریب ختم ہو گیا تھا اور یہ بے وقت کی راگنی معلوم ہونے لگی تھی۔"[2]

ڈاکٹر مسیح الزماں[3] نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ غالب دوستوں اور شاگردوں کی ایک بڑی تعداد رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان سے خط و کتابت کرنا آسان نہ تھا۔ غالب کے نام خطوں کا سلسلہ لگا رہتا تھا۔ لہٰذا غالب کو بڑی تعداد میں خطوط کے جواب دینا پڑتے تھے۔ فارسی مکتوب نگاری کے مروجہ تکلفات چند خطوط میں تو برتے جا سکتے تھے مگر خطوط کی بڑی تعداد میں ان کا برتنا غالب کی ضعیفی اور علالت کے پیش نظر یقیناً دشوار کام تھا۔ اسی لیے غالب نے فارسی کے بجائے اردو میں خطوط لکھنا شروع کر دیے۔ اس امر میں فارسی کے مقابلے میں اردو کی مقبولیت بھی شامل رہی ہے۔

مولانا حالی، ڈاکٹر مسیح الزماں اور اسلوب احمد انصاری وغیرہ کے بیانات سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ غالب نے اردو میں خط و کتابت شروع کرنے کے بعد فارسی زبان میں خط لکھنا بالکل موقوف کر دیا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ غالب کے بعض اردو خطوط کی داخلی شہادتیں اس امر کی نفی کر رہی ہیں۔ مولوی نعمان احمد کے نام غالب اپنے ایک خط مورخہ ۶ اکتوبر ۱۸۶۶ء میں لکھتے ہیں!

"... برسوں سے خطوط فارسی میں لکھنے چھوڑ دیے اب شاہزادہ بشیر الدین بیرہ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی خط نہیں لکھتا اور یہ موافق ان کے حکم کے ہے"[4]

یہاں اس امر کا اعتراف و انکشاف کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولوی نعمان احمد کے نام غالب کے جس خط سے یہ عبارت اخذ کی گئی ہے وہ پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم کی کاوشوں سے روشنی میں آیا ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین نے مولوی نعمان احمد کے نام غالب کے چار عدد غیر مطبوعہ اردو خطوط تلاش کر کے اپنے مقالے کے ساتھ

---

[1] ڈاکٹر محی الدین قادری زور؛ روح غالب۔ ادارہ ادبیات اردو۔ حیدرآباد دکن۔ ۱۹۵۰ء ص ۱۵۳
[2] اسلوب احمد انصاری۔ نقش غالب۔ غالب اکیڈمی دہلی۔ ۱۹۷۰ء ص ۱۲۸
[3] ڈاکٹر مسیح الزماں۔ معیار و میزان۔ الہ آباد ۱۹۶۸ء ص ۲۵۸
[4] گنجینۂ غالب۔ پبلیکیشنز ڈویژن نئی دہلی۔ ۱۹۶۹ء ص ۸۰

(ماہ نامہ آجکل دہلی بابتہ فروری ۱۹۵۰ء) میں شائع کرائے تھے[1]
یہ چاروں خط پروفیسر سید احتشام حسین کے ایک مجموعہ مضامین میں بھی بعد کو شامل کیے جاچکے ہیں[2] اور انھیں "غالب کی نادر تحریریں" مرتبہ خلیق انجم میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان خطوط کے بارے میں تفصیلی معلومات اس لیے فراہم کرنا پڑیں کہ یہ غالب کے اردو خطوط کے عام طور پر دستیاب ہوجانے والے مجموعوں میں سردست موجود نہیں ہیں۔

بہرحال مولوی نعمان احمد کے نام غالب کے خط کا مندرجہ بالا اقتباس بتاتا ہے کہ اردو مکتوب نگاری کے ساتھ ساتھ انھوں نے کبھی کبھی فارسی میں بھی خطوط لکھنا جاری رکھا۔ شہزادہ بشیرالدین کے علاوہ غالب کا فارسی زبان میں کرنل ڈدرو ینڈسے (چیف سکریٹری) کو بھی ایک خط روانہ کرنا ثابت ہوتا ہے جو ۱۸۵۰ء کے کافی بعد بھیجا گیا ہے۔ غالب کے ایک خط مورخہ ۱۲ رمئی ۱۸۶۱ء (بنام مرزا عباس بیگ) میں اس کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

"اب میں نے کرنل ڈدرو ینڈ صاحب بہادر چیف سکرتر کو فارسی خط بھیجا ہے۔"[3]

غالب کے فارسی زبان میں مکتوب نگاری ترک کرنے اور اردو میں خطوط نگاری کے آغاز سے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ بھی سن لیجیے۔ سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی گیاوی نے اپنے دادا کے نام غالب کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط ۱۹۳۹ء میں نادر خطوط غالب کے نام سے شائع کرائے ہیں۔ یہ خطوط دراصل جعلی ہیں۔ اس کتاب میں رسا ہمدانی کے دادا سید کرامت حسین ہمدانی بہاری کے نام غالب کا ایک خط مورخہ یکم جنوری ۱۸۵۱ء بھی شامل ہے جو درج ذیل ہے:

"دہلی۔ یکم جنوری ۱۸۵۱ء
شاہ صاحب کو غالب ناتواں کا سلام پہونچے۔ یہ پہلا خط ہے جو میں تمھیں اردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔ زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا آج سے متروک ہے[4]..."

ظاہر ہے کہ غالب کا یہ خط جعلی ہے۔ یکم جنوری ۱۸۵۱ء کو غالب کا پہلا اردو خط لکھنا کیونکر درست تسلیم کیا جاسکتا ہے جبکہ اس تاریخ سے قبل کے متعدد اردو خطوط روشنی میں آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ یکم جنوری ۱۸۵۱ء کے بعد بھی غالب نے فارسی میں خطوط کا لکھنا ترک نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں ثابت کیا جاچکا ہے۔ غالب پر تحقیق و تنقید کرنے والے صاحبان قلم رسا ہمدانی کی کتاب نادر خطوط غالب میں شامل بیشتر خطوط کو جعلی ثابت کرچکے ہیں[5]

غالب کے اردو خطوط کی اشاعت کا خیال خود غالب کی زندگی میں کئی حضرات کو ہوا۔ جن میں ممتاز علی خاں، منشی شیو نرائن آرام اور منشی جواہر سنگھ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ممتاز علی خاں نے عود ھندی کے نام سے غالب کی چند دوسری تحریروں کے ساتھ ۱۳۷ خطوط شائع کرائے۔ عود ھندی پہلی بار ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ (۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء)

---

[1] خلیق انجم: غالب کی نادر تحریریں۔ مکتبہ شاہراہ دہلی۔ ۱۹۶۱ء فٹ نوٹ۔ ص ۷۔
[2] سید احتشام حسین: ذوق ادب اور شعور۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۳ء ص ۱۳۶ تا ص ۱۴۱
[3] بحوالہ نادم سیتاپوری: مضمون "غالب کے خطوط افراد خاندان کے نام" مطبوعہ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ غالب نمبر فروری۔ مارچ ۱۹۶۹ء طبع ثانی ص ۸۶ (غالب کا یہ خط بھی سردست خطوط مخاطب کے عام مجموعوں میں شامل نہیں ہے۔ کاظم علی خاں)
[4] سید محمد اسماعیل رسا ہمدانی گیاوی: نادر خطوط غالب کاشانۂ ادب لکھنؤ۔ ۱۹۳۹ء ص ۲۔
[5] مالک رام اور قاضی عبدالودود نادر خطوط غالب کے ایک کے علاوہ سارے خطوط نقلی ثابت کرچکے ہیں۔ نادر خطوط غالب پر جامعہ مارچ ۱۹۴۲ء (ص ص ۱۷۳۔۱۹۰) میں مالک رام اور معیار (پٹنہ) جنوری ۱۹۴۳ء میں قاضی عبدالودود کے تبصرہ ملاحظہ ہوں۔ یہ اطلاعات کتاب "غالب کی نادر تحریریں" از خلیق انجم (دہلی ۱۹۶۱ء فٹ نوٹ ص ۲۵) پر مبنی ہیں (کاظم علی خاں)

کو مطبع مجتبائی میرٹھ سے غالب کی زندگی میں ہی کافی انتظار کے بعد شائع ہوئی۔ اس وقت اس کی قیمت ایک روپیہ فی جلد تھی[1]

ادبی خطوطِ غالب مرتبہ مرزا محمد عسکری میں عود ہندی کی اشاعت پہلی بار ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء) میں بتائی گئی ہے[2] جو درست نہیں۔ اس تسامح کا سبب یہ ہے کہ عود ہندی کی تیاری میں کافی تاخیر ہوئی۔ چودھری عبدالغفور سرور، صاحب عالم اور شاہ عالم کو لکھے جانے والے غالب کے ۱۳۱ خطوط جب ۱۸۶۲ء تک جمع ہوگئے تو عبدالغفور سرور نے ان ۱۳۱ خطوں کے مجموعہ کو مہرِ غالب کے نام سے موسوم کر کے ایک دیباچہ لکھا۔ اس سلسلے میں مصرعِ تاریخ "تاریخ بھی اس کی مہرِ غالب لکھی" سے مرزا محمد عسکری کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ عود ہندی کا سن اشاعت ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء) ہے حالانکہ یہ دراصل عبدالغفور سرور کے جمع کردہ ۱۳۱ خطوط کی ترتیب کی تکمیل کا سال ہے۔ مکمل عود ہندی ممتاز علی خاں کے جمع کردہ ۱۳ خطوط کی شمولیت کے بعد ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں ہی شائع ہو سکی تھی۔

خطوطِ غالب کا ایک اور اہم مجموعہ اردوئے معلیٰ ہے اس کی ترتیب غالب کی زندگی میں ہوئی لیکن اشاعت غالب کی وفات (۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) کے ۱۹ دن بعد ۲۱ ذیقعد ۱۲۸۵ھ (۶ مارچ ۱۸۶۹ء) کو ہوئی تھی[3] مرزا محمد عسکری کا یہ قول کہ اردوئے معلیٰ غالب کی زندگی میں ہی شائع ہو چکی تھی[4] درست نہیں۔ عسکری صاحب کو تسامح ہوا اور انھوں نے کتاب کے غالب کی زندگی میں زیرِ طبع ہونے کو شائع ہونے سے تعبیر فرمایا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر عبداللطیف نے اردوئے معلیٰ کو خطوطِ غالب کا پہلا مجموعہ لکھا ہے[5] جو درست نہیں۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ عود ہندی پہلی بار ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں شائع ہوئی لیکن یہ غالب کے اردو خطوط سے متعلق بہ لحاظِ اشاعت پہلی کتاب نہیں ہے۔ عود ہندی کی اشاعت سے کئی سال قبل اگست ۱۸۶۵ء میں غالب نے خود اپنے ذاتی مصارف سے اپنا ایک طویل اردو خط "غالب نامہ" شائع کرایا تھا۔ یہ مطبع محمدی (محمد مرزا خاں) دہلی سے شائع ہوا تھا[6]۔ یہ طویل خط مرزا رحیم بیگ، مصنف ساطع برہان کے نام ہے جو بعد کو عود ہندی میں بھی شامل کر لیا گیا[7]۔ اس طرح عود ہندی غالب کے اردو خطوط میں بہ لحاظِ اشاعت اولیت نہیں رکھتی۔

"نامۂ غالب" کے علاوہ عود ہندی سے قبل ایک اور کتاب "انتخابِ غالب" کے نام سے بھی شائع ہوئی تھی جس میں غالب کے بارہ عدد خطوط شامل ہیں اور اس کو خود غالب نے ہی مرتب کیا تھا۔ انتخابِ غالب کی پہلی اشاعت عود ہندی سے قبل ۱۸۶۶ء میں ہوئی تھی[8]۔ ان حقائق کی بنیاد پر ڈاکٹر عبادت بریلوی کا یہ قول کہ "خطوطِ غالب کا پہلا مجموعہ عود ہندی کے نام سے شائع ہوا[9]۔ درست

---

[1] مالک رام: ذکرِ غالب دہلی ۱۹۶۴ء ص ۲۰۸، [2] مرزا محمد عسکری: ادبی خطوطِ غالب۔ ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ ۱۹۶۷ء ص ۲۔
[3] مالک رام: ذکرِ غالب ص ۱۰۲، [4] مرزا محمد عسکری: ادبی خطوطِ غالب۔ ص ۶ [5] ڈاکٹر عبداللطیف: غالب (اردو ترجمہ معین الدین قریشی) جہانگیر بکڈپو دہلی ص ۲۹ [6] مالک رام: ذکرِ غالب ص ۲۲۰۔
[7] مرزا غالب: عود ہندی (مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حسنین) شائع کردہ رام نرائن لال الہ آباد۔ ۱۹۶۹ء ص ۲۳۰
[8] مالک رام: ذکرِ غالب ص ۲۱۶ تا ص ۲۱۷ [9] ڈاکٹر عبادت بریلوی: غالب اور مطالعۂ غالب، سکینہ پبلشنگ ہاؤس دہلی ڈی لکس ایڈیشن جون ۱۹۷۰ء ص ۲۷۹

نہیں ثابت ہوتا۔ کتاب **انتخاب** غالبؔ کے ۱۳۴۵ھ کے ایک ایڈیشن کے بارے میں نادم سیتاپوری نے بھی بعض اطلاعات فراہم کی ہیں[1]

غالب نے کچھ عرصے تک اردو خطوط شائع کرنے کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ منشی شیو نرائن کو ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے:

"اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ آپس کے معاملات اور دل پر ظاہر ہوں؟ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلافِ طبع ہے۔"

یہ عبارت جس خط سے ماخوذ ہے اس کی تاریخ تحریر شیخ محمد اکرام نے ۱۶ ر نومبر ۱۸۵۸ء بتائی ہے[2] جو درست نہیں۔ اس خط کی صحیح تاریخ تحریر ۱۸ ر نومبر ۱۸۵۸ء (پنجشنبہ) ہے۔[3] اور اسی تاریخ کو مالک رام نے بھی درست تسلیم کیا ہے[4] مرزا تفتہ وغیرہ کو بھی غالبؔ نے اپنے اردو خطوط کی اشاعت سے روکا تھا۔ لیکن غالبؔ کے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ انھوں نے اپنے جن اردو خطوط کو اپنی "سخنوری کے شکوہ کے منافی" سمجھا اور جن کا طبع کرنا اپنے خلافِ طبع قرار دیا وہ ان کی شہرت اور مقبولیت کے اہم ستون ثابت ہوئے اور فارسی نثر کی جس پنج آہنگ جیسی کتاب پر غالبؔ کو ناز تھا وہ آج ان کے اردو خطوط کی شہرت کے مقابلے میں گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں کا یہ قول شاید غلط نہیں کہ "غالبؔ اپنی صلاحیتوں کے متعلق کبھی صحیح رائے قائم نہیں کر سکے۔"

بعض اصحاب[5] کا خیال ہے کہ غالبؔ اپنے اردو خطوط کی اشاعت کا تصور بھی نہ رکھتے تھے اور انھوں نے اردو خطوط سرسری طور پر لکھے تھے۔ یہ بات ۱۸ ر نومبر ۱۸۵۸ء کے مذکورہ بالا خط (بنام منشی شیو نرائن) سے قبل تک کے لکھے جانے والے خطوط کے لیے تو صحیح ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے بعد یقیناً غالبؔ کو اپنے اردو خطوط کی اشاعت کا احساس ہو گیا تھا اور انھوں نے اس تاریخ کے بعد جو خطوط لکھے ہوں گے وہ یہ سمجھ کر لکھے ہوں گے کہ ان کی اشاعت بھی ہوگی۔ شیخ محمد اکرام نے بھی یہی رائے قائم کی ہے اور اس امر کی تصدیق بعد کے ان کے متعدد خطوط سے بھی ہو جاتی ہے۔ جن میں غالبؔ نے اپنے اردو خطوط کی اشاعت کی آرزو اور خلشِ انتظار کا بار بار اظہار کرتے ہوئے اشاعت میں تاخیر کے شکوے کیے ہیں۔ غالبؔ نے بعد کو اردو خطوط طبع کرانے کی اجازت منشی ممتاز علی خاں وغیرہ کو دے دی تھی۔ چنانچہ ان کی اشاعت میں تاخیر غالبؔ کو بعد میں گراں گزر رہی تھی۔ خواجہ غلام غوث بےخبر کے نام غالبؔ کے خط کی حسب ذیل عبارت اسی امر کی مظہر ہے!

"..... اجی حضرت یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں۔ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے فی الحال پنجاب احاطے میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے خطوط آپ کو پہنچے ہیں وہ سب یا ان کی نقل بطریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب،

---

[1] نادم سیتاپوری: غالبؔ نام آورم۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۲ء ص ۶۱ تا ۶۵

[2] شیخ محمد اکرام: غالبؔ نامہ۔ احسان بک ڈپو لکھنؤ ص ۲۲۸

[3] مرزا غالبؔ: **اردوئے معلّٰی**۔ شائع کردہ رام نرائن لال الہ آباد ص ۳۵۰ (خط نمبر ۳۷۵)

[4] مالک رام: خطوط غالبؔ۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۲ء ص ۴۲۹

[5] مثلاً ڈاکٹر سید محمد حسنین وغیرہ نے یہی رائے قائم کی ہے۔ ملاحظہ ہو مقدمہ عود ہندی۔ مرتبہ محمد حسنین ۱۹۶۹ء ص ۱۰

دہی پارسل ہو[1]...

خواجہ غلام غوث بے خبر ہی کے نام ایک اور خط میں غالبؔ اردو خطوط کی طباعت کے سلسلے میں اپنی آرزومندی کا اظہار یوں کرتے ہیں!

"... ہاں حضرت وہ مجموعہ کب چھپے گا۔ بالفتح چھپے گا یا بالضم۔ چھپ چکا ہو تو حق التصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے فقیر کو بھیجیے[2]..."

اپنے اردو خطوط کی ترتیب و اشاعت میں غالبؔ نے بعد کو خود پوری پوری دلچسپی لی ہے۔ مرزا علاء الدین احمد خاں علائیؔ کے نام غالبؔ کے متعدد خطوط اس امر کے شاہد ہیں۔ غالبؔ ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں علائی کو لکھتے ہیں۔

"مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع "اکمل المطابع" میں چند احباب میرے مسودات اردو کے جمع کرنے اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگتے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا، وہ جہاں بھیجنا ہوا وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمھارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسبیل ڈاک بھیج دو گے .... تو موجب میری خوشی کا ہوگا[3]..."

متذکرہ بالا خط کا جواب علائیؔ نے غالبؔ کے حسب دل خواہ نہ دیا۔ لہٰذا غالبؔ نے ایک اور خط میں قدرے برہمی کے ساتھ اپنے اردو خطوط کے بارے میں علائیؔ کو پھر لکھا ہے:

"... میرے خطوط اردو کے ارسال کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا تمھارے حسن طبع پر تم سے بعید تھا میں سخت بے مزہ ہوا۔ اگر بے مزگی کے وجوہ لکھوں، تو شاید ایک تختہ کاغذ سیاہ کرنا پڑے۔ اب ایک بات موجز و مختصر لکھتا ہوں۔ سنو بھائی، اگر ان خطوط کا تم کو اخفا منظور ہو اور شہرت تمھارے منافی طبع ہے، تو ہرگز نہ بھیجو، قصہ تمام ہوا۔ اور اگر ان کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو اور کسی متصدی سے نقل اتروا کر چاہو کسی کے ہاتھ، چاہو بسبیل پارسل، ارسال کرو لیکن جلد، خدا کے واسطے، کہیں غصے میں آ کر..... اصل خطوط نہ بھیج دینا؟ کہ یہ امر میرے خلافِ مقصود ہے[4]..."

ان حقائق کی روشنی میں غالبؔ کا بعد کو اپنے اردو خطوط کی ترتیب و اشاعت میں پوری پوری دلچسپی لینا ثابت ہوتا ہے اور یہ کہنا کہ غالبؔ کو اپنے اردو خطوط کی اشاعت کا گمان بھی نہ تھا اور انھوں نے رقعات سرسری لکھے ہیں، قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے مالک رامؔ نے لکھا ہے کہ اپنے اردو خطوط کی اشاعت کے جس کام کو منشی شیو نرائن کے کہنے پر غالبؔ نے پہلے ٹال دیا تھا۔ اسی کام میں بعد کو خود سرگرمی سے حصہ لیا۔ اس سلسلے میں شیخ محمد اکرام کا یہ نظریہ درست معلوم ہوتا ہے کہ:

"غالبؔ نے پہلے کی بہ نسبت بعد کو بہت زیادہ رقعات قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھے[5]"

اس طرح ہم غالبؔ کے اردو خطوط کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے حصے میں نومبر ۱۸۵۸ء تک کے وہ خطوط رکھے جا سکتے ہیں۔ جو بقول غالبؔ قلم سنبھال کر نہ لکھے گئے تھے۔ جبکہ دوسرے حصے میں ۱۷ر نومبر ۱۸۵۸ء کے بعد کے خطوط شامل کیے جا سکتے ہیں جو عام طور پر غالبؔ نے اشاعت کے احساس کے ساتھ قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھے ہوں گے۔ یہ کام مہیش پرشاد، غلام رسول مہرؔ اور مالک رامؔ وغیرہ کی تحقیقات کی روشنی میں آسانی سے سرانجام دیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان حضرات کی تحقیقی کاوشوں

---

[1] مرزا غالبؔ: عود ہندی۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد حسنین الہ آباد ۱۹۶۹ء ص ۲۱۹ [2] مرزا غالبؔ: عود ہندی۔ ص ۲۰۱

[3] مالک رام: خطوط غالبؔ۔ ۱۹۶۲ء۔ ص ۳۹۶، [4] ایضاً ص ۳۹۷

[5] شیخ محمد اکرامؔ: غالب نامہ۔ ص ۲۲۸۔



گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں ۵ مارچ ۷۴ء کو راج بھون لکھنؤ میں شری ہیم وتی نندن بہوگنا کو وزیر اعلیٰ کے عہدے کا حلف دلا رہے ہیں



شری اکبر علی خاں گورنر اتر پردیش یوم جمہوریہ کے موقع پر لکھنؤ میں پولو گراؤنڈ پر فوج اور پولیس کی مشترکہ پریڈ کی سلامی لیتے ہوئے



شری اکبر علی خاں لکھنؤ ریزرو پولیس لائن کے
میدان میں پولیس کی سالانہ پریڈ کی سلامی
لیتے ہوئے

گورنر شری اکبر علی خاں بابا فرید میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام قوالی کی ایک تقریب میں ۲۳ دسمبر ۱۹۷۳ء کو حسب بینرٹ کی قوالی سن رہے ہیں۔ سامنے کی صف
میں خالی کرسی کے بعد ڈائرکٹر انفارمیشن شری ترومنی ترپاٹھی بیٹھے ہوئے ہیں







لی خاں گورنر اتر پردیش ۲۲ دسمبر ۱۹۷۳ء کو بابا فرید میموریل سوسائٹی اتر پردیش کے زیر اہتمام لکھنؤ میں بابا فرید کی یاد میں ہونے والی تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے



ری ہیم وتی نندن بہوگنا ۲۹ جنوری
رویندرالیہ لکھنؤ میں (ماسٹیں) قبائل
مت کے لوک ناچ کی تقریب کا افتتاح
ے (داھے) ناچ کا ایک منظر

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کانپور میں یوم جمہوریہ کے موقع پر ایک بڑے جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے







) وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۳ جنوری ۱۹۷۴ء کو نرورا ضلع
بں ملک کے چوتھے ایٹمی توانائی منصوبے کا سنگ بنیاد رکھا۔ تصویر
ں گاندھی اس موقع پر بجلی کا بٹن دبا کر سنگ بنیاد کے پردہ کو ہٹاتے
کھائی دے رہی ہیں (دیا ئیں) وزیر اعلیٰ تیری بہوگنا ۲۰ جنوری ۷۴ء
ں کی یادگار (لکھنؤ) پر ”دیپ دان“ کرتے ہوئے



کے نتیجے میں غالب کے بہت سے اردو خطوط کی تاریخوں کا تعین ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف نے بھی اس سلسلے میں ایک خاکہ پیش کیا ہے، جس کے تحت موصوف نے خطوط غالب کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے اور خطوط کا زمانۂ تحریر بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔[۱]

خطوط غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ غالب کے دوست اور ہمعصر انشا پرداز خواجہ غلام غوث بے خبر نے بھی غالب کے خطوط کی ترتیب میں حصہ لیا ہے۔ غالب نے بے خبر کو ہدایت کی تھی کہ خطوط سے وہ مضامین حذف کر دیئے جائیں جو لائق اعلان و اشاعت نہ ہوں۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا خیال ہے کہ ۔۔۔۔ بے خبر نے غالب کی مرضی کے خلاف مجموعہ میں ہر قسم کے خطوط شامل کر دیے[۲] حالانکہ بے خبر نے غالب کے نام اپنے ایک خط میں ان موضوعات کو حذف کر دینے کی اطلاع دی ہے جو خطوط میں اعلان کے لائق نہ تھے۔ خواجہ غلام غوث بے خبر نے اس سلسلے میں غالب کو خود تحریر کیا ہے:

"چودھری عبدالغفور کے پاس سے آپ کے خطوط اور ان کا دیباچہ آ گیا۔ میں نے سوائے اس کے کہ آپ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ کالپی، لکھنؤ اور بریلی اور گورکھپور اور اکبر آباد سے تحریریں آپ کی فراہم کیں۔ خود سب کو دیکھا جو مضامین لائق اعلان کے نہ تھے ان کو نکال ڈالا۔ کاتب لکھ رہا ہے۔"[۳]

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ بے خبر متذکرہ بالا عبارت میں غالب کو یقین دہانی کرانے کے باوجود عود ہندی میں اپنے نام غالب کا ایک ایسا خط شائع کرا دیتے ہیں جسے غالب لائق اشاعت نہیں سمجھتے تھے۔ غالب اپنے ایک خط میں بے خبر کو لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔ آپ کو معلوم ہے کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفیٰ خاں حسرتی کو کبھی اردو خط نہیں لکھا۔ ہاں ذکا کو غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت میں منشاء اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے۔ نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے کہار آیا خط لایا آم پہنچے کچھ بانٹے کچھ کھائے بچوں کو دعا بچوں کی بندگی مولوی الطاف حسین کو سلام۔ یہ تحریر اس طبقے میں گئی ہے غرض کہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں یہ لائق شمول مجموعہ نثر اردو کہاں ہے۔ یقین جانتا ہوں کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کریں گے۔"[۴]

خواجہ غلام غوث بے خبر کا غالب کے خلاف طبع اس خط کو عود ہندی میں طبع کرانا ایک دلچسپ لطیفہ نظر آتا ہے۔ مگر یہ ایک قابل غور امر ہے۔ عجب نہیں کہ کوئی اسے بے خبر کی بھول چوک کا نتیجہ قرار دے۔ لیکن بعض امور کے پیش نظر راقم الحروف کو بے خبر کا اس خط کو شائع کرا دینا دیدہ و دانستہ نظر آتا ہے۔ غالب کے اس خط سے غالب کے اس دروغ مصلحت آمیز پر روشنی پڑتی ہے جس کو وہ بے خبر سے اکثر برتا کرتے تھے۔ غالب نے ذکا کو متعدد اردو خطوط لکھے ہیں[۵]۔ مگر ان خطوط کے بعض مطالب سے غالب دراصل بے خبر کو باخبر نہ کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے غالب نے بے خبر کو تحریر کیا ہے کہ ذکا کے نام غالب نے اردو خطوط نہیں لکھے ہیں اور محض کلام کی اصلاح اردو میں کی ہے۔ اس مضمون میں غالب اور ذکا یا غالب اور بے خبر کے باہمی تعلقات پر بخوف طوالت روشنی نہیں ڈالی جا رہی ہے۔

★ غالب اور ذکا کے تعلقات پر ضیاالدین شکیب نے مفید مواد پیش کیا ہے۔[۶]

---

[۱] ڈاکٹر سید عبداللطیف: غالب (اردو ترجمہ از معین الدین) جہانگیر بکڈپو دہلی ص ص ۴۲ تا ۵۱ [۲] خلیق انجم. غالب کی نادر تحریریں! مکتبہ شاہراہ دہلی۔ ۱۹۶۱ء۔ ص ۱۱ [۳] بحوالہ ادیس احمد ادیب: تنقیدیں: (مجموعہ مضامین ادیس احمد ادیب) اردو پبلشنگ ہاؤس الہ آباد۔ ۱۹۴۴ء ص ۱۰۵ [۴] عود ہندی۔ ص ۲۸۷ [۵] اردوئے معلیٰ، ص ۷ تا ۲۹ [۶] ضیاء الدین احمد شکیب: غالب اور ذکا غالب اکیڈمی نئی دہلی فروری ۱۹۷۲ء

غزل

شوکت پردیسی

دل جل رہا ہے آہ شرربار کے بغیر
دامن اُلجھ گیا ہے گل و خار کے بغیر

جب تک کٹھن تھی راہ اُبھرتے رہے قدم
اب کانپتا ہوں منزلِ دشوار کے بغیر

آئینۂ خیال میں ایسے بھی عکس ہیں
جن سے مجھے لگاؤ ہے دیدار کے بغیر

ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ خود بخود
امید بندھ گئی کسی آثار کے بغیر

کیا کیا نہ انتشار رہا دوستوں کے ساتھ
اب دل ہے پُرسکوں کسی غم خوار کے بغیر

ایسی بھی نامراد نہیں ہے مری حیات
زندہ رہوں میں دولتِ کردار کے بغیر

اس فیصلے پہ اٹ گئی دنیا ہے اعتبار
ثابت ہوا گناہ، گنہگار کے بغیر

محفل بھی تھی چراغ بھی تھا روشنی بھی تھی
اب کچھ نہیں ہے ایک نگہ دار کے بغیر

ہے ایک سنگِ راہ نشانِ قدم مرا
میں خود کو ڈھونڈ لیتا ہوں بازار کے بغیر

ہے زندگی سے پیار تو کیا سایہ اور دھوپ
چل تیز گام سایۂ دیوار کے بغیر

طوفاں جو تھم گیا تو وہ ساحل ملا کہ بس
کشتی ہی غرق ہوگئی منجدھار کے بغیر

سمجھو اُسی کو مصلحت اندیش و غم گسار
جو دل کی بات جان لے اظہار کے بغیر

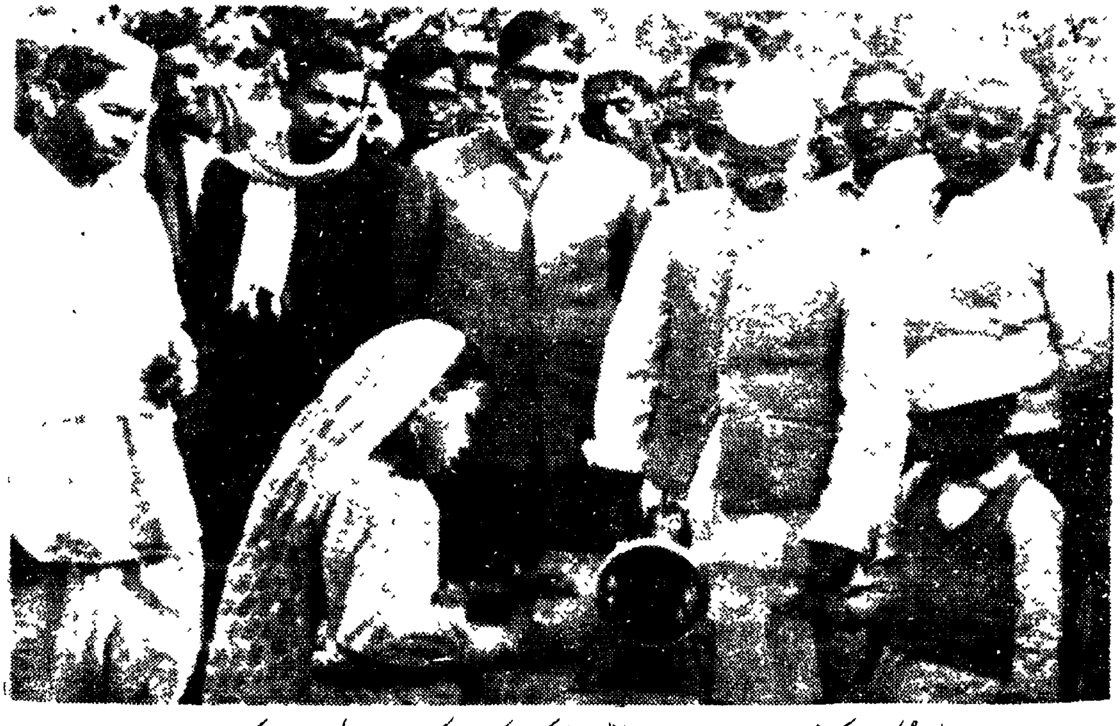
ہوتی نہ آرزو تو نہ ہوتا دیارِ غم
راحت کو کون ڈھونڈتا آزار کے بغیر

شوکتؔ! جہانِ فکر میں کوئی بھی روشنی
ملتی نہیں ہے دیدۂ بیدار کے بغیر

امیر حسن

یوپی کی قبائلی خواتین

قبائلی سماج میں عورتوں کے مرتبے، حیثیت اور اہمیت کے بارے میں کوئی عام رائے قائم کرنا اگرچہ آسان نہیں ہے مگر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ خاندانی اور سماجی معاملات میں ان



ایک بھکسا لڑکی شری دشوا ناتھ پرتاب سالق ڈپٹی منسٹر مرکزی حکومت کے سامنے سلائی کا مظاہرہ کر رہی ہے

کا دخل و اختیار آج کل کے 'مہذب' سماج کی خواتین سے کہیں زیادہ ہے، جہاں اب بھی مرد کا سکہ رائج ہے

شادی بیاہ

بہت سے قبائل میں طے شدہ شادیوں کا رواج بڑھ رہا ہے لیکن اب بھی لڑکیوں کی مرضی کے خلاف شادی شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ برفانی علاقے کے "بھوٹیا" اور "راجی" اور ترائی کے "بھوکسا" اور جنوبی یوپی کے "سہاریا" قبیلے شریک حیات کے انتخاب میں اپنی لڑکیوں کو کافی آزادی دیتے ہیں۔

پتھورا گڑھ کے دھارچولا علاقہ کے بھوٹیا لوگوں میں ایک سماجی ادارہ "رنگ بنگ" قائم ہے جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تفریح اور رقص کے لیے ایک دوسرے سے بلا روک ٹوک ملا کرتے ہیں۔ شریک زندگی کے انتخاب اور ابتدائی جنسی تعلیم میں یہ ادارہ اہم رول ادا کر رہا تھا مگر غیر قبائلی مصلحوں کی کوشش سے "رنگ بنگ" اب آخری سانسیں لے رہا ہے۔

اغوا کر کے شادی کرنے کا رواج مرزاپور کے کوروا اور بھوٹیا لوگوں میں رائج تھا مگر اب یہ رواج بھی قریب قریب ختم ہو گیا ہے۔ البتہ جو بھوٹیا خاندان شادی کے اخراجات کے

کفیل نہیں ہو سکتے وہ اس طریقۂ شادی کی اجازت دے دیتے ہیں۔ اس طرح وہ بارات و نیز شادی کے دیگر اخراجات سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ مگر اس قسم کی شادی میں اب پہلے کی سی رومانیت اور بانکپن باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اب دولہن کو محبت کے صبر آزما دور سے گزر کر تسخیر کرنے کی رومان پرور یاد ہی باقی رہ گئی ہے جو آج کے بھوٹیا نوجوان کے دل کو ایک بار گرما ضرور دیتی ہے۔

بعض قبائل کم سنی کی شادی اور سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد ترین شخص رسومات کو انجام دیتا ہے۔ راجی لوگوں میں دولہا دولہن کو زمین پر ایک سفید فرش پر بٹھاتے ہیں اور دولہن گیلی ہلدی دولہا کی پیشانی پر لگاتی ہے۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کو شکر یا گڑ کھلاتے ہیں۔ ان رسموں کے بعد دونوں کو زن و شوہر تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ بھوکسا، تھارو، کول، گونڈ اور دوسرے قبائل میں برہمنوں کے ذریعہ ویدک منتروں کو پڑھوا کر شادی کرانے کی رسم بلاشبہ جدید ہے۔



نینی تال ضلع کی بھکسا عورتیں اور بچے

گونے کا طریقہ بھی اپنا رہے ہیں مگر ناپسندیدگی کی صورت میں بیوی کو شوہر سے قطع تعلق کر لینے کا پورا حق حاصل ہے۔ درحقیقت یو پی کے قدیم باشندے شادی کو آسمانی یا روحانی رشتہ تسلیم نہیں کرتے ان کی نگاہ میں شادی فریقین کے درمیان ایک معاہدہ ہے جسے وقت ضرورت منسوخ کیا جا سکتا ہے بعض قبائل کی نظر میں شادی کی تو کوئی مذہبی حیثیت بھی نہیں ہے، مثلاً کورو الوگوں میں شادی کے وقت کوئی مذہبی پیشوا موجود بھی نہیں ہوتا بلکہ قبیلے کا بزرگ

یو پی کے قدیم باشندوں میں اگرچہ تعداد ازدواج کا عام رواج نہیں ہے مگر اس کی ممانعت بھی نہیں ہے اکثر قبیلوں کے سربراہوں یا بااثر لوگوں کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوتی ہیں۔ کئی بھائیوں کے درمیان ایک یا ایک سے زیادہ مشترکہ بیویاں رکھنے کا رواج دہرہ دون کے جونسار علاقے اور اس سے ملحق روائیتی (ضلع اتر کاشی) اور جون پور (ضلع ٹہری گڑھوال) میں اب بھی پایا جاتا ہے۔ اس سوسائٹی میں بیویوں کو کافی آزادی حاصل ہے اور میکے

سے ان کا گہرا تعلق قائم رہتا ہے۔ سسرال کی مشقت بھری زندگی اور غیر رومانی ماحول سے وقتی چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے کم عمر بیویاں کسی نہ کسی بہانے میکے جاتی رہتی ہیں جہاں انھیں خانہ داری سے نجات مل جاتی ہے لیکن اب رفتہ رفتہ مشترکہ بیوی کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔

علاحدگی اور طلاق نیز دوسری شادی وغیرہ مسائل کے بارے میں یوپی کے قدیم باشندے ایک عملی نظریہ رکھتے ہیں، گو کہ زن و شوہر دونوں کو علاحدگی حاصل کرنے کا اختیار رہتا ہے۔ آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ اس معاملے میں عموماً نصف بہتر کی طرف سے پہلا قدم اٹھایا جاتا ہے۔ جونساری خواتین کو اقتصادی بنا پر طلاق لینے کا حق حاصل ہے۔ کوروا لوگوں میں اگر کوئی عورت کسی ہریجن کے ہاتھ سے کھانا کھالے تو شوہر کو اسے طلاق دینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اکثر قبائل میں شوہر یا ماحول سے غیر مطمئن ہونے کی صورت میں کسی اور قبائلی مرد سے جنسی تعلق قائم کر لینا یا اس کے ساتھ فرار ہو جانا معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے مگر ایسے معاملات برادری کی پنچایت کے سامنے ضرور پیش ہوتے ہیں جو کہ عورت کو علاحدگی کی اجازت اس شرط کے ساتھ دے دیتی ہے کہ اغوا کرنے والا مرد مظلوم شوہر کو شادی کے اخراجات اور برادری کو بطور تاوان دعوت دینا قبول کرے۔ پنچایت کے اس فیصلے پر عمل درآمد کے بعد عموماً فریقین کے دل میں کوئی کدورت باقی نہیں رہتی۔

شادی چونکہ قابل فسخ ہے اس لیے دوبارہ شادی کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اس کا عام رواج بھی ہے۔ بیواؤں کو شادی کرنے کا اختیار بغیر کسی پابندی کے یا کچھ پابندیوں کے ساتھ حاصل ہے۔ مثلاً کوروا اور بھوٹیا لوگوں میں مرحوم شوہر کے چھوٹے بھائی کو بیوہ بھاوج کے ساتھ شادی کرنے کا پہلا حق ہے۔ عموماً دوسری شادی سادگی سے کی جاتی ہے۔ مگر جھانسی کے سہاریا قبیلے میں ایک "اعلیٰ پیمانہ" کی "رسم پاکیزگی" کے بعد ہی علاحدہ ہونے والی یا طلاق شدہ عورت یا بیوہ کو دوبارہ شریک حیات کے زمرے میں داخل کیا جاتا ہے۔

تفریح

قبائلی خواتین رقص اور موسیقی کی بہت شوقین ہوتی ہیں۔ جونساریوں میں باژگی اور مرزاپوری قبائیلیوں میں گھسیا لڑکیاں غضب کا رقص کرتی ہیں۔ باژگی رقاصاؤں کو جونساری دیوتا مہادیو کے مندر کے دروازے پر ناچنے کا خصوصی حق حاصل ہوتا ہے۔ جنوبی یوپی کے قبائلی رقص خصوصاً مرزاپوری کرما اور باندہ کے دادر رقص بہت جاندار ہوتے ہیں۔ اکثر قبائلی خواتین رقص سے پہلے شراب کا استعمال کرتی ہیں جس سے ان کے رقص میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔

اقتصادی حالت

قبائلی خواتین کے شوق رقص و موسیقی کے تذکرے سے اس غلط فہمی کا امکان ہے کہ قبائلی عورتیں اپنا بیشتر وقت تفریح اور رقص و سرود میں صرف کرتی ہیں جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ بقول غالبؔ ع

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو

دن بھر کی جانفشانی کے باوجود ان قبائیلیوں کو دو وقت کا کھانا بھی مشکل سے ملتا ہے۔ اس لیے یہی رقص و موسیقی کسی حد تک غم غلط کرنے اور حیات کے گوناگوں مسائل کو عارضی طور سے فراموش کرنے کے ذرائع ہیں۔

عورتیں کھیتوں اور کھلیانوں میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں اور خاندان کی کفالت کی ذمہ داری اس طرح نبھاتی ہیں جیسے ان کے مرد نبھاتے ہیں۔ بھوٹیا عورتیں خوبصورت قالین اور اونی کپڑے بننے میں اپنا جواب نہیں رکھتی ہیں۔ تھارو عورت کی کشیدہ کاری اور موبج کا کام بے مثال ہوتا ہے۔ عورتوں کی اقتصادی آزادی اور خاندان کے اخراجات پورا کرنے میں مردوں کا ہاتھ بٹانے کی وجہ سے قبائلی سماج میں جنسی مساوات قائم ہے۔

مسائل

زمانہ جس تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور حالات جس انداز سے بدل رہے ہیں اس کے باعث یوپی کے قدیم باشندوں اور ان کی خواتین کو نئے نئے مسائل درپیش ہیں۔ مرزاپور کے قبائلی علاقے کی

(بقیہ صفحہ ۵۰ پر)

ڈاکٹر اکبر حیدری

دیوانِ میر کا قدیم ترین مخطوطہ (۳)

(سلسلے کے لئے دیکھئے نیا دور مارچ ۱۹۷۴ء)

ترکیب بند

بند نمبر ۲ شعر ۴

کیا جسم ہے اور غم کو ہم سے   دل کو اپنے تو مار دیکھا[1]

بند ۸ شعر ۴، ۷

رہتے تھے جدا غم و الم سے   کاہے کو کسی سے دل لگا تھا[2]

مضطر میں ہوا ہائے اپنا   ٹک اور رہے تو جی گیا تھا

بند ۹ شعر ۷

لیتے گو نہ سانس حسرت حو لے   دل مرا ہے کو جیے سلامت[3]

مثنوی عاشق و معشوق (مناجات بطور ربط: عاشقاں مورد آفات وحادثات)

شعر ۱۲

رہے پھوڑے مژہ اس کی کاوش کبھی   رہے یاد تا حشر رخسار کی[4]

در تعریف عشق جاناں کر دہ دار دلہا بریاں افتاد

شعر ۱۲

تجھی سے تھا داغ کا احوال بند   غرض یکیاں ہیں تری لا تعد[5]

داغ از قصہ جانکاہ کہ پیش یکے نقل کردہ در دست آگاہ

شعر ۲۵، ۲۶، ۲۹، ۳۰، ۳۱

گزینہ کرا ہے داغوں سے دور (کلا) تو نزدیک ہے اور خوں کا ظہور[6]

سحر سرخ آنسو وہ رو یا کرے   رخ زرد کو اپنے دھو یا کرے

بدن گرد آلود بن بن کرے   لباس اپنا عریانی تن کرے

کرے جیب تک وہ گریباں دری   تو دامن کہ تب تک کرے دلبری

فراغ اس کو ہو جب چاکی سر جیب   خدا حافظ حال دامن ہے تب

مقولہ در بستن ساح واقف راز بعد مقولہ شاعر زباں دراز

شعر ۱۱، ۱۳

دیا دل یوں ہی جاناں نے تجھے   نہ جانا نہ پہچانا میں نے تجھے[7]

رہا باب دل میں سنام و سحر   پھرا خاک منہ پر ملے در بدر

مقولہ در بستن و رفتن ادمیش آں جواں و دلجوئی کردن پیغام دادن[8]

شعر ۸، ۱۴، ۱۵

تو عصر حموتی کو اب دور کر   سخن خون آلودہ مذکور کر

ترے سوز دل نے جلایا مجھے   ترے دل کی آتش یہ کیونکر نہ بجھے

ترے داغ آتشکدہ گرچہ ہوں   یہ کہہ کہ مجھ کے بجھا سا ہے کیوں

باز آمدن درویش و جواب پیغام دادن مردن آں جواں[9]

شعر ۲

نہ سونے دے باتوں سے ہمسایہ کو   بھلی مرگ ایسے نفس مایہ کو

مثنوی در ہجو برخور سلہ

شعر ۱۴[10]

کہنے لاگا میں ہو کے ہجو الا   کیا ہوا یہاں سے قلیہ کا پیالا

---

[1] نسخۂ کلکتہ ص ۱۴۸، [2] نسخۂ کلکتہ ص ۱۶۸، [3] نسخۂ کلکتہ ص ۱۷۸ [4] نسخۂ کلکتہ ص ۱۰۴۹ میں اس کا عنوان "مثنوی باعجاز عشق" ہے [5] نسخۂ کلکتہ ص ۱۰۵۱ [6] نسخۂ کلکتہ ص ۱۵۳، [7] نسخۂ کلکتہ ص ۱۵۴ [8] نسخۂ کلکتہ ص ۱۵۶ میں کوئی عنوان نہیں ہے۔ [9] نسخۂ کلکتہ ص ۱۶۰ عنوان ندارد [10] نسخۂ کلکتہ ص ۱۳۲ مثنوی در ہجو اکول

مثنوی در ہجو خانہ خود [1]

نمبر ۲۶ ہ

کچھ نہ بوسیدگی نے چھوڑا تھا گھر نہ تھا ایک پکا پھوڑا تھا

مثنوی [2]

کرتا ہوں معاش دل کے خوں سے پیدا میں ہوا تھا کس شگوں سے

رگوں سے ہے یار اب کی ہم کف بھائی ہیں برادران یوسف

متعلق ہیں مرے بھی ایک صاحب کیا ان کے بیاں کروں معائب

چہرے پہ ہیں داغ چیچک ایسے گوبر پہ پڑی ہیں بوندیں جیسے

وہ گندہ دہن جو ہووے گویا سنڈاس کا موہنہ کھلا ہے گویا

بیزار ہیں اس کے موہنہ سے ایسے گھیا دے ہے جیسے کوئی تے سے

آوے نہ ادھر رہے ادھر وہ ہے شہر میں جنگلی سور وہ

لب ہوں گے سیاہ اس کے بھتنے صدقے گئے اس پر کتنے بھتنے

مت پوچھ اسے کہ ہے وہ کیسا کیا کہیے غرض ہے ایسا ویسا

آئینہ دکھاؤ اس کو جاکر جوتی سی لگاؤ اس کے موہنہ پر

گر جان کثیف وہ نہ کھووے شرمندہ تو اپنے موہنہ سے ہووے

گو کپڑے پہن سفید جاوے دھوبی ہے وہ تیکھے جس کے آوے

مدت رہا یار ڈومنی کا دیکھا نہ تھا اور گھر کسی کا

عاشق تھا خراب و شیفتہ تھا اس پر یہ بہت فریفتہ تھا

اسباب معاش اس کی وہ زن آدم گری[3] اس کی اس کی گردن

سب اس کی مؤنت اس کے اوپر یہ ساری رعونت اس کے اوپر

حسن ڈرا اسے وہ جانتی تھی کہتا یہ جو کچھ وہ مانتی تھی

وہ گانی بجاتی اس کی خاطر خرچی بھی جو پاتی اس کی خاطر

. . . .

گھر اس کا تھا جائے باش اس کی مدت رہی یہ معاش اس کی

کیا جانے بات کیسی چل گئی وہ فاحشہ جس کو سن او دل گئی

مت پوچھیو یہ کہ وہ گئی اب لاوے گی وہ آفتیں نئی اب

دھگڑا ابھی کرے گی کوئی ڈھکا اس علتی کو کرے گی چنگا

جھونٹی سا ہے اس سے لڑ دن جا بس ہے اسے موت ہی کا ریلا

. . . .

پیزار مری کو ہو کدورت

کیا ہے وہ چمار کی سی صورت

درج ذیل اشعار دیوان میر نسخہ آصفیہ[4] میں درج ہیں اور یہ غیر مطبوعہ ہیں[5]

دل کے ڈھلے کا نہیں تو نہیں کچھ غم لیکن سب کو افسوس ہے اس قصر کی ویرانی کا

ذکر اس بت کا رباں پر ہے سبھوں کی اب تو کس مذکور نہیں سنتے خدا خدائی کا (ذکرا)

دل پہ بے رحم کبھی پھر رحم پر آجاؤں گا نہیں دیکھا ہے تڑپنا کبوتر بانی کا

ہم جاتے ہیں یا جگر ... تھا ملنا تھا بلک کا کہ کوئی خنجر کیں تھا

کل فال و خط یار کو ہم دیکھ کے کہیے اک حصہ تھا ایماں کا ایک دشمن دیں تھا

سینے کے شکوہ سے کیا سمع پے اوباش وہ تو حیواں ہے نہ کور کر انساں کا

محراب میں سر مارنے کا کچھ بھی نہ دیکھا اب ہم نے دعا مانگنے سے ہاتھ اٹھایا

دست و پا کہنے میں نہیں ہے ہی نہیں ہیں تب میں راہ رو واندے بہت ہو جاتے ہیں منزل کے پاس

گئے دن گرچہ رونے کے پر اب میر بکا کرتے ہیں ہم دو دو پہر تک[6]

---

[1] نسخہ کلکتہ ص ۱۰۲۵ "مثنوی در ہجو خانۂ خود بہ سبب شدت باراں خراب شدہ" [2] نسخہ محمود آباد ص ۲۲ میں اس کا کوئی عنوان نہیں ہے، صرف مثنوی لکھا ہے۔

[3] آدم گری ـــ ایجاد کردن آدم (فرہنگ آنند راج ص ۳۱) [4] کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں کلیات میر کا ایک نادر نسخہ ہے جو میر کی حیات کا مکتوبہ ہے۔

[6] نسخہ کلکتہ میں ان اشعار کو ص ۲ پر ہونا چاہیے تھا مگر نایاب ہیں (اکبر حیدری)

یاس کے اس کمر کو دست شوق   جو نمودار ایک مو بھی ہو[۵]

روکش شہ ہوں یہ ناشاعر   جب انھیں دل سے آبرو بھی ہو

میر کے دیوان چہارم بخط میر حسن علی تجلی میں ردیف "گ" میں دو شعر اس طرح درج ہیں ؎

ان پریوں سے لڑکوں کے جھمیلے میں دل آئے   بے ہوش و خرد جیسے پری دار ہیں ہم لوگ
در پہ سوکے جا کے کھڑے ہوں تو کھڑے ہیں   حیرت زدۂ عشق ہیں دیوار ہیں ہم لوگ

نسخۂ کلکتہ اور دیگر نسخوں میں ان دونوں کو جمع کرکے ایک ہی شعر میں درج کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے ؎

ان پریوں سے لڑکوں کے جھمیلے میں دل آئے
حیرت زدۂ عشق میں دیوار ہیں ہم لوگ

ذیل کا شعر بھی غیر مطبوعہ ہے ؎

مدکر دوجلی سے بقول میر   عیب کرنے کو بھی ہنر ہے شرط

غزل ۳۴۴ شعر ۶، ۴

سنکڑوں مرے ہیں سدا پھر بھی یہاں   واقعہ اک شام و سحر چاہیے[۲]
جیسے حرص پارہ گلو کسا کروں   مار و افعاں میں اتر جانے

غزل ۴۳۵ شعر ۲، ۸

بیزاری سے دل زار کی آزار ہوئے   خواہش اس حد کو کبھی آکر یار ہوئے[۳]
سستی بخت تو ٹک دیکھ کر اس چاہت   معشوقہ ہوئے ہم نہ وفادار ہوئے

غزل ۴۴۴ شعر ۵

پڑے ایسے اسباب پایان کار   کہ ناچار یوں جی جلا کر چلے[۴]

فردیات

ہر شب جہاں میں جلتے گزرتی ہے اے نسیم
گو باچراغ وقف ہوں میں اس دیار کا[۵]

رباعی

ہر گل کو اس سے عشوہ سازی ہے گی   ہر خار کو اس سے سرفرازی ہے گی[۶]
یہ دشمن و دوست سب ہیں اس کے مظہر   درگاہ خدا میں بے نیازی ہے گی

دیوان نسخۂ محمود آباد کے علاوہ راقم الحروف کو میر کا جو غیر مطبوعہ کلام دستیاب ہوا ہے وہ بھی ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"قصیدہ در شکایت نفاق یاران زمان"[۷]

جہاں میں کون ہے جس کو کسی سے الفت ہے   خراب کوچہ و بازاریاں محبت ہے
نفاق خانہ برانداز بسکہ ہے رائج   دل اتفاق کا ہر جا پہ شکست ہے
نا اتفاق اگر دو عزیز مل بیٹھیں   زبان مردم بد سے انھوں پہ آفت ہے
کروں میں ہجو اگر روز اپنے عالم کی   بجا ہے ان سے کہ ہے یہ میں شکایت ہے
درد دل کون سے دو آشنا لڑا دیا   کہاں کی رسم ہے یہ گر یہی مروت ہے
تو چھوڑ شہر کی نہ سکتا نکل جاویں   کہ گوشہ ہائے بیاباں میں بسکہ وسعت ہے
نہ دیکھوں مونھ میں ان کا اگر ہو آئینہ   اس لیے تو یہ دل نشیں عزلت ہے
کہوں میں مطلع ثانی کہ طور یاراں سے   دل شکستہ مرا تنگ اب نہایت ہے
نہ دل پہ صاف نہ سینہ لیکن خط نفرت ہے   مثال آئینہ دیکھیں ہی کی ملت ہے
اور حسن کی سے رنگ ان کی ہے جانسوز   دگر دلوں میں انھوں کے غرور و دولت ہے
حریف مکر ان نادانوں سے نہیں ہوتے   کہ راہ راست پہ ہوں میں انھیں ضلالت ہے

---

[۱] نسخۂ آصفیہ میں "مثنوی در بیان کدخدائی نواب آصف الدولہ" کے اختتام میں ۹ شعر کی ایک غزل درج ذیل ہے ؎

موسم ابر ہے شیشہ بھی ہو   گل ہو گلشن ہو ایک تو بھی ہو

نسخۂ کلکتہ ص ۹۲۶ میں اس غزل میں صرف ۷ شعر ہیں۔ مقطع یہ ہے

دل تمنا کدہ تو ہے پر میر   ہو تو اس کی ہی آرزو بھی ہو

نسخۂ آصفیہ میں "قصیدہ در مدح حضرت علی علیہ السلام" میں یہ شعر بھی غیر مطبوعہ ہے

کب تلک نوش کروں جام لہو کا ہر صبح   تا کھینچوں ہر ایک شام بے اندوہ گسل

[۲] نسخۂ کلکتہ ص ۱۸۳، [۳] ص ۲۱۰، [۴] ص ۲۴۶، [۵] ص ۶۷، [۶] ص ۹۴۲، [۷] کتب خانہ ادبیات اردو حیدرآباد

سخن کی خوبی کے میدان کا ہوں میں رستم　　مقابلے کو مرے ان میں کس کی طاقت ہے
رہا غرور زر و مال ان کا اب باقی　　سو اس کا ہونے کو رد کش مری شرافت ہے
بخالقیکہ زمیں اور آسماں کی بنا　　نظر میں سب کی اسی کا ظہور قدرت ہے
باحمدیکہ بلا میم اس کو کہتے ہیں　　اسی کی شرق سے لے تا بغرب امت ہے
مرتضیٰ کہ ہمسر ہے اسکو ہے خویشی　　بفاطمہ کہ کنیز اس کی ایک عصمت ہے
بآں امام کہ قسمت میں اس کی زہر ہوا　　بآں حسینؑ کہ وہ بیکس شہادت ہے
بذوالفقار کہ وقت سر دغا زی کے　　رواں میں نام سے اسکی ہوئی یہ حالت ہے
کہ گردہ بات کہے صف میں کا فروں کی جا　　تو سر کو تن یہ خوارج کے کب یہ فرصت ہے
کہ ایک دم میں نہ پیوند موجد اس کا　　ملے نہ خاک میں جبتک کہاں فراغت ہے
کہوں میں مطلع ثالث کہے ہے ہاتف غیب　　کہ نیرے صدق کی تائید تری ہی ہمت ہے
بزلف یار کہ مجھ پر اسی سے شامت ہے　　بزہر مار جو جینے میں کچھ حلاوت ہے
بذوق وصل کہ اک دم نہیں ہے مجھکو قرار　　باضطراب کہ وہ خانہ زاد فرقت ہے
بسوز شمع کہ جلتی ہے وہ بھی میری طرح　　بانجمن کہ وہ کثرت میں رشک خلوت ہے
بانتظار کہ آنکھیں سفید اس میں ہوئیں　　بنور شمع کہ وہ پائمال حیرت ہے
بطوف کعبہ کہ بے سعی واں نہیں ہے گذار　　بعشق دیر کہ واں برہمن سعادت ہے
بعزتیکہ ہے دوری راہ اس میں رفیق　　بہمرہیکہ پہنچنا وہاں قیامت ہے
بطاقتیکہ اسے ضعف سے ہے ربط قدیم　　بخاطریکہ وہ منت کش مصیبت ہے
بشہدیکہ چراغ اس کا چشم آہو ہو　　بجستجوئے کہ وہ خونریز اہل حسرت ہے
بہمتیکہ نہ دیکھا ہو ان نے خست کو　　بجستیکہ سراپا عدوے ہمت ہے
بدرتیکہ جو وہ نوح کی پناہ ہوئی　　بلقیکہ وہ طوفاں سے غرق خجلت ہے
بمحنتکہ وہ آزردہ ہوئے راحت سے　　براحتیکہ حقیقت میں رنج و محنت ہے
بعزتیکہ جو سنئی ہو نام ذلت کا　　بذلتیکہ وہ کہتی ہو کیسی عزت ہے
قسم ہے میرے تئیں ان تمام قسموں کی　　جو میں نے کچھ بھی کہا ہو یہ مجھ پہ تہمت ہے
جو کچھ کہا ہے کنہوں نے غلط کہا ہیگا　　کسو سے رنجش بے جا نہ میری طینت ہے
اگر یہ عذر ہو مقبول تو تو خیر ورنہ　　حریف ہونے کا میرے نتیجہ خفت ہے

کہاں تلک میں کروں اس نفاق کا شکوہ
خموشی اب تو ہے اولیٰ کہ اس میں راحت ہے

دیوان دوم۔ مخطوطہ راجہ صاحب محمود آباد
نمبر مخطوطہ ۵۱، سائز ۸"×۱۲"

غزلیات	رباعیات	-	مذمت کذب	حکایات	مذمت نائے حود
۲۸۹	۳۴	-	۱	۴	۱

عشق نامہ	مخمس	مسدس	ہجو لالہ بلاس رائے
۱	۲	۱	

رُباعی غیر مطبوعہ

کھوئے گئے ہیں بسکہ تیرے غم میں ہم　　اب پائے نہیں جاتے کھو ہم میں ہم
سب عالم آپ میں ہیں دل خوش تجھ سیتے　　بدنام ہوئے ایک سو عالم میں ہم

دیوان پنجم (مخطوطہ راجہ صاحب محمود آباد)
نمبر مخطوطہ ۵۵۔ تفصیل دیوان درج ذیل ہے۔

غزلیات	رباعیات	فردیات	ترجیع بند
۲۵۲	۱۲	۴	۱

قصیدہ	مثنوی
۱	۱

ابتداء

دل رفتۂ جمال ہے اس ذوالجلال کا　　مستجمع جمیع صفات و کمال کا

خاتمہ

عشق سے کیا میر اتنی گفتگو　　خاک اڑادی عشق نے ہر چار سو
درمیاں نہ کوہ نہ انبوہ ہے　　رانی کا راجہ کا اب اندوہ ہے
طائر و طاوس و حیواں اژدہے　　سب کہے کیا عشق کی کوئی کہے
یہ فسانہ تازہ کیا عالم کے بیچ
بازماندہ ان کے ہیں سب عالم کے بیچ

دیوان پنجم کے اشعار غیر مطبوعہ

مرے درد دل کا تو یہ جوش ہے　　کہ عالم جوان سیہ پوش ہے
کیا روبرو اس کے کیوں آئینہ　　کہ بے ہوشی اس کا دم و ہوش ہے

ہجر میں جان امیدوار گئی　　حسرت وصل ہائے مار گئی
رنگ و بو پر نہ بھولنا تھا تجھے　　آخر اے گل تری بہار گئی

کیا گل کے موںہہ لگی سی شگفتہ دماغ ہو   پھولا پھرے ہو مرغ چمن باغ باغ ہو
یارب رکھیں گے پنبہ و مرہم کہاں کہاں   سوز دروں کی ہنسلی بدن داغ داغ ہو

ستم نہ کم کرو گو ہم میں دم رہے نہ رہے   بہت تم ہی رہو دنیا میں ہم رہے نہ رہے
سانج سے بدحالی سی کچھ ہے رات ادھ کندہ دیجو
قرار ہووے اسے تو کچھ ہو نہیں ٹھہرتا مزاج اپنا (کذا)

حاجت بیان کروں پر پیر و جواں کہاں
جاتی ہے آہ فکر پریشاں کہاں کہاں
گل گئے پھر سے آئے ہو کے نئے   میر صد حیف ہم گئے سو گئے

اڑا برگ گل کو دکھاتی ہے دادی   صبا کس طرح سے نہیں جور بادی
اب کی چمن میں اور ہی لائی بہار رنگ   اک معنیٔ شگفتہ کو باندھا ہزار رنگ

رباعیات

کیا کہیے کہ فرط شوق نے جی مارے   دکھ اگلے بھلا دیے ہمارے سارے
اے میر شمار دم کے کس کو ہیں حواس   اب یاد نہیں اپنے ہیں ہم بیارے

اے میر محبت میں اذیت ہی رہی   پر ہم نے کسو سے اپنے دل کی نہ کہی
کٹ کٹ کے سوا کیے ہیں اس پر تبک   طور اپنا رہا یہی طرح ان کی رہی

کب حالت زار پر تلطف نہ کیا   کب دیکھ مرے موںہہ کو تاسف نہ کیا
موںہہ کھول دیا سو تو جو میں آ نکلا   بارے میں کبھو ان نے تکلف نہ کیا

آئے ملے عاقل و کامل سے بھی   سائل ہوئے عالم اور جاہل سے بھی
کیا ہی نہ کہا کنھوں نے اس کا اسرار   پوچھا خلوت میں دیر تک دل سے بھی
مسجد کے سودن سے گئی خواب نگاہ   بد منظر و بد جنس تھا وہ بے راہ
موںہہ دیکھ کر کراہت سے سحر میں نے کہا   لاحول ولا قوۃ الا باللہ

اے میر بہت صبر کیا ہجراں میں   اب تاب نہیں ظلم رسیدہ جاں میں
کڑھتے کڑھتے ہی ہم کھپنگے اس بن   عشق کی کھپت کہاں انساں میں

اے میر محبت نہ کسو سے کریے   یہ روگ ہے وہ کہ جس میں جیتے مریے
کہتے ہیں لگی آنکھ تو آرام کیا   اس آنکھ لگی جو نکتے سوتے ڈریے

ہم رفتہ کسو کے جو ہوئے سر پائے   کیا میر کہیں سانگ بہت لائے
عزلت عزت کی بھی نہ دان اپنی گئی   رسوا ہوئے بازار میں رقصاں آئے

قصیدہ در منقبت

نہ ہو دیں حرف و سخن کیوں سزائے صلِّ علیٰ
مری زباں پہ ہیں وصف امیر کار کشا
علو مرتبہ اس کا جہاں میں کیو نکے ہو
بلند اس کے لیے سینکڑوں ہیں دست دعا
شکار شیر کو نکلا تو دشت خالی ہووے
چلے بنوں سے نکل فیل و شیر و بس کیڑا
رئیس لطف شعار و کریم مردم دار
سخن شناس و وفا شیوہ و تمام حیا
عزیز و مقتدر و بردبار و عالم دوست
غریب پرور و انساں انیس و خصم جفا
زباں ہوں موے بدن تو بھی وصف کر نہ سکوں
تمام لطف و عنایت ہے جملہ مہر و فا
کمال یار و سراسر وقار و عزت دار
کرم شعار و مروت مدار و دل برجا
فراخ دامن و طالع بلند و دست کشاد
سخا میں یہن ہے اب نام اس کا نام خدا
خراب دیر پھری در بدر رہی آخر
اسی کے در پہ ہوئی سیر آ کے حرص گدا
ہم کو کیا لکھوں اس کی کہ درج لعل و گہر
گدا کو ایک صدا ہی میں ہے لطف کیا
لگا تھا ہاتھ کہیں اس کے گنج بے پایاں
خبر ہو جب تئیں لوگوں کو ان نے بخش دیا
بیاں کیا ہے زر و سیم و سکہ کا اکثر

کہ آگے ہمت عالی کے اس کی مال ہے کیا
سخن ہیں لطف کے جاں بخش عاجزاں یعنی
زبان نرم سے لوگوں کے درد کی ہے دوا
نگاہِ مہر و عنایت شفائے رنج دلی
حدیث مکرمت و لطف رفع درد و بلا
سلوک خلقِ نکو سے ہے عام کر لیکن (کذا)
جلی ہی جائے ہے ہر دم رعایت عزّ با
سوار کوہ سے ہاتھی پہ ہو تو شوکت دیکھ
شکوہ و شان بلندی رتبہ سب کا بڑا
ہوا وغا میں جو تیرہ ہو تو نشان برق
چمک ہو تیغ کی اس کی فروغ جو تسما
نہ سر اٹھانے کی فرصت ہو پائمالی سے
ہزار ہووے حریف اس کے بیش جو دریا
سبھوں سے ربط ہے اس رہگذر سے ہے یہ سلوک
کہ ملک داروں سے اس کے تئیں ہے صلح و صفا
سوائے لطف و عنایت اسیر حسن الخلق
رہے جو طفلی سے پیری تلک نہ ہووے رہا
صفت حلیمی کی ہے اس رئیس میں ایسی
کہ سن کے حرف درشت ایک دنی سے کچھ نہ کہا
یہیں سے کہتے ہیں عرباں کریں ہیں سب کے خوب
بڑوں سے بھی ہے بھلا آپ جو ہے وہ اچھا
سخن کے طول سے آزردہ ہوتے ہیں سامع
یہ کہہ کر مطلع ثانی رہوں گا میں چپکا

مطلع ثانی

لبوں پہ ایسے جواں مرد کی ہے مدح و ثنا
کہ جس نے مانگا ہے جو کچھ وہی کچھ اس کو ملا
اسی کے جود سے انبان بھرے فقیروں نے
اسی کی دولت وافر سے ہے گدا کو غنا
کھڑے ہیں قصر و محل شہر کے محلّوں میں
بنی ہے جن کی کچھ اس سے انہوں کی ہے یہ بنا
خدا نخواستہ بگڑے کسو سے وہ سردار
. . . . . . گرم وغا
طرف ہوئی پہ نہ معلوم یہ کہ جسم عفیر
چھپائے مونہہ کے تئیں اپنے کس طرف کو گیا
کہ قصد فتنہ فساد اس کو تھا بیاباں سے
غبار سا جو ہوا تھا بلند محو ہوا
صفت سمند و سرنگ و کمیت کی اس کے
نہ ہو سکے کہ یہ ہیں اپنی جنس میں یکتا
کوئی تو ان میں سے خوش راہ و خوش جلو ایسا
کہ چاہے راکب اُسے دو میں رکھ لے دو میں رہا (کذا)
کسو کے چلنے میں صرصر سے تیز تر رفتار
سبک روی سے سواری میں کوئی جیسے صبا
کسو کی باگ جو اُچکی تو پھر وہی محبوب
پری سا پیش نظر اس جگہ تھا یا اس جا
کوئی تو گرم ہوئے پر ہے نعل در آتش
لگی چلی گئیں آنکھیں گیا جو نعل نما
کوئی سواری میں رائض کے گرم جستن تھا
زمیں تک آیا نہ سایہ پھرا میاں ہوا
قدم قدم کوئی پھرتے ہوا تھا ایسا گرم
کہ ملک خیال میں آتش سے وہم جا کے لگا
الہٰی ابلق ایام [illegible] نہ پاوے کبھو
کہ پائمال ہی کرنا ردیہ ہے اس کا
جہاں نہ خالی ہو اس جنس خانہ پرور سے
رہے عراقی و تازی سے وہ طویلہ بھرا
الہٰی اس کے محبّاں سوار اسپ و فیل
جہاں میں خصم نہ ہو دفعتاً ہو دفع بلا

مثنوی "ہجو عقل نام ناکسے کہ سگان انسے تمام داشت" میں ۳۵ واں شعر غیر مطبوعہ ہے۔ مصرع اول صدود جستہ مخش ہے۔ مصرع ثانی درج کیا

جاتا ہے

داڑھی منڈاتے بیٹھے تو کتے کی موت

مثنوی مور نامہ

دیوان سخن میں یہ مثنوی آخر میں بغیر کسی عنوان کے درج ہے۔ یہ مثنوی سب سے پہلے ڈاکٹر گیان چند جین نے اردو ادب میں شائع کی اسکے بعد ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے اسے کلیات میر میں شامل کر کے شائع کیا۔ دونوں کے متن میں فاش غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ چونکہ مثنوی بڑی عمدہ اور دلچسپ ہے اس لیے اسے بہتر حالت میں فٹ نوٹ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم"

ہے غبار وادی وحدت جہاں — کثرت اعیان ہوگی اب عیاں
پرفشاں تھا ٹک جو طاؤس قدم — آسماں پر آسماں پہونچے بہم
عشق اپنا آپ ہی شیدا ہوا — تھا جو پنہاں پردے میں پیدا ہوا
نظم کل کا ڈول ڈالا عشق نے — انس سے انساں نکالا عشق نے
وہ حقیقت سب میں یہاں ساری ہوئی — ہے گی ہر شے عشق کی ماری ہوئی
چار سو ہنگامہ آرا عشق ہے — عشق کیا کہیے کہ کیا کیا عشق ہے
عشق ہی کا ہے جہاں میں سب ظہور — نور ظلمت ہو کہ ہو ظل و حرور
عشق گل ہے عشق بلبل عشق بو — عشق ہے سرو چمن عشق آب جو
ہے کہیں پیدا کہیں ہے یہ حجاب — عشق کے لوگوں سے ہیں کیا کیا خطاب[1]
یاں سے پیمبر نے لایا عشق کا — عشق کو پیغام آیا عشق کا
مسجد و منبر کیے تازہ بنا — واں امام پاک خود آکر بنا
عشق کے اعجاز دیکھے رنگ رنگ[2] — وم دے دل ہوگئے جو دل تھے سنگ
سنگ سے ہر لعل نکلا بے بہا[3] — یعنی وہ دل جگر کی خوں ہوگیا
کچھ بہا یاقوت سیلانی ہوا — بستہ قطرہ لعل رمانی ہوا
عاشق و معشوق رفتہ عشق کے — یعنی دونوں سینہ تفتہ عشق کے
بھڑکی آتش عشق کی دونوں جلے[4] — ڈوبے دریا میں ہوں گو پانی تلے
یا جلا با ایک ہندستاں کے طور — جا جلی ہے زن بھی اس بے جاں کے طور
جل چکے ہندی میں کہتے ہیں ستی[5] — ست یعنی استقامت واقعی
آگ میں جا بیٹھے زن کا ظرف کیا — عشق ہی کا جاذبہ دے ہے جلا
گرمی ہنگامہ اس کی قہر ہے[6] — پھونک دیوے گردیار و شہر ہے
عشق پردہ در نہ ہو رسوا کرے — پھر تماشا ہے جو کچھ پیدا کرے
عشق کو ہے خون کرنے کا مزا — مار ہی رکھتا ہے اپنے ڈھب چڑھا
مارگیری اس کی سیکھے اژدہے — عشق نے معشوق و عاشق جیتے کیے
عشق و دل میں ہے قدیمی دشمنی — عشق سے ہے دل گدازی جاں کنی
عشق کا پایا درمیاں آیا جہاں — دل ٹھہرتا واں نہیں ہرگز نہ جاں
عشق دشمن ہے بلائے جان و دل — عشق ہے ہم دل شکن ہم جاں گسل[7]
ہے سلوک عشق کا سارا جہاں — خاک میں ان نے ملایا آسماں
کون راہ عشق کو کرتا ہے سر — ہر طرف ہے جان کا اس میں خطر[8]
عشق زور آور سے سب ہیں زرناک — کشتے اس سے ہوگئے عالم کے پاک
عشق کا ہے بادیہ مشکل گزر — دیکھے ادھر مر ہی جاتے ہیں نمر[9]
روبہ اس جنگل میں ہے شیر دلیر — وہ کوئی واں جائے جو ہووے سے سیر
ڈر کے ہاتھی کم کرے ہے کوئی میل[10] — بچ کے نکلے ہے ادھر کے تند سیل
بالا بالا دو قدم گینڈا اگیا — اینڈا اینڈا راہ واں اس پر چلا
یوز نے کی فکر ترک گشت میں[11] — کب گیا کفتار ایسے دشت میں
عشق کے جنگل کی ہیبت سے طیور[12] — پر فشاں ہوتے نہیں ہیں دور دور
کیا درندے کیا چرندے کیا پرند[13] — دل ہے جن کے عشق سے ان کا کشند

---

[1] مطبوعہ نسخہ مرملوی ص ۱۱۲۵ عشق کے لوگوں سے ہیں کیا کیا خطاب، [2] مطبوعہ۔ عشق کے آعاد دیکھے رنگ رنگ، [3] مطبوعہ۔ سنگ سے پھر لعل نکلا بے بہا [4] مطبوعہ۔ بھڑکے آتش عشق کی دونوں چلے، [5] مطبوعہ۔ جل چکے کو ہندی کہتے ہیں ستی، [6] مطبوعہ۔ گرمی ہنگامہ اس کا قہر ہے، [7] مطبوعہ۔ عشق ہے ہم دل شکن ہم جاں گداز [8] مطبوعہ۔ ہر طرف ہے جان کو اس میں خطر، [9] مطبوعہ ص ۱۱۲۹ دیکھے ادھر مر ہی جاتی ہے نطر۔ دنمر کے معنی ہیں پلنگ، چیتا، [10] مطبوعہ۔ ڈر کر ہاتھی کم کرے ہے کوئی میل، [11] مطبوعہ۔ یوز ہیں گے فکر ترک گشت میں، کفتار۔ نام ایک جنگلی جانور درندہ کا جس کو ہندی میں ہنڈار کہتے ہیں۔ [12] مطبوعہ۔ عشق کے جنگل میں ہیبت سے طیور، [13] کیا درندہ کیا چرندے کیا پرند،

تو نہیں پر مارتے از بس ہراس — کب اڑا سیمرغ اس کے آس پاس
آدمی سے خاص اس کو لاگ ہے — ہر انساں عشق کی تیر آگ ہے
دل بڑا ہے اس کا ہر کار کلاں — یک بیک کرنا قبول اس کو بجاں

ہمت عاشق جو ہے از بس بلند
کار باطل بھی ہیں اس کے حق پسند

دست سے بستی میں آیا ایک مور — روز تھا زاں حسن کارانی کے تور
اڑ کے گھر راجا کے بیٹھا بے قرار — دیکھ اس کو ہو گیا حیران کار
جادو سا تھا حسن کا اس کے کمال — جانور بھی ہو گیا محو جمال
تھی نگہ رخسار پر حیرت کے ساتھ — چشم تھی رفتار پر حسرت کے ساتھ[1]
گر خرام یار سے جی لے گئی — خوش نگاہی جان تازہ دے گئی[2]
دستہ انداز اس کا ہر ایک شے — رفتہ اس کے ناز کا ہر جانور
دیکھنا تھا سے بہت جلوہ گری — جاکے بستی میں جو بیٹھی وہ پری[3]
دور دور جا کر ہوا نہ کبھی کھڑا — ٹک ٹھہر کر مضطرب ہو گر پڑا[4]
اضطراب عشق سے ناچار کی — دل دہی کرنے اٹھی دلگیر کی
پیار سے کہنے لگی کیوں ہو اداس[5] — پاس رہ میں کروں گی میں بھی پاس
وہ جو جنتی اس نور راز میں سے ہے — انس انساں کو نہ ہو مانوس ہے
شرم راج اپنے پرائے سے نفور — بھاگوں ہوں مانند وحشی سب سے دور
پاس رہنے سے ترے ہے دل خوشی — سب بلا اس پال ورنہ میں دل کشی
اس کسش کی تھی نہ تجھ کو کچھ خبر — ہوش اڑا کر لے گئی یہ مشت پر
اب تو دل ہی لگ گیا ہے میرے ساتھ — کہہ سکتے ہیں سبھی اٹھا نہیں لے ہاتھ
پاس رہ کر اس طاہر سے ضرور — آوے راجہ گھر میں تو بھر دور دور
رہ مبادا ربط سے ہو بد گماں — دوستی ہو جائے تیری خصم جاں
رنگ رنگ اس عشق کے ہیں گے سلوک — رنگ ہر دم بدلے ہے گیتی ملوک
رنگ صحبت دیکھ کر اتنگ اور لائے — اس کو جیاں اختلاطی خوش نہ آئے

دل ہی راجہ کا جو بد تر ہو تو پھر[6] — ترک کرنا ہی پڑے دونوں کو سیر
دل بلائے بد ہے جو چاہے کرے — کچھ نہیں پروا اسے کوئی مرے
دل نہ ہوتا تو نہ جاتی جی کی تاب — دل بدن میں ایک ہے خانہ خراب
دل سے کیسے کیسے گھر ویراں ہوئے — لوگ کیا کیا بے سر و ساماں ہوئے
دل کے رو چھے شہ فقری کر گئے[7] — جنگلوں میں تہر سے جا مر گئے
مرغ گلشن دل لگی آئے نگیر — بے کلی سے اس کی طائر ہیں اسیر
دل نہ ہوتا کاستکے اجسام میں — کرتی تھی ایسی عطا اجرام میں
کرنے نامعلوم ندر عافیت — ہوئی اس عالم کی بھی ایسی ہی گت
مختلط رہنے سے بعد چند روز[8] — شور یدنامی اٹھا ایک سینہ سوز
کھل گئی غماز لوگوں کی زباں[9] — سب پہ ظاہر ہو گیا راز نہاں
کان راجا کے بھرے دشمن ہوا — بدگماں دید برد بدظن ہوا
کار زن بد کھینچا آسن طول کو[10] — سمجھا نا معقول وہ معقول کو
اب تو نہیں کرنا ہے ظاہر دار کا — ورنہ ہیں کہنے کی باتیں سارباں
دھوم رسوائی کی ہے ار ان میں[11] — کہ سنتاں اس کی ہوئی ایماں میں
آنا جانا گھر میں کا اب ہو چکا — پاس ربط و رابطہ سب ہو چکا
بدگمانی سے ہوا ہے کینہ ور — ہے نمودار آنکھ سے خصمی کی طرز
راہ میں سے یا کبھو پھر جائے ہے[12] — پھر گیا تو دیر میں پھر آئے ہے
چار سو جھوٹے ہوئے جاسوس ہیں — ہمدگر کے در پے ناموس ہیں
مصلحت ہے دور رہ ٹک آنکل — اس میں شاید مٹ ہی جائے کل بکل[13]
سر پہ لایا ہے بلا آپس کا ربط[14] — جی تپیں ہیں شوق کا گر ہووے ضبط
اس سے پھر یارب ہے طلب پر روز و شب — دل لگی تو ایک خدا کا ہے غضب
دل گرفتہ دل شکستہ دل زدہ — ان نے مارے مرد کیا کیا آمدہ
بیدلاں بے دل رہیں تو خوب ہے — تن بدن میں دل سے ایک آشوب ہے[15]
دل کے جاتے ہی ملے ہے امتیاز — اہل دل کہتے ہیں جو ہو دل گداز

---

[1] مطبوعہ۔ چشم تھی رفتار پر الفت کے ساتھ، [2] مطبوعہ۔ خوش نگاہی جان تازہ لے گئی [3] مطبوعہ۔ حاشیہ میں جو بیٹھی وہ پری، [4] دور دور جا کر ہوا وہ بھی کھڑا [5] مطبوعہ۔ پیار سے کہنے لگی مت ہو اداس، [6] مطبوعہ ص ۱۳۱ دل ہی راجا کا جو بد ہو تو پھر [7] مطبوعہ۔ دل اچٹے شاہ فقری کر گئے، [8] مطبوعہ۔ مختلط رہتے سے بعد از چند روز، [9] مطبوعہ۔ کھل گئی غماز لوگوں کی زباں، [10] مطبوعہ۔ کار ظن بد کھینچا اک طول کو [11] مطبوعہ۔ دھوم رسوائی کی ہوئی ان ان میں
[12] راہ میں ہے یا کبھو پھر جائے ہے، [13] اس میں شاید مٹ بھی جاوے کل بکل، [14] سر پہ لایا ہے بلا آفت کا ربط [15] تن بدن میں ایسے اک آشوب ہے

دل بلائے جاں ہے اسے طاؤس لے   اس کے پہلو سے ہے لب پر ہائے وائے
ہے گی یہ دل لگی خانہ خراب   دربدر پھرنے کا کر دیوے ہے باب
خانہ ویرانی نہیں میری ہے اب   ہے خرابی جہاں کا دل سبب
اپنے تو گھر بار کا بھی ہے فسوس[1]   گر ترا بھی ویسے ہے یار خروس
کیا اڑایا ہے تجھے اے مست پر   خاک سے لے کر گیا افلاک پر
واں سے لگ دیکھئے کیونکر بچے[2]   ساتھ آزار دکرے کیدھر مجھے
بس کھڑا طاؤس سب سنتا رہا   درد و غم سے دیر سر دھنتا رہا
بے زبانی تھی نہ کچھ کہنا بنا   چپکے ہی آزردہ دل رہنا بنا[3]
حزن کے ساتھ ایک حزیں آواز کی   گرنے پڑنے دو قدم پرواز کی
دیر سر دیوار سے مارا کیا   صبر سے ناچار کچھ چارا کیا[4]
پاس سے کچھ دور ہی رہنے لگا[5]   دور تہ یار کے سہنے لگا
بیدل و آزردہ گاہے ہے کھڑا   سر جھکائے گاہ ایک سو ہے پڑا[6]
مضطرب ہو شور کرتا ہے کبھے   دل پہ رکھ دینا ہو سر تا تک رہے
دور دور اس سے پھرے الفت کے ساتھ   ھر کے دیکھے اس طرف حسرت کے ساتھ
آوے راجا نہ آوے یہ گیا   صبر کرنا اس کو اس بن ہی ہبا
تو شکیبی دل لگی پر ہے عذاب   جی میں ڈالیں ہیں غم کے پیچ و تاب
عشق و بے صبری بہت مشکل ہے کام   مرگ عاشق کا ہے یہ بھی ایک نام
جی کے گھبرانے ہوا تھا بدحال   طاقت بردار اس میں تھی کہاں
فرط دل تنگی سے ہو کر رہ گرا   ایک پرافشانی میں سر کے بل گرا[7]
پاؤں میں نہ زور تھا نہ سر میں شور   ناتواں طاؤس تھا مانند مور
دوڑی محبوبہ یہ اس کا حال دیکھ   رہ سکی نہ ساتھ یہ حال دیکھ
اشک ریزاں سر پہ اس کے رو رکھا   خوف طعن خلق کا یکسو رکھا[8]
ہو تسلی جاتی یار سے رہ گیا   جان کا بھی ڈر کنارے رہ گیا
چشم وا ہوے لگی اس زار کی   کی نظر رانی کے موہنہ پر پیار کی

سب لگے کہنے کہ اب تو یہ جیا   جان رفتہ نے موہنہ ایدھر پھر کیا
ہوگئی جتوں بھی اس کی اب درست   پانی چھڑکو تا کہ ہووے گرم و چست
پھر پھرائے پانی چھڑکے بال و پر[9]   اڑ چلا رانی کا کہنا یاد کر
کی نظر جانے ادھر الفت بھری   الفت ایسی جو کہ ہو حسرت بھری
اس نظر سے رانی نے بھی رو دیا   ہوش سر سے صبر دل سے کھو دیا
روتی روتے خواب گہہ میں جا گری   پھر نہ اس گھر میں کوئی دن آ پھری
پھر گیا ہو پرفشاں دیوار پر   بیٹھا لیکن موہنہ ادھر سے پھیر کر
لوگ تا جانے کہ یہ بھی ہے اداس   پھر نہ آوے شاید اب رانی کے پاس
واں سے اڑ کر ایک کھٹے پر گیا   گم ہوا واں ایسا جیسے مر گیا
واں کھلی سمار لوگوں کی زبان[10]   کہتے تھے راجہ سے جا کر کیا نہاں
اختلاط ان دونوں کا ظاہر کیا   اس حقیقت کا اسے ماہر کیا
وہ تو کافر آگئے ہی تھا سنگدل[11]   اور ان کے کہنے سے ہو تنگ دل
کہہ اٹھا میں نشکر میں ہو آ نکل   صاف دیتا ہوں مٹا سارا خلل
جان سے مارن کا میں اس مور کو   پھر نہ سنیے گا کبھو اس شور کو
ہے یہی ہنگامہ آرا جانور   قطع کے شایاں تھے اس کے بال و پر
تا نہ آتا شہر میں یہ دشت سے   باز رہتا ایسی سیر و گشت سے
یوز کا تھی اس کو کوئی کرنا شکار   سیر بچہ اس کو رکھتا کوئی مار
حسن سے ہر دم پڑا ٹپکے ہے زہر   اس کا جنون ہے بلائے شہر و دہر
کج خرامی کا ہے فتنہ بس خیز   چلنا اس کا جوں چلے شمشیر تیز
مت اسے حیواں صاحب جانیو   بد بلا اس کو کہیں تو مانیو
رقص سے ہنگامہ پردازی کرے   پرفشاں ہو تو پر اندازی کرے
بولے گر آواز اس کی دل خراش   کرم خوار و مار خوار و بدمعاش
رانی تھی ناقص خرد مائل ہوئی[12]   مفت لعن و طعن کے قابل ہوئی
بن ملے اس کے رہے ہے وہ اداس   میں کھڑا رہنے نہ دوں اپنے تو پاس

---

۱ اپنے تو گھر بار کا ہے ہی فسوس، ۲ واں سے ٹلکے دیکھئے کیونکر بچے، ۳ چپکے ہی آزردہ دل رہنا پڑا ۴ صبر سے ناچار پھر چارہ کیا،
۵ پاس سے کچھ دور ہی رہنے لگا ۶ سر جھکائے گاہ یک سو ہے پڑا، ۷ مطبوعہ۔ فرط دل تنگی سے ہو کر دل گرا   ایک افشانی میں سر کے بل گرا
۸ اشک ریزاں سر پہ اس کے رو رکھا   خوف طعن خلق کا ایک سو رکھا ۹ چھر چھرادے پانی چھڑکے بال و پر، ۱۰ یاں کھلی تمام لوگوں کی زباں
۱۱ وہ تو کافر آگے تھا تنگ دل، ۱۲ مطبوعہ۔ رانی بھی ناقص خود مائل ہوئی

گھر میں آ کر اُن نے کی جو بود و باش　　تھی اُسے خانہ خرابی کی تلاش
رانی نے جو مونہہ لگایا سر چڑھا　　قدر سے مقدار سے آگے بڑھا
پاؤں پھیلا گھر کا مالک ہو گیا　　اس روش سے اپنا مالک ہو گیا
اب نہ کریے اُس کے تئیں جب تک ہلاک　　گھر نہیں ہو نا نظر آتا ہے پاک
اس میں گو رانی بھی جاوے جان سے　　وہ کبھی خوش ہو مری کسر شان سے
فکر میں طاؤس کی راجہ رہا[1]　　مونہہ پہ رانی کے نہ ہرگز کچھ کہا
کی تسلی اور رکھا کر فریب
ہو شکیبا کوئی دن یہ ناشکیب
قصہ کوتاہ اڑ گیا یاں سے جو مور　　مونہہ چھپا ایسا گیا جیسے کہ چور
کس طرف جاتا رہا ہو پر فشاں　　کچھ نہ پیدا پھر ہوا اس کا نشاں
کچھ خبر اس کی نہیں کیدھر گیا　　یا کہیں جیتا ہے وہ یا مر گیا
یہ تاسف رانی کا جی کھا گیا　　دل جو اس کا گل تھا سو مرجھا گیا
کس سے پوچھے کس سے وہ جا کر کہے　　جوں خزاں کا پھول مرجھائے رہے[2]
کیا بہار عشق کے دیکھے ہیں رنگ　　زرد اس کا ہے گل تر دل ہے تنگ
آنکھیں اس کی دو گل عبہر عجب[3]　　سو جگر کی راہ پر دار و رو و تب
آدے جو کوئی مونہہ اس کا تک رہے[4]　　دیکھیں حیرانی اُسے کب تک رہے
وہ تو گم گشتہ کہیں پیدا نہیں　　یاں تسلی یہ دل شیدا نہیں
۔۔۔کی اس گل کو رہتی ہے کمال　　رنگ اڑے ہے مور کا کرنے خیال
ہوش سر سے جائے ہے پرواز کر　　ہوتی ہے بے خود حزیں آواز کر
۔۔۔ش پڑی رہتی ہے اس رد یر میں　　پھر بحال آتی ہے ٹک تو دیر میں
۔۔۔ل کی وحشت ہے وہی اندوہ میں[5]　　وہم لے جاتا ہے دشت و کوہ میں
۔۔۔ہی رہتی تھی کہ اے باد سحر　　لا کبھو طاؤس کی مجھ کو خبر
۔۔۔ن اسے ڈھونڈے ہے پر پاتی نہیں　　ان نے سے بھی یاں خبر آتی نہیں[6]
دل انھیں دو طرحوں میں پھر لے صبا[7]　　یا اسے لا یا مجھے واں لے کے جا
نا ملول عشق ہوں میں تو ملول　　اس طرف آتی ہے گر باد قبول
سن کے میرا حال ہو جاتی ہے سُن　　گرم رفتن ہوتے ہی پھر سر کو دھن[8]
کام اس سے بھی نکلتا کچھ نہیں　　مجھ کو وہ ناکام چھوڑے ہی نہیں
آتی ہے جو اس طرف باد دبور　　کچھ کچھ اُسے بھی کہا ہے بالضرور
ان غموں کا کچھ نہ دے گردہ جواب　　سر جھکائے یاں سے نکلے ہے شتاب
باد صرصر سے بھی درد دل کہتا　　سرسری سا ان نے بھی کچھ سن لیا
جھکڑ آیا اس سے بھی تھی گفتگو　　پھر نہ ادھر رو کیا ان نے کبھو
لگ چلی ہے مجھ سے گر نرمک ہوا[9]　　گرم ہو کر اس سے میں کیا کیا کہا
کہتے کہتے میں ہوئی تو نہیں سبک　　کی نہ ان باؤں نے تسکیں دل کی ٹک[10]
بے قراری دل کی میری ہے وہی　　در ہمی ہے حال کی سو ہے سہی
صبر ہو سکتا نہیں میں کیا کروں　　کب تلک بے طاقتی سے دل بھروں[11]
جی تو ٹک آنے ہی آئے رک گیا[12]　　تن بدن آتش سے غم کی پھک گیا
بے قراری سے کہو کیا اے صبا　　جو نہ کہتا تھا سو تجھ سے میں کہا
صبح کو جو آ نکلتی ہے نسیم　　اس سے بھی ہے درمیاں حال سقیم
جذب عشق اس جانور کا ہے بلا　　مجھکو برگ حنک سا دے ہے اڑا
جی کھچا جاتا ہے میرا اس طرف　　کر رہے گا جاذبہ اس کا تلف
اب تو کبھو آ گیا یہ مجھ کو بھی　　کر گیا کھویا گیا سا چلتے ہی
رات دن آرام اب مجھ کو نہیں　　خواب و خور سے کام اب مجھکو نہیں
جب چڑھے گلہائے بال و پر ہیں اب　　جیسے بلبل میں ہوں نالاں روز و شب
در ہمی حال طاؤس اب سنو　　عشق ہے تم کو بھی تو ٹک سر دھنو
یاں سے ہے وا سوختہ اڑتا گیا　　دیر اس کا مونہہ ادھر مڑتا گیا
پھر نہ ظاہر کچھ ہوا کیدھر گیا　　وادی آبادی کہیں جا مر گیا
الغرض اک بن میں جا پنہاں رہا　　دل جو آگے ہی گیا تھا یاں رہا
آب و دانہ کی نہ کرتا تھا تلاش　　دل ہی کے غم سے کیا کرتا معاش

---

[1] فکر کے طاؤس میں راجا رہا ، [2] جوں خزاں کا پھول مرجھائے رہے [3] آنکھیں اس کی دو گل عنبر عجب ، [4] مطبوعہ۔ آدے مونہہ تک اس کا جو کوئی رہے ،
[5] دل کی حالت ہے وہ اندوہ میں ، [6] جی اسے ڈھونڈے ہے پر پاتی نہیں اڑتی سی بھی یاں خبر آتی نہیں ، [7] دل انھیں دو طرحوں میں ٹھہرے صبا ،
[8] گرم رفتن ہوتی ہے پھر سر کو دھن [9] لے چلے ہے مجھ سے گر زنگ ہوا [10] کی نہ ان باؤں سے تسکین دل کی ٹک ، [11] کب تلک بے طاقتی سے دل بھروں ،
[12] جی تو ٹک آنے ہی آتے رک گیا

سرنگوں افتادہ رہتا وہ دلیر — غم سے محبوبہ کے ہوتا تھا سیر
حزن سے بس واں رہتا رہے[1] — آنے جانے پاؤں سے کہتا رہے
جائے تو راں سے کبھو دانشگاف — بھیکے خط کے حرف سا مٹتا ہوں صاف
جا بھوں میں جو نہیں وہ تسلیم — پھر نہیں ہے محرم آلام و غم
اب تلک جیتا تو ہوں پر زندگی — دور تجھ سے ہوگئی ستمگری
آنکھیں رہتی ہیں لگی تیری ہی راہ — کرتا ہوں اندھا سا میں ہر ماہ و شہور
شور و فریاد و آہ دونوں بے اثر — تجھ تلک ہو نہیں تو دیں مجھکو خبر
میرے ٹک آیا نہیں میں ناصبور — اب کھنچا ہے کام مشتاقی کا دور
پاؤں ادھر کی جو آتی تھی سہ — ہو نہ پاؤں ادھر کرتی نہیں بیگانہ خو
یاں سے جو دہر کوئی جاتا نہیں — سرسری بھی وہ ادھر آتا نہیں[2]
آتی ہیں مرغ نصیب سا وہ تیکھے — ہے نصیبوں میں تو دیکھوں گا تجھے
اڑ گئے جوں اس طرف تیرے کبھی — سب ملال و درد دل جاں نئے
کہتے جو ہوا اس طرف تیرا گذر — مور ایک جنگل میں کرتا تھا بسر
سر میں اس کے عشق کا سا شور ہے — مضطرب دن رات نالاں زور ہے
زار نالی سے طیور اس دشت کے — ترک کرکے رہ ہیں سیر و گشت کے
اب کوئی اس راہ سے جاتا نہیں — آنکلا ہے جو کبھو آتا نہیں
شور سے ہوتا ہے جب وہ ناکس — طائر اس جنگل کے کرجاتے ہیں بس
صبح اس کے نالوں سے ہے دھوم دھام — طائروں کا شام تک ہے ازدحام
شور کرتے کرتے تھا تا ہے گلا — اب جو نالے کرتا ہے سو بے صدا
پاؤں پر کھیلا کے جب کھینچے ہے دم — آہواں دشت کر جاتے ہیں رم
پر کے درندہ کسو کی کب رکے — خاک کے نیچے گر وہ جا چھپے
شور الحاصل ہے اس کا چارسو — شہر در شہر اب یہی ہے گفتگو
بار راجا کے ہاں مذکور ہے — مور کا سررفتہ پر مشہور ہے
رفتہ رفتہ یہ خبر یاں آگئی — رانی بھی سن کر کہیں سی ماگئی
آئی دل میں فکر جاں طاؤس کی — کشتہ مردہ ہوگئی افسوس کی
کس راجا کا حال آیا اسے — کیا کہوں کیا کیا ملال آیا اسے

گر پڑی بس کر گئی مرجھا گئی — ناگہاں باسدگل کمہلا گئی
کیا خبر آئی کہ تھی وہ بے خبر — چوٹ کیسی پڑ گئی تھی جان پر
بات مونہہ سے پھر نکلتی ہی نہ تھی[3] — دیر گزری تھی سنبھلنی ہی نہ تھی
کھل گئیں آنکھیں تو جو دل تڑپا بہت[4] — لب پہ آئی ناتواں سینہ سے آہ
ہر طرف کی حسرت آلودہ نگاہ — لب پہ آئی ناتواں سینہ سے آہ
آہ کر پوچھا کہ راجہ ہیں کہاں — ان کے کینے سے مجھے ہے خوف جاں
بے خبر ان کو نہیں ہوتی کا کشش — وے تو جی ماریں گے اس کا کر تلاش
بدگمانی کا کھنچا ہے دور کام — مور کا ہوتا نہیں کینے سے کام
تجھ رنگی اس حرم سے آیا غضب — کشت و خوں کے سب ہیں در پے اس سبب
سوچئے کیا درمیاں آوے سلوک — آگ ہے بھڑکی ہوئی کین ملوک
دل کے پھر اشتعال کے ہمدم — تھر تھر سب داد ہے ظلم و ستم
آتش دل سے یہ تو آئی ہے خبر — جب نہ تب ہیں گوش راجا کے ادھر
کل دن ایسے جان پر سے کٹ گئے — کیا عجب آنکھیں لے پاؤں ٹلے
ہم کہ ناچار ہے کچھ کی جاتا نہیں — کب بھی خونریز یاں آتا نہیں
سن یہ بات یہی کچھ اور ہے — نہ ترحم ہے نہ مطلق غور ہے[5]
جانور کا انس کچھ ثابت نہیں — اس دنیا کی سی یہ تہمت نہیں
سفت اتنی کچھ نہیں ہے مفتنی[6] — جیتی رہتی عشق کی ہو تہمتی
زندگانی کیا ہے جب عزت گئی[7] — مفت ذلت ہو گئی عزت گئی

جب تلک آئے جیتے ہیں ہم
لو ہوا اپنا ہر زماں جیتے ہیں ہم

جو مخاطب تھا کہا اس نے کہ ہاں — اس حرم کا اب نہیں ادھر کہاں
سن کے رانی نے کہا یہ اس کی دھوم — دام داروں کو بلا کاے قوم شوم
لو خبر ہے کس طرف وہ خارزار — آپ جاؤں گا ادھر بہر شکار
گو کہ ہو وہ بادیہ پر شر و شور — راہ چلنے ہوں عصا سے مار و مور
ہر طرف راجہ نے بھیجے دام دار[8] — ہوں تلاشی تا کدھر ہے دشت خار
حسب حکم دے گئے ہر چار اور — ڈھونڈیں کس جنگل میں ہے وہ مور شور

---

[1] مطبوعہ - حزن سے بس واں رہا کرتا ہے۔ [2] سرسری بھی پھر ادھر آتا نہیں [3] مطبوعہ کھل گئیں آنکھیں جو دل رکتا بہت [4] مطبوعہ۔ نے ترحم ہے نہ مطلق غور ہے
[5] مطبوعہ۔ اتنی بھی نہیں ہے بے عصمتی [6] زندگانی کیا ہے جب عزت گئی [7] ہر طرف راجہ کے بھیجے دام دار

کس بیاباں میں ہے اس کی بود و باش   کون سے ہے دشت و بر میں بد معاش
راہ میں ان سب کو یہ آئی خبر   جس بیاباں میں ہے وہ تفتہ جگر
خار کا جنگل نہیں ہے دشت مار   روز روشن میں بھی ہے تیرہ و تار
دم کش اژدر نکلے ہے گر سیر کو   دور سے کھنچے ہے وحش و طیر کی
جلتے ہیں آتش زبانی سے بہت   تیل ہو جاتے ہیں پانی سے بہت
یعنی دم سے طیر ہوتے ہیں گداز   ہیں زبانہ آگ کے اس کی دراز
ایسے ایسے سو پھریں ہیں واں سدا   جن کی وحش و طیر ہے اکثر غذا
اور بھی رہتے تھے واں اقسام مار   گھر انھوں کے ہیں اسی جنگل کے غار
ہے عجب ماروں میں مور آ کر رہے   مار بھی پھر کیسے اژدر اژدہے
مرغ کر جاتے ہیں در انداز دس   کیا کریں ایک مور کے کھانے سے بس
مار کھاجا مور کا ہے یاں کے مار   مور دس دس کھا گئے ہیں ایک بار
کردے ہے اس دشت کی کوہ گراں   ان سے اژدر جھانکے ہے سید ابھار
جانور اڑتے جو ڈھب پر آ گئے   چار چار ایک ایک ان کو کھا گئے
ہے زمانے کی سی ڈھیمی ان کی چال   جن کے ہیں کیڑے مکوڑے پائمال
حیب کو اپنی گزوں تک دیں ہیں ٹال   خشت و سنگ و خاک تک کھاویں اکول
ان کے چاٹے دشت میں کم ہیں درخت[1]   چٹ کیے ہیں کوہ تک کے سنگ سخت
مار یہ پتھر چٹے مشہور ہیں   زیر دنداں ان کے پتھر چور ہیں[2]
قدرت حق سے رہا ہے ان میں مور   پھر قیامت کا سا اس کے سر میں شور[3]
مور کیا چوری چھپے آیا ہے یاں   عشق کا اعجاز اُسے لایا ہے یاں
فتنہ در سر عشق کے یہ کام ہیں   مور و اژدر رانی راجہ نام ہیں
عشق ہے ہنگامہ ساز و شور و شر   قصہ قصہ عشق سے ہیں مختصر[4]
دشت ماراں خاک ہو گا جل جلا   اژدہے مر جائیں گے سب تلملا
بھیڑ لے کر ساتھ راجہ آئے گا   کل مکل میں مور مارا جائے گا
خاک میں مل جائے گا کوہ گراں   خاک سی اڑ جائینگے آخر کو واں[5]

رانی ہو گی فرط غیرت سے ستی   جانور کے عشق کی ہے تہمتی
طعن مردم سے ہوئی ہے بسکہ تنگ   زندگی کو جانتی ہے اپنا ننگ
رفتہ رفتہ راجا کا گھر جائے گا   عشق کام ان پردوں میں کر جائے گا
لے گئے القصہ جاسوساں خبر   جیتے مرتے یہ پہنچے کچھ راجا کے گھر
کی حقیقت اس جگہ کی سب بیاں   حال ان کا ہو گیا سب پر عیاں
راہ کی مشکل گزاری سب کہی   سننے والے لوگوں کو حیرت رہی
جنگلوں کی خار زاری نقل کی   راہ واں نکلی نہ ہرگز عقل کی
دشت ہر یک خارزار لق و دق   پاؤں چلتے چلتے جاسوسوں کے شق
سختی سنگستاں کی بیش از بیش تھی   سالکوں کی واں کف پا ریش تھی
غنچہ غنچہ ایک بیاباں میں تھے خار   جز گل و خار اور واں برگ و نہ بار[6]
پاؤں ریگستاں میں تا زانو چلے   راہ سر کے بل کوئی کیونکر چلے[7]
گرم تر اک دشت میں تھا آفتاب   سایہ واں پیدا نہ تھا نہ قطرہ آب
تشنگی سے کیا عجب گر غش بھی ہو[8]   آپ تو واں تھا نہ جو اب حس بھی ہو
شہری ان کے تور سے یکسر تھے داغ   نکلے تھے [illegible] ہر سراغ
پھرتے پھرتے جنگلوں میں تھک گئے   کتنوں کے تئیں شیر و اژدر کھا گئے
چلتے چلتے دور تک آئے نکل   پڑ گئے تھے آبلے تلوؤں میں چل
اور ابھی جنگل بڑے در پیش ہیں   پاؤں دونوں شل ہیں تلوے ریش ہیں
دیکھیے ہوتا ہے واں کیونکر نباہ   ہے بہت مشکل گزر کانٹوں سے راہ
ہر قدم خطرہ کہ ہیں شیر و پلنگ   اس پہ سر مارے کہ رہ پر خار و تنگ[9]
پھر ترا کم چار سو اشجار کا   پھر ہراس اس میں گڑھے کا غار کا
ہاتھی ارنے خوک کی واں بات ہو   کرگدن کی دھوم سے اکثر نمود
ہیں بیاباں ہلکی یہ تو سہی[10]   زندگی کیونکر کرے واں آدمی
قافلہ جاسوسوں کا ادھر چلا   آدھا پر واں سو گیا گر رہ گیا[11]
زندگی سے جمع یہ مایوس ہے[12]   ہر خطر گہہ خانہ جاسوس ہے

---

[1] مطبوعہ۔ ان کے چاٹے دشت میں کم ہیں درخت

[2] ماریے پتھر جیسے مشہور ہیں   ریزہ دنداں ان کے پتھر چور ہیں   [3] پھر قیامت کا سا اس کے سر میں شور

[4] عشق ہے ہنگام ساز شور و شر   قصے قصے عشق سے ہیں مختصر   [5] خاک سی اڑ جائے گی آخر کو واں

[6] غیر گل خار اور وہاں برگ نہ بار   [7] راہ سر کے بل گئے کیوں کر چلے   [8] تشنگی سے کیا عجب ہے غش بھی ہو

[9] مطبوعہ۔ اس پہ سر مارے کہ رہ ہر خار و تنگ۔   [10] ہیں بیاباں ہلکی یہ تو بھی ؛ [11] آدھا پر واں سو گیا گر رہ گیا ؛ [12] زندگی سے جمع یہ مایوس ہے

کیا کرے جو رزق یوں مقسوم ہو
کچھ ہو دشت مار تک جانا ہمیں
آب و دانہ لے چلا ہے اب تو واں
دیکھئے جانا ہو کیونکر اتفاق
سوچ کر آپس میں وے آگے گئے
طے ہوئے وے دشت جونہی ہولناک
راہ میں دو چار فاقہ بھی کیے
دیکھی اس کے ماحیہ میں ایک دھوم
جمع رہتے تھے طیور و دشت بھی
شور بیتابی سے بیٹھے تھے دہم
حرن سے ہوتا ہے جب دم مار کش
دیکھ وا مسمار اس کی رحم کر
کوئی دانا بوند پانی گھاس پات
بارہا تو سست سی پرواز کی[3]
کچھ اڑا بیتاب کچھ رکنے لگا
گر کہیں دو چار دانے پا گیا
جو کسو تالاب سے پانی پیا
تو یہ دے نو یعنی مجھ کو کون دے
سن کے راجہ یہ خبر نا داں ہوا
حکم کر لوگوں سے اپنے یہ کہا
اب یہ مژدہ لائے ہیں جاسوس جا
مجھ کو جانا اس طرف کا ہے اہم
لوگ میرے گرچہ ہیں حاضر یراق
جنگ حیوانات سے ہے بیشتر
یہ لڑائی طول کو گر کھینچ گئی

واں لے مرنا جہاں معلوم ہو[1]
مور کی واں سے خبر لانا ہمیں
آب و دانہ کچھ نہیں ملتا جہاں
کھوکوں مرنا راہ چلنے میں ہے شاق
دن گئے تھے رات بھی جاگے گئے
دشت ماراں پہنچے کچھ بے خوف و باک
کتنے ان میں سے موئے کتنے جئے
تھا چرندوں کا درندوں کا ہجوم
صبح سے تھی ترک سیر و گشت بھی
سن کے نالے بیٹھے کر جاتے تھے رم
پاس کے کچھ جانور کرتے ہیں غش[2]
کچھ نہ کچھ رکھ دیتے مونہہ میں جانور
کاٹتا تھا اس طرح دن اور رات
اس بیاباں میں حزیں آواز کی
سنگریزے کنکری چننے لگا[4]
شکر کر اپنی زباں میں کھا گیا
آسماں کی اور مونہہ اپنا کیا
پر شکستہ کی خبر یوں کون لے[5]
خشمگیں تر خانہ آباداں ہوا
دیر اس موذی کے غم میں میں رہا
ان بنوں میں ایک بن میں وہ بھی تھا
کھا گیا ہے جان اس دشمن کا غم
پر رکھو کچھ اور بھی بہر سیاق[6]
ہیں طرف اژدر، مر، شیران نر[7]
ہمت مردانہ سینو ہیچ گئی

ہے لڑائی سخت کوہستان کی
منہ پسارے اژدہے ہیں گرم جنگ
آئے ہاتھی بھی اتر کر کوہ سے[8]
ہو گیا مار آہ سد راہ اگر[9]
ہوگا گرجا موش دشتی سے معاف
کرگدن آکر اگر ہوگا طرف
مونہہ چڑھیں گے اس کے مردم کم بہت
ہوگئی گر خرس سے استادگی
مونہہ سے گرگرگ بغل زن آگیا[10]
یوز گرگ و تیر اگر آ جائینگے
مست ہاتھی ہو گئے جیرہ اگر[11]
سامنے ہوگا اگر مار سیاہ
گرم کیں اژدر کوئی گر آ گیا
لوگ رکھو الغرض صاحب جگر
جدول ان کی تیغ کی جاری رہی
ساتھ راجا کے گیا تدبیر
راؤ راجہ ساتھ جب سانپ گئے
منزلیں طے ہو کے آئے دشت در
بھڑکی آتش عشق کی جنگل جلے
آگ پھیلی ان بنوں میں دور تک
مار و اژدر اژدہے جھلسے گئے
جل گیا طاؤس بھی اس آگ میں
مور کا مرداگھا راجہ کے پاس
پھر پڑی جو آگ سب لشکر جلا

پھر بہم حیوان اور انسان کی
کھینچ کر نکلے ہیں دم سے نشت و سنگ
ہو سکے گا کچھ نہ پھر انبوہ سے
یوں کھینچا کر نفر راہ دگر
تو کوئی دم ہو کوئی میدان صاف
تو الٹ دیوے گا کوئی صف کی صف
اک طرف ہو جائے گا عالم بہت
درمیاں آ جائے گی افتادگی
دیکھیو پیٹھ اک جہاں دکھلا گیا
بزدلوں کو فوج کے کھا جائینگے
مونہہ چھپا لینگے سپاہی بیشتر
سامنے اسکے نہ ہووے گی سپاہ
کھا گیا جھٹ کر گیا جب پا گیا[12]
پھوئیے سر پر مدعی کے مشتر
ان کی تر دستی سے وہ جاری رہی[13]
سر صغیر و ہم جوان و ہم کبیر
کچھ نہ بولے شرم کے مارے گئے
اترے واں جا لوگ لشکر سر بسر
دوں لگادی طائر و اژدر جلے[14]
جل گئے حیواں کھبی لنگور تک
شیر و گرگ و کرگدن جھلسے گئے
جی گئے بہتیرے دل کی لاگ میں
اور جھلسے جھلسے طائر بے حواس
اور راجا کا بھی اودھر گھر جلا[15]

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

[1] کیا کرے جو رزق یوں مقسوم ہے — واں لے مرنا جہاں معدوم ہے [2] حرن سے ہوتا ہے جب دم مار کش — پاس ہی کچھ جانور کرتے ہیں غش
[3] یارکا تو سست سی پرواز کی [4] سنگریزے کنکری چکنے لگا [5] مطبوعہ۔ پر شکستہ کی خبر یوں کون دے، [6] پر رکھو کچھ اور بھی بہر براق،
[7] شیراں تستر، [8] آئے ہاتھی بھی اترکر کوہ سے، [9] ہو گیا یار راہ سد راہ اگر [10] سہ اگر گرگ بغل زن آگیا، [11] سب ہاتھی ہو گئے جیرہ اگر،
[12] کھا گیا جھٹ کر گیا جب پا گیا، [13] جدول ... رہی ... جاری ہے، [14] دوں لگا دو طائر و اژدر جلے [15] مطبوعہ۔ پھر پڑی جو آگ سب لشکر جلا

چیتر ۱۸۹۶ اشک

غزل

اقبال ماہر

کبھی گل کی کبھی ہم خار کی تعریف کرتے ہیں
یوں ہی فطرت کے ہر شہکار کی تعریف کرتے ہیں

لبِ ساحل کبھی منجدھار کی تعریف کرتے ہیں
کبھی موجِ سبک رفتار کی تعریف کرتے ہیں

خزاں کا ذکر تو حالات پر ہے منحصر ورنہ
ہمیشہ ہم گل و گلزار کی تعریف کرتے ہیں

وطن میں راحتِ آغوشِ بام و در نہیں ملتی
سفر میں سایۂ دیوار کی تعریف کرتے ہیں

حقیقت میں وہ ذکرِ گردشِ ایام ہوتا ہے
بظاہر شوخیِ رفتار کی تعریف کرتے ہیں

ہمارا ہاتھ ہے آرائشِ گیسوئے دوراں میں
زبانِ فن میں زلفِ یار کی تعریف کرتے ہیں

رموزِ زلفِ برہم سے کنایاتِ لب و رخ تک
نگارِ عالمِ اسرار کی تعریف کرتے ہیں

شفق جب رنگ بھرتی ہے افق کے لالہ زاروں میں
بہارستانِ روئے یار کی تعریف کرتے ہیں

مبادا پاؤں کی زنجیر بن جائے تن آسانی
ہم اکثر وادیِ پُرخار کی تعریف کرتے ہیں

ہمارے نکتہ چینیوں نے ہمارا نام اُچھالا ہے
بہ قدرِ ظرف ہم اغیار کی تعریف کرتے ہیں

تعجب ہے کہ جن میں ذکر بھی ان کا نہیں ماہرؔ
سُنا ہے وہ انھیں اشعار کی تعریف کرتے ہیں

غزل

جوہر ہاشمی

ایک ایک گل بہارِ تمنا کا زرد ہے
ہر آرزو کا پیکرِ خوش رنگ سرد ہے

جو شخص پوچھتا تھا ترے شہر کا پتہ
کیا جانے آج کیوں وہی صحرا نورد ہے

ان پتھروں کی قدر کرو ان میں دوستو
الماس ہے کوئی تو کوئی لاجورد ہے

شاید ہے وہ مسافرِ ناکامِ راہِ شوق
آنکھیں لہو ترنگ ہیں چہرے پہ گرد ہے

شامل ہیں سب ہی زیست کی پرلطف دور میں
شیرازۂ حیات مگر منفرد فرد ہے

آنکھوں میں ہے جو نور وہ ہے بے مثال نور
جو درد میرے دل میں ہے پرکیف درد ہے

ہم ان کی بے وفائی پہ تنقید کیا کریں
جب آرزو سے آرزو وقفِ نبرد ہے

آگے نکل گیا ہوں حدِ حسن و عشق سے
اب سوز ہے جگر میں نہ اب دل میں درد ہے

کیا تیرے شہر میں نہیں ملتا سکونِ دل
جوہرؔ سا کوہِ ضبط بھی صحرا نورد ہے

فضلِ حسین

مزاحیہ

رفیقہ

آج پورے ایک ہفتہ بعد مل رہا ہوں اپنی رفیقہ سے۔ اس سے پہلے کبھی اتنی مدت تک اس سے جدا نہ ہوا تھا۔ ہر جگہ اسے ساتھ لے جاتا تھا۔ عجیب اُنس تھا اس سے مجھ کو! دل چاہتا ہے لپٹ کر خوب رو لوں، دل کی بھڑاس نکل جائے۔ لوگوں نے تو بہت چاہا کہ میں اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاؤں لیکن خدا کا شکر ہے میری آنکھ بہت جلد کھل گئی اور اب کبھی اس سے جدا ہونے کا خیال تک دل میں نہ لاؤں گا۔ کیا کرتا صاحب؟ لوگوں کی لعن طعن سنتے سنتے عاجز آ گیا تھا۔

میں بات کر رہا تھا اپنی سائیکل کی، جسے لوگ عام طور سے کھٹارا کہتے ہیں۔

میں نے اُسے چار سال قبل پورے چالیس روپے میں خرید ا تھا اور صرف پینسٹھ روپے پچیس پیسے مرمّت کے دیے تھے اور یہ سڑک پر اتنی تیز بھاگنے لگی تھی کہ میں سڑک پر چلتے ہوئے کسی بھی سائیکل والے کو بآسانی اُوَرٹیک (OVER TAKE) کر سکتا تھا لیکن صاحب! یہ بات تو صرف میں جانتا ہوں۔ دنیا والوں کو تو اس سے خدا واسطے کا بیر تھا۔

میں اپنی پہلی تنخواہ ملنے پر اپنے شاگردوں کے لیے (جنھیں میں ٹیوشن پڑھاتا ہوں) مٹھائی لے کر پہنچا تو انھوں نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا۔ کہ "ماسٹر جی! آپ کو سب سے پہلے سائیکل خریدنی تھی!" کمبختوں کو جانے کیا پریشانی ہے۔ حالانکہ اس غریب سے انھیں بھی کافی سہولت تھی۔ مثلاً جب میں پڑھانے کے لیے ان کے دروازے پہنچتا تو تو بغیر آواز دیے ہی دروازہ کھول دیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ "جب آپ اس گلی میں داخل ہوتے ہیں تب ہی ہم لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔" وہ لوگ میری سائیکل کی مخصوص "موسیقی" سے کافی حد تک مانوس ہو چکے تھے۔ میں نے سائیکل میں گھنٹی کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی۔ کون سا انگ نہ بجتا تھا بیچاری کا؟ اکثر سڑک پر لوگ مجھے جلدی سے پاس دے دیتے۔ انھیں مغالطہ ہوتا کہ شاید کوئی ٹھیلا وغیرہ آ رہا ہے۔

مجھے اس سائیکل سے کتنی سہولت تھی، کتنا سکون تھا، بیان نہیں کر سکتا۔ آج تک اس سائیکل پر میرے علاوہ صرف ایک ہی صاحب نے سواری کا شرف حاصل کیا تھا۔ یہ بات نہیں ہے کہ میں سائیکل کسی کو دینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن لوگ اسے سائیکل ماننے سے سراسر انکار کر دیتے۔ دراصل وہ صاحب محلے میں نئے نئے آئے تھے۔ ایک دن آئے اور بڑی لجاجت سے مجھ سے کہنے لگے: "ماسٹر صاحب! ایک چیز کے لیے کہوں، اگر آپ انکار نہ کریں۔ . . . ؟"

میں نے کہا: ہاں! ہاں! بلا تکلف کہیے"! کہنے لگے: "ذرا اپنی سائیکل دیدیں۔ مجھے بھائی صاحب کو رسیو کرنے اسٹیشن جانا ہے۔ وقت بالکل ہو چکا ہے۔" میں نے کہا: "یہ کون سی بڑی بات ہے" اور جب میں نے اپنی سائیکل نکالی تو انھوں نے بڑی معصومیت سے پوچھا: "یہ سائیکل ہے؟" "نہیں! گھوڑا ہے"! میں جھلا گیا۔ خیر صاحب طوعاً و کرہاً وہ صاحب سائیکل لے گئے۔ کافی دیر بعد لوٹے منھ بنائے ہوئے۔ میں نے پوچھا: "کہیے صاحب! آئے آپ کے بھائی صاحب؟" انھوں نے ناراضگی کے لہجے میں جواب دیا: "اب گھر جاؤں تو معلوم ہو! کیونکہ اسٹیشن پہنچنے تک کئی مرحلوں سے گزرنا پڑا تھا۔ شاید بھائی صاحب انتظار کرتے کرتے اکیلے ہی چلے آئے . . ."

"خیریت تو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

ارے صاحب! کم از کم پانچ مرتبہ تو چین (CHAIN) اتری تھی۔ آدھے ہی راستے تک پہنچا تھا کہ پچھلی بریک گر گئی۔

"آگے بریک تھی ہی نہیں۔ اس لیے بقیہ راستہ پیدل ہی طے کیا۔"

"ارے صاحب! تو بنوا لیتے میں آپ کو پیسے دے دیتا۔ حالانکہ میں نے تو ایک مستری کو کونٹریکٹ (CONTRACT) دے رکھا ہے کیونکہ ہر دوسرے تیسرے گاڑی ریپیرنگ یعنی مرمت مانگتی ہی ہے. . . "

اور پھر اس دن سے قسم ہے کہ انھوں نے دوبارہ کبھی سائیکل کا نام لیا ہو . . . .

میں بڑے سے بڑے جلسے میں جاتا ہوں لیکن سائیکل اسٹینڈ پر کبھی ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ کہیں بھی پھینک دیتا ہوں بیچاری پڑی رہتی ہے۔ کون لے جائے گا؟ کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھنے تک کی زحمت گوارا نہ کرے گا۔

لیکن ادھر کچھ دنوں سے لوگوں کا احتجاج اتنا شدید ہوتا گیا کہ مجبوراً مجھے نئی سائیکل خریدنے کے بارے میں سوچنا پڑا۔ جب کوئی ملتا فوراً بول اٹھتا: "کہیے صاحب! سائیکل کب خرید رہے ہیں؟" جیسے پوچھ رہا ہو "شادی کب کر رہے ہیں؟"

میرے مستری نے بھی ایک دن عاجز آ کر الٹیمیٹم دے ہی دیا: "صاحب اب آپ اس سائیکل کا پیچھا چھوڑ دیں تو بہتر ہے ورنہ اب میں کوئی دوسرا کام شروع کر دوں گا۔ شاید ہی کسی دن ناغہ ہوتا ہو جب آپ سائیکل بنوانے نہ آتے ہوں۔ اب نئی سائیکل خرید لیجیے! اب تو آپ اتنے بڑے کالج میں لکچرر ہو گئے ہیں یہ سائیکل لے کر چلتے آپ کو زیب نہیں دیتا۔"

"تو اس کو بکوا دو!" میں نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"جناب آپ اس کی لاٹری ڈال دیں۔" دوکان پر کھڑے ایک دوسرے صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"اگر بیچنا چاہیں تو میں خرید سکتا ہوں۔" ایک گندہ سا آدمی بولا۔

"ارے واہ صاحب! ہم تو آپ جیسے لوگوں کی تلاش میں تھے ہی" میں نے بے انتہا خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: "بولیے کیا دیجیے گا؟"

"صاحب پندرہ پیسے کلو کے حساب سے لے لوں گا۔ لیکن یہ چیتھڑے اور ربر وغیرہ نکال کر!"

"کیا؟؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "کیا یہ ساگ سبزی ہے؟"

"نہیں صاحب! ساگ سبزی تو ایک روپیہ کلو بکتی ہے۔ میں لوہے کا بھاؤ لگا رہا ہوں۔"

"یعنی پوری سائیکل دس روپے کی بھی نہ ہوئی!" مجھے غصہ آ گیا۔ اور کیوں نہ آتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ سائیکل پورے چالیس روپے میں خریدی تھی اور پینسٹھ روپے پچیس پیسے مرمت کے دیے تھے۔ اور ادھر قریب ۶ ماہ سے مستری کو مستقل پانچ روپے ماہوار دیا کرتا تھا۔ ٹھیکہ جو دیدیا تھا!

"ہاں صاحب! بولیے کیا کہتے ہیں؟" خریدار نے استفسار کیا۔

"ارے یار جاؤ! ایسے بیچنے سے تو بہتر ہے کہ یہ سائیکل مستری کو ہی دے دوں۔ انھوں نے سیوا بھی بہت کی ہے اس کی۔"

نہیں صاحب! خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجیے" مستری گھگیایا "اس بلا کو اپنے پاس ہی رکھیے۔"

مجھے شدید دھچکا لگا۔ ایسی وفادار سائیکل کو کمبخت سراسر بلا کہہ رہا تھا۔

لیکن ایک دن اچانک میرے لڑکے ظفر نے نوٹس دے دی کہ اگر میں اس تیلی کو سائیکل نہیں خریدتا تو وہ بھوک ہڑتال شروع کر دے گا اور اس نے دوسری تاریخ کو واقعی صبح ناشتہ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ میں نے لاکھ منایا لیکن کہنے لگا: "اب تو لوگوں نے آپ کا نام رکھ دیا ہے۔ مجھے دوستوں میں بڑی شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔ ایک دن ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کس کے لڑکے ہو؟ میں نے آپ کا نام بتایا۔ انھیں کچھ تذبذب میں دیکھ کر میرے ایک ساتھی نے برجستہ کہا "ارے وہی کھٹارا سائیکل والے"! مجھے اس بات پر غصہ بھی آیا اور دلی صدمہ بھی پہنچا۔ لڑکا بھی برت توڑنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا اس لیے مجبوراً اسی دن مجھے نئی سائیکل خریدنا پڑی۔ اپنی رفیقہ کو میں نے مستری کی دوکان پر یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ "اگر کبھی کوئی اچھے دام لگائے تو نکال دینا . . . . . !"

سائیکل خرید کر میں فاتحانہ شان سے اس پر سوار ہوا۔ دل چاہتا کہ اسی وقت سارے شہر کا چکر لگا ڈالوں اور سبھوں کو بتا دوں کہ "لو! نئی سائیکل خرید لی میں نے! اب تو دل ٹھنڈا ہوا تم لوگوں کا؟" لیکن میں سائیکل پر سوار ہوتے ہی زمین پر آ رہا۔ دراصل میں نے سائیکل پر اتنی ہی طاقت صرف کر دی جتنی اپنی پرانی سائیکل پر کرتا تھا۔ سائیکل ڈسبیلنس (DISBALANCE) ہو گئی جس سے پیر کافی چوٹ آئی۔ ایک پاؤں بھی موچ کھا گیا۔ سات دن تک بستر پر پڑا رہا لیکن میری سائیکل دن بھر سڑکیں ناپتی رہی۔ ایک انقلاب

سا آگیا تھا۔ میرے بچے دن بھر گھر میں پوچھا کرتے "امی! کچھ منگا تو نہیں ہے؟" محلے کے لوگ بھی شاید اسی تاک میں تھے۔ جیسے دیکھیے "ذرا اپنی سائیکل دے دیجیے!" اور آج میں کالج جانے کے لیے بیٹھا تھا ـــــ ظفر سائیکل لے کر کہیں گیا تھا۔ لیکن پیدل ہی آتا نظر آیا۔ چہرہ اترا ہوا تھا کچھ خوف کے آثار بھی پائے جاتے تھے میرا دل دھک سے ہوگیا۔

"سائیکل؟" میں نے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔

"میں دوکان پر سائیکل کھڑی کر کے ٹماٹر چھانٹ رہا تھا۔ ٹماٹر لے چکا تو دیکھا سائیکل غائب تھی۔" اس نے کانپتے ہوئے کہا۔ میرے منہ سے کچھ نہ نکلا۔ جیسے سکتہ سا ہوگیا۔ دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ لیکن آج کالج جانا بہت ضروری تھا۔ اس لیے مجبوراً اپنے مستری کی دوکان پر پہنچا۔

"مستری! سائیکل بکی تو نہیں؟" میں نے بڑے افسردہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں! جہاں آپ رکھ گئے تھے وہیں پڑی ہے۔ صاحب خدا کے لیے اب اس کا پیچھا چھوڑیے! میں نے سمجھا تھا آپ نے نئی سائیکل خرید ہی لی ہے"

میں اس کو کیا جواب دیتا۔ خاموشی سے اپنی سائیکل نکالنے لگا لیکن آج وہ بھی نخرے کرنے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو "نہیں، نہیں! جائیے آپ نئی سائیکل خرید لیجیے۔ میں آپ کے کس کام کی!" بات معقول تھی۔ میں نے یقیناً اپنی اس رفیقہ کے ساتھ بے وفائی کی تھی لیکن خدا کا شکر ہے۔ صبح کا بھولا شام کو آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے ......

★

بقیہ: یوپی کی قبائلی خواتین

صنعتی ترقی سے ترائی بھابھر میں بیرونی اثرات کے بڑھنے کی وجہ سے کوہستانی علاقے میں ذرائع نقل و حمل اور پنج سالہ منصوبوں کے تحت دیہی علاقوں میں زرعی ترقی اور وسائل کے بڑھ جانے سے نہ صرف قبائلیوں کا طرز زندگی تبدیل ہو رہا ہے بلکہ ان کی اخلاقی قدریں بھی بدل رہی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ قبائلی سوسائٹی میں عورت کا مقام و حیثیت اور ان کے رول کے بارے میں خیالات بدل رہے ہیں۔ جہاں مشترکہ بیویوں کے رواج کے تدریجی زوال میں قبائلی عورت کی بہبودی ہے، وہاں غیر قبائلی اثرات کی وجہ سے اس کی مرد کے مساوی حیثیت یا جنسی فوقیت کو رفتہ رفتہ چیلنج کیا جا رہا ہے۔ قبائلی علاقوں میں غیر قبائلیوں کی آمد و رفت بڑھتی جا رہی ہے۔ قبائلی سماج غیر قبائلی رسم و رواج اور طور طریقے اپنا رہا ہے۔ مگر یہ رسم و رواج اور دستور ان کے حالات روایات اور مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے اس طرح قبائلی خواتین کے لیے نت نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور ان کی سماجی اور اقتصادی زندگی کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔

★

بقیہ۔ دیوانِ میر کا قدیم ترین مخطوطہ

یعنی رانی نے سُنی جب یہ خبر — آتش غم سے جلا اس کا جگر
کھینچ آہ سرد یہ کہنے لگی — عشق کی تھی آگ کیا بہنے لگی
بن جلا کر بستیوں میں آ لگی — پھیل کر یاں دل جگر کو جا لگی
جمع کر خاشاک و خار و خس تناب — جل گئے وے آگ وہ بھی بس تناب
کیا لگی دل کو کہ رانی جل گئی — خاک ہو کر خاک ہی میں رل گئی
عشق ہی کی ہیں یہ تازہ کاریاں — عشق نے پردے میں جانیں ماریاں
مور کے بدلے جلایا دشت مار — مار و اژدر جل گئے چندیں ہزار

بل کے لشکر ہوگیا تھا بے چراغ — بہ خبر سن ہوگیا راجہ بھی داغ
عشق سے کیا میر اتنی گفتگو — خاک اڑا دی عشق نے ہر جا یہ سو
درمیاں نہ کوہ نہ انبوہ ہے — رانی کا راجہ کا اب اندوہ ہے
طائر و طاؤس و حیواں اژدہے — سب کہے کیا کیا عشق کی کوئی کہے[1]
یہ فسانہ تازہ کیا عالم کے بیچ
تا زمانہ ان کے ہیں سب غم کے بیچ

---

[1] سب کہے کیا عشق کی کوئی کہے

★

غزل

احترام اسلام

مر مر کے جینے رہنے کی چاہت ملی مجھے
کچھ اتنی دوستوں کی محبت ملی مجھے

یا دل کی دھڑکنوں کو سہارا سا مل گیا
یا یوں کہوں کہ آپ کی قربت ملی مجھے

اپنے بھی مجھ سے روٹھ کے بیگانے ہو گئے
اللہ جانے کیسی یہ قسمت ملی مجھے

پُرپیچ رہ گزار میں منزل بھی ہوئی
شامِ الم میں صبحِ مسرت ملی مجھے

گھبرا کے مے کدے کی طرف لوٹنا پڑا
بیرونِ میکدہ وہ قیامت ملی مجھے

سمجھا ہوں آج میں بھی فریبِ حیات کو
جب موت زندگی کی بدولت ملی مجھے

ناکامیِ حیات میں کچھ تھا مرا قصور
شامل کچھ آپ کی بھی عنایت ملی مجھے

اے دوست اپنی فکر بھی ہوتی مجھے مگر
تیرے خیال ہی سے نہ فرصت ملی مجھے

یا غم تری شگفتہ رُخی میں نہ چھپ سکا
یا احترامؔ چشمِ بصیرت ملی مجھے

غزل

مجیب بستوی

کانٹوں نے گلستاں میں اک شور مچایا ہے
پھولوں کی طرف ہم نے جب ہاتھ بڑھایا ہے

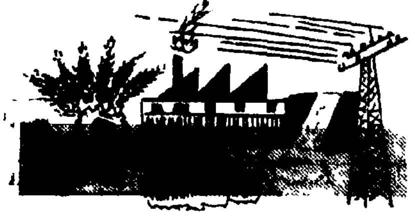
میخانے کی چوکھٹ سے جنت کے دریچوں تک
تیرے گھنے گیسو کا پھیلا ہوا سایا ہے

بادل تری رحمت کے گھر گھر کے چلے آئے
آنسو مری آنکھوں میں جس وقت بھی آیا ہے

کونین کی وسعت کا ہر ذرّہ چمک اٹھا
نقشہ تری صورت کا جب ہم نے بنایا ہے

آمد تری جس میں تھی جب وہ بھی گھڑی گزری
دکھتا ہوا دل ہم نے پہلو میں سلایا ہے

کتنوں کی مجیبؔ آنکھیں نمناک ہوئیں سُن کر
جب ہم نے کوئی نغمہ محفل میں سنایا ہے



اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

ڈگری کالجوں کے ٹیچروں کی تنخواہوں میں اضافہ ●●● ریاست میں آبپاشی کے لیے مزید سہولتیں ●●● ریاستی حکومت کی جانب سے مہنگائی بھتہ میں مزید اضافہ ●●● مجاہدین آزادی کے بچوں کے لیے تعلیمی سہولتیں ●●● ڈگری کالجوں کے ٹیچروں کی تنخواہوں کی باقاعدہ ادائیگی کا بندوبست ●●● روہیلکھنڈ ڈویژن میں سیاحوں کے لیے مزید سہولتیں ●●● سون پمپ نہر اسکیم ●●● ریاست میں ۱۸۰ ایلوپیتھک اسپتالوں کا قیام ●●● اردو ٹیچروں کے لیے پرائمری اسکولوں کو مالی امداد ●●● پرائمری اسکولوں کے اردو ٹیچروں کو عبوری راحت ●●● تعلیمی فیس کی ادائیگی

حکومت اتر پردیش نے وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کی یقین دہانی کے بموجب نجی ڈگری اور پوسٹ گریجویٹ کالجوں کے ٹیچروں، جن میں پرنسپل بھی شامل ہیں، کی تنخواہوں میں ۱۰۰ روپیہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

یہ خصوصی اضافہ تنخواہ کی ان شرحوں میں ضم کر دیا جائے گا جن کا اعلان حکومت ہند ان ٹیچروں کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی سفارشات کی بنیاد پر کرے گی۔ وارانسی سنسکرت یونیورسٹی نیز آگرہ اور میرٹھ یونیورسٹیوں سے ملحق اداروں کے ان ٹیچروں کو بھی یہ اضافہ دیا جائے گا جو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی شرحوں پر کام کر رہے ہیں۔

⁂

ریاست میں ۷۴-۱۹۷۳ء کے دوران دسمبر تک آبپاشی کے مختلف ذرائع کی سکیموں کے نتیجہ میں ۱۱ر۴ لاکھ ہیکٹر آراضی کے لیے آبپاشی کی سہولتیں مہیا کی گئیں جبکہ گذشتہ سال اسی مدت کے دوران ۱۸ر۳ لاکھ ہیکٹر کے لیے آبپاشی کا بندوبست کیا گیا تھا سال رواں کے لیے مقررہ نشانہ کا تقریباً ۷۵ فیصد پورا ہو گیا ہے۔

اس مدت کے دوران ۳۹۱۹۳ نجی ٹیوب ویلوں اور ۹۲۳۵ سرکاری ٹیوب ویلوں نیز ۱۷۲۶۲ پمپنگ سیٹوں کی تنصیب کی گئی۔ پہاڑی علاقوں میں افراد اور گاؤں سبھاؤں کی طرف سے بالترتیب ۲۸۱۶۰ ہیکٹر اور ۳۱۴۲ ہیکٹر آراضی کی آبپاشی کے لیے بندھیاں، گولین اور آبی ذخیرے تعمیر کیے گئے۔

اس کے علاوہ زیر نظر مدت کے دوران ۱۱۱۰۸ کیلو میٹر لمبی نالیاں بھی تعمیر کی گئیں۔ اس کے علاوہ مذکورہ مدت کے دوران ۷۱۹۴۴ نلیاں اور ۹۵۴۳ کنوئیں کھودے گئے۔

⁂

ریاستی حکومت، لوکل باڈیز اور امداد یافتہ تعلیمی اور ٹیکنیکی اداروں کے تقریباً ۱۱ لاکھ ملازمین کو یکم اکتوبر سنہ ۱۹۷۳ء سے مہنگائی بھتہ میں تیسرا اضافہ دیا جائے گا تاکہ مہنگائی بھتہ کی شرح مرکزی ملازمین کے برابر ہو جائے۔ اس اضافہ کے نتیجہ میں مالی سال رواں کے دوران ۱۹ر۵ کروڑ روپیہ اور پورے سال میں ۴۶ر۱۲ کروڑ روپیہ کے مصارف ہوں گے۔

اس اضافہ سے متعلق ایک سرکاری حکم میں کہا گیا ہے کہ مہنگائی بھتہ کی نئی شرحیں ۳۰۰ روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پانے والے ملازمین کے لیے تنخواہ کے ۱۲ فیصد اور ۳۰۰ روپیہ سے زیادہ اور ۱۲۰۰ روپیہ تک تنخواہ پانے والوں کے لیے ۹ فیصد کے برابر ہوں گی لیکن زیادہ سے زیادہ اضافہ ۸۱ روپیہ اور کم سے کم اضافہ ۳۶ روپیہ ماہانہ ہوگا۔

ریاستی حکومت نے یکم اگست ۱۹۷۲ء کے بعد ریاستی ملازمین کا مہنگائی بھتہ مرکزی ملازمین کے برابر کرنے کا جو اعلان کیا تھا اس کے نتیجہ میں یکم مئی ۱۹۷۳ء اور یکم اگست ۱۹۷۳ء سے

مہنگائی بھتہ میں دو اضافے منظور کیے جا چکے ہیں۔ مہنگائی بھتہ میں جو مذکورہ بالا تین اضافے کیے گئے ہیں وہ تنخواہ کی نئی شرحوں کے ساتھ منظور شدہ اس مہنگائی بھتہ کے علاوہ ہیں جن کی سفارش تنخواہ کمیشن نے کی تھی اور جنہیں حکومت نے ۴ جولائی ۱۹۷۳ء کو منظور کیا تھا۔

❖ ❖ ❖

مجاہدین آزادی کے بچوں اور دیگر زیر کفالت افراد کو حکومت کی منظور شدہ اس اسکیم کے تحت جو وظائف اور دیگر تعلیمی سہولتوں سے متعلق ہے، ترمیم کے تحت فائدہ پہنچے گا۔ بنیادی اسکیم کے بموجب جو سنہ ۱۹۶۹ء میں نافذ کی گئی تھی، مجاہد آزادی کے صرف ایک بچے کو تعلیمی سہولتوں کا استحقاق حاصل تھا۔

مذکورہ بالا اسکیم میں ترمیم کے بعد جو گزشتہ ۱۳ جنوری سے کی گئی ہے۔ اب مجاہدین آزادی کے تمام نابالغ بیٹے، غیر شادی شدہ بیٹیاں، زیر کفالت بہنیں اور بیویاں یا بیوائیں وظائف اور تعلیمی سہولتوں کی مستحق ہوں گی۔ حکومت نے ۳۰۰ روپیہ ماہانہ آمدنی کی حد بھی ختم کر دی ہے اور اب مجاہدین آزادی اپنی آمدنی سے قطع نظر ان سہولتوں کو حاصل کر سکتے ہیں۔

ترمیم شدہ اسکیم کے تحت ان سہولتوں کے خواہش مند مجاہدین آزادی کے بچے اور زیر کفالت افراد مقررہ فارموں پر اپنی درخواستیں دے سکتے ہیں۔ یہ فارم ڈسٹرکٹ انسپکٹرس آف اسکولس، ڈپٹی اور اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹریس کے دفتروں سے اور تسلیم شدہ تعلیمی اداروں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

ڈگری کالجوں کے ٹیچروں کو تنخواہوں کی بے قاعدہ ادائیگی کی دشواریوں کو دور کرنے کے مدنظر ریاستی حکومت نے اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے مناسب بندوبست کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ڈائرکٹر کو ہدایات جاری کی گئی ہیں کہ وہ حکومت کو مطلع کریں کہ ہر کالج کے لیے کتنی رقم درکار ہے تاکہ ان تعلیمی اداروں کے خسارے کو خصوصی مالی امداد منظور کر کے پورا کیا جا سکے اور ٹیچروں کو یقینی طور پر باقاعدگی کے ساتھ تنخواہوں کی ادائیگی کا بندوبست کیا جا سکے۔

حکومت نے چار ڈگری کالجوں یعنی بابا راگھو داس ڈگری کالج، دیوریا، کے کے کالج، اٹاوہ، کے جی کے ڈگری کالج، مرادآباد اور چودھری چھوٹو رام ڈگری کالج، مظفر نگر کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے کیونکہ ان کالجوں میں ٹیچروں کی تنخواہ کی ادائیگی میں بے قاعدگی اور بدانتظامی کے خلاف متعدد شکایات موصول ہوئی ہیں۔ ان کالجوں کا انتظام خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لیے مجاز کنٹرولروں کی تقرری کی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ مزید چھ ڈگری کالجوں کے خلاف بھی جانچ کی جا رہی ہے۔

❖ ❖ ❖

روہیلکھنڈ منطقے میں سیاحوں اور تعطیلات منانے والوں کے لیے قومی شاہ راہ نمبر ۲۴ پر مختلف سہولتیں جلد ہی فراہم کی جائیں گی جن میں کیفیٹیریا، ہوٹلوں، پینے کے پانی کی فراہمی اور ضروری ساز و سامان سے آراستہ غسل خانوں اور پاخانوں کا قیام شامل ہے۔ یہ فیصلہ منطقائی سیاحت مشاورتی کمیٹی کے ایک جلسہ میں کیا گیا جو حال ہی میں ڈویژنل کمشنر کی صدارت میں بریلی میں منعقد ہوا۔

جلسہ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ سیاحوں اور دیگر افراد کو آبی ذخیروں اور دیگر ترقیاتی اسکیموں سے روشناس کرنے کے لیے معلوماتی دوروں کا بندوبست بھی کیا جائے۔ اس کے علاوہ بریلی، رام پور اور پیلی بھیت میں سیاحوں کو مزید رہائشی سہولتیں بھی فراہم کی جائیں گی۔

❖ ❖ ❖

ایشیا کے سب سے بڑے لفٹ آبپاشی پراجکٹ سون پمپ پر زور و شور سے کام جاری ہے۔ یہ پروجکٹ خشک سالی سے متاثرہ ضلع مرزاپور میں مکمل کیا جا رہا ہے اور اس پر ۸۹ء۴ کروڑ روپیہ کی لاگت آئے گی۔ یہ پروجکٹ، جس کا سنگ بنیاد وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے حال ہی میں رکھا تھا، سون ندی کے کنارے پر واقع ہے

یہ پروجیکٹ جس کی تکمیل سنہ ۱۹۷۷ء تک متوقع ہے، اس

علاقہ کے عوام کو پینے کے پانی کی سہولت فراہم کرنے کے علاوہ ۶۶۲۷۰ ہیکٹیر آراضی کی آبیاری کرے گا۔ اس کے نتیجہ میں ہر سال مزید آٹھ لاکھ کوئنٹل غلہ اور ۳۶۶۵ لاکھ کوئنٹل گنا اور دیگر فصلیں پیدا ہوں گی جس کی مالیت چھ کروڑ روپیہ ہوگی۔ اس طرح ایک سال کی زائد آمدنی پروجکٹ کی کل لاگت سے سے زیادہ ہوگی۔

❖ ❖ ❖

حکومت اترپردیش نے ریاست کے دیہی علاقوں میں قائم کیے جانے والے ۱۰۴ ایلوپیتھک اسپتالوں کی جائے وقوع تبدیل کر دی ہے۔ یہ فیصلہ اس امر کے پیش نظر کیا گیا ہے کہ مالی سال رواں کے دوران ۱۰۴ اسپتالوں اور ڈسپنسریوں کے قیام کے لیے جن مقامات کا انتخاب کیا گیا تھا، ان میں سے ۱۸ اسپتال کسی وجہ سے قائم نہیں کیے جا سکے۔

ضلع الہ آباد میں بھٹ پورا در جاری میں ایک ایک اسپتال قائم کرنے کے لیے پہلے ہی احکام جاری کیے جا چکے ہیں۔ بقیہ ۱۶ اسپتال گوری خالصہ (ہردوئی)، نعمت پور (فرخ آباد)، رٹرگاؤں اور رستا (کان پور)، سہسون اور جگت پور (الہ آباد)، بیئی یاز پیرا کھیرا اور علی در پور (بستی)، دلدار نگر (غازی پور)، پرسے تیواری (گونڈہ)، ڈھکولا بازار (پرتاب گڑھ)، گوتھانی (بلند شہر)، سدا باد (زنانہ) (متھرا)، فتح گنج (تحصیل تری بانڈ) اور بیٹ کوٹ (رام نگر بلاک۔ نینی تال) میں قائم کیے جائیں گے

❖ ❖ ❖

حکومت اترپردیش نے چوتھے پنج سالہ منصوبہ کے تحت ضلع پریشدوں، میونسپلٹیوں اور کارپوریشنوں کے زیر انتظام پرائمری اسکولوں میں مقرر کیے گئے ۹۵۲ اردو ٹیچروں کے سلسلہ میں ۱۶۷۶۲۲۶ روپیہ کی مالی امداد منظور کی ہے۔

اس سلسلے میں منظور شدہ کل رقم میں سے دیہی علاقوں میں ضلع پریشدوں کے زیر انتظام پرائمری اسکولوں کے ۶۱۱ اردو ٹیچروں کے لیے ۴۳۰۷۷۰۱ روپیہ اور شہری علاقوں میں میونسپلٹیوں اور کارپوریشنوں کے زیر انتظام پرائمری اسکولوں کے ۳۴۱ اردو ٹیچروں کے لیے ۵۹۸۷۹۶ روپیہ کی رقم فراہم کی گئی ہے۔

❖ ❖ ❖

ریاستی حکومت نے پانچویں پنج سالہ منصوبہ کے تحت لوکل باڈیز اور ضلع پریشدوں کی طرف سے پرائمری اسکولوں میں تقرر کردہ ۹۵۲ اردو ٹیچروں کو ۱۹۷۳-۷۴ء کے دوران وقتاً فوقتاً منظور شدہ عبوری راحت دینے کی غرض سے مجموعی طور پر ۴۶۴۱۰۰ روپیہ کی مالی امداد منظور کی ہے۔ اس رقم میں سے دیہی علاقوں میں ضلع پریشدوں کے زیر انتظام پرائمری اسکولوں کے ۶۱۱ ٹیچروں کے لیے ۲۹۶۳۲۸ روپیہ اور میونسپلٹیوں اور کارپوریشنوں کے زیر نگرانی پرائمری اسکولوں کے ۳۴۱ ٹیچروں کے لیے ۲۷۷۷۶۱ روپیہ منظور کیا گیا ہے۔

❖ ❖ ❖

حکومت اترپردیش نے ۲۲۵ روپیہ یا اس سے کم ماہانہ تنخواہ پانے والے ملازمین کے ۱۲ ویں درجہ تک زیر تعلیم بچوں کی تعلیمی فیس ادا کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں سائنس فیس بھی شامل ہے یہ سہولت اب تک صرف ۱۰۰ روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پانے والوں کو بھی میسر تھی۔ اس سلسلہ میں انتہائی حد ۱۰۰ روپیہ سے بڑھا کر ۲۲۵ روپیہ کرنے کا فیصلہ مختلف وجوہ اور تنخواہ کمیشن کے تنخواہ کی شرحوں میں اضافہ کرنے کی بنا پر کیا گیا ہے۔ اگرچہ ۱۰۰ روپیہ کی متوازی رقم نئی شرحوں میں ۲۰۵ روپیہ ہے تاہم حکومت نے ۲۲۵ روپیہ تک ماہانہ تنخواہ پانے والے ملازمین کو بھی یہ سہولت دینے کا فیصلہ کیا ہے

★

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

اُردو مضمون کا ارتقاء

مصنفہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر۔ ۱۹۵۰ء تک ۔ سائز ۲۲ × ۱۸

کاغذ، کتابت، طباعت ۔ اعلیٰ و معیاری ۔ قیمت بارہ روپیہ۔
ملنے کا پتہ: مصنفہ ایلیا، لنگر حوض حیدرآباد ۔ ۸ ۔ (اے ۔ پی)

اردو مضمون کا ارتقاء ۱۹۵۰ء تک، ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ کا تحقیقی مقالہ ہے، جس پر انھیں عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد سے ۱۹۵۸ء میں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی ۔ یہ مقالہ خاصا ضخیم تھا، ڈاکٹر صاحبہ نے اس کو مختصر اور مرتب کر کے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔

پہلے مقالہ کا عنوان اردو انشائیہ کا ارتقاء ۱۹۵۰ء تک تھا، لیکن بعد میں ڈاکٹر صاحبہ نے ایسے (ESSAY) کے لیے مضمون کی اصطلاح پسند کی ان کے خیال میں "ہلکے پھلکے موضوعات پر پرلطف اور شگفتہ انداز میں لکھی ہوئی ایسی تحریریں جن میں مضمون نگار کی شخصیت کی جھلک اور اس کے ذہن کا پرتو موجود ہوتا ہے" انشائیہ ہیں۔ اس کتاب میں اس نازک فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ لیکن اردو مضمون کے ارتقا کے سلسلے میں، انشائیہ کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے ۔

کتاب کے نو باب ہیں پہلے باب میں "ایسے اور اس کا فن" پر روشنی ڈالی ہے ۔ یہ باب مصنفہ نے بڑی محنت اور کاوش سے لکھا ہے ۔ "ایسے" کی پیدائش، اس کی تشکیل و ترقی، اس کے موضوعات، خصوصیات اور اس کے اقسام کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ اس سلسلہ میں انھیں دنیا کی متعدد زبانوں کا مطالعہ کرنا پڑا ۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صرف ایک باب میں انھوں نے اپنا کتنا خونِ جگر صرف کیا ہے اسی طرح دوسرے باب "مضمون نما تحریروں میں بھی چینی، عرانی، رومی، عربی اور فارسی ادب سے استفادہ کر کے اس میں مثالیں پیش کی ہیں ۔ سچ تو یہ ہے کہ تحقیق کے سخت اور دشوار گزار کام سے واقف حضرات ڈاکٹر صاحبہ کی محنت کا اندازہ کر سکتے ہیں اور بغیر کسی جھجک کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہی دو ابواب ڈاکٹر صاحبہ کی ادبی اور تحقیقی حیثیت و صلاحیت کو تسلیم کرنے کے لیے کافی ہیں۔

تیسرے، چوتھے اور پانچویں باب میں عصر اصلاح، علی گڑھ تحریک اور اس کے ردعمل کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔ عصر اصلاح، کو اردو نثر کا زریں عہد کہنا چاہیے ۔ اسی عہد میں اردو کے ایسے ادراک نے چراغ روشن ہوئے جنھوں نے اردو نثر کو مصنوعی اور پرتکلف اسالیب کی تاریکی سے نکال کر سیدھا اور آسان راستہ دکھایا ۔ ماسٹر رام چندر اور ان کے رفقا اور تلامذہ کے نثری کارنامے اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحبہ نے عصر اصلاح کے تحت ماسٹر رام چندر اور ان کے تلامذہ ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، اور نذیر احمد کی نگارشات کا ذکر کیا ہے ۔ اور علی گڑھ تحریک کو اس میں شامل نہیں کیا ہے ۔ غالباً علی گڑھ تحریک کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ڈاکٹر صاحبہ نے اس کو علیحدہ بیان کرنا ہی مناسب سمجھا ۔ اس سلسلے میں انھوں نے سرسید، حالیؔ، چراغ علی، محسن الملک، وقار الملک، قاری سرفراز حسین اور اسماعیل میرٹھی کا ذکر کیا ہے اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے ۔ علی گڑھ تحریک، اردو شعر و ادب کی اصلاحی اور ترقی پذیر تحریک تھی اور وہ نئے رجحانات اور نئے علوم و فنون کو اپنانے کی حامی تھی ۔ اس تحریک کے اراکین اردو نثر کے ایسے معمار ہیں جن کے فن اور شعور نے اس کو وسعت و جامعیت اور افادیت و مقصدیت عطا کی ۔ اس تحریک کی شدت کے ساتھ مخالفت بھی کی گئی ۔ یہ مخالفت دو صورتوں میں ہوئی ۔ پہلی صورت مشرقی ادب و تہذیب کی بقا کے لیے و دوسری مغرب کی اندھا دھند تقلید کے خلاف ۔ اودھ پنچ نے سرسید تحریک کی دھجیاں اڑانی شروع کیں ۔ سرسید کو نیچری اور ان کے رفقاء کار کو نیچری کہا گیا اور طنز و مزاح کے پیرایے میں علی گڑھ تحریک کے بانی اور اس کے حامیوں پر سخت نکتہ چینی کی گئی اس میں شک نہیں کہ منشی سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف تربھون ناتھ ہجر، سید محمد آزاد کی نگارشات نے اردو مضمون نویسی میں چار چاند لگا دیے لیکن اودھ پنچ میں اور بھی ایسے مضمون نگار تھے جن کو مضمون نگاری میں کمال تھا مثلاً پنڈت برج نرائن چکبست کا مضمون "مولانا حالی کا ہوا سے لڑنا" انشائیہ نگاری کا اچھا نمونہ ہے ۔

ایک اور ردعمل خود علی گڑھ تحریک کے حامیوں کے اندر پیدا ہوا ۔ سرسید کی بڑھتی ہوئی مغرب پسندی نے خود سرسید کے قریبی حلقے میں بے چینی پیدا کر دی، شبلی نعمانی نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور ان کی رہنمائی میں مشرق و مغرب کے محاسن کو اپنائے جانے کا کام شروع ہوا۔

ڈاکٹر صاحبہ نے ان تمام مباحث پر بڑی خوبی کے ساتھ مدلل روشنی ڈالی ہے ۔ ان کی تحریر میں کہیں ابہام نہیں ہے ۔ وہ اپنی بات کو سلجھے ہوئے اور دل نشین انداز میں بیان کرنے کا بہترین سلیقہ رکھتی ہیں ۔

چھٹے باب میں انشائیہ پر رومانیت کی پرچھائیں پر بحث کی ہے اور مشہور انشائیہ نگار سجاد انصاری، مہدی افادی، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کی رومانیت پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے ۔

ساتواں اور آٹھواں باب عصر جدید سے تعلق ہے ۔ اس میں حسب ذیل عنوانات قائم کر کے مشاہیر ادب کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے :

۱۔ تاریخی اور سیاسی مضامین کے تحت عبد الحلیم شرر، محمد علی جوہر ظفر علی خاں اور ابو الکلام آزاد کی نگارشات پر تبصرہ کیا گیا ہے ۔

۲۔ انشائے لطیف کے تحت ناصر علی، یوسف حسن، میاں بشیر احمد عبد العزیز فلک پیما، اختر جونا گڑھی، جوش ملیح آبادی اور حجاب امتیاز علی کی انشائیہ نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

۳۔ مذہبی، سماجی اور اصلاحی مضمون نگاروں میں سید سلیمان ندوی عبد السلام ندوی، عبد المالک آروی، سلطان حیدر جوش اور میاں محمد شاہدین وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے ۔

عصر جدید کے پہلے حصہ میں ڈاکٹر صاحبہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش

کی ہے کہ اردو انشائیہ یا مضمون نگاروں نے ہر قسم کے مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور اردو نثر کو دلچسپ، مفید اور وقیع بنایا ہے۔

عصر جدید حصہ دوم کو تین عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ فلسفیانہ مضامین، طنز و مزاح، اور تحقیقی و تنقیدی مضامین۔ فلسفیانہ مضامین میں نظم طباطبائی، حسن نظامی، عبدالماجد دریا آبادی اور ڈاکٹر عابد حسین کی نگارشات سے بحث کی ہے۔ طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے محفوظ علی بدایونی، فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، عرش ملسیانی اور فرقت کاکوروی کو پیش کیا ہے۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے تحت صدر یار جنگ حسرت شیرانی، وحید الدین سلیم پانی پتی، ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری، ڈاکٹر عبدالحق، عبدالقادر، حسرت موہانی، پریم چند، چکبست، دتاتریہ کیفی، فراق گورکھپوری اور خواجہ احمد فاروقی کے مقالات سے نمونے پیش کیے ہیں۔ اس حصے میں بعض مشاہیر کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ شمس العلماء عبدالرحمان صاحب (مراۃ الشعر)، ڈاکٹر ذاکر حسین، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، مالک رام، امتیاز علی خاں عرشی، محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر کلیم الدین احمد، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اور قاضی عبدالودود وغیرہ اساطین ادب کی خدمات کا ذکر نہ ہونا حیرت انگیز ضرور ہے۔ ممکن ہے اختصار اس کا سبب ہو۔

نواں اور آخری باب، ترقی پسند تحریک اور اردو مضمون نگاری کے متعلق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں لکھا ہے:

"اردو ادب میں زندگی کی متحرک اور جدلیاتی حقیقتوں کا احساس اور تغیر پذیر سیاسی و معاشی قدروں اور آرٹ کے سماجی کردار کا شعور ۱۸۵۷ء کے اس عظیم واقعے سے اجاگر ہونے لگتا ہے جسے کارل مارکس نے ایشیا کا عظیم انقلاب کہا تھا۔"

اگر ترقی پسند تحریک سے اشتراکی نظریات و عقائد اور ان کے پروپیگنڈے کو علیحدہ کر دیا جائے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس تحریک کی ابتدا سرسید کے زمانے ہی میں ہو گئی تھی۔ سرسید اور ان کے رفقاء کا شمار اس کے بانیوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے موثر اور مدلل انداز میں (۱۸۵۷ء سے ۱۹۲۸ء تک) اردو نثر کا جائزہ لیا ہے اور اس کے اندر نئے نئے رجحانات اور اسلوب پر بحث کی ہے اور وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

"بیدار ذہن رکھنے والوں نے ادب کے متعلق یہ تسلیم کیا کہ زندگی اور ادب کا ایک اٹوٹ ناتا ہے۔ بہترین اور صحت مند ادب کی علامت یہ ہے کہ وہ زندگی کے مادی مسائل سے آنکھیں نہ چرائے۔"

انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس ۱۹۳۶ء کی صدارت کرتے ہوئے پریم چند نے واضح طور پر یہ خیالات ظاہر کیے تھے۔

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں۔"

ترقی پسند تحریک اور تنقیدی مضامین کی مقبولیت و اہمیت کے اسباب پر ڈاکٹر صاحب نے اختصار مگر جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ مجنوں گورکھپوری، اختر حسین رائے پوری، احتشام حسین، آل احمد سرور، ممتاز حسین، اختر اورینوی اور عبادت بریلوی کی تنقید نگاری پر تبصرہ کر کے ان کی تنقیدی خدمات کو سراہا ہے۔

اردو مضمون کا ارتقاء عمومی حیثیت سے اردو ادب میں قابل قدر اہم اور مفید اضافہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب تحقیق کی پرخار وادیوں کو حسن خوبی اور محنت کے ساتھ گل و گلزار بنا رہی ہیں اس کے لیے وہ قابل مبارکباد ہیں۔ وہ اپنی محنت اور لگن اپنے مطالعہ اور شوق اور ان سب سے بڑھ کر اپنے سلیقہ اور شعور سے اردو تحقیق کو ہفت پہل نگینہ بنا رہی ہیں۔ حالی، سلیم پانی پتی اور بابائے اردو کی بیشتر خصوصیات، ان کی شخصیت، اور ان کے اسلوب میں جمع ہو گئی ہیں۔ اردو مضمون کا ارتقاء اس کی ایک اچھی مثال ہے۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

★

بقیہ: لانجی نس

نفس کے والہانہ اظہار کے جو ہر بھی کسب کر لیے جائیں تو اس کا حصول پائیدار اور لافانی بن جائے گا۔ اچھی بات کے پیچھے اگر کردار کی عظمت نہ ہو تو وہ وقتی طور پر ہمیں اپنی عظمت کا قائل کر لے گی لیکن زندہ جاوید مرغوبیت اس میں پیدا نہیں ہو سکتی۔

لانجی نس کا یہ نظریہ ہمارے دور میں کافی غور و خوض کا مستحق ہے جبکہ شاعری محض ایک ذہنی کرشمہ سازی بن چکی ہے اور کلام کا شخصیت سے مناسب نہ ہونا کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ لانجی نس کا دعویٰ ہے کہ شعر کو حیثیت نفس استعمال کرنے والے زندہ جاوید اشعار کے خالق نہیں ہو سکتے۔ جاویدیت کردار کی عظمت اور روح کی گہرائی سے آتی ہے۔ یہ مصنف کی روحانی علویت ہی ہے جو عظیم ادب کے پیرایہ میں تحلیل ہو کر ہر روحِ انسانی میں محبوبیت کے ساتھ نفوذ کر جاتی ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لانجی نس کے نزدیک وجدانیت اسی ادیب کی مستند ہے جس کی روح بلند ہے۔ گندی روح کا وجدان معتبر نہیں ہے۔

★



...ہوگیا ۲۴ جنوری ۱۹۷۴ء
...موریل ہال لکھنؤ میں
...کے احتشام نمبر کا
...کی ایک کاپی احتشام
...کے صاحبزادے جعفر عسکری
...

...اعلیٰ تیری ہوگیا اتر پردیش اسٹیٹ اسپنگ ملس کا سنگ بنیاد ۳۱ جنوری ۱۹۷۴ء کو رکھتے ہوئے



Regd No LW/NP-17



• وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو ان کی نئی دہلی کی قیام گاہ پر ۸ مارچ کو ہر طبقے کے لوگ مبارکباد دینے کے لیے آئے۔
تصویر میں ایک خاتون شریمتی اندرا گاندھی کی پیشانی پر گلال لگا رہی ہیں



ماہنامہ
نیا دور
لکھنؤ
جلد ۳۰ | نمبر ۲
مئی ۱۹۷۴ء
ایڈیٹر
خورشید احمد
جوائنٹ ایڈیٹر
امیر احمد صدیقی
پبلشر
شرومنی شرما
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات اتر پردیش
پرنٹر
اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ
یو گورنمنٹ پریس عیش باغ۔ لکھنؤ
شائع کردہ
محکمہ اطلاعات اتر پردیش
فی پرچہ ۔ پچاس پیسے
سالانہ چندہ ۔ پانچ روپیے
ترسیل زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ انفارمیشن سی ڈپارٹمنٹ
اتر پردیش۔ لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور
انفارمیشن ڈپارٹمنٹ اتر پردیش لکھنؤ

سرورق: قیصر سرمست

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

پنڈت جواہرلال نہرو کی دسویں برسی ملک بھر میں ۲۷ مئی کو منائی جارہی ہے۔ برسی کے موقع پر وزرا، ممبران پارلیمنٹ، مجالس قانون ساز کے اراکین، مختلف پارٹیوں کے لیڈر، ماہرین تعلیم، دانشور، طلبا، عوام غرض ہر طبقے اور خیال کے لوگ عظیم نہرو کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ جدید ہندوستان کے معمار پنڈت نہرو کی بے مثال تدبر و فراست، ان کی حب الوطنی، کاروان آزادی کے ایک عظیم سپہ سالار کی حیثیت سے ان کی ولولہ انگیز قیادت اور ان کے جذبۂ خدمت نے انھیں نہ صرف ایک عظیم سیاسی شخصیت کا مالک بنا دیا تھا بلکہ وہ اپنی انسانیت نوازی، امن کوشی، رواداری، وسیع القلبی، صلح پسندی، دور اندیشی، سیکولرزم پر پختہ عقیدہ اور اظہار رائے کی آزادی کے علم بردار ہونے کے باعث ملک کے محبوب ترین رہنما اور اقوام عالم کی صف میں ممتاز حیثیت کے مالک بھی بن گئے تھے۔ انھوں نے ساری دنیا کو بقائے باہم کی تلقین کی اور "پنچ شیل" کے اصول بتائے۔ اسی کے ساتھ اپنے ہم وطنوں کے لیے سیکولرزم کا نصب العین تجویز کیا۔ آج جب کہ ملک و قوم سے جدا ہوئے انھیں دس سال گزر چکے ہیں اور اس عرصے میں ملک اور بیرون ملک حالات میں اتنی تبدیلی آچکی ہے، ان کے نصب العین اور ان کی پالیسیاں اتنی ہی درست ہیں جتنی ان کی حیات میں تھیں۔ آج بھی اگر ان کے بقائے باہم کے اصول پر عمل کیا جائے تو بڑی طاقتوں کی بالادستی کے لیے ریشہ دوانیاں اور تصادمات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پریشانیاں تیز کرنے اور کم طاقت در ملکوں کا خوف و ہراس دور ہوسکتا ہے اور اقوام عالم امن و ترقی کی جانب زیادہ تیزی سے گامزن ہوسکتی ہیں۔ آیئے نہرو جی کی دسویں برسی کے موقع پر ہم عہد کریں کہ ہم اپنی تمام تر طاقت تعمیری کاموں میں لگائیں گے، موجودہ خلفشار کو دور کرنے، ملک کو درپیش چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی اور بدعنوانی کی لعنت کو ختم کرنے، تشدد آمیز احتجاجات اور تحریکوں کو روکنے اور پرامن طریقے سے سوشلزم لانے اور سیکولرزم کو فروغ دینے میں صرف کریں گے۔ اپنے محبوب رہنما پنڈت نہرو کو ہمارا سب سے بڑا خراج عقیدت یہی ہوگا۔

آہ افسر میرٹھی

حامد اللہ افسر صاحب جو اردو دنیا میں افسر میرٹھی کے نام سے مشہور تھے، ان کے انتقال سے ہم بیک وقت ایک ادیب، ایک شاعر، ایک تنقید نگار، ایک افسانہ نگار، بچوں کے ادب کے ایک بیش رو اور ایک مرنجاں مرنج انسان سے محروم ہو گئے ہیں۔ یہ محرومی عرصۂ دراز تک محسوس کی جائے گی اس لیے کہ مستقبل قریب میں ان کی جگہ کے پر ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔

افسر صاحب میرٹھ کے مفتیوں کے ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ تہذیب و متانت، شائستگی اور رکھ رکھاؤ کا ایک ایسا ستھرا مذاق انھیں ورثے میں ملا تھا جس کی مثال کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ طبیعت کو شروع ہی سے ادب سے لگاؤ تھا اس لیے حضرت افسر میرٹھی نے اپنے لیے معلمی کا پیشہ منتخب کیا کہ اس میں تعلیم و تعلم کے ساتھ لکھنے اور ادب کی خدمت کرنے کا بہتر ماحول میسر ہوگا۔ چنانچہ آپ دسمبر ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ کے جوبلی کالج میں بحیثیت استاد آئے اور یہیں سے ۱۹۵۸ء کے لگ بھگ ریٹائر ہوئے۔ دوران ملازمت بھی ریٹائر ہونے کے بعد بھی آپ آخر عمر تک ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ راقم حروف کو بھی جوبلی کالج میں حضرت افسر میرٹھی سے فیض حاصل کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ یاد نہیں پڑتا کہ کبھی وہ اپنے کسی شاگرد سے ترش روئی سے پیش آئے ہوں۔ گفتگو کا انداز ایسا تھا کہ اس میں تحکم یا تکبر کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا تھا بلکہ ایسا محسوس ہوتا کہ اپنے شاگرد سے نہیں کسی برابر والے سے محو گفتگو ہیں۔ مرحوم اپنے شاگردوں میں ادبی ذوق پیدا کرنے کا ایک خاص سلیقہ رکھتے تھے۔ صلح پسندی آپ کے مزاج کا خاصہ اور ہنگامہ آرائیوں سے دور رہنا آپ کی افتاد طبع تھی۔ اسی لیے آپ نے ادبی معرکہ آرائیوں سے خود کو ہمیشہ الگ ہی رکھا۔

آپ کی تصانیف میں نظموں کے مجموعے پیام روح اور حوے رواں، افسانوں کے مجموعے ڈالی کا جوگ، پرچھائیاں اور آنکھ کا نور، ادبی مضامین کا مجموعہ نود میں، تنقید میں نقد الادب اور ڈراموں کا مجموعہ ہفت منظر آپ کی یادگار ہیں۔ پیام روح آپ کا سب سے پہلا شعری مجموعہ ہے جو آپ کی شہرت کا سنگ بنیاد بنا۔ ادھر تقریباً تین برس سے افسر صاحب بیمار تھے۔ بالآخر ۸۰ سال کی عمر میں ایک مدت تک ادب کی خدمت کرنے کے بعد آپ نے ۱۹ اپریل ۱۹۷۴ء کو داعی اجل کو لبیک کہا اور محفل ادب کو جس میں آپ ایک ممتاز مقام رکھتے تھے سونا کر گئے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

● اترپردیش اردو اکاڈمی نے ہندوستان بھر کے ۹۱ مصنفین کو ان کی ۱۹۷۳ء کے دوران شائع شدہ ادبی تنقید، تاریخ ادب، سوانح عمری، شاعری، سائنس، افسانوی ادب بشمول ڈراما اور بچوں کے ادب وغیرہ سے متعلق تصنیفات پر مجموعی طور سے ایک لاکھ تیس ہزار روپئے بطور انعام تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انعامی رقم تین ہزار روپے سے ۵۰۰ روپئے تک ہے۔ مصنفین کے علاوہ دو ناشرین مکتبہ جامعہ (نئی دہلی) اور نسیم بکڈپو (لکھنؤ) کو بھی ان کی مطبوعات پر بالترتیب ۲ ہزار اور ایک ہزار روپئے کے انعامات دینے کا اکاڈمی نے فیصلہ کیا ہے۔ ان انعامات کے علاوہ اکاڈمی نے اترپردیش کے دو ممتاز اردو مصنفین جناب شیام موہن لال جگر بریلوی اور جناب ل۔ احمد اکبرآبادی کو اردو زبان و ادب کے سلسلے میں ان کی مجموعی خدمات کے اعتراف کے طور پر سال ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۳ء کے لیے پانچ پانچ ہزار روپئے کے انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سے قبل دو دوسرے ممتاز اردو مصنفین پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر احتشام حسین (ڈیس امرگ) کو پانچ پانچ ہزار روپئے کے انعامات دیے جاچکے ہیں۔

اردو کے مصنفین کو حکومت اترپردیش کی جانب سے بھی ان کی تصنیفات پر انعامات دیے جاتے ہیں۔ اس سال مصنفین کو جو انعامات دیے گئے ہیں ان کا ذکر ہم نیا دور شمارہ اپریل ۱۹۷۴ء میں انھی سطور میں کر چکے ہیں۔

● ہمیں یہ معلوم کرکے بے حد مسرت ہوکر سر زمین شعر و ادب، لکھنؤ سے صبح ادب کے نام سے ایک اردو ماہنامہ کا اجرا ہونے جارہا ہے اس کے مشاورتی بورڈ میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، جگن ناتھ آزاد، علی سردار جعفری، کوثر چاند پوری، ڈاکٹر شارب ردولوی اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی جیسے ممتاز ادیبوں اور دانشوروں کے نام شامل ہیں۔ ماہنامے کے چیف ایڈیٹر مسعود الحسن عثمانی اور ایڈیٹر شہاب صدیقی ہوں گے۔ اس کا سالانہ چندہ سولہ روپے اور قیمت فی شمارہ ایک روپیہ ۵۰ پیسے رکھی گئی ہے۔ دفتر محمود منزل، گوئن روڈ، لکھنؤ میں ہوگا۔

موجودہ مشکل دور میں کسی علمی اور ادبی ماہنامہ کا اجرا جرأت رندانہ سے کم نہیں۔ ہماری دعا ہے کہ ماہنامہ "صبح ادب" لکھنؤ منظر عام پر آنے کے بعد صالح ادبی روایات قائم کرنے اور تعمیری تخلیقات کے ذریعے قومی یکجہتی اور امن و اتحاد کو فروغ دینے میں پیش پیش نظر آئے۔

محمد شفیع اللہ

مولانا امتیاز علی عرشی

انجان شاعروں کے اچھے شعر

انجان شاعروں سے میری مراد وہ فن کار ہیں، جو کبھی شہرتِ عام کے مالک نہ ہوئے، یا اپنے زمانے میں تو خوب جانے پہچانے تھے، مگر اب اُن کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں۔ اس صحبت میں جن حضرات کے شعر آپ سنیں گے، شعرا کے تذکروں میں، ان کا تخلص، کبھی نام، بعض اوقات والد کا نام اور مسکن بھی، اور کبھی کبھار استاد کا نام بھی ملتا ہے اور بس۔ ایسی مثالیں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں جہاں تاریخ انتقال بھی بتائی ہو۔

ان شاعروں کی مثال اُن بیل بوٹوں کی سی ہے، جو برسات کے موسم میں کسی جنگل میں اُگیں اور پھولیں پھلیں، تو اُن کی آنکھیں لطف اٹھانے والوں کے انتظار میں کھلی رہیں، تا آنکہ خشک موسم انھیں مٹی میں ملا دے۔ یقین فرمائیے کہ ان خودرو پودوں میں ایسے بھی ہوتے ہیں، جو کسی چمن میں ہوتے، تو اپنے پتوں کی رعنائی اور پھولوں کی خوشنمائی سے اس کی زینت بڑھا دیتے اور ایسے تو سبھی ہوتے ہیں جو جنگل کو گلستاں بنائے رکھتے ہیں، اور ادھر سے گزرنے والے کو دعوتِ نظارہ دے کر کچھ دیر کے لیے اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

اچھے شعر سے میرا مقصد ایسا شعر ہے، جو سننے والے کے ذوقِ جمال کو حرکت میں لے آئے۔ شعر خواہ سنجیدہ ہو، خواہ شوخ۔ مفہوم عارفانہ ہو، یا رندانہ۔ وارداتِ عشق میں سے شوق وصال کی عکاسی کرتا ہو یا دردِ فراق کی۔ محبوب سے لطف و مہربانی کی التجا پر مشتمل ہو، یا اس میں رسمِ الفت کے برخلاف ترکِ محبت کی دھمکی دی گئی ہو۔ معشوق کو شرمیلا اور حیادار کہا گیا ہو، یا بے باک اور ہرجائی، غرض یہ ہے کہ عاشق کے دل میں پیدا ہونے والی کسی بات کا مذکور ہو، اسے اس انداز سے بیان کیا گیا ہو کہ میں سنوں تو چونک پڑوں۔ ایسا شعر مجھے دل سے پسند آتا ہے۔

جو شعر میں آپ کو ابھی سناتا ہوں، انھیں پڑھ کر مجھ پر مذکورہ بالا کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی لیے میں نے یہ طے کیا کہ آپ کی بھی سمع خراشی کروں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو یہ سب یا ان میں سے کچھ شعر پسند نہ آئیں مگر حضرات، میں اپنی پسند کے شعر سنا رہا ہوں اور اس کا ہرگز دعویٰ نہیں کرتا کہ آپ کو مجھ سے کلاً یا جزءً اتفاق بھی ہو گا۔ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔ اگر دنیا اختلافِ ذوق سے محروم ہو جائے، تو زندگی بے کیف ہو کر رہ جائے گی کیونکہ بقول ذوقؔ "اس جہان کو ہے زیب اختلاف سے۔"
تاہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان اشعار میں سے کسی ایک کو بھی آپ ناپسندیدہ قرار دیدیں، ایسا کبھی نہ ہو گا، خواہ آپ کا معیار مجھ سے کتنا ہی جدا کیوں نہ ہو۔ کیونکہ آخر میں آپ کے ہی زمانے کا آدمی ہوں اور ہر زمانے کے ذوقِ شعری میں قدرِ مشترک ضرور ہوتی ہے۔ بیشک یہ شعر میرزا غالبؔ کے اشعار کی طرح گہری فکر اور بارعب الفاظ پر مشتمل نہیں۔ لیکن ان کے مطالب کی سادگی اور الفاظ کا ہلکا پھلکا اور سہل و صاف ہونا بجائے خود ایک حسن ہے۔ خود غالبؔ نے اپنے عہد کے حسینوں کے بارے میں کہا ہے کہ "سادہ پرکار ہیں خوباں، غالبؔ"
بہت سے نقاد تو سادگی و پرکاری کو شعر کی معراج قرار دیتے ہیں۔ ان شعروں میں معراجِ سادگی و پرکاری نہ سہی، مگر صرف سادگی پر بھی غالبؔ کے دل میں مر جانے کی حسرت تھی پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان

شعروں کی سادگی ہم میں سے بہت سوں کو دل پسند نہ ہو۔

اچھا اب ان شاعروں کے اچھے شعر سنیے۔ ساتھ ساتھ شاعر کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہے، وہ بھی بتاتا چلوں گا اگر آپ کو کسی ایک یا دو چار کے بارے میں مجھ سے زیادہ معلوم ہے، تو میری طرف سے مبارک باد قبول فرمایئے۔

(۱) حکیم مظہر احسن خاں، احسن تخلص، خوشنویس، عالم اور طبیب تھے، پہلے غالب اور پھر امیر سے اصلاح لی۔ فرماتے ہیں:

نامہربانیوں پہ تو مرتا ہے اک جہاں — کہیے کہ کیا غضب ہو اگر مہرباں ہو آپ
بات کرنے میں تو شرماتے ہو تم — ظلم کرنے میں نہیں آتا لحاظ

(۲) سید نجف علی ساکن شاہ آباد ضلع ہردوئی، امیر کے شاگرد تھے، فرماتے ہیں:

بتوں کو سامنے اپنے بٹھا کے — تماشے دیکھیے شانِ خدا کے

(۳) نواب محمد یار خاں امیر کے پوتے، اصغر علی خاں نام، نگار تخلص کرتے تھے اور غفلت، آتش، ذوق اور بیمار کے شاگرد تھے۔ فرماتے ہیں:

دے دیا طاق سے آئینہ اٹھا کر ان کو — حال مجھ سے دلِ حیران کا دکھایا نہ گیا
قدِ خود قیامت تھا زلف کیوں بڑھائی کر — اور ساتھ محشر کے اک بلا لگائی کیوں
اس پہ مرتے ہیں وہ آئیں قبر پر — یہ بھی ہو جائے گا، ہونا کچھ نہیں
تم تو محشر میں نہ ہوگے کہہ دو — ورنہ اک اور قیامت ہوگی

(۴) غلام احمد نام، تمیز تخلص، رام پور کے باشندے اور داغ کے شاگرد تھے۔ فرماتے ہیں:

لوگ کس طرح سے کرتے ہیں صدا کو راضی — ہم سے تو اک بت کافر بھی منایا نہ گیا
بے وفائی سے بھی خوش ہوں یار کی — ہر کسی کا آشنا ہوتا نہیں
سامنے اس نے بلایا مجھے بہرِ تعزیر — کام آئیں تو کچھ آخر کو خطائیں آئیں

(۵) سید وارث حسن عرف بڑے صاحب، لکھنؤ کے ساکن، جلال کے شاگرد تھے۔ طالب تخلص کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:

ہیں جو کم سن تو میرے رونے پر — ہنسے دیتے ہیں لوٹے جاتے ہیں
کون لیٹا ہے یہ سر رکھے ہوئے زانو پر — تم تو کہتے تھے محبت میں اثر کچھ بھی نہیں

(۶) حافظ شبراتی، رام پور کے باشندے، ملا حسن فرنگی محلی اور قدرت اللہ شوق کے شاگرد تھے۔ طالب تخلص کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:

مر کے بھی ہم نے سب کو دیکھ لیا — کوئی مرتا نہیں کسی کے لیے
نفس عیسوی سے کر ممنون — ہم کو دو دن کی زندگی کے لیے
آؤ عشق بتاں بھی کر دیکھیں — یہ بھی اک طبع آزمائی ہے

(۷) سید صادق شاہ خلف سید حسن شاہ، منیر کے شاگرد تھے، اور صادق تخلص کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:

میرے پہلو سے جو وہ رشکِ مسیحا اٹھا — تھام کر دل کو کئی بار میں بیٹھا اٹھا

(۸) میر سعادت علی تسکین تخلص، منت کے شاگرد تھے، فرماتے ہیں:

کس کا کوچہ ہے یہ، یا رب نہیں معلوم ہمیں — خود بخود یاں کے پہنچتے ہی قدم رکتا ہے

(۹) میر مہدی، داغ تخلص، میر سوز کے بیٹے تھے، فرماتے ہیں:

یہ چاہ نہیں بھلی، بری ہوتی ہے — جی لیتی ہے، دوستی بری ہوتی ہے
لگتا ہی نہیں ہے جی کہیں بس ن آہ — سچ کہتے ہیں، یہ لگی بری ہوتی ہے

(۱۰) مرزا محمد یار بیگ، سائل تخلص، شاہ حاتم اور سودا کے شاگرد تھے۔ فرماتے ہیں:

اٹھ گیا جب کہ تعین تو جہاں اپنا ہے — جس جگہ بیٹھ گئے پھر وہ مکاں اپنا ہے

(۱۱) قدوی عظیم آبادی کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہوا۔ آپ یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

ہو ساتھ کہ حسرت دل مرحوم سے نکلے — عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
شب ہجراں کی اور تو قدوی — ہم سے تقریر کر نہیں آتی
پر یہ وہ رات ہے کہ جس کی ہمیں — صبح ہوتی نظر نہیں آتی

(۱۲) میر زین العابدین تبریزی آشنا تخلص کا یہ شعر سنیے:

گر مجھ سے دوانے کو تم آزاد کر دگے — ویرانے میاں کتنے ہی آباد کر دگے

(۱۳) میر اعلیٰ علی خلف میر ولایت اللہ خاں دہلی کے باشندے تھے۔ فرماتے ہیں:

توڑ بت زاہد نے کیوں مسجد یہ بت جا نہ کیا؟ — تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا؟

(۱۴) سید جبار علی مبتلا تخلص نے فرمایا ہے:

وہ نہ دیکھا میں تیری شوخی میں — جو میں تیرے حجاب میں دیکھا
جب کھلی آنکھ خوابِ غفلت سے — ایک عالم کو خواب میں دیکھا

(۱۵) ہردے رام مرشد آبادی جودت تخلص، نواب علاؤ الدولہ سرفراز کا

کے موسس تھے۔ فرماتے ہیں :

دو غط، تری بات دل سے کہنے کا نہیں — پتھر کی چوٹ شیشہ سہنے کا نہیں
بس، زاہد خشک تو ہے جب تک مرے پاس — تو ہو مری چشم تر سے بہنے کا نہیں

(۱۶) مرزا محمد اکرم آشنا ولد مرزا محمد اسلم، رام پور کے باشندے تھے۔ ۱۲۲۹ھ میں فوت ہوئے فرماتے ہیں :

جام اس کے ہاتھ سے اک بار گر پڑا — آنکھوں کی اپنی جب اسے مستی نظر پڑی
آشنا کو اٹھا بزم سے اپنی ظالم — ایسے ملنے کے نہیں ناز اٹھانے والے

(۱۷) نواب محمد یار خاں امیر کے پوتے، غلام محی الدین خاں نام، حزیں تخلص، باشندۂ رام پور، غفلت کے شاگرد تھے فرماتے ہیں :

ہم کے اسکے کچھ کے رقت ہوئی نہیں — جھٹکا جو کوئی عجیب کہا ہم نے ہائے دل
دیا یار نے بوسہ تو اشتیاق بڑھا — دوا سے اور بھی بیمار دردمند ہوا

(۱۸) محمد مظفر خاں گرم تخلص، رام پور کے باشندے، ذوق کے شاگرد اور صاحب دیوان تھے۔ فرماتے ہیں :

مہربانی میں دل ستانی ہے — قہر کرتے تو کیا ٹھکانا تھا
پڑے پا کھینچے جاروب کش ہیں اتنے لیے — کہ نقش پا کو کوئی سجدہ گاہ بھی نہ کرے
تجھ پہ ہنستا ہے چاک جیب مرا — شرم اے بخیہ گر نہیں آتی

(۱۹) شیخ رحیم بخش کشتہ، شاگرد داغ، یہ بھی رام پور کے ساکن تھے۔ فرماتے ہیں :

وہ کہہ جاگے نہ کبھی خاطر وحشت — دل چاک کریں گے، جو گریباں نہ رہے گا
حشر کے دن وعدۂ دیدار ہے — یہ اگر سچ ہے تو کیا دشوار ہے

(۲۰) بیتاب تخلص، جن کا اتا پتا کچھ معلوم نہیں، فرماتے ہیں :

بیتاب بھی کیا جواں تھا اے وائے — ہو خانہ خراب اس اجل کا

(۲۱) سید احمد شاہ مفتون تخلص رام پور کے باشندے اور داغ کے شاگرد تھے۔ فرماتے ہیں :

ترے خرام سے برپا ہے شور رستخیز کیا — اٹھا یہ فتنہ قیامت سے بیشتر کیا
مری دو بیش تیغ نگہ کا کیا کہنا — ہمیں تو دیکھ کہ رکھتے ہیں ہم جگر کیا

(۲۲) میر چراغ علی، حیف تخلص، افسوس کے شاگرد تھے فرماتے ہیں :

اے راہ رو دو مری زبانی — کہنا یہ پیام کاروان سے
رستے میں تھکا ہوا پڑا ہے — اک شخص تمہارے ہمرہاں سے

(۲۳) مرزا مکھن، رفاقت تخلص، جرأت کے شاگرد تھے۔ فرماتے ہیں :

کہیے ہو تم، انہ گھر مرے آیا کرے کوئی — گر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی
داں کیونکہ روئیے کہ نہ ادی جہاں نہ ہو — زانو پہ سر کو دھر کے نہ بیٹھا کرے کوئی
برسوں کی ایک دم میں رفاقت جو چھوڑ دے — کیا ایسی زندگی کا بھروسا کرے کوئی

(۲۴) خواجہ محترم خاں، محترم تخلص، فرماتے ہیں :

اے محترم اپنی اشک باری — کھل جاتا ہے ابر بھی برس کر
کیا رونا ہے یہ ترا کہ جس سے — بدنام ہوا میں، اب تو بس کر

(۲۵) نجف تخلص ایک شاعر کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

دل کو کہتا ہوں، شاید اب سمجھے — پر یہ خانہ خراب کب سمجھے
اس کے کوچے میں دمبدم جانا — روز سمجھے ہے دل نہ شب سمجھے
درد دل اور میری بے تابی — جب وہ چاہے کسی کو تب سمجھے
ہجر کے غم سے مر گئے لاکھوں — ہم بھی تھے تجھ کو جاں بلب سمجھے
شکر صد شکر، بچ گیا تو نجف — تیرا جینا ہی ہم عجب سمجھے

(۲۶) انصاف، محمد شاہ کے عہد میں دہلی کے اندر زندگی گزاری ہے۔ فرماتے ہیں :

واقف تھے ہم کہ عشق کے شیوے میں خیر نہیں — پر کیا کریں کہ دیدہ و دل اپنے بس نہیں

(۲۷) میر اولیا، مہان ضلع لکھنؤ کے باشندے، دردمند اور حسن پرست تھے، فرماتے ہیں :

زاہد نے کہا حرم میں بستی کر کر — ہندو کہتا ہے بت پرستی کر لے
اے دل، نہ تو اس بکھیڑے میں نہ آ — ہستی کوئی دم ہے خوب مستی کر لے

(۲۸) جنون، دہلی کے باشندے اور خواجہ میر درد کے یاروں میں تھے، فرماتے ہیں :

کبھی گرتا تھا قدم پر، کبھی ہوتا تھا نثار — کیا بھلی موت ہوئی رات کو پروانے کی

(۲۹) آخر میں ایک شاعرہ کی غزل سنیے جس کا نام زینت اور تخلص نازک تھا۔ یہ فیض آباد کی رہنے والی تھی :

کوچے میں کوئی سسکے، کوئی در پہ مرے ہے — انصاف بھی کچھ ہے، تو یہ کیا ظلم کرے ہے
موجود ہے ہر آن جو نزدیک ہمارے — وہ وہم و گماں سے بھی حقیقت میں پرے ہے
ہے نالۂ و زاری کا مری شور فلک تک — پر وہ بت مغرور کوئی کان دھرے ہے

(باقی صفحہ ۴۱ پر)

فتح مبین

ساغر نظامی

خاک تھا پھر بھی میں انوار فشاں ہو کے رہا
رشکِ خورشید نہیں کاہکشاں ہو کے رہا

کبھی نکہت نے کبھی بادِ صبا نے روکا
میں مگر خلوتِ گل بدناں ہو کے رہا

لاکھ اندھیروں نے ہر اک موڑ پہ مجھ کو ٹوکا
میں مگر جلوتِ ماہ وشاں ہو کے رہا

بات ملتے ہی رہے بزم میں بیٹھے کچھ لوگ
میں مگر صدرِ حسینانِ جہاں ہو کے رہا

لاکھ توڑے مرے ساغر مرے خُم میرے سُبو
میں مگر مرشدِ رندانِ جہاں ہو کے رہا

ژالہ باری کے کلیجے کو کچل کر آخر
شعلہ زا، شعلہ فشاں شعلہ بجاں ہو کے رہا

زلزلوں نے کبھی کچلا کبھی طوفانوں نے
ذرّۂ خاک مگر کوہِ گراں ہو کے رہا

وقت کے سینۂ سنگیں کے اڑا کر ٹکڑے
میں وہ چشمہ ہوں کہ صحرا میں رواں ہو کے رہا

میرے سینے میں دبے لالہ و گل کھل ہی اٹھے
میں وہ صحرا ہوں کہ صد رشکِ جناں ہو کے رہا

شورشِ بزم نے آواز دبانا چاہی
جشنِ تاریخ میں میں نغمہ کناں ہو کے رہا

سب نے چاہا کہ میں بے نام و نشاں ہو جاؤں
میں مگر صاحبِ اسناد و نشاں ہو کے رہا

خانہ ویرانی نے ہر گام پہ سو دام بچھائے
پھر بھی میں جانِ مکاں روحِ زماں ہو کے رہا

مصلحت کوشیوں کے دام کو پگھلا ہی دیا
جبر کوشوں میں حقائق کی زباں ہو کے رہا

ریگزاروں نے مرا کم نہیں گھونٹا ہے گلا
پھر بھی میں گاتی ہوئی جوئے رواں ہو کے رہا

لاکھ باطل نے زمانے میں زباں بندی کی
میں بہر حال حقائق کی زباں ہو کے رہا

لاکھ راتوں نے مرے رخ پہ اندھیرے الٹے
وہ کرن ہوں کہ گجردم میں عیاں ہو کے رہا

گو میں اک رمز تھا اک راز تھا پھر بھی اک دن
اپنی فطرت کی کشاکش سے عیاں ہو کے رہا

ہر حقیقت کا وظیفہ ہے عیاں ہو جانا
سب چھپاتے ہی رہے اور میں عیاں ہو کے رہا

واجب القتل جو انبوہ مجھے کہتا تھا
وہی انبوہ بہ حسرت نگراں ہو کے رہا

نفع میں میں ہی رہا پھر بھی مجھے غم یہ ہے
کہ اک انبوۂ حریفاں کا زیاں ہو کے رہا

محمد محفوظ الحسن

عظیم آباد آئینۂ ایام میں

برصغیر ہند کا ہر صوبہ اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے خواہ وہ صوبہ جنوبی ہند کا [illegible] ہو یا میسور، آندھرا ہو یا کیرالا اور شمالی ہند کا دلی ہو یا اترپردیش، بنگال [illegible] اور بہار، برصغیر کے ان تمام صوبوں نے وقت اور زمانے کی بے شمار [illegible] دیکھی ہیں۔ کبھی حادثات زمانہ نے ان کی مانگ میں افشاں چنی ہے کبھی اس کی مانگ کا سیندور دھویا ہے۔ کبھی تہذیب و تمدن کا چراغ [illegible] جلایا ہے اور کبھی یہاں کے باسیوں نے اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کا [illegible] اپنے ہاتھوں گھونٹ دیا ہے، ہندستان کا صوبہ بہار بھی اپنے [illegible] میں بے انتہا تبدیلیاں اور تغیرات لیے ہوئے ہے۔ جب پورے [illegible] کی داستان حوادث لکھی ہو تو ظاہر ہے کہ اس کے ایک شہر [illegible] تاریخ مرتب کرنے میں زمانے کی نیرنگی کو کچھ کم دخل نہ ہوگا ——— یہ [illegible] شہر عظیم آباد۔ صوبہ بہار کا ایک عظیم شہر جو اپنے دامن میں تاریخ کے بہتیرے [illegible] چھپائے ہوئے ہے۔ ذرا اس کے دامن کو ہوا دیجئے اور پھر دیکھیے وقت [illegible] نیرنگی۔ کتنے طوفانوں کے تھپیڑے اور حوادث کے طمانچے کھاتا ہوا یہ شہر کھنڈر بنا اور پھر گلشن کی طرح سجا۔ کب کب اس کی مانگ موتیوں سے [illegible] گئی اور کب کب اس کا سیندور دھویا گیا۔ یہ داستان جہاں المناک ہے وہیں بے حد دلچسپ بھی۔

آیئے تھوڑی دیر کے لیے گردش ایام کو پیچھے کی طرف لے چلیں اور [illegible] صبح و شام کی تصویریں دیکھیں جن میں عظیم آباد کی تاریخ سمٹی ہوئی ہے۔ عظیم آباد کا قدیم ترین نام مگدھ[1] ہے یہ بڑا قدیم شہر ہے اس کی پہلی راجدھانی ہونے کا فخر راج گرہ کو حاصل تھا جو ان دنوں راج گیر کے نام سے معروف و مشہور تھا اور پورے ہندستان کے لیے اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتا تھا اس کا تذکرہ ہندوؤں کی مقدس کتاب رامائن[2] میں بھی موجود ہے۔ اس شہر کی بنا "داسو جیدیا اوپاریچارا" نے ڈالی تھی جس کے بیٹے کا ذکر مہابھارت[3] میں بھی ملتا ہے۔

مگدھ دیس کی تاریخ یوں تو بڑی پرانی ہے لیکن چھٹی صدی قبل مسیح سے جو تاریخ شروع ہوتی ہے وہ بڑی ہی شاندار ہے۔ مگدھ دیس کا یہ دور عہد زریں تھا۔ یہ عہد بمبسار اور اجات شترو راجاؤں کا تھا یہ راجہ سیسو ناگ خاندان کے تھے۔ ان دونوں راجاؤں نے مگدھ دیس کی سرحد میں بہتیرے شہروں کا اضافہ کیا اور بہت سے نئے شہر بسائے[4] ان دونوں راجاؤں کے زمانے میں شمالی ہند میں مگدھ دیس کی طاقت سب سے بڑی تھی اور سب پر فائق[5] تھی لیکن سیاسی لحاظ سے زیادہ اس کی اہمیت تہذیبی و تمدنی تھی کیونکہ ان ہی راجاؤں کے عہد میں مہاتما گوتم نے بودھ دھرم کی بنا ڈالی تھی اور نئے مذہب کی قدروں سے متاثر ہو کر ان راجاؤں نے یہ مذہب قبول کر لیا تھا[6]۔ اختر اورینوی نے لکھا ہے کہ[7]

"مہاویر اور گوتم نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ یہیں بسر کیا۔ مہاویر کا انتقال بہار شریف کے قریب پاوا پوری میں ہوا اور گوتم بودھ کو بودھ گیا میں نور ہدایت حاصل ہوا۔ بودھ دھرم کی چار بڑی مجلس مشاورت میں سے دو بہار میں قائم ہوئیں ایک

---

[1] اختر اورینوی۔ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ص۲۲ [2] تاریخ مگدھ ص۱۴ [3] فصیح الدین بلخی [4] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ص۳ [5] اختر اورینوی [6] تاریخ مگدھ ص۱۵ فصیح الدین بلخی [7] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ص۳ اختر اورینوی۔

راج گیر میں دوسری پاٹلی پترا میں "۔
پاٹلی پتر ہندستان کا پہلا شاہی دارالسلطنت تھا اسے راجہ اجات شترو نے بسایا تھا۔ پاٹلی پترا نام کی وجہ تسمیہ بھی عجیب وغریب افسانوں سے بھری پڑی ہے نصیح الدین بلخی نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے[۲]
" پاٹلی پتر کی بنا اور وجہ تسمیہ کے متعلق بہت سے افسانے ہیں لیکن قرین قیاس صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ راجہ اجات شترو جس نے پاٹلی پتر کو دارالحکومت بنایا، بودھ دھرم اختیار کرنے کے بعد اس مذہب کا بڑا حامی اور پیشوا بن گیا تھا اس لیے اس کے محلات کو پٹلہ کہتے ہوں گے جیسا کہ تبت کے دارالحکومت لہاسہ میں لاماؤں (مذہبی پیشوا جو برسرحکومت بھی ہوتے ہیں) کے محلات کو پٹلہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ بھی تبت میں ہندستان سے پہنچا ہے "۔
اپنے بیان کو مزید تقویت دینے کے لئے انھوں نے آگے لکھا ہے کہ۔
" ہوری چوانگ[۲] کا یہ بیان کہ جب دارالحکومت یہاں منتقل ہوا اس کا نام پاٹلی پتر رکھا گیا راقم کے خیال کی تائید کرتا ہے"۔
نصیح الدین بلخی نے اس ضمن میں چند اور دلیلیں پیش کی ہیں جو یہ ہیں۔
" اس[۳] روایت میں کوئی اختلاف نہیں کہ پاٹلی پتر نام ہونے سے پہلے جو آبادی تھی اس کو کسُم پورہ یا پشپ پورہ یعنی پھولوں والا شہر کہتے تھے بعد کو یہی شہر پاٹلی پتر کہلایا ہو یا اس کے آس پاس نیا شہر آباد ہو کر پاٹلی پتر کہلایا ہو۔ یہ امر ثابت ہے کہ دارالحکومت ہونے کے سبب اس کا نام پاٹلی پتر ہوا "۔
کسی شہر یا جگہ کا نام کسی عظیم آدمی کے نام پر ہی رکھا جاتا ہے یا اگر کسی شہر کا نام تبدیل کیا جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا نام تجویز کیا جاتا ہے تو اس صورت میں یہ بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ نام ایسا ہو جو موزوں اور مناسب ہو نصیح الدین بلخی اس ضمن میں اظہار خیال کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں[۴]
" دارالحکومت ہونے پر پاٹلی پتر نام ہونا خود بتاتا ہے کہ اس کا بانی کوئی راجہ تھا اور تاریخی طور پر اجات شترو ہی اس کا بانی معلوم ہوتا ہے۔ نئے دارالحکومت کا نام رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے نام سے موسوم کیا جائے جو حکومت کے لیے شایان شان اور مناسب ہو۔ اگر لفظ پاٹلی کو بجائے درخت پاڑلی کے نام کے لفظ پاٹلہ (معنی شاہی محل) سے مشتق سمجھا جائے تو پاٹلی پتر کے معنی راج پور کے ہو جاتے ہیں جو راج گیر کے مرادف ہے اور مگدھ کے سابق دارالحکومت کا نام ہے اور اس شہر کی بنا کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے "۔
اجات شترو کے بعد پاٹلی پتر کی حکومت پر نند خاندان کا قبضہ ہو گیا۔ نند خاندان کے راجاؤں کے زمانے میں پاٹلی پتر نے کافی ترقی کی اس خاندان کے راجاؤں نے تقریباً سارے ہندستان پر قبضہ کر لیا[۵] تھا، اس خاندان کے آخری راجہ کو قتل کر کے چندر گپت موریہ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی[۶]۔ عہد موریہ میں پاٹلی پتر نے ایک عظیم سلطنت کی حیثیت اپنا لی تھی اس کی سرحدیں کوہ ہندوکش اور میسور کے کوہستانوں تک پھیلی ہوئی تھیں اور شہنشاہ اشوک تک آتے آتے پاٹلی پتر نہ صرف ہندستان بلکہ پورے ایشیا کا سیاسی، تجارتی، تہذیبی، علمی، تمدنی اور ذہنی صدر مقام بن گیا تھا۔ باہمی چپقلش فوجی سرداروں کی بغاوت اور عیاش طبع حکمرانوں کی وجہ سے موریہ سلطنت کو زوال آ گیا۔ سلطنت موریہ کے زوال کے بعد یونانیوں اور تورانیوں نے مل کر مگدھ دیس کو روند ڈالا گپت عہد حکومت میں پاٹلی پتر میں پھر جان پڑی۔ اس شہر نے نئے سرے سے ترقی حاصل کی اس کی نبض جو ڈوب رہی تھی معمول پر آنے لگی لیکن ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ گپتا سلطنت کا دارالحکومت پاٹلی پتر سے

---

[۱] تاریخ مگدھ ص۲۶ [۲] نصیح الدین بلخی [۳] ایک چینی سیاح [۳] [۴] تاریخ مگدھ نصیح الدین بلخی۔ [۵] بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا اختر اورینوی [۶] تاریخ مگدھ نصیح الدین بلخی [۷] تاریخ مگدھ۔ نصیح الدین بلخی ص۵۵

اجودھیا منتقل ہوگیا اور یہ شہر پھر ویران ہوگیا۔ چینی سیاح ہیون سانگ نے جب پاٹلی پتر کا دورہ کیا تو اسے یہاں ویرانی ہی ویرانی ملی۔ اس شہر کی ویرانی غالباً ہُن قوم کے حملوں کی وجہ سے ہوئی۔ اس کے بعد بہار پے در پے حملوں کا شکار رہتا رہا، خاص طور سے ساتویں آٹھویں صدی عیسوی بہار کی تاریخ کا انتہائی پریشان کن اور ہنگامہ خیز دور تھا۔ لیکن ان دونوں صدیوں میں مغربی ہندستان کی مختلف سلطنتیں بہار پر حملہ کرتی رہیں اور وقتاً فوقتاً اپنی حکومت قائم کرتی رہیں۔ اس ہنگامی دور اور طوائف الملوکی پر روشنی ڈالتے ہوئے فصیح الدین بلخی لکھتے ہیں:

"حقیقتاً ہرش[۱] کے بعد حکومت کا شیرازہ بکھر گیا اور ایک زمانے تک آشوب و غدر کی سی کیفیت رہی۔ جہاں جس کی بن آئی ذی اقتدار لوگوں نے اپنا دخل جمایا۔"

اختر اورینوی رقمطراز ہیں۔

"ساتویں آٹھویں[۲] صدی عیسوی میں بہار پر مختلف مغربی ہندستانی سلطنتوں کے حملے ہوئے اور وقتاً فوقتاً ان کا اقتدار قائم ہوا۔"

نظم و ضبط کے پابند لوگوں کو جب ایک عرصہ تک منظم و منضبط زندگی گذارنے کا سہارا نہ ملا تو بالآخر مجبور ہو کر آٹھویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی کے درمیان بنگال کے ایک ذی اقتدار شخص گوپال[۳] کو حکمراں منتخب کیا گیا۔ طوائف الملوکی ختم ہوئی، ذہنی سکون میسر ہوا۔ لوگوں نے چین کی سانس لی۔ چنانچہ امن و طمانیت کے اس دور میں جب گوپال۔ دھرم پال، دیوپال نے حکمرانی کی بہار خصوصاً مگدھ نے دوبارہ استقلال[۴] و استحکام حاصل کیا۔ یہ راجے بودھ دھرم[۵] کے زیر اثر تھے۔ ان راجاؤں کے عہد میں ایک بار پھر بہار کو ایشیا کی ذہنی تہذیبی و تمدنی رہنمائی کا موقع ملا۔ کیونکہ اسی عہد میں نالندہ وکرم شیلا اور اودنت پوری کے دارالعلوم قائم ہوئے، پال خاندان کے حکمرانوں نے ہی مختلف وِہارے تعمیر کرائے گوپال نے موجودہ قصبہ بہار میں بھی وِہارہ تعمیر کرایا اور اس کے بعد مختلف حکمرانوں نے یہاں دارالحکومت بنایا۔ دارالحکومت اور وِہارہ کی تعمیر ان دونوں وجوہات کے سبب اس قصبے کا نام مگدھ کے نام پر بہار[۶] ہوگیا۔ اس کے بعد سے تاریخوں میں مگدھ کی بجائے فقط بہار ہی ملتا ہے، پال خاندان کے بعد بہار پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا کہ مسلم عہد شروع ہوا۔ پہلی بار ۱۲۰۴ء میں قطب الدین ایبک کے سپہ سالار اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی نے جنوبی بہار کا ایک بہت بڑا علاقہ فتح کرلیا۔ بہار کی نامزدگی پر روشنی ڈالتے ہوئے فصیح الدین بلخی لکھتے ہیں[۷]۔

"پال خاندان کی حکومت کے زمانے میں مسلمانوں نے بہار کو فتح کیا اور اس صوبے میں اسلامی حکومت کا آغاز چھٹی صدی ہجری (بارہویں صدی عیسوی) کے آخر زمانے میں ہوا اور مسلمانوں کی تاریخ میں سوائے بہار کے مگدھ کا کہیں نام نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے مگدھ کا نام تبدیل ہو کر بہار ہو چکا تھا۔ طبقات ناصری میں جو ۶۵۸ھ میں لکھی گئی مگدھ کا نام کہیں نہیں پایا جاتا۔"

بہار میں اسلامی فتوحات کی ابتدا پر روشنی ڈالتے ہوئے اختر اورینوی رقمطراز ہیں۔

"قطب[۸] الدین ایبک کے سپہ سالار اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی نے جنوبی بہار فتح کرلیا۔ ... بہار کا ایک بہت بڑا علاقہ دہلی کے سلطان کے ماتحت ہوگیا۔ شاہ آباد: پٹنہ، مونگیر، بہار شریف، بھاگل پور کے اضلاع ان کے زیر نگیں پہلے ہوئے۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے بہار میں مسلم دور حکومت کی ابتدا کا پتہ چلتا ہے۔ تاریخی حقائق سے اس کی توثیق بھی ہو جاتی ہے لیکن بعض واقعات سے اس امر کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ بختیار کی فتوحات سے بہت پہلے ہی بہار میں اسلام کی روشنی پہنچنے لگی تھی۔ بہار میں اسلام

---

[۱] تاریخ مگدھ، فصیح الدین بلخی ص۵۸ [۲] تا[۵] فصیح الدین بلخی تاریخ مگدھ ص۵۹ [۳] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء ص۱۱ اختر اورینوی ص۴ [۴]... فصیح الدین بلخی تاریخ مگدھ ص۶۰ [۶] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء ص۱۱ اختر اورینوی [۷]... بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء اختر اورینوی۔

مذہب پھیلانے والوں میں سلطان محمود غزنوی کی فوج کے بعض سپاہیوں کا نام لیا جاتا ہے۔ اس امر کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے فصیح الدین بلخی لکھتے ہیں:

"صوبہ بہار[2] میں اسلامی حکومت کا آغاز محمد بن بختیار خلجی کی فتوحات سے ہوا لیکن بعض واقعات سے یہ ثابت ہے کہ محمد بن بختیار سے پہلے مسلمانوں نے یہاں قدم جمانے شروع کر دیے تھے۔ مقامی روایات کے مطابق منیر کو اول اول سلطان محمود غزنوی کے سپاہیوں نے فتح کیا۔"

فصیح الدین بلخی نے اس سلسلے میں جو تاریخی حقائق جمع کیے ہیں منیر کے مخدوم زادوں کے سفینوں اور لوح کے حوالے سے جو انکشاف کیا ہے وہ بے حد سنسنی خیز اور دلچسپ ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بختیار خلجی سے پہلے بہار کے بعض علاقوں پر اسلامی حکومت کا پرچم لہرا چکا تھا۔ لکھتے ہیں[3]

"محمود غزنوی کے انتقال سے دو ایک سال پہلے اس کا ایک لشکر اس کے ایک بھانجے سالار مسعود غازی کے تحت میں ہندوستان آیا۔ سالار مسعود غازی نے مقام ستر میں قیام کر کے مشرقی علاقوں پر چڑھائی کی۔ سالار مسعود کے بعد اس گروہ کے پسماندہ افراد مختلف اطراف میں منتشر ہو کر رہ گئے۔ جن جن مقام میں مسعود غازی کے سپاہیوں نے جنگ کی اور مقتول ہو کر مدفون ہوئے عام طور پر گنج شہیداں کے نام سے مشہور ہیں اطراف کٹرہ مانک پور، غازی پور، سیوان (ضلع چمپارن) کے علاوہ خاص قصبہ منیر میں بھی ایسی جگہ موجود ہے جہاں اس واقعہ کی یادگار میں سالانہ میلہ ہوا کرتا ہے جو غازی میاں کے میلہ کے نام سے مشہور ہے۔ منیر کے مخدوم زادوں کے سفینوں سے پایا جاتا کہ محرم ۵۷۶ھ میں حضرت تاج فقیہہ اور قطب سالار نے راجہ منیر کو شکست دے کر منیر پر قبضہ کیا قطب سالار کا مزار منیر سے دو میل پورب موضع مہداوان میں مسجد کے پس پشت میدان میں واقع ہے۔"

حضرت تاج فقیہہ کی آمد منیر کا واقعہ بھی کم دلچسپ نہیں سفینوں کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

"تاج[4] فقیہہ اور قطب سالار کے آنے سے پہلے ایک مسلمان مومن عارف نامی منیر میں رہتا تھا جس کو راجہ منیر سے سخت ایذائیں پہنچتی تھیں۔ مومن عارف نے تنگ آ کر مدینے کی راہ لی اور وہاں جا کر حضرت تاج فقیہہ کو اپنا ماجرا کہہ سنایا۔ حضرت تاج فقیہہ جن کا اصل وطن خلیل الرحمان (ہبرون) تھا ایک گروہ کو ساتھ لے کر غزنی ہوتے ہوئے منیر پہنچے اور راجہ منیر سے جنگ کر کے منیر پر قابض ہوئے۔"

ان تاریخی واقعات اور حوالہ جات سے قطع نظر یہ بھی تاریخی حقیقت ہی ہے کہ صوبہ بہار پر باضابطہ اسلامی پرچم جیسا کہ گذشتہ سطور میں مرقوم ہو چکا ہے خلجی کے ہاتھوں ہی لہرایا۔ اور اس کا خاندان ایک عرصے تک حکمرانی کرتا رہا۔ تا آنکہ سکندر[5] لودی نے اس پر قبضہ نہیں کر لیا۔ سکندر لودی نے دریا خاں کے سپرد صوبہ بہار کی حکومت کی۔ سولہویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی میں جب بہتیرے امرا نے بغاوت کی تو دریا خاں نے بھی بغاوت کی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا دریا خاں ہی کے زمانے میں بابر نے ۹۳۵ھ میں صوبہ بہار پر حملہ کیا اس کے بعد کافی عرصے تک بہار مغلوں اور پٹھانوں کی رزم گاہ بنا رہا۔ اختر اورینوی لکھتے ہیں۔

سولہویں[6] صدی عیسوی میں بہار افغانوں اور مغلوں کے رقیبانہ مجادلہ کی آماجگاہ بنا۔"

اس تمام عرصے میں بہار شریف ہی دارالحکومت بنا رہا تھا لیکن شیر شاہ سوری افغان نے پہلی بار پٹنہ کو دارالسلطنت بنا دیا۔ یہ ۱۵۴۱ء کی بات ہے۔ سولہویں صدی کی آٹھویں دہائی میں اکبر اعظم نے بہار پر حملہ کر کے پٹنہ اور باڑھ فتح کر لیا۔ جہانگیر کے زمانے میں سلطنت مغلیہ کی حدود میں بہار کے چھوٹا ناگپور کا علاقہ شامل ہو گیا تھا۔ عہد شاہجہانی میں بھوج پور پر قبضہ ہوا اور اسی عہد میں انگریزی تاجر بغرض تجارت پٹنہ[7] پہنچے۔

---

[1] فصیح الدین بلخی تاریخ مگدھ [2] فصیح الدین بلخی تاریخ مگدھ [3] فصیح الدین بلخی تاریخ مگدھ [4] فصیح الدین بلخی تاریخ مگدھ [5] فصیح الدین بلخی تاریخ مگدھ [6] اختر اورینوی بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء [7] اختر اورینوی بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء

اٹھارہویں صدی عیسوی میں اورنگ زیب عالمگیر نے بہار کا صوبہ دار اپنے پوتے شہزادہ عظیم الشان کو مقرر کیا اور اسی وقت پٹنہ کا نام[سہ] عظیم آباد رکھا گیا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں بہار بنگال کو ملا دیا گیا۔ ۱۷۴۲ء سے ۱۷۵۰ء تک بہار پر مرہٹوں نے بھی کئی بار حملے کیے یہاں تک ۱۷۵۷ء کی پلاسی کی جنگ کے بعد انگریز بہار و بنگال کے مختار کل ہو گئے اور ۱۸۵۷ء کے بعد تو ان کی حکومت مسلم ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں وطن کے سپوتوں نے بڑی جرأت اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا۔ بہار میں کنور سنگھ اور اہل صادق پور کے کارنامے اس ضمن میں مشہور زمانہ ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں بہار بنگال سے علاحدہ ہو گیا اور ۱۹۳۵ء میں اڑیسہ بھی بہار سے الگ ہو کر ایک علاحدہ صوبہ بن گیا۔ ہندستان کی جنگ آزادی کی تحریک میں بھی اس علاقے کے لوگوں نے بڑی خندہ پیشانی سے ہاتھ بٹایا۔ کانگریس تحریک میں بہتیرے لوگ شامل ہوئے۔ مولانا مظہر الحق، ڈاکٹر سید محمود، پروفیسر عبدالباری، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور جے پرکاش نرائن کے نام اس ضمن میں لیے جا سکتے ہیں۔

۱۹۳۸ء میں بہار میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا اور ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ میں اجلاس ہوا۔ ہندستانی آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ دو قومی نظریہ بھی پروان چڑھ چکا تھا کہ ۱۹۴۶ء میں زبردست فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا۔ ابھی یہ زخم پوری طرح بھرا بھی نہیں تھا کہ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا۔ ملک کی آزادی کے بعد سے اب تک پٹنہ بہار کا دارالحکومت ہے۔

★

سہ فصیح الدین بلخی تاریخ مگدھ۔

غزل

میلا رام وفاؔ

ہم گاہ اِدھر گاہ اُدھر دیکھ رہے ہیں
یوں دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

عالم ہے ترے پرتوِ رُخ سے یہ ہمارا
حیرت سے ہمیں شمس و قمر دیکھ رہے ہیں

بھاگے چلے جاتے ہیں اُدھر کو تو عجب کیا
رُخ لوگ ہواؤں کا جدھر دیکھ رہے ہیں

شکوہ کریں غیروں کا تو کس منہ سے کریں ہم
بدلی ہوئی یاروں کی نظر دیکھ رہے ہیں

ہوگی نہ شبِ غم تو قیامت سے اِدھر ختم
ہم شام ہی سے راہِ سحر دیکھ رہے ہیں

وعدے پہ وہ آئیں یہ توقع نہیں ہم کو
رہ رہ کے مگر جانبِ در دیکھ رہے ہیں

شاید کہ اسی میں ہو وفاؔ خیر ہماری
برپا جو یہ ہنگامۂ شر دیکھ رہے ہیں

رضوان احمد خان

بھگتی کال

ہندی ادب کا ابتدائی دور ہندوستان کا وہ زمانہ تھا جب پورا ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور رجواڑوں میں منقسم تھا۔ ذہن انسان پر ابھی دور وحشت کے اثرات نمایاں تھے جس کے زیر اثر جنگ و پیکار ان کی طبیعت کا خاصہ تھا چنانچہ اس دور میں جو ادب پیدا ہوا اس میں بہادری و جوانمردی کی داستانیں قلم بند ہوتی رہیں۔ اس عہد کو ہندی ادب میں " ویر گاتھا کال" سے موسوم کیا جاتا ہے ــــــــ وقت گزرتا گیا اور زمانے نے کروٹ لی۔ مسلمانوں کا ورود ہوا اور اُن کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔

سلطان علاء الدین کی فتوحات کے بعد ہندوستان کی وہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں جو ہمیشہ باہم دست و گریبان رہا کرتی تھیں ختم ہوگئیں۔ لازمی طور پر ان کی داستانیں بھی ان کے ساتھ ختم ہوگئیں اور حکومت کی تبدیلی سے پیدا ہونے والے انقلاب کی دہشت گیری اور سراسیمگی میں مذہب کی محفوظ اور پرامن پناہ گاہ کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی۔ چنانچہ اب شاعری میں شمشیر و سناں کی جگہ سبحہ و زنار کا ذکر ہونے لگا اور تصوف کے سائے میں اطمینان قلب و نجات کی تلاش شروع ہوئی۔ سو تین سو سال تک حق پرستی و وحدانیت، تصوف اور بھگتی کے نغمے فضائے ہند میں گونجتے رہے۔ اس دور میں بے شمار مذہبی تحریکیں وجود میں آئیں اور اس دور کا ہر شاعر کسی نہ کسی تحریک کا بانی، مجدد یا مقلد ضرور رہا۔ اس دور نے بے شمار شاعر پیدا کیے اور اسی دور میں ہندی شاعری جذب و کیف، احساس و تخیل، وجد و عرفان، درد و اثر اور سوز و گداز سے روشناس ہوئی۔ اور صحیح معنوں میں شاعرانہ خصوصیات کی حامل بنی۔ اس دور میں کبیر داس، سور داس، تلسی داس، میرا بائی اور ملک محمد جائسی جیسے عظیم فنکار پیدا ہوئے۔ یہ دور ہندی ادب کا عہد زریں ہے اور اسی کو ہندی ادب میں " بھگتی کال" سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس دور کی تمام شاعری دو اہم نظریوں کے تحت آتی ہے۔ ایک کو نرگن واد اور دوسرے کو سگن واد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان دونوں کی بھی دو دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ نرگن واد کی ایک شاخ گیان اشری سلسلہ کہلاتی ہے اور دوسری پریم مارگی یا صوفیوں کا سلسلہ۔ سگن واد میں ایک کو رام بھگتی سلسلہ کہا جاتا ہے اور دوسرے کو کرشن بھگتی سلسلہ ــــــــ ان چاروں سلسلوں کے تحت بہت سے شعرا گزرے ہیں۔

گیان اشری شعرا بیکر اور تجسیم سے آزاد خدا کا تصور رکھتے ہیں اور خدا تک رسائی کا ذریعہ علم و عرفان کو مانتے ہیں۔ راما نند کو اس سلسلے میں مرشد اول کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے شاگردوں کی تعداد بارہ بتلائی جاتی ہے۔ ان میں نانک اور کبیر خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ کبیر داس اس سلسلے کا عظیم شاعر ہے۔ اس کی شاعری سے ہندی ادب کے سرمائے میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔

پریم مارگی شعرا عشق حقیقی کو واحد مقصد حیات اور وصل خداوندی کو منتہائے حیات سمجھتے ہیں۔ مگر یہ حقیقت کے اظہار کے لیے مجاز کا سہارا لیتے ہیں اور کردار و واقعات مجازی استعمال کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دیتے ہیں اور واصل حق ہونے کے لیے عاشق کو وصل معشوق مجازی کا لذت آشنا ہونا ضروری جانتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک لذت وصل مجاز سے ناآشنائی کی صورت میں

وصل محبوب حقیقی سے (جوان کے تصور میں اوّل الذکر سے ہزار درجہ برکیف ہوگا) صحیح طور پر محظوظ و مکیف ہونا ممکن نہیں۔ گویا اس طرح یہاں ذات حقیقی سے ملنے کا ذریعہ عشق ہے۔ اسی لیے اسے پریم مارگی سلسلہ کہا جاتا ہے۔ ہندی شاعری میں اس سلسلے کی ابتدا ملّا داؤد اور رتن سے شروع ہوتی ہے۔ مگر ان کے بارے میں معلومات بہت محدود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ملّا داود نے چنداین نامی ایک مثنوی لکھی تھی جس میں نورک اور چندا کے معاشقے کا بیان تھا رتن کی تصنیف پر تسمہ بے کہی جاتی ہے لیکن پریم مارگی دور کا باقاعدہ آغاز قطبن کی مرگا وتی سے ہوتا ہے۔ اس سے متصوفانہ تمثیلوں کی بنیاد پڑی ہے۔ یہ چندن گڑھ کے راجہ کن پتی دیو اور کنچن پور کے راجہ روپ مراری کی راج کماری مرگاوتی کے معاشقے کی داستان ہے۔ اس کا سال تصنیف سمبت ۱۵۶۶ ہے۔ اس کے بعد اس دور میں منجھن کی مدھو مالتی، ملک محمد جائسی کی پدماوت اکھراوٹ اور آخری کلام، عثمان کی چیتراولی اور نور محمد کی اندراوتی مشہور تصانیف ملتی ہیں۔ ان میں جائسی کی پدماوت کو شہرت دوام حاصل ہے۔ اس کی تکمیل شیر شاہ سوری کے عہد میں ہوئی۔ اس کی داستان جزیرۂ سنگلدیپ کی راج کماری پدماوتی اور رتن سین کی داستان معاشقہ ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جو حقیقی ہوتے ہوئے بھی تمثیلی ہے اور اسکے پردے میں تصوف کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔

رام بھگتی تحریک کے مشہور شعرا تلسی داس اور نابھا داس ہیں۔ نابھا داس کی "بھگت مالا" رام بھگتی کے جذبات سے معمور ہے۔ تلسی داس اس تحریک کا عظیم شاعر ہے اور اس کی مشہور تصنیف اپنی گوناگوں ادبی، شعری اور تاریخی خصوصیات سے اس دور کا عظیم شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ راماین کو تلسی داس نے رام چرتر مانس سے موسوم کیا ہے۔ اس میں رام کی پوری زندگی کے حالات و واقعات بالتفصیل قلم بند ہوئے ہیں۔ اس تحریک کے شعرا معبود حقیقی کو کسی انسانی پیکر میں مانتے ہیں۔

کرشن بھگتی تحریک کے تحت سورداس، میرابائی، ودیاپتی اور رس کھان مشہور شعرا گزرے ہیں ان میں سورداس کو عظمت حاصل ہے۔ ان کی اہم تصنیف سورساگر ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ سوا لاکھ اشعار تھے۔ اس میں کرشن کے کردار کو پیش کیا گیا ہے جس طرح تلسی داس نے رام چندر جی کی ذات میں یزدانی جلوے کو مجسم کرنے کی کوشش کی، اسی طرح سورداس نے کرشن جی میں یزدانیت کو محدود کر دیا۔ ودیاپتی بہار کے دربھنگہ ضلع کے بسپی نامی گاؤں کے باشندے تھے۔ ان کے گیتوں میں رومانیت کا اثر ہے۔ میرابائی کے بھجن شیرینی اور سادگی کے لیے مشہور ہیں۔ انھوں نے جذبات نگاری اور عشق کامل کا جو انداز اختیار کیا ہے اس پر تصوف کا بہت کچھ اثر ملتا ہے رس کھان کا کلام سیدھا، صاف اور عاشقانہ ہے ؎

مانس ہوں تو وہی رس کھان بسوں سنگ گوکل گاؤں کے گوارن
جو پشو ہوں تو کہا بس میرو چروں نت نند کی دھینو مجھارن

رس کھان کی دو کتابیں، پریم باٹکا اور سجان رس کھان ہیں۔

اس طرح بھگتی تحریک نے ہندی شاعری کو جن گراں بہا فن پاروں اور عظیم شاعروں سے نوازا اس کی مثال ہندی ادب کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ بھگتی کال ۱۳۱۹ء سے ۱۶۴۳ء تک محیط ہے۔

★

انجان شاعروں کے اچھے شعر: (صفحہ ۵ کا بقیہ)

دوانی ہے ان آنکھوں میں آمدہ نشے کی — ساقی بگلا نگ سو جب جام بھرے ہے
غش میں مجھے کل دیکھ کے وہ کہہ کے۔ ولا — بس ہوش میں آ، کیوں، مجھے بدنام کرے ہے
پیغام اجل چاہ ہے اس بت کی، دلسکن — کب عاشق جاں باختہ مرنے سے ڈرے ہے

محفل میں مجھے دیکھ کے کہنے لگا اپنی — جا دے۔ بلا گھر سے مرے، کوئی اڑے ہے
اٹھا تو میں بولا کہ میں ہوں غیر کو کہتا — جل جل کے تو کچھ اپنی ہی عبرت میں مرے ہے
تارک سفر دور کو گویا وہ سدھارا — گرم طلب شوق کے نزدیک ورے ہے

★

غزل

نذیر بنارسی

وہ بھی بدل گئے جو کبھی ہم نشیں رہے
انسان اپنا وقت نہ بھولے کہیں رہے

اس کا خیال اے مرے قلبِ حزیں رہے
آگے بڑھے نہ بات جہاں ہے وہیں رہے

ہر دم جو درمیان گمان و یقیں رہے
وہ بدنصیب عشق کہیں کے نہیں رہے

کیا جانے کس خیال میں چیں بر جبیں رہے
گیسو کہیں نگاہ کہیں وہ کہیں رہے

حُسنِ نظر کے ساتھ جو حُسنِ یقیں رہے
جس شے کو بھی حسین بنا دو حسیں رہے

کچھ روز ہم بھی تارکِ دنیا و دیں رہے
انجام یہ ہوا کہ کہیں کے نہیں رہے

محفل میں اور بھی تو کئی خوش جمال تھے
کیوں ہر نظر کی زد پہ اکیلے تمھیں رہے

تنہا جو تھا وہ ہو گیا آوارۂ جہاں
تم سب کے ساتھ رہ کے بھی پردہ نشیں رہے

تم اک طرف کے ہو تو گئے عہد توڑ کے
ہم تو زبان دے کے کہیں کے نہیں رہے

دادِ وفا تو لینے کو آئے ہیں آج سب
الزام سر پہ لینے کو تنہا ہمیں رہے

پھر کس طرف سے غم مرے نزدیک آ گیا
حدِ نگاہ تک تو نظر میں تمھیں رہے

وہ آ رہے ہیں لوگ نہ آگے بڑھیں نذیرؔ
کہہ دیجیے کہ جو ہے جہاں پر وہیں رہے

زندگی کا دائرہ

وجئے پانسکر ——— (کہانی)

ڈرائنگ روم کے قالین کو نوکر کے ہاتھ نیچے بچھوا کر کلپنا نے اطمینان کی سانس لی۔ ایک کونے میں ڈھیر سارے سگریٹ کے ٹکڑے جمع ہوگئے تھے۔ وہ ٹکڑے اس نے خود نکالے تو جھاڑو کے ساتھ اکٹھے کرتے ہوئے وہ مسکرا پڑی۔

اکھل نے کسی مری ہوئی آواز میں کہا تھا۔ "مجھے آرٹ نہیں، زندگی چاہیے کلپنا۔ اگر آرٹ مجھے زندگی سے دور لے جائے تو میں اس کے بنا ہی ٹھیک ہوں میں بہت معمولی سی زندگی کا خواہاں ہوں — وہی جو پہلے تھی تم تھیں، منا تھا اور گھر تھا۔ مکمل سکون تھا ——— اب اس کا فقدان ہے۔"

کلپنا اس مخصوص لمحے کی بات سوچ کر خوشی سے جھوم اٹھی۔ ابھی دو ہی دن کی تو بات ہے۔ اس نے جو کھویا تھا پا لیا۔ ڈگمگاتی گرہستی کی ناؤ کو ساحل پر لے آئی ہے۔ وہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر اندر جانے والے کمرے میں گئی۔ شیشے میں منہ دیکھا۔ ترشی ہوئی بھویں۔ بیوٹی پارلر سے مزین ترشے ہوئے نئے اسٹائل کے بال جب وہ پہلے دن بال کٹوا کر آئی تھی تو اکھل کا چہرہ قابلِ دید تھا

"ارے، ارے ——— یہ تم نے اپنے بالوں کا کیا کر ڈالا؟"

"کچھ نہیں۔"

"مگر یہ ———"

"نیا اسٹائل ہے نا۔ تمہارا اور باس دونوں کو پسند تھا، اس لیے میں نے ایسا کر ڈالا۔"

اکھل اس کے بعد کچھ بھی نہ بول سکا تھا۔ اس نے سگریٹ جلالی

کلپنا نے ایک ترچھی چتون اکھل کے چہرے پر ڈالی تھی اور اندر والے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس دن اسے احساس ہوا تھا کہ اس کی پہلی فتح ہے۔

تبھی کلپنا کی نظر میز پر رکھی اپنی ایک برس قبل کی تصویر پر گئی۔ تب وہ کتنی سیدھی سادی تھی۔ بڑا سا گول جوڑا اور ماتھے پر بڑی سی بندیا آنکھوں میں سہاگ کی سرخی اور پلکوں پر پردہ کی تقدس اور عظمت۔ اس کلپنا اور آج کی کلپنا میں کتنا فرق آگیا تھا۔ شاید یہ فرق نہ آتا، کلپنا وہی بھولی، دنیا کے داؤ پیچ سے اچھوتی رہتی، اگر اس کی زندگی میں گزشتہ کچھ ماہ کا اضافہ نہ ہوا ہوتا

پرسوں شام کی ہی تو بات ہے جب کلپنا نے گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہی جان لیا تھا کہ اس کے شوہر اکھل کی محفل روزانہ کی طرح اس دن بھی جمی تھی۔ نمیتا کی آواز سنائی دی تھی۔ "ہم لوگ جب تک اپنی گرہستی سے بندھے رہیں گے تب تک ہرگز ترقی نہ کر سکیں گے۔" اس وقت کلپنا نے سوچا تھا۔ وہ لوگ گرہستی کا مطلب ہی نہیں سمجھتے جہاں کافی کچھ کھانے کو مل جاتا ہے وہیں ان کی گرہستی جمتی ہے۔

کلپنا نے کال بیل دبائی تھی ڈرائنگ روم کا دروازہ نمیتا نے ہی کھولا تھا جس کی اونچی آواز کلپنا نے سیڑھیوں میں ہی سن لی تھی۔ کلپنا نے بڑی عجیب سی حالت میں دم رکھا تھا۔ بکھرے ہوئے بال ادھر ادھر الجھ رہے تھے۔ مانگ نکالی گئی تھی یا نہیں اس کا علم اسے دیکھ کر نہیں ہوتا تھا سوتی ہلکے پیلے رنگ کی ساڑی کئی جگہ سے سلوٹوں سے بھری ہوئی لگ رہی تھی۔ نمیتا نے "برگیٹ بارڈوت" اسٹائل پر بنا

جوڑا باندھا تھا۔ اس کے سوکھے منحوس چہرے پر اس وقت بھی ایک تازگی تھی۔ اور وہ بڑے بھڑکیلے رنگ کی گلابی لپ اسٹک لگائے ہوئے تھی۔

" ہیلو کلپنا ——— "

" ہیلو " کلپنا نے بھری مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا اور اندر والے کمرے میں چلی گئی تھی۔ محفل کی امنگ میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ باہر والے کمرے میں پھر بحث شروع ہو گئی تھی ہر روز بحث کا موضوع ایک ہی ہوتا ——— کبھی اس کا ایک پہلو لیا جاتا ہے کبھی دوسرا۔ فن کار کو فن کو فوقیت دینی چاہیے یا اہمیت۔ اسے آرٹ کو اولیت دینی چاہیے یا زندگی کو۔ گوشٹھی میں سب جدید آرٹسٹ اور قدردانِ فن جمع ہوئے۔ شروع شروع میں گوشٹھی کافی ہاؤس میں ہوتی تھی۔ ایک دن کلپنا نے اکھل سے کہا تھا " کافی ہاؤس میں بات چیت کرنے میں پریشانی ہوتی ہوگی۔ آپ دوستوں کو گھر ہی لے آیئے۔ آخر آپ کے دیگر دوست احباب بھی تو آتے ہی ہیں۔ کافی ہاؤس لاکھ اچھا ہو ——— اس سے کیا ہوتا ہے۔ پھر ——— روز روز کا خرچ بھی تو کافی ہوتا ہوگا "

اکھل کے گندمی چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی تھی۔ وہ کلپنا کے کندھے چھوتا ہوا بولا تھا " تم بہت اچھی ہو کلپنا۔ میری ہر ضرورت کا کتنا خیال رکھتی ہو "

کلپنا کی آنکھیں محبت و عقیدت سے نم ہو گئیں۔ ان دونوں کی دو سال قبل لو میرج ہوئی تھی۔ اکھل یوں تو فیض آباد ضلع کا رہنے والا ہے لیکن اُسے کلکتہ میں رہتے ہوئے دو دہے گزر چکے ہیں۔ اس کی تعلیم بھی کلکتہ میں ہوئی ہے۔ اسی لیے اس کے لباس میں بنگالی پن آگیا ہے جو اس کی شخصیت کو جاذبِ نظر بناتا ہے۔

کلپنا اسکول بند ہو جانے پر گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے ماما کے یہاں آئی تھی۔ وہ اتر پردیش میں ایک چھوٹے سے شہر کے ایک اسکول میں لڑکیوں کو دست کاری سکھاتی تھی۔ ممیرے بھائی کے ذریعے اکھل سے مل کر وہ بڑی خوش ہوئی تھی۔ اکھل اس وقت ایک بینک میں ہیڈ کلرک کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ ساڑھے تین سو کے قریب تنخواہ ملتی تھی۔ اس بینک میں کلپنا کے ماما کچھ اونچی پوسٹ پر تھے۔ اکھل ان ہی سے ایک بار ملنے آیا تھا کہ ہریش کا دوست بن گیا۔ ہریش اکھل دا سے متاثر تھا۔ جو تھوڑی سی پینٹنگ بھی کر لیتے تھے اور دن بھر بینک کے لیجر چیک کرنے کے بعد نئی کویتا (شاعری) بھی کرتے تھے۔ دھڑکنوں سے موسیقی سنتے تھے اور پتھروں سے تعبیر کی کہانی کہتے تھے۔ اکھل دا جب بات چیت کرتے تو بحث کے جوش میں اپنا جیون بھی داؤں پر لگا دیتے تھے۔ اکھل کے سپنوں سے کلپنا بھی متاثر ہوئی تھی۔ اکھل کی کویتاؤں میں ظلم و نا انصافی کے خلاف آواز تھی۔ دیانت کے اوپر بھرپور چوٹ تھی۔ چھوٹے سے اسکول کی ماسٹرنی کلپنا اگر اپنے کو فراموش کر بیٹھی تھی تو اسے اس کا دوش نہیں دیا جا سکتا۔

تعارف کے تین چار دن کے اندر ہی اکھل نے کلپنا کو اتنی باتیں سنا دی تھیں جتنی شاید معمولی آدمی تین سال میں سنا پاتا۔ اپنے گھر پریوار کی، اپنے ماں باپ کی۔ اس غریبی اور تکلیف کی جس میں سے گزر کر وہ آیا تھا۔ ان ہی تین چار دن کے بعد ہی اکھل نے کلپنا سے کہا " میں بہت بڑے بڑے سپنے دیکھتا ہوں ——— شاید زندگی بھر وہ سپنے ہی رہ جائیں گے، کلپنا تم اپنی برش سے ہلکا رنگ بھر دو تو وہ حقیقت میں بدل جائیں گے "

بات ہریش کے سامنے کہی گئی تھی۔ وہ فوراً بولا " ہریش دا آپ میری جی جی کو 'پر پوز' کر رہے ہیں "

کلپنا کا سر حیا سے جھک گیا تھا۔

" واہ بھئی خوب! یوں تو تم سیدھی سے سیدھی بات نہیں سمجھتے۔ یہ سمجھے تو خوب۔ تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ کیوں، بولو کرو گے اپنی جی جی کی شادی میرے ساتھ؟ "

" اکھل دا، میں ابھی پتا جی سے معلوم کر کے آتا ہوں "

کلپنا کے کچھ بولنے سے پہلے ہریش اپنے پتا سے معلوم کر آیا تھا۔ نہیں۔ وہ خود اس کے ساتھ آ گئے تھے۔ گھر بیٹھے بنا کسی کوشش کے اکھل جیسا داماد پا کر انھیں بڑی خوشی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی بہن کو تار بھیج دیا تھا۔ وہ فوراً آ گئی تھیں۔ بنا کسی تکلف و تیاری کے ان دونوں کا بیاہ ہو گیا تھا۔ کلپنا نے کلکتہ سے ہی اپنا استعفیٰ بھیج دیا تھا اور پھر لوٹ کر اپنے شہر نہیں گئی تھی۔

شادی کے بعد اکھل نے گھر بستی جمانے میں کلپنا کو بڑا تعاون

دیا تھا۔ شام کو گھومنے کے مقصد سے وہ گنگا کے کنارے نکل جاتے تھے اور کبھی بازار۔ اکھل نے شادی میں کچھ لیا نہیں تھا۔ اس لیے کلپنا بڑی کفایت اور سلیقہ شعاری سے گھر چلاتی تھی۔ زمین پر جنت کیسی ہوتی ہے اس کا احساس اکھل کو اپنے گھر بیٹھ کر ہوتا تھا۔ اپنی مطمئن گرہستی میں اسے چار چاند لگے محسوس ہوئے جب منّا بھی آ گیا۔

منّا کی پیدائش کے بعد اکھل کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی خود کو تجزیہ کرنے کی عادت جسے اب وہ بھول چکا تھا عود کر آئی۔ میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟ سنسار میں کس لیے آیا ہوں؟ ذاتی طور پر علم ہوا۔ شادی کے بعد وہ کلپنا سے بندھ سا گیا تھا۔ اب وہ تیسرے چوتھے دن شام کو گھر سے باہر جانے لگا جس دن شام کو جاتا، رات کو بڑی دیر سے لوٹتا۔ کلپنا بچے کے سو جانے کے بعد اونگھنے لگتی۔ دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ میں اس کا دم گھٹنے لگتا۔ لو میرج کے ضمن میں اس نے جو کچھ بھی سنا تھا یا پڑھا تھا اسے دوہرا لیتی۔ اس کا من ایک خوف سے کانپتا رہتا ——— کہیں اس کی لو میرج بھی تو دوسری لو میرجوں کی طرح ناکام نہیں ہو رہی ہے؟

وہ اکھل کے بھوجن، اس کی پسند کا خاص خیال رکھتی۔ اکھل اکثر کہتا "تم کتنی اچھی ہو کلپنا۔ کتنی سمجھ دار ہو۔ میری قسمت کہ تو تم کلکتہ دیکھنے چلی آئیں ورنہ اس منحوس شہر کو دیکھنے کون آتا ہے؟"

کلپنا اپنی قسمت کی تعریف سن کر پھولی نہ سمائی۔ وہ سوچتی کس کی قسمت کس سے اچھی ہے۔ اس کا فیصلہ ان دونوں کے لیے وقت طلب تھا۔ اکھل کے باہر جانے سے اسے روپیوں کی ضرورت بھی پڑنے لگی۔ آج روپیہ اس لیے چاہیئے تو کل دوسری چیز کے لیے چاہیے۔ کلپنا دھیرے دھیرے روپیے نکال کر دینے لگی۔

کبھی کبھی ساڑھے دس بجے اور پونے گیارہ بجے رات کو لوٹتا تو کلپنا سے کہتا "تم نے کھانا کیوں نہیں کھا لیا؟ تم سوئی کیوں نہیں؟"

کلپنا روہانسی آواز میں کہتی "میں کب آپ سے پہلے سو جاتی ہوں یا آپ کے آنے سے پہلے کھانا کھا لیتی ہوں؟"

ایک رات وہ بہت دیر سے گھر آیا تو کلپنا نے کہا "آخر بات کیا ہے جو آپ اتنی اتنی دیر گھر سے باہر رہتے ہیں؟"

اس کا جواب اکھل نے کچھ نہ دیا۔ وہ بہت نرم لہجے میں بولا "تم تو جانتی ہو کہ شادی سے پہلے میں اپنے کئی شوق پورے کرتا تھا۔ مجھے پینٹنگ کا بہت شوق تھا۔ کویتا لکھنے میں دلچسپی تھی۔ شادی کے بعد یہ دونوں ہی باتیں ختم ہو گئی تھیں۔ شاید تم نہیں جانتیں کہ میں کبھی کبھی جھنجھلاہٹ سے بھر اٹھتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے میری زندگی ختم ہو رہی ہے۔ جیسے بس میں بینک کا بہی کھاتہ لکھنے اور گھر میں منّا کے کپڑے دھونے کے ہی لیے رہ گیا ہوں جیسے میرا اور کوئی کام نہیں ہے تبھی ایک دن پانڈے مل گیا۔ مجھے کھینچ کر کافی ہاؤس لے گیا وہاں پرانی محفل جمی تھی ——— پانڈے، ارون، روپت، میناکشی اور نمیتا۔ پانڈے نے اپنی کویتا سنائی جو اس نے جینٹیوں کی سیاست پر لکھی ہے۔

کلپنا کے ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی۔

"کیوں، تم جینٹیوں کی سیاست پر ہنس رہی ہو؟ وہ بڑی چالاک ہوتی ہیں۔"

"سچ؟ تم اور تمہارے دوست احباب بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ کیوں نہ میں بھی سنوں؟"

اکھل کی آنکھوں میں از سر نو خواب تیر گئے جو بہت پہلے اس نے تصور میں دیکھے تھے۔ کلپنا کو بھی لگا گویا وہ دونوں اجنبی مسافروں کی طرح ہیں اور ایک دوسرے سے متعارف ہو رہے ہیں۔

اکھل کو محسوس ہوا کہ لڑکیوں کو سلائی سکھانے والی ٹیچر، جس سے اس نے شادی کی ہے، وہ کوئی اور ہے ——— یہ نہیں ہے۔ یہ تو بڑی باکمال اور ذی شعور عورت ہے جو نئی شاعری میں نئی اٹکنگ میں اور آرٹ میں دلچسپی دکھاتی ہے۔ اکھل نے کبھی کلپنا سے پوچھا بھی نہ تھا کہ اس کی کتنی تعلیم ہے اور وہ کہاں تک پڑھی لکھی ہے۔ شاید وہ بھی بائرن اور کیٹس کی شاعری سمجھتی ہو۔ اس کو اتنے دن اس آرام سے اس نے محروم ہی رکھا کہ اس کا شوہر بھی ایک دن بائرن بن سکتا ہے۔ شہرت حاصل کر سکتی ہے۔

شادی کے پہلے سال میں گرہستی جاتے، ایک دوسرے کو پہچانتے اور پرکھتے انھوں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ کون

کتنا تعلیم یافتہ ہے۔ کبھی اس کا ذکر ہی نہیں ہوا۔

اکھل کو یاد آیا، کئی بار، وہ اور کلپنا ریستوراں میں کھانا کھانے گئے ہیں، وہاں بجتے "جاز" اور "ٹیوسٹ" کو اس نے بڑی دلچسپی سے سنا ہے۔ سنیما کے پردے پر بھی وہ اس کے ساتھ ان ہی تصاویر کو پسند کرتی رہی ہے جنھیں وہ پسند کرتا تھا۔ اکھل یوں ہی اتنی فکر کرتا آیا ہے۔ اسے بہت پہلے سے اپنے دوستوں کو گھر بلانا چاہیے تھا۔

اس وقت اکھل کلپنا کو اپنی آئندہ کامیابیوں سے متعارف کرا دینا چاہتا ہے۔ اس نے کہا "کلپنا میں تم سے معافی چاہوں گا ——— میں نے تمھیں بتایا نہیں کہ پانڈے اور میرے دیگر دوستوں کا خیال ہے کہ میں ضرور ایک دن بہت بڑا شاعر بنوں گا۔ میری کتاب شائع ہوتے ہی لوگوں کا پتہ چل جائے گا کہ اتنی بڑی علمی شخصیت کس کونے میں چھپی پڑی ہے۔ بنک کے لیجرز لکھتے لکھتے وہ ختم ہو رہی ہے۔ بائرن کی شہرت میری منتظر ہے۔"

اس کے بعد تیسرے دن ہی پوری محفل ان کے گھر جمی۔ جتنا تو ماہ کا تھا۔ دو کمروں کے فلیٹ میں بہت سے لوگوں کی اونچی اونچی آواز سنکر چلانے لگا تھا۔ وہ تو کسی کے بھی گھر آنے کا عادی نہیں تھا۔

کلپنا نے بڑے پیار سے کافی بنائی۔ کچھ پکوڑیاں اس نے پہلے ہی بنا رکھی تھیں۔

آج تک اکھل کے جتنے بھی دوست آئے تھے انھوں نے کلپنا کی سلیقہ شعاری کی تعریف ہی کی تھی ——— اس میں دل جیسی آشکار کی تھی۔ آج کے مہمان کچھ دوسرے ڈھنگ کے تھے۔ پانڈے سے تعارف ہونے پر اس نے اس سے ہاتھ ملایا۔ کلپنا نے جواب میں ہاتھ جوڑ دیئے تو اس نے اس کے جڑے ہاتھوں کو اپنے دو ہاتھوں میں لے لیا۔ کلپنا نے بڑبڑایا اکھل کی طرف نظر کی تو وہ دوسروں سے بات چیت کرنے میں اتنا مصروف تھا گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

مینا کشی نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں "اوہ! تو تم ہی وہ جادوگرنی ہو جس نے اکھل سے اس کی محفل چھڑا لی۔ میں بھی تو دیکھوں تمھارا جادو۔"

نمیتا نے پکوڑی کو منہ میں رکھتے ہوئے کہا "مرد بڑے چھچھورے ہوتے ہیں۔ اچھا بھوجن کرنے کے لیے اکھل نے کلپنا کو قیدی بنا لیا ہے ———"

کلپنا نے اس کا جواب دیا تھا "نہیں ——— نہیں۔ اُسے کسی نے قید نہیں کیا ہے۔ گھر کا کام کرنا تو عورت کا اولین فرض ہے۔"

اروِن کے علاوہ کلپنا کی بات پر سب ہنس دیئے۔

میناکشی بولی "کلپنا ابھی نئی روشنی سے بہت دور ہے۔"

کلپنا نے اکھل سے آنکھ ملانا چاہی۔ وہ دور سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ بات کلپنا کے دل میں اسی طرح پیوست ہو گئی جس طرح ڈرائنگ پن لکڑی میں فٹ ہو جاتی ہے۔ جلد ہی کلپنا کو معلوم ہو گیا کہ پانڈے کا پیشہ دوسروں پر انحصار کرنا ہے۔ اس کا تندرست چہرہ دیکھ کر اس طرح کا خیال نہیں آتا تھا۔ تیس سال کی عمر، لال سرخ چہرہ، موٹا مگر جھکتا ہوا بدن، بات کرتا تو اس یقین کے ساتھ گویا کوئی پروچن دے رہا ہو۔

اس کے بعد پابندی سے محفل ان ہی کے گھر جمنے لگی۔ بات چیت کرتے کرتے ——— کافی کئی بار بنانی پڑتی۔ اُن کے جھوٹے برتن اٹھانے پڑتے، پھر کافی بنانی پڑتی۔ سلسلہ اسی طرح چلتا۔ دودھ ختم ہو جاتا تو منے کا پاؤڈر والا دودھ لیا جاتا۔ دھیرے دھیرے حالت یہ آ گئی کہ منے کا دودھ ختم ہونے لگا۔ اکھل دوستوں کی محفل میں ایسا الجھا رہتا کہ اس نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے ——— کلپنا کو کن تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے کلپنا دھیرے دھیرے اپنی جمع پونجی صرف کرنے لگی۔ ایک دن اکھل نے آفس سے آکر کہا "کلپنا تم بڑی سمجھ دار بیوی ہو۔ تم تو سمجھتی ہو ——— میں آرٹ کا دل دلدادہ ہوں۔ مجھے روز روز فکر کی کرنا پڑتی ہے۔ بینک میں جا کر لیجر لکھنا پڑتا ہے۔ میں اس نوکری سے پریشان ہو گیا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے میرے سپنوں کا دم نکل رہا ہے۔ میری سانس نکلنا مشکل ہے۔ کچھ دن کے لیے میں چھٹی چاہتا ہوں۔ میں نے تین مہینے کی چھٹی لی ہے۔ اس میں صرف ایک مہینہ تنخواہ کے ساتھ ہے باقی دو بنا "پے" کے۔"

کلپنا متحیر سی اکھل کو دیکھنے لگی کہ یہ وہ اکھل ہے جس نے اس

نے دو سال قبل شادی کی ہے۔

"تم نے جواب نہیں دیا کلپنا ــــــ"

بڑے سادے اور گمبھیر لہجے میں وہ بولی "اس میں بھلا میں کیا کہوں گی۔ آپ نے جو کچھ کیا ہوگا سوچ سمجھ کر کیا ہوگا۔"

گھر کیسے چلے گا ــــــ روپیہ کہاں سے آئے گا ــــــ لمبی لمبی کافی کی محفلیں کیسے ہوں گی ــــــ اس کا ذکر نہیں ہوا۔ ادبی ذوق والے شوہر سے ہمیشہ روزمرہ کی ضروریات کی بات کرتے اس کی ہمت نہیں پڑی۔ اکھل نے کبھی اس سے پوچھا ہی نہیں کہ وہ گھر کس طرح چلاتی ہے ــــــ کیا کرتی ہے۔

اکھل کے آفس نہ جانے سے اور بھی مصیبت ہو گئی تھی۔ اب گوشٹھی صبح بھی جمنے لگی تھی پانڈے اور ارون کو تو کبھی کبھی ہی آنا نصیب ہوتا، نمیتا یا میناکشی یا کوئی دوسرا لونڈا صبح ہوتے ہی آدھمکتا۔ میناکشی اور پانڈے پہلے شوہر بیوی تھے اب نہیں رہے۔ پھر بھی ایک دوسرے سے مل ہی لیتے ہیں۔ وہ گہرے دوستوں کی طرح ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ بات چیت کرتے ہیں۔ کلپنا کے لیے حقیقت میں یہ نئی بات ہے۔ اس نے کبھی ایسی بات نہیں سنی۔

اکھل چھٹی لینے کے بعد ایک پروجیکٹ تیار کرنے لگا اور میناکشی اس کی ماڈل بنی۔ کلپنا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ موٹی آنکھوں والی موٹے ہونٹوں والی گونڈ حسینہ کی طرح نظر آنے والی میناکشی ماڈل کیسے بن گئی۔ اکھل کہتا ہے ــــــ وہ قدرت کے بہت قریب ہے۔ وہ اسے حسین تخلیق کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ جو تصویر بنا رہا ہے اور بھی عجیب لگتی ہے۔

کلپنا اسے تصویر میں ہمہ تن گوش دیکھتی یا میناکشی کے کندھے ٹھیک کرتے ہوئے پاتی تو چپ رہتی۔ کچھ بولتی نہیں۔ نئی روشنی سے دور رہنے والی بھلا بول کیا سکتی ہے، جب تک ان لوگوں کے امتحان میں پوری نہ اترے۔

ایک دن کلپنا نے ایک نوکرانی رکھ لی۔

اکھل گویا اس نوکرانی کے وجود سے بھی بے خبر رہا ــــــ کیوں رکھی گئی ہے۔ اس کی تنخواہ کا انتظام کہاں سے ہوسکے گا؟

کلپنا تیار ہو کر باہر جانے لگی تو اکھل نے پوچھا "کہاں جا رہی ہو ــــــ؟"

"نوکری پر ــــــ"

"کیا؟"

"بتایا نا۔ نوکری پر جا رہی ہوں۔"

"کیسی نوکری؟"

"ریسیپشنسٹ کی۔"

اکھل کے منہ پر گویا سیاہی پت گئی۔

"کیوں؟"

"مجھے نہ سہی منّا کو تو دودھ چاہیے۔ اس کا پیٹ آرٹ کی بات چیت سے نہیں بھرتا۔" اکھل نے نہیں پوچھا ــــــ نوکری کب ملی؟ کس نے دلوائی؟ وہ صرف سوچ کر رہ گیا اور وہ چلتی بنی۔ اکھل کو محسوس ہوا گویا کوئی خواب اس کے ہاتھ سے پھسل کر چکنا چور ہو گیا ہو۔ ہاتھ خالی خالی رہ گیا ہو۔ آج کل خاص کام نہ ہونے کے سبب وہ دل ہی دل میں کئی خاکے بناتا اور بگاڑتا رہا۔ اسے آئینے میں دیکھنے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ آئینے والا اکھل کہتا ــــــ تم بیکار ہو۔ تم کلرکی سے بھی گئے اور آرٹسٹ بھی نہ بن سکے۔ تم کچھ بھی نہیں ہو۔ ہوا میں اڑتا پتہ بھی تم سے بہتر ہے۔ اکھل اس وقت دیوار سے سر ٹکرا کر اپنے کو "خود" کے پاس لے آتا۔

نوکرانی منّا کی دیکھ بھال کرتی ــــــ بیچ بیچ میں کافی بناتی چائے بناتی۔ کبھی کھانا بناتی اور کبھی اس کا وقت ہی نہ ملتا۔

ایک شام ٹرالن کا بڑھیا سوٹ زیب تن کیے ایک آدمی کلپنا کے ساتھ آیا۔ اکھل اس وقت نمیتا سے بحث کر رہا تھا۔

کلپنا نے اپنے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی کہا "یہ میرے پتی ہیں، اکھل۔" "ان سے ملو، میرے دوست مسٹر گھوش۔" دوست کا الفاظ سنتے ہی اکھل چونک گیا۔ اکھل نے نمیتا کا تعارف کرایا ــــــ "اور یہ نمیتا جی ہیں، آرٹ کریٹک (فن کی ناقد)۔"

نمیتا نے لمبے لمبے ناخونوں والا ہاتھ بڑھا دیا۔ گھوش نے زور سے دبا دیا۔ نمیتا گھوش کے ہاتھ کے سہارے لڑھک گئی گویا اس کے ساتھ ڈانس کرنے والی ہو۔ کلپنا نے حقارت سے ان کی طرف دیکھا۔

اکھل بولا "تشریف رکھیے نا۔ چائے پیجیے۔"

"نہیں، آپ لوگ ڈسٹرب ہوں گے۔ ہمارا کوئی ارادہ نہیں کہ آپ
وں کو ڈسٹرب کیا جائے۔ میں تو منّا کو دیکھنے آئی تھی" کلپنا نے جواب دیا۔

"منّا کو آیا باہر لے گئی ہے۔ کلپنا تم چائے بناؤ نا" نیتا نے مشورہ

کلپنا بولی "نہیں، میں مسٹر گھوش کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔ آپ خود
یے اور نوش کیجیے۔ میں آرٹ پر بحث کرکے نہیں، دن بھر کام کرکے آئی
ں ــــــ"

اکھل بولا "میں نے بھی چائے نہیں پی۔"

کلپنا نے بنا کچھ کہے اپنی بات جاری رکھی "چلیے مسٹر گھوش، مجھے جلدی
لوٹ کر منّا کے لیے کھچڑی بنانی ہوگی۔ نہیں تو باہر سے آکر بھوکا ہی
و جائے گا۔"

اکھل کو جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا ہو۔ اس واقعہ کا ذکر اس نے
بعد میں کلپنا سے نہیں کیا اور اس رات دونوں خاموش رہے۔

اس کے بعد کلپنا اکثر ایک نہ ایک دوست کو ساتھ لے آتی۔
کبھی کبھی منّا کو بھی ساتھ لے جاتی۔ اکھل کو محسوس ہوتا کہ گھر میں وہ اکیلا
رہ گیا ہے۔ کلپنا کی موجودگی کا وہ عادی ہو چکا تھا۔ اب کلپنا زیادہ تر گھر سے
باہر رہتی تھی۔ اسے ماڈل بننے کی کوشش نہیں رہی تھی۔ اکھل کو سگریٹ
پینے تک کو کلپنا سے پیسے مانگنے پڑتے تھے۔ وہ اشارہ کرتا تو کلپنا
اس کی پسند کے موافق چیز منگوا دیتی۔ اپنی طرف سے ہمیشہ وہ اس کی
طرف سے کسی چیز کی طلب کی منتظر رہتی۔ اکھل پریشان سا رہنے لگا۔
اسے محسوس ہوا گویا وہ بے کار اور بے مقصد ہو گیا ہے۔ گویا اس کے
وجود، رہنے کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔

وہ گزشتہ دو ماہ سے ایک بھی تخلیق نہیں کر سکا تھا۔ اس کی کوئی
خواہش پوری نہ ہوئی تھی۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھتا، تو کچھ بھی نہیں سوچ پاتا۔
اپنی پرچھائیں کو ہی اپنی طرف آتے دیکھ کر چونکنا ہو جاتا۔ اس نے اکھل کا
مختلف روپ تھا۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ چہرہ بھی روشن
نہیں تھا۔ آنکھوں میں سپنوں کے دیپ بجھ چکے تھے۔ ان کی راکھ بھی باقی
نہ تھی۔

اور اس رات منّا کے پیٹ میں درد ہوتا رہا۔ اکھل برابر کہتا
"ڈاکٹر صاحب کو کیوں نہیں بلاتیں؟"

چار پانچ بار اس نے ایک ہی بات دہرائی تو کلپنا نے آہستہ
آواز میں کہا "فیس کے لیے روپے نہیں ہیں۔"

اکھل کو کاٹو تو خون نہیں۔ اس نے سہارے کے لیے دیوار پکڑ لی۔
منّا بیچ بیچ میں رونا اور پھر چپ ہو جاتا۔ اکھل اور کلپنا رات بھر جاگتے
رہے۔ صبح نوکرانی آئی تو کلپنا نے اس سے ادھار مانگے۔ ڈاکٹر کو بلوایا۔ ڈاکٹر
دوا دے گیا۔ منّا کو انجکشن لگ گیا تو وہ سو گیا۔

اکھل نے رات بھر میں صرف سگریٹ ہی پھونکے تھے اور کچھ
نہیں کیا تھا۔ کلپنا بچے کو سلا کر کام پر جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔

اکھل اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "مجھے معاف کر دو
کلپنا۔ میں نے تمھیں بہت تکلیف دی ہے۔"

کلپنا اس ڈر سے کہ اس کے آنسو نکل آئیں، دوسری طرف دیکھتی رہی

"آج سے تم کام پر نہیں جاؤگی۔ میں جاؤں گا۔"

"آپ ــــــ آپ کے آرٹ کا کیا ہوگا؟"

"اوہ، کلپنا ــــــ آرٹ زندگی سے کیسے الگ ہو سکتا ہے۔ مجھے
زندگی چاہیے صرف آرٹ نہیں۔ میں راستہ بھٹک گیا تھا کلپنا۔ تم نے مجھے
کیوں نہیں ٹوکا؟ کیوں نہیں کچھ کہا ــــــ تم تو بس سب چپ چاپ
برداشت کرتی رہیں۔"

اکھل بھی رو رہا تھا۔ کلپنا اس کے آنسو پونچھ رہی تھی۔ مینا کسی کا
پورٹریٹ دیوار پر ہوا سے پھڑ پھڑا کر گر گیا اور کھلے دروازے
سے باہر اڑ گیا۔

★

باکو میت

جواہر لال نہرو کی تشریف آوری[1] پر ایک گیت

مترجم ——— ڈاکٹر اجمل اجملی

توفیق بیرام سوویت آذربائیجان کے شاعروں کی درمیانی نسل کے نمائندے ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں وہ باکو میں پیدا ہوئے، ۱۶ برس کی عمر میں ان کی اولین نظمیں شائع ہوئیں۔ اس وقت آذربائیجان کے ممتاز شاعر صمد ورگن، رسول رضا اور سلیمان رستم نے اس نئے شاعر کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا اور ترکی کے ممتاز شاعر ناظم حکمت نے ان کی شاعری کی بڑی تعریف کی۔ ۱۹۶۱ء میں بیرام کی نظموں کا پہلا مجموعہ "ماں کی مسکراہٹ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کی مزید ۷ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ سوویت یونین کی مختلف زبانوں، مثلاً روسی، یوکرینی، لتھوانیائی، مولداویائی وغیرہ میں ان کی نظموں کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ بیرام مترجم کی حیثیت سے بھی خاص شہرت کے مالک ہیں۔ انھوں نے آذربائیجانی زبان میں ٹیگور کے "فلسفیانہ افکار" کا اور علی سردار جعفری نیز دوسرے کئی ہندستانی شاعروں کی نظموں کے ترجمے کیے ہیں۔ توفیق بیرام نے ہندستان پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ اپنی ایک نظم میں انھوں نے کہا ہے: "ہندستان رنگا رنگ گلابوں کا بہت بڑا گلدستہ ہے۔ ہمارے سیارے کے روح کا تحفہ ہے۔" ان کا کہنا ہے کہ "میں نے جواہر لال نہرو پر یہ نظم ۱۹۷۰ء میں لکھی، حالانکہ نظم لکھنے کا خیال میرے ذہن میں ۱۹۵۴ء میں پیدا ہوا تھا جب انھوں نے ہماری جمہوریہ کا دورہ کیا تھا۔ اس کے بعد سے میں ہندستان کے بارے میں بہت کچھ پڑھتا رہا ہوں۔ وہاں کے واقعات کا مشاہدہ کرتا رہا ہوں۔ ہندستانی عوام نے معاشیات، سائنس اور کلچر کے میدانوں میں جو کارنامے نمایاں انجام دیے ہیں میں ان پر مسرت محسوس کرتا ہوں۔ آذربائیجان کے ایسے بہت سے لوگوں سے ملتا رہا ہوں اور باتیں کرتا رہا ہوں جو ہندستان جانے کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔"

میں سوچتا ہوں کہاں میں نے اس کو دیکھا تھا؟
وطن کے شہرِ مقدس میں اژدہام کے ساتھ
جنم لیا ہے جہاں ماں کی کوکھ سے میں نے
دہن دہن تھی صدا اس کی احترام کے ساتھ
گرج اٹھی تھیں فضاؤں میں تالیاں ہر سو
چمک اٹھی تھی محبت کی ضو نگاہوں میں
پھر اس کے بعد گلے اس طرح ملے اس سے
کہ بھر لیا اسے بابیک[2] جیسی باہوں میں

زمیں کی عظمت و رفعت کا وہ نمائندہ
کرد گلو[3] کی خودی نے جسے سلام کیا
دلوں کا جوش پئے نذر لے کے ہم نکلے
بصد خلوص سواگت کا اہتمام کیا
زبانِ شوق پہ مچلی یہ آرزو دل کی
کہ دوستی کا یہ جذبہ سدا بہار رہے
کپاز[3] جیسی بلندی نصیب ہو اس کو
فصیل کوہ کی مانند پائیدار رہے

---

[1] آذربائیجان کا قومی ہیرو [2] آذربائیجان کا قومی ہیرو [3] آذربائیجان کا ایک پہاڑ

مجھے ہے یاد وہ طوفان خیر مقدم کا
وہ اژدہام، عقیدت کی وہ فراوانی
وہ میہمان، وہ اُس قوم کا دل اور دماغ
کہ جس کی جہد پہ نازاں ہے نسلِ انسانی
وہ میہمان کہ جس کے سفید بالوں پر
عظیم گنگا کی لہروں کا ہو رہا تھا گماں
اسے جو دیکھا تو کچھ یوں مجھے لگا جیسے
قدیم ہند کی بستی میں بن گیا مہماں
کھڑے ہیں میرے لیے دلی اور کلکتہ
بصد خلوص نگاہوں میں انتظار لیے
نظر میں پھرنے لگی ہند کی سجل بستی
وہ آسمان ستاروں کا جیسے ہار لیے
اسے جو دیکھا تو یاد آ گیا پر دیتھوس
وہ نیم دیوتا، وہ حریت کا پیغمبر
ہلا رہی تھی فضاؤں کو تالیوں کی گرج
نثار باکو تھا ان سحر کار ہاتھوں پر
کہ جن کی ضرب مسلسل سے کٹ گئی زنجیر
لرز کے ظلم کے ہاتھوں سے گر پڑی شمشیر
اسی لیے تو زمانہ ادب سے کہتا ہے
مجاہدِ رہِ آزادیِ وطن اس کو
مگر نہیں، کسی اک ملک تک نہیں محدود
ہر ایک قوم سمجھتی ہے اک رتن اس کو
کبھی نہ بھول سکوں گا میں خیر مقدم کو
کہ نقش ہے مرے دل پر ادا ادا اس کی
بڑھا تھا دل میں مچلتی یہ آرزو لے کر
"نگاہ مجھ پہ بھی پڑ جائے اک ذرا اس کی"
مگر رسائی نہ ہو پائی اس تلک اپنی
اگرچہ میں نے جتن اس کے بار بار کیے
پھر آئی کانوں میں اس کی صدائے خوش آہنگ
مجھے لگا کہ وہ آواز دے رہا ہے مجھے
مجھے لگا کہ وہ اک سانت دے رہا ہے مجھے
مگر نہیں وہ مرے ملک سے مخاطب تھا
وہ دے رہا تھا مری اپنی قوم کو پیغام
پھر اس کے ہاتھ اٹھے اور فضا میں لہرائے
چڑھائے سب نے بڑے شوق سے خوشی کے جام
مجھے لگا کہ مرا دیس۔ میرا پیارا دیس
بڑھا اور ہند کی دھرتی سے ہم کنار ہوا
چمک اٹھا جو محبت کا نور آنکھوں میں
تو جذبۂ دلِ ہر فرد آشکار ہوا
بکھر گئی جو تبسم کی لہر ہونٹوں پر
تو یوں لگا کہ یہ قوموں کی مسکراہٹ ہے
دلوں پہ نقش ہیں وہ روز میزبانی کے
فضا میں آج تلک ان کی نرم آہٹ ہے
پلک کسی کی نہ جھپکی کہ انتظار تھا ایک
کھلے رہے مرے دروازے دوستی کے لیے
وہ اک پڑوسی تھا، کیا جانے کس گھڑی آ جائے
میں ڈیوڑھی سے نہ ہٹ پایا اک گھڑی کے لیے
وہ آ نہ پایا کہ فرصت نہ مل سکی اس کو
پر ایک خواب مری آنکھ میں اتر آیا
وہ خواب۔ طفلکِ نادان کا حسیں سا خواب
کہ جس میں خود کو میں اک میہماں نظر آیا
پھر اس کے بعد اچانک ہوا مجھے احساس
کہ اپنا پیارا جواہر اک ایسا مہماں ہے
جو میری قوم کے دل میں سدا مقیم رہا
سدا مقیم رہے گا کہ حاصلِ جاں ہے

★

مصطفےٰ احسن رضوی

پنڈاری کون تھے

ہندوستان میں گوریلا طرز جنگ کی ابتدا مرہٹوں نے کی۔ وہ اس فن میں ایسی مہارت رکھتے تھے کہ اورنگ زیب کی فوجیں بھی انھیں کبھی پوری طرح اپنے قبضہ میں نہ لا سکیں۔ پنڈاریوں نے بھی مرہٹہ فوج ہی کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ وہ ایک طرح سے مرہٹہ فوج کا ایک اہم جزو سمجھے جاتے تھے۔ شیواجی اور ان کے جانشینوں کے زمانے میں پنڈاری جنگ جو والوں کی ایک جماعت تھی جو مستقل ملازمت نہیں کرتے تھے اور نہ کسی راجہ یا نواب سے مستقل تنخواہ پاتے تھے۔ وہ دوسروں کے لیے بلا اجرت لڑتے تھے۔ ان کی اجرت کا طریقہ بہت نرالا تھا۔ جب دشمن کی فوج کو شکست ہو جاتی تو پنڈاری فوج کو میدان میں جانے کی اجازت دی جاتی تھی تاکہ وہ دشمن کے کیمپ کو لوٹ لیں اور ایسی کاری ضرب لگائیں کہ اسے پھر دوبارہ سنبھلنے کا موقع نہ ملے۔ اس لوٹ میں پنڈاریوں کو جو کچھ ملتا تھا اسی کو ان کی مزدوری سمجھ لیا جاتا تھا۔

پیشوا باجی راؤ اور اس کے ماتحت حکمرانوں — سندھیا، ہلکر اور پوار وغیرہ — کے پاس اس قسم کے عارضی لشکر رہا کرتے تھے۔ یہ مرہٹہ سردار ان پنڈاریوں کو اپنی تقویت اور طاقت کے اظہار کے لیے استعمال کرتے تھے۔

پنڈاریوں کی اصل تاریخ شاید آج تک کبھی نہیں لکھی گئی بلکہ ان کے حالات جستہ جستہ مختلف کتب تاریخ میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ انگریز مؤرخوں نے پنڈاریوں کی تصویر بہت مسخ کر کے پیش کی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ وہ لٹیرے تھے، رہزن تھے، ظالم تھے، قاتل تھے جو امن پسند لوگوں کو اپنے فائدے کے لیے لوٹتے تھے اور اپنے جذبۂ خوں آشامی کی تسکین کے لیے بے گناہوں کو قتل کرتے اور انھیں طرح طرح کی ایذائیں دیتے تھے۔

انگریزوں نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں انصاف اور حقیقت سے زیادہ تعصب و تنگ نظری اور ناانصافی کی جھلک نظر آتی ہے چونکہ پنڈاری برطانوی سلطنت کی راہ میں زبردست رکاوٹ بنے ہوئے تھے اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی انھیں بدنام کرنے اور مٹا ڈالنے کو ضروری خیال کرتی تھی۔

پنڈاریوں کی فوج سے مرہٹہ سردار ہی کام نہ لیتے تھے بلکہ ان سے ٹیپو سلطان اور نظام دکن نے بھی کام لیا ہے۔ پنڈاری بڑے ماہر شہسوار ہوتے تھے وہ اپنے شکار پر اس طرح جھپٹ پڑتے تھے جیسے عقاب کسی چھوٹے پرند پر جھپٹتا ہے۔ وہ ایک دن میں اپنے لمبے لمبے دھاوے مارتے تھے کہ کوئی بھی فوجی دستہ اتنی تیز رفتاری سے پیش قدمی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے گھوڑوں کو اتنا تیز سرپٹ دوڑاتے تھے کہ ان کا تعاقب کرنا بڑا دشوار ہوتا تھا۔

پنڈاریوں میں ہندو مسلمان دونوں ہوتے تھے اور ان کے سردار بھی ہندو مسلمان دونوں تھے۔ ان کا آپس میں کوئی مذہبی اختلاف نہ تھا وہ فرقہ پرستی سے کوسوں دور تھے۔ آج کل کے ہندو مسلمانوں کو ان پنڈاریوں سے سبق لینا چاہیے کہ اس وقت کی اتنی بدنام جماعت میں بھی قومی یکجہتی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔

پنڈاریوں کی تعداد اور ان کی سرگرمیوں میں اضافہ کا سبب انگریزوں کی توسیع پسندانہ پالیسی تھی۔ وہ جس ہندوستانی ریاست کو اپنے زیر اقتدار لاتے وہاں کی فوجوں کی ایک خاصی تعداد بھی بیکار ہو جاتی۔ جس ریاست کی کسی فوج کو توڑا جاتا تھا اس کے بیکار سپاہی پنڈاریوں



پاکستان

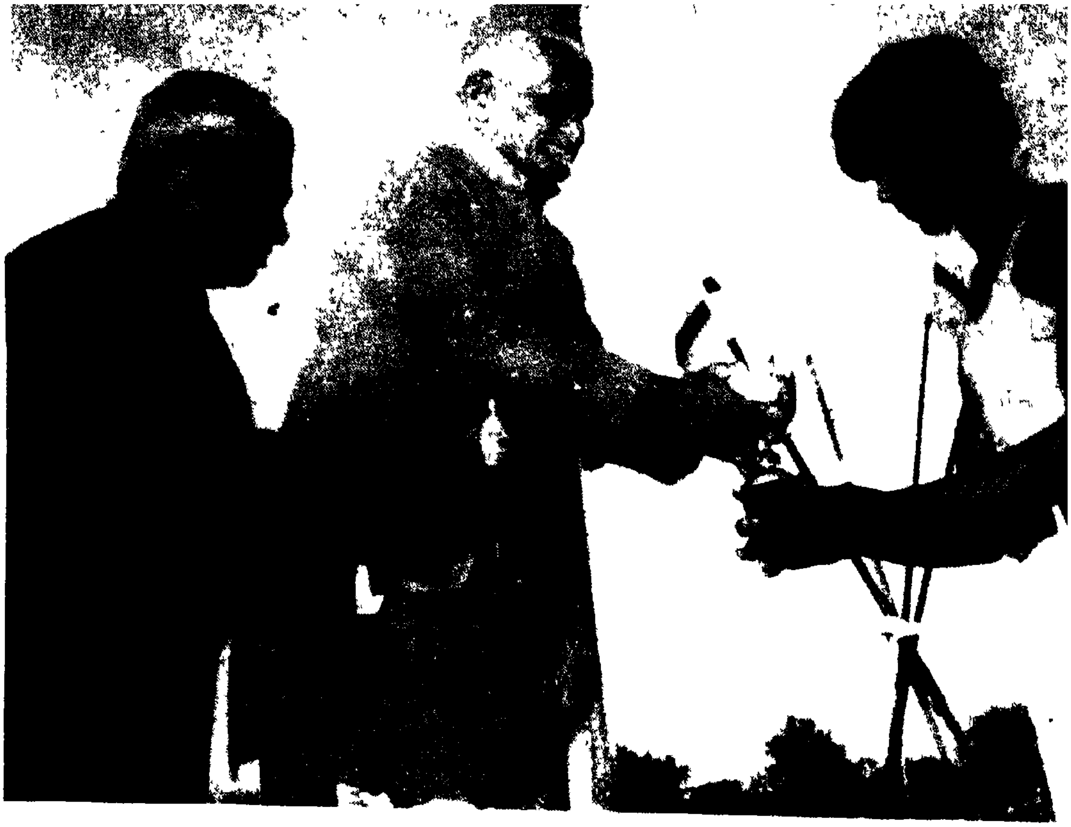
بنگلہ دیش

اور

ہندوستان

کے

وزرائے خارجہ مسٹر عزیز احمد (پاکستان) مسٹر کمال حسین (بنگلہ دیش) اور سردار سورن سنگھ (ہندوستان) کے درمیان ۵ اپریل ۱۹۷۴ء کو ایک کانفرنس منعقد ہوئی پانچ روز کے مذاکرات کے بعد ۹ اپریل کو جملہ مسائل طے پائے اور ایک تاریخ ساز معاہدہ پر دستخط ہوئے تصویر میں صدر جمہوریہ ہند مسٹر وی وی گری پاکستان کے وزیر ریاست برائے امور خارجہ و دفاع مسٹر عزیز احمد کو راشٹرپتی بھون میں خوش آمدید کہہ رہے ہیں



گورنر سری اکبر علی خاں، انریدیتس سینک اسکول، لکھنؤ کے کھیل کود مقابلے میں اوّل آنے والے طالب علم ۳ مارچ ۷۴ء
کی تقسیم انعامات تقریب کے موقع پر انعام میں کپ دے رہے ہیں

وزیر تعلیمات ڈاکٹر رام جی لال سہایک ۲۱ مارچ ۷۴ء کو سکریٹریٹ میں تعلیمی اور غیر تعلیمی عملے کے لیے اجتماعی
زندگی بیمہ اسکیم کے تحت کارپوریشن کے حصہ میں کو پہلی قسط کی رقم کا چیک دے رہے ہیں



کل ہند حامد اللہ منصور سدی جشن کا
مرکزی ہائی وزیر احامد اللہ منصور سدی
نے لکھنؤ میں ۳ مارچ ۷۴ء کو افتتاح کیا
افتتاح کے بعد وزیر موصوف جلسے کو خطاب کرتے ہوئے



وزیراعلیٰ مسٹر ہیم ولی سندل مھوگسا ۸ مارچ ۱۹۷۴ء کو سکریٹریٹ کے سبزہ زار پر منعقد ہونے والی ہولی ملن تقریب کے موقع پر حاضرین کو خطاب کر رہے ہیں



سہ وزیر مسٹر اصطفےٰ حسین ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء کو کامیور ہوسٹل ماسٹر کا افتتاح کرتے ہوئے





صدر جمہوریہ شری وی وی گری نے ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء کو راشٹرپتی بھون نئی دہلی میں قومی ایوارڈ برائے ۱۹۷۳ء تقسیم کیے
یہ تصویر بعض دانشوروں اور مصوروں کی ہے جنھوں نے اس تقریب میں ایوارڈ حاصل کیے



بھوشن لال ساہ کے حوالے یہ ابل گیا ہے
تھا کہ کشمیر اسمبلی کے ممبروں ... اور
اور ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے درمیان ۲۳ جون
۱۹۷۴ء کو تقریباً ایک رات میں مٹھ بھیڑ کے نتیجے
میں ۳۲ سالہ سری رام تیر بلوریہ ہلاک ہو گئے
تھے بعد میں اگرچہ دونوں کی لاش برآمد ہوئی
لیکن ان کی قیمت ہماری دھرتی تک سی محرکے
ساتھ یاد رکھی جائے گی یہ تصویر شری رام کی بیوہ
شریمتی ودیاوتی اور ان کے دو نابالغ لڑکے مسلے
(۱۱ سال) اور سورج (۹ سال) کی ہے

کی فوج میں شامل ہو جاتے تھے ۔ بارلو (BARLOW) اور منٹو (MINTO) کے عہد میں برطانی پالیسی میں اور تبدیلی ہوئی اور انھوں نے اپنے زیرِ اقتدار ریاستوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنے خرچ پر اپنے یہاں ایک گروہ فوج بھی رکھیں ۔ اسے امدادی فوج کا طریقہ یا سبسی ڈیری (SUBSI - DIARY) سسٹم کہا جاتا تھا۔ اس طریقے کے رائج ہو جانے کے بعد ہر ریاست کی فوج میں کمی آتی چلی گئی کیونکہ گو وہ فوج کے اخراجات برداشت کرنے کی خاطر انھیں اپنی مستقل فوج میں اس لیے کمی کرنا ناگزیر ہوتی تھی کہ وہ دو دو فوجوں کا خرچ برداشت کرنے سے قاصر تھے ۔ اس طرح دیسی ریاستوں کے جو فوجی بیکار ہوتے گئے ان کی زیادہ تر تعداد پنڈاریوں میں شامل ہوتی گئی اور اس طرح پنڈاریوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے سواہی نہیں بلکہ اس کی ماتحت ریاستوں — مالوہ اور بندیل کھنڈ — کے اقتدار کو بھی بڑی ٹھیس لگی اور انھوں نے اپنی پوزیشن کو سنبھالنے کے لیے پنڈاریوں کو اپنا آلۂ کار بنایا اور اس طرح ان کی غارت گرانہ سرگرمیوں کو بڑھاوا ملا۔

کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہر صوبے سے پنڈاریوں کے متعلق خبریں موصول ہونے لگیں کہ وہ بڑے ظالمانہ طور پر لوٹ مار کرتے ہیں۔ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارتے ہیں، بے گناہوں کو ہولناک اذیتیں پہنچاتے ہیں، خواتین کی عصمت دری کرتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال کے طور پر پکڑ لے جاتے ہیں ۔ وہ جدھر دھاوا بولتے ہیں علاقے کے علاقے تباہ و برباد کرتے چلے جاتے ہیں۔

جب لارڈ ہیسٹنگز گورنر جنرل ہو کر کلکتہ پہنچا تو اس کی توجہ پنڈاریوں کے خطرہ کی طرف مبذول کرائی گئی ۔ اس نے محکمۂ داخلہ سے یہ اجازت حاصل کی کہ پنڈاریوں کا خاتمہ فوج کے ذریعہ کیا جائے ۔ لیکن نیپال کی جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے پنڈاریوں کے استیصال کے کام میں کچھ تعویق ہو گئی لیکن پھر بھی کام جاری رہا۔

ان پنڈاریوں کی سب سے بڑی تعداد سندھیا اور ہلکر کے پاس تھی اور انھیں کی قوت کے سہارے پر ان دونوں مملکتوں کو "سندھیا شاہی" اور "ہلکر شاہی" کہا جاتا۔ مہا دجی سندھیا کو دو بڑے پنڈاری لیڈروں — ہیرا اور برہان — کی تائید حاصل تھی۔ سندھیا نے ان دونوں کو نیماوار کا علاقہ فتح کرنے کی اجازت دے دی تھی جو وندھیا چل کے شمال میں واقع ہے جس کے بعد پنڈاریوں نے اس علاقہ کو اپنا مستقل گڑھ بنا لیا تھا۔ یہ پنڈاری سردار ہیرا اور برہان سنہ ۱۸۰۰ء میں انتقال کر گئے۔ ہیرا کے دو بیٹے تھے دوست محمد اور ولی محمد۔ وہ اپنے زمانے میں پنڈاریوں کے بڑے مشہور لیڈر تھے ۔ ایک اور پنڈاری سردار کریم خان نے یشونت راؤ ہلکر کی سرپرستی میں بڑی شہرت حاصل کی جسے وہ اپنے مقاصد کے لیے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا۔

کریم خاں نے بھوپال پر جو یلغار کی وہ بڑی سخت تھی اس نے اور اس کے ساتھیوں نے ایک بہت بڑے علاقہ کو جو دریائے چنبل کے دہانے سے شروع ہو کر دریائے گوداوری پر ختم ہوتا تھا بالکل تباہ و برباد کر ڈالا۔ وہ مسافروں سے زبردستی مال اور روپیہ وصول کرتا تھا۔ دولت راؤ سندھیا نے بڑے حیلوں سے اسے اپنے پاس بلا کر گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ پانچ سال تک قید رہنے کے بعد اس نے ایک بڑی رقم دے کر رہائی حاصل کی۔ کریم خاں کا ایک اور شاگرد نامدار خاں نامی تھا۔ اس نے سندھیا کی عملداری میں قتل و غارت اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ کریم خاں کی رہائی کے بعد یہ دونوں استاد شاگرد مل کر سندھیا کے علاقے کو تہ و بالا کرنے لگے اور ان تکالیف کے بدلے میں جو کریم خاں کو گوالیار کے قلعہ میں بہ زمانہ اسیری پہنچائی گئی تھیں۔ سندھیا کے علاقے کے بڑے بڑے سرداروں اور افسروں سے زبردستی بڑی بڑی رقمیں وصول کی جاتی تھیں۔

اس کے بعد یہ دونوں ایک اور پنڈاری سردار چیتو سے متحد ہو گئے ۔ چیتو بڑا نڈر اور سنگدل سردار تھا۔ اتحادِ ثلاثہ کے ان تینوں ممبروں نے اب بہت وسیع علاقہ میں لوٹ مار مچا دی۔ انھوں نے سنہ ۱۸۱۶ء میں بمقام نیماوار اپنا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں پچیس ہزار سے زائد پنڈاریوں نے شرکت کی ۔ انھوں نے اس جلسہ میں بہ اتفاق آرا یہ طے کیا کہ سارے ہندوستان میں لوٹ مار مچا دی جائے اور ایک ایک علاقے کو ایک ایک پنڈاری سردار کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن ان پنڈاریوں میں اختلاف پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے

ان کے تخریبی مقاصد پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ سندھیا نے چیتو کو اپنی طرف ملا لیا اور ہیران دونوں نے مل کر کریم خاں پر حملہ کر دیا جس کے بعد وہ پھر پکڑا گیا اور قید ہوا۔ اس فتح نے چیتو کے حوصلوں کو اور بلند کر دیا اور وہ پندرہ ہزار پنڈاری سپاہی کے ساتھ دوست محمد سے جا ملا جس کے پاس اٹھارہ ہزار پنڈاری فوج تھی۔ ان دونوں لیڈروں نے ۱۸۱۲ء میں الگ الگ علاقوں میں لوٹ مار شروع کی جس کا سلسلہ آئندہ سال ۱۸۱۳ء تک جاری رہا۔

اسی سال چیتو اپنی فوج کے دو دستوں کو لیکر نظام کی عملداری میں لوٹ مار کرنے لگا۔ ایک دستہ دریائے تاپتی کے کنارے کنارے غارت گری کرتا رہا اور دوسرا دستہ جو خاص چیتو کی سرکردگی میں تھا نظام کی قلمرو میں لوٹ مار کرنے لگا۔ چیتو ماہ نومبر میں دریائے کرشنا تک پہنچ گیا اور پھر دریا کے دونوں کناروں کے علاقہ کو لوٹتا ہوا مشرقی ساحل تک جا پہنچا اور پھر وہاں سے دریائے گوداوری کے کنارے کنارے ہوتا ہوا اپنے مستقر کو واپس آگیا۔ انھوں نے اس لوٹ مار سے اتنا زیادہ مال و متاع اور قیمتی سامان جمع کر لیا تھا جس کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے چنانچہ انھوں نے اس سامان کی نکاسی کے لیے نیماوار کے مقام پر ایک بازار لگایا جس میں لوٹ کے ہیرے، جواہرات، موتی، زیورات اور دوسرے قیمتی پتھر فروخت کیے جاتے تھے۔

یشونت راؤ ہلکر کے پاس دو پٹھان سردار، امیر خاں اور شہامت خاں تھے جو مال غنیمت میں سے ایک حصہ ہلکر کو بھی دیا کرتے تھے۔ یہی دونوں فوجی سردار تھے جن کی بہادری، جواں مردی، جاں بازی اور وفاداری کی وجہ سے یشونت راؤ ہلکر نے ۱۸۰۲ء میں پیشوا پر فتح پائی تھی اور اسے پونا سے نکال باہر کیا تھا۔ امیر خاں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا ظالم اور بے درد تھا، اتنا ظالم اور بے درد کہ وہ تاجروں سے روپیہ وصول کرنے کی غرض سے ان کی انگلیوں پر روئی کے بھاہے رکھ کر انھیں آگ لگا دیتا تھا مگر یہ سختی انھیں تاجروں کے ساتھ برتی جاتی جو اپنا مال خوشی سے امیر خاں کے سپرد نہیں کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اودے پور کی کرشنا کماری کو بھی امیر خاں ہی کے حکم سے قتل کیا گیا تھا۔

شہامت خاں ۱۸۱۴ء میں مر گیا لیکن اس کا ساتھی امیر خاں ریاست ہلکر کی سرپرستی میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے رہا۔ یہاں تک کہ ہیدپور (MAHIDPUR) کی لڑائی میں اسے انگریزوں نے اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ ہلکر کو چھوڑ دے اور اس کے بدلے میں اسے ٹونک کی ریاست دے دی گئی۔ یہ ریاست امیر خاں کے خاندان میں اس وقت تک باقی رہی جبکہ ۱۹۴۸ء میں ساری دیسی ریاستوں کو سردار پٹیل کی اسکیم کے ماتحت انڈین یونین میں ضم کیا گیا۔

پنڈاری سرداروں نے ۱۸۱۶ء میں پھر لوٹ مار کا سلسلہ شروع کیا۔ انھوں نے ماہ فروری میں اپنے ہیڈ کوارٹر مالوہ کو چھوڑ دیا اور سارے علاقہ کو تباہ و برباد کرتے ہوئے ۱۰ مارچ کو سولی پٹم پہنچے۔ اس کے بعد وہ مدراس کے انگریزی علاقہ میں داخل ہوئے۔ وہ روزانہ چالیس میل کی مسافت تک لوٹ مار کرتے ہوئے نکل جاتے تھے اور ہر روز کم سے کم پچاس گاؤں ان کی تخریبی سرگرمیوں کا نشانہ بنتے تھے۔

کڑپا کو لوٹ کر وہ شمال کی طرف بڑھے۔ انگریزوں کی فوج ان کے تعاقب میں تھی لیکن وہ اسے دھوکہ دے کر نکل بھاگے اور حیدرآباد میں داخل ہو کر لوٹ مار شروع کر دی اور ۱۷ مئی کو پھر اپنے مستقر نیماوار واپس پہونچ گئے۔ پنڈاریوں کی تیز رفتاری اور سرعت کا یہ عالم تھا کہ اتنے وسیع و عریض علاقے کو انھوں نے ساڑھے تین مہینے میں پوری طرح روند ڈالا۔

پنڈاریوں نے ۱۸۱۵ء اور ۱۸۱۶ء کے دو برسوں میں جنوبی ہند کو دو مرتبہ پامال کیا جس کے باعث انگریز حکام بڑے پریشان ہو گئے اور اس خطرہ پر قابو پانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ ان کی لوٹ مار کی جو رپورٹ تحقیقات کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کو پیش کی گئی اس میں بتایا گیا تھا کہ بارہ دن کے مختصر سے عرصہ میں مدراس پریسڈنسی میں ۱۸۲ انسانوں کو قتل کیا، ۵۰۵ کو زخمی کیا اور ساڑھے تین ہزار افراد کو مختلف قسم کے زخم پہنچائے اور کم سے کم دس لاکھ روپیہ لوٹ لے گئے۔

اب پنڈاریوں نے اپنی غارت گری کا میدان برطانوی علاقوں کو بنا رکھا تھا اور وہ انگریزوں کی توسیع پسندانہ پالیسی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بن گئے تھے اس لیے انگریز چاہتے تھے کہ پنڈاریوں کا خاتمہ جلد سے جلد ہو جائے۔

پیشوا کا ایجنٹ بالوجی کونجار مرہٹہ سرداروں اور دوسرے حکمرانوں سے ملنے کے لیے نکلا تاکہ انھیں بتا سکے کہ وہ انگریزوں کی قوت توڑنے کے لیے پنڈاریوں سے اتحاد کرلیں کیونکہ یہی وہ طریقہ ہوسکتا تھا جس سے انگریزی مملکت کی توسیع پر بند لگایا جاسکتا تھا۔

اس کے بعد انگریزوں کی پالیسی میں پنڈاریوں کا استیصال ہی شامل نہ رہا بلکہ انگریزوں نے اس بات کا بھی اعلان کردیا کہ وہ ان والیان ریاست کو بھی اپنا دشمن سمجھیں گے جو پنڈاریوں کی حمایت کریں گے اور انھیں لوٹ مار پر اکسائیں گے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی پیشوا، اپّا صاحب آف ناگپور اور مالوہ کے سربراہ ہلکر کو پنڈاریوں کا سرپرست اور ممد و معاون سمجھتی تھی اور یہ جانتی تھی کہ یہ سردار پنڈاریوں کی قوت کا سہارا لے کر مرہٹہ راج کو پھر قائم و مضبوط بنانا چاہتے تھے۔ انگریزوں نے جو لڑائیاں پنڈاریوں یا مرہٹہ سرداروں سے لڑیں وہ ایک ہی سکے کے دو رخ تھے۔ انگریزوں کو یہ یقین تھا کہ چھوٹے چھوٹے مرہٹہ سردار مثلاً بالوجی کونجار، ترمبک جی ڈنگلے وغیرہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے پنڈاریوں سے ملے ہوئے ہیں۔

ہندستان کے وہ راجے، مہاراجے اور نواب جن کے علاقے انگریزوں کے قبضہ میں پہنچ چکے تھے وہ بھی پنڈاریوں کی سرگرمیوں سے ہمدردی رکھتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ جو نقصان انگریزوں کو پہنچائیں گے وہ ہماری تقویت و تسکین کا سبب ہوگا۔

اب انگریزوں نے یہ کوشش شروع کی کہ کوئی حکمراں پنڈاریوں اور مرہٹوں کی تحریک میں شامل نہ ہونے پائے۔ اس سلسلے میں گورنر جنرل نے ایک بہت وسیع پالیسی بنائی جس پر عمل کرکے وہ سارے ہندستان کو اپنے زیر اقتدار لاسکتے تھے اور اپنے تمام مخالفین کا استیصال کرنے میں کامیاب ہوسکتے تھے۔

گورنر جنرل نے تمام حکمرانوں سے ایک تحریر پر دستخط لینے کی مہم شروع کی جس میں یہ لکھا گیا تھا کہ پنڈاری امن عامہ کے لیے خطرہ اور عوام کے لیے تکلیف کا باعث ہیں اس لیے ان کی بیخ کنی حد درجہ ضروری ہے۔ اس تحریر پر دستخط کرنے کے بعد کسی حکمراں میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ پنڈاریوں کی حمایت و مدافعت میں ایک لفظ بھی زبان یا قلم سے نکال سکے حالانکہ یہ حقیقت تھی کہ بہت سے راجے مہاراجے اور نواب ان پنڈاریوں سے دل میں ہمدردی رکھتے تھے۔

پنڈاری صرف انگریزی علاقے ہی کو تباہ و برباد نہیں کرتے تھے بلکہ وہ جے پور، بھوپال، ناگپور، پونا اور حیدرآباد کو پامال کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔ یہ سب ریاستیں اس وقت خود مختار تھیں اور پنڈاریوں کا خاتمہ اسی وقت ہوسکتا تھا جبکہ یہ ریاستیں بھی انگریزوں کے شریک کار ہوں۔

اب گورنر جنرل نے ان سب حکمرانوں کو پنڈاریوں کے خلاف جنگ میں شریک ہونے کی دعوت دی اور یہ اعلان کردیا کہ اس میں جو حکومت شامل نہ ہوگی انگریز اسے اپنا دشمن قرار دیں گے۔ اب تک جن ریاستوں سے معاہدے ہوچکے تھے انھیں فسخ کرکے ہر ایک سے نیا معاہدہ کیا گیا۔

گورنر جنرل نے اس مقصد کے ماتحت ملک کو دو حصوں میں تقسیم کردیا ایک شمالی اور دوسرا جنوبی۔ ان دونوں حصوں کو دریائے نربدا الگ کرتا تھا۔

دہلی کے برطانی ایجنٹ چارلیس مٹکاف (CHARLES METCALFE) کو اس مہم کا انچارج بنایا گیا اور ان پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی کہ وہ اس علاقے کے تمام حکمرانوں سے اس معاہدے کی تکمیل کرائیں۔ اسی طرح جان مالکم (JOHN MALCOLM) کو جنوبی حصہ کی ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ اس حصے کے حکمرانوں سے معاہدہ کی تکمیل کرائیں۔

۱۸۱۷ء میں چارلس مٹکاف بھوپال، کوٹا، بوندی، اودے پور، جودھ پور اور جے پور سے یہ معاہدہ کرلینے میں کامیاب ہوگئے کہ وہ پنڈاریوں کو نہ پناہ دیں گے اور نہ کوئی مدد۔ جان مالکم ناگپور، پونا اور حیدرآباد گئے۔ حیدرآباد پہلے ہی سے انگریزوں سے معاہدہ کرچکا تھا اس لیے اس سے معاہدہ پر دستخط کرلینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی لیکن ناگپور اور پونا کے راجہ انگریز ایجنٹ کے پھندے میں نہ پھنسے۔ وہ پہلے ہی سے انگریزوں کے خلاف تھے۔ مالکم نے ہر طرف کا دورہ کیا اور تمام علاقوں کے انگریز ریزیڈنٹوں کو اس سلسلہ میں ہدایات بھیجیں۔ اس کے بعد مالکم اور مٹکاف دونوں گورنر جنرل سے ملے اور ان سے یہ طے کیا کہ جیسے ہی موسم سازگار ہوجائے پنڈاریوں کے خلاف

مہم کا آغاز کر دیا جائے۔

گورنر جنرل نے اپنا کیمپ آگرہ کے مقام پر دریائے جمنا کے کنارے قائم کیا اور پھر وہاں سے بندیلکھنڈ منتقل ہو گئے۔ اس دوران میں پیشوا نے مختلف مرہٹہ سرداروں کو خفیہ پیغامات بھیجے کہ وہ بیک وقت انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں ساتھ ہی ساتھ پیشوا نے اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنا شروع کر دیا اور بہانہ یہ کیا کہ وہ ایسا پنڈاریوں کے قلع قمع کے لیے کر رہا ہے اور اس پیغام کی تعمیل میں کر رہا ہے جو مالکم کی طرف سے اسے ملا تھا۔

سندھیا کی پوزیشن زیادہ نازک تھی وہ ہر چہار طرف سے انگریزی فوجوں سے گھرا ہوا تھا۔ دل میں وہ مرہٹوں سے ضرور ہمدردی رکھتا تھا۔ مگر انگریزی فوجوں کے درمیان گھرا ہونے کی وجہ سے بالکل بے بس تھا اور مجبوراً اس نے بھی ۵ نومبر ۱۸۱۷ء کو انگریزوں سے معاہدہ کر لیا کہ وہ پنڈاریوں کے استیصال میں انگریزوں کی مدد کرے گا۔

پنڈاریوں کے استیصال پر دو برطانی ڈویژن مقرر کیے گئے تھے جن میں سے ایک دریائے جمنا پر جنرل آرچ ٹرلونی (OCHTER-LONY) کے ماتحت تعینات تھا اور دوسرا ڈویژن دریائے نربدا پر سر تھامس ہسلوپ (SIR THOMAS HISLOP) کی زیر سرکردگی تعینات کیا گیا تھا۔ ان دونوں ڈویژنوں کے ماتحت مختلف مقامات پر فوجی دستے تعینات کر دیے گئے تھے۔ اس وقت پنڈاریوں کی تعداد ۲۳ ہزار تھی جو تین ڈویژنوں پر مشتمل تھی۔ یہ تینوں ڈویژن کریم خاں، واصل محمد اور چیتو کے زیر کمان تھے۔ ان پنڈاریوں نے مرہٹوں سے مدد مانگی مگر انھیں برائے نام ہی مدد مل سکی اور وہ بھی صرف پونا، ناگپور اور اندور سے ملی۔

گورنر جنرل نے یہ مہم ۱۵ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو شروع کی۔ برطانی فوج نے پنڈاریوں پر گھیرا ڈالنا شروع کر دیا۔ کریم خاں اور واصل محمد نے گوالیار کے قریب بمقام شاہ آباد شکست کھائی اور بھاگ کر اودے پور کے جنگلوں میں جا چھپے۔ مگر ان پر گھیرا تنگ کیا جاتا رہا اور وہ اپنی پناہ گاہ چھوڑنے پر مجبور ہو کر مارے نربدا کی طرف بھاگے مگر برطانی فوجوں نے انھیں کہیں دم نہ لینے دیا۔

اس عرصہ میں گورنر جنرل نے ان کے سامنے اس شرط پر معافی کی پیش کش کی کہ وہ فوراً ہتھیار ڈال دیں۔ واصل محمد نے اپنے آپ کو سندھیا کے حوالے کر دیا اور جب وہ فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا تو اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ کریم خاں نے اپنے آپ کو مالکم کے سپرد کر دیا اور اسے گورکھپور کے قریب ایک چھوٹی سی ریاست دیدی گئی۔ ایک اور پنڈاری لیڈر نامدار خاں نے کرنل آدم (COL. ADAMS) کے سامنے ۳ فروری کو بھوپال کے پاس دورا جپور کے مقام پر ہتھیار ڈال دیے۔

انگریزی فوجیں چیتو کا پیچھا برابر کرتی رہیں جو سب سے زیادہ دلیر، نڈر اور جرأت مند تھا۔ اسے کہیں دم لینے کا موقع نہیں دیا گیا اور آخر کار اسے شیر گڈھ کے قریب ایک جنگل میں چیتے نے پھاڑ ڈالا۔

اس طرح برسوں کی کوشش کے بعد ان پنڈاریوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ پنڈاریوں کے استیصال میں انگریزوں کا ایک مقصد یہ بھی مضمر تھا کہ اس طرح مرہٹوں کی قوت کو بالکل توڑ دیا جائے۔

یشونت راؤ ہلکر کی وفات کے بعد اس کی خوبصورت رانی نے یشونت راؤ کی دوسری بیوی کے چار سالہ لڑکے ملہار راؤ ہلکر کے نام سے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور بڑے حسن و خوبی کے ساتھ مملکت کا بندوبست کرنے لگی۔ اس کے اس کام میں اس کا محبوب گنپت راؤ بھی اس کا معاون تھا۔ اسی طرح اس کے مددگار تانتیا جوگ اور اس کے سورگیہ شوہر کے ہمعصر دوست امیر خاں اور غفور خاں بھی تھے۔

★

جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی

شاہکار

اک نظر اس سمت بھی اے بندگانِ قیل و قال
دیدنی ہے ماہی بازوئے حکمت کی اُچھال
موجۂ فیضِ بہاراں خیمہ زن سنگل میں ہے
چار سو سنگل ہی سنگل ان دنوں جنگل میں ہے
آبِ صافی کا ذخیرہ بے عدیل و بے بدل
فی الحقیقت ہے مجسّم شاہدِ حُسنِ عمل
عقل کی جدت طرازی ختم ہے اس بند پر
سنگ ریزے بن گئے بہتے ہوئے پانی کے پر
بول بالا ہے جہاں میں خوبیِ تدبیر کا
موجۂ آبِ رواں حلقہ ہے اک زنجیر کا
موج زن دریا سے پتھر کا کلیجہ چیر کر
ڈال کر باہیں گلے میں تر ہے پتھر کا جگر
پرچمِ آبِ رواں لہرا رہا ہے عرش پر
کاروانِ ماہ و انجم رقص میں ہے فرش پر
لڑکھڑاتے ماہِ تاباں کی حسیں اٹھکیلیاں
لرزشِ بہم میانِ محرمِ آبِ رواں
چادرِ سیمیں بچھی ہے زیرِ پائے آسماں
کس قدر پُر کیف ہے پچھلے پہر کا یہ سماں
تیشۂ مزدور نے لے کر سمندر سے خراج
رکھ دیا ہے مادرِ ہندوستاں کے سر پہ تاج
گرد اڑتی تھی جہاں دم توڑ دیتی تھی نگاہ
کروٹیں لیتی تھی تپتی ریگ بے آب و گیاہ
آسماں سے پھول جھڑتے تھے دہکتی خاک پر
لو سے شبنم کی پگھلتا تھا سمندر کا جگر
خار و خس میں دوڑتا ہے موسمِ گل کا لہو
آگ کے شعلوں نے پایا ہے مزاجِ رنگ و بو
منھ میں بھر آئے نہ پانی ابر دریا بار کے
جھانکتا ہے آئینے میں حلقۂ کہسار کے
متصل ظلمت کدوں میں ضو فشاں ہیں بجلیاں
کشتِ دہقاں لے رہی ہے جھوم کر انگڑائیاں
کروٹیں لینے لگی ہے رونقِ بزمِ کہن
طالع بیدار ہے یا شاہکارِ فکر و فن

واحد پریمی

سرزمینِ مہوشاں

روح پرور گلستاں کشمیر ہے
رشکِ باغِ جناں کشمیر ہے

سرزمینِ مہوشاں کشمیر ہے
آستانِ کہکشاں کشمیر ہے

ہر طرف انگڑائی لیتا ہے شباب
مرکزِ حُسنِ جہاں کشمیر ہے

ہم پرستارانِ رنگ و نور ہیں
اور ہمارا آستاں کشمیر ہے

واعظو! پھر خواہشِ فردوس کیوں
جب یہاں جنت نشاں کشمیر ہے

آرزو ہے دید ہم کو کیوں نہ ہو
ایک شہرِ دلبراں کشمیر ہے

شاہکارِ فطرتِ حسن و جمال
زینتِ کون و مکاں کشمیر ہے

کیوں نہ ہم اہلِ وطن کو ناز ہو
نازشِ ہندوستاں کشمیر ہے

تیرے شعروں کا ہو واحد کیا شمار
دفترِ لفظ و بیاں کشمیر ہے

وسیم احمد اعظمی

شیخ الہند شخصیت اور کارنامے

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کی پیدائش بریلی میں ۱۸۵۱ء میں ہوئی جہاں ان کے والد بزرگوار مولانا ذوالفقار علی مرحوم محکمۂ تعلیم سے وابستہ ایک افسر تھے۔ آپ نے فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے چچا مولانا مہتاب عالم مرحوم سے حاصل کی اور پھر جب دیوبند میں ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم[1] کا قیام عمل میں آیا تو آپ نے اس عظیم درسگاہ اور تحریک آزادی کے ناقابل تسخیر قلعے کے سب سے پہلے طالب علم ہونے کی سعادت حاصل کی اور ملا محمودؒ کے سامنے کتاب کھولی۔ آپ نے درسِ نظامی کی دیگر کتابیں مولانا قاسم نانوتویؒ اور دوسرے بزرگوں سے نیز حدیث کی دوسری کتابیں اپنے والد ماجد مولانا ذوالفقار سے پڑھیں۔ آپ ۱۸۷۳ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے۔ مولانا قاسم نانوتوی کے مبارک ہاتھوں سے دستار فضیلت حاصل کی اور فراغت کے دوسرے ہی سال آپ کو دارالعلوم میں درجۂ چہارم کا مدرس رکھ لیا گیا۔ تھوڑی ہی مدت یعنی ۱۸۹۰ء میں اس اہم درسگاہ میں صدر مدرس ہو گئے۔

علمی خدمات

شیخ الہند اپنی سیاسی زندگی کی بے پناہ مصروفیت کے باوجود علمی خدمات انجام دیتے رہے۔ دارالعلوم میں درس و تدریس کی ذمہ داری ہی کچھ کم نہ تھی اس پر مستزاد یہ کہ تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رہا چنانچہ بہت سی اہم عربی اور اردو کتابیں آپ نے تصنیف کیں۔ آپ کی تصانیف میں حاشیہ ابوداؤد[2]، حاشیہ مختصر المعانی[3]، ایضاح الادلۃ، ابواب و تراجم بخاری[4]، اور جہد المقل وغیرہ کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس سلسلے کی آخری اور سب سے اہم کڑی قرآن پاک کا وہ عظیم الہامی ترجمہ ہے جس کو مالٹا کے ایام اسیری میں لکھا تھا اور جو اپنی شہرت کے اعلیٰ نقطے پر پہنچ گیا ہے۔ آپ کی علمی یادگاریں آپ کے وہ شاگرد ہیں جو عرصے تک علم و دین کی خدمت کرتے رہے مثلاً مولانا انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ وغیرہ۔

سیاسی دور

مولانا ایک سچے مسلمان محب وطن تھے۔ وہ انگریزوں کے وجود کو ہندستان کے جسم کا سڑا ہوا ناسور تصور کرتے تھے۔ آپ کے ایک شاگرد مولانا حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں: "حضرت کی گہری نظر واقعاتِ عالم بالخصوص ہندستان اور ترکی پر مرکوز رہتی تھی۔ طرابلس اور بلقان کے دلگداز واقعات اور ہولناک مظالم اور اندرونِ ہند انگریزوں کی روز افزوں چیرہ دستیوں اور شرمناک بربریت نے انتہائی درجہ میں مایوس و مضطرب کر دیا اور آمادہ کر دیا کہ نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر میدان انقلاب میں سر بکف، کفن بردوش نکل پڑیں۔"[5] مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں: "حضرت شیخ الہند اپنی عملی زندگی کے آغاز ہی میں

---

[1] دیوبند میں دارالعلوم کا قیام اس وقت ہوا جب انگریز ہندستان پر پوری طرح مسلط ہو گئے تھے۔ دارالعلوم کے سامنے اس وقت سب سے بڑا مقصد آزادی کا حصول تھا اور اس کے لیے دارالعلوم کے علماء نے جو قربانیاں دی ہیں ان کی مثال نہیں ملتی۔ یہ آج بھی ایشیا کا سب سے بڑا دینی تعلیم کا مرکز ہے۔ [2] ابوداؤد شریف حدیث کی مشہور و مستند کتاب ہے۔ [3] مختصر معانی، فن بلاغت، معانی، اور بدیع کی ایک لاجواب کتاب ہے جو درس نظامی میں داخل نصاب ہے۔ [4] حدیث کی مشہور کتاب، بخاری شریف کے تراجم اور ابواب بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ شیخ الہند نے ان پر بسط کے ساتھ کام کیا ہے (وسیم احمد)

[5] نقش حیات ص ۱۳۶

ایک نقشہ عمل تیار کر چکے تھے اور اسے لباس پہنانے کی کوشش انھوں نے اس وقت شروع کر دی تھی جب ہندستان کے اندر سیاسی سرگرمیاں محض برائے نام تھیں۔ ملک کے حالات کسی تیز تحریک کے لیے سازگار نہ تھے [1] عملی جدوجہد کے اس ابتدائی دور میں فضلائے دار العلوم کی ایک انجمن "ثمرۃ التربیۃ" کے نام سے قائم کی جو دراصل جدوجہد آزادی کی تربیت کے لیے ایک تنظیم تھی۔ مگر اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا چنانچہ ۱۹۰۹ء میں ایک دوسری جماعت جمعیۃ الانصار کے نام سے تشکیل دی گئی۔ مولانا عبید اللہ سندھی اس کے جنرل سکریٹری مقرر کیے گئے۔ جماعت کا مقصد تھا کہ تحریکِ آزادی کی جڑیں مضبوط بنالی جائیں، اور یہ ہندستان ہی تک محدود نہ رہیں بلکہ ہندستان کے باہر بھی پھیلیں۔

طرابلس اور بلقان کی جنگ سے متاثر ہو کر مولانا نے مسلح جدوجہد کی ایک خفیہ اور جامع اسکیم مرتب کی جس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۱۹۱۵ء میں مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان بھیجا گیا، اور مولانا منصور انصاری کو آزاد قبائل کے رہناؤں کے پاس تاکہ وہ ان جگہوں پر مسلح جدوجہد کے لیے ضروری مشورے کر سکیں [2] اس سخت مرحلے میں ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابو الکلام آزاد اور نواب وقار الملک جیسے مدبرین آپ کے معاون و مشیر تھے،

اسی زمانے میں قانون تحفظِ ہند کے تحت بہت سے مقتدر رہنماؤں کو [3] گرفتار کر لیا گیا۔ خطرہ تھا کہ آپ بھی گرفتار ہو جاتے مگر ڈاکٹر انصاری کا تدبر کام آیا اور انھوں نے شیخ الہند کو ہندستان سے باہر چلے جانے پر راضی کر لیا۔ چنانچہ ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء میں آپ حجاز روانہ ہوئے تاکہ وہاں ترکوں سے مل کر جدوجہد آزادی کے لیے اسلحہ اور دوسری چیزیں فراہم کی جا سکیں۔ ادھر آپ حجاز روانہ ہوئے اور ادھر گورنر اتر پردیش نے آپ کی گرفتاری کا آرڈر دیدیا۔ جب تک آرڈر بمبئی کے گورنر تک پہنچے، آپ کا جہاز روانہ ہو چکا تھا۔ اس پر یو پی کے گورنر نے عدن کے گورنر کو بھی بذریعہ تار اس کی اطلاع دی، مگر ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے یہ تار اتنی تاخیر سے عدن پہنچا کہ آپ وہاں سے بھی آگے روانہ ہو چکے [4] تو مکہ معظمہ پہنچ کر آپ نے وہاں کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی، انھیں تحریک سے آگاہ کیا۔ غالب پاشا کی کوششوں سے مدینہ منورہ میں انور پاشا اور جمال پاشا سے بھی بند کمرے میں متعدد بار تفصیلی گفتگو کی۔ ان لوگوں نے مولانا کو تحریر لکھ کر دی جس میں آزاد قبائل کو ہر قسم کی اعانت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور ہر اس شخص کو مکلف بنایا گیا تھا کہ وہ مولانا محمود حسن پر اعتماد کرے اور تحریک میں پوری طرح حصہ لے [5] آپ چاہتے تھے کہ جلد از جلد مرکزِ تحریک یاغستان پہنچا جائے اور اس تحریر کی کاپیاں کرا کے تمام خانوں میں تقسیم کرا دی جائیں۔ مگر ترکی کے تمام بڑے بڑے افسر اس بات پر مصر رہے کہ یہیں رہ کر تحریک کی قیادت ہو۔ چنانچہ آپ نے یہ تحریر مولانا ہادی حسن کے ذریعے لکڑی کے ایک صندوق میں رکھ کر ہندستان بھیج دی [6] اس دوران اچانک وہ خطوط [7] جو مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا محمد میاں منصور انصاری نے افغانستان سے شیخ الہند کے نام بھیجے تھے برطانی حکومت کے ہاتھ لگ گئے اور یہ سب لوگ بالکل غیر شعوری طور پر حکومت کی نظروں میں آ گئے۔

عربوں کی بغاوت کے بعد

ادھر سلطنت عثمانیہ کے خلاف عربوں کی بغاوت کے دوران جب آپ طائف میں محصور ہو گئے تو بڑی مشکلوں سے نجات ملی سیدھے مکہ معظمہ پہنچے۔ وہاں سے استنبول جانے کی فکر میں تھے کہ والی مکہ شریف حسین نے سلطنت عثمانیہ

---

[1] سرگزشت مجاہدین ص ۵۵۲، ۵۵۳ [2] ایضاً ص ۵۵۵ [3] مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، اور مولانا شوکت علی وغیرہ گرفتاروں میں شامل تھے۔ ص۱۸ نقش حیات ص ۲۲۱/۲ [5] علمائے حق ج۔ ا ص۱۴۳ [6] یہ وہی خطوط تھے جو ہندستان کی سیاسی تاریخ میں "ریشمی خطوط" کے نام سے مشہور ہیں جن میں غالب نامہ کی تقسیم کی اطلاع، افغانستان کے سیاسی حالات، عارضی حکومت کی تشکیل حزب اللہ کے نام سے فوجی تنظیم کے قیام کا ذکر اور فوجی مرکزوں اور عہدیداروں کی پوری تفصیل تھی یہ تمام خطوط کاغذ کے بجائے زرد ریشم کے کپڑے پر لکھے گئے تھے اور انھیں عبد الحق نام کے ایک شخص کے حوالے کر دیا گیا تھا کہ وہ سندھ جا کر شیخ عبد الرحیم کو دیدے تاکہ وہ جب حج کے لیے جائیں تو حضرت شیخ کے حوالے کر دیں۔ مگر عبد الحق نے احتیاط نہیں برتی اور ملتان کے ایک شخص حق نواز خاں سے اس کا تذکرہ کر دیا اور اس نے یہ دستاویزات پنجاب کے گورنر مائکل اوڈ وائر کے حوالے کر دیں۔ حضرت شیخ الہند کی اس تحریک میں یہ حضرات شریک تھے: مولانا عبید اللہ سندھی، حاجی ترنگ زئی، مولانا سیف الرحمن پشاوری، مولانا منصور انصاری، مولانا عزیز گل پشاوری، مولانا احمد اللہ پانی پتی، مولانا ظہور خاں سہارنپوری، شیخ عبد الرحیم سندھی، مولانا غلام محمد دین پوری، تاج محمود سندھی، محمد صادق کراچوی، مولانا فضل ربی پشاوری، مولانا محمد اکبر یاغستانی، مولانا فضل محمود پشاوری، خاں عبد الغفار خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، محمد احمد چکوالی، شاہ عبد الرحیم رائے پوری، مولانا محمد مبین دیوبندی، محمد ابراہیم راندیری (تاریخ دیوبند ص ۲۴۲)

کے خلاف عربوں کی بغاوت کے سلسلے میں فتویٰ طلب کیا۔ آپ نے فتویٰ دینے سے انکار کر دیا، جس پر آپ کو گرفتار کر کے (۱۹۱۷ء/۱۳۳۵ھ) رفقاء کے ساتھ جدہ بھیج دیا گیا۔ اس گرفتاری پر احتجاج بھی ہوا۔ مگر ان لوگوں کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا کہ مولانا کو انگریز حکومت نے طلب کیا ہے[1] جدہ میں آپ لوگ تین ہفتے جیل میں رہے اور پھر کچھ دن مصر کی جیل میں گزار کر فروری ۱۹۱۷ء کی صبح کو بحری جہاز کے ذریعے مالٹا روانہ کر دیے گئے۔ جہاز پر آویزاں ایک سائن بورڈ پر لکھا ہوا تھا۔ "اس جہاز میں زخمی اور بیمار سپاہی ہیں سامان جنگ نہیں ہے۔[2] اس سفر میں آپ کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حکیم نصرت حسین، مولانا عزیز گل، اور احمد علی صاحب وغیرہ تھے۔ جہاز سے آپ کو اس قلعے میں منتقل کیا گیا جہاں قیدیوں کے لیے مختلف بیرکیں خاردار تاروں سے گھیر کر بنا دی گئی تھیں۔ مولانا مالٹا کی جیل کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔ "گویا (مالٹا) نظر بندوں کا ہائیکورٹ ہے کہ بڑے سنگین مجرم اور سیاسی نظر بند وہاں رکھے جاتے ہیں[3] اس قلعے میں تقریباً تین ہزار جنگی اور سیاسی قیدی موجود تھے جو مختلف ممالک سے تعلق رکھتے تھے اور جن میں سعید حلیم پاشا سابق وزیر اعظم ترکی، ان کے بھائی عباس حلیم پاشا، کرنل جلال بیگ، جنرل علی احسان پاشا، جنرل فخری پاشا، شیخ الاسلام خیر الدین، آفندی اور جنرل محمود پاشا جیسے ترک رہنما بھی موجود تھے[4]

ہندستان میں احتجاج

جب شیخ الہند کی گرفتاری کی اطلاع ہندستان پہنچی تو بہت سے اخباروں نے جن میں صداقت، جمہور، نئی روشنی، مساوات، مشرق، عدم، مدینہ، الخلیل خطیب، اور الصباح وغیرہ ہیں، احتجاجی اداریے لکھے اور وائسرائے کے پاس غم و غصّہ کے تار بھیجے۔ آنریبل سید علی رضا مرحوم نے صوبۂ متحدہ آگرہ اودھ کی قانونی کونسل کے اجلاس میں آپ کی نظربندی کو چیلنج کیا۔ مگر انھیں یہ جواب دیا گیا کہ صوبۂ متحدہ کو خبر ملی ہے کہ مولانا کی گرفتاری ہندستان کے باہر عمل میں لائی گئی، کیوں کہ انھوں نے شریف مکّہ ملک معظم کے دشمنوں کو ان کی نوجی تجاویز میں مدد دی تھی[5]

اس سلسلے میں دارالعلوم کا ایک وفد ۵ نومبر ۱۹۱۷ء کو جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر سے ملا اور شیخ الہند کی گرفتاری پر میمورنڈم پیش کیا اور وجہ گرفتاری دریافت کی تو گورنر نے وفد سے کہا، مولانا کی نظر بندی ہمارے یہاں اور ہمارے حکم سے نہیں ہوئی، شریف نے گرفتار کر کے ہمارے حوالے کیا ہے وہاں کوئی بات ہوئی ہوگی[6]

اخباروں اور اداروں کے احتجاج سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ جیمس مسٹن نے اپنے ایک پرائیویٹ سکریٹری برن کو مالٹا بھیجا تاکہ وہ مولانا اور ان کے رفقاء کے لیے کچھ سہولیات مہیا کر سکے[7]

مالٹا میں آزادی کا درس

مالٹا میں مقید تمام جنگی و سیاسی قیدیوں میں بہت اتفاق رہتا تھا کیوں کہ تمام قیدی اتحادی طاقتوں اور انگریزوں کے شرمناک مظالم سے تنگ آ چکے تھے اور تقریباً سب ہی کے دلوں میں ان کے خلاف بغاوت کا جذبہ موجزن تھا۔ مولانا نے یہاں بھی آزادی کا درس جاری رکھا۔ قلعہ میں قیدیوں کے درمیان ایک ایسا اتحاد قائم تھا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ بڑے بڑے افسر اور اسیران جنگ مولانا کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ پرنس جرمنی قیصر جرمنی کا بھتیجہ بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ وہ جب بھی مولانا کو ملتا ٹوپی اتار کر فرشی سلام کیا کرتا تھا۔ آپ کی صداقت، حقانیت اور تقویٰ نے بہت سے دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔

ان ہی دنوں آپ کے ایک رفیق تحریک حکیم نصرت حسین[8] کا انتقال ہو گیا اور آپ کی بھی صحت خراب رہنے لگی۔ حکیم صاحب کے انتقال کے تین مہینے بعد اسیران جنگ کی رہائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسیر مالٹا اور ان کے رفقاء ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو رہا کیے گئے۔ مختلف مقامات مثلاً اسکندریہ، سیدی بشر، اور عدن وغیرہ میں قید کی سنگینیاں برداشت کرنے کے بعد آپ ۸ جون کو بمبئی پہنچے۔ یہاں پہنچے پر سب سے پہلے سی آئی ڈی کے ایک افسر سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ مولوی رحیم بخش آئے ہوئے ہیں ان سے بغیر ملے ہرگز جہاز سے نہ اتریں۔ یہ گورنمنٹ کے آدمی تھے۔ مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہند تحریک خلافت میں شریک نہ ہوں اور ریل پر سوار ہو کر دیوبند چلے

---

[1] شیخ الہند ص۲۳ [2] اسیر مالٹا ص۱۵ [3] حیات شیخ الہند ص۸۰ [4] علمائے حق ج ۱ ص۱۵۱ [5] شیخ الہند ص۲۱ [6] روزنامہ الجمعیۃ مجور محوالہ شیخ الہند [7] اسیر مالٹا ص۲۰

[8] حکیم صاحب بڑے سلیم الطبع انسان تھے کوڑا جہان آباد کے رہنے والے تھے، لاہور اور کانپور میں اکثر کتابوں کا درس لے کر دیوبند تشریف لائے اور دارالعلوم میں حدیث شریف کی تکمیل کی

...ہائی[1] مگر حضرت شیخ الہند نے ان کا کہنا ماننے سے انکار کر دیا آپ جب
...رگاہ پر اترے تو یہاں مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا کفایت اللہ
...ر دوسرے ہزاروں افراد استقبال کے لیے موجود تھے۔

ممبئی میں اس زمانے میں خلافت تحریک زوروں پر تھی۔ ایک جلسۂ عام
...اس موقع پر انعقاد کیا گیا اور آپ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا اور
...یخ الہند نے جلسہ کو خطاب کیا۔

مہاتما گاندھی اور مولانا عبدالباری

ممبئی کے دو روزہ قیام کے دوران مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنؤ
...سے اور مہاتما گاندھی احمد آباد سے تشریف لائے اور دیر تک بند کمرے میں
...تحریک آزادی سے متعلق اہم مسائل پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی[2]

علی گڑھ کا سفر

دیوبند پہنچنے پر اگرچہ طبیعت خراب رہنے لگی تھی، مگر انگریز کا لوحہ یہ
...سکون سے نہ رہنے دیتا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء و اساتذہ پورے
...جوش کے ساتھ انگریزی اقتدار کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے مگر بعض سرکاری
...یونیورسٹی پر مسلط تھے اور جدوجہد کی راہ میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ ...
...ترک موالات کے مشہور فتوے کے بعد وہاں ایک دوسری یونیورسٹی مسلم نیشنل یونیورسٹی
...کے نام کا فیصلہ کیا گیا۔ شیخ الہند سے صدارت کے لیے کہا گیا۔ اگرچہ آپ علیل
...تھے، یہ کہہ کر علی گڑھ جانے کے لیے تیار ہو گئے کہ اگر میری صدارت سے انگریز کو
...تکلیف ہو گی تو اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا۔ واپسی میں دہلی تشریف
...لائے، اور جمعیۃ العلماء ہند کے تاریخی اجلاس منعقدہ ۱۹، ۲۰ اور ۲۱ اکتوبر
...۱۹۲۰ء کی صدارت کی۔

جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد اور وفات

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ پیدائش کے بعد دارالعلوم جیسی عظیم دینی درسگاہ وجود میں آئی اور آپ اس کے پہلے طالب علم قرار پائے، اور وفات کے وقت اپنے ہاتھوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسی عصری درسگاہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ جامعہ ملیہ کی بناء کی اصل وجہ یہ تھی کہ علومِ عصریہ کی تعلیم کے لیے ایک ایسی آزاد اور خود مختار درسگاہ کی ضرورت تھی جو گورنمنٹ کی اعانت کی محتاج نہ ہو اور ہندوستانی قوم اس کے نظم و نسق کی ذمے دار ہو۔

ان ہی دنوں آپ کی طبیعت زیادہ علیل رہنے لگی۔ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں نے بے حد توجہ سے علاج کیا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر کار ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت آپ دہلی میں تھے۔ جنازہ دیوبند لایا گیا اور مزارِ قاسمی میں سپردِ خاک کر دیے گئے۔ ع۔۔۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

کتابیات

۱۔ نقش حیات — مولانا حسین احمد مدنی
۲۔ علمائے حق — مولانا سید محمد میاں
۳۔ حیات شیخ الہند — مولانا میاں اصغر حسین
۴۔ تاریخ دیوبند — سید محبوب رضوی
۵۔ سرگزشت مجاہدین — مولانا غلام رسول مہر
۶ شیخ الہند — شائع کردہ انجمن اعانت نظربندان اسلام دہلی ۱۹۱۸ء
۷ اسیرِ مالٹا — مولانا حسین احمد مدنی
۸۔ خطبات شیخ الہند

★

---

[1] نقش حیات ج ۲ ص۲۳۵ [2] تاریخ دیوبند ص۲۲۲

سرسوتی سرن کیفؔ

منہاج احمد ضمیر جونپوری

غزلیں

کوئی پہنچ پایا نہ وہاں تک
پہنچی ہے دل کی آہ جہاں تک

اپنی رسائی ماہ وشاں تک
دل یہ خیالِ خام کہاں تک

دل کی نقاہت کا یہ عالم
اٹھتی نہیں ہے اب تو فغاں تک

یاں ہیں کچھ بے ربط سی باتیں
ان کی توجہ حسنِ بیاں تک

آتشِ دل اب سرد پڑی ہے
اٹھتا نہیں ہے اس میں دھواں تک

سر ہی نہیں تھا کس کو پٹکتے
جب پہنچے ہم کوئے بتاں تک

پہلے اپنے کو گم کر دو
پھر پہنچو گے سرِ نہاں تک

کوششِ مرہم! توبہ توبہ
ہنسنے لگے زخموں کے دہاں تک

میری رسائی دل کے اندر
تیری پہنچ بس جسمِ جواں تک

قدر اگر وہ اس کی کرتے
دل کیا ہم دے دیتے جاں تک

واعظ بات نہیں یہ اچھی
پہنچی ہے یہ میرے ایماں تک

جس کی کھوج میں ہم ہیں ازل سے
پایا نہیں ہے اس کا نشاں تک

جان دے بیٹھے ان کے در پر
روکتے ہم جذبات کہاں تک

کیفؔ ہمیں بے صبر تھے ورنہ
آتے وہ آتے آتے یہاں تک

ہر نفس خوابِ پریشاں کی طرح لگتا ہے
آدمی سایۂ انساں کی طرح لگتا ہے

اور کیا چاہیے اے کشمکشِ وقت تجھے
اب تو دامن بھی گریباں کی طرح لگتا ہے

زندگی چپ ہے تو پھر حشر ہی توڑے یہ سکوت
ہر نگر شہرِ خموشاں کی طرح لگتا ہے

خشک آنکھوں میں محبت کی سجل موج نہ ڈھونڈ
یہ تو پتھر ہے جو انساں کی طرح لگتا ہے

رُخ پہ سورج کے ہے اس دور کا تاریک نقاب
یہ بھی اک شمعِ غریباں کی طرح لگتا ہے

سرد ماحول میں بجھ جائے نہ احساس کی آگ
مجھ کو یہ وہم بھی امکاں کی طرح لگتا ہے

کرب کی دھوپ سکھا دیتی ہے اس کو رہبر
جو بھی چہرہ گلِ خنداں کی طرح لگتا ہے

شمیق احمد صدیقی

افسانہ

عشق نہ دیکھے جات کو بات

یونیورسٹی کے امتحان ختم ہو چکے ہیں۔ ہوسٹل میں رہنے والے سبھی طلبا اپنے اپنے گھر جانے کی تیاریوں میں مصروف نظر آ رہے ہیں سبھی کے چہروں پر خوشی اور مسرت نمایاں ہے۔ سبھی طلبا نے اپنے مستقبل کے متعلق حسین خواب اور منصوبے بنا رکھے ہیں۔ سبھی طلبا کی یونیورسٹی کی زندگی کی عجیب عجیب کہانیاں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کی کہانی کی ابتدا ہے اور کسی کی انتہا۔ کسی کی کہانی میں رنگینی ہے۔ کسی کی کہانی میں رڑ بجنڈی۔ کسی کی کہانی ہنسی مذاق قہقہوں کے ساتھ ختم ہوتی ہے تو کسی کی گرم آنسوؤں کے ساتھ۔

آنند کی دو سال کی یونیورسٹی کی زندگی سے بھی ایک عجیب کہانی وابستہ ہے جس کا کلائمیکس ابھی بھنور میں ہے، جس کا آغاز تو آنند کو معلوم ہے لیکن انجام نہیں۔ جیسے ہی آنند نے ہائر سیکنڈری کا امتحان اوّل درجہ سے پاس کیا اسے دہلی کے پرائیوٹ ہائیر سیکنڈری اسکول میں ٹیچر کی جگہ مل گئی۔ آنند کی بے لوث محنت اور لگن کا اسکول کے منیجر پر اچھا اثر ہوا۔ کچھ ہی دنوں بعد جب آنند نے اسکول کے منیجر سے تعلیم جاری رکھنے کی اجازت طلب کی تو منیجر نے اس کے بلند حوصلہ اور نیک ارادوں کے پیش نظر اُسے اس کی اجازت دے دی۔ آنند نے انگریزی ادب علم سیاست اور جرنلزم کے مضامین لے کر بی۔ اے میں داخلہ لے لیا۔ وہ انگریزی ادب میں ایم۔ اے اور جرنلزم میں ڈپلومہ حاصل کر کے ایک ممتاز جرنلسٹ بننے کا متمنی تھا۔

یونیورسٹی کا ماحول اسے بہت دل چسپ معلوم ہوا۔ نئے نئے دوست بنے۔ نئی سوسائٹی ملی۔ طالب علمی زندگی کے نئے نئے پہلوؤں سے آشنا ہوا لیکن وہ چیز جس نے اسے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھی کو ایجوکیشن جس میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایک ماہ بعد علم سیاست کے شعبہ کی طرف سے ایک ڈبیٹ کا اہتمام ہوا جس کا موضوع تھا "آج کے سماج پر مذہب اور فرقہ پرستی کا اثر" یہ موضوع آنند کا من پسند موضوع تھا کیونکہ وہ ہمیشہ ہی سے سماج کی ترقی اور بہبودی کے لیے مذہب کی مداخلت کے خلاف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے کسی مذہب کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ اس کائنات کے خالق خدا، بھگوان یا گاڈ کو کسی مذہب سے تعلق رکھے بغیر بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے اور اس کی عبادت کی جا سکتی ہے۔

آنند بھی اس ڈبیٹ میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا تھا جس سے سننے والوں میں کھلبلی مچ جائے جس کے ہر لفظ میں سچائی ہو۔ جو اسے انعام بھی دلا سکے۔ ویسے وہ انعام سے زیادہ اپنے مقالہ پر داد کا متمنی تھا۔ جب آنند کو اپنے خیالات کے اظہار کرنے کے لیے اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی تو اس نے مائک پر آ کر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا "اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب تک ہمارے دل و دماغ پر یہ باتیں کہ میں ہندو ہوں تو مسلمان ہے وہ عیسائی ہے، چھائی رہیں گی ہمارے سماج میں فرقہ پرستی کے زہریلے عناصر پنپتے رہیں گے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ہمارے سماج کے بگڑے ہوئے خد و خال کی ذمہ دار وہ فرقہ پرست سیاسی جماعتیں ہیں جو فرنٹ ڈور سے تو سیکولرزم کا پرچار کرتی ہیں لیکن بیک ڈور سے فرقہ پرستی کے شعلوں کو ہوا دیتی ہیں۔ آج وقت کا تقاضہ ہے کہ ہم سماج کے سب مسائل پر انسانیت کے نقطۂ نظر سے غور و فکر کریں

اور اس مسئلہ کا مناسب حل تلاش کریں جو ہر فرد کو قابلِ قبول ہو۔"

اپنی تقریر کا آخری جملہ پورا کر کے آنند اسٹیج سے اپنی سیٹ پر چلا گیا۔ وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ کچھ لوگ اس پر سخت تنقید کر رہے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے تالیاں بجا کر اس کی تقریر کا سواگت کیا اور اس کی تعریف و تحسین کی۔ آنند کے اسٹیج سے آنے کے چند منٹ بعد مائک سے اعلان ہوا "اب آپ کے سامنے مس روزی اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کریں گی۔" سفید منی اسکرٹ میں ملبوس ایک حسین لڑکی اسٹیج پر جلوہ افروز ہوئی جسے دیکھ کر آنند کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ علم سیاست میں اس کی ہم جماعت ہے۔ آنند کے دل نے چاہا کہ اس لڑکی کی خوب حوصلہ افزائی کرے کیونکہ اس سے پہلے کسی لڑکی نے اسٹیج پر آنے کی جرأت نہ کی تھی۔ بولنے سے پہلے ہی اس کی پر خلوص اور پر وقار شخصیت نے پورے مجمع پر سکوت طاری کر دیا تھا۔ مس روزی نے اپنی تقریر میں فرقہ پرستی کی سخت مذمت کرتے ہوئے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں سے اپیل کی کہ وہ یورپ اور امریکہ کی اقتصادی اور سائنٹفک ترقی کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنی ساری توجہ ملک کے تعمیری کاموں کے لیے وقف کر دیں اور وہ نظریات جو انسان کو انسانیت کی راہ سے ہٹا کر فرقہ پرستی کو جنم دیتے ہیں اپنے دل میں بالکل نہ پنپنے دیں۔

اپنی تقریر میں جو کچھ مس روزی نے کہا اس کا مختصر سا متن کچھ اس طرح تھا۔ "آج ہم خدا اور مذہب کو اچھی طرح نہیں سمجھ پاتے ہیں ہم مذہبی معاملات پر بہت ہی تنگ نظری سے غور و فکر کرتے ہیں اور مذہبی معاملات کے پیشِ نظر جھگڑے فساد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ہر شخص اپنے خدا، بھگوان، یا گاڈ کو اپنی عبادت گاہ میں بند کر دینا چاہتا ہے۔ سارے مذاہب کی عبادت گاہیں بہت تنگ اور چھوٹی ہیں خدا اتنا بڑا ہے کہ اسے کسی بھی عبادت گاہ میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ کیا یہ سب عبادت گاہیں اس عبادت گاہ کے برابر ہو سکتی ہیں جو خدا نے سب لوگوں کو ایک ہی یقین اور اعتبار کے موتیوں کے ہار میں پرونے کے لیے بنائی ہے۔ وہ عبادت گاہ یہ دنیا ہے۔ یہ چھوٹی سی دنیا۔ یہ بڑی سی دنیا۔ یہ عبادت گاہ خدا نے اس لیے بنائی ہے کہ سب لوگ اسے اپنا مشترکہ گھر سمجھ کر اس میں امن اور سکون کے ساتھ رہیں۔ ایک دوسرے سے پیار کرنا سیکھیں اور اپنی زندگی کو خوشیوں سے پُر کریں۔"

یہ کہہ کر روزی پسینہ صاف کرتی ہوئی اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ یوں تو سب اس کی تقریر پر محوِ حیرت تھے لیکن اس کی جرأت مندانہ اور حقیقت پسندانہ تقریر سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا جو شخص تھا وہ آنند تھا۔ دل ہی دل میں آنند روزی کو داد و تحسین دے رہا تھا۔ جب تک روزی تقریر کرتی رہی۔ آنند پیکرِ حیرت بنا بیٹھا رہا جیسے وہ پتھر کا بے جان بت ہو۔ وہ تو اس وقت چونکا جب روزی اسٹیج سے اپنی سیٹ پر آئی اور ہال لوگوں کی پر جوش تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔

روزی کا اندازِ بیان اتنا سحر آفرین تھا کہ خود محوِ حیرت رہ گیا۔ کیونکہ چھ ججوں میں سے تین آنند کو اور تین روزی کو پہلے انعام کا حق دار سمجھتے تھے اس لیے فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا گیا جس کے تحت روزی کو پہلا انعام ملا اور آنند کو دوسرا۔ روزی کو پہلا انعام ملنے کی آنند کو بہت خوشی ہوئی۔ اس نے روزی کی کامیابی پر اسے مبارک باد دی "مس روزی! یہ آپ کی تعریف نہیں حقیقت ہے کہ آپ کی تقریر میں سچائی اور حقیقت کا نہایت بلند امتزاج ہے آپ کا اندازِ بیان قابلِ تعریف ہے۔ آپ نے اپنی تقریر میں سماج کی بہت صحیح عکاسی کی ہے۔ آپ کے طنز میں تلخی نہیں شیرینی ہے۔ میری طرف سے اپنی کامیابی پر دلی مبارک باد قبول کیجیے۔"

"تھینکس فار یور کانگریچولیشن مسٹر آنند! لیکن یہ کہتے ہوئے مجھے اعتراف ہے کہ میں اس کی حقدار نہ تھی۔"

"وہ کیوں؟" آنند نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ اس لیے مسٹر آنند!" روزی "کہ اس انعام کے اصل حقدار تو آپ تھے۔ آپ نے سماج کے گھناؤنے چہرے سے وہ نقاب اُتار پھینکی ہے جس کی ابھی تک کسی نے جرأت تک نہیں کی تھی۔ آپ نے جس صاف گوئی اور حقیقت پسندی کا ثبوت اپنی تقریر میں دیا وہ قابلِ داد ہے۔ اگر قرعہ اندازی میں آپ کو اول انعام مل جاتا تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔"

آنند اور روزی کے خیالات کی یکسانیت دونوں کو ایک دوسرے

کے بہت قریب لے آئی تھی ۔ وہ دونوں کالج لائبریری میں، کامن روم میں کینٹین میں اور یہاں تک کہ یونیورسٹی کمپاؤنڈ سے باہر بھی ملنے لگے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنا قریب آ گئے تھے کہ روزی کے دل کی دھڑکن آنند اپنے دل میں محسوس کرتا تھا اور آنند کے دل کا درد روزی اپنے دل میں محسوس کرتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ روزی کے نقش پا آنند کے کمرے میں نمایاں ہونے لگے۔ یونیورسٹی ہاسٹل، انڈیا گیٹ، مغل گارڈن در جنوں مقامات ان کی ملاقاتوں کے رازدار بن گئے۔ اپنے سحر آفریں حسن، متناسب جسم، بڑی بڑی آنکھیں، کتابی چہرہ، سیاہ ریشمیں بال، گھنیری پلکیں، بے پناہ ذہانت اور پُرخلوص شخصیت کی بنا پر روزی آنند کے دل کے پردوں پر ایک دلکش و دل نواز تصویر کی طرح ابھر چکی تھی۔ روزی ہی وہ شخصیت تھی جس نے آنند کے احساس کو مزید پاکیزگی بخشی تھی روزی کی چاہت کے مسرور کن جذبوں نے آنند کو مدہوش بنا ڈالا تھا۔ روزی سرور انگیز نشہ بن کر آنند کے وجود پر چھا گئی تھی

روزی کی بھی یہی کیفیت تھی۔ آنند کی پروقار شخصیت، بلند فطرت کی شوخی نے روزی کو مسحور کر دیا تھا۔ وہ اپنے دل میں آنند کے لیے بے پناہ چاہ محسوس کرنے لگی تھی۔ حالانکہ دونوں میں کسی نے اپنی زباں سے اظہارِ محبت نہیں کیا تھا لیکن دونوں پر ایک دوسرے کی محبت کا راز کھل چکا تھا۔ جس دن بی۔ اے فائنل کا آخری پرچہ تھا آنند کو ایک مقامی انگریزی روزنامہ اخبار میں جونیر رپورٹر کی جگہ مل گئی۔ جب آنند نے نوکری ملنے کی خبر روزی کو سنائی تو روزی کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ روزی مستقبل کے حسین خوابوں میں ڈوب گئی۔ اُسے اس طرح کھوئی دیکھ کر آنند نے کہا "کیا سوچ رہی ہو روزی؟"

"کچھ نہیں! یوں ہی کچھ سوچنے لگی تھی!"

"کیا تمھیں یہ نوکری پسند نہیں؟"

"نہیں نہیں یہ بات نہیں آنند! میں یہ جان کر بہت خوش ہوں کہ تم ایسے ماحول میں قدم رکھنے جا رہے ہو جہاں پہنچ کر تم اپنے قلم سے سماج میں انقلاب لا سکتے ہو۔ آنند کیا میں اُمید رکھوں کہ تم اپنے قلم کو اپنی مجبوری کا غلام نہ بننے دو گے۔ اپنے قلم کو سماج سے برائیاں نکالنے میں وقف کر دو گے اور سماج کے رستے ہوئے ناسور کو مرہم بخشو گے مجھے امید ہے کہ تم سماج پر چھائے ہوئے اندھیرے میں اپنے قلم سے روشنی کا مینار تعمیر کرو گے۔"

یہ جملے کچھ ایسے انداز میں روزی کی زبان سے ادا ہوئے کہ آنند نے شدتِ جذبات سے سرشار ہو کر روزی کے خوب صورت ہاتھ چوم لیے " تمھارے مشورے میرے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ جب تک زندہ رہوں گا تمھارے مشوروں کو اپنا ایمان سمجھوں گا۔"

جس وقت آنند روزی کا ہاتھ چوم رہا تھا روزی کے چہرے پر حیا کی سرخی آ گئی تھی۔ وہ حیران ہو کر آنند کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن شدتِ جذبات سے الفاظ اس کی زبان سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔ اس کے شبنم سے دُھلے ہوئے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں کو کپکپاتے دیکھ کر آنند کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ روزی اس سے کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہے۔ آنند نے کہا " روزی تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔"

روزی شرمائی لجائی نظروں سے آنند کو دیکھنے لگی۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور روزی نے تاب نہ لا کر نگاہیں جھکا لیں اور آہستہ سے بولی " آنند تم بڑے جرنلسٹ بن کر مجھے بھول تو نہ جاؤ گے؟"

یہ جملہ ادا کرتے وقت روزی کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ آنند تڑپ اٹھا۔ اُس نے روزی کو ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر کرتے ہوئے کہا" روزی کیا اپنی جان کو کوئی بھول سکتا ہے؟ اپنی روح کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے اپنی زندگی کے متعلق جو حسین خواب میں نے دیکھے ہیں اُس کی تعبیر تم ہی تو ہو روزی۔ میں نے اپنے دل میں تمھارے پیار کی جو شمع روشن کی ہے وقت کی تیز آندھی بھی اُسے بجھا نہ سکے گی۔"

روزی نے آہ بھرتے ہوئے کہا " سچ آنند!"

"ہاں روزی! تمھاری روشن آنکھوں میں میرے سفر کی صبح اور تمھاری گھنیری زلفوں میں میری محبت کی شام ہے جو تھکے ہوئے راہی کو نیا عزم و نیا حوصلہ دے کر اپنی منزل کی طرف گامزن کر دیتی"

"آنند نہ معلوم کیوں نیند میری آنکھوں سے میلوں دور رہتی اور

رات کروٹیں بدلنے ہی میں بیت جاتی ہے۔"

"میرا بھی یہی حال ہے روزی! اب وقت آگیا ہے کہ ہم دونوں اپنی زندگی کے بارے میں اپنے والدین سے مشورہ کرلیں۔"

"ہاں آنند! میں آج ہی ڈیڈی سے بات کروں گی تم بھی اپنے پتاجی سے بات کرنا۔ پھر ہم دونوں . . ." روزی نے شرماتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور گڈ نائٹ کہہ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی آنند کے کمرے سے نکل گئی۔

اگلے دن روزی آنند سے ملی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آنند روزی کو اس حالت میں دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ وہ سب کچھ برداشت کرسکتا تھا۔ لیکن روزی کے چہرے پر اداسی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس شاداب اور شگفتہ پھول کو اس حالت میں دیکھ کر بولا "اتنی اداس کیوں ہو روزی؟ تمھارے ڈیڈی نے انکار کر دیا ہے کیا؟"

"انکار ہی نہیں کیا آنند اور بھی بہت کچھ کہا ہے"

آنند نے ڈوبتے ہوئے دل سے پوچھا "کیا کہا ہے؟ مجھے بھی تو معلوم ہو آخر انھیں مجھ میں کیا برائی نظر آتی ہے؟"

روزی کچھ نہ بولی۔ وہ کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ پھر دبی آواز میں بولی "آنند! ڈیڈی کہتے تم ہندو ہو اور یہ بھی کہتے ہیں کہ میں مر جاؤں گا لیکن اپنی لڑکی کو ایک ہندو لڑکے سے ہرگز نہ بیاہوں گا۔"

"اوہو! تو کیا وہ تمھاری شادی کرسچین ہی لڑکے سے کریں گے؟"

"ہاں آنند! وہ ہر سنڈے کو چرچ جاتے ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ روزی انھیں میرے ہندو ہونے کے علاوہ تو کوئی اعتراض نہیں۔"

"ہاں ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ڈیڈی کا نظریہ ہے کہ جرنلسٹ اور رائٹر ہمیشہ غربت اور افلاس کی دلدل میں پھنسے رہتے ہیں۔"

آنند خاموش ہو گیا۔ ایک عجیب سی الجھن نے اُسے گھیر لیا۔

خاموشی کو توڑتے ہوئے روزی نے آنند سے پوچھا "تم بھی تو بتاؤ آنند تمھارے پتاجی نے کیا کہا ہے"؟

"وہ بھی ہماری شادی سے خوش نہیں روزی!"

"وہ کیوں؟"

"پتاجی کہتے ہیں میں ہندو ہو کر اپنے بیٹے کی شادی کرسچین لڑکی سے ہرگز نہ کروں گا!"

"اوہو! تو کیا وہ تمھاری شادی کسی ہندو ہی لڑکی سے کریں گے کیا وہ ہندو ازم میں زیادہ یقین رکھتے ہیں۔"

"ہاں روزی! روز مندر جاتے ہیں!"

"اچھا یہ بتاؤ آنند انھیں میرے کرسچن ہونے کے علاوہ تو کوئی اور اعتراض نہیں؟"

"نہیں!"

"آنند کیا محبت کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے۔"

"ہاں ہوتا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"دو دلوں کی چاہ ہی محبت کا مذہب ہے روزی"

"آنند! محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں"

"ہاں ہے! صرف تمھارے ڈیڈی اور میرے پتاجی کی عدالت میں! قانون کی عدالت میں نہیں۔ بھگوان یا گاڈ کی عدالت میں نہیں۔"

کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے۔ پھر آنند نے خاموشی توڑی "روزی! کیوں نہ ہم دونوں اس تنگ دل اور تنگ نظر سماج کی پروا کیے بغیر اس عدالت میں جا کر گاڈ کو گواہ مان کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں!"

روزی نے آنند کو دیکھا اور کچھ دیر تک بغیر پلکیں جھپکائے دیکھتی رہی۔ شاید وہ آنند کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اپنی محبت کی ترازو میں تول رہی تھی۔ پھر اپنی خاموش نگاہوں سے روزی نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اور ان دونوں کے قدم سول کورٹ کی طرف بڑھ گئے۔

★

غزلیں

رحمان جامی

اِک مدّت سے شہر میں تیرے اُلجھا اُلجھا پھرتا ہے
میرے جیسا حال ہے اس کا بہکا بہکا پھرتا ہے

پاگل پاگل سا لگتا ہے دیوانہ دیوانہ سا
گاؤں گاؤں شہروں شہروں صحرا صحرا پھرتا ہے

لوگ اُسے "میں" کیوں کہتے ہیں جبکہ وہ مجھ سے ہے جُدا
وہ جو میرے جسم میں اکثر اکڑا اکڑا پھرتا ہے

لوگ نہ جانے تجھ سے مل کر کیوں تجھ سے ہو جاتے ہیں
تجھ سے مل کر میرا "میں" بھی تنہا تنہا پھرتا ہے

چاند میں جا کر واپس لوٹا سنّاٹے کو ساتھ لیے
اپنی کھوج میں خود ہی انساں مارا مارا پھرتا ہے

جامی صاحب جب سے اِس نے اُس کی صورت دیکھی ہے
جانے کیا اس دل کو ہوا ہے مچلا مچلا پھرتا ہے

فرحت کیفی

کسی نے میری اُداسی کا روپ دیکھا تھا
غمِ حیات کی تصویر کا تراشا تھا

اُبھرتی ڈوبتی موجوں کے درمیاں کوئی
کبھی خدا سا کبھی ناخدا سا لگتا تھا

جو ہے وہ عمرِ رواں کا حسین تحفہ ہے
جو تھا وہ بیتے دنوں کا عجیب قصہ تھا

مرے دکھوں کا مداوا ابھی ہو تو کیوں کر ہو
سنو کہ دشمنِ جاں ہی مرا مسیحا تھا

مزاجِ اہلِ جنوں کس طرح بدل جاتا
کہ ان کا دشتِ الم میں کہیں بسیرا تھا

کس انہماک سے سنتا تھا میرا قصّۂ غم
عجیب کیف میں ڈوبا ہوا زمانہ تھا

ہے پیار وقت سے اب بھی اے فرحتِ کیفی
کہ وقت ہی تو محبت کا شاخسانہ تھا

پروفیسر ستین بوس — زندگی اور تصانیف

پروفیسر (ڈاکٹر) ڈی باسو

پروفیسر ستیندر ناتھ بوس کا جنم یکم جنوری ۱۸۹۴ء کو شمالی کلکتہ میں اپنی رہائش گاہ پر ہوا۔ پروفیسر موصوف کی زندگی کی تاریخ عجیب وغریب ہے۔ آپ کے والد سری سریندر ناتھ بوس انڈین ریلویز میں اکاؤنٹنٹ تھے۔

پروفیسر ستیندر ناتھ بوس نے ۱۹۰۹ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور بہ لحاظ قابلیت پانچویں نمبر پر رہے۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ پریذیڈنسی کالج میں انھیں آچاریہ جگدیش بوس، آچاریہ پرفل چندر رائے، پروفیسر کوس اور ایسے ہی دیگر اعلیٰ اور مقتدر استادوں سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ موصوف نے کلکتہ یونی ورسٹی سے انٹر سائنس بی ایس سی اور ایم ایس سی کے امتحانات پاس کیے اور ہر امتحان میں اول آئے۔

سر اسوتوش مکھرجی کی درخواست پر موصوف نے لکچرر کی حیثیت سے یونی ورسٹی کالج آف سائنس میں شمولیت کی۔ ۱۹۲۱ء میں موصوف ڈھاکہ یونی ورسٹی میں ریڈر کی حیثیت سے چلے گئے۔ شماریات پر پروفیسر ستین کا مشہور مقالہ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا جو بوس اسٹےٹسٹکس کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی اشاعت کے فوراً بعد وہ یوروپ کے لیے روانہ ہوگئے اور جرمنی اور فرانس میں مقیم ہوئے۔ اس طرح انھیں آئن سٹائن کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

علمی کارنامے

موصوف ۱۹۲۷ء میں یوروپ سے واپسی پر ڈھاکہ یونیورسٹی میں فزکس کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ دہلی میں ۱۹۴۴ء میں انڈین سائنس کانگریس کا سیشن ہوا اور موصوف کو اس کا جنرل پریذیڈنٹ چنا گیا۔ ۱۹۴۵ء میں وہ فزکس کے پروفیسر کی حیثیت سے کلکتہ یونی ورسٹی میں واپس چلے گئے اور ۱۹۵۶ء تک اس جگہ پر کام کرتے رہے، پھر یہیں سے رٹائر ہوئے اس کے بعد انھیں پروفیسر ایمیریٹس کا عہدہ دیا گیا۔ موصوف نے شانتی نکیتن میں وشو بھارتی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے منصب سنبھالا اور ۱۹۵۹ء میں اس سے سبک دوش ہوگئے۔

کلکتہ یونی ورسٹی نے موصوف کو ۱۹۵۷ء میں ڈاکٹریٹ آف سائنس کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ بھارت سرکار نے ۱۹۵۹ء میں ان کو نیشنل پروفیسر کا مرتبہ دے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ۱۹۵۸ء میں موصوف کو رائل سوسائٹی آف لندن کا فیلو چنا گیا۔ پروفیسر موصوف نے کلکتہ میں ریاضی سے متعلق سوسائٹی، انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی اور سائنس کے فروغ کے متعلق بھارتی ایسوسی ایشن کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ آپ اور بہت سی تنظیموں کے صدر بھی رہے ہیں۔

پروفیسر موصوف کو سائنس کے مختلف شعبوں میں چھان بین اور تحقیقی امور کو انجام دینے کا زبردست ملکہ حاصل تھا۔ آج کے دور میں ہر چیز کے بارے میں تھوڑی واقفیت حاصل کرنا غیر ممکن نہیں ہے۔ اس طرح اس دور میں کسی خاص موضوع کے بارے میں اعلیٰ مہارت حاصل کرنا بھی ممکن ہے لیکن پروفیسر بوس فزکس کے علاوہ دیگر موضوعات کا بھی اس قدر گہرا علم رکھتے تھے جس قدر

ئی بھی اسکالر یا محقق اپنے موضوع کے بارے میں رکھتا ہے ۔

پروفیسر بوس ۱۹۵۹ء سے سائنس کے موضوع سے متعلق رتی ایسوسی ایشن میں نیشنل پروفیسر یونٹ کے تحت کچھ پراجیکٹوں لسلے میں سرگرم عمل تھے ۔ اس سلسلے میں ایک خاص پراجیکٹ کیا جا سکتا ہے ۔ اس کا تعلق مغربی بنگال اور بہار کے کچھ ح چشموں میں پائی جانے والی ہیلیم گیس (ایک شفاف گیس جو ے آفتاب میں پائی جاتی ہے) کی درجہ بندی وغیرہ سے متعلق گیس درآمد کی جاتی رہی لیکن اس وقت اس کی درآمد قریب ب بند کر دی گئی ہے ۔ نیوکلیئر انجینئرنگ اور خلائی ٹکنالوجی س کی مانگ روز بروز بڑھ رہی ہے اس وجہ سے اس گیس کی ندی سے متعلق اسکیم خاص اہمیت رکھتی ہے ۔

بل ذکر تجربات

بیسویں صدی میں سائنس کے شعبے میں دو نمایاں کارنامے م دیے گئے ۔ ان میں سے ایک ہے نظریہ اضافیت (Theory of Relativity) کی دریافت اور دوسرا ہے نظریہ مقادیر ت (QUANTUM THEORY) یہ ایک عجیب اتفاق ہے فیسر آئن سٹائن اور پروفیسر بوس نے ان دونوں شعبوں میں اہم ی رول ادا کیا ہے جو روائتی نظریات سے قطعی مختلف نظریات کلاسیکی فزکس کی نمایاں خصوصیت عمل کا تسلسل ہے ۔

پلانک نے ۱۹۰۰ء میں ایک فارمولا تیار کیا جس میں بتایا س طرح روشنی کے مختلف رنگوں کی شدتیں روشنی پھینکنے والے سم کے درجہ حرارت پر مبنی ہیں ۔ اس فارمولے کو اخذ کرنے کے لانک نے یہ فرض کیا کہ روشنی کا اخراج ایک مسلسل عمل نہیں ہے ۔ ت کی صورت میں سامنے آتی ہے اور ہر حست میں انرجی کچھ ں کی صورت میں باہر آتی ہے ۔ لیکن روشنی باہر آنے کے بعد یہ ں کی صورت میں سفر کرتی ہے ۔

روشنی کے اخراج کا یہ تصور ہی نظریہ مقادیر برقیات کی ابتدا ہے ۔ سورج کی روشنی میں دھات کی سطحوں سے خارج ہونے والے الیکٹرون کو واضح کرنے کے لیے ۱۹۰۵ء میں پروفیسر آئن سٹائن نے یہ نظریہ پیش کیا کہ روشنی کو ذرات کا مجموعہ سمجھنا چاہیے ۔ اس طرح جدید فزکس میں دو طرح کے نظریات ہیں یعنی یہ کہ روشنی کی لہریں کی صورت میں کام کرتی ہے اور یہ ذرات کا مجموعہ ہے ۔

بوس ۔ آئن سٹائن کا نظریہ

پروفیسر بوس نے ۱۹۲۴ء میں پلانک کے فارمولے سے دوبارہ یہ اخذ کیا کہ روشنی مادہ کا مجموعہ ہے نہ کہ الیکٹرو میگنیٹک لہروں کا مجموعہ ۔ اس کائنات میں تمام وجود دو زمروں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں ایک وہ جو بوس اسٹے ٹسٹکس کے طابع ہیں اور جو اس مناسبت سے کہلاتے ہیں، اور دوسرے وہ اطالوی ماہر فزکس فرمی کی اسٹے ٹسٹکس کے تابع ہیں جو فرمیونز مولا ہیں ۔ فرمیونز کی وجہ سے پروفیسر بوس سائنس کی تاریخ میں زندہ و پائندہ رہیں گے ۔

پروفیسر بوس مختلف علوم و فنون کے ماہر تھے وہ ایسراج بجانے کے ماہر تھے ۔ وہ ہر طرح کے علمی موضوع پر بحث کرنے پر قادر تھے ۔ ان کے ڈرائنگ روم میں ہر مکتبۂ فکر کے لوگ آتے تھے ان کی شدید خواہش تھی کہ اپنی ہی زبان میں سائنسی علوم کو عوام تک پہنچایا جائے ۔ چنانچہ مختلف اداروں اور تنظیموں مثلاً بنگیہ وگیان پریشد کے ذریعہ ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے کام کیا جا رہا ہے ۔ وہ صاف گو تھے ایک بار انھوں نے بہت صاف لفظوں میں ایک مشہور روسی سائنس داں سے جو کہ بھارت آئے ہوئے تھے پوچھا کہ کیا وہ خدا پر یقین رکھتے ہیں ۔ اس نے بھی صاف لفظوں میں جواب دیا کہ "نہیں" ان میں ظرافت بدرجہ اتم تھی ۔ وہ منکسر المزاج تھے اور اپنے اوپر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے عادی تھے ۔ اسی وجہ سے وہ ماضی کے ایک رشی منی کی طرح سے تھے ۔

★

غزلیں

اسرار حسن خلش

حسیں آنکھوں میں بھی اشکوں کا طوفاں ہم نے دیکھا ہے
جمالِ مضمحل، حالِ پریشاں ہم نے دیکھا ہے

کبھی بیچارگیٔ عشق کا جب ذکر آیا ہے
لبِ نازک پہ پیہم زہرِ خنداں ہم نے دیکھا ہے

یہ فطرت حسن کی کب ہے نگراں کی یہ خود دیکھی
خطا دے بے خطا ان کو پشیماں ہم نے دیکھا ہے

نہ بزمِ ناز وہ دستور خاموشی وہ سناٹا
تکلّم سے لبِ نازک گریزاں ہم نے دیکھا ہے

مقدّر عشق کا بدلا کہ فطرت حسن کی بدلی
مثالِ گُل انھیں بھی چاک داماں ہم نے دیکھا ہے

مری نظروں میں اب تاریک ہے دنیا خلش اپنی
غضب کا اک شکستِ عہد و پیماں ہم نے دیکھا ہے

ویشاکھ ۱۸۹۶ اشک

ظہیر غازی پوری

بغور دیکھو مجھے میں نیازِ آدم ہوں
نشیب میں سہی پھر بھی فرازِ آدم ہوں

خود اپنے آپ کو دہرا رہا ہوں صدیوں سے
میں اپنی ذات میں تاریخ سازِ آدم ہوں

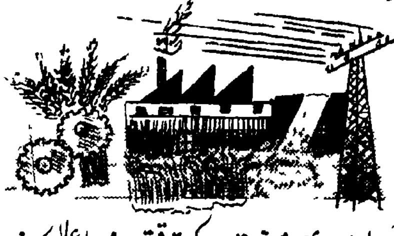
مرے سوا مجھے پہچانتا کوئی کیسے
جو منکشف نہ ہوا میں وہ رازِ آدم ہوں

"لہو زدہ" ملا جس عہد میں ہر اک ذرّہ
میں ایسے عہد میں بھی سرفرازِ آدم ہوں

خود اپنے حرف و صدا ہیں صلیب میرے لیے
مجھے بچا لو میں نغمہ طرازِ آدم ہوں

بہ رنگ شعلہ جو اپنے لہو سے بھڑکا تھا
وہ آگہی کا وسیلہ ہوں نازِ آدم ہوں

مرے قلم کی، مرے عشوہ کار جذبوں کی
ظہیر قدر کرو میں جوازِ آدم ہوں



اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

گھریلو اور دیہی صنعتوں کی ترقی پر وزیر اعلیٰ کا زور ●●● پنچایت راج اداروں کو مزید اختیارات ●●● مالک مکان ملازمین کو بھی مکان کرایہ بھتہ ●●● معطل ملازمین کے لیے گزارہ بھتہ کی منظوری ●●● قومی بچت کے کارکنوں کو نقد انعامات ●●● اتر پردیش سے ۲۳ لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا سامان برآمد ●●● موٹے اناج کی نقل و حرکت پر پابندیاں ختم ●●● کلکٹروں کو معاوضے کی رقم منظور کرنے کے اختیارات ●●● اتر پردیش لاٹری کا دوسرا انعام جیتنے والوں کو امبیسڈر کار ●●● مصنفین کو امداد ●●● متفرقات

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا
آج ریاستی محکمہ صنعت کے اعلیٰ افسران کو
یت کی ہے کہ وہ ایک سوشلسٹ سماج
قیام اور عوام خاص طور پر کمزور طبقوں
حالات بہتر بنانے کے وعدے کے
ق و سباق میں اپنے انداز فکر اور نقطۂ
میں تبدیلی پیدا کریں۔ انھوں نے افسران
کہا کہ "میں چاہتا ہوں کہ نئی تبدیلی
نے کے لیے آپ اپنے اندر جذباتی وابستگی
ا کریں اور سماجی اور معاشی انقلاب
نما کرنے کے لیے سرگرم حصہ لیں"۔

وزیر اعلیٰ نے جو ریاست میں صنعت کاری
تیز رفتار ترقی کے راستے میں حائل مختلف
واریوں اور مسائل کے سلسلے میں تبادلۂ
ل کر رہے تھے۔ ہماری صنعتوں
اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ بجلی کی قلت
پیش نظر ہینڈ لوم صنعت اور دستکاریوں
ترقی کے لیے ان کی حوصلہ افزائی اشد
ری ہے تاکہ دیہی علاقوں میں دستیاب
سانی طاقت کو منفعت بخش روزگار
فراہم کیا جا سکے۔

شری بہوگنا نے یہ قطعی طور پر واضح کر دیا ہے کہ محکمہ صنعت اور مختلف ریاستی صنعتی اور مالیاتی کارپوریشنوں کے اعلیٰ افسران کی کارگزاری کا اندازہ اس بات سے لگایا جائے گا کہ وہ گھریلو اور دیگر دیہی صنعتوں کی ترقی کے لیے کیا کوششیں کرتے ہیں کیونکہ ان صنعتوں کے لیے بے روزگار عوام کو روزگار کے مواقع مہیا کرنے کی عظیم ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ انھوں نے افسران کو ہدایت کی کہ وہ اس سلسلے میں مقررہ مدت کے اندر مکمل کیا جانے والا ایک پروگرام وضع کریں اور ان پر عزم و انہماک کے ساتھ عملی جامہ پہنائیں۔ انھوں نے کہا کہ "میں چاہتا ہوں کہ آپ ہر ہر فرد اور دستکاروں کو روزگار فراہم کریں۔ انسان کی دس انگلیاں بیکار نہ رہیں اور اگر یہ کاریگر بیکار رہتے ہیں تو اسے محکمہ صنعت کی ناکامی سے منسوب کیا جائے گا۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ گھریلو اور دیہی صنعتوں کی ترقی پر توجہ دینا اس لیے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ صنعتیں غیر ملکی زر مبادلہ کیلئے ایک زبردست ذریعہ ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے نئے ڈیزائن تیار کئے جائیں جو غیر ملکی بازاروں میں قابل قبول ہوں۔ انھوں نے کہا کہ غیر ممالک میں لکھنؤ کے چکن کرتوں کی بے حد مانگ ہے اور حال ہی میں امریکہ سے ۱۰ ہزار کرتوں کی برآمد کا ایک آرڈر حکومت کو وصول ہوا ہے۔ حکام کو ہنر مند افراد اور کاریگروں کی پوری پوری حوصلہ افزائی کرنا چاہیئے اور انھیں مالی امداد مہیا کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ حکام کو یہ بھی بندوبست کرنا چاہیئے کہ درمیانی اشخاص کاریگروں کا استحصال نہ کر سکیں۔

٭ ٭ ٭

وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے اعلان کیا کہ پنچایتی راج اداروں یعنی گاؤں سبھاؤں، چھیتر سمیتوں اور ضلع پریشدوں کو مزید اختیارات اور ذمہ داریاں سپرد کی جائیں گی۔

وزیراعلیٰ نے جو رویندرالیہ میں پنچایتی راج کے دو روزہ ریاستی سطح کے سیمینار کا افتتاح کر رہے تھے کہا کہ جب تک ان بنیادی جمہوری اداروں کو عوام کی خدمت کے لیے مستحکم اور پائیدار نہیں بنایا جائے گا اس وقت تک ریاستی اور مرکزی سطح پر جمہوری نظام مناسب اور موثر طور سے کام نہیں کر سکے گا۔ ان جمہوری اداروں کو مستحکم اور پائیدار بنانا ریاستی حکومت کے مفاد میں ہے۔

انھوں نے کہا کہ ریاست کے چار سطحوں میں۔ پہلی گاؤں سبھا کی حکومت، بلاک سطح کی حکومت، ضلع کی سطح کی حکومت اور ریاستی سطح کی حکومت۔ یہ سوچنا غلط ہے کہ ریاستی سطح کی حکومت دیگر تینوں حکومتوں کو نظرانداز کر کے کام کر سکتی ہے کیونکہ یہ سب مل کر ہی حکومت کے ڈھانچہ کی تکمیل کرتے ہیں۔

شری بہوگنا نے کہا کہ حکومت پنچایتی راج اداروں پر افسر شاہی کا تسلط برداشت نہیں کرے گی اور ریاست کی تعمیر کے سلسلہ میں پردھانوں اور پرمکھوں کو مزید اختیارات اور ذمہ داریاں سپرد کی جائیں گی۔

انھوں نے کہا کہ پرمکھوں اور پردھانوں کو اپنے اداروں کے ملازمین اور افسران کی کارکردگی پر نظر رکھنے اور ان کے اعمال نامون میں اندراجات کی سفارش کرنے کا بھی اختیار ہوگا۔

وزیراعلیٰ نے ان اداروں کے لیڈروں سے کہا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں کے لیے خود اپنے پنج سالہ منصوبے بنائیں اور مقامی وسائل کی مدد سے انھیں بروئے کار لائیں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت ان اداروں کو رقومات فراہم کرنے کی ایک تجویز پر غور کر رہی ہے۔

⁂

ریاستی حکومت نے حکومت ہند کے طرز پر ایسے سرکاری ملازمین کو بھی مکان کرایہ بھتہ منظور کیا ہے جن کے اپنے یا اپنے خاندان کے مکانات ان مقامات پر ہیں جہاں پر وہ تعینات ہیں۔ یہ سہولت یکم جنوری ۱۹۷۴ء سے منظور کی گئی ہے اور اس سے وہ ملازمین بھی مستفید ہوں گے جن کے اپنے نجی مکانات تعیناتی کے مقام پر ہیں لیکن وہ کرایہ کے مکان میں رہ رہے ہیں۔

ریاست کے کاول شہروں میں ایسے ملازمین کو جنھیں ۷۵۰ روپیہ ماہانہ تنخواہ مل رہی ہے تنخواہ کی ۱۵ فیصد شرح سے مکان کرایہ بھتہ ملے گا۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ سے پانچ لاکھ تک کی آبادی والے بعض شہروں کے ملازمین کو ۱۲ فیصد شرح سے مکان کرایہ بھتہ ملے گا۔ سرکاری ملازمین کو اس سلسلے میں ایک معمولی سرٹیفیکیٹ پیش کرنا ہوگا کہ وہ مکان ٹیکس ادا کر رہے ہیں۔

اسی طرح ایسے ملازمین کو جو ۷۵۰ روپیہ ماہانہ سے زائد تنخواہ پا رہے ہیں وہ کرایہ بھتہ پانے کے اسی صورت میں مستحق ہوں گے جبکہ کرایہ ان کی تنخواہ سے ۱۰ فیصد زیادہ ہو۔ لیکن یہ وہ رقم کاول شہروں میں اور دیگر شہروں میں بالترتیب ۴۰۰ روپیہ اور ۲۰۰ روپیہ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس مقصد کے لیے میونسپل حکام کی جانب سے متعین کردہ مکان کے کرایہ کی کل رقم اور سرکاری ملازم کے ادا کردہ میونسپل ٹیکسوں کی بنیاد پر کرایہ مکان بھتہ مقرر کیا جائے گا۔

⁂

ریاستی حکومت کے ایک فیصلہ کے بموجب اب ایک معطل سرکاری ملازم کو اسکی اوسط نصف تنخواہ یا نصف تنخواہ کے برابر گزارہ بھتہ کے ساتھ ساتھ چھ ماہ تک کی مدت کے لیے مہنگائی بھتہ اور وقتاً فوقتاً منظور کئے جانے والے ملانی بھتّے دیئے جائیں گے۔ ایسے ملازم کو بہرحال یہ سرٹیفیکیٹ پیش کرنا ہوگا کہ معطلی کی مدت کے دوران اس نے کوئی دوسرا روزگار یا پیشہ اختیار نہیں کیا تھا۔

گزشتہ ۲۷ مارچ کو یہ فیصلہ وزیراعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کی صدارت میں منعقدہ کابینہ کے ایک جلسہ میں کیا گیا۔

معطلی کی مدّت چھ ماہ سے تجاوز کر جانے پر معطل کرنے والا حاکم گزارہ بھتہ میں اتنی رقم کا اضافہ کر سکتا ہے کہ وہ ۵۰ فی صد سے زیادہ نہ ہو بشرطیکہ اسے یہ اطمینان ہو کہ معطلی کی مدت میں ایسے اسباب کی بنا پر توسیع کی گئی ہے جو معطل ملازم سے منسوب نہیں کئے جا سکتے۔ اگر صورتحال اس کے برعکس ہو تو گزارہ بھتہ میں کمی کی جا سکتی ہے۔ اب تک گزارہ بھتہ ملازم کی تنخواہ کے ایک چوتھائی سے لے کر نصف تک دیا جاتا تھا۔ ایسے ملازم کو بہرحال

ی بھتہ منظور کیا جا سکتا تھا۔ لیکن
قسم کا تلافی بھتہ مثلاً شہر تلافی بھتہ
ن کرایہ بھتہ نہیں دیا جاتا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

کومت اترپردیش نے قومی بچت سے
تسکات میں رقم جمع کرنے کے کام میں
ہوئے کارکنوں کو نقد انعامات منظور
، کی اسکیم میں ترمیم کر دی ہے۔ یہ
اس مقصد کے پیش نظر کی گئی ہے تاکہ
بچت کا کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی
جا سکے۔ ان ترمیمات کے بموجب ایسے
ع کو جو اپنے مقررہ نشانے کے حصول
سلے میں بہترین کارکردگی کا ثبوت دیں
نھیں اپنے عملے کو زیادہ انعامات دینے
یے مزید رقم الاٹ کی جائے گی۔
ریاست کے ایسے اضلاع جو اپنے مقررہ
کی ۵ فیصد خالص رقم جمع کریں گے
ں ہر ۲۰ لاکھ روپیہ پر ۱۰۰۰ روپیہ یا اس
اسب میں رقم الاٹ کی جائے گی۔
طرح جن اضلاع میں مقررہ نشانے کی
ور ۷۵ فیصد اور ۷۶ اور ۱۰۰ فیصد کے
رمیان رقم جمع ہوگی انھیں ہر ۲۰ لاکھ
یہ پر بالترتیب ۱۵۰۰ روپیہ اور ۲۰۰۰
یہ یا اس کے تناسب میں رقم مخصوص
جائے گی جن اضلاع میں ۱۰۰ فیصد سے
ہ خالص رقم جمع ہو جائے گی انھیں ہر
لاکھ روپیہ پر ۲۵۰۰ روپیہ یا اس کے
سب میں رقم الاٹ کی جائے گی۔ ایک
ست کے اضلاع کو ہر ۲۰ ہزار روپیہ

کی خالص رقم جمع کرنے پر ۱۰۰ روپیہ یا اس کے تناسب میں رقم الاٹ کرنے کا بندوبست تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

اترپردیش سے ۷۲-۱۹۷۱ء اور ۷۳-۱۹۷۲ء کے دوران ریاستی برآمد کارپوریشن کے ذریعہ [illegible] روپیہ مالیت کا سامان برآمد کیا گیا۔

یہ اطلاع ودھان پریشد میں وقفۂ سوالات کے دوران چھوٹی صنعتوں کے وزیر شری اصطفےٰ حسین نے دی۔ انھوں نے شری گوری شنکر رائے کو بتایا کہ اس رقم میں سے ۷۲-۱۹۷۱ء کے دوران ۷۱۹۵۲۶ روپیہ مالیت کا سامان اور ۷۳-۱۹۷۲ء میں ۴۶۹۸۴۷۱ روپیہ کا سامان برآمد کیا گیا۔

وزیر موصوف نے ایک ضمنی سوال کا جواب دیتے ہوئے ایوان کو مطلع کیا کہ مذکورہ بالا برسوں کے دوران جو خاص چیزیں برآمد کی گئیں ان میں قالین، مصنوعی زیورات، شیشہ کے موتی اور پوت، اور سلے ہوئے کپڑے شامل ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

وزیر غذا اور رسد شری راجندر کماری باجپئی نے ودھان سبھا میں وقفۂ سوالات کے دوران بتایا کہ ریاستی حکومت نے مرکز کے ایک فیصلہ کے بموجب موٹے اناج کی بین ریاستی نقل و حرکت پر عائد پابندیاں ختم کر دی ہیں۔

ایک مختصر نوٹس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر غذا نے کہا کہ جن اضلاع میں لیوی کے ذریعہ خریداری کی جا رہی ہے وہاں لیوی کے تحت ۵ فیصد خریداری کے بعد بقیہ دستیاب موٹے اناج پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ دیگر اضلاع میں موٹے اناج کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

زمین کے حصول سے متعلق قانون کے تحت حاصل کردہ زمین کے معاوضہ کی رقم کے تعین میں غیر ضروری تاخیر کو دور کرنے کے لیے ریاستی حکومت نے کلکٹروں اور کمشنروں کو معاوضہ کی رقم منظور کرنے کے اختیارات تفویض کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس سلسلے میں کلکٹروں کو ۲۵ ہزار روپیہ تک اور کمشنروں کو ۷۵ ہزار روپیہ تک کا معاوضہ منظور کرنے کے لیے مجاز کیا گیا ہے۔ صرف ایسے خصوصی معاوضہ کے معاملات بورڈ آف ریونیو کے دائرے اختیار میں آئیں گے جن کی رقم ۷۵ ہزار روپیہ سے زیادہ ہوگی۔ اس طرح بورڈ آف ریونیو پر کام کا بار کم ہو جائیگا۔

⁂ ⁂ ⁂

اترپردیش ریاستی لاٹری کے ۲۴ ویں اور ۲۵ ویں ڈرا میں دوسرا انعام جیتنے والے دو خوش نصیب افراد نے لاٹری نظامت کے احاطہ میں گزشتہ ۲۸ مارچ کو منعقدہ ایک تقریب میں دو ایمبیسڈر، مارک، کاریں حاصل کیں۔

اترپردیش ریاستی لاٹری کے ڈائرکٹر

شری سریندر موہن نے انعام یافتگان شری کشن لال کھرانا کو جو میرٹھ میں فوجی سامان تیار کرنے سے متعلق ورکشاپ میں فورمین ہیں اور کاس گنج ضلع ایٹہ کے شری جگدیش پرشاد شرما کو جو ضلع بدایوں میں جونا مئی بلاک میں اکاؤنٹنٹ ہیں کاروں کی کنجیاں پیش کیں۔

⁂ ⁂ ⁂

ریاستی حکومت نے ۱۹۷۳-۷۴ء کے لیے ہندی، سنسکرت اور اردو کے ۹۶ مصنفین کو انعامات دینے کے لیے ۲،۰۰،۰۰۰ روپیہ کی رقم منظور کی ہے۔ اس سلسلے میں پانچ ہزار روپیہ کے دو خصوصی انعامات حاصل کرنے کا فخر سنسکرت کے مصنف ہری ہرانند سرسوتی کرپاتری سوامی، وارانسی اور اردو کے ممتاز ادیب اور رضا لائبریری، رامپور کے ڈائرکٹر شری امتیاز علی خاں عرشی کو حاصل ہوا۔

اس کے علاوہ دیگر ۹۴ انعامات کی رقم ۲۵۰۰ روپیہ تا ۵۰۰ روپیہ کے درمیان ہے۔ اس سلسلے میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ اردو اکاڈمی کے انعام یافتگان کو ریاستی حکومت کے انعامات نہیں دیئے جائیں گے۔

⁂ ⁂ ⁂

بلند کرنے کے لیے ۷۵۰۰۰ روپیہ کی غیر متواتر مالی امداد منظور کی ہے۔ اس سلسلے میں کرائسٹ چرچ کالج، کانپور، سینٹ جانس کالج، آگرہ، اچاریہ نریندر دیو مہاپالیکا مہیلا ودیالیہ کانپور، لاریٹو کانونیٹ گرلس ڈگری کالج، لکھنؤ اور آئی۔ ٹی کالج، لکھنؤ کو دس دس ہزار روپیہ اور آر بی۔ ایس کالج، آگرہ، بی۔ این۔ ایس ڈی کالج، کانپور، ہندو کنیا مہاودیالیہ سیتاپور، بی ڈی کنیا مہاودیالیہ، آگرہ اور کے آر گرلس کالج متھرا کو پانچ پانچ ہزار روپیہ دیے جائیں گے۔

سروجنی نائیڈو کو خراج عقیدت: گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں اور وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے منعقدہ ایک سادہ تقریب میں آزادی کے بعد اتر پردیش کی پہلی گورنر آنجہانی شریمتی سروجنی نائیڈو کی ۲۵ ویں برسی کے موقع پر ان کے مجسمہ کو ہار پہنائے۔

اس تقریب میں، جس میں گیتا، قرآن، اور گرو گرنتھ صاحب کے اقتباس پڑھے گئے شریمتی نائیڈو کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ ناری نکیتن کی طالبات نے اس موقع پر بھجن اور رام دھن کا ایک پروگرام پیش کیا۔

اسکول بسوں کیلیے ۲۲۰۰۰ روپیہ منظور: حکومت اتر پردیش نے لڑکیوں کے سات امداد یافتہ ہائر سکنڈری اسکولوں کو ۲۳۰۰۰ روپیہ کی مکرر مالی امداد منظور کی ہے۔ جو طالبات کو سستی شرح پر آمد و رفت کی سہولت مہیا کرنے کے پیش نظر اسکول بسوں کی خریداری کے لیے استعمال کی جائے گی۔

جن اسکولوں کو اس امداد کے لیے منتخب کیا گیا ہے ان کے نام یہ ہیں: شریمتی کنیا پرشن انٹر کالج اور راما کنیا انٹر کالج آگرہ، گیان بھارتی بالیکا انٹر کالج، کانپور، تارا مہیلا انٹر کالج، بہرائچ، آریہ کنیا انٹر کالج اوریٔ، جنتا گرلس انٹر کالج اور کستوربا بالیکا ودیالیہ، لکھنؤ۔ اول الذکر دو اداروں کو ۳۰-۳۰ ہزار روپیہ اور بقیہ پانچ اداروں کو ۳۴-۳۴ ہزار دیئے جائیں گے۔

پری سکنڈری اسکولوں کے لیے مالی امداد: ریاستی حکومت نے چوتھے پنج سالہ منصوبہ کے تحت ۱۹۷۳-۷۴ء کے دوران مالی امداد کی فہرست میں شامل کیے جانے والے ۹۰ پری سکنڈری اسکولوں کو ۱۹۸۰۰۰ روپیہ کی خصوصی مالی امداد منظور کی ہے۔ یہ امداد ۲۲۰۰ روپیہ فی اسکول کی شرح سے دی گئی ہے۔

مذکورہ بالا ۹۰ پری سکنڈری اسکولوں میں ۶۸ لڑکوں کے اور ۲۲ لڑکیوں کے اسکول شامل ہیں۔

الٰہ آباد میں تعمیر مکانات کے لیے دس لاکھ روپیہ منظور: ریاستی حکومت نے الٰہ آباد میں گوند پور ہاؤسنگ اسکیم کے تحت زمین کے حصول اور اس کی ترقی کے مقصد کے پیش نظر نگر مہاپالیکا الٰہ آباد کو دس لاکھ روپیہ کا قرضہ منظور کیا ہے۔ یہ قرضہ ۲۵ لاکھ سالانہ قسطوں میں واجب الادا ہوگا اور اس پر آٹھ فی صد سالانہ کی شرح سے سود

متفرقات

پرائیوٹ ڈگری کالجوں کو مالی امداد: حکومت اتر پردیش نے ریاست کے کچھ پرائیوٹ ڈگری کالجوں اور انڈر گریجویٹ کالجوں کا معیار

وصول کیا جائے گا۔ اس اسکیم کے تحت ۲۵ فیصد ترقی یافتہ قطعات آراضی سرکاری ہاؤسنگ سوسائیٹیوں کے لیے محفوظ کر دیئے جائیں گے۔

کانسٹبل کو شاندار بہادری کے لیے انعام :۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے دہرہ دون کے ایک پولیس کانسٹبل شری ذیشان رحمان کو بدنام مجرموں کے ایک گروہ سے مڈبھیڑ کے دوران مثالی بہادری کا مظاہرہ کرنے پر ۲۵۰ روپیہ کا نقد انعام دیا ہے۔ شری رحمان نے بندوق کی گولی سے اپنے سینہ پر زخم کھانے کے باوجود اپنی جان خطرہ میں ڈال کر گروہ کے دو ممبروں کو گرفتار کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ پولیس انسپکٹر جنرل نے زخمی کانسٹبل کے علاج کے لیے مزید ۲۰۰ روپیہ کی رقم بھی منظور کی ہے۔

ضلع امن کمیٹیوں کا نام تبدیل :۔ ضلع کمیٹیوں کا نام تبدیل کر کے اب ضلع یکجہتی کمیٹی رکھدیا گیا ہے۔ نام میں یہ تبدیلی ریاستی یکجہتی کونسل کے لکھنؤ میں منعقدہ ایک جلسہ کے فیصلہ کی روشنی میں کی گئی ہے۔

ریاستی حکومت نے مذکورہ کمیٹیوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے پیش نظر تمام ضلع مجسٹریٹوں کے نام جاری کیے گئے ایک گشتی خط میں ہدایت کی ہے کہ وہ ہر ماہ ضلع یکجہتی کمیٹی کا ایک جلسہ طلب کیا کریں۔ یہ کمیٹی تحریبی تحریکوں کو درپیش مسائل کی جانب خصوصی توجہ دے گی۔

گونڈہ میں آبپاشی کی مزید سہولت۔ گونڈہ کے آبپاشی ڈویزن نے گزشتہ برسوں کے مقابلہ میں امسال تقریباً ڈیڑھ گنا رقبہ کو آبپاشی کی سہولت مہیا کی۔

مذکورہ ڈویزن کے گونڈہ اور بہرائچ اضلاع میں گذشتہ فروری کے تیسرے ہفتہ کے آخر تک تعمیر شدہ مختلف بندھیوں کے ذریعہ ۷۰۵۰ ہیکٹر (۱۷۴۱۵ ایکڑ) رقبہ کی آبپاشی کی گئی۔ اسی ڈویزن میں گذشتہ برسوں میں زیادہ سے زیادہ ۵۳۰۰ ہیکٹر (۱۳۱۷۷ ایکڑ) رقبہ کی آبپاشی کی گئی تھی۔

ریاست میں طلبا کو فیس میں چھوٹ۔ حکومت اتر پردیش نے ریاست کے سیلاب اور خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کے طلبا کی فیس میں چھوٹ دینے کے واسطے ۱۱ لاکھ روپیہ منظور کیا ہے۔ اس رقم میں سے ضلع اعظم گڈھ کو پانچ لاکھ روپیہ ضلع بستی کو تین لاکھ روپیہ اور ضلع بلیا کو تین لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔

★

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

عطرِ گل

شاعر خضر برنی سال اشاعت، جولائی ۱۹۷۱ء
قیمت: پانچ روپے، ضخامت: ۱۷۶ صفحات۔
مطبع: جمال پرنٹنگ پریس، دہلی

جناب خضر برنی اردو کے کہنہ مشق شاعروں میں سے ہیں اور غزل و نظم دونوں میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ غزلوں میں قدیم طرزِ غزل گوئی کے ساتھ موجودہ دور کے ادبی تقاضوں کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں سے الگ ہو کر کچھ ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو حقیقی معنوں میں فن کار کا مقصدِ حیات ہوتی ہیں۔ اس لیے خضر برنی کے کلام میں جوتِ آگہی بھی ہے اور خوفِ بیخودی بھی۔ وہ ایک ایسے ناکام تمنا ہیں جہاں خود منزلِ مقصود راہِ فرار اختیار کرتی ہے۔ اس کے باوصف انھوں نے آئینِ حیات میں زمانے کی تفسیر کچھ اس انداز سے پیش کی ہے جس سے فرازِ عشق اور حسن کی ہمہ گیری کا راز عیاں ہو جاتا ہے۔

نظموں میں خضر برنی نے توازن اور اعتدال قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مجموعۂ کلام کی نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں جہاں منظر نگاری، شدتِ جذبات اور حسنِ ترتیب کا ایک اچھا نمونہ ملتا ہے وہیں حب الوطنی کے تابناک نقوش بھی انگڑائیاں لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غزلوں اور نظموں دونوں کے مطالعے کے بعد جناب میر قاسم دریا اعلیٰ جیوں وکشمیر کی مندرجہ ذیل رائے سے اتفاق کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا ہے

"جناب خضر برنی کا دم اردو کے لیے غنیمت ہے کیونکہ آپ ان معدودے چند بزرگ شعرا میں سے ہیں جو زندگی اور ادب کا آپسی رشتہ تسلیم کرتے ہوئے صحت مند اور قوم پرور روایتوں اور قدروں کی آبیاری کرتے آئے ہیں۔"

کتابت اور طباعت پر اگر کچھ اور توجہ کی گئی ہوتی تو اچھا تھا۔

—— ڈاکٹر فضل امام

ستاروں سے بھی کچھ آگے

مصنفہ لیلیٰ لکھنوی
ناشر اقبال پبلکیشنز نمبر ۲۴، کاتانہ دکیہ گولہ گنج لکھنؤ۔ سال اشاعت، ستمبر ۱۹۷۳ء قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے
ضخامت، ۱۶۰ صفحات

موجودہ دور میں افسانے کے فن نے بہت تیزی سے ترقی کی ہے۔ اس لیے چاہے انڈگر ایلن پو ہوں یا ملس سیری، کسی کی بھی افسانے کے متعلق تعریف جامع اور مانع نہیں کہی جا سکتی ہے کیونکہ مختصر افسانہ بذاتِ خود ایک فکری داستان ہے جس میں کسی ایک خاص واقعے، مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں کرداروں کے ذریعے روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس میں پلاٹ اور بیاں اس قدر گٹھا ہوا اور منظم ہونا چاہیے کہ وہ تاثر پیدا کرنے کے قابل ہو جائے۔

مندرجہ بالا تاثرات کی روشنی میں لیلیٰ لکھنوی کی افسانہ نگاری آج کی نہیں بلکہ ماضی کی معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ اسے موجودہ ادبی رجحانات کے تقاضے سے ہم آہنگ کر دیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ اس سے قبل "تارے ہنستے رہے" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ دونوں کے تقابلی مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اب ان کے فن میں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ وہ ایک مخصوص قسم کی افسانہ نگاری میں یقین رکھتی ہیں اور اس سے آگے وہ قدم نہیں بڑھانا چاہتی ہیں۔ ان کے رومان پرور افسانوں میں ہماری تہذیب و معاشرت کی زندہ تصویریں ملتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اردو والے لفظ "رومان" کو استعمال کرتے ہوئے اس کی وسعتوں کو بھول جاتے ہیں اور ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے بھی ہم لوگ اس لفظ کے حقیقی وسعتوں سے ابھی تک بے خبر ہیں۔

خوشی ہے کہ لیلیٰ لکھنوی نے رومان کی "مثالی محبت" کا ایک نکھرا ہوا روپ اسے اس افسانوی مجموعے کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ ان افسانوں میں جہاں خود سپردگی ہے وہیں [illegible] ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو میں زبان پروری فرانس اور ترکی کی دین ہے [illegible] اس کی مثالی محبت "نے اور چار چاند لگا دیے ہیں اور ان سب کے امتزاج نے معاشی محبت کے لیے راہیں ہموار کر دی ہیں جس کا خاکہ لیلیٰ لکھنوی کے اس افسانوی مجموعے میں دیکھا جا سکتا ہے اور ان کے قلم سے اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے۔ قدیم طرزِ املا سے احتراز کیا جاتا تو بہتر تھا۔

—— ڈاکٹر فضل امام

ایک ادبی حماقت (طنز و مزاح)

مصنف ضیا حسنی ضخامت ۱۱۲ صفحات
ناشر ادبی سنگم - ۱۵۵/۱۰۵ - چمن گنج - کانپور۔

ضیا حسنی اپنے ادبی مضامین اور کہانیوں کی بدولت دنیائے ادب میں پہلے ہی سے روشناس ہو چکے ہیں۔ اب ان کے چودہ دلچسپ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "ایک ادبی حماقت" منظرِ عام پر آیا ہے۔

یوں تو زیرِ نظر مجموعے کے سبھی مضامین لائقِ مطالعہ ہیں لیکن "مچھلی کا شکار" "ایک تصویر" "بیگم" "آئی فلو" "مرتت صاحب" "گرانی" اور "گھی کی جستجو" میں ضیا حسنی کی رواں اور سلیس عبارت کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں اور جاندار و دلچسپ فقرے لطف دے جاتے ہیں۔ یہ مضامین آج کی زندگی کی الجھنوں کو نہ صرف اجاگر کرتے ہیں بلکہ یہ ایسا آئینہ بھی بن جاتے ہیں جس میں سماج کے کربناک پہلو صاف دکھائی دیتے ہیں۔ طنز و مزاح کے ذریعہ سماج کی دکھتی رگ پر انگلی رکھنے میں ضیا حسنی کامیاب نظر آتے ہیں۔

"اردو رسم الخط میں لکھنا ہو یا مچھلی کا شکار دونوں توکل علی اللہ کا درس دیتے ہیں۔" —— "مچھلی کا شکار"

ذرا سی بات کہہ کر طنز نگار نے کیسی کاری ضرب لگائی ہے، کس خوبی سے ایک حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے۔ اردو قارئین کی قوتِ خرید جس نہج پر آ گئی ہے اس کی وضاحت بھی دادطلب ہے۔

"درحقیقت ذرا سی بات ہے جسے لوگوں نے افسانہ بنا دیا۔ معاملہ یہ ہے کہ کچھ ضروری چیزوں کے نرخ بڑھ گئے ہیں اسی کا نام گرانی رکھا گیا ہے۔ اور اسی کو آلۂ کار بنا کے قیامت برپا کی جا رہی ہے۔" "گرانی"

ان مختصر مثالوں سے ضیا حسنی کے دلکش اسلوب کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔ ضیا حسنی نے اپنے مضامین میں انگریزی الفاظ فیاضانہ استعمال کیے ہیں جو کہیں کہیں نامناسب معلوم ہوتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی زیرِ نظر مجموعہ اس میدان میں ضیا حسنی کے اچھے مستقبل کی نشاندہی کرتا ہو۔ سرورق دلکش و دیدہ زیب ہے۔ کتابت و چھپائی اچھی ہے۔

—— قمر صدیقی





۵۰ پیسے

ن ۱۹۷۴ء

اس شمارے میں

سید مسعود حسن رضوی ادیب، سید حامد، اختر بستوی، بدیع الزماں اعظمی، پیام گورکھپوری، قمر جہاں، دیریندر پرشاد سکسینہ سالک لکھنوی، شباب للت، ماہر حیدرآبادی، محوی صدیقی باداکرشن گوپال مغموم، ظفر صہبائی، چندر پرکاش جوہر بجنوری قمر صدیقی وغیرہ وغیرہ

ماہنامہ

نیا دور

لکھنؤ

جلد ۳۰ | نمبر ۳

جون ۱۹۷۴ء

ایڈیٹر خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر امیر احمد صدیقی

★

ناشر ستیہ پرکاش بھٹناگر
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری یوپی
مطبوعہ گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اترپردیش

قیمت فی شمارہ ۔ پچاس پیسے
زر سالانہ ۔ پانچ روپے
ترسیل زر کا پتہ سپرنٹنڈنٹ انفارمیشن (سی) ڈپارٹمنٹ۔ یوپی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری۔ ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

اُردو کے ممتاز ادیب، نقاد اور شاعر جناب علی جواد زیدی صاحب کو جنگ آزادی کے سلسلے میں ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت ہند کی جانب سے تامر پتر دیا گیا ہے۔ یہ تامر پتر زیدی صاحب کو وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے لکھنؤ میں ۳ جون کو ایک سادہ اور پُر وقار تقریب میں عطا کیا۔ زیدی صاحب طالب علمی کے ابتدائی زمانے ہی سے سیاسیات کی طرف مائل تھے۔ محمود آباد ضلع سیتاپور سے ہائی اسکول کرنے کے بعد جب وہ جوبلی کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے تو آزادی کی تحریکیں پورے شباب پر تھیں۔ یہی زمانہ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام کا تھا چنانچہ آپ فیڈریشن میں شامل ہو گئے اور بہت جلد اس کے قائدین میں ان کا شمار ہونے لگا۔ فیڈریشن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے زیدی صاحب نے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا۔ ان دوروں میں آپنے انگریزی سامراج کے خلاف جو تقریریں کیں ان کے باعث حکومت وقت برافروختہ ہوگئی اور انھیں گرفتار کرنے اور سزا دینے کے لیے موقع کا انتظار کرنے لگی۔ اتفاق سے سر مارس گائر جو علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور اپنی سامراج پرستی اور طلبا دشمنی کے لیے مشہور تھے لکھنؤ آئے اور یونیورسٹی کے طلبا کو خطاب کرنا چاہتے تھے۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے سر مارس کی آمد کے موقع پر ایک زبردست جلسہ کیا جس میں زیدی صاحب نے انگریزی سامراج اور دوسری جنگ عظیم کے دوران جنگی مساعی میں ہندستان کی شمولیت کے خلاف ایک نہایت پر جوش تقریر کی۔ طلبا میں اس قدر جوش و خروش تھا کہ مارس گائر تقریر نہ کر سکے اور انھیں ناکام واپس جانا پڑا۔ زیدی صاحب کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری ہوا۔ اسی زمانے میں ناگپور میں فیڈریشن کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا۔ معاملہ سخت تھا لیکن پولیس کی نظر بچا کر زیدی صاحب ناگپور پہنچ گئے۔ وہیں انھیں گرفتار کر لیا گیا لکھنؤ لاکر جیل میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور ڈی آئی آر میں ۷ جنوری ۱۹۴۱ء کو چھ ماہ کی سزا ہوئی۔

سیاسیات سے دلچسپی تو زیدی صاحب کو طالب علمی کے زمانے سے پیدا ہوئی لیکن لکھنے پڑھنے اور شاعری کا ذوق و شوق تو بچپن ہی سے ہے۔ اس وقت زیدی صاحب کا شمار ملک کے نامور ادیبوں، شاعروں اور نقادوں میں ہوتا ہے۔ آپ کی تنقیدی بصیرت اور بے لاگ اظہار رائے کے سبھی قائل ہیں قلم میں روانی اور شگفتگی ہے۔ وہ گو ہونے کے ساتھ ساتھ زیدی صاحب زود نویس بھی ہیں۔ سرکاری فرائض منصبی کبھی ان کی تصنیف و تالیف اور شعر گوئی میں حائل نہیں رہے جس کا ثبوت ان کی ایک درجن سے زیادہ تصانیف ہیں جو اب تک شائع ہو چکی ہیں اور کچھ زیر طباعت ہیں۔

ہم زیدی صاحب کو اس قومی اعزاز پر پُر خلوص مبارک باد پیش کرتے ہیں اس شمارے میں اس موقع کی تصویر بھی شائع کی جا رہی ہے جب وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے زیدی صاحب کو تامر پتر پیش کیا۔

سانحے

ادھر تھوڑے سے عرصے کے اندر پے در پے سانحوں نے نہ صرف دنیائے ادب بلکہ دنیائے طب و صحافت کی کچھ نامور ہستیاں ہم سے جدا کر دی ہیں جن کی جگہ شاید عرصۂ دراز تک پُر نہ ہو سکے۔ ان میں ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی، پروفیسر شیو ناتھ پرشاد اور شری درگا داس خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر فریدی ۔ ملک کے ایک نامور معالج اور ماہر امراض سینہ ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی اپنے مطب لکھنؤ میں ۱۹ مئی کو تقریباً ۱۱ بجے دن میں وفات پا گئے۔ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا جلد پُر ہونا آسان نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک ممتاز معالج ہونے کے ساتھ ساتھ ایک معروف سیاستداں اور ایک بہت ہی اچھے انسان بھی تھے۔ ان کی شرافت، تہذیب و شائستگی اور دردمندی نے انھیں ہر دلعزیز اور مقبول بنا دیا تھا۔ وہ لوگ بھی جو ان سے سیاسی اختلاف رکھتے تھے ان کے خلوص و ایثار کے معترف تھے۔ اسی خلوص اور بے غرضی نے انھیں اپنے سیاسی نظریات میں اٹل اور بے باکی کے ساتھ اپنی بات کہہ دینے کا خوگر بنا دیا تھا۔ انسانیت دوستی، اخلاق، مروت اور شیریں گفتاری ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ انھوں نے کبھی اپنے پیشہ کو دولت کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ بے لوث اور بے لوث خدمت خلق ان کا شعار اور "با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا" ان کا عمل رہا۔ اپنے ان اوصاف کے باعث ڈاکٹر فریدی ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ماہنامہ نیا دور کو اس کے صوری و معنوی معیار کی بنا پر بہت پسند کرتے اور ہمیشہ دلچسپی کے ساتھ پڑھتے تھے۔

پروفیسر شیو ناتھ پرشاد ۔ اردو کے اچھے شاعر، صاحب طرز ادیب، عربی اور فارسی کے ممتاز عالم، مقرر اور مجاہد آزادی پروفیسر شیو ناتھ کا ۱۸ مئی کو بنارس میں انتقال ہو گیا۔ اردو کے شیدائی شیو ناتھ پرشاد جی اردو تحریک کے ایک بڑے علمبردار بھی تھے۔ وفات کے وقت پروفیسر شیو ناتھ ریاستی انجمن ترقی اردو کے صدر تھے۔ اردو زبان خصوصاً اردو شاعری سے انھیں جو عشق تھا اسی کے باعث وہ آخر وقت تک اردو کی بقا و ترقی کے لیے عملاً سرگرم رہے۔ جد وجہد آزادی کے سلسلے میں پروفیسر صاحب کی خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجاہد آزادی کے ساتھ ساتھ آپ کو مجاہد اردو کہنا یقیناً حق بجانب ہوگا۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

شری درگا داس ۔ ملک کے نامور بزرگ صحافی شری درگا داس کا انتقال دنیائے صحافت کے لیے ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی آسان نظر نہیں آتی۔ اسوشی ایٹڈ پریس آف انڈیا اور اسٹیٹسمین کے خصوصی نامہ نگار، ہندستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کی صحافتی خدمات ہمیشہ تابندہ رہیں گی۔ ان کی کتاب ... کرزن سے نہرو تک اور دس جلدوں میں سردار پٹیل کی خط و کتابت کی ترتیب نیز صحافت کی ترقی کے لیے درگا رتن ایوارڈ کا قیام ان کے وہ دستکار کارنامے ہیں جو ان کو زندہ رکھیں گے۔

——— ایڈیٹر

غزل

سالک لکھنوی

بہ پاسِ گلشنِ آزار کیا کیا
گلِ رنگیں بنے افکار کیا کیا

ترے سائے میں چشمِ یار کیا کیا
نظر آئے ہیں دل افگار کیا کیا

ہوئے معلوم ہر نقشِ قدم سے
رموزِ شوخیٔ رفتار کیا کیا

نہ تھے جب تک نظر کے سامنے تم
تھا لطفِ منظرِ دیدار کیا کیا

تہی ظرفی پہ تیری چشمِ ساقی
سبکسی ہے فطرتِ خوددار کیا کیا

بہ فیضِ ذوقِ سجدہ دیر و کعبہ
ملے ہیں آستانِ یار کیا کیا

تری نظروں کی جب شہ پا گئے ہم
کھلے ہیں پھر لبِ اظہار کیا کیا

اُن آنکھوں سے جنھیں چھیڑا تھا تم نے
اٹھے ہیں ابرِ گوہر بار کیا کیا

تھے ہم جب تک خریدارِ تمنّا
رہی ہے گرمیٔ بازار کیا کیا

ترے قدموں سے اے سالکؔ اُڑی ہر
یہ خاکِ کوچۂ دلدار کیا کیا

نانک چند لکھنوی

ایک حیرت انگیز شخصیت

مسعود حسن رضوی ادیب

اردو کے ان پڑھ شاعر لالہ نانک چند کھتری متخلّص بہ نانک اردو کے حرف شناس بھی نہیں تھے۔ دیوناگری رسمِ خط سے بھی واقف نہ تھے۔ اپنا اردو کلام مرتبا جہاجنی میں لکھتے تھے۔ ان کا دیوان غزلیات مطلعٔ خورشید کے نام سے سلیمانی پریس بنارس میں ۱۹۲۵ء (۱۳۴۳ھ) میں شائع ہوا جو تخمیناً دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے سرورق پر نانک کے نام کے ساتھ "شاگرد خدائے سخن حضرت رشید مرحوم لکھنوی" لکھا گیا ہے۔ ان کی مسدس رامائن نو حصّوں میں تھی، جس کے صرف تین حصے 'مطلعِ نور یعنی فروغ اودھ'، 'ویرانی اودھ' اور 'خوش نصیب چترکوٹ'، ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئے۔ مطبع کا نام سرورق پر نہیں ہے۔ یہ دونوں کتابیں میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ نانک مرثیے بھی کہتے اور پڑھتے تھے۔ میرے ذخیرۂ مراثی میں ان کے دو مرثیے بھی موجود ہیں جو مطبع سیّدی حیدر آباد دکن میں ۱۳۴۴ھ میں چھپے تھے۔ ایک ۸۴ بند کا مرثیہ بریر ہمدانی کے حال میں ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

وصفِ مدحتِ شبیر کا جرّار ہوں میں

دوسرا ۹۲ بند کا مرثیہ زہیر ابنِ قین کے حال میں ہے جس کا مطلع یہ ہے

طبعِ موزوں ہے مری موجۂ دریائے سخن

پہلے مرثیے کے ساتھ نانک کے دو سلام اور چار رباعیاں اور دوسرے مرثیے کے ساتھ چھ رباعیاں بھی چھاپی گئی ہیں۔

مدّت ہوئی میں نے نانک کے حالاتِ زندگی انھیں سے پوچھ کے لکھ لیے تھے جو اب من و عن شائع کیے جا رہے ہیں۔

"لکھنؤ چوک محلہ بہورن ٹولہ میں پیدائش ہوئی سمت ۱۹۴۹ بکرمی ماہ جیٹھ بدی چودس یعنی سمت ۱۹۴۹ بکرمی کے ختم ہونے سے ایک دن قبل پچھلی رات کو۔ اب چونتیسواں (۳۴) سال شروع ہے۔

والد کا نام راجہ رام تھا جو خود اور ان کے آبا و اجداد بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ ان کی شادی لکھنؤ میں محلہ مذکور میں ہوئی تھی۔ کچھ دن بعد انھوں نے مستقل سکونت لکھنؤ میں اختیار کر لی۔ ان کی چکن کی دکان برابر میں دکٹوریہ اسٹریٹ پر تھی۔

نانک نے خود چکن کی دکان والد کی زندگی میں پارچے والی گلی میں کوئی بارہ (۱۲) تیرہ (۱۳) برس کے سن میں کھولی جو تقریباً تین سال تک قائم رہ کر کچھ باہمی نزاع کی وجہ سے اٹھ گئی۔ سال بھر کے بعد پھر دکان رکھی جو کوئی تین برس قائم رہی۔ آخر باہمی نزاع کی بنا پر دکان اٹھا ڈالی۔

کوئی بارہ برس کے سن سے ہندی میں تُک بندی شروع کر دی تھی۔ مختلف چیزوں اور واقعات پر نظمیں لکھا کرتے تھے۔ ان نظموں کو ۱۹۰۸ء سے چھوٹی چھوٹی کتابوں کی شکل میں چھاپ کر گا گا کر شہر بشہر بیچتے پھرتے تھے۔ ان کی قیمت ایک پیسہ ہوتی تھی۔ ہر خاص موقع پر اس کی مناسبت سے نظم کہہ کر بیچتے تھے۔ مثلاً آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں کا مناظرہ، دیویوں دیوتاؤں کی تعریف، شراب، جوا، عیاشی وغیرہ کی مذمت، گیت، بارہ ماسے، الکشن، دہلی بازار، نان کو آپریشن وغیرہ۔ ولایت میں جارج پنجم کی تخت نشینی کے دن اپنی مطبوعہ نظمیں کلکتہ میں ستانوے (۹۷) روپے کی بیچیں۔ ان نظموں میں بعض بعض گورنمنٹ کے خلاف تھیں، اسی وجہ سے ایک مرتبہ لکھنؤ کے پیارہ اخبار کی ایک اردو نظم پر کچھ باز پرس

ہوئی۔ دوسری مرتبہ کلکتے میں ایک نظم "مہاتما گاندھی کی گرفتاری پر افسوس" بھی اور بیچی۔ یہ بھی تک بندی ہی تھی۔ اس پر چالان ہو گیا اور کئی ہفتوں کے بعد رہائی ہوئی۔ یہ واقعہ جلیانوالہ باغ کے واقعہ کے زمانے میں شاید ۱۹۱۹ء میں پیش آیا۔

یہ تک بندی والی کتابیں تین چار سو کی تعداد میں چھپیں اور بکیں۔ زیادہ تر ہندی میں اور کچھ اردو میں۔ تک بندی کا سلسلہ واقعۂ مذکورۂ بالا تک ۱۹۱۹ء) جاری رہا۔ بعض نظمیں بنگلہ، گجراتی، گورمکھی حرفوں میں بھی چھپی تھیں۔

خواجہ عبد الغنی غنیؔ شاگرد اسیرؔ، ہادی حسین شاگرد باقر صاحب حمیدؔ نانک کی دکان کے سامنے ان دونوں کی دکانیں تھیں۔ بعد کو دکانیں دونوں نے اٹھا دیں۔ ہادی حسین کا چکن کا بہت بڑا کارخانہ مفتی گنج میں اب بھی ہے۔ یہ دونوں آدمی ابھی زندہ ہیں۔ انھوں نے نانک کی تک بندی سن کر انھیں اردو غزل کہنے کا شوق دلایا۔ ان دونوں کے علاوہ تین دکاندار بھی شاعر تھے۔ یہ لوگ فرصت کے وقت جمع ہو کر شعر و شاعری کا چرچا کرتے رہتے تھے۔ نانک نے کوئی انیس برس کے سن میں غزل کہنا شروع کیا اور غنیؔ سے اصلاح لینے لگے۔ منشی اصغر حسین اصغرؔ شاگرد پیارے صاحب رشیدؔ غنیؔ کے پاس اکثر آیا کرتے تھے۔ ایک دن غنیؔ نے ان سے کہا کہ میں نے ایک غزل کہی ہے، مگر مطلع کسی طرح نہیں ہوتا۔ اصغرؔ نے فوراً مطلع کہہ دیا۔ ادھر اس واقعے نے اصغرؔ کو نانک کی نظر میں بہت بڑا شاعر ثابت کیا۔ ادھر غنیؔ نے نانک کا تعارف اصغرؔ سے کروا دیا اور اپنی عدیم الفرصتی کی بنا پر ان کے کلام کی اصلاح بھی اصغرؔ کے متعلق کر دی۔ غنیؔ کی شاگردی صرف چند ماہ رہی۔ اس زمانے میں نانک کے شعر ایسے ہوتے تھے کہ ایک مصرعہ اپنی بحر کا ہے تو دوسرا کسی دوسری بحر کا۔ اصغر صاحب نے طبیعت میں موزونی پیدا کرنے کے لیے یہ تدبیر بتائی کہ تم لوگوں کے دیوانوں سے غزلیں پڑھوا کر سنا کرو اور انھیں زبانی یاد کرنے کی کوشش کرو۔ نانک نے غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، امیرؔ، تعشقؔ وغیرہ کی غزلیں ایک ہزار سے زیادہ یاد کیں۔ پورے پورے دیوان یاد کر ڈالے تھے۔ مگر بعد کو استاد کے حکم سے انھیں بالکل بھلا دیا تاکہ دوسروں کے کہے ہوئے مضامین سے توارد نہ ہونے پائے۔ اب نانک کے حافظے میں زیادہ تر صرف اپنا ذاتی کلام محفوظ ہے۔ دوسروں کی غزلیں مشاعروں میں سن کر یاد کر لیتے ہیں، مگر وہ بہت جلد ذہن سے اتر جاتی ہیں۔ آٹھ مہینے تک دیوان یاد کرنے اور غزلیں کہنے کا مشغلہ جاری رہا۔ استاد صرف دوسروں کی یاد کی ہوئی غزلیں سن لیا کرتے تھے۔ ان کے کلام پر اصلاح نہ دیتے تھے۔

آٹھ مہینے کے بعد نواب نبن صاحب رازؔ کے یہاں وکٹوریہ گنج میں مشاعرہ ہوا۔ طرح یہ تھی 'بعد مرنے کے حسینوں میں مرا ماتم ہوا'۔ نانک نے غزل کہی اور اصغرؔ سے اصلاح لے کر اسے مشاعرے میں پڑھا۔ بہت تعریف ہوئی۔ یہ شعر بہت پسند کیا گیا

ہوں وہ مے کش بعد مردن بھی اثر ہے خاک میں
جو بنا ساغر مری گل کا وہ جام جم ہوا

اس کے چار دن بعد سندیلے میں منشی التفات رسول صاحب کے یہاں کا مشہور سالانہ مشاعرہ ہوا۔ طرح یہ تھی: 'یہ بدر وہ ہے کہ گھٹ کے ہلال ہوتا ہے'، وہاں بھی نانک نے غزل پڑھی۔ کچھ بہت تعریف نہیں ہوئی۔ وہ غزل بھی بہت اچھی نہ تھی۔ چنانچہ نانک نے اسے اپنے دیوان میں شامل نہیں کیا۔ اس کے بعد برابر قریب قریب روزانہ غزل کہنے کی مشق کرتے رہے اور مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ اُن دنوں لکھنؤ میں مشاعروں کی یہ کثرت تھی کہ ہر ہفتے میں ایک دو مشاعرے ہو جاتے تھے۔ نانک صرف مشاعروں کی غزلوں پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ اصغرؔ سے کوئی تین برس اصلاح لی۔ اس کے بعد نانک نے خود مشاعرہ کیا۔ طرح یہ تھی 'نظر کو دیکھنے والے نظر کو دیکھتے ہیں'۔ اس غزل کے لیے کئی سو شعر کہے اور ۵۷ شعر منتخب کر کے استاد کے پاس لے گئے۔ انھوں نے ان میں سے صرف ۲۵ شعر انتخاب کیے اور نانک کو اپنے استاد جناب رشیدؔ کے پاس لے جا کر ان کا شاگرد کروا دیا۔ انھوں نے ۲۵ شعر پسند کیے اور اصلاح دی۔

نانک نے پھر ہر مہینے میں دو مشاعرے کرنا شروع کیے، ایک طرحی اور ایک غیر طرحی۔ یہ سلسلہ دو تین برس جاری رہا۔ اس کے بعد رشیدؔ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ نانک نے ان کی تاریخ وفات کہی 'ہے ورد زبان لکھ رشید آہ رشید'۔ رشیدؔ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی باقر صاحب حمیدؔ سے کوئی سال بھر اصلاح لی۔ چھ سات برس کسی سے اصلاح نہیں لی۔ اس کے بعد چند غزلیں کاظم حسین محشرؔ

کو دکھائیں۔

رتی صاحب کی زندگی میں مرثیے کے صرف ۱۵ بند اور دو سلام کہے تھے۔ مگر یہ سلسلہ جاری نہیں رہا۔ ان کے انتقال کے کوئی سال بھر بعد پہلا مکمل مرثیہ کہا۔ بعض حریفوں کی طعنہ زنی کے جواب میں کہا کہ غزل کیا چیز ہے میں مرثیہ کہہ سکتا ہوں۔ چنانچہ مرثیے کے لیے بربرہمدانی کی روایت ناصر حسین صاحب قبلہ نے لکھ دی۔ اسی کو نانک نے نظم کر کے ۸ ربیع الاول ۱۳۲۶ھ کو پہلی مجلس اکرام اللہ خاں کے امام باڑے میں پڑھی۔ مجمع کی یہ حالت تھی کہ لوگ کہتے تھے کہ شاید انیس کو اتنی بڑی مجلس پڑھنے کا اتفاق ہوا ہو تو ہوا ہو۔ اس مرثیے پر کسی سے اصلاح نہیں لی تھی۔ اسی سال ۲۸ رجب کو سید تقی صاحب کے امام باڑے میں دوسری مجلس میں نیا مرثیہ زہیر قین کے حال میں پڑھا۔ روایت بھی ناصر حسین صاحب قبلہ سے لی۔ اس کے بعد کوئی چار سال تک ان دونوں تاریخوں پر نیا مرثیہ پڑھتے رہے۔ پہلے مرثیے کے بعد مشہور ہوا کہ وہ مرثیہ رشید صاحب نے کہہ دیا تھا۔ دوسرے مرثیے کے بعد انوار حسین انوار شاگرد رشید نے کسی سے کہہ دیا کہ یہ دو مرثیے میں نے کہہ کے دیے ہیں۔ ان کے علاوہ کہیں تو معلوم ہو۔ اس لیے نانک نے اسی سال محرم کے ختم ہونے تک دو مرثیے اور کہہ کر پڑھے۔ انوار مرثیہ خود کہتے نہ تھے۔ اس لیے نانک نے کئی رباعیوں میں ان پر تعریض کی۔ لوگوں کو یقین نہ آتا تھا کہ تجارت پیشہ ہندو گھرانے کا ایک ان پڑھ فرد ایسے مرثیے کیونکر کہہ سکتا ہے۔ کئی جگہ نانک کا امتحان لیا گیا اور وہ ہر امتحان میں کامیاب ہوئے۔

لکھنؤ سے باہر پہلی مجلس کانپور میں محرم کی ۱۲ کو مرزا جعفر علی خاں اثر اگزیکیٹو آفیسر میونسپل بورڈ کے یہاں پڑھی۔ اس کے بعد سیتاپور، فتح پور (ضلع بارہ بنکی)، محمود آباد ضلع سیتاپور، بارہ بنکی، دہلی، امروہہ، جلیسر (ضلع ایٹہ) حیدر آباد دکن، پٹنہ، جونپور، الہ آباد، بنارس، فرخ آباد، پانی پت، انبالہ، آگرہ، مین پوری، جلالی ضلع علی گڑھ، جانسٹھ، میرٹھ، اصغر آباد، اٹاوہ، دہرہ دون، منصوری، نہٹور (ضلع بجنور) نگینہ (ضلع بجنور) بجنور، شاہجہاں پور، سندیلہ، بلند شہر، ساکنی (ضلع بلند شہر) وغیرہ میں مجلسیں پڑھیں۔

نانک کی عمر اس وقت چھتیس برس کی ہے۔ اب تک سترہ مرثیے کہہ چکے ہیں۔ پچاس ساٹھ سلام اور پچاس کے قریب رباعیاں ہو چکی ہیں۔ دو مرثیے چھپ چکے ہیں۔ دیوان کوئی دو سال ہوئے بنارس میں چھپا تھا۔

علمائے شیعہ کی صحبت سے اکثر مذہبی روایات، آیات و احادیث وغیرہ سے واقفیت ہو گئی ہے۔ مڑ با ہا جنی کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ مگر اس میں بہت مہارت رکھتے ہیں۔"

☆

غزلیں

محوی صدیقی لکھنوی

شباب کا وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا
کہ ہر حسین سے ہمیں عشق غائبانہ تھا

مری حیات کا حاصل وہی زمانہ تھا
یہ دل جب ان کی محبت کا آشیانہ تھا

غرورِ حسن کی انگڑائیاں خدا کی پناہ
مری زبان پہ کیوں عشق کا ترانہ تھا

حضورِ قلب پھر اس کا تصورِ رنگیں
بہشتِ ناز یہ اپنا نگار خانہ تھا

نہ لب پہ نغمۂ شیریں نہ شعرِ تر نہ شراب
وہ دن گئے کہ جب ان سب سے دوستانہ تھا

بڑھایا حوصلۂ ذوقِ سجدہ کیوں تو نے
سرِ نیاز اگر ننگِ آستانہ تھا

ہر ایک چیز پہ تھا کیفِ سرمدی طاری
جب ان کا حسن مرا عشق ہم فسانہ تھا

قفس کی آب و ہوا سے وہ بن گیا فریاد
زبانِ بلبلِ بیکس پہ جو ترانہ تھا

تجھے بھی یاد ہے اے دورِ گردشِ ایام
اسی چمن میں ہمارا بھی آشیانہ تھا

اسی کی قبر زیارت گہِ جہاں ہے آج
جو دل ستم کشِ ناقدریِ زمانہ تھا

سکونِ مرگ کو اک نعمتِ خدا سمجھو
کہ زندگی نہ تھی اک دکھ بھرا فسانہ تھا

تڑپ کے سینے سے باہر تھے دل جگر دونوں
نگاہِ ناز تھی یا کوئی تازیانہ تھا

ہمیں بھی یاد ہیں وہ دن کہ جن دنوں محوی
وہاں لبوں پہ تبسم یہاں ترانہ تھا

جون ۴، ۱۹ء

غلام مرتضیٰ راہی

ابھی بڑا ہوں تو اب پتھروں سے داب مجھے
نہ سوچ کیسے کیا تو نے دستیاب مجھے

سب ایک موڑ تک آئے مرے تعاقب میں
اور اس کے بعد سمجھنے لگے سراب مجھے

اتر چکا تھا میں گہرائی میں سمندر کی
کہاں سے کھینچ کے لے آئی سطحِ آب مجھے

عجیب نیند تھی جو آج تک نہیں ٹوٹی
دکھا گیا تھا کوئی اک حسین خواب مجھے

چمک دمک سے مری بند ہو گئی آنکھیں
دکھا گیا اسی عالم میں آفتاب مجھے

کوئی فرشتہ ابھی آسماں سے اترے گا
ملے گا اس کی طرف سے کوئی جواب مجھے

وہ میرے سامنے بت بن کے رہ گیا راہی
ذرا ملی تھی اسے دیکھنے کی تاب مجھے

جنیٹھ ۱۹۶۸ء اشک

(قطعات)

کشمیر کی جھلکیاں

—— بادا کرشن گوپال مغموم

۱

جھیل ڈل ہے کہ ایک آبی پری
جلوہ آرائے پہلوئے کہسار
اور اسکے دھڑکتے سینے پر
حسنِ عکسِ جمیل "چار چنار"

۲

ڈل کے ساکن، خموش پانی میں
چاندنی اس طرح نہاتی ہے
جیسے سیمیں بدن عروسِ نو
آئینہ دیکھ کر لجاتی ہے

۳

خیمۂ نور تان کر آیا
چاند کہسار سے اُتر آیا
ڈل پہ کرنوں کا رقص، کیا کہنا!
جلوۂ رازِ ازل نظر آیا

۴

"چشمہ شاہی" کا چشمۂ شیریں
دعوتِ آبِ سرد دیتا ہے
حسنِ بارہ دری، یہ منظرِ باغ
"واہ وا" کا خراج لیتا ہے

۵

اللہ اللہ کیفیت "باغِ نشاط"
پھول ہی پھول ہیں بہشت نظر
دامنِ کوہ • قربِ ڈل، یہ چنار
کہتے ہیں "آئیے گا بارِ دگر"

۶

لبِ مرطوب ڈل سے دور ذرا
ہم نے دیکھا ہے "باغِ شالامار"
آبجو، سبزہ، پھول، فوارے
مستقل ہے یہیں قیامِ بہار

۷

لبِ جھیلم غروب کا منظر
آگ سی لگ گئی ہے پانی میں
دیکھیے ان سبک "شکاروں" کو
بارشِ رنگِ ارغوانی میں

۸

شنکر آچاریہ کا یہ مندر
کس بلندی پہ آشکارا ہے
منظرِ برفِ کوہسارِ بلند
نظر افروز ہے دل آرا ہے

۹

پامپور میں یہ جلوۂ مہتاب
کاسنی رنگ زعفران کے پھول
نرم و نازک ہوں تتلیاں جیسے
یا زمیں پر ہوں آسمان کے پھول

۱۰

یہ پہلگام کی سہانی شام
سرِ کہسار ابرِ نیلی فام
یہ شجر، یہ حجر، یہ آبِ رواں
اور دوشیزگانِ گل اندام

۱۱

سرد و شفاف آبشاریں ہیں
پگھلی چاندی کہ جوئباریں ہیں
کتنی رنگین ہے "وادیِ لدر"
نظر افروز مرغزاریں ہیں

۱۲

واہ! گلمرگ کی فضائے لطیف
قلۂ کوہ کی ہوائے لطیف
دامنِ کوہ میں گھنے جنگل
دور جھرنوں کی اک نوائے لطیف

۱۳

غنچہ غنچہ چمن بداماں ہے
پتے پتے میں گیت لرزاں ہے
ذرے ذرے میں تابشِ اختر
ارضِ کشمیر باغِ رضواں ہے

۱۴

میٹھے چشمے ہیں اس کے دامن میں
پھول لاکھوں طرح کے گلشن میں
وادیِ برگ و بار ہے کشمیر
نوبہاریں ہیں اس کے آنگن میں

۱۵

"چشمۂ ویری ناگ" کی یہ فضا
نفسِ حور ہے کہ بادِ صبا
نغمہ برلب ہے آبشارِ خنک
دل ستاں ہے ہر ایک گل کی ادا

۱۶

نغمۂ سرمدی فضاؤں میں
کیف روحانیت ہواؤں میں
آکے کشمیر میں کوئی دیکھے
یہ سیہ مستیاں گھٹاؤں میں

۱۷

"اچھابل" — ایک مختصر سا باغ
یہ جہانگیر کی عنایت ہے
ایک چشمہ، شکستہ کچھ حمام
یہ نظارا بھی کیا غنیمت ہے

۱۸

سامنے یہ مقام "گاندربل"
ایک معمورہ ہے چناروں کا
جیسے خوابوں کی سرزمینِ حسیں
منظر ایسا ہے سبزہ زاروں کا

۱۹

ارضِ کشمیر! تیرے دامن میں
غنچے دیکھے، گلاب دیکھے ہیں
پھول تو پھول، تیرے پتے بھی
رنگ میں لاجواب دیکھے ہیں

۲۰

اسکے کھیتوں میں محنتِ دہقاں
چشمِ بد دور، خوب پھلتی ہے
ہر طرف باغِ سیب رنگا رنگ
خاکِ کشمیر زر اُگلتی ہے

۲۱

ایک نا ظورہ جمال ہے یہ
ایک شہکارِ لازوال ہے یہ
واہ وا! حسنِ "وادیِ لولاب"
ایک تصور، گہہ خیال ہے یہ

۲۲

دور — معروف راستوں سے دور
"باغِ سُن مرگ" ہے سرِ کہسار
واہ! ندی کی سیر دل خوش کن
ہے اِدھر بھی بہار، اُدھر بھی بہار

۲۳

شامِ کشمیر کیا فسیلی ہے
شفق آلود ہے، رنگیلی ہے
اُف حسینوں کی ٹولیاں جس میں
کوئی چنچل، کوئی چھبیلی ہے

۲۴

شوخ جھرنوں کی نغمگی ہے یہاں
گلِ خود رَو کی دلکشی ہے یہاں
کیوں نہ کشمیر ہی کے ہو رہیے؟
حسن کی طرفہ ساحری ہے یہاں

غزلیں

ظفر صہبائی

محروم ہیں پروں سے اظہار کے وسیلے
باہوں میں کیسے بھرلوں آکاش نیلے نیلے

خواہش کا چاند چمکے جب جسم کی گھٹا میں
پھر یہ نہیں ہے ممکن کوئی لبوں کو سی لے

شاید وہ زخم کھا کر میرا مزاج سمجھے
میں نے لکھے ہیں خط میں جملے اُسے نکیلے

برسیں گے آسماں سے آسودگی کے موتی
ہونے تو دو گھٹا کے یہ خشک بال گیلے

لو اُس کی آرزو میں اک سال اور گزرا
پیڑوں کے سبز پتّے پھر ہو رہے ہیں پیلے

پہچانتے ہیں سب کے لہجے کو اے ظفر ہم
مفہوم نیم جیسا الفاظ ہیں رسیلے

جون ۱۹۷۳ء

جیندر پرکاش جوہر بجنوری

جس روز سے اٹھے ہیں تری رہگذر سے ہم
گرتے ہی جا رہے ہیں خود اپنی نظر سے ہم

راہِ طلب میں دَیر بھی ہے ان کا در بھی ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ جائیں کدھر سے ہم

اب امتیازِ جلوہ و پردہ ہمیں کہاں
آگے نکل چکے ہیں مقامِ نظر سے ہم

دل ہے دوائے دوست کے غم میں بُجھا بُجھا
ہیں دم بخود خیالِ نمودِ سحر سے ہم

وہ خود ہیں ساتھ ساتھ خوشا ذوقِ جستجو
چھوٹے تکلفاتِ قیام و سفر سے ہم

جوہر غمِ زمانہ مٹائے گا کیا ہمیں
نظریں ملا چکے ہیں کسی کی نظر سے ہم

جیٹھ ۱۶ ۱۸ اشک

پیام گورکھپوری

چھتونی پل



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو چھتونی میں چھتونی بگہا ریلوے لائن کے تعمیری کام کے افتتاح کے موقع پر عوام کو خطاب کر رہی ہیں

اس دن لوگوں میں بے پناہ خوشی کا منظر دیکھنے کو ملا جس دن وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے چھتونی پل کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ ۲۲ اکتوبر ۷۳ء کو صبح سویرے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا تہوار ہو۔ عورت مرد، بوڑھے جوان سبھی جلسہ گاہ کی سمت بڑھے جا رہے تھے۔ ہر طرف انسانوں کا سیلاب امنڈ پڑا تھا۔

دور دور گاؤں میں بسنے والے کسان اور مزدور اور استحصال سے تباہ اس علاقے کے عوام میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ ایک ایسی لہر جس میں خوشحالی کی تمنا تھی۔ دیوریا ضلع کا یہ علاقہ جو ہر سال سیلاب اور خشک سالی سے تباہ ہوتا ہے، آج اس علاقے کے عوام نے امید کی کرن دیکھی تھی۔ مشرقی اتر پردیش کا یہ علاقہ جو صدیوں سے ترقی کی راہ دیکھتا رہا ہے، آج جب اس کی قسمت بدلتی دکھائی دے رہی ہے تو اس علاقے کے عوام میں مسرت کی لہر دوڑ جانا ایک فطری بات ہے۔

مشرقی اتر پردیش سنتوں اور سادھوؤں کی نگری، گوتم، کبیر اور بابا گورکھ ناتھ کی سرزمین، انگریزی سامراج کے باغیوں کی یہ دھرتی صدیوں سے استحصال کا شکار رہی ہے۔ غیر ملکی حکمرانوں نے یہ کہہ کر اسے نظر انداز کیا کہ ترائی کا علاقہ ہونے کی وجہ سے یہ بیماریوں کا گھر ہے۔ لیکن بات کچھ اور ہی تھی۔ انگریزوں نے اس علاقہ کو صرف اس وجہ سے نظر انداز کیا کہ یہ انقلابیوں کی سرزمین رہا ہے۔ سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر اس وجہ سے نہیں کی گئی کہ اس علاقے کے عوام کو آسانیاں نہ مل سکیں۔ لیکن آزادی کی متوالی اس علاقہ کی جنتا نے استحصال، غربت اور بے پناہ ظلم و ستم کو سہتے ہوئے علم بغاوت کو بلند رکھا تھا۔ اور اسی استحصال کے خلاف قوم کے باپو کو ۱۹۱۷ء میں ستیہ گرہ کرنی پڑی تھی۔ اسی مشرقی علاقے کے چمپارن ضلع سے مہاتما گاندھی نے استحصال کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ ایک ایسی آواز جو سارے ہندوستان کی آواز تھی۔ انسانیت کی آواز تھی۔

چھتونی پل کی تعمیر کے منصوبے کے ساتھ ساتھ اس مشرقی علاقہ کی انقلابی تاریخ کا ایک ایک ورق نئی روشنی کے ساتھ نظروں کے سامنے کھلتا جا رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی سے لے کر ۱۹۲۲ء کا چوری چورا اور ۱۹۴۲ء کا اندولن جہاں ہر صفحے پر "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ بلند ہوتا رہا ہے اور اس علاقے کے غریب عوام کی سرفروشی کی داستان ہر ایک کے دل اور دماغ کو متاثر کرتی جا رہی ہے۔

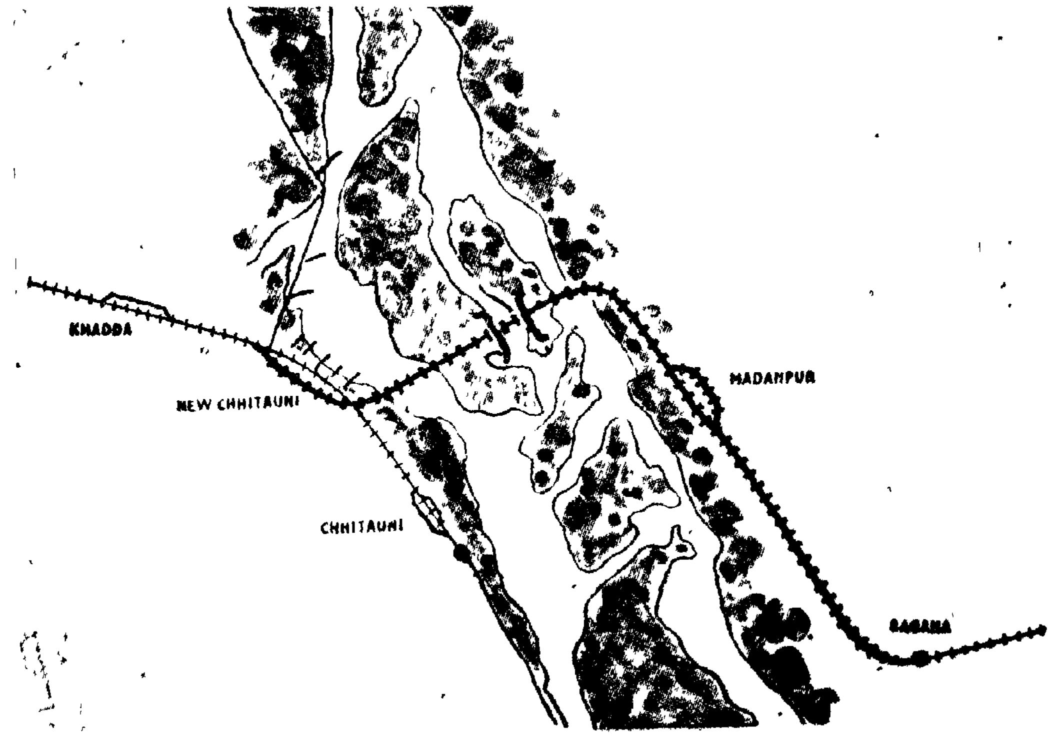
اور ۱۹۴۷ء کا وہ دن بھی آ گیا جب مادر وطن کے پیروں میں پڑی غلامی کی بیڑیاں ٹوٹ گئیں۔ ہم آزاد ہو گئے۔ اس کے بعد یہاں کی سیاسی اور سماجی انجمنوں نے اس علاقہ کی ترقی کے لیے زوردار آواز بلند کی۔ چھتونی پل کی تعمیر کے لیے آواز اٹھتی ہی رہی۔ لیکن حالات نے اس پل کی تعمیر میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کیں۔ لیکن آخر ۲۲ اکتوبر کا وہ دن بھی

۔ ۔اگی جب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اس پل کی تعمیر کا سنگِ بنیاد رکھا۔

عام پلوں کی طرح یہ پل نہیں ہے۔ اس پل کے ساتھ ہماری جنگِ آزادی کی شاندار تاریخ وابستہ ہے۔ اس جگہ پر پہلے بھی پل تھا جو ۱۹۲۴ کے سیلاب میں بہہ گیا۔ تب سے اس وقت کی ریل کمپنی بی۔ این۔ ڈبلیو اور سرکار اس کا بنایا جانا ٹالتی رہی۔ ایک مرحلہ پر تو انھوں نے اسے

ریل لائن کو پل سے جوڑا جانا ضروری سمجھا گیا۔ اور ۱۹۱۴ میں پل بن بھی گیا۔ ان دنوں چمپارن میں انگریزوں کے بڑے بڑے فارم تھے۔ انھیں اپنی زراعتی پیداوار کو بازاروں میں پہنچانے کے لیے آسانیاں چاہیے تھیں۔ اس وجہ سے یہ پل بنایا گیا تھا۔ یہاں کے کسانوں سے جبراً کام لیا جاتا تھا اور انگریز ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے تھے۔

مہاتما گاندھی افریقہ سے لوٹنے کے بعد جب لکھنؤ کانگریس



چھتونی ۔ بگہا ریلوے پل کا نقشہ

۔ ۔ کا بنانا تکنیکی وجوہات کا بہانا لے کر ناممکن قرار دے دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ اقتصادی نقطۂ نظر سے یہ پل بے سود ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو پل ۱۹۱۲ میں اس خیال سے بنایا گیا تھا کہ چمپارن کی زراعتی پیداوار اس کے ذریعہ اتر پردیش میں بھیجی جائے گی اسے بعد میں بے سود قرار دیا گیا۔ ۱۹۰۷ میں نرکٹیا گنج سے بگہا تک اور بگہا سے چھتونی تک ریل لائن بنی لیکن تجارتی نقطۂ نظر سے اس

میں شامل ہونے کے لیے آئے تو چمپارن کے کسانوں نے وہاں پر ہو رہے مظالم کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی اور گاندھی جی نے یہیں فیصلہ کیا کہ وہ چمپارن جائیں گے۔ وہ ۱۵ اپریل ۱۹۱۷ کو کلکتہ سے مظفر پور اور موتی ہاری ہوتے ہوئے بیتیا پہنچے۔ یوروپین ایسوسی ایشن کی بہار شاخ اور آل انڈیا یوروپین ایسوسی ایشن کلکتہ نے گاندھی جی کی چمپارن میں موجودگی کے خلاف آواز بلند کی۔ لیکن وہ سب بیکار گیا اور آخر میں ایک

کمیشن مقرر ہوا جس نے کچھ سفارشیں کیں اور کسانوں پر کیے جانے والے مظالم میں کچھ کمی آئی۔

بی۔ این۔ ڈبلو پوری طور سے انگریزوں کے زیر اثر تھی۔ اس ریلوے کو بنانے میں ان کا پورا ہاتھ تھا۔ ان کی تجارتوں اور پیشوں کی حفاظت کرنا اس کا فرض تھا۔ اس خیال سے ۱۹۰۷ء میں چھتونی بگہا کو جوڑ کر بی۔ این ڈبلو کی مین لائن بنائی گئی تھی اور ۱۹۱۸ء کے چمپارن آندولن کے بعد اس ریل کے مالکوں نے اسے فائدہ مند نہیں سمجھا۔ چمپارن کی لہر گورکھپور کو بھی متاثر کرتی رہی۔ ۱۹۱۸ء کے آندولن سے انگریز گھبرا چکے تھے۔ وہ گورکھپور میں جگہ جگہ اپنا اڈہ بنا چکے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام بھی مشتعل ہو گئے، جس کے نتیجے میں ۱۹۲۲ میں چوری چورا کا حادثہ پیش آیا۔

دیوریا ضلع میں جہاں گھاگرا، راپتی، نرائنی، گنڈک اور دوسری بہت سی ندیاں بہتی ہیں، ہر سال سیلاب سے تباہ ہوتا رہتا ہے۔ جس ضلع میں ندیوں کا اس طرح جال بچھا ہوا ہو اور نقل و حمل کے ذرائع نہ ہوں وہاں کے عوام کی پریشانیوں کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

گورکھپور شمالی مشرقی ریلوے کا ہیڈکوارٹر ہے۔ یہاں سے ہوتی ہوئی "مین لائن" بردنی، کٹیہار وغیرہ جگہوں کو جاتی ہے۔ لوپ لائن گورکھپور سے پڈرونہ ہوتے ہوئے سیوان جاتی ہے اور کپتان گنج ہوتے ہوئے چھتونی جاتی ہے۔ جب ۱۹۰۷ء میں چھتونی لائن کھلی تو نرائنی کے اس پار اتر پردیش میں آخری اسٹیشن چھتونی گھاٹ تھا اور نرائنی کے اس پار بہار میں بگہا اسٹیشن تھا جہاں سے نرکٹیا گنج، مظفرپور، پٹنہ وغیرہ ریل جاتی تھی اور چھتونی گھاٹ اور بگہا کو جانے کے لیے اسی نرائنی پر ۱۹۱۲ میں ایک ریلوے پل کی تعمیر کی گئی اور اس پل کے بن جانے سے نقل و حمل کی آسانیاں ہو گئی تھیں۔

لیکن بدقسمتی سے ۱۲ سال کے بعد جب ۱۹۲۴ میں ایک بھیانک سیلاب کی وجہ سے یہ پل بہہ گیا اور زبردست جانی مالی نقصان ہوا تو لوگوں کا کہنا ہے کہ پل بہنے سے پہلے اس ندی نے بڑا ہی طوفانی روپ اختیار کر لیا تھا۔ تب سے اس ندی کے بارے میں طرح طرح کے وہم لوگوں کے دل و دماغ پر چھائے رہے۔ جھوٹی سچی کئی طرح کی کہانیاں اس



وہ مقام جہاں نیا پل بنایا جائے گا

ندی سے متعلق پھیلا دی گئیں۔

بہار کی کوسی ندی کی طرح نرائنی (بڑی گنڈک) بھی بہت خطرناک سمجھی جاتی ہے۔ گنڈک ندی نیپال کی سیت گنڈگی سے نکل کر میدانی علاقوں میں دور تک پھیل جاتی ہے۔ اس کی کل لمبائی کا ۱۷۱ میل حصہ بہار میں اور ۲۸ میل اتر پردیش میں پڑتا ہے۔

گنڈک ندی پر ریلوے پل بنانے کے پہلے اس ندی کو قابو میں کرنے کا کام نہایت ضروری تھا۔ اس سلسلے میں رڑکی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور ہائی لیول کمیٹی کے ذریعہ کام لیا گیا۔ مرکزی وزیر آبپاشی ڈاکٹر کے ایل راؤ نے بھی گنڈک کے خطرناک اثرات کو روکنے کے لیے مشورے دیئے، جس کے نتیجے میں ۱۹۶۴-۶۷ء میں اس ندی پر بالمیک نگر نامی مقام پر ایک بیراج کی تعمیر کی گئی اور ندی کے بہاؤ کو قابو میں رکھنے کا کام کیا گیا۔

اب یہ ممکن ہو سکا ہے کہ چھتونی بگہا لائن کو پھر سے چالو کیا جائے۔ یہ پل پرانے مقام پر نہ بنا کر نئے مقام پر بنایا جائے گا جو چھتونی اسٹیشن سے پہلے جہلیا نامی مقام پر ہوگا۔ یہ پل کافی بڑا ہوگا اور اس نقطۂ نظر سے بنایا جائے گا کہ نرائنی (بڑی گنڈک) اس پل کو تباہ نہ کر سکے۔ اس پل کے بن جانے سے بہت سے فاصلے کم ہو جائیں گے۔ بہار کے بہت سے شہروں کی دوری اتر پردیش سے بہت کم ہو جائے گی۔ نیپال جانے کے لیے بھی ایک آسان راستہ قائم ہو جائے گا۔ اس پل کی تعمیر سے



وزیر اعلیٰ اترپردیش شری ہیم وتی نندن بہوگنا کو ان کی قیام گاہ پر ان کے ۵۴ ویں یوم پیدائش کے موقع پر ان کے دوستوں، مداحوں اور ہر طبقے کے لوگوں نے مبارکباد پیش کی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے

ہندوستان میں برطانوی ہائی کمشنر سر مائیکل واکر نے گذشتہ ۶ اپریل کو وزیر اعلیٰ اترپردیش شری ہیم وتی نندن بہوگنا سے ان کی قیام گاہ پر ملاقات کی تصویر میں وہ وزیر اعلیٰ سے محو گفتگو دکھائی دے رہے ہیں۔

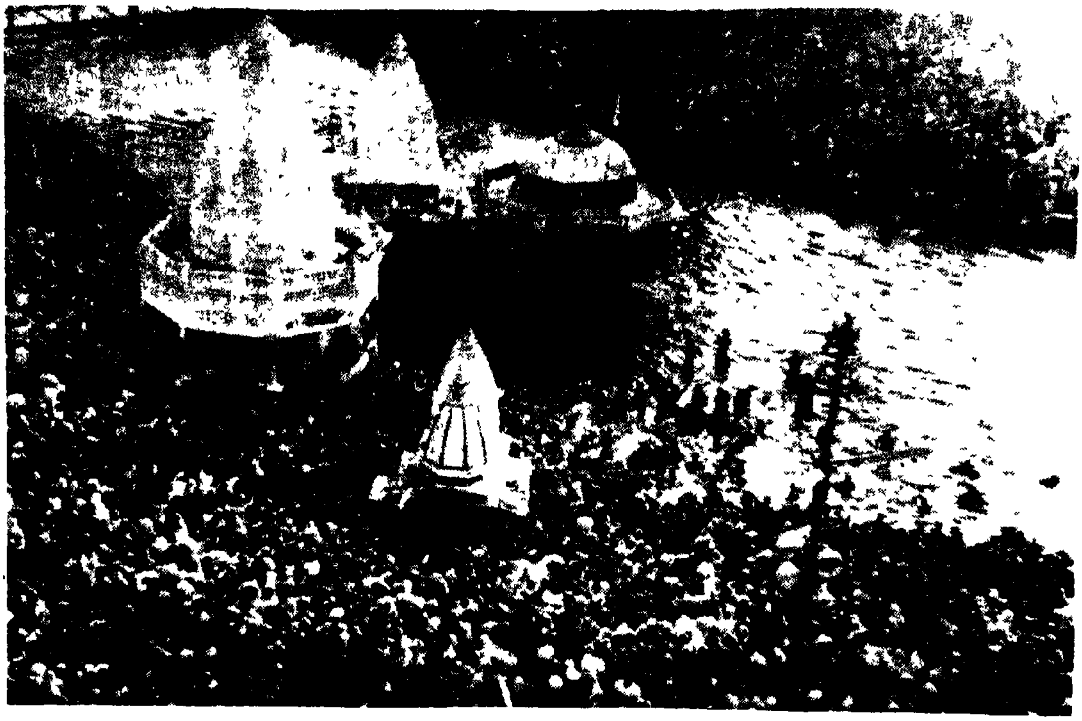




وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری ہیم وتی نندن بہوگنا گذشتہ ۲ر اپریل کو تلک ہال لکھنؤ میں مہابیر جی کے ۲۵۰۰ ویں نروان مہوتسو کے موقع پر تقریر کر رہے ہیں

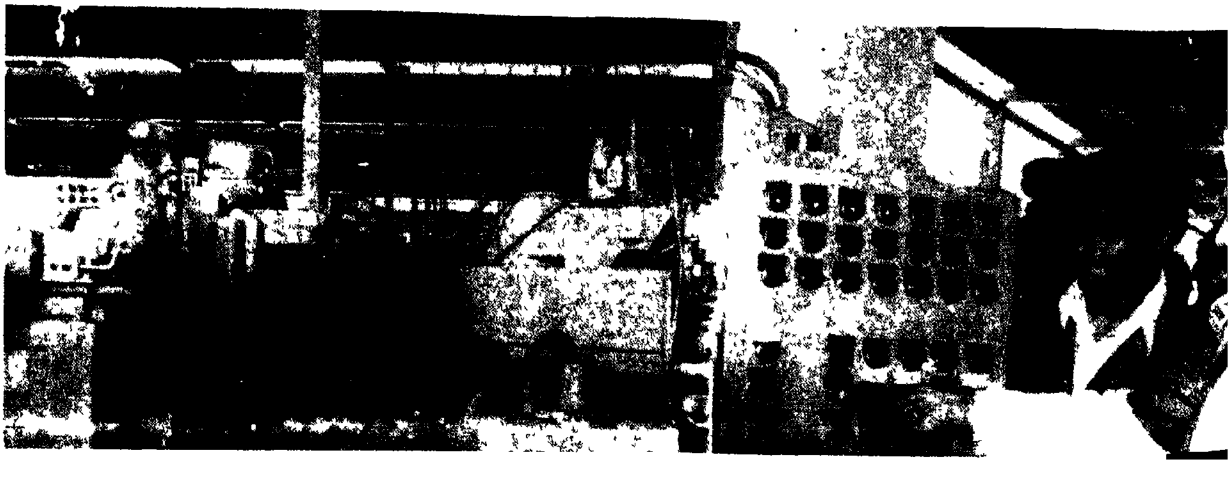
وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری ہیم وتی نندن بہوگنا گذشتہ ۵ر اپریل کو اپنی قیام گاہ پر محکمہ صنعت کے اعلیٰ افسران کو خطاب کر رہے ہیں





کمبھ میلے کے موقع پر ہردوار میں تقریباً ۲۰ لاکھ یاتریوں نے ہر کی پیڑی پر گنگا اسنان کیا تصویر میں اسنان کا ایک منظر نظر آرہا ہے

وزیراعلیٰ اترپردیش شری ہیم وتی نندن بہوگنا لکھنؤ سے ۱۶ کیلومیٹر دور اسکوٹر انڈیا لمیٹڈ میں گذشتہ ۷ اپریل کو پہلی کرینک کیس مشین کو چلانے کے لیے بٹن دبا رہے ہیں







وزیراعلیٰ شری ہیم وتی سدان ہوگیاے گذشتہ ، مئی کو
دوھاں ھوں کے ٹلک ہال میں منعقدہ ایک
تقریب میں ریاستی حکومت نے ۱۳ افسران کو
۱۹۷۲-۷۳ء کے دوران ان کی اعلیٰ کارکردگی
اور نمایاں خدمات کے صلے میں اسٹیٹ ایوارڈ تقسیم
کیے اوپر کی تصویر میں شری لیلادھر ستر مارونی
ڈپٹی ڈائرکٹر انفارمیشن ایوارڈ لے رہے ہیں اوسط
میں) سری جو رشید احمد اسسٹنٹ ڈائرکٹر انفارمیشن
دائرہ میاد وزیراعلیٰ سے ایوارڈ حاصل کرتے
ہوئے (نیچے) تصویر میں کچھ افسران بیٹھے ہوئے نظر
آرہے ہیں جنھیں اسسٹنٹ ایوارڈ ملا ہے۔



اور بھی دوسری آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

فاصلوں میں کمی ملاحظہ ہو

اسٹیشن سے	اسٹیشنوں تک	بذریعہ ریل کیلومیٹر میں فاصلہ	
		موجود سونپور مظفرپور ہوکر	مجوزہ۔ چھتونی۔بگہا ہوکر
گورکھپور	سگولی	۲۹۴	۲۰۹
	رکسول	۴۲۳	۱۹۱
	دربھنگہ	۳۸۲	۳۴۱
	موتی ہاری	۳۷۲	۲۳۱
	جے نگر	۴۵۰	۴۰۹
	سیتامڑھی	۴۵۰	۲۷۳
	سیرا گنبا	۴۷۶	۲۴۴
	جنک پور روڈ	۴۷۵	۲۹۹
	بتیا	۴۱۶	۱۸۷
	بگہا	۴۹۵	۱۰۸

اس وقت شمالی بہار میں رکسول اسٹیشن، موٹر لائن سے نیپال کی جانب بھاری مقدار میں بھیجے جانے والے مال کے لیے نقل و حمل کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس پل کی تعمیر سے گورکھپور سے رکسول اور دوسرے سرحدی علاقو کے فاصلے بہت کم ہو جائیں گے اور نقل و حمل میں کافی ترقی ہوگی۔

یہاں پر کچھ پرانی باتوں کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے۔ یہ ریل لائن جب پہلی بار تعمیر ہوئی تو اس علاقے کے لیے بہت ہی فائدہ مند تھی۔ اس وقت اتر پردیش کو "نارتھ ویسٹرن پراونس" کہا جاتا تھا۔

چمپارن ضلع کے سروے اور "سٹلمنٹ آپریشن" (رپورٹ متعلق بندوبست) کے مطابق "بگہا، شکارپور اور اداپور تھانوں کی چاول کی پیداوار کو نارتھ ویسٹ پراونس کے بازاروں میں بھیجا جا سکتا ہے، ریل کی قیمت بڑھ گئی ہے اور یہ ضلع تیزی سے برآمدی تجارت میں ترقی کر رہا ہے۔"

اسی رپورٹ میں آگے کہا گیا ہے کہ نرکٹیا گنج سے گورکھپور تک اور



پرانے پل کے کھنڈر

دوسری کئی ریلوے لائنوں کی تعمیر سے ضلع کے ڈھانچے میں پورے طور سے انقلابی تبدیلی ہوئی ہے۔"

لیکن اس ریل لائن کی تعمیر اس علاقہ کے لیے کوئی تحفہ نہیں تھا۔ رپورٹ کے مطابق "یہ امید نہیں رکھنی چاہئے کہ ان ریلوے لائنوں کی توسیع اور اس سے ہونے والی ترقی بغیر متوقع مصیبتوں کا سامنا نہیں ہے۔ قدرتی پانی کے راستوں کے کنارے بڑے بڑے باندھ ضرور بنائے جائیں۔ خاص طور سے نرکٹیا گنج۔ گورکھپور ریل لائن کے سلسلے میں ریل لائن مشرق سے مغرب کی سمت جاتی ہے جبکہ پہاڑی ترائی سے نکلنے والی پانی کے دھاروں کی سمت شمال سے ہوتی ہے۔

۱۹۱۴ کے چمپارن ضلع کے گزیٹیر میں بگہا کا ایک چھوٹے قصبہ کے روپ میں بھی ذکر نہیں ہے۔ گزیٹیر کے مطابق بگہا ایک تحصیل اور تھانہ تھا جس کا رقبہ ۶۹۰ مربع میل تھا اور اس کے ماتحت ۳۸۰ گاؤں تھے جن کی آبادی ۲ لاکھ تھی۔ اس رپورٹ اور پل کی تاریخ کے پس منظر میں یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ اس پل کی کتنی اہمیت ہے۔ ساتھ ہی اس پل کا کام کتنا مشکل بھی ہے جسے حکومت کرنے جا رہی ہے۔

اس ریل لائن کی تعمیر کے بعد اس علاقے کی اقتصادی ترقی میں کافی مدد ملے گی اور بازار کا علاقہ بھی بڑھ جائے گا۔ چھتونی اور بگہا کی شکر ملوں کو آسانی سے کچا مال فراہم ہو سکے گا۔ اور یہاں کی تیار کی جانے والی اشیا دوسرے بازاروں میں بھیجی جا سکیں گی۔ چمپارن ضلع میں بگہا کے قریب

اون فیکٹری اور کارڈ بورڈ فیکٹری، بالمیک نگر میں پیپر مل، چاول مل کولڈ اسٹوریج اور ڈسٹلری وغیرہ کی تجویزیں بھی سامنے ہیں۔

ریلوے کی آسانی پیدا ہو جانے سے ترائی کے علاقوں میں جنگلات کی تجارت کو بھی فروغ ہوگا۔ اس ریلوے لائن کی تعمیر سے دوسرے کئی طرح کے بھی فائدے ہوں گے۔ مثلاً یہ لائن اتر پردیش اور بہار جیسے دو بڑے صوبوں کو شمالی حصے میں جوڑ دے گی جس سے دونوں صوبوں کی ایکتا مضبوط ہوگی۔ اس وقت بگہا سے چھتونی آنے میں ۵ سے ۶ گھنٹے لگتے ہیں لیکن گنڈک پر پل کی تعمیر ہو جانے سے اتنے لمبے وقت کی مسافت منٹوں کی رہ جائے گی۔

ملک کی اندرونی مالی حالت کے سدھار کے ساتھ ساتھ نیپال کے ساتھ ہونے والی تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوگا اور دوسرے ملکوں کے بازاروں سے اور بھی قربت ہوگی۔

☆

> "ملک چاہے اس وقت کتنی ہی دشواریوں سے گزر رہا ہو ہماری معاشی زندگی کی تصویر تاریک نہیں ہے۔"
>
> — شریمتی اندرا گاندھی

غزل

ایس۔ بی چودھری تمنّا مرادآبادی

دو نورِ دیدۂ پُر اشک ہیں ہم کہہ نہیں سکتے
جو بیتی اس کی محفل میں وہ عالم کہہ نہیں سکتے

شبِ فرقت کی خاموشی کا عالم کہہ نہیں سکتے
ستارے ڈوب جاتے ہیں مگر ہم کہہ نہیں سکتے

جو دل کا حال ہے وہ دیدۂ نم کہہ نہیں سکتے
بہتے آنسوؤں میں غم کا عالم کہہ نہیں سکتے

جو طوفانِ الم میں اپنا عالم ہوتا رہتا ہے
وہ دل محسوس کرتا ہے مگر ہم کہہ نہیں سکتے

زمانہ کس طرح کروٹ بدل کر ختم ہوتا ہے
نظر سے دیکھ لیتے ہیں مگر ہم کہہ نہیں سکتے

جو کلیوں کی طرح اس کے لبوں پر آکے ٹھہرا تھا
تجلی میں تبسم کا وہ عالم کہہ نہیں سکتے

تمنّا جو چراغِ شامِ غم کو تیز کرتی ہے
وہ لو کس طرح ہو جاتی ہے مدھم کہہ نہیں سکتے

(افسانہ)

گرداب

قمر جہاں

بچپن سے وہ پانی سے ڈرتی تھی۔ پہلی بار یہ خوف اس وقت پیدا ہوا تھا جب گھر کے سامنے والے کنویں سے ابّا کی لاش نکالی گئی۔ وہ کنویں کی جگت کی مرمت کروا رہے تھے کہ اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ کنویں میں جا رہے۔ نہ معلوم کیسے وہ سب کے ہاتھوں سے چھوٹ کر جگت پر چڑھ گئی اور کنویں میں جھانکنے لگی۔ اف! کتنی گہرائی، کتنا اندھیرا ——— وہ چکرا گئی۔ پانی سے خوف کے ساتھ ادب بھی اس کے دل میں سما گیا۔ پانی جو زندگی ہے اس کے لیے موت بن گیا۔ اس نے کبھی گلاس میں پانی نہیں پیا۔ جب بھی گلاس اس کے سامنے آتا، پھیلتے پھیلتے کنواں بن جاتا اور پل بھر میں ابّا کی لاش سرلی نظر آتی۔ اس نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ قدم نکالتے ہی محسوس کنواں سامنے ہوتا۔ لوگوں کا ہجوم، اماں کی چیخیں اور پھر چند ہاتھوں پر لٹکتی ابّا کی لاش ——— وہ دھمکائی گئی، ڈرائی گئی، یہاں تک کہ بعض موقعوں پر پٹائی بھی ہوئی اور اس نے سسکتے ہوئے اماں کو بتا دیا کہ اسے کنویں سے ڈر لگتا ہے۔ ذرا دیر کے لیے اماں کو سکتہ سا ہو گیا۔ مارنے کے لیے اٹھا ہوا ہاتھ فضا میں جھول گیا، پھر وہ گھٹی گھٹی سسکیاں لینے لگیں۔ ایسی سسکیاں اکثر رات کی تاریکی میں اسے نیند سے جھنجھوڑ دیتیں اور وہ خاموش آنسوؤں سے اماں کا ساتھ دیتی۔ اماں نے وعدہ کر لیا کہ وہ یہ مکان چھوڑ دیں گی اور اس نے بھی رستی ہوئی آنکھوں سے سمجھوتا کر لیا کہ وہ اسکول جائے گی۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ کئی ماہ کا کرایہ نہ ملنے پر مالک مکان نے نوٹس دیا تھا اور اماں جنھوں نے کبھی گھر سے قدم نہ نکالا تھا، عدالت اور کچہری کے خوف سے شاندار مکان

چھوڑ کر ایک تنگ و تاریک مکان میں منتقل ہو گئیں۔ کرائے کی عدم ادائیگی کی سزا میں انھیں اپنے بہت سے زیوروں سے ہاتھ دھونا پڑا۔

سلائی کرتے کرتے اماں کے ہاتھ تھک گئے۔ آنکھیں ساتھ چھوڑنے لگیں اور تب اسے اپنی ذمے داریوں کا احساس ستانے لگا۔ اماں نے تعلیم کی تکمیل پر زور دیا مگر وہ جب بھی کتاب کھول کر بیٹھتی ہشیں کی تھکی تھکی آواز اماں کی شکست کا اعلان کرتی اور وہ تصور میں ہی اتنی ملازمتوں کے لیے درخواست دے ڈالتی کہ ایک راہ کا تعین مشکل ہو جاتا۔

اس کے چاروں طرف ٹھاٹھیں مارتا ہوا زندگی کا بیکراں سمندر پھیلا ہوا تھا لیکن وہ تو پانی سے ڈر گئی تھی۔ وہ ایک حصار میں قید تھی جہاں اماں ہی اس کا آئیڈیل تھیں۔ وہ سوچتی ——— "اچھا ہوا جو اماں بیوہ ہو گئیں۔ سفید لباس میں کیسی شاندار معلوم ہوتی ہیں۔ ابّا کی زندگی میں تو وہ ہر وقت گڑیا کی طرح سجی رہتی تھیں۔ ہمیشہ کلائی میں ڈھیر سی چوڑیاں، ہاتھوں میں مہندی، کانوں اور گلے میں ڈھیر سا زیور اور رنگ برنگے کپڑوں میں خود اماں کا وجود گم ہو جاتا تھا۔ اور اب ——— سراپا اماں ہی اماں تھیں مگر ضعیف اور کمزور ———" اور ایک دن اس نے ضد کر کے اماں کو فکر معاش سے آزاد کر دیا۔ تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا اور جوان ہاتھوں کے لمس نے مشین کو ایک بار پھر برق رفتار بنا دیا۔ ذمے داریوں کے بوجھ میں خود اس کا وجود گم ہو گیا۔

ماہ و سال کی آگ میں تپ تپ کر وہ کندن بنتی رہی مگر ہنگاموں سے دور اور زندگی کی گہما گہمی سے بے نیاز ——— حیات کا ہنگامہ خیز سمندر بار بار اسے دعوت نظارہ دیتا مگر وہ تو پانی سے ڈر گئی تھی۔ کیا معلوم کب یہ موجیں اسے اپنے ساتھ بہالے جائیں، کب اماں کا وجود ان لہروں میں گم ہو جائے۔ وہ تو زندگی کا ایک ایک پل اماں کے نام وقف کر چکی تھی۔ اسی سکوت میں ایک دن اماں نے ایک کاغذ کا ٹکڑا اس کے سامنے رکھ دیا۔ زندگی سے بھرپور ایک عکس اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہا تھا۔ کچھ پلوں کے لیے وہ سب کچھ بھول کر عکس میں گم ہو گئی۔ مگر یہ کیوں ہے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اپنی سوالیہ نگاہیں اس نے اماں کے چہرے پر ڈالیں۔

"بیٹی ان لوگوں نے تیرا ہاتھ مانگا ہے۔"

"وہ سُن ہو کر رہ گئی۔ زندگی کے اس پہلو پر تو اس نے کچھ سوچا ہی نہ تھا۔ اس کے حصار میں تو کبھی اتنی جگہ نہ تھی کہ کوئی تیسرا وجود قدم رکھتا۔ وہ زندگی کے ہنگاموں سے ڈرتی تھی۔ اس کا شکستہ وجود اس کا متحمل نہ تھا کہ دو چار تھپیڑے بھی سہہ لے جاتی۔ اس نے اماں کی خوشامد کی، روئی، گڑگڑائی، مگر اماں نے اپنی موت، اس کی تنہائی اور دنیا کا ہوّا کچھ اس طرح تیار کیا کہ اس نے ہتھیار ڈال دیے اور ایک دن در و دیوار سے سر ٹپکتی اماں کو چھوڑ کر جوڑ جوڑ تخصیص لیے ہوئے اس نے ایک نئے آنگن، ایک نئی دنیا میں قدم رکھا ـــ سب کچھ انجانا، سب لوگ بیگانے ـــ تھوڑے دن تک وہ سہمی سہمی رہی مگر اس انجانے ماحول اور بیگانے لوگوں کے درمیان ایک شخصیت محبت اور ملاپ کا ذریعہ بن گئی۔

کلفتوں کی دھول جسم پر سے ہٹی تو روپ دمک اٹھا۔ اس کا اعتماد بحال ہوا اور دو مضبوط باہوں کا سہارا ملا تو اس نے بے خطر خود کو جذبات کے حوالے کر دیا۔ چاروں طرف سکون اور ٹھنڈک ـــ ہلکی ہلکی لہریں جیسے کوئی دھیمے دھیمے ہنگ دے رہا ہو ـــ اونچی اونچی لہریں، جھاگ اڑاتا ہوا ٹھنڈا پانی۔ پیروں کے نیچے سے سرکتی ہوئی ریت ـــ اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ سب کو دعوت دیتا ہوا ـــ وہ ہر وقت مسکراتی رہتی ـــ اس سمندر کی وسعت کیسی بے کنار تھی۔ اس کی ٹھنڈک کیسی حیات آفریں۔ اس کے طوفان کیسے ولولہ انگیز اور اس کی رنگینی کیسی ہوش ربا۔

وہ پچھتانے لگی "میں کیوں اتنی PASSEMISTIC بن گئی تھی ـــــــ جس زندگی کو میں نے گلے لگایا تھا وہ کیسی بے رنگ اور بے جان تھی ـــ اپنی عمر کے قیمتی سرمایے کو کیوں اب تک صحراؤں میں لٹاتی رہی۔ زندگی کی نعمت ایک ہی بار تو ملی ہے، وہ بھی اشرف المخلوقات کی شکل میں۔ ایک ہی بار تو اس سمندر میں قدم رکھا ہے۔ میں اس کا ایک ایک قطرہ پلکوں سے چن لوں گی، جسم پر سجا لوں گی۔ چاروں طرف رنگ برنگے سیپ اور موتی بکھرے پڑے ہیں، زندگی کا دامن اس دولت سے بھر لوں گی۔"

چوڑیوں کی کھنک اس کے کانوں میں رس گھولنے لگی تھی۔ ہاتھوں کی لالی پر نظر پڑتی تو سارا سنسار جیسے شفق میں نہا جاتا۔ جسم پر پہنے سجانی تو رنگ و نور کا سیلاب امڈ پڑتا۔ شوخ رنگ کے کپڑے ہر وقت اس کے جسم سے لپٹے ہنستے رہتے ـــــــ اس کے ذہن کے پردے پر بنی سنوری اماں کی ایک دھندلی تصویر ابھر آتی تو وہ تڑپ جاتی ـــ سفید لباس سے تو وہ خوف کھانے لگی۔ اکثر سوچتی "گھر جاؤں گی تو سب سے پہلے اماں کا سفید لباس بدلوں گی۔ بیچاری اماں۔ جیسے جیتا جاگتا انسان کفن میں لپٹا اپنی موت کا انتظار کر رہا ہو۔ اور اب تو گھر کی تنہائی سچ مچ انھیں قبر جیسی لگتی ہوگی۔ اور کبھی تو صوفیانہ اور سنجیدہ رنگ ہیں سرمئی نیلا دھانی۔ کاہی بھی سب رنگ اماں کو پہناؤں گی۔

اس کا سا ہمسفر تسکاگو سے ماہر تعمیرات کی سند لے کر آیا تھا۔ ہنس مکھ شوخ، پارہ صفت اور مردانہ وجاہت کا مکمل نمونہ ـــــــ کبھی کبھی تو وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ـــ شوہر کے سامنے اس کا وجود ایسا معلوم ہوتا جیسے تاج محل کے سامنے کھنڈر پڑا ہو، مگر شوہر کے لیے بے پناہ پیار نے کھنڈر کو بھی سنوار دیا، ویرانہ بھی جاگ پڑا۔

جب سے وہ سسرال آئی تھی ایک بار اسے کسی نے میکے نہ جانے دیا۔ کئی بار اسے اماں کی یاد آئی، وہ اداس ہو گئی مگر اس کا شوہر تو ایک ایک پل اس پر نگاہ رکھتا تھا۔ ادھر اس کی نگاہوں میں اداسی کی ایک اچٹتی ہوئی جھلک بھی نظر آئی اور وہ بے چین ہوا اٹھا۔ اتنے قہقہے لگائے کہ خود ہنستے ہنستے بے دم ہو گئے ـــ وہ زندگی کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لینا چاہتا تھا۔ اداسی، مایوسی، ناکامی اور آنسو کا تو اس کی زندگی میں کہیں نام نہ تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچ میں پڑ جاتی ـــــــ "وہ کیوں اتنا خوش ہے؟ زندگی کے ایک ہی رخ پر اس کی گرفت اتنی مضبوط کیوں ہے؟ کیوں وہ اسے میکے نہیں جانے دیتا؟ کیا چاہتا ہے وہ اس سے؟ اور ایسے ایک بھی سوال کا جواب نہ ملتا تو وہ گھبرا کر بے معنی قہقہوں میں شامل ہو جاتی۔

ایک ماہ جیسے ہوا کے دوش پر گزر گیا ـــــــ ایک رات اس نے میٹھے سپنوں میں کھوئے ہوئے کروٹ بدلی تو اس کے شوہر کا بستر خالی تھا۔ "یہیں کہیں ہوں گے"، یہ سوچ کر اس نے آنکھیں موند لیں مگر گھڑی کی ٹک ٹک نے اس کی آنکھوں سے نیند اڑا دی۔ چاروں طرف سکوت کوئی آواز نہیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی ـــ ایک کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ اس کا شوہر ایک ہیٹر کے سامنے

جھکا ہوا بیٹھا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوگئی۔ آہٹ پاکر شوہر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے سراسیمہ ہوا اور دوسرے پل مسکرا دیا ـــــ مگر وہ جو بچپن سے دکھوں اور بے چینیوں کی نبض شناس تھی، اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپے ہوئے کرب کو تاڑ گئی۔

"تم کیوں آگئیں"، شوہر نے بھینچے ہوئے ہونٹوں کو بہ مشکل کھولا مگر اس کی آواز صاف کانپ رہی تھی۔

"یہی میں آپ سے پوچھنے آئی ہوں" وہ پشت پر پہنچ گئی ـــ ایک تولیے سے وہ اپنے شانے کا نچلا حصہ سینک رہا تھا۔ اس نے تولیہ ہٹا کر رخ پلٹا ـــــــ ایک بڑا سا نیلا داغ ہیٹر کی سرخ روشنی میں چمک رہا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟" وہ سچ مچ گھبرا گئی۔

"شاید سوتے میں بے چین ہوگیا۔ تم فکر نہ کرو۔ جاکر سو جاؤ ـــــ میں ابھی آتا ہوں"

"لیکن وہ تولیہ لے کر سنکائی کرنے لگی ـــــ داغ کا رنگ گہرا ہوتا گیا ـــــ حجم بڑھتا گیا اور اکھڑی اکھڑی سانسوں میں خود اس کا اپنا وجود لرزنے لگا۔

"میں کسی کو جگا لاؤں" وہ بے چین ہوکر کھڑی ہوگئی۔

"نہیں ـــــ تم میرے پاس بیٹھو" شوہر نے تھک کر اس کی آغوش میں سر ڈال دیا۔

صبح وہ دیر سے اٹھی ـــــ شوہر کے چہرے پر سوا اکان کے رات کی تکلیف کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس نے آہستگی سے چپل پہنی اور نیچے جاکر بڑے بھائی سے رات کی کیفیت بیان کر دی۔ چند لمحوں کے لیے کرب کے سائے ان کے چہرے پر لہرائے اور وہ بضد ہوگئی کہ وہ شوہر کے ساتھ ڈاکٹر کے یہاں جائے گی۔ لیکن گھر کے سبھی لوگوں نے مخالفت کی ـــــ شوہر ڈاکٹر کے یہاں سے واپس آیا تو اسی طرح ہشاش بشاش اور چاق و چوبند ـــــ

سنا تم نے ڈاکٹر نے کیا کہا؟" وہ آتے ہی گویا ہوا "وہ کہتا تھا کہ ایک ہی کروٹ سوئے رہنے سے دوران خوں متاثر ہوا اور ایک ہی جگہ رکنے لگا اس لیے نیلا داغ پڑ گیا ـــــ"

اس نے اطمینان کی سانس لی ـــــ مہیب پرشور اور قد آدم لہریں اس کی گردن تک آکے واپس چلی گئیں ورنہ وہ تو لہروں میں ڈوب گئی ہوتی۔

شب و روز کے پاٹ میں ایک ہفتہ اور پس گیا۔ اس نے شوہر سے ایک بار پھر اماں کو دیکھنے کی ضد کی۔

"بس تھوڑے دن اور رک جاؤ، پھر چلی جانا" اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا۔ وہ موم کی طرح پگھل گئی ـــــــ دل بہلانے کے لیے اس نے گھر کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا ـــ مگر جب کبھی وہ خاموش اور تنہا بیٹھے ہوئے شوہر کا چپکے سے جائزہ لیتی تو وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت دکھائی دیتا ـــــ بے حس و حرکت ـــــ اس کی آہٹ پاتے ہی وہ چونک اٹھتا ـــــ نگاہیں ملتے ہی مسکرا اٹھتا اور قربت پاتے ہی کھلکھلا پڑتا ـــــ پھر وہ سب کچھ بھول جاتی۔ ماحول رنگین ہو جاتا، فضا میں خوشبو رچ جاتی ـــــ کبھی وہ پوچھ بھی لیتی تو ایک مردہ سی ہنسی کے ساتھ کہتا۔

"تم تو کام میں لگ جاتی ہو۔ اداس نہ ہوں تو کیا کروں؟"

مگر وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ یہ اداسی کیسی گمبھیر اور پر سکوت کیسا گھبرا دینے والا ہے۔ جیسے طوفان آنے سے پہلے سمندر شانت ہو جائے یا جیسے بارش سے پہلے فضا پر امس چھا جائے۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک بار یہ طوفان سر سے گزر جائے۔ ایک بار وہ کھل کر برس جائے مگر وہاں دور دور تک موت کی سی خاموشی تھی۔ اسے تعجب کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوتا ہے سبھی لڑکیاں شادی کے بعد اپنے میکے جاتی ہیں مگر میں جانے کا نام لیتی ہوں تو سب خاموش ہو جاتے ہیں ـــــ مگر وہ کیوں اداس ہو جاتے ہیں؟ خوشی سے تو اجازت دی پھر یہ اداسی کیوں؟

ایک ہفتہ اور گزر گیا ـــــ کل وہ گھر جا رہی تھی۔ پورے ڈیڑھ ماہ کے بعد اماں سے ملے گی۔ اس کا سفید کفن اتارے گی اور انھیں اس ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں کھینچ لائے گی ـــــ وہ خوشی کے مارے سب کچھ بھول گئی ـــــ سسرال والوں کے اترے ہوئے چہرے بھی، شوہر کی گہری اداسی اور منجمد خاموشی بھی ـــ دن

پھر وہ خوشی خوشی سامان پیک کرتی رہی ـــــ شام کو تھک کر لیٹی تو وہی خاموشی اور سکوت ـــ وہ فیصلہ کن بات کرنے شوہر کے قریب ہی بیٹھ گئی ـــ آہستہ سے بولی :

"اگر آپ خوشی سے اجازت نہیں دیتے تو میں گھر نہیں جاؤں گی۔"

"نہیں بھئی ـــــ میں تمھیں بہ خوشی اجازت دے رہا ہوں۔ مگر تم بہت جلدی آجانا بس جانا اور آنا۔ اماں کو ساتھ لے آنا ٹھہرنا نہیں ـــــ" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ نہ معلوم کیوں بے چین ہوا جا رہا تھا ـــــ وہ پگھل گئی۔

"اماں کی تنہائی کا خیال نہ ہوتا تو میں کبھی اصرار نہ کرتی ـــــ انھوں نے کتنے غم جھیلے ہیں، کیسے کیسے صدمے اٹھائے ہیں۔ آپ کیا جانیں دکھ اور تنہائی کیا چیز ہے۔" اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ بیتی ہوئی زندگی کا ایک ایک پل اس کے سامنے کھڑا تھا۔

شوہر تڑپ کر اٹھ بیٹھا جیسے کسی نے شہ رگ پر تلوار کی دھار رکھ دی ہو۔ شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا جیسے وہ کسی طوفان کو امڈنے سے روک رہا ہو ـــــ وہ بے چین سانسیں لینے لگا۔ جذبات' الفاظ بن کر بہنے لگے۔

"بہت کھو کر میں دکھ اور تنہائی کے کرب کو سمجھ سکا ہوں۔ میں دنیا کے کونے کونے میں بے چین پھرتا رہا ہوں ـــــ دولت کا ڈھیر خرچ کر کے میں نے خوشیاں خریدنے کی کوشش کی مگر کہیں بھی دکھ اور تنہائی کا علاج نہ ہوا۔ میں اس وقت بھی تنہا تھا' جب ہسپانیہ کے کوہستانی علاقوں میں بھٹک رہا تھا۔ خوب صورت آبشار، جنگلی پھول، دیودار اور یوکلپٹس کے دل کش درخت بھی میری اداسی دور نہ کر سکے ـــــ میں اس وقت بھی دکھ کا بوجھ اٹھائے اکیلا ہی تھا جب نیاگرا کے ساحل سے دور رخصت ہو رہا تھا۔ نئے نویلے جوڑے کثرت سے نیاگرا کا دل کش اور سحر انگیز حسن دیکھنے آئے تھے۔ تب جا کر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ہندستان جاتے ہی شادی کر لوں گا ـــ پیرس کی رنگین اور جوان راتیں اور قاہرہ کے نائٹ کلبوں کی رنگ رلیاں بھی میرے درد کا مداوا نہ بن سکیں۔ انسانوں کے اس طوفانی سمندر میں میں اپنی صلیب اٹھائے ہوئے گھومتا رہا۔ کہیں میرا بوجھ بٹانے والا کوئی نہ ملا۔ تم جو میرے لیے سب کچھ ہو' میری رگ رگ میں بس چکی ہو' میری صلیب کا بوجھ ہمیشہ کے لیے اپنے نازک کاندھوں پر رکھ رہی ہو، تم مجھے دکھوں سے ناواقف کا طعنہ دیتی ہو ـــــ تم نہیں جانتیں کہ" جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ ہانپنے لگا جیسے زبردستی سانس لینے کی کوشش کر رہا ہو۔

وہ گم سم سی بیٹھی رہ گئی ـــــ طوفان ابل رہا تھا ـــــ بادل کھل کر برس رہے تھے۔ اچانک خاموشی پر اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ شوہر کا تمام جسم نیلا ہو رہا تھا، ہونٹوں کے گوشے لٹک گئے تھے اور سانس شاید رک رک کر آ رہی تھی ـــــ یا شاید نہیں آ رہی تھی ـــــ وہ ایک بھیانک چیخ کے ساتھ باہر کی طرف بھاگی ـــــ پل بھر میں کمرہ بھر گیا ـــــ وہ وحشت زدہ سی دور کھڑی رہی ـــــ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی، کچھ بھی نہیں سن رہی تھی، کچھ بھی نہیں سمجھ رہی تھی۔ ایک وحشت ناک اندھیرا اسے چاروں طرف سے جکڑ رہا تھا۔ بے بسی سے اس نے اندھیرے میں کچھ ٹٹولنے کی کوشش کی۔ کسی چیز کا سہارا پانے کی ناکام کوشش کی۔ پھر اس کے ہوش و حواس مکمل تاریکی میں ڈوب گئے۔

معلوم نہیں کب تک وہ بے ہوش رہی ـــــ حواس واپس آئے تو سب سے پہلے گھر میں چہل پہل اور آوازوں کا احساس ہوا ـــ دھیرے دھیرے اس نے پپوٹے کھولے ـــــ وہ ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ نہ معلوم کیسے ساری اس کے جسم سے الگ ہو گئی تھی۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر جسم بے حس و حرکت رہا۔ جسم و جان کی تمام قوت یکجا کر کے اس نے اپنے ہاتھ اٹھائے تاکہ چادر سینے پر کھینچ لے ـــــ پاس ہی دو عورتیں آپس میں گفتگو کر رہی تھیں۔ اس کے کانوں میں آواز آئی۔

"ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے مصنوعی دل لگا دیا تھا اور منع کر دیا تھا کہ شادی نہ کرنا کیونکہ زیادہ سے زیادہ چھ مہینے زندہ رہو گے ـــ بیچاری نے سہاگ کا سکھ بھی نہ دیکھا کہ اجڑ گئی۔"

اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھوں پر نظر ڈالی۔ سونی سونی کلائیوں نے اس کے منھ پر بھرپور طمانچہ لگایا، مہندی کھلکھلا پڑی اور وہ ایک بار پھر تاریکیوں میں ڈوب گئی۔

☆

شباب للت

کھوئی ہوئی خوشیوں کا سراغ

وقت کے ساتھ کچھ انداز نظر بدلا ہے
ولولے آج مرے اہلِ وطن کے ہیں بلند
ہم کہ تھے خوگرِ تسلیم و رضا صدیوں سے
سرحدِ صبر و قناعت کے نہیں اب پابند

آج اس دیس کا ہر فرد بآوازِ بلند
اپنے حصے کے سبھی سکھ سبھی خوشیاں مانگے
رزق و تعلیم کا حق، رہنے کو عمدہ سا مکاں
دل کے بہلانے کو تفریح کے ساماں مانگے

بو کے دھرتی میں یہ خود کثرتِ اولاد کے بیج
فصلِ آسودگی و عیشِ فراواں مانگے
کر کے دن رات حکومت کے تغافل کا گلہ
دردِ خود کردہ کا سرکار سے درماں مانگے

ہر تحفظ کی طلب گار نئی نسلِ وطن
ایک مستقبلِ پُرنور و درخشاں مانگے
یعنی اس دھرتی پہ خودداری و بےفکری سے
زندگی کرنے کا حق آج کا انساں مانگے

خواب یہ کتنے دل آویز و حسیں ہیں لیکن
آہ یہ خواب رہے تشنۂ تعبیر اب تک
زخمِ حالات سے امید کا پنچھی ہے نڈھال
اس کے پہلو میں ہے پیوست وہی تیر اب تک

کنبہ بندی کے اصولوں سے گریزاں رہ کر
ملک خوشحالی کی منزل کو کہاں پاتے ہیں
بوجھ ہلکا ہو تو اٹھتے ہیں قدم تیزی سے
جو گراں بار ہوں وہ راہ میں رہ جاتے ہیں

آہ اس دیس میں ایسے بھی ہیں کچھ لوگ اب تک
کنبہ بندی کے چلن کی جو اڑاتے ہیں ہنسی
شاخسانہ ہے انہی لوگوں کی ہٹ دھرمی کا
دیس کی ناؤ جو غربت کے بھنور میں ہے پھنسی

جو ہیں مغرور ابھی اپنی گراں جانی پر
اب جہالت کی گپھاؤں سے نکل کر دیکھیں
ان کو مل جائے گا کھوئی ہوئی خوشیوں کا سراغ
کنبہ بندی کی ذرا راہ پہ چل کر دیکھیں

وریندر پرشاد سکسینہ

تسکین قریشی ــــ حیات اور شاعری

محمد یٰسین صاحب تسکین قریشی جو ایک زمانہ میں تسکین سورنوی کے نام سے ادبی دنیا میں معروف و مقبول تھے، ان کے بزرگوں کا آبائی وطن ہندوؤں کا دھارمک استھان سوروں ضلع ایٹہ تھا اور یہیں وہ آخر ۱۸۹۸ء یا شروع ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ ایک اعلیٰ قریشی مسلم خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کے بزرگ شاہان مغلیہ سے پہلے سہسوان ضلع بدایوں میں آباد تھے۔ یہ خاندان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران تباہ و برباد ہوگیا، اس خاندان کی ایک بیوہ خاتون ترک وطن کرکے اپنے دو بچوں کے ساتھ سوروں ضلع ایٹہ میں اپنے والدین کے پاس آگئیں اور تسکین صاحب کے پردادا شیخ رفعت اللہ نے نانا کی تنہا جائداد کے وارث ہوئے کیونکہ ان کے نانا کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ تسکین صاحب نے ابتدا میں فارسی مولوی غلام علی صاحب سے پڑھی جو مضافات لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور فارسی زبان کے ایک عالم متبحر تھے۔ انھوں نے ۱۹۱۷ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول آگرہ سے ایس ایل سی کا امتحان پاس کیا اور سینٹ اینڈ روز کالج گورکھپور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل ہوگئے۔ مگر امتحان میں ناکامیاب رہے اس لیے انگریزی تعلیم انٹرمیڈیٹ (الف اے) تک ہی رہی۔ آپ ۱۹۲۲ء میں محکمہ پولیس میں ملازم ہوئے اور سب انسپکٹر پولیس کے عہدہ سے ترقی کرکے کورٹ انسپکٹر ہوگئے اور ۱۹۵۲ء میں اسی عہدے سے پنشن لے کر اپنے وطن سوروں کے بجائے میرٹھ میں سکونت اختیار کرلی۔ لیکن سال میں ایک بار اپنے وطن کی زیارت کرنے ضرور جاتے تھے۔ تسکین صاحب کینسر کے عارضے میں میرٹھ میں چند ماہ بیمار رہے۔ انتقال سے چند روز پہلے ان کے اعزا علاج کے لیے انھیں آگرہ لے گئے اور ۲۵ر جون ۱۹۷۱ء کو آگرہ میڈیکل کالج ہی میں ان کا چراغ زندگی گل ہوگیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۷۱ یا ۷۲ سال کی تھی اور یہ ان کا آخری سفر تھا حضرت جگر بریلوی نے یہ شعر تسکین جیسے شاعروں ہی کے بارے میں کہا ہوگا ؎

> تجھ سے کیا لیں انتقام اے خاکِ بے برگ و نوا
> وہ کہاں ہیں مہر و مہ تجھ میں جو پنہاں ہوگئے

تسکین صاحب ہمارے اس پرانے کلچر کی یادگار تھے جس میں مذہب اور انسانیت کی گہری چھاپ لگی ہوئی تھی۔ لیکن مذہب میں کٹرپن کہیں نظر نہیں آتا تھا سب مذہبوں کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کے جگری دوست تھے اور اُن کی وفات کا اُن کو بڑا صدمہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی مدد سے تسکین صاحب نے جامعہ ملیہ دہلی کی لائبریری میں "گوشۂ جگر" کے نام سے ان کی یادگار قائم کرادی تھی۔ ان میں حضرت جگر کی تصانیف کے علاوہ ان کی ذات سے متعلق بہت سی چیزیں محفوظ تھیں۔ تسکین صاحب کے خاندان میں شعر و شاعری کا کسی کو ذوق نہیں تھا لیکن آپ کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے لگاؤ تھا اور ۱۹۲۰ء میں حضرت عزیز لکھنوی مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ اپنی مرتب کی ہوئی کتاب مکاتیب جگر صحائفِ اسعد مکتوبات عزیز کے صفحہ ۲۶۵ پر آپ رقمطراز ہیں۔

" مجھے حضرت عزیز سے ۱۹۲۰ء میں شرف تلمذ حاصل ہوا تھا اور یہ نیازمندانہ تعلقات مسلسل پندرہ سولہ سال یعنی ان کے

انتقال تک قائم رہے۔"

ہمارے بعض ادیبوں نے حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کی یاد میں جب مضامین لکھے تو جگر مرادآبادی کے شاگردوں میں تسکین صاحب کا بھی نام لکھ دیا۔ میں نے اُن کو خط لکھا تو حضرت تسکین نے جواب دیا کہ جناب جگر مرادآبادی سے انھوں نے کبھی مشورۂ سخن نہیں کیا تھا۔

تسکین صاحب کی وفات پر دو تین مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اُن میں پروفیسر آل احمد سرور اور مسعود علی ذوقی صاحب کے مقالے قابلِ ذکر ہیں۔ سرور صاحب ۸ جنوری ۱۹۷۱ء کے "ہماری زبان" میں اپنا مقالہ ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

"تسکین صاحب کے کلام میں پختگی بھی تھی اور کیفیت بھی، شگفتگی بھی اور تاثر بھی۔ افسوس ہے کہ انھیں وہ شہرت نہ ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ اچھے رسالوں میں ان کا کلام ضرور چھپتا تھا مگر مشاعروں میں کم ہی شرکت کرتے تھے۔ تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ اپنی وضع خوب نبھا گئے۔ خدا ان کی تربت کو نور سے معمور کر دے۔"

جناب مسعود علی ذوقی یکم اگست ۱۹۷۱ء کے "ہماری زبان" میں رقم طراز ہیں:

"اردو کے کہنہ مشق شاعر اور عہدِ حاضر کے ممتاز غزل گو جناب تسکین قریشی کا ۲۴ جون (۱۹۷۱ء) کو آگرے میں انتقال ہو گیا۔ تسکین قریشی ان برگزیدہ فنکاروں میں تھے جو اپنی تصنیف کے وقار اور حسنِ کردار سے اپنے فن کے ناموں کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ میں تو جب بھی ان کا کلام پڑھتا ہوں مجھے لگتا ہے جیسے جگر (مرادآبادی) کے اسلوب اور تسکین کے اندازِ فکر نے شیر و شکر ہو کر ایک نیا روپ اختیار کر لیا ہو جس میں اوّل الذکر کی شگفتگی و رعنائی اور موخر الذکر کی پاکیزہ خیالی اور نکتہ دانی دونوں بڑی خوب صورتی کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے ہوں۔"

تسکین صاحب کی تصانیف کے بارے میں کچھ عرض کر دینا اس لیے بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بعض نقادوں اور ادیبوں نے ان کی تصانیف کے سلسلے میں بعض باتیں ایسی لکھ دی ہیں جو درست نہیں ہیں۔

(۱) **سرمایۂ تسکین جلد اول**۔ تسکین صاحب کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۶ء میں مطبع منشی ہر پرشاد سند تھر میں ...منشی ہر پرشاد شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ میں ۳۹ نظمیں اور صرف ۴۸ غزلیں ہیں۔ جناب مسعود علی ذوقی نے اپنے مضمون "تسکین قریشی کی یاد میں" مطبوعہ "ہماری زبان" یکم اگست ۱۹۷۱ء میں لکھا ہے۔

"سرمایۂ تسکین میں صرف نظمیں ہیں۔"

یہ صحیح نہیں ہے۔ تسکین صاحب کی شاعری کا یہ وہ دور تھا جب اُن کو نظموں سے لگاؤ تھا اور وہ ایک نظم نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں جانے پہچانے جاتے تھے۔

(۲) **سرمایۂ تسکین جلد دوم**۔ تسکین صاحب کی نظموں اور غزلوں کا دوسرا مجموعہ ہے جو ۱۹۳۶ء میں قائم کاسمو پرنٹنگ پریس سہارن پور سے طبع ہوا تھا۔ اس میں ۲۵ منظومات اور چالیس غزلیات ہیں۔ اس مجموعہ کی کئی نظمیں نصابِ تعلیم میں شامل تھیں۔ اس مجموعہ کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظموں پر سرور جہان آبادی کا بڑا گہرا اثر تھا۔

(۳) **گلگونہ**۔ ۱۹۵۱ء میں تاج پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ آپ کے کلام کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس میں تسکین صاحب نے اپنے نعتیہ کلام اور غزلیات کا انتخاب پیش کیا ہے۔ کسی غلط فہمی کی بنا پر جناب مسعود علی ذوقی نے یکم اگست ۱۹۷۱ء کے "ہماری زبان" میں یہ لکھا ہے کہ گلگونہ میں تسکین صاحب کا نعتیہ کلام ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس مجموعہ میں پروفیسر آل احمد سرور، حضرت اثر لکھنوی مرحوم، حضرت جگر مرادآبادی مرحوم اور حضرت حمید لکھنوی مرحوم کی رائیں ہیں اور سب نے آپ کے کلام کو سراہا ہے۔

(۴) **متاعِ تسکین**۔ اس میں گلگونہ کا تمام مطبوعہ کلام نظرِ ثانی اور مزید انتخاب و ترمیم کے بعد شامل کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ سرمایۂ تسکین جلد اول کی منتخب منظومات وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں اور ۱۹۵۲ء کے بعد جتنا غیر مطبوعہ کلام ہے وہ بھی درج کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ ان کے کلام کا مجموعی انتخاب ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے

کلام کا بہت سا حصہ انتخاب سے رہ گیا ہے۔

(۵) مکاتیبِ جگر، صحائفِ اسعد، مکتوباتِ عزیز۔ بظاہر یہ تین نام جداگانہ ہیں لیکن دراصل ایک ہی کتاب میں تینوں کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ اس میں حضرت جگر مراد آبادی، حضرت اسعد اللہ صاحب اور مولانا عزیز لکھنوی کے منتخب خطوط شامل ہیں۔ یہ کتاب نوئیں پرنٹنگ پریس دہلی سے مارچ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے مرتب جناب تسکین سورنوی ہیں۔ ہمارے زیادہ تر ادیبوں نے یہ لکھ دیا ہے کہ تسکین صاحب نے حضرت جگر مراد آبادی ہی کے خطوط مرتب کر کے شائع کرائے تھے۔ ان حضرات کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ حضرت تسکین اس کتاب کے آخری صفحہ ۸ پر رقم طراز ہیں:

"اس مجموعہ مکاتیب میں صرف تین حضرات کے خطوط شامل ہیں جو محض بطور یادگار اب تک رکھے ہوئے تھے۔"

اب تسکین صاحب کی شاعرانہ زندگی کے متعلق ضروری معلومات درج کیے جاتے ہیں جو انھوں نے ۲۲ اگست ۱۹۵۸ء کے خط میں مجھے لکھے تھے۔ وہ حسبِ ذیل ہیں:

"عہدِ حاضر میری شاعرانہ زندگی کا جو تھا دور ہے۔ ابتدائی (مشقیہ) دور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۶ء تک رہا۔ اس زمانے میں مجھے غزل گوئی سے بہت کم لگاؤ تھا کیونکہ اس زمانے کا رنگِ تغزل مجھے پسند نہ تھا۔ نظم نگاری اگرچہ ابتدائی منزل میں تھی لیکن جدت پسند طبائع اس صنفِ سخن سے زیادہ شغف رکھتی تھیں۔ چنانچہ میری توجہ تمام تر نظم گوئی پر مرکوز رہی اور بکثرت نظمیں لکھیں جو اس دور کے مشہور و موقر رسائل زمانہ (کانپور) اور شباب اردو (لاہور) وغیرہ میں خصوصیت کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ مختصر یہ ہے کہ اس صنفِ سخن میں تنوع و تجمل پیدا کرنے کی خاص کوشش کی گئی اس کا اعتراف جناب رام بابو سکسینہ مرحوم نے اپنی مشہور و مستند انگریزی تصنیف "اے ہسٹری آف اردو لٹریچر" میں کیا ہے۔ اس وقت میری شاعری کی عمر صرف ۷-۸ سال تھی۔

[اس دور کا مجموعۂ کلام سرمایۂ تسکین کے نام سے ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔ (رشید ربستاد)]

دوسرا دور وسط ۱۹۲۶ء سے شروع ہو کر وسط ۱۹۳۶ء میں ختم ہوتا ہے۔ اور اس دور کا مجموعۂ کلام بھی ۱۹۳۶ء میں چھپ چکا ہے۔ اس زمانے میں اگرچہ غزلوں سے زیادہ شغف ہو چکا تھا، تاہم نظم نگاری سے بھی پہلا سا لگاؤ رہا۔ ظاہر ہے کہ آج سے ۲۰-۲۵ سال پہلے کی لکھی نظموں کا کوئی موازنہ عہدِ حاضر کی منظومات سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ صنفِ شاعری پچھلے دس پندرہ سال میں بہت ترقی و تنوع حاصل کر چکی ہے لیکن ان منظومات کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان میں متعدد منظومات مدارس کی بعض نصاب کی کتابوں میں بھی داخل ہیں۔ جیسا کہ جناب مانی جائسی (مرحوم) نے اپنے مضمون "عزیز لکھنوی" مطبوعہ رسالہ نقوش شخصیات نمبر جلد دوم میں تحریر فرمایا ہے۔ مانی صاحب کے مضمون کا اقتباس حسبِ ذیل ہے:

"ان (تسکین) سے میرا تعارف تو کبھی نہیں ہوا۔ لیکن ان کا کلام اکثر رسائل میں دیکھا ہے۔ وہ بھی عزیز صاحب کے ممتاز شاگردوں کی صف میں آتے ہیں۔ اور اس صف میں امتیاز رکھتے ہیں۔ ان کا کلام مدارس کی بعض نصاب کی کتابوں میں بھی داخل ہے۔"

وسط ۱۹۳۶ء سے میری شاعری کا تیسرا دور شروع ہوا۔ میرا تیسرا مجموعہ کلام گلگونہ اس دور کی یادگار ہے جو حضرت جگر مراد آبادی، حضرت اثر لکھنوی، پروفیسر آل احمد سرور، مولانا عبدالماجد صاحب، حضرت نیاز فتح پوری جیسے اکابرینِ شعر و ادب اور معارف (اعظم گڑھ) آج کل (دہلی) معیار (میرٹھ) فاران (کراچی) وغیرہ جیسے موقر رسائل و جرائد سے سندِ قبولیت حاصل کر چکا ہے۔"

جناب تسکین کا شمار ہندوستان کے صفِ اوّل کے اساتذۂ سخن میں ہوتا تھا اور غزل اور نظم دونوں میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ تلامذۂ عزیز لکھنوی میں اثر لکھنوی، رواں (ناردی)، جوش ملیح آبادی، جگر بریلوی، امن لکھنوی وغیرہ زیادہ معروف ہیں لیکن تسکین کا مرتبہ بھی عزیز کے ان شاگردوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ تسکین کی شاعری کی ابتدا نظم نگاری سے ہوئی تھی اور یہ وہ دور تھا جب اردو شعرا کی ایک نئی نسل سرور جہان آبادی کے کلام سے متاثر ہو رہی تھی۔ اس دور میں تسکین نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ سرور جہان آبادی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ "موجِ تسنیم" "مرغابی" "قاز" "طاؤس"

جوگن"، "عشق"، "حقیقت زمانہ"، "انجام حیات"، "اور "انکسارِ کمال"
ان کی نظمیں بہت دلچسپ ہیں اور اردو زبان کے ساتھ زندہ رہیں گی۔

"موجِ ہستی" کے عنوان سے آپ نے اپنی نظم ۱۹۲۳ء میں لکھی تھی۔ اس وقت آپ کی شاعری کی عمر صرف ۵-۶ سال کی تھی۔ یہ نظم ایک زمانے تک نصابِ تعلیم میں شامل رہی۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

اک حوض چمن میں نزہت افزا دیکھا لبریز و مسطح و مصفا دیکھا
پانی کے سکوں کی تھی یہ کیفیت گویا کوئی آئینہ سراپا دیکھا

ناگاہ ہوا کے چند جھونکے آئے آئے تو وہ یوں آئے اور ایسے آئے
یہ سطح پر سکوں مٹا کر چھوڑا سوئی ہوئی لہروں کو جگاتے آئے

لہریں جو اٹھیں تو لڑکھڑاتی اٹھیں کچھ اٹھ کے گریں تو کچھ اٹھاتی اٹھیں
سمٹیں، ابھریں، ملیں اور آخر مل کر ہر سمت کو دائرے بناتی اٹھیں

قطرے کی نمود تھی نمایاں ان میں اک طرزِ وجود تھی نمایاں ان میں
بے حد و حساب کنارے تک تھی ہر شانِ جمود تھی ہویدا ان میں

اس حوض میں میں نے موجِ ہستی دیکھی تحریک ہوا میں ایک مستی دیکھی
اللہ کا بھید میں نے پایا تسکیں ہستی کی بلندی اور پستی دیکھی

دریائی پری پر اردو کے شعرا نے کئی قابلِ ذکر نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں سرور جہان آبادی اور تسکین سورنوی کی نظمیں ہمارے ادب میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تو مایۂ صد دلبری تو پیکرِ عشوہ گری
یا کوئی دریائی پری نازک شِ ادا ناز آفریں

پہلے اڑی پھر گر پڑی گر کر چلی چل کر بڑھی
اللہ ری پیراکی تری دم میں کہیں دم میں کہیں

یہ شاہکار نظم ان اشعار پر ختم ہوتی ہے:

اے پیاری مرغابی مگر تو ہے کوئی رشکِ بشر
اے کاش میں تفتہ جگر ہوتا ترا ہی ہم نشیں

نظم "جوگن" کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔ کیا خوب فرمایا ہے:

فطرت کی گل کاری تو ہے!
گل کی نزاکت باری تو ہے!
موجِ بادِ بہاری تو ہے!
پھر اپنا اعجاز دکھا دے ــــ ہاں پھر کوئی نغمہ گا دے
حسن ہے تیرا نور عریاں!
تیرا جلوہ صبح درخشاں!
قامت دلجو فتنۂ دوراں!
جانِ تمنا روحِ ارماں!
آگ لگی ہے دل میں بجھا دے ہاں پھر کوئی نغمہ گا دے

نعت رسول پر ہمارے اردو شعرا نے نہایت ہی قابلِ قدر نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں کرامت علی شہیدی، مولانا ضیاء القادری، حمید لکھنوی، عرش ملسیانی، تسکین سورنوی اور بہزاد لکھنوی وغیرہ زیادہ معروف ہیں۔ تسکین صاحب کے نعتیہ کلام کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اتر پردیش میں ان کے نعتیہ کلام کو بڑی عقیدت کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں ہندو اور مسلمان پڑھتے ہیں" "دوری و مہجوری" ملاحظہ فرمائیے:

ہزاروں آرزوؤں کا یہ حاصل لے کے آیا ہوں
کہ دل لے کر گیا تھا اور غمِ دل لے کے آیا ہوں
نیاز و ناز کے سارے مناظر ہیں ان آنکھوں میں
میں ان کی بزم سے محفل کی محفل لے کے آیا ہوں
نشاط دید سے چھلکی ہوئی ہے شوق کی دنیا
نظر بہکی ہوئی کھویا ہوا دل لے کے آیا ہوں
حجابوں کا یہ عالم، بے حجابی دیکھیے کیا ہو
کہ بے دیکھے یقینِ دید کامل لے کے آیا ہوں
بڑھا دی ہیں سفر نے لذتیں صحرا نوردی کی
میں ہر منزل سے دل میں یادِ منزل لے کے آیا ہوں

مدینہ سجدہ گاہِ دل ہے، مسجودِ حسیں کعبہ
یہی شوقِ زیارت کا میں حاصل لے کے آیا ہوں
مزار کے ہمیشہ شاد و آباد ان کو اے تسکین
کہ میں صدقے میں جن کے کاہشِ دل لے کے آیا ہوں

حضرت تسکین کی شاعری کے تیسرے اور چوتھے دور میں آپ کی شاعری کا محور و مرکز صرف غزل ہی رہا تھا کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ غزل کا ایک شعر پوری نظم کی ترجمانی کرسکتا ہے اور آخر میں آپ کا موضوعِ شاعری صرف غزل رہ گئی تھی۔ آپ کی عام غزلیں سادگی و حسن کی بھرپور آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ تیر و نشتر سے بھی [illegible] ہیں۔ ایسے اشعار کی بہتات ہے جو دل میں اتر جانے والے ہیں [illegible] ملاحظہ فرمائیے۔

[illegible] حقیقت نہ پوچھیے
[illegible] مجھ کو آپ سے ہے محبت نہ پوچھیے
[illegible] ادا نامِ محبت نہ ہو سکا
[illegible] ہوئی ہے دل کو ندامت نہ پوچھیے
کہنے کو دل میں کچھ بھی نہیں جز خیالِ یار
لیکن خیالِ یار کی وسعت نہ پوچھیے
[illegible] بھول جانے کے قابل ہیں عشق میں
افسانۂ مجاز و حقیقت نہ پوچھیے

[illegible] زندگی کی [illegible] سکے — ترے خیال کو جو زندگی بنا نہ سکے
[illegible] اٹھا نہ سکے — جو دل کو ٹوٹتے دیکھا تو مسکرا نہ سکے
[illegible] — تمہیں نے آگ لگائی تمہیں بجھا نہ سکے
[illegible] — ہمیں یہ غم ہے کہ طوفاں کا لطف اٹھا نہ سکے

وہ کیا کریں گے مداوائے دردِ دل تسکین
جو اک نگاہِ محبت کی تاب لا نہ سکے

کوئی ہنستا ہے کوئی رو رہا ہے
یہ آخر کیا تماشا ہو رہا ہے
سکونِ مرگِ عاشق کچھ نہ پوچھو
بہت جاگا ہوا تھا سو رہا ہے
کہیں رونے سے جاتا ہے غمِ دل
ارے کیوں جان اپنی کھو رہا ہے
مرے انجم کی جاگ اٹھی ہے قسمت
کہ وہ مستِ جوانی سو رہا ہے
محبت میں کسی کی کیا شکایت
جو ہوتا آ رہا ہے ہو رہا ہے
رہو تسکین سا ناشاد کوئی
اسے جس وقت دیکھو رو رہا ہے

دل کی تجلی دل ہو اگر دل — خلوت بہ خلوت محفل بہ محفل
کیا زندگی کا احساس کامل — تیرے بغیر اے غارت گرِ دل
دل اور وہ بھی ٹوٹا ہوا دل — اب زندگی ہے جینے کے قابل
ہوتا ہے جتنا خونِ تمنا — بڑھتی ہے اتنی رنگینیٔ دل
لب پہ تبسم آنکھوں میں آنسو — ہم لکھ رہے ہیں افسانۂ دل
قطرے کی ہستی اللہ اکبر — طوفاں بہ طوفاں ساحل بہ ساحل
تسکین سے ہم بھی اکثر ملے ہیں
کچھ بھی ہو لیکن ہے صاحبِ دل

★

غزل

قمرؔ مدنی

اس طرح [illegible] موسم تنہائی
آنکھوں سے گرے آنسو جب یاد تری آئی

کس شان سے گلشن میں [illegible]
برسات نے گل [illegible] لالے کے سینے پہ انگڑائی

ہر سمت خزاں کی [illegible]
کس منھ سے چمن والے کہتے ہیں بہار آئی

صحرا ہو کہ گلشن ہو گھر ہو کہ بیاباں ہو
اے عشق تری خاطر ہر سمت ہے رسوائی

آئینۂ حیرت ہے بازار جہاں [illegible]
کچھ محو تماشہ ہیں کچھ محو تماشائی

جلووں کی فراوانی سے تیرے تصور میں
پر کیف گذرتی ہے میری شب تنہائی

فرقت میں قمرؔ تیری جینا ہے نہ مرنا ہے
دل دے کے تجھے اس نے یہ کیسی سزا پائی

رباعیات

ماہرؔ حیدرآبادی

[illegible]ونٹوں کے مساوی گل تر بھی ہوں گے
گلشن میں کچھ ایسے ہی ثمر بھی ہوں گے
[illegible] وہ سب گن دیے ہیں سو عیب
سوچا نہیں ایسے تو ہنر بھی ہوں گے

[illegible] آب ہیں میخانہ میں پھر شام ڈھلے
کہنہ ہو شراب اور نیا دور چلے
[illegible] تک نہ پئیں جام لڑا کر دونوں
ملنے کے نہیں شیخ و برہمن بھی گلے

[illegible] ہے اگر پیاس بجھائی بھی ہے
اک آگ سی دل میں لگائی بھی ہے
[illegible] کی طرح میں نے جوانی ہے [illegible]
جو ناب کے دریا میں بہائی بھی ہے

[illegible] کو ظرف گدایانہ ہے
ساقی ترا انعام تو شاہانہ ہے
[illegible] میں جو ہے بحر تلاطم خانہ
ساحل کا مرے ہاتھ میں پیمانہ ہے

دنیا یہ سمجھتی ہے بہک جاتا ہے
کچھ بات تو ہے رند جو اتراتا ہے
اک دانۂ گندم نے زمیں پر پھینکا
اک قطرۂ مے عرش پہ لے جاتا ہے

بدیع الزماں اعظمی

قدرتی چشمے اور ان کی افادیت

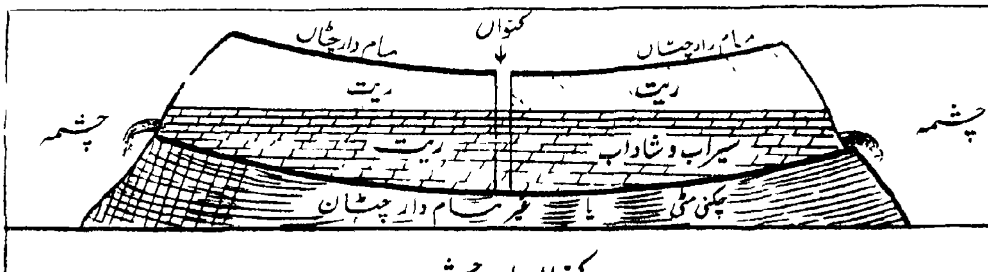
ہم جانتے ہیں کہ بارش کا پانی تین طریق پر ضائع ہوتا رہتا ہے۔ بیشتر حصہ تو ندی نالوں کی راہ بہہ کر سمندروں میں واپس چلا جاتا ہے۔ کچھ حصہ عمل تبخیر سے بھاپ بن کر فضا میں اٹھ جاتا ہے اور کچھ حصہ زمین میں جذب ہو کر آب زمین دوز کہلاتا ہے۔ یہی آب زمین دوز چشموں کو جنم دیتا ہے۔

قدرتی چشموں کی ساخت

قشر ارض کی بناوٹ مختلف قسم کی چٹانوں پر مشتمل ہے ان میں سے کچھ تو مسام دار ہوتی ہیں اور کچھ غیر مسام دار۔ مسام دار چٹانوں میں بارش کا پانی آسانی سے جذب ہوتا رہتا ہے اور غیر مسام دار چٹانوں میں پانی جذب نہیں ہوپاتا۔ اگر کسی خطۂ ارض پر مسام دار چٹان سطح ارض تک ہو اور اس کے نیچے غیر مسام دار چٹان کی تہہ ہو تو بارش کا پانی مسام دار چٹانوں میں جذب ہو کر اسے سیراب اور شاداب کر دیتا ہے۔ جب یہ پانی سب سے کمزور نقطہ کو توڑ کر باہر نکلنے لگتا ہے تو اسی کو قدرتی چشمہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ نیچے دی ہوئی شکل سے ظاہر ہوتا ہے۔

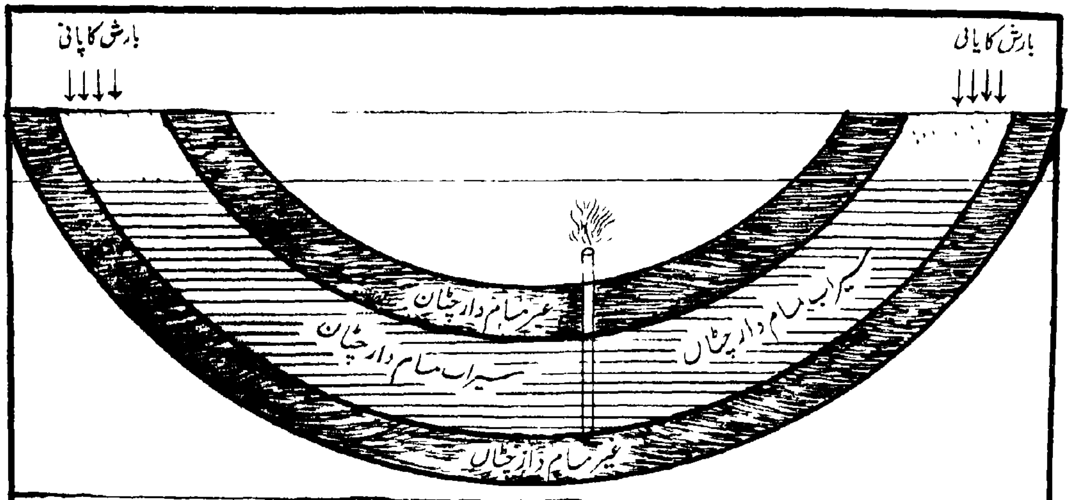
کرۂ ارض پر ان چٹانوں کی ترتیب کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ کہیں پر یہ سطح زمین کے متوازی ہوتی ہیں اور کہیں پر ترچھی اور کہیں پر خم دار ہوتی ہیں۔ ان کے خم کہیں کہیں پر پیالہ نما ہوتے ہیں۔ ان پیالہ نما یا گول تہوں میں بعض اوقات مسام دار یا نفوذ پذیر چٹانیں غیر مسام دار یا غیر نفوذ پذیر چٹانوں کے درمیان پڑ جاتی ہیں۔ اگر مسام دار یا نفوذ پذیر چٹان کے سرے سطح ارض پر کھلے ہوئے ہوں تو بارش کا پانی ان کے اندر جذب ہوتا رہتا ہے جس سے تہہ میں مسام دار یا نفوذ پذیر چٹان پانی سے سیراب ہو جاتی ہے۔

جہاں پر زمین کی ساخت اس قسم کی ہوتی ہے۔ وہاں پر مصنوعی چشمے جنھیں پاتال توڑ کنویں یا آرٹیزین کنویں (ARTESIAN WELLS) کہتے ہیں کھودے جا سکتے ہیں اس قسم کے کنویں دنیا کے بیشتر حصوں بالخصوص آسٹریلیا کے متعدد علاقوں اور صحرائے اعظم افریقہ میں کثیر تعداد میں کھودے گئے ہیں۔ ان چشموں یا کنووں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان سے پانی فوارہ کی شکل میں اپنے آپ کچھ مدت تک نکلتا رہتا ہے۔ پانی کے اخراج سے



کنواں اور چشمے

حسب سطح آب نیچی ہوجاتی ہے تو پھر پانی پمپ کرکے نکالنا پڑتا ہے جیسا ... ہوئی شکل سے ظاہر ہوتا ہے۔



(ARTESIAN WELL) آرٹیزین کنواں

قدرتی چشمے کئی طرح کے ہوتے ہیں (۱) سرد پانی کے چشمے (۲) گرم پانی کے معدنی چشمے (۳) کھولتے ہوئے پانی کے چشمے۔

سرد پانی کے چشمے

یہ چشمے زیادہ تر پہاڑی علاقوں اور ریگستانی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں کے چشمے ندی نالوں کو اور ریگستانی علاقوں کے چشمے نخلستانوں کو جنم دیتے ہیں۔ گنگوتری اور جمنوتری جو بالترتیب گنگا اور جمنا ندیوں کے منبع ہیں ایسے ہی سرد پانی کے چشمے ہیں۔ ریگستانی علاقوں میں ان قدرتی چشموں کا وجود قدرت کی بہت بڑی دین ہے۔ انھیں کے دم سے نخلستان سرسبز و شاداب رہتے ہیں۔ صحرائے اعظم افریقہ اور جزیرۃ العرب کے تمام نخلستان ان کی زندہ مثالیں ہیں۔

گرم پانی کے چشمے

جب زمین دوز پانی زمین کے کسی گرم طبقہ سے گذرتا ہے تو اس کا درجۂ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ اُس طبق میں پائے جانے والے کیمیائی مادے گرم پانی میں تحلیل ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے چشموں کا پانی جلدی امراض کے لیے مفید ہوتا ہے۔

کھولتے ہوئے پانی کے چشمے

یہ زیادہ تر آتش فشانی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ جزیرہ آئس لینڈ، شمالی نیوزی لینڈ اور ریاستہائے متحدہ (امریکہ) کے مغربی حصہ میں (YELLOW STONE NATIONAL PARK) اس کے مخصوص علاقے ہیں۔ آئس لینڈ کی زبان میں ایسے چشموں کو گیسر کہتے ہیں۔ ان چشموں سے کھولتا ہوا پانی فوارے کی شکل میں تھوڑے وقفہ کے ساتھ نکلتا رہتا ہے۔ امریکہ میں ایک ایسا چشمہ جس کا پانی ایک ایک منٹ کے بعد نکلتا رہتا ہے منٹ مین (MINUTE MAN) کہلاتا ہے۔ اولڈ فیتھفل (OLD FAITHFUL) نام کا ایک دوسرا مشہور گیسر ہے جس کا ابال ۳۵ منٹ سے ۹۵ منٹ کے وقفہ کے بعد ہوتا رہتا ہے یعنی ایک ابال سے دوسرے ابال تک کا اوسط وقفہ ۶۵ منٹ تک کا ہوتا ہے۔ جب جب اس کا ابال ہوتا ہے تو کھولتے ہوئے پانی اور بھاپ کے ستون کی اونچائی ۱۰۶ فٹ سے ۱۸۸ فٹ تک ہوتی ہے۔ البتہ ۱۸۸۸ء میں ایک ابال کی اونچائی کی بلندی تین سو فٹ تک ناپی گئی تھی۔ اس کا ایک ابال اوسطاً ۴ منٹ تک رہتا تھا۔ ایک ابال میں تقریباً دس بارہ ہزار گیلن پانی کا اخراج ہوتا ہے۔ خارج شدہ پانی کا زیادہ تر حصہ بہ کر فائر ہول ندی (FIREHOLE RIVER) میں چلا جاتا ہے۔ اس کے ابال کو دیکھنے کے لیے لوگ جوق در جوق وہاں

پیش ہوتے ہیں۔



(۱) نیفیفل گیسر کے اُبال کا ایک منظر

شمالی ہوری لینڈ میں ترادیرا آتش فشاں کے قریب کھولتے ہوئے پانی کا ایک چشمہ ہے۔ یہ مشہور گیسر ۱۹ء سے ۱۹۰۴ء تک تقریباً روزانہ کھولتے ہوئے پانی کو فوارہ کی شکل میں ۱۶۰۰ فٹ کی بلندی تک پھینکتا رہا۔ اس کا پانی اتنا گرم ہوتا ہے کہ یہاں کے قدیم باشندے (ماؤری لوگ) اس پانی میں آلو ابال لیتے ہیں۔ ہاں اس کا پانی جب بہہ کر کچھ دور پہنچ جاتا ہے تو صرف اتنا گرم رہ جاتا ہے کہ لوگ جاڑے کے موسم میں مزہ لے کر نہاتے ہیں۔

بھارت کے مخصوص چشمے

(۱) صوبہ بہار میں راج گیر کا علاقہ ایسے چشموں کے لیے مشہور ہے۔ یہ چشمے عرف عام میں کنڈ کہلاتے ہیں ان کے پانی میں مختلف قسم کے کیمیاوی مادے تحلیل رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے پانی مختلف امراض مثلاً گٹھیا، جوڑوں کے درد، جلدی امراض اور بدہضمی کو دور کرنے میں جادو کا اثر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سارے کنڈ تیرتھ استھان بن گئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور چشمہ سپت رشی کنڈ ہے۔ یہ مستطیل شکل کا ہے اس کی لمبائی ۹ فٹ، چوڑائی ۸ فٹ اور گہرائی ۲ فٹ ہے۔ اس کنڈ میں پانی پتھر کی سات نالیوں سے نکل کر اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ ان نالیوں کو سات رشیوں۔ گوتم، بھردواج، وشوامتر، جمد اگنی، وششٹ، کشیپ اور اتری کے ناموں سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

(۲) سپت رشی کنڈ کے پورب جانب سرسوتی ندی قریب کی پہاڑی سے نکل کر دلفریب انداز میں بہتی ہے۔ ندی کے پورب میں ویبھار گری پربت کے دامن میں کئی ایک کنڈ ہیں جن میں سیتا کنڈ، شرنگ رشی کنڈ، گنیش کنڈ، سورج کنڈ اور چندرما کنڈ مشہور ہیں۔ یہ سب گرم پانی کے چشمے ہیں۔ ان کنڈوں میں موسم سرما میں اشنان کرنا بہت ہی خوشگوار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہندو، جین اور بدھ مت کے یاتری ہزاروں کی تعداد میں یہاں ہر سال



گوداوری ندی کا وہ پوتر استھان جہاں ایک کریہہ المنظر جوڑا اشنان کرنے کے بعد ایک خوبرو جوڑے میں تبدیل ہو گیا

نوٹ تصاویر بہ شکریہ "MIRROR" (بدیع الزماں)

ٓتے ہیں اور ان میں اشنان کرکے نہ صرف آنند پاتے ہیں بلکہ اپنی آتما کو سکھی بھی بناتے ہیں۔ سیتا کنڈ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا گرم پانی کا چشمہ ہے۔ اس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ سیتا دیوی نے اس کنڈ میں اشنان کیا تھا۔ اسی لیے اس کا نام سیتا کنڈ پڑا۔

(۳) بردوہ اور راسٹرا کی سرحد پر اُنّی کا کنڈ ہے جہاں گٹھیا، دمہ اور عرق النسا کے مریض بڑی تعداد میں آتے رہتے ہیں اور ان میں اشنان کرکے مکمل شفا پاتے ہیں۔ اس کنڈ کے پانی میں گندھک، چونا، امونیا کلورائیڈ کے علاوہ دیگر نمکیات کی بھی آمیزش رہتی ہے۔ اس کنڈ کے متعلق یہ دیومالا زبان زد عام ہے کہ جب فتح لنکا کے بعد شری رام چندر جی اپنی پتنی سیتا جی کو لیے اڑن کھٹولے (پشپک ودمان) پر لیے ہوئے آرہے تھے تو ان کی نگاہ آگست رشی کے آشرم پر پڑی۔ انہوں نے اپنے سوار یا اڑن کھٹولے کو روک دیا اور رشی کے درشن کے لیے اتر پڑے۔ رشی مہاراج نے شری رام چندر جی کو راون کے قتل کے سلسلے میں ایک خاص قسم کی تپسیا کی ہدایت دی چنانچہ شری رام چندر جی نے اس مقام کا انتخاب کیا۔ چونکہ اس سنسان اور غیر آباد علاقے میں سوائے **بھیل** کے کوئی برہمن نہ تھا اس لیے برہمنوں کو ہمالیہ کے پہاڑی علاقے سے لانا پڑا۔ ان برہمنوں کی آسائش کے خیال سے شری رام چندر جی نے زمین میں ایک ایسا تیر مارا کہ زمین سے گرم پانی کا چشمہ ابل پڑا جو اُنّی کا کنڈ کہلاتا ہے۔

(۴) ممبئی کے قریب واجریشوری نام کے گرم معدنی چشمے ہیں۔ ان میں سورج کنڈ کا پانی سب سے زیادہ گرم ہے۔ جو لوگ گرم پانی سے اشنان کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ اس کنڈ کے قریب بیٹھ کر پانی بھر بھر کر نہاتے ہیں لطف اٹھاتے ہیں۔ اس کنڈ کے پانی میں دیگر معدنی اجزا کے ساتھ ساتھ گندھک کا جُز زیادہ ہوتا ہے۔ بقیہ کنڈوں میں کیلشیم کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ ان کنڈوں کا پانی پینے سے مختلف اقسام کی جسمانی شکایتیں دور ہو جاتی ہیں۔ اس کنڈ سے چند میل کے فاصلے پر گنیش پوری استھان پر دو کنڈ اور ہیں جن کا پانی بطور دوا استعمال کیا جاتا ہے۔

(۵) ریاست میسور (کرناٹک) میں ایک خوبصورت پہاڑی مقام نندی دُرگ ہے جو سطح سمندر سے لگ بھگ ۴۸۰۰ فٹ بلند ہے۔ گرمی کے موسم میں بھی یہاں سہانی رُت رہتی ہے۔ اس لیے یہ مقام بھارت کے مختلف گوشوں سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ بلاتا ہے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر ایک معدنی چشمہ ہے جو "امرت سرور" کے نام سے مشہور ہے۔ لوگوں کا اس بات پر یقین ہے کہ اس چشمہ کے پانی میں مختلف امراض کو دور کرنے کی خاصیت ہے چنانچہ نندی درگ ایک صحت بخش اور پُرفضا مقام ہونے کے ساتھ ساتھ امرت سرور کی بدولت ایک خاص شہرت کا مالک بن گیا ہے۔

(۶) انبالہ میں امبا کا کنڈ اتری بھارت میں تیرتھ استھان بن گیا ہے جہاں دوران سال ہزاروں مریض آتے اور اس کے پانی میں اشنان کرکے شفا پاتے ہیں اس کنڈ میں پانی ہمالیہ کی ترائی سے آتا رہتا ہے اس کے متعلق یہ دیومالا زبان زد عام ہے کہ ایک راجپوت سردار جس کا نام امبا تھا برص کے مرض میں مبتلا تھا۔ وہ اس گھناؤنی بیماری سے نجات پانے کے لیے ایک مدت تک مختلف مقامات کی خاک چھانتا رہا۔ ایک دن جبکہ وہ گھوڑے پر سوار اپنی اسی مہم پر جا رہا تھا تو دھوپ کی تمازت سے پیاس کی شدت محسوس کرنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ زمین کے ایک ننھے سے سوراخ سے پانی قطرہ قطرہ نکل رہا ہے۔ وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور پیاس بجھانے کی غرض سے اس نے سوراخ کو بڑا کرنے کے لیے اپنی انگلیوں سے کھودنا شروع کیا۔ سوراخ قدرے بڑا ہو گیا اور اس میں سے پانی کی دھار نکلنے لگی۔ میٹھے اور ٹھنڈے پانی سے اس نے اپنی پیاس بجھالی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھ کا جتنا حصہ پانی سے تر ہو چکا تھا وہاں کے سفید داغ بھی دور ہو چکے تھے۔ اس نے مزید کوشش کرکے اتنا بڑا گڈھا کھود لیا کہ جس میں بیٹھ کر اس نے کئی بار ڈبکی لگائی۔ ڈبکی لگانے کے بعد جب وہ پانی سے باہر آیا تو نہ مرض باقی رہا نہ مرض کا کوئی نشان۔ وہ بالکل صحتیاب ہو چکا تھا۔

امبا کا کنڈ جو ایک گڈھے کی شکل میں تھا اب ایک چوکور تالاب کی شکل میں ہے۔ جو لوگ اس تالاب میں اشنان کرنے آتے ہیں کنڈ میں چاندی کے سکے ڈال کر اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

(۷) راجستھان میں پُشکر ایک تیرتھ استھان ہے۔ پُشکر جھیل بھارت کی سب سے زیادہ پوتر جھیل مانی جاتی ہے۔ اس جھیل کے کنارے برہما کا مندر بنا ہوا ہے جو اپنی نوعیت کا بھارت میں واحد مندر ہے۔ اس جھیل کے سلسلے میں ایک قدیم روایت چلی آرہی ہے کہ گیارہویں صدی میں

ایک راجا سمنی نرسہرراؤ شکار کھیلتے ہوئے اس جھیل کے کنارے آ پہنچا۔ وہ پیاس بجھانے کی غرض سے گھوڑے سے اتر پڑا۔ پانی میں ہاتھ پیر دھونے کے بعد اس نے اپنی پیاس بھی بجھائی اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پانی کے اثر سے اس کا لاعلاج جلدی مرض بھی جاتا رہا۔ اس خیال سے کہ جھیل کے پانی میں ایک اعجازی قوت ہے اس نے اس کے چاروں طرف کناروں پر پختہ گھاٹ تعمیر کرا لیے یہ بھی مشہور ہے کہ چند ضعیف اور بدصورت رشیوں کی کایا پلٹ اس جھیل میں اشنان کرنے کے بعد ہو گئی۔ اشنان کے بعد وہ خوبرو نوجوانوں میں تبدیل ہو گئے۔

عوام میں چونکہ یہ عقیدہ راسخ ہے کہ تالاب کے پانی میں امراض سے نجات دلانے کی خداداد صفت پائی جاتی ہے اس لیے اس کے کنارے ہمہ وقت لوگوں کا ایک میلہ سا لگا رہتا ہے خاص کر سنکرانت میلہ کے وقت تو ایک بھاری اجتماع ہوتا ہے۔

(۸) گوداوری ندی جو دکھنی بھارت کی ایک خاص ندی ہے گنگا کی طرح اپنی پوترتا اور تقدس کے لیے مشہور ہے کہا یہ جاتا ہے کہ گوتم منی کے ایک بیٹا تھا۔ اس کا نام بھی گوتم تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی یہ کہ اس نے اسے ناک سے محروم کر رکھا تھا۔ جب وہ جوان ہوا تو اپنی ہیئت کذائی پر اسے بڑا دکھ رہنے لگا۔ اس سلسلے میں اس نے بہت کچھ دوا اور دعا سے کام لیا مگر سب بے سود۔ ایک دن اس کا گذر سوتیا گری پربت کے ایک غار میں ہوا جہاں ایک بڑھی اور کریہہ المنظر عورت نے یہ کہتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا کہ ایک مدت سے مجھے تمہارا انتظار تھا۔ اس عورت نے اسے اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا کہ دیوتاؤں نے مجھے یہ حکم دیا کہ جو بھی اس غار میں سب سے پہلے آئے اس سے میں شادی کر لوں۔ اب تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔ گوتم نے بہت کچھ دہائی دی اور ایک دوسرے کی عمر کے تفاوت کے خیال سے منت سماجت کی کہ وہ اپنے ارادہ سے باز آئے مگر ایک طرف سے جتنا انکار ہوتا رہا دوسری طرف سے اسی قدر اصرار کی شدت بڑھتی گئی۔ گوتم کو جب راہ فرار نظر نہ آئی تو وہ بادل نخواستہ شادی کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ نیا جوڑا لوگوں کے لیے باعث تفریح بن گیا۔ دونوں تنگ آ کر اگست منی کے پاس گئے اور ان کے چرنوں میں گر کر ان کا مشورہ طلب کیا انھوں نے ان دونوں کو گوداوری ندی میں اشنان کرنے کا مشورہ دیا۔ دونوں جب اشنان کر کے ندی سے باہر آئے تو ایک حسین و جمیل جوڑے میں تبدیل ہو گئے۔

بھارت کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی اس قسم کے معدنی چشمے پائے جاتے ہیں جو طبی نقطۂ نظر سے اپنے اندر بعض امراض سے شفا دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایشیا کے مغربی ساحل کے قریب کلانگ کے مقام پر ایک چشمہ ہے جس کا پانی وجع مفاصل کی تکالیف دور کرنے میں تیر بہدف ثابت ہوا ہے۔ اس چشمہ کا پانی یہاں سے لوگوں نے اسے اپنے رشتہ داروں کے لیے بوتلوں میں بند کر کے دوسرے ملکوں کو بھی بھیجا ہے وہ مفید ثابت ہوا ہے اس چشمے کے کنارے ہمہ وقت بھیڑ سی لگی رہتی ہے۔ حاملہ عورتیں تو اس چشمہ کے پانی کو پیٹ اور سر پر اس غرض سے ملتی ہیں کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق بچہ پیدا کر سکیں۔

جاپان میں بھی گرم پانی کے معدنی چشمے تقریباً ایک ہزار کی تعداد میں پائے جاتے ہیں جو گٹھیا، جلدی امراض اور بدہضمی کی شکایت دور کرنے کے لیے مشہور ہیں جاپان کا سب سے مشہور چشمہ جزیرہ کیوشو میں ساحل سمندر کے قریب بپو مقام پر واقع ہے ہزاروں آدمی یہاں اشنان کرنے کے لیے آتے ہیں ہر شخص اپنے لیے چشمہ کے کنارے اتنا گہرا گڈھا کھود لیتا ہے کہ جس کے اندر وہ گردن تک اپنے کو چھپا سکے جب وہ گڈھے کے پانی میں اترتا ہے تو اس کے ساتھی اس کا دھڑ ریت سے ڈھک دیتے ہیں۔ چشمے کے گرم پانی کی طبی خاصیت، ریت کے دباؤ اور نسیم بحری کے جاں فزا جھونکوں کی بدولت جب وہ شخص چند گھنٹوں کے بعد قبر نما گڈھے سے باہر نکلتا ہے تو اپنے کو بالکل تندرست پاتا ہے۔

فرانس کے دلکشی علاقہ میں بھی ایک چشمہ ہے جس کے پانی میں گندھک محلول رہتی ہے۔ اس چشمہ کا پانی پینے میں بہت ہاضم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس چشمہ کا پانی بوتلوں میں بند کر کے عام طور پر فروخت ہوتا ہے۔

ان چشموں کے بارے میں جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں وہ خواہ سچی ہوں یا من گڑھت مگر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ قدرت نے ان قدرتی چشموں کو روئے زمین پر بکھیر کر ابن آدم پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ یہ ہمارے لیے قدرت کا ایسا انعام ہے کہ ہماری گردنیں بارِ احسان سے اس کی بارگاہ میں جھک جاتی ہیں۔

★

غزلیں

مختار بارہ بنکوی

غمِ دو جہاں ہو کے کیا کیجیے گا
ابھی سے جواں ہو کے کیا کیجیے گا

مناسب نہیں ہم پہ لطف و عنایت
حریفِ جہاں ہو کے کیا کیجیے گا

ہماری کہانی نہ سنیے نہ سنیے
شریکِ فغاں ہو کے کیا کیجیے گا

ہمیں زندگی بھر کے غم مل چکے ہیں
بس اب مہرباں ہو کے کیا کیجیے گا

نظر ہی نظر ہے بہ حدِّ تجلّی
نظر سے نہاں ہو کے کیا کیجیے گا

قیامت کو کافی ہیں اتنے ہی جلوے
زیادہ عیاں ہو کے کیا کیجیے گا

دل دیجیے غم بہاروں سے مختارؔ
سکونِ خزاں ہو کے کیا کیجیے گا

سلیم صدیقی

معالجوں کے دہن بند ہیں کلی کی طرح
کھلا ہوا ہے ہر اک زخم چاندنی کی طرح

پڑا ہوں ایک کنارے میں خشک ہونٹ لیے
رواں دواں ہے وہ ہر اک موجِ بے حسی کی طرح

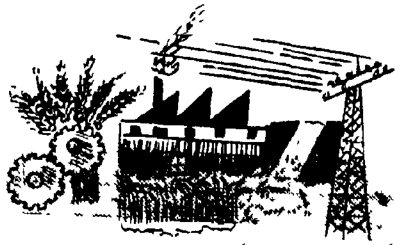
کھڑے ہو دُور عجب طور ہے یہ ملنے کا
جو جانور کی طرح ہے نہ آدمی کی طرح

نہیں ہے اس سے کوئی آس اُنس کی لیکن
وہ میرے ساتھ ہے دَر دَر رَدا رَوی کی طرح

ہر ایک شخص تھا ہر چند جانا پہچانا
گزر گیا میں ہر اک در سے اجنبی کی طرح

اسی لیے تو مری موت منہ چھپاتی رہی
کہ زندگی بھی نہ تھی میری زندگی کی طرح

وفا پرست وہ ایسا کہ آخری دم تک
سلیمؔ ساتھ تھا الزامِ خودکشی کی طرح



اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

ٹکنیکی تعلیم کے نظام کو مزید کارآمد بنانے پر وزیر اعلیٰ کا زور • • • اتر پردیش گیہوں لیوی آرڈر • • • معقول قیمتوں پر سوت کی فراہمی کی یقین دہانی • • • زرعی پیداوار کی فی ہیکٹر مالیت کے معاملے میں پانچ مغربی اضلاع ملک میں سرفہرست • • • اتر پردیش ایڈوکیٹ فلاحی فنڈ ایکٹ • • • ہمیرپور میں چار نئی پمپ نہروں کی تعمیر • • • اردو ٹیچروں کے مہنگائی بھتے میں اضافہ • • • اتر پردیش میں قومی بچت اسکیموں میں مقررہ نشانے سے زیادہ رقم جمع • • • ناقص دواؤں کے خلاف بروقت کارروائی • • • سڑکوں کی تعمیر کے لیے سات ضلع پریشدوں کو مالی امداد • • • اتر پردیش میں زمین کے حصول سے متعلق ایکٹ کا نفاذ • • • قدرتی آفتوں اور بہتر کارکردگی کے سلسلے میں تعلیمی اداروں کو مالی امداد • • • آگرہ میونسپل بورڈ کی تعمیر مکانات کے لیے قرضہ

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے ریاستی ٹکنکی تعلیم کے محکمے کے سینئر افسروں سے کہا کہ وہ ریاست میں پانچویں منصوبے کے دوران نئے پالی ٹکنیک قائم کرنے کے بجائے موجودہ ۲۸ پالی ٹکنیکوں کی نو تنظیم کرنے اور انھیں مستحکم بنانے کے سوال پر سنجیدگی سے غور و خوض کریں۔ انھوں نے بہرحال ریاست میں خواتین کے لیے ایک دوسرا پالی ٹکنیک کھولنے کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ریاست میں موجودہ پالی ٹکنیک میں سالانہ داخلوں کی گنجائش ۶۰۰۰ سے زیادہ ہے۔

وزیر اعلیٰ نے ٹکنیکی تعلیم کے فروغ سے متعلق مسائل پر غور و خوض کرنے کے لیے منعقدہ ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے ٹکنیکی تعلیم کو روزگار کی فراہمی کے مواقع سے بھرپور بنانے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ ان اداروں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلنے والے افراد کو بلا تاخیر منفعت بخش روزگار حاصل ہو سکے۔ اس جلسہ میں تعلیم، مالیات اور منصوبہ بندی محکموں کے سکریٹریوں، ٹکنیکی تعلیم کے ڈائرکٹر اور الہ آباد پالی ٹکنیک کے پرنسپل نے بھی شرکت کی۔

وزیر اعلیٰ نے حکم دیا کہ پانچویں منصوبے میں ٹکنیکی تعلیم کی ترقی کے لیے مخصوص ۵۵ء۸ کروڑ روپے کے مصارف کی ابتدائی رقم بڑھا کر ایک کروڑ روپیہ کر دی جائے تاکہ آئندہ تعلیمی سال کے دوران ایسی اسکیمیں بروئے کار لائی جا سکیں جنھیں موجودہ مالیاتی سال کے بجٹ میں شامل نہیں کیا جا سکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس رقم میں سے سال رواں کے واسطے ۵۰ لاکھ روپیہ فراہم کیا جائے گا۔

شری بہوگنا نے یہ بھی کہا کہ مالیاتی منظوری اور پالی ٹکنیکوں کی طرف سے بلا تاخیر پروگراموں پر عمل درآمد کے مسئلے کو تیزی سے نپٹانے کے لیے مالی امداد کی منظوری کا اختیار ٹکنیکی تعلیم کے ڈائرکٹر کو دیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ ان پالی ٹکنیکوں میں طلبا کی ٹریننگ کے سلسلے میں متفرق اخراجات کی رقم میں اضافہ کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا تاکہ روپے کی کمی کی وجہ سے ان کی عملی ٹریننگ پر خراب اثر نہ پڑنے پائے۔

حکومت اتر پردیش نے ضروری اشیاء سے متعلق ایکٹ ۱۹۶۵ کی دفعہ ۳ کے تحت حاصل شدہ اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے گزشتہ بدھ کو جاری کردہ ایک اعلانیہ کے ذریعہ اتر پردیش گیہوں (لیوی) آرڈر ۱۹۷۴ء نافذ کر دیا ہے جس کا مقصد ریاست میں مناسب قیمتوں پر گیہوں کی یکساں تقسیم اور یقینی فراہمی کا بندوبست کرنا ہے۔

اس آرڈر کے تحت ہر لائسنس یافتہ بیوپاری ہندستان غذائی کارپوریشن یا ریاستی حکومت کے کنٹرولر یا اس کے نامزد نمائندے کو فروخت مرکز پر اس آرڈر کے نافذ ہونے کی تاریخ سے اپنے اسٹاک کا ۵۰ فیصد گیہوں فروخت کرے گا اور ۵۰ فیصد گیہوں جو اس نے خریدا ہے یا اس کی تحویل میں آیا ہے یا فروخت کے لیے اس کے قبضہ میں ہے یا کمیشن کی بنیاد پر اس کے پاس ہے یا کسی دوسری طرح اس کی تحویل میں ہے مذکورہ آرڈر کے نافذ ہونے کی تاریخ سے روزانہ اس وقت

تک ذخیرہ کرنا رہے گا جب تک ریاستی حکومت کوئی دوسری ہدایات جاری نہ کرے۔

لائسنس یافتہ بیوپاری کو عمدہ قسم کے اوسط درجے کے گیہوں کے لیے ۱۰۵ روپیہ فی کوئنٹل کے حساب سے قیمت اس شرط کے تحت ادا کی جائے گی کہ اگر مذکورہ گیہوں کی قسم مقررہ معیار سے ادنیٰ ہوگی تو قیمت میں اسی تناسب سے کمی کر دی جائے گی۔ اس آرڈر کے تحت کوئی بیوپاری ایسا گیہوں کا اسٹاک نہ تو اس وقت تک فروخت کرے گا نہ نکالے گا نہ کسی دوسری جگہ منتقل کرے گا جب تک وہ ریاستی حکومت کو گیہوں کا مقررہ فیصد نہیں فروخت کر دیتا اور بقیہ اسٹاک کے سلسلے میں ریلیز سرٹیفکیٹ حاصل نہیں کر لیتا۔

تمام لائسنس یافتہ بیوپاریوں کو مذکورہ آرڈر کے تحت ریاستی حکومت یا کلکٹر کی جاری کردہ کسی بھی ہدایت کی تعمیل کرنا ہوگی۔ ریاستی حکومت مفاد عامہ کے پیش نظر کسی بھی علاقے میں سوی کے فیصد کو مستثنیٰ کر سکتی ہے یا فیصد میں کمی کر سکتی ہے۔

اس آرڈر کے تحت نفاذ افسر کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ ایسی جگہوں میں داخل ہو سکتا ہے جہاں گیہوں کے کسی ذخیرہ پر اسے شبہ ہو۔ وہ اس سلسلے میں جانچ کر سکتا ہے اور حسابات کی ایسی کتابوں یا کاغذات کو اپنے قبضے میں لے سکتا ہے جو مذکورہ آرڈر کی خلاف ورزی کے سلسلے میں کسی بھی کارروائی کے لیے مفید ثابت ہوں۔ اس کے علاوہ نفاذ افسر کسی بھی عمارت کاڑی یا کشتی کی تلاشی لے سکتا ہے اور گیہوں یا گیہوں سے تیار ہونے والی اشیا پر اس یقین کے ساتھ قبضہ کر سکتا ہے کہ اس سے مذکورہ آرڈر کی خلاف ورزی ہوئی ہے یا ہو رہی ہے یا ہونے کا امکان ہے۔ نفاذ افسر کو اس سلسلے میں ضروری کارروائی کرنا ہوگی۔ مختلف قسم کے گیہوں کی صراحت کر دی گئی ہے جس کے بموجب گیہوں کی قسم کا تعین تین گریڈوں کے تحت کیا جائے گا۔

عمدہ قسم کے اوسط درجے کے گیہوں کی شرح ۱۰۵ روپے فی کوئنٹل ایک گریڈ کم کے گیہوں کے لیے ۱۰۴ روپے دو گریڈ کم کے لیے ۱۰۳ روپے اور تین گریڈ کم کے لیے ۱۰۲ روپے فی کوئنٹل ہوگی۔

X X X

اترپردیش کے چھوٹی صنعتوں کے وزیر شری اصطفیٰ حسین نے کہا کہ ریاست میں خام مال کی کمی کا سامنا کرنے والے بنکروں کو راحت پہنچانے کے لیے معقول قیمتوں پر سوت کی فراہمی کے واسطے موثر اقدامات کیے جائیں گے۔

وزیر موصوف نے جودھان بھون کے تلک ہال میں ریاستی ہینڈلوم بورڈ کے ایک جلسہ کی صدارت کر رہے تھے کہا کہ بنکروں کا خاص مسئلہ سوت کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس مسئلہ کا ایک فوری اور موثر حل تلاش کرنے کے لیے اترپردیش کے بنکروں کا ایک وفد خود ان کی قیادت میں گزشتہ ۸ اپریل کو دہلی میں مرکزی وزیر تجارت شری ڈی۔ پی چٹوپادھیائے سے ملا تھا اور انھیں بنکروں کی پریشانیوں سے آگاہ کیا تھا۔ مرکزی وزیر نے وفد کو یقین دلایا کہ سوت کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافے کو روکنے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں گے۔ انھوں نے یہ یقین دلایا کہ مرکزی حکومت مل مالکوں کو رضاکارانہ طور پر قیمتیں کم کرنے کے لیے ایک سمجھوتہ کرنے کے لیے بھی رضامند کرے گی اور اس سلسلے میں موثر اقدامات کرے گی۔

شری اصطفیٰ حسین نے انکشاف کیا کہ اسٹیپل سوت کی فراہمی کے سلسلہ میں مرکزی وزیر نے کارخانہ داروں کو یہ انتباہ دیا ہے کہ وہ اگر معاہدے کی شرائط کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے اور قیمتیں بڑھاتے رہیں گے تو حکومت اسٹیپل سوت اور دیگر تمام مصنوعی دھاگوں پر کنٹرول نافذ کرنے میں تامل نہیں کرے گی۔ وفد کو یہ یقین دہانی بھی کرائی گئی کہ بنکروں کو رنگوں اور کیمیائی اشیاء کی معقول قیمتوں پر فراہمی کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔

ریاستی حکومت نے پانچویں پنج سالہ منصوبے میں اترپردیش کے لیے ۱۵۰۰ ملین روپے مخصوص کرنے کے لیے درخواست کی ہے۔

X X X

اترپردیش کے پانچ مغربی اضلاع بلند شہر، مظفر نگر، میرٹھ، علی گڑھ اور سہارنپور زرعی پیداوار کی کل مالیت کے معاملے میں ملک بھر میں سرفہرست قرار دیے گئے اور اس طرح یہ اضلاع پنجاب اور ہریانہ سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ ان اضلاع کے کاشتکار زرعی میدان میں ترقی یافتہ دیگر ریاستوں کے کسان بھائیوں کے مقابلے میں اپنی فصلوں سے فی ہیکٹر زیادہ فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ ریاستی حکومت کے ماہرین نے یہ تقابلی تجزیہ حال ہی میں تین ریاستوں کی خاص فصلوں کی فی ہیکٹر پیداوار کی مالیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا ہے۔ یہ مطالعہ

اتر پردیش کے بلند شہر، میرٹھ، علی گڑھ اور سہارنپور اضلاع اور پنجاب اور ہریانہ ریاستوں میں ۱۹۷۰ء میں ہونے والی کل زرعی پیداوار کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

اتر پردیش کے پانچ اضلاع کی سب سے زیادہ فی ہیکٹر پیداواری مالیت ۲۱۶۲ روپے ہے جبکہ پنجاب اور ہریانہ کی بالترتیب ۱۹۷۱ روپے اور ۱۵۴۴ روپے ہے۔ اس سلسلے میں فی ہیکٹر پیداواری مالیت کا تعین کرتے وقت تمام غذائی فصلوں کے علاوہ تلہن، کپاس، گنا اور آلو وغیرہ کو بھی پیش نظر رکھا گیا تھا۔

ضلع بلند شہر نے اس سلسلے میں سب سے بہتر مقام حاصل کیا ہے جس کی فی ہیکٹر پیداواری مالیت ۳۰۴۰ روپیہ ہے جو ہریانہ سے اوسطاً دوگنی ہے۔ اسی طرح مظفر نگر، میرٹھ، اور علی گڑھ کی پیداواری مالیت بالترتیب ۲۲۹۵ روپیہ، ۲۲۵۹ روپیہ اور ۲۱۶۲ روپیہ تھی جو ہریانہ اور پنجاب کی ریاستوں سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ سہارنپور کی اوسط مالیت ۱۷۴۶ روپیہ تھی۔

× × ×

اتر پردیش کے گورنر شری اکبر علی خاں نے 'اتر پردیش ایڈوکیٹ فلاحی فنڈ ایکٹ ۱۹۷۴ء'، جس کو اتر پردیش مجالس قانون ساز کی منظوری حاصل ہو چکی ہے، اپنی رضامندی دے دی ہے۔

اس ایکٹ کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔
ایک فلاحی ٹرسٹ کا قیام، ۶۰ سال تک کی عمر کے ایڈوکیٹوں کے لیے ہندوستانی زندگی بیمہ کارپوریشن سے اجتماعی زندگی بیمہ کی پالیسی حاصل کرنا، ضلع بار ایسوسی ایشن کے لیے عمارتوں کا انتظام کرنا جن میں ہال، کمرے، لائبریریاں اور کینٹین وغیرہ ہوں، ضرورتمند ایڈوکیٹوں کی فلاح و بہبود کے لیے دوسری اسکیمیں شروع کرنا نیز دیگر ایسے کام کرنا جو ٹرسٹیوں کی کمیٹی کے خیال میں ایڈوکیٹوں کے لیے کام کے حالات کو بہتر بنانے اور دوسری سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے مناسب ہوں۔

× × ×

خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں کے مسائل کو حل کرنے کے پروگرام کے تحت ضلع ہمیرپور کی تحصیل ہمیرپور میں بیتوا اور جمنا ندیوں پر چار پمپ نہروں کی تعمیر مکمل ہو گئی ہے۔ یہ نہریں اس علاقے میں بلندی پر واقع کچھ ایسے مقامات کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم کریں گی جن کی آبیاری موجودہ نہری نظام کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔

ان چاروں پمپ نہروں سے مجموعی طور پر ۱۰۵۰ ہیکٹر رقبے میں آبپاشی کی سہولت مہیا ہو جائے گی۔ جس کے سبب غلہ کی سالانہ پیداوار میں معتدبہ اضافہ ہو جائے گا۔

بیتوا ندی پر سہجنا اور سوہرا پور پمپ نہروں کے ذریعے، جو بالترتیب گزشتہ نومبر اور جنوری میں مکمل ہو گئی تھیں، ربیع کی فصلوں کی آبپاشی شروع کر دی گئی ہے۔ دیگر دو نہریں یعنی سرولی بزرگ اور بیتوا انگلی جمنا ندی پر مکمل ہو گئی ہیں۔ بجلی دستیاب ہوتے ہی ان کے ذریعے آبپاشی شروع کر دی جائے گی۔

× × ×

ریاستی حکومت نے چوتھے پنج سالہ منصوبہ کے تحت اتر پردیش کی مختلف لوکل باڈیز کے پرائمری اسکولوں میں کام کرنے والے ۱۹۵۲ اردو ٹیچروں کے مہنگائی بھتہ میں ۱۹۷۳-۷۴ء کے دوران اضافہ کرنے کے لیے ۱۲۹۴۷۲ روپیہ کی رقم منظور کی ہے۔ اس مہنگائی بھتہ کا تعلق ان اضافوں سے ہے جن کا اعلان حکومت نے مئی اور اگست ۱۹۷۳ء میں کیا تھا۔

مذکورہ بالا منظور شدہ رقم میں سے ۸۳۰۹۶ روپیے دیہی علاقوں میں واقع ضلع پریشدوں کے پرائمری اسکولوں کے ۶۱۱ ٹیچروں میں اور بقیہ رقم میونسپلٹیوں اور کارپوریشنوں کے پرائمری اسکولوں کے ٹیچروں میں تقسیم کی جائے گی۔

× × ×

اتر پردیش نے قومی بچت اسکیموں کے تحت چوتھے منصوبہ کے دوران ۱۹ کروڑ روپے کے مقررہ نشانہ کے مقابلے میں ۲ کروڑ روپے جمع کر کے عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے۔

اتر پردیش میں قومی بچت اسکیموں کے قیام کے وقت سے اب تک پہلی بار مقررہ نشانہ سے زیادہ رقم جمع کی گئی ہے۔ پانچویں منصوبے کے مصارف میں اضافے کو ملحوظ رکھتے ہوئے قومی بچت اسکیموں کے تحت پانچویں منصوبے کی مدت کے دوران ۵۰۰ کروڑ روپے جمع کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ قومی بچت کے سکریٹری نیز ڈائرکٹر نے تمام ضلع مجسٹریٹوں کے نام ایک گشتی خط میں ہدایت کی ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنی کوششوں میں کسی قسم کی تساہلی نہ برتیں کیونکہ قومی بچت ترقیاتی اسکیموں کو سرمایہ فراہم

…ت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

پانچویں منصوبے کے دوران ۷۵-۱۹۷۴ء کے لیے ۷۵ کروڑ روپے، ۷۶-۱۹۷۵ء کے لیے ۸۵ کروڑ روپے، ۷۷-۱۹۷۶ء کے لیے ۱۰۰ کروڑ روپے، ۷۸-۱۹۷۷ء کے لیے ۱۱۵ کروڑ روپے اور ۷۹-۱۹۷۸ء کے لیے ۱۲۵ کروڑ روپے کے نشانے مقرر کیے گئے ہیں۔ مقررہ نشانوں کے حصول کے پیش نظر جو مختلف اقدامات کیے جا رہے ہیں ان میں ریاستی اور مرکزی قومی بچت ادارہ کی تنظیم، قومی بچت کے ریاستی مشاورتی بورڈ کی ایک قائمہ کمیٹی کی تشکیل اور قومی بچت اسکیموں کی اور زیادہ موثر پبلسٹی کے لیے ریاستی صدر مقام پر ایک پبلسٹی نیز ترقیاتی شعبے کے قیام سے متعلق … شامل ہیں۔

اس کے علاوہ ریاستی حکومت نے قومی … اسکیموں کے تحت بچت کارکنوں اور … سرکاری ملازمین کو ان کے قابل تعریف کام پر انعامات دینے کے لیے بھی مختلف اسکیمیں شروع کی ہیں۔

× × ×

حکومت اترپردیش نے ڈرگ کنٹرولر کو ہدایت کی ہے کہ وہ غیر معیاری اور ناقص دواؤں کے معاملات میں بروقت کارروائی کریں۔

ریاست کے تمام اسپتالوں، ڈسپنسریوں اور … کو ایسی دواساز فرموں کے بارے میں مطلع کیا جائے گا جن کی تیار کردہ دواؤں کے نمونے کیمیاوی جانچ کے بعد ناقص پائے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ایسی دواساز فرموں کے نام اور ڈرگس اینڈ کاسمیٹک ایکٹ کی جس دفعہ کے تحت ان کا چالان کیا جائے گا اس کی اطلاع بھی اسپتالوں، ڈسپنسریوں اور دواؤں کا کاروبار کرنے والے بیوپاریوں کو دی جائے گی اور اخبارات میں بھی اس کی اشاعت کی جائے گی۔ اس سے قبل قانونی کارروائی اس وقت کی جاتی تھی جب ڈرگ انسپکٹر اچانک چھاپے کے دوران دواساز فرم یا کارخانے سے حاصل شدہ مشتبہ دواؤں کے نمونوں کو عوامی تجزیہ کار کیمیاوی جانچ کے بعد غیر معیاری یا ناقص قرار دیتا تھا۔

× × ×

ریاستی حکومت نے سات ضلع پریشدوں کو ان کے علاقوں میں واقع سڑکوں کی نگہداشت مرمت، جدید کاری اور تعمیر کے لیے ۴۷ء۷ لاکھ روپے کی امداد منظور کی ہے۔ ان ضلع پریشدوں کے نام … ہیں: ہردوئی، اٹاوہ، اعظم گڑھ، الموڑہ، نینی تال، پوڑی گڑھوال اور گونڈہ۔

مذکورہ مجموعی رقم میں سے ہردوئی، اعظم گڑھ اور نینی تال کی ضلع پریشدوں کو ۱۰۵ لاکھ روپے اور اٹاوہ ضلع پریشد کو ایک لاکھ روپے کی رقم منظور کی گئی ہے جبکہ پوڑی ضلع پریشد کو ۹۰۰ روپے فراہم کیے گئے ہیں۔ اسی طرح گونڈہ اور الموڑہ کی ضلع پریشدوں کو پچاس پچاس ہزار روپے دیے گئے ہیں۔ ہردوئی، اٹاوہ، الموڑہ اور اعظم گڑھ کی ضلع پریشدوں کو منظور شدہ امداد کو استعمال میں لانے کے لیے مذکورہ امداد کے مساوی رقم خود اپنے وسائل سے فراہم کرنا ہوگی۔ گونڈہ ضلع پریشد کو ۵۰ ہزار روپے کی امداد کے مقابلے میں صرف ۲۹ ہزار روپیہ مہیا کرنا ہوگا۔ نینی تال اور پوڑی گڑھوال کی ضلع پریشدوں کو حکومت نے رقم فراہم کرنے کی اس شرط سے مستثنیٰ قرار دے دیا ہے۔

× × ×

صدر جمہوریہ شری وی۔ وی گری نے ریاستی مجالس قانون ساز کے منظور شدہ زمین کے حصول اور توثیق سے متعلق بل پر اپنی منظوری دے دی ہے۔ یہ بل زمین کے حصول (اترپردیش، ترمیمی اور توثیقی) آرڈی ننس کی جگہ لے گا، جسے اترپردیش کے گورنر نے گزشتہ ۴ جنوری کو نافذ کیا تھا۔

مذکورہ ایکٹ کا مقصد ریاستی حکومت کو چھ ماہ کے اندر کاشتکاروں کی حاصل شدہ زمین کے لیے معاوضہ کی ادائیگی کا بندوبست کرنا ہے۔ اس سے چھوٹے کسان خاص طور پر مستفید ہوں گے۔ اس ایکٹ کے بموجب حاصل شدہ زمین کے معاوضہ کی شکل میں تعین کی گئی یا کی جا سکنے والی رقم کے دو تہائی تک کی "علی الحساب" رقم بھی ادائیگی زمین کے حصول کے بعد زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کے اندر کرنا ہوگی جو مقامی کلکٹر کی صوابدید پر منحصر ہوگا۔

ریاستی حکومت نے ۲۴ امداد یافتہ ہائر سکنڈری اسکولوں کو قدرتی آفات کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات کو پورا کرنے کے لیے ۱۱۸۹ روپیہ کی غیر متواتر مالی امداد منظور کی ہے۔ یہ امداد ۱۰۰۰ روپیہ اور ۱۰۰ روپیہ کے درمیان دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ۱۰۰۰ روپیہ کی سب سے زیادہ رقم ایچ این کے انٹر کالج اناؤ کو اور ۱۰۰ روپیہ کی سب سے کم رقم رنجیت پنڈت انٹر کالج الہ آباد کو دی گئی ہے۔

ریاستی حکومت نے ۷۴-۱۹۷۳ء کے لیے ۶۰

امداد یافتہ ہائر سکنڈری اسکولوں کو کارکردگی کی بنیاد پر ..... ا روپیہ کی مالی امداد منظور کی ہے۔ یہ امداد نظم و ضبط کے قیام اور امتحانات کے نتائج کا غیر معمولی معیار برقرار رکھنے کے لیے دی گئی ہے۔

مذکورہ امداد کی مجموعی رقم میں سے دس اداروں کو چار چار ہزار روپیہ، دس اداروں کو دو دو ہزار روپیہ اور تیرہ اداروں کو ایک ایک ہزار روپیہ دیے جائیں گے۔

× × ×

آگرہ شہر میں شاہ گنج اور بجے پور ہاؤسنگ اسکیموں کو روبہ کار لانے کے بعد آگرہ کے گنجان شہر کو کچھ راحت مل جائے گی۔ ریاستی حکومت نے ان اسکیموں کے تحت درمیانہ آمدنی والے طبقوں کے لیے پہلی اسکیم کے بموجب ۲۰ مکانات کی تعمیر کے واسطے ۶۶۰۰ روپیہ اور دوسری اسکیم کے تحت ۱۶ مکانات کی تعمیر کے لیے ۲۹۲۸۰۰ روپیہ کا قرضہ منظور کیا ہے۔ اس کے علاوہ فتح پور سیکری کی تعمیر مکانات اسکیم کے تحت زمین کے حصول اور اسے ترقی دینے کے مقصد سے چار لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی گئی ہے۔

اس قرضہ پر آٹھ فیصد سالانہ سود وصول کیا جائے گا اور اس کی ادائیگی ۲۶ مساوی سالانہ قسطوں میں ہوگی۔

❖ ❖ ❖

اتر پردیش کھیل کود کونسل نے میرٹھ اور کانپور میں نوجوان کھلاڑیوں کے لیے دو ہاسٹل قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں اول الذکر ہاسٹل میں تربیت حاصل کرنے والے ۱۸ ہاکی کے کھلاڑی اور پانچ ایتھلیٹکس کھلاڑیوں کے لیے رہائش کی گنجائش ہوگی جبکہ کانپور کے ہاسٹل میں کرکٹ کی تربیت حاصل کرنے والے ۱۴ کھلاڑیوں کی رہائش کا بندوبست ہوگا۔

اس سلسلے میں کھلاڑیوں کے انتخاب کے لیے ۲ اور ۳ جولائی کو سنٹرل اسپورٹس اسٹیڈیم لکھنؤ میں ایک آزمائشی مقابلہ منعقد کیا جائے گا۔ مجوزہ ہاسٹلوں کے لیے وہی کھلاڑی منتخب کیے جائیں گے جن کی عمر آئندہ یکم جولائی کو ۱۶ سال سے زیادہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ نمایاں صلاحیت رکھنے والے طلبا کی عمر کے معاملے میں دو سال تک کی چھوٹ دی جائے گی۔ طلبا کو آزمائشی مقابلہ میں شرکت کے لیے اپنے اخراجات پر آنا ہوگا لیکن اگر وہ منتخب کر لیے جائیں گے تو انھیں ریل کے ذریعہ آمد و رفت کا سکنڈ کلاس کا کرایہ دیا جائے گا۔ طلبا کو آزمائشی مقابلہ کے دوران اسٹیڈیم میں مفت قیام کی سہولت حاصل ہوگی۔

جو کھلاڑی داخلہ کے لیے منتخب کر لیے جائیں گے ان کو اسٹیڈیم میں مفت طعام، قیام اور تربیت کی سہولت حاصل ہوگی۔ اس کے علاوہ ریاستی کھیل کود کونسل کے فیصلہ کے بموجب وہ کسی ادارے میں تعلیم بھی حاصل کریں گے۔

❖ ❖ ❖

متفرقات

ریاست کے ۸۹ ہائر سکنڈری اسکولوں کو مالی امداد۔ ریاست کے ۸۹ تسلیم شدہ پری ہائر سکنڈری اسکولوں کو ۷۴-۱۹۷۳ کے دوران امدادی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے اور ریاستی حکومت نے ان اداروں کے لیے ۱۹۵۸۰۰ روپیہ کی خصوصی امداد منظور کی ہے۔ یہ امداد ۲۲۰۰ روپیہ کی شرح سے ہر اسکول کو دی جائے گی۔ اس سلسلے میں بیسک ایجوکیشن افسروں کو متعلقہ اضلاع کے تعلیمی اداروں کے منیجروں کو امدادی رقم کی ادائیگی کے لیے مجاز کیا گیا ہے۔

ریاست کے ۱۸ تعلیمی اداروں میں نئی تجربہ گاہیں۔ حکومت اتر پردیش نے ریاست کے ۱۸ امداد یافتہ ہائر سکنڈری اسکولوں کو ۲۰۱۰۰ روپیہ کی غیر مکرر مالی امداد منظور کی ہے۔ یہ امدادی رقم ہائی اسکولوں اور ہائر سکنڈری سطح کے اسکولوں میں نئی تجربہ گاہیں قائم کرنے اور سائنسی ساز و سامان اور آلات کی خریداری اور سائنس کی تعلیم کی توسیع پر خرچ کی جائے گی۔

مذکورہ رقم میں سے ۱۳۸۵۰۰ روپیہ آٹھ ہائر سکنڈری اسکولوں اور بقیہ رقم دس ہائی اسکولوں کے لیے منظور کی گئی ہے۔

مکانوں کے لیے زمین کی فراہمی۔ ریاست کے ۱۷ اضلاع میں بے زمین ہریجنوں اور زرعی مزدوروں کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمین فراہم کرنے کا کام مکمل ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں اب تک بے زمین ہریجنوں اور زرعی مزدوروں کے ۹۳۶۶۴ خاندانوں کو ۱۳۰۹۰ ہیکٹر زمین تقسیم کی جا چکی ہے۔

اس ضمن میں مزید تقریباً ۲۲۸۹۰۰ خاندانوں کو مکانات کے لیے زمین کی فراہمی کا کام تیز رفتاری کے ساتھ کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انتہائی آراضی قانون کے تحت فاضل قرار دی جانے والی ۲۰۶۰۰۰ ایکڑ زمین میں سے ۱۱۰۰۰۰ ایکڑ زمین بے زمین افراد کو زرعی مقاصد کے لیے دی جا چکی ہے۔

❖ ❖ ❖

★

REGD. No. LW/NP-17



صدر جمہوریہ شری وی وی گری گذشتہ ۱۰ اپریل کو نئی دہلی میں
وزیر اعظم بنگلہ دیش شری مجیب الرحمان کا گرمجوشی سے استقبال کر رہے ہیں


جولائی ۱۹۸۳ء

ماہنامہ

نیا دور

لکھنؤ

جلد ۳۰ | نمبر ۳

جولائی ۱۹۷۴ء

ایڈیٹر خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر امیر احمد صدیقی

★

نگراں ستیہ پرکاش بھٹناگر
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

قیمت فی شمارہ ۔ پچاس پیسے
زر سالانہ پانچ روپے
ملنے کا پتہ سپرنٹنڈنٹ انفارمیشن (سی) ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ
خط وکتابت کا پتہ ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ ۔ لکھنؤ
زر چندہ بنام ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ، یوپی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

نیوکلیائی ترقی کے میدان میں سنیچر ۱۸ مئی ۱۹۷۴ء کو صبح ۸ بج کر ۵ منٹ پہلا زیر زمین دھماکہ کرکے ہندستان نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ کئی اعتبار سے اہم اور عظیم ہے۔ ایٹمی توانائی کے تجربہ و استعمال کے معاملے میں اب تک امریکا، روس، برطانیہ، فرانس اور چین کو جو بالادستی حاصل تھی وہ باقی نہیں رہی اور اب اس فہرست میں چھٹے ملک کی حیثیت سے ہندستان بھی شامل ہوگیا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ اول الذکر پانچ ملکوں نے ایٹمی تجربے اور دھماکے زمین پر فضا میں اور سمندر کے نیچے کیے جن کا مقصد ایٹمی ہتھیاروں کی اثرانگیزی اور ہلاکت آفرینی کا اندازہ لگانا تھا۔ اس طرح ایٹمی توانائی کے استعمال کے سلسلے میں ان ملکوں کی کوششوں کی ابتدا اسلحہ سازی سے ہوئی لیکن ہندستان شروع ہی سے ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال کی تحقیق میں سرگرم رہا اور اسی مقصد سے زیر زمین ایٹمی دھماکے کی تکنیک اپنائی گئی۔ چنانچہ راجستھان میں زمین کے اندر ۔۔ میٹر کی گہرائی پر پہلا ایٹمی دھماکہ کرکے ہندستان نے اپنے مقصد کی پوری طرح توثیق کر دی ہے۔ وہ مقصد تھا یہ دیکھنا کہ ایٹمی توانائی کو ترقیاتی کاموں کے لیے کس کس طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس سے قبل ہندستان ایٹمی توانائی کو بجلی پیدا کرنے اور زرعی و صنعتی تحقیقات کے سلسلے میں استعمال کرتا رہا ہے لیکن راجستھان کے کامیاب تجربے سے اب اسے ترقیاتی کاموں میں استعمال کرنے کے وسیع امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ مثلاً کان کنی، پشتہ بندی، بڑے بڑے باندھوں کی تعمیر اور دیگر پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ بنانے وغیرہ کا کام اس سے لیا جاسکتا ہے۔

ہندستان میں نیوکلیائی پروگرام کا آغاز آزادی کے گیارہ دن بعد پنڈت جواہر لال نہرو کی رہنمائی میں ہوا جب ایٹمی توانائی کا ایک شعبہ اور بعد میں ایک کمیشن قائم کیا گیا۔ اس پروگرام کے بانی اور معمار اعلیٰ ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا تھے۔ یہ ان کی دور بینی تھی کہ انھوں نے پہلے ہی بمبئی میں بنیادی تحقیقات کا ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ قائم کرکے ایٹمی سائنس داں تیار کر دیے تھے۔ چنانچہ جب ہندستان میں یہ پروگرام شروع ہوا تو اس کے لیے سائنس دانوں کی کمی نہ تھی۔ پنڈت نہرو سے لے کر شریمتی اندرا گاندھی تک ہر وزیر اعظم کی جانب سے ہندستان کے اس موقف کا اعلان و اعادہ کیا جاتا رہا ہے کہ ہندستان ایٹمی توانائی کو "جنگ اور تباہی کے لیے نہیں بلکہ پرامن اغراض اور اپنے ترقیاتی کاموں کے لیے استعمال کرے گا"۔ پہلے کامیاب زیر زمین دھماکے کے بعد بھی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اس وعدہ کا اعادہ کیا اور کہا کہ "جیسا کہ میں ایوان میں کہہ چکی ہوں کہ یہ ہماری تحقیق کا حصہ ہے اور ہم ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال کے وعدہ پر اب بھی قائم ہیں"۔ اسی لیے انھوں نے دھماکے کے فوراً ہی بعد قوم کو آگاہ کیا کہ اس واقعہ پر غیر معقول جوش و خروش کی ضرورت نہیں۔ مقصد یہ تھا کہ یہ کامیابی باعث فخر و مباہات ضرور ہے لیکن اس کے کوئی اور معنی پہنا کر بہت زیادہ جوش و خروش دکھانے کا محل نہیں۔ ہندستانی ایٹمی توانائی کمیشن نے بھی یہ اعلان کیا ہے کہ ہندستان ایٹمی ہتھیار بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود بعض ملکوں نے ہندستان کی نیوکلیائی پیش رفت کو پسند نہیں کیا ہے اور راجستھان کے ایٹمی دھماکے پر اعتراض کیا ہے۔ خصوصاً پاکستان نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اس تجربے سے سیاسی اور فوجی صورت حال میں تبدیلی آگئی ہے۔ لیکن وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اور وزیر خارجہ کی کھلی ہوئی اور بار بار یقین دہانیوں کے پیش نظر پاکستان کا یہ اندیشہ بالکل ہی بے بنیاد ہے اور اس کا کوئی جواز ہی نہیں ہوسکتا۔

ہندستان کے پہلے ایٹمی دھماکے کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ تمام تر ہندستانی وسائل کی مدد سے اور مختلف سائنسی علوم سے تعلق رکھنے والے ۵۰ ہندستانی سائنس دانوں کی مشترکہ کوششوں سے کیا گیا۔ واضح رہے کہ دھماکے میں استعمال کیا جانے والا پلوٹونیم بھی بھابھا ایٹمی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تیار کیا گیا تھا۔ پرامن مقاصد کے لیے ایٹمی توانائی کے استعمال کی سمت یقیناً یہ ایک بڑا قدم ہے جو ملک کی معاشی حالت میں تبدیلی لانے میں ناقابل انکار رول ادا کرے گا۔ اس کامیاب تجربے پر ہندستانی قوم کو بجا طور سے فخر ہے۔ اور ہم ایٹمی توانائی کمیشن کے چیرمین ڈاکٹر کے۔ این۔ سیٹھنا اور ان کے رفقائے کار کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

● اترپردیش کے وزیر مالیات شری نرائن دت تیواری نے ۷۵-۱۹۷۴ء کا نیا بجٹ ریاستی مجالس قانون ساز میں ۱۱ جون ۱۹۷۴ء کو پیش کیا۔ محاصل سے آمدنی کا تخمینہ ۶۹۳ کروڑ ۹ لاکھ روپے اور اخراجات کا تخمینہ ۹۰۳ کروڑ ۳ لاکھ روپے ہے۔ آمدنی میں بجٹ کی دیگر مدوں کی ۲۲۳ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے کی رقم بھی شامل کرلی جائے تو بجٹ میں ۱۶ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے کا خسارہ آتا ہے۔ اس خسارہ میں گزشتہ سال کے ۲۰ کروڑ ۴۱ لاکھ روپے کا خسارہ شامل کرنے کے بعد مجموعی تخمینی خسارہ ۴۵ کروڑ ۱۱ لاکھ روپے کا آتا ہے۔ اس خسارہ کو پورا کرنے کے لیے آمدنی کے وسائل میں اضافہ اور اس سلسلے میں ضروری اقدامات ناگزیر تھے۔ چنانچہ بعض ٹیکسوں اور ڈیوٹیوں کی شرحوں میں اضافے کی تجویز بجٹ میں رکھی گئی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ ٹیکس میں اضافے کا بار عام طور سے ایسے لوگوں پر پڑے جو اسے برداشت کرسکتے ہیں۔ مثلاً اسٹامپ ڈیوٹی، شراب اور تفریحی مدوں پر ٹیکس میں اضافہ ہو جائے اور بڑے ہوٹلوں پر ٹیکس لگ جانے سے بالآخر وہی لوگ متاثر ہوں گے جو اسے برداشت کرسکتے ہیں۔ بہرحال ٹیکسوں اور ڈیوٹیوں میں اضافے، نئے ٹیکس تجویز، آمدنی ٹیکس میں استقامت ہی انتظامات اور ٹیکس وصولی ڈھانچہ کو معقولیت پسندانہ شکل دینے کے نتیجے میں بجٹ خسارہ پھر بھی ۸ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے رہ جائے گا۔

نئے بجٹ میں عوام خصوصاً غریبوں کے لیے فلاحی اسکیموں اور انھیں ظلم و زیادتی سے بچانے کی غرض سے بعض اقدامات پر منافع بازی کی روک تھام کے لیے اسکیموں کی تجاویز رکھی گئی ہیں مثلاً زراعت جو ہماری معیشت میں ایک بنیادی ستون کی حیثیت رکھتی ہے اس کے لیے زیر نظر بجٹ میں زیادہ رقم رکھی گئی ہے۔ بجلی کی پیداوار میں اضافے کے لیے اس سال تین بڑی اسکیمیں مکمل ہو جائیں گی جس سے ۵۴۰ میگاواٹ زائد بجلی دستیاب ہونے لگے گی۔ چھوٹی صنعتوں کو نائنیشنل کارپوریشن کے علاوہ تجارتی بنکوں سے بھی قرض کی فراہمی کی تجویز ہے۔ اس کے علاوہ برکتا کارپوریشن، ٹیوب ویل کارپوریشن، مراد آباد میں برتنوں اور آگرے میں جوتے کی صنعت کو ترقی دینے والے کارپوریشنوں، اصلاح و ترقی آراضی کارپوریشن، چھوٹی صنعت کارپوریشن اور ضروری اشیا کی خرید و فروخت کے لیے کارپوریشن کا قیام بجٹ تجویزوں میں شامل ہے۔

اقوام و قبائل پسماندہ و فہرست کو قرض سے نجات دلانے، نئے گھروں کو مکانات مہیا کرنے، بے روزگاروں کو روزگار شروع کرنے کے لیے بڑے رقمیں، زرعی اور دوسری یونیورسٹیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے، ہوسٹلوں کی گنجائش بڑھانے، "طلبا کی فلاحی کونسل" کے قیام، بعض صنعتوں کے مزدوروں کی اجرت میں اضافے، اقلیتی کمیشن کے قیام وغیرہ کی اسکیمیں وہ فلاحی اسکیمیں ہیں جو خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت نے ۵ ممتاز عربی مدارس کو امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے لیے نئے بجٹ میں تین لاکھ روپے کی رقم رکھی ہے۔ یہ مدارس ہیں ۔۔ ندوۃ العلما لکھنؤ (ایک لاکھ روپیہ) دارالعلوم دیوبند (ایک لاکھ روپیہ) سلطان المدارس لکھنؤ (۲۵ ہزار روپیہ) مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ (۴۵ ہزار روپیہ) اور شیعہ عربی کالج لکھنؤ (دس ہزار روپیہ)۔ نئے بجٹ میں الہ آباد میں اکبر الہ آبادی کی یادگار قائم کرنے کے لیے ۵۰ ہزار روپیے کی رقم منظور کی گئی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عالمگیر معاشی اور پیداواری بحران کے زمانے میں یہ بجٹ ایک "حوصلہ افزا" بجٹ ہے لیکن عوام کے اشتراک سے موجودہ مشکلات کو کامیابیوں میں بدل کر خودکفالتی لائی جاسکتی ہے جس کی توقع وزیر مالیات نے اپنی بجٹ تقریر میں کی ہے۔

——— ایڈیٹر

غزل

عمر انصاری

ہوا کرے جو مخالف ہوا بہت ہے ابھی
قدم بڑھائے چلو راستا بہت ہے ابھی

گلہ ہمیں سے جو یوں برملا بہت ہے ابھی
خیال اس کو ہمارا سُنا بہت ہے ابھی

بنے گی انجُم و مہتاب بھی زمیں کے لیے
یہ زندگی کہ جو بے دست و پا بہت ہے ابھی

بچھڑ نہ جائے کسی سے کوئی ٹھہر کے چلو
غبار راہ میں چھایا ہوا بہت ہے ابھی

ابھی سے زحمت چارہ گری وہ کیوں فرمائے
کہ اس کا نام ہی، نام خُدا بہت ہے ابھی

ہمارے نام اور اس درجہ لطف کے پیغام
تو یہ کہو کہ وہ ہم سے خفا بہت ہے ابھی

بھرا نہیں ابھی دامن بہار کا شاید
اداس اداس جو یاد صبا بہت ہے ابھی

لگے گی دیر مرے حال کے سنبھلنے میں
وہ زخم ہوں جو کریدا ہوا بہت ہے ابھی

ادھر سے گزرے ہیں کیا جانے کس قدر طوفاں
مقام عشق مگر پُر فضا بہت ہے ابھی

کچھ اور گھر کے دریچوں کو بند رہنے دو
ابھی تو گزرا ہے طوفاں ہوا بہت ہے ابھی

وہ ہے وہ لہر کہ اس کو جہاں سے بھی دیکھو
یہی کہو گے کہ ہاں فاصلا بہت ہے ابھی

قدم قدم ہے وہی قافلوں کی بھیڑ مگر
چراغ رہ ہے کہ بے آسرا بہت ہے ابھی

کسے خبر کہ وہ کب اذنِ باریابی دے
نگاہ ناز کہ دیر آشنا بہت ہے ابھی

کچھ اور دل کو جلاؤ، لہو کو گرم کرو
خیال یار کی ٹھنڈی ہوا بہت ہے ابھی

عمرؔ کے سامنے چھیڑو نہ ذکرِ کوچۂ یار
کہ مٹ گیا ہے مگر سر پھرا بہت ہے ابھی

رضا حسین زیدی



رضا حسین زیدی صاحب دلّی میں آرٹ کے استاد ہیں۔ کچھ عرصہ قبل آپ مزید تعلیم کے لیے ہالینڈ گئے تھے۔ اس سلسلے میں آپ نے ایک سفرنامہ بھی ڈائری کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ زیرِنظر مضمون اسی سفرنامہ کا ایک حصہ ہے جو پیرس کے آرٹ سے متعلق ہے جس میں وہاں کے میوزیم آرٹ گیلری اور سماجی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے ـــ ایڈیٹر

۲۹ اگست ۱۹۷۲ء بروز منگل۔ ٹرین میں پیرس سے ہیگ (ہالینڈ) کو روانگی۔

اس وقت ٹرین کے ڈبہ میں بیٹھا یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ ٹرین چلنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے۔ پیرس کے بارے میں کیا لکھوں کہ میں نے ان تین دنوں میں کیا دیکھا۔ پیرس کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی خواب دیکھتا ہو۔ اب تک میں نے جو شہر دیکھے ہیں، ان میں پیرس سب سے زیادہ پسند آیا۔ یہاں کے میوزیم، آرٹ گیلریاں، میخانے، عبادت گاہیں، تھیٹر اور رقص گاہیں، باغ، تاریخی مقامات تعداد میں اتنے اور اس قدر متنوع ہیں کہ ان کے دیکھنے کے لیے بہت وقت چاہیے۔ پیرس ایک شہر نہیں دنیا ہے۔ ایک فضا ایک تاثر۔ اس کا ایک مزاج ہے اور یہ سب کچھ صدیوں کے انقلابات کا نتیجہ ہے۔

میں ۲۷ اگست کی صبح سوا آٹھ بجے میونخ (جرمنی) سے پیرس پہنچا۔ پیرس کا اسٹیشن بہت پرانے طرز کا معلوم ہوا۔ ٹرین سے اترنے کے بعد قطعی علم نہیں تھا کہ کہاں ٹھہروں گا اور کس جگہ جاؤں گا مگر خدا پر یقین اور بھروسہ سب مشکلات اور تکلیفیں دور کر دیتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے مارک (جرمنی کا سکّہ) کو فرانس کے سکّہ فرینک میں تبدیل کرایا تاکہ اسٹیشن سے باہر نکل کر کرنسی کی دشواری نہ ہو۔ باہر نکل کر سوچا کہ اسٹیشن کے قریب ہی ہوٹل مل جائے تو اس میں زیادہ آسانی رہے گی۔ چنانچہ ایسٹ اسٹیشن سے نارتھ اسٹیشن پر آیا (یہاں سے ٹرین ہالینڈ جاتی ہے) اور اب اس کے قریب سی ہوٹل کی تلاش کی۔ جب ہوٹل میں گیا سوال انگریزی میں کیا مگر جواب فرنچ میں مل رہا ہے۔ پیرس کی سب سے بڑی دشواری یہی ہے کہ فرانسیسی نہ آتی ہو تو انسان احمق معلوم ہوتا ہے، پھر یہ بھی نہیں کہ آپ کتابوں سے دیکھ کر فرانسیسی بول لیں، منجھا ہوا تلفظ اور عام بول چال نہ ہو تو نہ ہوٹل والا آپ کی بات سمجھتا ہے نہ ٹیکسی والا۔ تقریباً سارے اشارات بھی فرانسیسی میں ہی ہوتے ہیں۔

میوزیم لوور

قریب ہی دو تین ہوٹلوں میں جانے کے بعد ایک ہوٹل پر "ENGLISH SPEAKING" لکھا دکھائی دیا۔ بس یہی مناسب سمجھا کہ اسی پر قناعت کر لی جائے۔ چنانچہ ہوٹل میں کمرہ دیکھا پسند آیا۔ ایک گھنٹہ آرام کیا اور پھر میوزیم لوور کی تلاش میں نکل پڑا۔

لوور جانے کے لیے یہاں کی میٹرو (زمین کے اندر چلنے والی ٹرین)
میں سفر کیا۔ میٹرو کا نقشہ میرے پاس موجود تھا مگر سب اشارات فرانسیسی
زبان میں ہونے کے سبب مسافروں سے پوچھ گچھ کی۔ بعض مسکرا کر آگے
بڑھ گئے بعض ہاتھ کے اشارے سے سمجھاتے رہے مگر "جستجو ہو تو سفر
ختم کہاں ہوتا ہے" کے مصداق ایک میٹرو سے دوسری میٹرو میں سفر
کرتا ہوا بالآخر لوور کے مشہور اسٹیشن پر اتر ہی گیا، جس کی دیواروں اور
شوکیس میں مونا لیزا کے ری پروڈکشن لگا رکھے ہیں۔ میوزیم کے احاطے
میں داخل ہوا تو ایک پُرجلال عظیم الشان عمارت نظر پڑی جس کے مناسب
ہیئت ہوئے بازو سامنے کے حسین اور بلند پھاٹک سے ہم آغوش ہونے
کے لیے بڑھ رہے تھے۔ اس دروازے کو تمام لوگ "آرک دا تزایف"
کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہاں یونانی اور رومن وضع کے خوبصورت
مجسموں کی بہتات ہے۔ میوزیم میں داخل ہوا تو جتنا نام سنا تھا اس سے
بڑھ کر پایا۔ عمارت اس قدر بڑی، شاندار اور پھر اس کے اندر تصویروں،
مجسموں اور دوسرے فنون لطیفہ کا اس قدر ذخیرہ موجود کہ ہفتوں گزار
دیں مگر تشنگی باقی رہے۔ چنانچہ میں نے پہلے دن میوزیم کو صرف سرسری
نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی اور اس وقت باہر آیا جب میوزیم کا وقت
ختم ہو چکا تھا مگر یہ جانے بغیر کیسی پیاس تھی کہ کم ہونے کے بجائے شدت
اختیار کر گئی۔ اس تھوڑے سے وقت میں ان نگاہوں نے وہ دیکھ لیا
جس کے دیکھنے کی لوگ تمنا کرتے ہیں، لوور کی کہانی بڑی بڑی کتابوں میں
بیان ہوئی ہے میں کیا لکھوں۔

اس میوزیم کی جان لیونارڈو ڈا ونچی کی مایہ ناز تصویر مونا لیزا
ہے۔ ویسے تو میوزیم اپنے بے بہا سرمایہ کی وجہ سے سارے عالم میں مشہور
ہے مگر مونا لیزا دنیا کے شائقین کو برسوں سے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔
ڈا ونچی کا شاہکار ایک سرخ مخمل کے فریم میں (تقریباً تین فٹ لمبی)
لوور کی زینت ہے۔ شائقین کا مجمع ہر وقت لگا رہتا ہے جو اس کی
حسن اور دلفریب مسکراہٹ دیکھنے کے لیے دور دراز کا سفر کر کے آتے
ہیں اور پھر گھنٹوں یہاں صرف کر دیتے ہیں۔ خود مونا لیزا اپنی دلکش
مسکراہٹ کے ساتھ لوگوں کو نہ جانے کب سے دیکھ رہی
ہے۔

میوزیم میں تصاویر کا ذخیرہ

میوزیم میں اس وقت تصاویر کا تین ہزار سے اوپر ذخیرہ موجود
ہے جبکہ اس میوزیم کی دوسری عمارتوں میں اس کے علاوہ ہے۔ میوزیم
میں یورپ کے سبھی اسکول ابتدا سے آج تک موجود ہیں۔ مثلاً لاطینی اسکول
فرانسیسی اسکول، ڈچ اور فلمش اسکول، جرمن اسکول، اسپینش اسکول،
انگریزی اسکول وغیرہ۔ ان اسکولوں میں مندرجہ ذیل آرٹسٹوں کی
تصاویر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ وہ آرٹسٹ مندرجہ ذیل ہیں۔

لاطینی اسکول۔ جیوٹو، سماٹو، اسپلو، فرانجیلو، لیونارڈو ڈا ونچی،
رافیل

فرانسیسی اسکول۔ جارج ڈی لاٹور، پوساں، واٹو، شارداں،
فراگونارڈ، ڈیوڈ، گیریکو، ایڈورڈ، اینگرس، ڈیلاکروئکس، کوربٹ، کاربے۔

ڈچ اور فلمش اسکول۔ فرانس ہال، ریمبراں، ورمیر، جان وان ایک
روبن، وان ڈائیک

جرمن اسکول۔ ڈیورر، کرانیخ، ہالبین

اسپینی اسکول۔ ایل گریکو، موریلو، ویلاسکوئز، گویا

انگریزی اسکول۔ رینولڈس، لارنس، گینس برا، کانسٹیبل

ہر اسکول کی اپنی خصوصیت ہے مگر بعض تصاویر نے میرے قدم
اور میرے دامن کو تھاما اور آنکھوں سے بینائی کے علاوہ آگہی بھی مانگی۔
ان میں ڈا ونچی کی مونا لیزا کے علاوہ "ورجن آف دی راکس" قابل
ذکر ہے۔ یہ تصویر مونا لیزا کے قریب ہی کی دیوار پر لگی ہے۔ تصویر
میں شبیہیں گروپ کی شکل میں موجود ہیں، حضرت مریم درمیان میں
بیٹھی ہیں، جن کے چہرے سے تقدس جھلک رہا ہے، ان کے قریب
دو معصوم بچے کھیل رہے ہیں۔ دائیں جانب ایک لڑکی معصوم بچوں کو
دیکھ رہی ہے۔ پیچھے کی منظر کشی میں پہاڑوں کی نوکیلی چٹانیں ابھر رہی
ہیں۔ بہت ہی خاموش اور معصومیت سے بھرپور ماحول ہے۔ رنگوں
کی آمیزش اور روحانی روشنی کا چہروں کو تابناک بنانا ایک ایسی کیفیت
پیدا کر رہا تھا جس نے کافی دیر تک تصویر کے سامنے سے نہ ہٹنے دیا۔

بوچر اور اینگرس کی تصاویر میں عورتوں کے جسم کے خطوط اور رنگوں
کی ملائمیت، ہم آہنگی اور رنگ نے متاثر کیا تو ڈیلاکروئکس کی بہت بڑی

اور مشہور تصویر LIBERTY LEADING THE PEOPLE نے فرانس کی آزادی سے روشناس کرایا جس میں انسانوں کی لاشوں پر سے ایک عورت آزادی کا پرچم لے کر رواں دواں ہے۔ فوجی گر رہے ہیں مگر پرچم آگے بڑھ رہا ہے۔

ریمبراں کی مشہور برہنہ تصویر BATHSHEBA بھی مجھے اس وقت یاد آ رہی ہے (یہ ریمبراں کی خادمہ تھی جو بعد میں اس کی بیوی بن گئی) جو غسل کر کے آئی ہے۔ ... سر لٹکائے بیٹھی ہے دائیں ہاتھ میں ... کا خط ہے جس میں اس نے اظہار محبت کیا ہے ... نیچے ... بیٹھا ہوا اس کے دائیں ... کو ... سے ... کر رہا ہے ریمبراں نے اس تصویر میں بھی اپنے روایتی رنگوں کو قائم رکھا ہے ایک الہامی روشنی "باتھ شیبا" کے برہنہ جسم پر پڑ رہی ہے جس سے اس کے جسم کے خطوط میں بے انتہا ملائمت نظر آ رہی ہے۔ گردن دائیں طرف ڈھلکی ہوئی ہے ... اور ... کی کیفیت نمایاں ہے پس پشت گہرے رنگوں کا امتزاج ہے۔

پیرس کا مشہور کرجا ساکرے کور اور فلیش

اسی دن شام کو پیرس کا مشہور کرجا ساکرے کور ... دیکھا جو آرٹسٹوں کا گڑھ (دیکھنے کی سمت سے نکلا ... ہوٹل سے تقریباً دو کلو میٹر کے فاصلے پر ... پہاڑی پر واقع ہے ... اندھیرا ہو رہا تھا ... سے پوچھ ... کے ... غلط راہوں پر چلتا بھٹکتا، رکتا آخر ... منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ ساکرے کور ... کھڑا خوبصورت، جیسے سفید پتھر سے تراش لیا گیا ہو۔ اوپر جانے کے لیے بہت سی سیڑھیاں ہیں۔ گرجا ... بہت خوبصورت ... سا ہے اسی کے قریب ہوا ہو ... آرٹسٹوں ... نائٹ کلبوں اور رقص گاہوں کے لیے ... رہے یہاں پہنچ کر بے انتہا خوشی اور مسرت کا احساس ہوا۔ اس جگہ سے متعلق کتابوں اور رسالوں میں تو بار بار پڑھا تھا مگر آج میں خود اس فضا میں گھوم رہا تھا۔ کھلی فضا میں ایک بہت ... ریسٹورنٹ بنا ہوا تھا۔ جہاں لال چھت گیری کے زیر سایہ لال میزیں، لال میز پوش اور لال ہی ٹیبل لیمپ روشن تھے۔ جن پر بوڑھے، جوان، عورت، مرد بیٹھے شغل

مے کشی میں مصروف تھے۔ قریب کے کیفے میں بھی یہی کیفیت تھی۔ میوزک بج رہا تھا، بیچ بیچ میں سب لوگ ساتھ ساتھ تالیاں بجاتے رہتے تھے اور گاتے رہتے تھے۔ معلوم ہو رہا تھا کہ زندگی میں خوشی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ جتنا بھی اس مختصر زندگی سے لطف اندوز ہو لیں بہتر ہے۔ یہی حال فیشن کا نظر آیا۔ جتنی لڑکیاں اور خواتین یہاں نظر آئیں کسی کا بھی لباس ایک دوسرے سے نہیں مل رہا تھا یہی حال لباس کی نفاست اور پہننے کا تھا۔ یہاں کی خواتین میں جتنی خوبصورتی، تمکنت اور وقار نظر آیا، میں نے ہالینڈ، جرمنی، لندن اور بلجیم کی خواتین میں بھی نہ پایا۔ ریسٹورنٹ کے چاروں طرف آرٹ کی تصویریں رکھی دکھائی دیں۔ ان میں OIL اور WATER قسم کی تصویریں شامل تھیں۔ ریسٹورنٹ کے ایک طرف مجمع نظر آیا وہاں جا کر دیکھا تو آرٹسٹ بیٹھے ہوئے پورٹریٹ بنا رہے تھے۔ تقریباً بیس منٹ یا آدھے گھنٹے میں ایک پورٹریٹ اسکیچ مکمل ہو جاتا ہے جس کی قیمت تقریباً چالیس فرینک سے ساٹھ فرینک کے لگ بھگ ہوتی تھی۔ یہاں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آرٹسٹ کو اس کی محنت کا صلہ ہاتھ کے ہاتھ ہی مل جاتا ہے۔ آس پاس بہت سی آرٹ گیلریاں اور آرٹ کی دکانیں ہیں جہاں آرٹسٹوں کی اصل تصویریں بازی پروڈکشن ہوتی ہیں کافی دیر تک ان جگہوں کا گشت کرتا رہا۔

پیرس کے ریسٹورنٹ

رات تقریباً ۱۰ بجے واپسی ہوئی، بھوک شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ ہوٹل کے قریب ہی "ومپی" ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا جہاں "اپنی مدد آپ" پر عمل ہو رہا تھا۔ میں بھی لائن میں لگ گیا ایک ٹرے میں اپنی پسند کا کھانا رکھتا گیا (سوائے گوشت کی قسم کے)، یہاں کی ڈبل روٹی گول اور تقریباً دو تین فٹ لمبی ہوتی ہے جس کو دیکھ کر تھوڑا سا تعجب ہوا۔ کھانے کی میز پر بیٹھنے کے بعد بیرے نے ایک جگ میں برف کا پانی لا کر رکھ دیا جس کو دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی اور خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ پیرس آنے سے قبل بعض حضرات نے پیرس کی جہاں بہت سی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کیا تھا وہاں یہ بھی کہ پانی بہت مشکل سے دستیاب ہوتا ہے بلکہ یہ کہ شراب کے بغیر پانی

سی نہیں جاتا۔ اب خود جب بیرے نے پانی کا جگ میرے سامنے لاکر رکھا تو میرے دونوں ہاتھ پروردگار کے شکر کے لیے اٹھ گئے۔ یہاں کا دستور بھی پسند آیا کہ ایک طرف سے کھانا لے کر آئے۔ بیٹھے کھانا کھایا اور جب دوسرے راستے سے جانے لگے تب کھانے کی قیمت وصول کی گئی۔ مگر معلوم ہوا کہ پیرس بہت مہنگا شہر ہے۔ ایک وقت کا اوسط کھانا پچیس روپے کا ہوا۔ صبح ایک گلاس فینٹا کا پیا تو تقریباً چھ روپے کا۔ چیزوں کی قیمتیں مختلف جگہ دریافت کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یورپ کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں یہاں ہر چیز مہنگی ہے۔

پیرس کی مشہور عمارتیں

اگلے دن ۲۸ اگست کو پیرس کی مشہور عمارتیں بذریعہ بس (CITYRAMA) دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے ایک چھوٹی گاڑی ہوٹل پر آئی اور مجھے لوور میوزیم کے قریب لے گئی جہاں سے ڈبل ڈیکر بس کے ذریعہ میں گھنٹے کا سفر شروع ہونے والا تھا۔ پچیس فرینک کے ٹکٹ کا ریزرویشن کل ہی کرا لیا تھا ورنہ دشواری رہتی۔ بس بہت خوبصورت اور آرام دہ تھی جس کے چاروں طرف شیشے لگے تھے جس میں بیٹھنے کے بعد معلوم ہو رہا تھا کہ کسی کھلی جگہ میں بیٹھے ہیں۔ ہر سیٹ کے ساتھ ایک ہیڈ فون ملحق تھا۔ دس زبانوں میں کمنٹری ہو رہی تھی، جس زبان میں کمنٹری سننے کی خواہش ہو بٹن دبا دیجیے اسی زبان کی کمنٹری آنے لگتی تھی۔

ٹھیک دس بجے لوور کے سامنے سے بس چلنا شروع ہوئی۔ قریب ہی ایک فوارہ نظر آیا جس میں بہت خوبصورت مجسمے بنے تھے جن کے جسم کے مختلف اعضا سے پانی کی پھواریں نکل رہی تھیں۔ (پیرس میں جگہ جگہ مجسموں کی بہتات ہے) اس کے بعد توئلریز کا مشہور باغ نظر آیا۔ کیا حسین چمن ہے جس نے صدیوں کی بہاریں دیکھی ہیں اور انقلاب فرانس کے زمانے میں سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اس سے ملحق ہی پلیس دالاکان کا رہے جہاں میری اینٹوائنٹ، ہنری ناز دہم داسوں، رابس پیر کے سر قلم ہوئے۔ اب یہاں پر وہ ستون نصب ہے جسے "کلوپیٹرا کی سوئی" کہا جاتا ہے (لندن میں دریائے ٹیمز کے کنارے ایسا ہی ستون نصب ہے) اب سامنے دریائے سین بہہ رہا ہے، اس کا ایک پل پار کر کے سامنے ایوان اسمبلی نظر آ رہا ہے جو اپنی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس کی دیواروں پر ریلیف میں سیکڑوں مجسمے بنائے ہیں۔ اس کے اندر بہت سی تبرکات بھی ہیں جن کی تاریخ ڈیڑھ ہزار سال تک پیچھے تک جاتی ہے۔ کیمرہ میرے ہاتھ میں ہے جو اپنی آنکھ سے ان نقوش دیرینہ کو اپنے میں سمو رہا ہے اور کان کمنٹری پر جو میرے دل و دماغ پر نقش ہو رہی ہے۔ اب سامنے پینتھین جو پیرس کی قومی یادگار ہے نظر آ رہی ہے اس کی دیواروں پر بڑی بڑی خوبصورت تصویریں بنی ہیں جن میں قومی رہنماؤں کے مجسمے بھی شامل ہیں۔ اس کو دیکھتے ہی انقلاب فرانس اور بعد کی زندگی ذہن میں جاگ اٹھتی ہے۔ اس عمارت میں ادیبوں، شاعروں، سائنسدانوں اور محبان وطن کی قبریں موجود ہیں۔ ان میں روسو، والٹیر، وکٹر ہیوگو وغیرہ کی بھی ہیں۔

سامنے یکسر رنگ مارنٹ کے آہنی دروازے نظر آ رہے ہیں جن میں سے جھانکتی ہوئی نظار اندر قطار لگے اونچے درختوں، پھولوں کے تختوں، فواروں اور مجسموں کی یہ تفریح گاہ پیرس کی حسن دوستی اور جمالیاتی ذوق کی آئینہ دار ہے۔ اس راستے میں کئی گرجا گھروں اور خوبصورت عمارتوں سے گزرتے ہوئے (جن کے نام ذہن سے نکل گئے ہیں) ایفل ٹاور پہنچے۔ یہ اونچا مینار نہ جانے کہاں کہاں سے دکھائی دیتا ہے۔ ہزارہا تصویریں دیکھی ہیں، بارہا اس کا ذکر پڑھا ہے لیکن اس کی بلندی، اس کی آہنی عظمت اس کے تعمیری کمال کا اندازہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ جب ہماری بس اس کے سامنے جا کر رکی تو معلوم ہوا کہ ساری عمارتیں اس کے سامنے بے حقیقت ہیں۔ تقریباً پندرہ منٹ کے وقفے کے بعد بس دوبارہ روانہ ہوئی اور ایک مرتبہ پھر دریائے سین کو پار کر کے "آرک دا ٹرائیمف" کی جانب روانہ ہو گئی جو دور سے (انڈیا گیٹ دہلی کی طرح) نظر آتا ہے۔ اس گیٹ پر بھی ریلیف میں مجسمے بنائے گئے ہیں۔ اس کے چاروں طرف سے تقریباً چودہ سڑکیں مختلف اطراف میں جاتی ہیں جن میں شانزیلیزے سب سے چوڑی اور خوبصورت سڑک ہے اس کے دونوں جانب سایہ دار درختوں کی قطاریں، جگمگا دینے والی دکانیں، ہوٹل اور ریسٹورنٹ ہیں۔ یہاں کے ریسٹورنٹ کے باہر بھی کرسیاں

پڑی رہتی ہیں جو پیرس کا ایک عام دستور ہے اور بعض مرتبہ شعل گیتی میں مشغول لوگ ایک آدھ جملہ گزرنے والوں پر بھی کہہ دیتے ہیں۔ شانزے لیزے "آرک دی ٹرائمف" سے شروع ہو کر لوور میوزیم پر ختم ہوتی ہے۔ یہاں سے ہماری بس سیکرے کور' ماں مارت (انھیں کل دیکھ چکا تھا) ہوتی ہوئی اوپیرا پہنچی جو غالباً دنیا میں سب سے مشہور موسیقی اور رقص کا مرکز ہے۔ یہ عمارت بے حد جاذب توجہ ہے سب سے پہلے تو اس کی وسعت ہی اثر انداز ہوتی ہے اور پھر اس کا حسن۔ اب سامنے لوور کا باغ نظر آنے لگا ہے۔ اس طرح ہمارا تین گھنٹے کا سفر ایک بجے لوور کے سامنے آ کر ختم ہوا۔

لوور میوزیم دیکھنے کی پیاس ندستور باقی تھی چنانچہ قدم پھر اسی جانب اٹھ گئے۔ آج میں نے اپنی پسند کی تصویروں کے فوٹو گراف لیے (بغیر فلش کے فوٹو کھینچنے کی اجازت ہے)، اس کے علاوہ وہ ہال جو کل نہیں دیکھ سکا تھا وہ بھی دیکھے۔ تصویروں اور مجسموں کے علاوہ میوزیم میں فرنیچر، لباس، ظروف، زیورات، نقاشی کے نمونے، اسلحہ جات، چھتوں پر کاری گری وغیرہ اتنی چیزیں قابل نقش کہ صرف سرسری نگاہ پر ہی اکتفا کیا۔ میوزیم کا وقت ختم ہونے پر ہی واپسی ہوئی۔

پیرس کا مشہور بازار

شام کھانے کے بعد یہاں کا مشہور بازار پگالے دیکھنے چلا گیا جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس کو بغیر دیکھے پیرس کی سیر مکمل نہیں ہوتی ہے۔ یہاں پر بیسیوں نائٹ کلب، سیکس تماشے، مشہور ریسٹورنٹ "مولن روژ" (جہاں کسی زمانے میں CAN CAN ناچ ہوتے تھے اور فرانس کا مشہور آرٹسٹ ہنری لاٹرک اسکیچ بناتا تھا) بلو موویز اور سیکڑوں دلچسپ چیزیں نظر پڑتیں۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ اصل میں پیرس رات کو جاگتا ہے۔ نوجوان ٹولیوں میں شکاری کتوں کی طرح تلاش شکار میں مشغول نظر آ رہے تھے۔ بلو موویز اور لائف شو (جس میں انسان اپنے پیدائشی لباس میں آتا ہے) میں باقاعدہ آوازیں لگا لگا کر دعوت عیش دی جا رہی تھی اور بعض کو ایجنٹ زبردستی شو دکھانے کا ٹکٹ دے رہے تھے۔ کیمرہ میرے پاس تھا جس کی مجھے زیادہ فکر تھی، دو تین فوٹو اس ماحول کے بھی لیے۔ مجھے لندن اور پیرس کی سڑکوں پر رات کے وقت خطرہ کا زیادہ اندیشہ رہا بہ نسبت ہالینڈ کے جہاں اس طرح کے واقعات شاذ و نادر ہی رونما ہوتے ہیں۔

یہاں سے پھر اپنی کل والی جگہ ماں مارت آ گیا، یہاں آ کر کل کی طرح ذہنی سکون حاصل کیا اور فن کاروں کے فن سے محظوظ ہوتا رہا۔ اس علاقہ کے بھی کافی فوٹو گراف لیے اور بعض آرٹ گیلریوں سے تصویروں کے ری پروڈکشن بھی خریدے۔ رات گیارہ بجے ہوٹل واپسی ہوئی۔

پیرس کے اسٹیشن

آج صبح (۲۹ اگست ۱۹۷۱ء) جب اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ صبح کی ٹرین کا وقت نکل چکا ہے۔ چنانچہ اب دس بج کر چھبیس منٹ کی ٹرین لی ہے۔ یہ بلجیم کے دارالخلافہ بروسلز ہوتی ہوئی ہالینڈ جائے گی۔ اس وقت کمپارٹمنٹ میں ایک امریکن جوڑا، ایک ڈچ لڑکی، ایک فرانسیسی بوڑھی عورت اور ایک اطالوی لڑکی بیٹھی ہے۔ ٹرین چلنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی ہیں۔ ابھی ابھی لاؤڈ اسپیکر پر میوزک بجنا شروع ہوا ہے جس کا مطلب ہے کہ کوئی اناؤنسمنٹ ہونے والا ہے۔ یہ طریقہ مجھے پیرس کے اسٹیشنوں پر ہی نظر آیا۔ یورپ میں کہیں اور نظر نہیں آیا۔

★

بھارت ماتا سے خطاب

عرب اور شرق کے جلوے ترے چہرے کا نکھار   صبح کا کیف، تری مست نگاہوں کا خمار
ساری دنیا کی تجلی، ترے گلشن کی بہار   "مادرِ ہند" ترے حسن پہ کونین نثار
گردشیں کرتے ہوئے نور کے دو زینے ہیں
چاند سورج ترے دربار کے آئینے ہیں

عرش کے نام سے مشہور ہے بامِ الفت   پاسباں تیرا ہمالہ ہے پڑوسی تبت
زلفِ بنگال سے اُلجھا ہوا تارِ قسمت   تیرے کشمیر میں آباد ہے جنتی جنت
تیرے ہاتھوں کی لکیریں نہیں، تلواریں ہیں
گنگا اور جمنا ترے دودھ کی دو دھاریں ہیں

تیرے اخلاق کے سکے حدِ عالم میں چلے   تیری عظمت کے دیے سارے زمانے میں جلے
تیری الفت میں جھکا دیتے ہیں تیغوں پہ گلے   ہندو مسلم و سکھ ہیں، تری گودی کے پلے
تو جو گھبراتی ہے اکثر شبِ تنہائی میں
ساتوں آکاش سمٹ آتے ہیں انگڑائی میں

علم و فن، شعر و ادب، مرکزِ اربابِ کمال   صبحِ نو، شامِ طرب، عزم و عمل، رعب و جلال
تیری دھرتی میں جواہر، ترے سینے میں ہیں لال   دیکھنے آتی ہے دنیا، ترے چہرے کا جمال
خون کی طرح نکھرتا ہے اثر پانی کا
کہکشاں بنتی ہے جھومر تری پیشانی کا

آبشاروں میں ترنم ہے پہاڑوں پہ شباب   تیرے دریاؤں کے موتی ہیں، سمندر کے حباب
تیرے جلووں کے مقابل میں ہے نایاب آب   ایشیا میں کوئی ثانی ہے نہ یورپ میں جواب
رُخ ہے مشرق و مغرب کی ترے سینے میں
دونوں کا عکس نظر آتا ہے آئینے میں

شانتی تیری زباں اور اہنسا فطرت   اہلِ دنیا کا مقدر تری اونچی قسمت
حُسنِ اخلاق سے وابستہ ہے رسمِ اُلفت   اب بھی جاتی ہے ہر اک ملک میں تیری دولت
ہے شجاعت کی کرن عظمتِ انسانی پر
یا شکن ہے ترے پرتاپ کی پیشانی پر؟

فضل نقوی

اختر بستوی

مولانا آزاد اور علامہ اقبال

ایک دوسرے کی نظر میں

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ قدرت نے اردو کے سب سے بڑے نثر نگار اور سب سے عظیم شاعر کو ایک ہی دور میں پیدا کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال دونوں ہمعصر تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو نثر نگاری کے میدان میں آزاد کا اور شاعری کی دنیا میں اقبال کا کوئی ہمسر و ہم پلہ نہیں۔ سجاد انصاری کے اس ارشاد کے بعد کہ "اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو یا مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم" شاید ہی کسی کو یہ تسلیم کرنے میں تامل ہو کہ آزاد اردو کے سب سے بڑے نثر نگار، اور اقبال سب سے بڑے شاعر تھے۔

عام طور پر عظیم المرتبت ہمعصر شخصیتوں کے باہمی تعلقات و معاملات اور ایک دوسرے کے متعلق ان کے خیالات و نظریات پر بہت کچھ لکھا جاتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ آزاد اور اقبال کے بارے میں ہمیں اس قسم کا تحریری مواد بہت ہی کم ملتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں اردو کے اہل قلم نے اس سلسلے میں اتنی بے توجہی برتی کہ اس موضوع پر علاحدہ سے کوئی ایک مضمون بھی اب تک نہیں لکھا گیا۔ حالانکہ اس مسئلے پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالنا بہت ضروری تھا کیونکہ اردو داں طبقہ کی اکثریت اس معاملے میں مختلف النوع غلط فہمیوں کا شکار ہے عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ آزاد اور اقبال دونوں بڑی ہی پُر وقار شخصیت کے مالک تھے اس لیے ان دونوں میں انتہا درجے کی انانیت پسندی تھی اور محض اپنے حد سے بڑھے ہوئے احساس انا کی بنا پر انھوں نے نہ تو ایک دوسرے کی عظمت کا اقرار کیا اور نہ اظہار فرمایا۔ میں نے اکثر بہت سے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کو بھی اس سلسلے میں یہ دلیل پیش کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ مولانا آزاد نے غبار خاطر میں متعدد شعراء کے سیکڑوں اشعار استعمال کیے ہیں لیکن علامہ اقبال کا کوئی ایک مصرعہ بھی ان میں کہیں نظر نہیں آتا اور اس طرح علامہ کے کلام سے مکمل بے اعتنائی برت کر گویا مولانا نے بالواسطہ طور پر یہ تاثر دیا ہے کہ وہ انھیں اردو کا سب سے بڑا شاعر سمجھنا تو درکنار اس لائق بھی تصور نہیں کرتے کہ ان کے اشعار ذہن میں رکھے جائیں اور ادبی تحریروں میں استعمال کیے جائیں۔

یہ اور اسی قسم کی دیگر بہت سی غلط فہمیاں صرف اس وجہ سے زبان زد عام ہیں کہ اردو کے ادیبوں اور نقادوں نے اس امر پر سیر حاصل روشنی نہیں ڈالی کہ حقیقتاً مولانا آزاد علامہ اقبال کی شاعری اور شخصیت کے متعلق کس قسم کے تصورات رکھتے تھے اور اقبال کے خیالات مولانا کی ذات، اور ان کے فکر و فن کے بارے میں کیا تھے۔ غالباً ہمارے تذکرہ نگاروں کے سامنے دشواری یہ بھی کہ جب وہ اقبال و آزاد کی نگارشات کا مطالعہ فرماتے تھے تو ان میں انھیں ایک دوسرے کی شخصیتوں کے متعلق کہیں بھی اظہار خیال نہیں ملتا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آزاد اور اقبال دونوں اس معاملے میں حد درجہ محتاط تھے اور اپنی ادبی تحریروں میں انھوں نے اس سے ہمیشہ گریز کیا۔ لیکن پھر بھی ایک ذریعہ ایسا موجود ہے جس سے اس راز درونِ پردہ کو طشت از بام کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے دونوں کے ذاتی خطوط کا ذخیرہ، جسے کھنگال کر اردو کے اہل قلم نے موضوع مذکور پر تفصیلی بحث نہیں کی اور چونکہ ذاتی خطوط زیور طباعت سے آراستہ ہونے کے بعد بھی عام لوگوں کی دلچسپی کی چیز نہیں ہوا کرتے اس لیے اردو داں عوام کی اکثریت براہ راست بھی اس سلسلے میں اصل

حقائق سے واقف نہ ہو سکی۔

اصلیت یہ ہے کہ مولانا آزاد اور علامہ اقبال ایک دوسرے کی عظمت کے قائل تھے اور ان دونوں میں نہ تو کسی قسم کی معاصرانہ چشمک تھی اور نہ کوئی معاندانہ کشاکش۔ اس کے برخلاف ان کے دلوں میں خلوص کی حلاوت تھی، اور رویے میں خوشگوار ملاطفت۔ دونوں نے اپنے دور کی نامور شخصیتوں کے نام وقتاً فوقتاً جو خطوط لکھے ہیں ان میں اکثر مواقع پر اس کا اظہار ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک موقعہ وہ ہے جب مولانا کی تصنیف "تذکرہ" منظرِ عام پر آئی اور اس کے مقدمے میں فضل الدین احمد کے قلم سے اقبال کے بارے میں یہ سطور نظر آئیں:

"ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں پچھلا حال جو کچھ سنا ہے اس کے مقابلے میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔" اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی فی الحقیقت الہلال ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔"

علامہ اقبال نے اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا:

"مولانا ابوالکلام کا تذکرہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ بہت دل چسپ کتاب ہے۔ مگر دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ "اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں۔ شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں ان کو برابر سنہ ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر انگریزی و اردو موجود ہیں، جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں۔ بہرحال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انھوں نے ایسا لکھا، مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے نہ کہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا، الہلال نے اسے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے ممکن ہے اُن کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور اُن کی تحریک سے ہمدردی مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔"

(اقبال نامہ، صفحہ ۱۱۱)

حالانکہ علامہ اقبال نے مندرجہ بالا خط میں فضل الدین احمد کی رائے پر اعتراض اور اظہار افسوس کیا ہے، کیونکہ اس سے ان کی دل آزاری ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود نہ تو انھوں نے تذکرہ کی برائی کی ہے اور نہ مولانا آزاد کے بارے میں کسی قسم کی تلخی کا اظہار کیا ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف انھوں نے انتہائی ظرف کا ثبوت دیتے ہوئے تذکرہ کی بابت یہ کہہ کر کہ "بہت دل چسپ کتاب ہے" اس کی تعریف کی ہے اور مولانا آزاد کے متعلق یہ تحریر فرما کر کہ "میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی" اپنے اُن حقیقی جذبات و تاثرات کو واضح کر دیا ہے جو آزاد کے بارے میں ان کے دل کی گہرائیوں میں موجود تھے۔ اس قسم کے موقعے پر جبکہ دل کو ٹھیس پہنچی ہو ایسے خیالات کا اظہار اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ علامہ اقبال کے قلب و ذہن میں مولانا آزاد کی عظمت کا ایسا مستحکم اعتراف جاگزیں تھا جسے کسی طرح کا احساس ناگواری بھی زائل نہیں کر سکتا ہے۔

لیکن یہاں ایک سوال اٹھتا ہے کہ کیا علامہ اقبال یک طرفہ طور پر مولانا آزاد کی عزت کرتے تھے، اور کیا خود آزاد ان کی شخصیت و شاعری کی عظمت کے قائل نہ تھے؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ مولانا کی تصنیف تذکرہ کے مقدمے میں اقبال کے متعلق مندرجہ بالا کلمات کی موجودگی بظاہر اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ مولانا آزاد اقبال کی قدر نہیں کرتے تھے اور اپنی کتاب کے مقدمہ نویس سے ان کے بارے میں اس طرح کی اہانت آمیز باتیں لکھوا کر وہ ان کے وقار و مرتبہ کو گھٹانا چاہتے تھے۔ لیکن اصلیت اس کے بالکل ہی برعکس ہے۔ مقدمے میں فضل الدین احمد نے اقبال کے متعلق جو کچھ فرمایا وہ ان کی اپنی رائے ہے اور مولانا آزاد نہ تو اسے درست سمجھتے تھے اور نہ اس کی اشاعت چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا کے خیالات کا پتہ اس مراسلے سے چلتا ہے جو انھوں نے

۲؍جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا۔ شاید سید صاحب نے اقبال کی شکایت سے مولانا آزاد کو مطلع کر دیا تھا، جس کے جواب میں مولانا نے تحریر فرمایا تھا۔

ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بیجا نہیں۔ یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی، اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی۔ لیکن لوگوں کا پیمانۂ نظر یہی باتیں ہیں تو کیا کیا جائے۔ دراصل اس کمبخت تذکرہ کی ساری باتیں میرے لیے تکلیف دہ ہوئیں۔ مسٹر فضل دین نے یہ مقدمہ لکھ کر نظر ثانی کے لیے بھیجا تھا۔ میں نے واپس نہیں بھیجا اس لیے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کو پہلا حصہ کر کے شائع کرنا چاہتے تھے اور میں مصر تھا کہ ایک ہی مرتبہ میں پوری کتاب شائع کر دی جائے۔ صرف اتنا ٹکڑا احد درجہ ضمنی مطولات وعدم انضباط کی وجہ سے نہایت مکروہ ہو گیا۔ خیال کیا کہ مقدمہ کا واپس نہ کرنا اشاعت میں روک ہوگا لیکن انھوں نے بجنسہٖ چھاپ کر، جلد باندھ کر یکا یک ایک نسخہ بھیج دیا اور ان ساری باتوں کو وہ مزاح سمجھتے رہے۔ علاوہ ڈاکٹر اقبال کے ٹکڑے کے پورا مقدمہ طرزِ تحریر و استدلال وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے۔ لطف یہ کہ اس مرتبہ جب وہ جلسہ کے موقع پر آئے اور میں نے پوچھا کہ اقبال کی نسبت آپ نے کیونکر تبدیلی معلوم کی، تو خود میرے ہی ایک قول کا حوالہ دیا۔ جو کبھی کہا تھا، حالانکہ میں نے جو بات کہی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اقبال پہلے آج کل کے عامۃ الناس کے تصوف میں مبتلا تھے، اب ان کے خیالات اس طرف سے ہٹ گئے اور دونوں مثنویوں میں جو بات ظاہر کرنی چاہتے ہیں، وہ وہی ہے جو میں ہمیشہ لکھتا رہا ہوں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد علامہ اقبال کو اردو کا سب سے بڑا شاعر تصور کرتے تھے، اور ان کا یہ تصور اتنا واضح اور یقینی تھا کہ جب عرب ممالک نے احمد شوقی پاشا کو "امیر الشعراء" کا خطاب دیا تو مولانا آزاد نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندستان میں اقبال کو "ملک الشعرا" بنا دیا جائے۔

اس سلسلے میں وہ اخبار "پیام" میں ایک تجویز شائع کرانا چاہتے تھے۔ آزاد کے اس ارادے کا حال مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے تحریر فرمایا ہے ـــــ آزاد اور اقبال دونوں چونکہ میدان ادب کے شہسوار ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی آدمی بھی تھے اس لیے ان دونوں کے ذاتی خیالات کے بارے میں ان کے اپنے خطوط کے علاوہ ان دونوں کے بعض سیاسی حلیفوں اور معاونوں کی تحریر و تقریر میں بھی کہیں کہیں کچھ حقائق کا ذکر ملتا ہے۔ مگر اول تو یہ بس خال خال ہی ہیں اور دوم یہ کہ ذاتی خطوط کی طرح چونکہ اس قسم کی تحریریں اور تقریریں بھی پڑھنے والوں اور سننے والوں کے ایک بہت ہی محدود حلقے سے باہر نہیں جا پاتیں اس لیے یہ حقائق بھی عام نہیں ہو سکے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں اور نقادوں نے بھی اس طرح کے مواد کو نہ تو ڈھونڈھ کر نکالا اور نہ اس پر مزید تحقیق و تجزیہ کر کے اس کی تفصیلات اردو دانوں کے سامنے پیش کیں ـــ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایک وطن پرست مسلمان اور سرگرم سیاسی کارکن تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے اڑتیس سال مولانا کے ایک زبردست سیاسی معتقد و معاون کی حیثیت سے گزارے۔ اس عرصے میں مولانا نے اپنے سیاسی افکار و نظریات کی تشہیر کے لیے صحافت کے جو پلیٹ فارم استعمال کیے ان میں سے اکثر پر عبدالرزاق ملیح آبادی ایک صحافی کی حیثیت سے بھی مصروف کار رہے۔ مولانا آزاد نے اقبال کو "ملک الشعرا" بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کا علم ممکن ہے کہ ان کے کچھ اور سیاسی معاونین کو بھی رہا ہو لیکن اس کا اظہار صرف عبدالرزاق صاحب ہی نے کیا ہے، اور وہ بھی بس دو سطروں میں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ذکرِ آزاد میں لکھتے ہیں :ـــ

"مصری شاعر احمد شوقی پاشا کو عرب ملکوں نے "امیر الشعرا" کا خطاب دیا تھا اس پر مولانا کو خیال ہوا کہ ہندستان میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کو ملک الشعرا بنا دیا جائے۔ ایک دن صبح مولانا ہاتھ میں کچھ کاغذ لیے میرے کمرے میں آئے اور اپنا خیال ظاہر کیا۔ میں نے سختی سے مخالفت کی۔ متعجب ہو کر فرمایا، کیا ڈاکٹر اس خطاب کے اہل نہیں ہیں؟ عرض کیا، ڈاکٹر صاحب کے

کے شاعرانہ کمالات کے معترف آپ ہیں۔ مجھے شاعری سے ذوق نہیں لیکن ڈاکٹر صاحب محض شاعر ہی نہیں ہیں، سیاسی لیڈر بھی ہیں، اور ہم ان کی سیاسیات کے مخالف ہیں۔ ملک الشعراء بن کر وہ سیاسی فائدے بھی اٹھا سکتے ہیں۔" یہ سن کر مولانا نے ہاتھ کے کاغذ پھاڑ ڈالے اور فرمایا "آپ ٹھیک کہتے ہیں ہمیں یہ تجویز نہیں کرنا چاہیے۔"

(ذکرِ آزاد صفحہ ۳۱۲ و ۳۱۳)

عبدالرزاق صاحب نے مولانا آزاد کو جس سیاسی مصلحت بینی کا مشورہ دیا تھا اور جسے قبول کر کے انھوں نے اقبال کو ملک الشعراء بنانے کی تجویز پیش کرنے کا خیال ترک کر دیا تھا، غالباً وہی آزاد و اقبال دونوں کے اس محتاط رویے کا سبب تھی جو ان عظیم شخصیتوں نے اپنی ادبی نگارشات میں ایک دوسرے کے متعلق اظہار خیال کرنے کے معاملے میں اپنا رکھا تھا، اور شاید اسی وجہ سے مولانا آزاد نے غبارِ خاطر میں بے تکان اشعار استعمال کرنے کے باوجود علامہ اقبال کے کلام سے مکمل طور پر گریز کیا تھا لیکن اس احتیاط و اغماز نے کبھی ان دونوں کے دلوں میں کسی طرح کی پرخاش یا کدورت پیدا نہیں کی۔ بلکہ اس کے برعکس یہ دونوں قلبی طور پر ایک دوسرے کے لیے ایک قسم کا جذبۂ موانست رکھتے تھے، جس کے ثبوت کے لیے علامہ اقبال کا وہ مراسلہ ہی بہت کافی ہے جو انھوں نے سید سلیمان ندوی کو اس وقت لکھا تھا جب مولانا آزاد کو رانچی کی نظربندی سے، پہلی جنگ عظیم کے بعد، رہائی ملی تھی۔ علامہ لکھتے ہیں:

"الحمد للہ کہ مولانا آزاد کو آزادی ملی۔ مولانا آزاد اب کہاں ہیں، پتہ لکھیے کہ ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔"

(مکتوب مورخہ ۳ اپریل ۱۹۱۹ء مشمولہ اقبال نامہ)

آزاد اور اقبال کے سیاسی اختلافات کو نظر میں رکھتے ہوئے اگر اس امر پر غور کیا جائے کہ ایک سیاسی اسیری سے مولانا کی رہائی کے موقع پر علامہ اقبال نے کس طرح والہانہ طور پر اظہارِ مسرت فرمایا ہے، تو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ علامہ کو آزاد سے کتنا انس تھا، اور یہ تو ایک عام تجربے اور مشاہدے کی بات ہے کہ اس قسم کا انس اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جبکہ دوسری سمت بھی ایسا ہی جذبہ موجود ہو، کیونکہ تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔

میرا مدعائے تحریر یہ ہے کہ ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کے بارے میں اس قسم کے خیالات کو ذہن میں جگہ دینا قطعی غلط ہے کہ یہ دونوں عظیم المرتبت ہمعصر اپنے حفظ و وقار اور احساسِ انا کی وجہ سے آپس میں کسی طرح کی منافرت یا مغائرت کا جذبہ رکھتے تھے، یا ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے کی بلند مقامی سے انکار تھا۔ مذکورہ بالا شواہد کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ سیاست کے معاملات میں نظریاتی اختلافات رکھتے ہوئے بھی اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اپنی ادبی تحریروں میں احتیاطاً بیگانہ یک دگر بنے رہنے کے باوجود ذاتی طور پر، یہ دونوں عظیم ہستیاں خلوص و محبت کے جذبات کے ساتھ ایک دوسرے کی عظمت کی معترف تھیں۔

★

دوہے

نصر قریشی

امرت، وِش، میٹھا پانی، بن جائے کھارا پانی
من درپن کو توڑے یارو، تیکھی، کڑوی بانی

•

دنیا کے بازار میں یارو، ہیرا بھی ہے کانچ
کیسے کیسے روپ جلائے، ناقدری کی آنچ

•

پیار کی جوت سے جگ اُجیارا، سورج جیون داتا
پیار کی جوت بجھی تو سمجھو، جگ سارا اندھیارا

•

گاڑھے وقت میں کون کسی کا، کوئی کام نہ آئے
اندھیارے میں اپنی چھایا بھی پیچھے رہ جائے

•

کاغذ کے پھولوں میں ڈھونڈے اک پاگل مہکار
بیرن ہو گئی اپنی چھایا، مطلب کا سنسار

•

تن اُپون اور اپون ہے بن، کال کی ایسی چھایا
بوستم کی الٹی مایا نے پلٹی سب کی کایا

•

پتھر دیس میں نگ نگ پتھر، برس اگنی بان
ابھیلاشائیں راکھ ہو گئیں، جیون ہے شمشان

•

من بیاہے اگی بینا، پھول بنے ہیں شول
گیتوں کی نگری میں دیکھو، اڑنے لگی ہے دھول

•

شہناز کنول

قدیم ادب — ایک جائزہ

ایک چینی کہاوت ہے — اس عظیم و قدیم بربط میں پرانے نغمات سو رہے ہیں پرانے نغمات — جو نئے دور میں ہمیں نہ بھائیں، مگر ہم یہاں تک انھیں کے ذریعہ پہنچے ہیں

ہمارا پرانا ادب دیو، پریوں، بھوتوں، چڑیلوں، شاہزادوں، شاہزادیوں، عمل سندور، جادو کی انگوٹھی، اڑن کھٹولہ جیسی تمثیلوں سے بھرا پڑا ہے۔ آج کے ایٹمی دور میں دیو، پریوں کا تصور مضحکہ خیز ضرور لگتا ہے۔ اور بظاہر سطحی بھی معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانی ذہن کی تربیت اسی ادب سے ہی ہے یونگ کہتا ہے "جنوں اور پریوں کی کہانیاں علم الاصنام کے قصے اور قدیم روایات دراصل لاشعور سے تعلق رکھتی ہیں" اور شعور نے انھیں سے بچپنا۔ کہانیوں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے، آج ہم لاشعور کے اس قیمتی اثاثے کی جا ہے قدر نہ کریں اور ان قصوں کو تمسخر کی نگاہ سے دیکھیں، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لاشعور ہی کے ذریعہ اس وقت کے انسان نے اپنے دور کی مشکلات پر قابو پایا تھا۔

شعور عقل تحقیق کا دوسرا نام ہے جبکہ لاشعور وجدان سے تعلق رکھتا ہے۔ فرائڈ نے اس کی مثال برفانی تودے سے دی ہے جو ابھرا ہوا ہے وہ شعور ہے اور جو حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے وہ لاشعور ہے

جوں جوں وقت گزرتا گیا زمانے میں تبدیلیاں آئیں اور رفتہ رفتہ انسانی عقل و شعور میں بھی پختگی آتی چلی گئی اور اسی چیز نے اس کے خیالات میں انقلاب برپا کر دیا۔ چنانچہ آج اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس دنیا کے ارتقا کے ساتھ انسانی ذہن نے بھی ایک طویل ارتقائی مرحلے کیا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمارا ذہن اپنی اصل سے زیادہ دور نہیں جا پاتا اور اسی لیے بعض اوقات آج کے انسان میں اور پتھر کے دور کے وحشی انسان میں زیادہ فرق نہیں رہ جاتا۔ دراصل ہمارا پرانا ادب موجودہ دور اور عہد رفتہ کے انسان کے درمیان ایک واسطہ سا ہوا ہے اور دونوں ادوار کے درمیان موازنہ کے مواقع بھی فراہم کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ آج بھی ایک اچھے استاد کا کام کرتا ہے

ہماری ناکامیوں کی ذمہ داری ہم پر ہی عائد ہوتی ہے ایک نوجوان اگر زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہ جاتا ہے تو آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ محض اس لیے کہ وہ دوسروں کے ساتھ دوڑ نہیں سکتا اور بہت جلد مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ مشکلات سے گھبرا کر مقابلہ کی قوت کھو دیتا ہے۔ انسان میں عزم و استقلال کامیابی کے پیچھے دوڑنے ہی سے پیدا ہوتا ہے اور ہمارے پرانے ادب کی ان کہانیوں نے اسی عزم و استقلال کا درس دیا ہے۔

شہزادی نیلوفر کی کہانی کو ہی لے لیجیے جس میں شہزادی اعلان کرتی ہے کہ وہ اسی نوجوان سے شادی کرے گی جو اس کی دو شرطیں پوری کرے گا۔ بہت سے ملکوں کے شہزادے یہ شرطیں پوری کرنے کے لیے نکلتے ہیں لیکن پھر کبھی واپس نہیں لوٹ پاتے۔ آخر کار ایک غریب درزی کا بیٹا بھی جانے کی اجازت چاہتا ہے۔ بصد مشکل وہ اس سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ سات سمندر سات میدان اور سات پہاڑ پار کر کے وہ ساتویں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتا ہے جہاں پر وہ طوطا ہے جس میں اس دیو کی جان ہے جس کے قبضہ میں بولتی مینا اور موتی برسانے والا فوارہ موجود ہے اپنی بہادری اور مینا کی مدد سے وہ دیو سے لڑ کر اُسے مار دیتا ہے، فوارے اور مینا کو لے کر شہزادی نیلوفر تک پہنچتا

ہے۔ اس بہادری اور جواں ہمتی کے صلے میں اسے نہ صرف شہزادی ملتی ہے بلکہ بوڑھا بادشاہ اپنی سلطنت بھی اسے دے دیتا ہے۔ یہ کہانی کتنی ہی بچکانہ معلوم ہوتی ہے صرف خیالوں کی اڑان ہی ہے اور معنوی لحاظ سے بھی اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن ایک معصوم ذہن کے لیے اس میں کئی غور کرنے والی باتیں موجود ہیں۔ اول تو وہ دیو جو بڑے بڑے شہزادوں کے قابو میں نہ آسکا ایک معمولی درزی کے بیٹے سے مارا جاتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی کام میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے دولت، حکومت یا کسی بڑے شخص کی اولاد ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا کوشش اور ولولہ، بہادری، خود اعتمادی اور عقل کی ضرورت ہے اور یہ چیزیں کسی کی میراث نہیں ہوتی ہیں۔ ایک معمولی انسان بھی ان پر کاربند ہو کر اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ وہ دیو کوئی غیر معمولی مخلوق نہیں بلکہ وہ ان مشکلات کی تمثیل ہے جو انسان کے مقصد کی راہ میں ہمیشہ آتی ہیں اور وہ پہاڑ، سمندر، میدان۔ وہ جد و جہد ہے جس کے بنا کامیابی ملنی ناممکن ہے۔ چونکہ تکلیف اور مشکلات کا تصور ہمارے لئے گھماؤ دار اور کریہہ المنظر ہے اس لیے دیو یا بھوت سے تشبیہ دینا اس زمانے کا کتنا صحیح تصور ہے اور ان پریشانیوں کے پس پردہ کامیابی اور کامرانی کی پریاں رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ ان تک پہنچنے کے لیے جنوں، بھوتوں، دیو اور چڑیلوں سے لڑنا بے حد ضروری بتایا گیا ہے۔ کیا آج کے دور کا انسان کسی اچھے مقصد کے لیے اسی طرح نہیں لڑتا یا ایسی ہی جد و جہد نہیں کرتا؟

اگرچہ گڑھنے والوں نے ان کہانیوں کو تفریح طبع کے لیے گڑھا ہوگا، لیکن صرف یہی ایک مقصد اس وقت بھی نہیں ہوگا اور نہ آج یہ محض دل بہلا دینے کی چیز ہیں۔ ان معمولی کہانیوں میں لکھنے والوں نے قدرت کے وہ قوانین سمو دیے ہیں کہ ان سے سبق بھی ملتا ہے عبرت بھی، کام کی ترغیب بھی اور جد و جہد کی لگن بھی۔

ان کہانیوں میں پری کا تصور بے حد دلخوش کرنے والا ہے آخر یہ پری آئی کہاں سے اس سلسلے میں بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ صفحۂ ہستی پر انسان نے جب پہلی بار اپنے اطراف پر نظر ڈالی تو اسے آسمان پر خوبصورت پرندے اڑتے نظر آئے۔ ان پرندوں کو فضا میں یوں تیرتے دیکھ کر اس نے بھی اڑنے کی کوشش کی اور اوندھے منھ زمین پر آرہا۔ اس چوٹ اور ناکامی نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ وہ کیا چیز ہے جس سے یہ پرندے اڑ سکتے ہیں۔ بہت غور کرنے کے بعد اس نے اپنے بازوؤں پر نظر ڈالی اور پھر سوچا کہ یہ رنگ برنگے پنکھ ہی ان کو اڑنے میں مدد دیتے ہیں۔ انسان ہمیشہ ہی سے خوابوں کا رسیا ہے اس انسان نے بھی تصور میں اپنے پنکھ لگائے اور ایک ہی اڑان میں فضا میں پرواز کرنے لگا لیکن اسے اس دنیا کے بارے میں کچھ بھی تو معلوم نہیں تھا اس لیے اسے اس تصور میں وہ کچھ زیادہ خوشی محسوس نہ کر سکا اور جب ایک رات وہ سویا تو خوابوں کی دیوی نے وہ پنکھ ایک عورت کے لگا دیے (عورت جو مرد کی کمزوری ہے) وہ اس خوبصورت عورت کے پیچھے بھاگا اور وہ پروں والی عورت پھر سے اڑ گئی اور یہی چیز اس کی ذہنی آسودگی کا ذریعہ بن گئی۔ آنکھ کھلی ____

حساب اور جنسیات سے ناواقف انسان کو اپنے خوابوں کی محبوبہ بہت پیاری تھی جو بار بار اسے چھل دے کر نکل جاتی تھی۔ اور یوں یہ پروں والی عورت پری بن گئی۔ حقیقی دنیا میں جب اسے پروں والی عورت نظر نہ آئی تو اس نے ان کے رہنے کی جگہ کا ایک فرضی نام دیا "پرستان"! اور کچھ عرصہ بعد یہ پریاں ان لوگوں کی مدد کو آنے لگیں جو اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرکے ہمت اور بہادری کے بل بوتے پر کسی نیک مقصد کے لیے گھر سے نکلتے اور اپنے مقصد کی راہ میں چھوٹی موٹی کامیابیاں انھیں پریوں سے ملتی تھیں

موجودہ ناولوں اور ان کہانیوں میں زیادہ فرق نہیں ہے، ماحول اور کردار بدل گئے ہیں شہزادی کی جگہ ہیروئن، بہادر شہزادے یا دہ بلند ہمت نوجوان جو شہزادی کو حاصل کرنے نکلتے ہیں ناول کا ہیرو، چڑیل اور بھوت ویمپ اور ولین کا کردار ادا کرتے اور پریاں وہ کامیابیاں ہیں جو تھوڑی بہت حاصل ہوتی ہیں مکمل کامیابی تو شہزادی کو حاصل کرنا ہی ہے۔

مشکلات کے خلاف انسان کا جہاد ایک مسلسل کہانی ہے جو تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد معمولی سے رد و بدل کے ساتھ آگے بڑھ جاتی ہے۔ ایک سیدھی سادی راہ پر چلنے سے انسان کے جوہر نہیں کھلتے ناکامیوں اور پریشانیوں کے دوران نہ صرف اس کا کردار کھل کر سامنے آتا ہے بلکہ وہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آتے ہیں اور قوت کسی سے جھک کر ملنا نہیں جانتی وہ ہمیشہ ابھرتی ہے اور دوسری قوت سے ٹکراتی ہے اور پھر اس کشمکش کا فیصلہ بھی قوت ہی کے ذریعہ ہوتا ہے واضح رہے کہ یہ حصول مقصد کی جنگ ہے۔ اور یہ جد و جہد ان کی قابلیت کا پیمانہ بھی ہوتی ہے

انی فتح اکثر لازنی چیزیں بن جاتی ہیں خواہ وہ جادو کی انگوٹھی سے ہو، الہ دین کے
چراغ سے ہو، سبز پری کی عنایت سے یا محض عقل کے بل بوتے پر کسی نیک دل شخص کے ذریعہ۔
نیک اور سچے انسان کو ہر زمانے میں عام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ
بیان کیا جاتا ہے جس طرح الف لیلیٰ میں زبیدہ کا قصہ ہے، جس میں
زبیدہ اپنی بہنوں کی غربت پر ترس کھا کر ان کو اپنے گھر لے آتی ہے انھیں
کئی ہزار دینار دیتی ہے اور ان کو اچھی خوراک عمدہ پوشاک عطا کرتی
ہے جب تجارت کی غرض سے جاتی ہے تو ان کو ساتھ لے جاتی ہے لیکن
راستے میں کسی جزیرے پر اترتی ہے جہاں کا شہزادہ زبیدہ کو پسند
کرتا ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیتی ہے ان دونوں کا میل
زبیدہ کی بہنوں کو ناگوار گزرتا ہے اور ایک رات دونوں مل کر زبیدہ اور
اس شہزادے کو سمندر میں ڈھکیل دیتی ہیں۔ شہزادہ ڈوب جاتا ہے لیکن
ایک پری زبیدہ کو بچا لیتی ہے اور اس کی دونوں بہنوں کو کتیوں کی شکل
میں تبدیل کر دیتی ہے اور زبیدہ کو شہزادے کی وہ ساری دولت بھی لا کر
دیتی ہے اور اس طرح زبیدہ کو اس کی نیکی کا صلہ مل جاتا ہے۔ اب سوچئے اس کہانی
میں احسان فراموشی کو کتنا بڑا گناہ سمجھا گیا اور اس کی سزا کتنی سخت دی گئی ہے۔
ماں کی محبت پر بے شمار کہانیاں لکھی گئی ہیں اور آج بھی لکھی جا رہی
ہیں لیکن یہ کہانی کتنا گہرا تاثر چھوڑتی ہے جب ایک صاف شفاف
راستے میں چشمہ پر ایک نوجوان لڑکا پانی بھرنے والی لڑکی سے اس چشمہ
کے پانی کی تعریف کرتا ہے تو وہ اسے بتاتی ہے کہ میں نے اپنے بزرگوں
سے سنا ہے کہ ایک خوبصورت عورت کا لڑکا ڈاکو کے ہاتھ سے ہلاک ہو گیا تھا۔
اس کے غم میں وہ اتنا روئی کہ خود بھی آنسو بن کر گھل گئی اور یہ چشمہ وجود
میں آیا اور اسی لیے اس کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا ہے کہ اس میں ممتا کا جذبہ شامل ہے۔
ہمارے ملک میں گنگا کو اسی لیے 'ماں' کہا گیا ہے کہ اس کا پانی ہر لحاظ سے بہت اچھا ہے۔
نوجوانوں میں انکساری اور پیار محبت کا جذبہ پیدا کرنا ہو تو یہ
کہانی ان کے لیے سبق آموز ہے۔ نارسیس جو غیر معمولی حسین تھا لیکن
جب خود پسندی بے حد تھی اور اس وجہ سے وہ دنیا میں ہر انسان
کو حقارت سے دیکھنے کا عادی ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سب سے الگ
تھلگ ہو گیا اور تنہائی کی زندگی بسر کرنے کے لیے جنگل میں چلا گیا جہاں
اس کے چند ساتھی تھے جو ہر وقت اس کی تعریف کرتے رہتے حتیٰ کہ وہ ان

سے بھی بے نیازی برتتا۔ ان میں ایک حسین عورت ایکو (ECHO) بھی تھی۔
آخر ایک دن نارسیس ایک چشمہ پر پانی پینے گیا اور اس میں اپنا عکس
دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ وہ چشمہ پر سے نظریں ہٹانا بھول گیا اور اسی عالم
میں کچھ دن بعد وہ ایسا پھول بن گیا جو موسم بہار کے آغاز میں کھلتا۔ یہ
کہانی خود پسند لوگوں کے لیے ہی ہے۔ ایسے انسان کا رشتہ
رفتہ رفتہ سب سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی تنہائی میں صرف وہی لوگ
داخل ہو سکتے ہیں جو مستقل اس کی تعریف کریں کیونکہ وہ کسی قسم کی تنقید
برداشت کرنے کی قوت ہی نہیں رکھتا اور ایکو تو کسی کی تعریف کرنے کی مثال
صدائے بازگشت سے بہتر ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ یونانی کہانیوں میں بھی
دیو، پری، چڑیل کو بہت دخل تھا، لیکن یونانی کہانیاں ہونے کے
باوجود چند مخصوص کرداروں کی وجہ سے انھوں نے ایک انفرادیت قائم کرلی۔
عربوں کی دیومالائی کہانیاں اپنے دور کی کہانیوں میں بہت عروج
پر رہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی قوت تخیلہ بہت بلند تھی۔ مافوق الفطرت
جاندار اور ماورائے عقل قصے جس انداز پر انھوں نے لکھے وہ ان کے ذہن کی
مکمل کامیابی کی دلیل ہیں۔ الف لیلیٰ ہزار داستان۔ قصہ سیف
الملوک داستان امیر حمزہ عمرو عیار کی زنبیل۔ قصہ حاتم
طائی وغیرہ ان کی ذہانت طبع کے ثبوت ہیں ان کہانیوں میں ایسے ایسے
جہانوں کی سیر کرائی ہے کہ گمان بھی اسے وہم سمجھنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔
ہر کہانی کو دلچسپ بنانے کے لیے دل اس لیے تیار نہیں ہوتا کہ ہر مصنف نے
نیکی اور بدی کی جنگ دکھائی ہے اور درمیان میں مصیبتوں اور پریشانیوں
کا سمندر ہے جوان مصیبتوں میں ثابت قدم رہا فتح اس کی ہو جاتی ہے دراصل
زندگی کے سفر میں طرح طرح کی رکاوٹیں اور قسم قسم کے نشیب و فراز آتے
ہیں جن سے انسان کو مفر نہیں تھا۔ زندگی جتنی بامقصد اور اعلیٰ ہوگی اتنی
ہی جدوجہد بڑھ جائے گی۔ ہر کہانی کا اختتام اس بات کی نشاندہی کرتا
ہے کہ اچھا عمل کبھی رائیگاں نہیں جاتا اور محبت کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہے۔
ہر کہانی کا مقصد ایک ہونے کے باوجود تمام کہانیوں اور قصوں
کا پس منظر اپنے ملک کی تہذیب اور روایات پیش کرتا ہے۔ افریقی کہانیوں میں
پریاں نہیں ہیں ان کی جگہ خوش آواز پرندے ہیں۔ یہ پرندے دو قسم کے ہیں بعض ظالم
کی مدد کرتے ہیں بعض مظلوم کی۔ جیسے کسان کی کہانی ہے ایک پرندہ ہے جو کسان

کے کھیت میں ایسی آواز سے گھاس پھوس پیدا کر دیتا ہے۔ کسان اچھے پرندے سے فریاد کرتا ہے۔ وہ فوراً مدد کرتا ہے اور اس پہلے پرندے کو پکڑوا دیتا اور پھر کسان کا گھر دودھ اور مکھن سے بھر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کسان کے لیے ہیرے جواہرات یا شہزادی سے زیادہ اہم چیز اس کی فصل اور دودھ مکھن ہے اس کے مویشی ہی قدرت کا انعام ہیں چونکہ افریقہ دوسرے ممالک کی بہ نسبت پسماندہ رہا اس لیے وہاں نہ شہزادہ ہے نہ شہزادی نہ موتی رولنے والی پریاں۔

ہندو دیومالائی کہانیوں میں پریوں سے زیادہ بھوت پریت کو دخل رہا ہے لیکن کہانی کا سب سے اہم کردار ہمیشہ بہادری جوانمردی، ایمانداری اور عمل کی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

جس طرح ایک غریب برہمن کمانے کے لیے گھر سے نکلتا ہے اس کے جانے کے کچھ دن بعد ایک بھوت برہمن کی شکل میں اس کے گھر آ کر رہنے لگتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب اصلی برہمن واپس آتا ہے تو بھوت برہمن اسے گھر میں گھسنے تک نہیں دیتا۔ اصلی برہمن بادشاہ کے پاس شکایت لے کر جاتا ہے۔ لیکن بادشاہ کی بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔ آخر ایک درباری کے دو چھوٹے بچے بھوت کو بھگانے کے لیے جاتے ہیں۔ پہلے ایک بوتل منگواتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ جو اصلی برہمن ہوگا وہ بہ آسانی اس بوتل میں گھس جائے گا۔ نتیجہ میں وہ بھوت فوراً بوتل میں گھس جاتا ہے اور پھر بوتل مضبوطی سے بند کر کے سمندر میں پھینک دی جاتی ہے۔ اس کہانی میں جہاں نیکی اور بدی کی جیت ہار ہے وہیں انسانی عقل کی کرشمہ سازی بھی دکھائی گئی ہے، بھوت کتنا بھی زور آور ہو لیکن عقل انسانی ذرا سی سوجھ بوجھ سے اسے تسخیر کر سکتی ہے مشکلات بھی انسان پر کبھی کبھی ہر طرف سے یلغار کرتی ہیں لیکن اگر کوئی حکمت عملی اور خود اعتمادی سے کام لے تو پھر جیت یقینی ہو سکتی ہے

بنگالی کہانیوں میں بھی پریوں کو زیادہ دخل نہیں ہے اور بنگالی کی طرح انگریزی کہانیاں بھی پری کے علاوہ بھوت پریت، آسیب اور بدروحوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں ان کا نظریہ یہ ہے کہ جب بڑے انسان مر جاتے ہیں تو اُن کی روحیں وہی کام کرتی ہیں جو وہ زندگی میں کرتے تھے۔

آئرش کہانیوں میں بھی آسیب اور بھوت کثیر تعداد میں موجود ہیں، لیکن ان کے بھوت پریت نرم دل اور انسان دوست ہوتے تھے اور پریاں بھی موجود ہیں۔ لیکن ان کے بھوت اور پری اگر کسی سے گبڑ جائیں تو ان کی رحم دلی سخت دلی میں بدل جاتی ہے اور پھر وہ اسے پریشان کرتے ہیں اور ستاتے ہیں۔ آئرش پریوں اور دوسرے ممالک کی پریوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ آئرش پریاں چھوٹے سے قد کی نازک اندام ہوتی ہیں اور ہمیشہ سبز لباس میں رہتی ہیں۔ وہ چاندنی راتوں میں گھاس پر رقص کرتی ہیں اور صبح کو گھاس پر پڑے فیری رنگ (FAIRY RING) دیکھ کر سب سمجھ جاتے ہیں کہ رات کو یہاں پریوں کا رقص ہوا تھا۔ یہی پریاں دن میں ہوا کے ساتھ بگولہ بن کر رقص کرتی ہوئی چلتی ہیں اس لیے ان کی کہانیوں میں جگہ جگہ یہ ہے کہ جب کوئی بگولہ دیکھو تو ہیٹ اتار کر ننھی پریوں کو تعظیم دو تاکہ وہ تم سے خوش رہیں۔

علم کی انتہا حیرت ہے تو ان کہانیوں کی انتہا بھی انبساط آمیز حیرت ہوتی ہے: "اور اس کے بعد سب ہنسی خوشی رہنے لگے" یہ وہ جملہ ہے جو اسی کہانیوں کا آخری فقرہ ہوتا ہے جس کو کہنے کے بعد پلکیں نہیں جھپکتی ہیں بلکہ غموں کے سارے اندھیرے دور ہو کر اُمید اور کامیابی کا سورج طلوع ہوتا ہے۔ ہر ایک کامیابی پہلے دل میں جنم لیتی ہے کچھ عرصہ بعد پھر خوابوں تک پہنچتی ہے باعمل انسان کے لیے حقیقت کا روپ اختیار کر لیتی ہے سست کاہل اور بے عمل کے لیے محض ایک خواب سی رہتی ہے۔ دراصل ہماری پوری زندگی ہمارے خیالات کا پھل ہوتی ہے۔ ایسے خوابوں کو حاصل کرنے کے لیے جس قدر محنت کی جائے گی اسی قدر وہ حقیقت بنتے جائیں گے۔ کل کا انسان معجونِ فلک سیر کھا کر پورے حلا کو کھنگال آتا تھا آج کا انسان راکٹ سے چاند تک پہنچ گیا معجون فلک سیر سے راکٹ تک صرف عمل کی قوت ہے۔ پھر بھلا ان کہانیوں کو ہم تمسخر کی نگاہ سے دیکھنے کا حق کہاں رکھتے ہیں۔ دراصل وہ انسانی ذہن کے خواب تھے جن کو آج عمل کی قوت حقیقت کا روپ دے رہی ہے۔ اور اس لحاظ سے ان کہانیوں کا نکتۂ نظر بہت وسیع ہے۔ ان میں تجسس اور تلاش کے جذبہ کی فراوانی ہے، بہادری، شجاعت کے وہ کارنامے ہیں جو انسان کے شوق کو تیز کر کے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ سب کچھ جان لینے اور پھر حاصل کرنے کی خواہش ہی انسان کا وہ جذبہ ہے جو کبھی ہمالیہ کی چوٹی سر کرا دیتا ہے کبھی امریکہ دریافت کراتا ہے اور کبھی چاند پر پہنچواتا ہے۔

اور اگر انسانی تاریخ سے یہ جذبہ نکال دیں تو پھر آپ خود سوچئے باقی ہی کیا رہ جائے گا —؟

★

غزل

محسن جلگانوی

چہروں میں ملیں گے نہ کتابوں میں ملیں گے
ہم لوگ بہت دور سرابوں میں ملیں گے

مہکے گی تمہارے بھی بدن جسم کی خوشبو
کچھ رنگ ہمارے بھی گلابوں میں ملیں گے

لائیں گے کہاں سے یہ اجالوں کے سمندر
ویسے کئی سورج بھی حبابوں میں ملیں گے

آواز پلٹ آئے گی دیوارِ وفا سے
پتھر بھی سوالوں کے جوابوں میں ملیں گے

ان ملگجی راتوں میں تراشے ہوئے پیکر
سب شہر کی پریوں کے شبابوں میں ملیں گے

بن جائیں گے ہم ڈھلتے ہوئے گیت کی دھڑکن
آواز کی لے بن کے ربابوں میں ملیں گے

شہزادوں کی محفل میں نہ ڈھونڈے کوئی محسن
ملنا ہے تو ہم خانہ خرابوں میں ملیں گے

سید تعبیر حسن کوثر

پھر فصلِ گل میں شعلۂ برقِ تپاں بنے
یہ کون چاہتا ہے نشیمن دھواں بنے

فن کار چاہتا ہے کمالاتِ فن کے ساتھ
ہر جملہ داستاں کا نئی داستاں بنے

ہے بندشِ قفس میں بھی تعمیر میں یہ کد
جب کوئی آشیانہ جلے آشیاں بنے

رکھ دیں قدم جو آپ تو ذرّے چمک اٹھیں
فرشِ زمیں پہ ایک نئی کہکشاں بنے

آجائیے بس آپ کے آنے کی دیر ہے
ہجراں نصیب دل کی زمیں آسماں بنے

کیا کہیے انقلاب کی نیرنگیوں کا حال
گلشن وہی جلائے وہی باغباں بنے

جو حوصلوں سے بڑھتے رہے پا گئے مراد
جو تھک گئے وہ گردِ رہِ کارواں بنے

کوثر اگر نصیب ہو دامن ترا اٹھیں
ایک ایک اشک کشتیِ عمرِ رواں بنے

سلام بن رزاق

(کہانی)

بے کلامی

مہنگائی کا گراف دن بہ دن ندی کی باڑھ کی طرح بڑھ رہا ہے۔ اور گھر کا بجٹ چکنی مچھلی کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ پانچ منٹ پہلے ہی بیوی وارننگ دے چکی ہے کہ گیہوں ختم ہو چکے ہیں اور یہ کہ روٹی کے لیے آٹا بالکل نہیں ہے۔ آج مہینے کی پچیس تاریخ ہے، راشن پہلی تاریخ سے پہلے ملے گا نہیں۔ اور بلیک سے خریدنے کی جیب میں گنجائش نہیں۔ تنخواہ کے لیے قریب ایک ہفتہ باقی ہے اور میری جیب میں پڑا پانچ روپے کا اکلوتا نوٹ آنے والے وقت کا عفریت بنا مجھے ڈرا رہا ہے۔ پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ میری ساری ذہنی الجھن کا باعث یہی پانچ کا نوٹ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اسے باہر نکال کر اس کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں اچھال دوں اور مطمئن ہو کر پلنگ پر نڈھال پڑ جاؤں۔ ساری پریشانیوں کی جڑ یہی اکلوتا نوٹ تو ہے۔ جب اس کا خیال آتا ہے۔ بنیے کا قرض، بجلی کا بل، دودھ والے کی اُدھاری، راشن کا ہفتہ، سبھی کچھ یاد آ جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے میری ساری پریشانیوں کے تانت اسی نوٹ کی کھونٹی سے بندھے ہیں۔

میری چھوٹی بچی پکار رہی ہے۔ "ابا! ابا! پانچ پیسہ دو نا ابا! ہمیں پانچ پیسہ چاہیے۔ ٹافی لینا ہے۔ ابا دو نا۔ ابا اٹھو نا۔" اس کی چھوٹی اور نرم ہتھیلیوں کا لمس میں اپنے بازو پر محسوس کر رہا ہوں۔ اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔ اس کی آواز میں بیک وقت لجاجت، جھنجھلاہٹ، اضطراب سبھی کچھ اتر آیا ہے۔ مگر مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ میں اسی طرح آنکھیں بند کیے پڑا ہوں۔

"امی ابا نہیں اٹھتے۔ امی پانچ پیسہ دو نا۔" بچی مایوس ہو کر اپنی ماں کے پاس جا چکی ہے۔ میں نے بیوی کے الفاظ نہیں سنے۔ مگر بیوی نے شاید اسے ڈانٹ دیا ہے۔ کیونکہ بچی اب رو رہی ہے۔ ایک تھکی تھکی اور مایوس روہاہٹ جس میں نہ کوئی ضد کی شدت نہ تڑپ۔ بس ایک سطحی قسم کی ریں ریں۔ شاید بچی بھی جان گئی ہے کہ اسے کچھ نہیں ملے گا۔ اب کہیں سے بھی پانچ پیسہ نہیں ملے گا۔ میں چپ چاپ آنکھیں بند کیے اس کا رونا سن رہا ہوں۔ میرے دل میں ایک بار کو خیال آیا ہے کہ اسے گود میں لے کر پچکار دوں۔ مگر وہ اتنا کمزور تھا کہ پانی کے بلبلے کی طرح اٹھا بھی اور ٹوٹ بھی گیا۔ بچی روتی ہوئی پھر میرے پاس آ کھڑی ہے۔ چند لمحے اسی طرح روتی ہے۔ پھر جب دیکھتی ہے کہ میری آنکھیں بند ہیں اور میں اس کے رونے کا کوئی نوٹس نہیں لے رہا ہوں تو مجھے سوتا جان کر برآمدے میں چلی جاتی ہے۔ اب اس کی روہاہٹ بند ہو چکی ہے اور میں اسی طرح آنکھیں بند کیے پڑا ہوں۔

جب تک ہم اپنی آنکھیں بند کیے رہتے ہیں کتنے محفوظ ہیں۔ حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ ہو تو شتر مرغ بن جانے میں عافیت ہے۔ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں۔ وہ انتہائی مایوس کن ہے۔ مگر میرے خیالات میں اب وہ استحکام اور سختی نہیں رہی جو کبھی تھی۔ میرا ذہن تو اس دلدل اور بنجر دھرتی کی مانند ہو گیا ہے جس میں خیالات کے پودے اپنی جڑیں پھیلانے سے پہلے ہی مرجھا جاتے ہیں۔

باورچی خانے سے برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی ہے

یہ کھڑ پٹر آج معمول سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ بیوی شاید اپنی جھنجھلاہٹ کا نکھار برتنوں پر اتار رہی ہے۔ وہ ہر مہینے کی آخری تاریخوں میں یہی کرتی ہے۔ میں اسی طرح آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑا ہوں۔ بیوی نے شاید میری خاموشی سے میری مجبوری کا اندازہ لگا لیا ہے۔ اس نے پڑوس میں کسی سے اُدھار آٹا لے لیا ہے۔ اور اب آٹا گوندھ رہی ہے۔ تھالی کی رُخ رُخ سنائی دے رہی ہے۔ مجھے تھوڑا اطمینان ہوتا ہے۔ اگر روٹی نہ بنتی تو منا اسکول سے لوٹتے ہی ایک ہنگامہ کر دیتا۔ اُسے اسکول سے لوٹتے ہی سب سے پہلے پیٹ بھر روٹی چاہیے۔ ورنہ رو رو کر اور چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اُٹھا لیتا ہے۔ کمبخت سے بھوک ذرا برداشت نہیں ہوتی۔ ویسے بھی غریبوں کے بچے کچھ زیادہ ہی پیٹو ہوتے ہیں غالباً ان کے لاشعور میں بھی یہ بات بیٹھی ہوتی ہے کہ جتنا کھا سکتے ہو اسی وقت کھا لو۔ پتہ نہیں بعد میں ملے نہ ملے۔ بیوی شاید اسی کا خیال کر کے آٹا ادھار لے آئی ہے۔ بہرحال اب شام تک کی فکر سے تو نجات مل گئی ہے۔ شام کو دیکھا جائے گا۔ لے آؤں گا بنیے سے کچھ ادھار۔

بیس تاریخ کے بعد مجھے بنیے کی صورت دیکھتے ہی ہول ہونے لگتا ہے کیونکہ عموماً بیس تاریخ کے بعد اس کے ہاں سے اُدھاری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیس تاریخ کے بعد اس کا چہرہ اتنا کٹھور اور سپاٹ ہو جاتا ہے۔ جیسے آدمی کا چہرہ نہ ہو، کسی گینڈے کی کھال کا ٹکڑا ہو، سخت اور جذبات سے عاری۔ آواز بے مروتی کے زہر میں ڈوبی ہوئی۔ ہر بیس تاریخ کے بعد مجھے یہ سب جھیلنا ہی پڑتا ہے۔ اس قسم کی توہین، حقارت اور ذلالت جھیلنے کا اب میں قریب قریب عادی ہو گیا ہوں۔ اب کسی کی بھی کسی قسم کی بے اعتنائی یا اہانت سے میری بے حس غیرت میں جنبش تک نہیں ہوتی۔ حالات کی چوطرفہ چوٹیں سہتے سہتے شاید بے چاری غیرت مر ہی گئی ہے۔

"بابا! اللہ کے نام پر دو مٹھی آٹا۔" شاید کوئی فقیر آواز لگا رہا ہے۔ اس مہنگائی کے زمانے میں دو مٹھی آٹا بھی خیرات کرنا کتنا مشکل ہے۔ خیرات اور سخاوت کے قصے اس زمانے میں کتنے جھوٹے اور ناقابل یقین لگتے ہیں۔ حاتم اور ہریش چندر اس زمانے کے لوگ ہوں گے جب دنیا مہنگائی سے پریشان نہیں تھی۔

پچھلے ہفتہ دفتر سے چھٹی لے کر دن بھر راشن کی قطار میں کھڑا رہا تھا تب کہیں جا کر دس کیلو راشن لے پایا تھا۔ چینی پھر بھی نہیں ملی تھی۔ تین چار روز تک بچوں کو دودھ میں گڑ گھول کر پلانا پڑا تھا۔ پیتے وقت وہ عجیب منہ بناتے تھے۔ جیسے دودھ نہ پی رہے ہوں۔ دوا پی رہے ہوں۔

"مائی آدھی روٹی دے دو۔ سویرے سے بھوکا ہوں۔"

پھر کوئی بھکاری۔ میں پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھتا نہیں مگر آواز سے اندازہ لگا لیتا ہوں کہ سات آٹھ برس کا کوئی بھکاری بچہ ہے۔ منا کی عمر کا۔ بیوی شاید منی کے ذریعے اسے آدھی روٹی بھجوا رہی ہے۔ اسے بھی غالباً اس بھکاری بچے میں اپنے منے کی جھلک نظر آئی ہوگی۔ جب ہم دوسروں پر ترس کھاتے ہیں تو دراصل ہم اپنے آپ پر ترس کھاتے ہیں۔ ہم خیرات کرتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ ہمارے دل میں دوسروں کے لیے ہمدردی کا جذبہ ہے بلکہ ہمارے تحت الشعور کے کسی نامعلوم گوشے میں یہ خوف براجمان ہے کہ اگر وقت نے ہمیں بھی ایسا ہی بنا دیا تو؟ اور یہ خوف بڑھ کر ہمیں اس بھکاری کے روپ میں کھڑا کر دیتا ہے۔ اور ہم بے اختیار اس بھکاری کو یعنی کہ اپنے آپ کو خیرات دینے لگتے ہیں۔

اصل میں ہمیں کسی سے کبھی ہمدردی یا محبت نہیں ہوتی ہمیں صرف اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے۔ انسان پرلے درجے کا خود غرض حیوان ہے۔

بھکاری بچہ جا چکا ہے۔ میں آنکھیں کھولتا ہوں۔ دروازے کی چوکھٹ سے لگی منی روٹی کھا رہی ہے۔ بچے جب اپنے آپ میں مگن ہوں تو کتنے معصوم لگتے ہیں۔ اس وقت ان کے مقابلے میں ہم کتنے ادھورے اور حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ میں اشارے سے منی کو اپنے پاس بلاتا ہوں۔ مگر وہ گردن کو جھٹکا دے کر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتی ہے۔ اس کی پیشانی پر ننھی ننھی شکنیں ابھر آتی ہیں۔ میں مسکرا دیتا ہوں اور دوبارہ اشارے سے اسے اپنے پاس بلاتا ہوں۔ مگر وہ پھر بھی نہیں آتی۔ روٹی کترتی ہوئی دروازے کے باہر نکل جاتی ہے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ طبیعت کا اضمحلال جوں کا توں ہے۔ جی چاہ رہا ہے بس یونہی بے حرکت پڑا رہوں۔ اب اکثر اسی

قسم کی تھکان تلے گھٹتی ہے۔ اور دل کسی بھاری بوجھ تلے دبتا محسوس ہوتا ہے۔ جوش، امنگ، ولولہ، سب کو جیسے گھن لگ گئی ہے نہ آگ، نہ گرمی، نہ تمازت۔ چنگاری، نہ برف۔ راکھ کا ایک ڈھیر۔ زندگی کبھی کبھی کتنی بے کیف لگنے لگتی ہے۔ سوچا جائے تو اس بے کیفی کی کوئی ٹھوس وجہ بھی نہیں ہوتی۔ مگر ذہن ہر دم ایک تھکا دینے والے نم سے ڈھال رہتا ہے۔

بالوجی! [illegible] ان کے نام پر [illegible]"

اُف! یہ کوئی بھکارن نہیں۔ آواز کسی بھکارن کی معلوم ہوتی ہے [illegible] اور بھوک کے غلبے کے باوجود کوئی مٹھاس کی [illegible] ہے۔ میری آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ ایک انتہائی میلا [illegible] پہنے ایک [illegible] کی ہمت لیے ایک [illegible] کر [illegible] لڑکی [illegible] ہوں میری طرف [illegible] ہے۔ اس کی بولی [illegible] سے کہ اس کی [illegible] ہیں۔ سینے سے کمر تک [illegible] بال [illegible] بھوک کے ایک [illegible] جس کی [illegible] کی [illegible] پتلی اور نازک معلوم [illegible] ہے۔ اس کے گالے کے [illegible] اور سینے کی [illegible] ہیں۔ [illegible] اس قدر [illegible] ہوئے ہیں کہ ان کی [illegible] وہ [illegible] نظر آنے لگے ہیں۔ یہ بھی کسی قحط [illegible] آئی ہوئی [illegible] اس کی [illegible] نہیں [illegible] بھوک [illegible] اس کے عضو عضو سے ظاہر ہے۔ [illegible] سب بھوک کے آگے کتنے بے حقیقت نظر آتے ہیں۔

"بالوجی! ایک [illegible] کر دیجیے۔ بھگوان آپ کا بھلا کرے گا۔"

وہ [illegible] چڑھ کر دروازے کی چوکھٹ سے آ لگی ہے۔ میری بچی گھبرا کر [illegible] ہے۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی روٹی کا ٹکڑا ہے۔ مگر اس نے اسے اس طرح اپنی پیٹھ کے پیچھے چھپا لیا ہے جیسے اسے خوف ہو کہ نظر پڑتے ہی وہ بھکارن اس سے روٹی کا ٹکڑا چھین لے گی۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چھٹے پیسے تلاش کیے۔ [illegible] میں ایک تین پیسے کا سکہ پڑا ہوا مل گیا ہے۔ میں نے سکہ بھکارن لڑکی کی طرف اچھال دیا۔ وہ سکہ لینے کے لیے نیچے جھکی اور اس کے گداز جسم کے نشیب و فراز اور بھی نمایاں ہو گئے۔ ایک لمحے کے لیے میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک گدگدی سی دوڑ گئی۔ میں دوبارہ [illegible] پلیٹ کر آنکھیں موند لیتا ہوں۔ بھکارن نے شاید مجھے دوبارہ پکارا بھی ہے۔ مگر میں آنکھیں نہیں کھولتا۔ مجھے خود اپنی آنکھوں سے خوف محسوس ہونے لگا ہے۔ بھکارن شاید آگے بڑھ گئی ہے۔

"ابا! ہمیں بھی پانچ پیسے چاہییں۔ آپ نے اس عورت کو پانچ پیسے کیوں دیا؟"

یہ منی ہے۔ مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ میں آنکھیں کھول کر منی پر ایک نظر ڈالتا ہوں۔ پھر مسکرا کر اس کی دونوں بانہیں پکڑ کر اسے کھینچ لیتا ہوں اور اسے سینے پر بٹھا لیتا ہوں۔ منی پہلے تو مجھ سے اپنی بانہیں چھڑانے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر گردن مٹکا کر کہتی ہے "میں آپ کو پپی نہیں دوں گی۔ ممی کو پپی دوں گی۔ آپ نے مجھے پانچ پیسے نہیں دیا نا؟" میں اسے چمکارتا ہوں۔ "میرے پاس چھٹا پیسہ نہیں ہے بیٹا۔ بازار جاؤں گا نا تو تمہارے لیے اچھی سی گڑیا لاؤں گا۔"

"جھوٹ آپ نہیں لائیں گے۔"

میں اسے سمجھاتا ہوں۔ "[illegible] گا بیٹا، اچھا [illegible] نہیں ایک گانا تو سنا دو۔"

منی گانا سنانے لگتی ہے۔

"میں چلی میں چلی میرے ساتھی [illegible] میرے ساتھی۔
گھٹا [illegible] کے، چل یار [illegible]
[illegible]"

گانے کے ساتھ ہی وہ میرے سینے پر بیٹھی مٹکتی بھی جا رہی ہے۔ میں خوب ہنستا ہوں۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ کچھ دیر پہلے کا [illegible] دھیرے دھیرے ختم ہوتی جا رہی ہے۔

سے بیوی پکار رہی ہے۔ وہ مجھے کھانے کے لیے بلا رہی ہے
کچھ دیر پہلے بھوک بالکل نہیں تھی۔ مگر اب اچھی خاصی بھوک محسوس
کر رہا ہوں۔ میں منّی کو باہوں سے پکڑ کر پلنگ کے نیچے اتار دیتا ہوں۔
منّی مچلنے لگتی ہے۔ مگر جب میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں تب اس
کا مچلنا تھم جاتا ہے۔ میں باہر کا دروازہ بند کر لیتا ہوں۔ منّی میری
انگلی تھام لیتی ہے۔

"چلو بیٹا! کھانا کھانے چلتے ہیں۔"

میں منّی کے ساتھ باورچی خانے کی طرف مڑتا ہوں۔ تبھی
اُس کی طرف بڑھتے ہوئے میرے قدم یک بیک رک جاتے ہیں۔ باہر
سے کوئی میرا نام لے کر پکار رہا ہے۔ آواز جانی پہچانی سی لگتی
ہے۔ میں پلٹ کر دروازہ کھول دیتا ہوں۔ سامنے میلے چیکٹ کپڑوں
اور دھول بھرے چہرے کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کے شخص کھڑے
ہیں۔ ان سے ذرا ہٹ کر ایک برقعہ پوش خاتون اور ان کی کمر سے
لگی تین دبلی پتلی لڑکیاں کھڑی ہیں۔ لڑکیوں کی عمر علی الترتیب گیارہ
نو اور سات برس کی ہوں گی۔ میں ادھیڑ عمر شخص کو فوراً پہچان گیا ہوں۔
یہ رشتے میں میرے والد کے چچا زاد یا پھوپھی زاد بھائی لگتے ہیں۔
اس رشتے سے وہ میرے چچا ہیں۔ برقعہ پوش خاتون ان کی بیوی
اور دو لڑکیاں ان کی بچیاں ہیں۔ مگر یہ لوگ تو یوپی کے پاس گاؤں
میں رہتے تھے۔ بغیر اطلاع کیے اچانک کیسے آ گئے؟ مگر جب ان
کے پیچھے کھڑے قلی پر نظر پڑی جس کے سر پہ ایک ٹرنک اور کچھ دیگر
سامان رکھا ہے تب اچانک مجھے ایک مہینہ پہلے گاؤں سے آیا
ہوا ان کا ایک خط یاد آ جاتا ہے جس میں انھوں نے اس سال
بھی بارش نہ ہونے اور اپنی کھیتی کے بالکل ہی سوکھ جانے کی
اطلاع دی تھی۔ اب میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں

ایک بار پھر میری نظروں نے ان سب کے چہروں کا جائزہ
لیا ہے۔ چچی کے میلے برقعے اور لڑکیوں کے سوکھے سہمے چہروں پر سے
ہوتی میری نظریں چچا کی دھول بھری کھچڑی داڑھی پہ آ کر ٹھہر گئی ہیں۔
دفعتاً وہ آگے بڑھے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ ۔۔۔ وہ پھوٹ پھوٹ
کر رو رہے ہیں۔ چچی کے برقعے کے اندر سے ہلکی ہلکی سسکیوں
کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ لڑکیوں کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئی
ہیں۔ کل ملا کر ایک ایسی ماتمی کیفیت پیدا ہو گئی ہے جس کے باعث
سے میرے دل اور دماغ سُن ہوتے جا رہے ہیں۔ میرا ہاتھ
میری جیب میں ہے۔ اور میرے ہاتھ کی بند مٹھی میں سے وہ پانچ
روپے کا اکلوتا نوٹ، چچا کے رونے کی آواز بار بار سنائی دے رہی
ہے۔ مگر میں اس قدر سٹپٹا گیا ہوں کہ انھیں تسلی دینے کے بجائے
ہکا بکا کھڑا ان کا منہ تک رہا ہوں۔ میں اس وقت اس ایکٹر کی
طرح بوکھلایا سا لگ رہا ہوں جو سین اسٹیج پر اپنے مکالمے بھول گیا
ہو۔

★

علیم جہانگیر

شاعر و مصور

رنگ بھرتی ہے فضاؤں میں تری فکر رسا
حسن کا پیکر نظر آتی ہے ہر موج صبا

دیکھ کر پُر ہول سناٹے میں اجڑی بستیاں
غم سے رہ جاتا ہوں دانتوں میں دبا کر انگلیاں

تیری زلفیں بدلیاں، آنکھیں ستاروں کی طرح
چال میں ہیں مستیاں، رنگت شراروں کی طرح

رکنے لگتے ہیں اجالوں کے اسی دم جیسے پاؤں
جس طرف پگڈنڈیوں پر پڑتی ہے گاگر کی چھاؤں

مضطرب ہوتا ہے اس منظر سے دل انسان کا
دھڑکنوں پر دل کی ہوتا ہے گماں طوفان کا

اے مصور تجھ کو شاعر نے اسی پر مات دی
کھینچ بھی سکتا ہے تو تصویر احساسات کی

کاش دے سکتا تجھے حسن بصیرت تیرا فن
ہر مرقع تیرا بن جاتا خود اپنی انجمن

کون ہے قائل تری اس شوخیٔ تحریر کا
تو مصور ہی نہیں جذبات کی تصویر کا

غزل

زبیدہ تحسین

ہر شمع تمنا کو پروانہ بنایا ہے
حالات نے یوں دل کو ویرانہ بنایا ہے

میں نے تو چھپایا تھا اشکوں کو تبسم میں
دنیا نے مرے غم کو افسانہ بنایا ہے

احباب بھی اپنے تھے اغیار بھی اپنے تھے
کس کس کو رقیبوں نے بیگانہ بنایا ہے

کچھ دور چلے ہیں وہ جو ساتھ کبھی میرے
اس بات کا دنیا نے افسانہ بنایا ہے

جیتے ہیں کہ جینا بھی سنتے ہیں عبادت ہے
ورنہ ہمیں اپنوں نے کیا کیا نہ بنایا ہے

تخئیل میں ڈھالے ہیں کتنے ہی صنم ہم نے
کعبہ نہیں بنتا تھا بت خانہ بنایا ہے

ہر شے کو جگہ دی ہے جز گردِ کدورت کے
تحسین دل محزوں کو آئینہ بنایا ہے

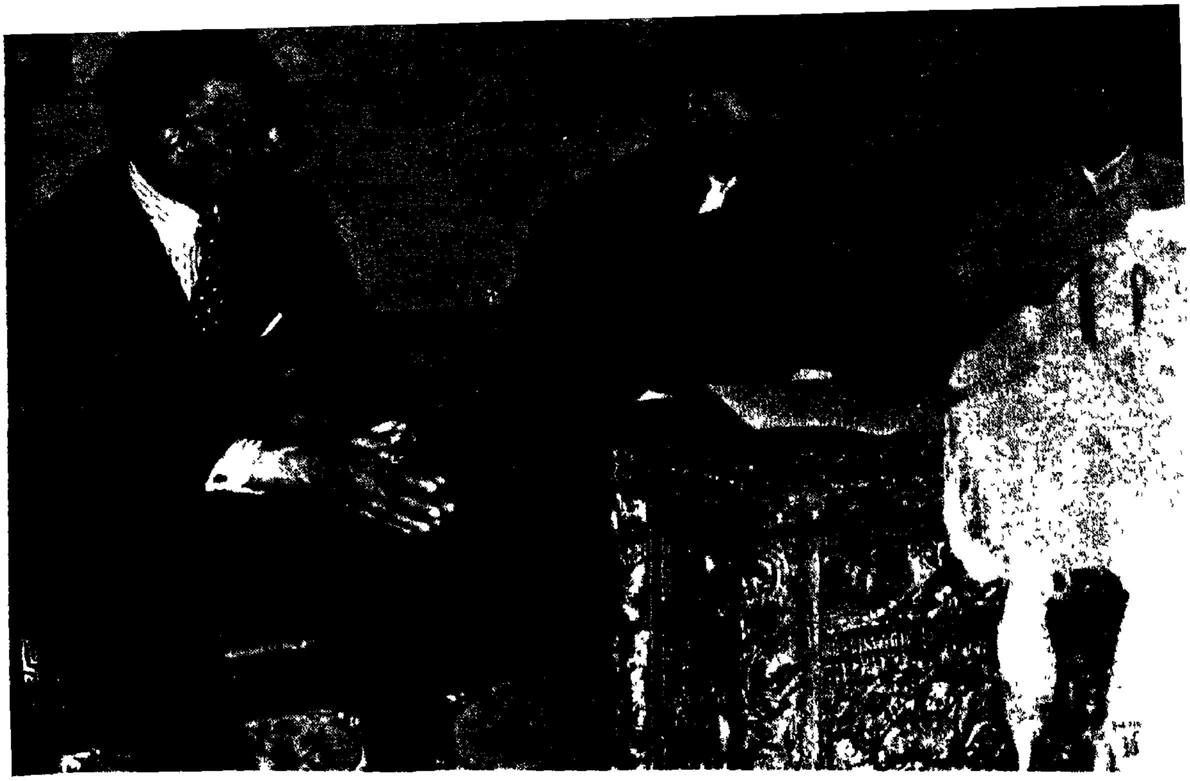


وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی اپنے ایران کے دورہ میں ۲۹ اپریل ۱۹۷۴ء کو شہنشاہ ایران سے ملاقات کرنے کے لیے نیاوران محل تہران تشریف لے گئیں اوپر تصویر میں وزیراعظم شہنشاہ ایران سے محو گفتگو ہیں

وزیر اعظم کا دورۂ ایران

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی ایران کا چار روزہ دورہ ختم کرکے ۲ مئی کو ہندستان واپس تشریف لے آئیں نائب صدر جمہوریہ شری جی ایس پاٹھک دہلی کے ہوائی اڈے پر وزیراعظم کا استقبال کر رہے ہیں۔





(اوپر) سکم کے چوگیال نے گذشتہ ۴ جولائی کو
گنگ ٹوک میں سکم گورمنٹ ایکٹ ۱۹۷۴ء کو منظوری
دے دی۔ تصویر میں (درمیان میں) مسٹر چوگیال
اور ان کے بائیں جانب حکومت ہند کے سکریٹری
خارجہ شری کیول سنگھ بیٹھے ہوئے ہیں



انسپکٹر جنرل پولیس یو پی شری ایچ کے کر، ۱۰ مئی کو میسرو
پہاڑیوں سے لائے ہوئے ایک بھالو کے بچے کو سادسی ملاع
لکھنؤ کے عجائب گھر میں محکمہ جنگلات کے سکریٹری شری کے
سی جوشی کو پیش کر رہے ہیں ←

محمد اسحاق صدیقی

دنیا کی بربادی اور انسان



خدا نے جب انسان کو پیدا کرنا چاہا اور یہ اعلان کیا کہ میں آدم کو زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے اعتراض کیا کہ جب ہم دن رات تیری عبادت کرتے ہیں تو پھر انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ انسان تو زمین پر جا کر فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا۔ خدا نے جواب دیا کہ جو میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے فرشتے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور خدا نے انسان کو پیدا کر دیا اور اس نے دن رات اپنی نسل بڑھانے کی کوشش کی۔ یہاں تک وہ تمام روئے زمین پر چھا گیا۔

انسان کو زمین پر پیدا کرنے کا اصل مقصد کیا تھا یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے فلسفیوں میں اس پر اختلاف ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے بہر حال مجھے تو شاعر کی یہ بات پسند آتی ہے ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرو بیاں

رہا فرشتوں کا اندیشہ، سو وہ بے بنیاد نہ تھا۔ خدا کے ارضی خلیفہ یعنی حضرتِ انسان نے زمین پر آ کر وہ فساد برپا کیا کہ خود زمین کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ انسان نے اب تک کتنی جنگیں لڑیں اور ان جنگوں میں کتنا جانی اور مالی نقصان ہوا۔ زر، زن اور زمین کے لیے اب تک کتنے قتل ہوئے اس کی چھان بین کا مجھے موقع نہیں ملا لیکن اگر حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان نے انسان کا اتنا خون بہایا ہے کہ بحرِ قلزم کا پانی اس کے سامنے ہیچ ہے۔ انسان نے زمین کو کس کس طرح سے نقصان پہنچایا ہے، اس کا مختصر جائزہ میں نے اس مضمون میں لیا ہے۔

جنگلی جانوروں کا صفایا

انسان اس زمین پر تقریباً دس لاکھ سال پہلے ظاہر ہوا۔ اس سے پہلے جانور مزے میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان پر قدرت کے قانون کے سوا کسی اور کی حکمرانی نہ تھی لیکن جب انسان معرض وجود میں آیا تو وہ رفتہ رفتہ ان کی قسمت کا مالک بن گیا۔ اس نے خود قدرت کے قوانین میں دخل دینا شروع کر دیا۔ اپنی زندگی آرام سے بسر کرنے کے لیے کارخانۂ قدرت میں تبدیلیاں شروع کر دیں اور جیسے جیسے اِن تبدیلیوں کا سلسلہ وسیع ہوتا گیا، اس کی نسل تیزی سے بڑھنے لگی لیکن دوسرے جانداروں کی زندگی میں خلل پڑ گیا۔ ان کی تعداد تیزی سے گھٹنے لگی۔ انسان نے جانوروں کو ہلاک کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھیار ایجاد کیے اور بہادری کے زعم میں جانوروں کا بیدردی سے قتل عام کیا۔ اس نے جنگل کاٹنا شروع کر دیے تاکہ اپنے پالتو جانوروں کو چرا سکے، کھیتی کر سکے اور اپنے رہنے کے لیے مکان بنا سکے۔ جنگلوں کو صاف کرنے کا سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہا جب جنگلی جانوروں کے رہنے کے لیے جگہ نہ ہو تو وہ کہاں جائیں اور اپنی نسل کیسے برقرار رکھیں؟

گذشتہ دو ہزار سال میں جنگلی جانوروں کی تقریباً سو قسمیں ناپید ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ۱۸۵۰ء تک ۳۵ قسمیں غائب ہو چکی تھیں گویا ۵۳ سال میں ایک قسم۔ اس کے بعد کے ۵۰ برسوں میں مزید ۳۱ قسمیں غائب ہو گئیں اور موجودہ صدی کے پہلے نصف میں مزید ۴۰ قسمیں ختم ہو چکی ہیں اور اب ہم اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ ہر سال جانور کی ایک قسم غائب ہو جاتی ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ دنیا میں (دودھ پلانے والے) جنگلی جانوروں کی ۲۴۹

قسمیں فنا ہونے والی ہیں۔ ان میں سے ۱۳۲ کے ناپید ہو جانے میں کوئی شبہ نہیں۔ ۶۰ قسموں کا امکان ہے۔ اور ۵۷ قسمیں کمیاب ہیں۔

جانوروں کی جن قسموں کے ناپید ہو جانے میں کوئی شبہ نہیں ان میں قسمیں ملک کے جانداران سے تعلق رکھتی ہیں۔ چیتا تو پہلے ہی ہندوستان سے غائب ہو چکا ہے اور یقین ہے کہ دس سال کے اندر ملک کے باقی حصوں سے بھی غائب ہو جائے گا۔ [illegible] گر کا ٹھیاواڑ کے ۱۲۴۸ مربع کیلومیٹر کے علاقے میں تقریباً ۲۰۰ کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اس سے ۵۰ سال پہلے اس زمین پر ایک لاکھ شیر تھے اور اب ان کی تعداد گھٹ کر [illegible] رہ گئی ہے۔ ہندوستان [illegible] بنگلہ دیش میں پچاس سال پہلے تک [illegible] رہتے تھے اور اب ہندوستان میں ان کی تعداد ۲ [illegible] سے زیادہ نہیں۔ [illegible] خوبصورت اور شاندار جانور اور اس کا یہ انجام، سوچیے کتنا رنجدہ ہو گا۔

[illegible] صرف ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔ اس کی تعداد [illegible] سے گھٹ رہی ہے۔ اس کا اندازہ یوں کیجیے کہ ۱۹۰۴ء [illegible] ہندوستان کی [illegible] میں [illegible] دیکھے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں ان کی تعداد ۶۶ رہ گئی۔

گزشتہ [illegible] سال [illegible] کے مطابق [illegible] رہ گئے ہیں اور اتنی [illegible] کے اور [illegible] تھے۔ صحیح علم نہیں ہے [illegible] کے شکار کا سبب ان کا [illegible] ہے۔ [illegible] ہو سکی ہے کہ [illegible] کے سینگ میں وہ جنسی خصوصیات ہیں [illegible] جس کے لیے وہ [illegible] بے تحاشہ [illegible] کا بے دریغ شکار کیا جاتا ہے۔

ہاتھی نہ صرف ہندوستان بلکہ افریقہ سے بھی غائب ہو رہے ہیں۔ ہاتھی کے شکار کا سبب اس کا دانت ہے جس سے سامان آرائش چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ بعض جانور اس لیے مارے جاتے ہیں تاکہ انسان ان سے ایسا لباس تیار کر سکے۔ تیندوا اور اجگر اپنی کھال کے لیے مارے جاتے ہیں تاکہ اس سے بیگ اور جوتے بنائے جا سکیں۔ خوش نما اور خوش رنگ پروں والی چڑیاں (جیسے مور، مرغ زریں، سارس اور شتر مرغ) اپنے پروں کے لیے ماری جاتی ہیں تاکہ ان کے پروں سے مرد اور عورتیں اپنے جسم کو سجا سکیں۔ ہندوستانی پرندوں میں گلابی سر والی بطخ اور سارس کی کئی قسمیں نایاب ہیں اور سون چڑیا (INDIAN BUSTARD) کی نسل غائب ہو رہی ہے۔

مشہور ماہر حیوانیات کارسیٹ نے ۱۹۵۳ء میں تخمینہ کیا تھا کہ ہندوستان میں تقریباً ایک کروڑ بندر پائے جاتے ہیں لیکن ۱۹۶۰ء میں جب بندروں کا شمار کیا گیا تو صرف دس لاکھ نکلے۔ ہو سکتا ہے کہ کارسیٹ کا اندازہ غلط ہو لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ بندروں کی نسل تیزی سے کم ہوتی جاتی ہے جس کا نتیجہ [illegible] کی کمی ہے۔ علاوہ ازیں ہر سال ہزاروں بندر پکڑ کر دوسرے ملکوں کو بھیجے جاتے ہیں اور زر مبادلہ کمایا جاتا ہے۔ ۷۰-۱۹۶۹ء اور ۷۲-۱۹۷۱ء میں ۱۲،۱۰۵ [illegible] بندر [illegible] کیے گئے اور ۷۰ لاکھ روپیہ کمایا گیا لیکن [illegible] ۲،۰۰۰ بندر فروخت کیے جا سکے اور بیس لاکھ روپیہ کمایا گیا۔ کیونکہ جوان بندروں کی تعداد میں کافی کمی ہو گئی تھی۔ آپ خود محسوس کرتے ہوں گے کہ اب سے چند سال پہلے جتنے بندر نظر آتے تھے اب اتنے نظر نہیں آتے۔ دوسرے ممالک یہ بندر مختلف انسانی امراض کے علاج کے لیے ان پر تجربے کرنے کے لیے خریدتے ہیں۔ ہر نئی دوا انسان سے پہلے [illegible] پر آزمائی جاتی ہے کیونکہ [illegible] سے ہمارا خونی رشتہ ہے۔ گویا ہمارے [illegible] کا [illegible] اس کے بغیر [illegible] حاصل نہ ہو گا۔ بندر [illegible] [illegible] تجربے کرنے [illegible] انسان کی جان بچائی جا سکتی ہے [illegible] سوال یہ ہے کہ [illegible] بندروں کی نسل ہی ختم ہو جائے تو [illegible] کیے جائیں گے؟

[illegible] لوگوں [illegible] جیوانی [illegible] کی [illegible] جنگلی جانوروں کی حفاظت کے لیے [illegible] ادارہ [illegible] جانوروں کے [illegible] جگہ جگہ محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ جنگلی جانوروں کی حفاظت کے لیے دو سبب ہیں (۱) کارخانۂ قدرت میں ہر جانور کے ذمہ کچھ ضروری کام ہیں جن میں خلل ڈالنا مناسب نہیں۔ مثال کے طور پر گدھ، اُلّو اور سانپ کو لیجیے جنھیں ہم نہایت نفرت اور خوف کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ گدھ کو قدرت نے سڑی گلی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے پیدا کیا اور اُلّو اور سانپ کو چوہے کھانے کے لیے جو اناج کے دشمن ہیں۔ یہی حال گرگٹ کا ہے۔ جسے دیکھتے ہی نادان بچے ڈھیلوں کا نشانہ بناتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم ثواب کما رہے ہیں حالانکہ گرگٹ کو بھی قدرت نے کیڑے مکوڑوں کی تعداد گھٹانے کے لیے پیدا کیا ہے اور (۲) جانوروں

کا [illegible] ان کے قدرتی ماحول میں بہت سے لوگوں کے ذوقِ جمال کی تسکین کا سبب ہے۔ حیوانی زندگی کے متعلق کتابیں، مضامین، تصویریں اور فلم ساری دنیا میں مقبول ہیں۔ مردہ اور زندہ عجائب گھروں میں لوگوں کا ہجوم انسان کی جانوروں میں دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے۔ جب انسان یہ دیکھتا ہے کہ حیوانات کے جذبات ادراک کی، زندگی کے بنیادی مسائل انسانی زندگی سے کتنے مشابہ ہیں تو حیرت ہوتی ہے اور خود حیوان ہونے کا احساس ہوتا ہے کیا آپ یہ نہیں چاہتے کہ آنے والی نسلیں جانوروں کی جنگلی زندگی سے اسی طرح لطف اندوز ہوں جس طرح ہم ہوتے ہیں۔ اگر ہم نے قفس [illegible] تو شاید ان جانوروں [illegible] آنے والی نسلوں [illegible] کی [illegible] تصویریں [illegible] دیکھیں۔

[illegible] یہاں [illegible] زندگی [illegible] آجائے گی۔

یہاں [illegible] احساس دلانا [illegible] کہ بظاہر [illegible] معلوم ہوتی ہے لیکن جاندار اس [illegible] LEIOSPHERE [illegible] سطح سمندر [illegible] اور انسان یہ سمجھ رہا ہے [illegible]

[illegible] کھول رہا ہے

مضرتِ رساں ایجادیں

[illegible] انسان نے ابھی بعض ایجادوں اور دریافتوں کو عام کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے اور ان کے رواج کے دور رس نتائج پر غور نہیں کیا [illegible] ڈی ڈی ٹی (DDT) [illegible] خصوصیات کا [illegible] کی سلامتی کا [illegible] دریافت کرنے والے کو [illegible] ملکوں میں ڈی ڈی ٹی [illegible] دیا گیا [illegible]

انسان نے ابھی اس غلطی سے سبق نہیں لیا

[illegible] والی دواؤں کا اثر انسان کے علاوہ دوسرے جانداروں پر بھی پڑتا ہے۔ ہوا کے ذریعہ تازہ چھڑکی ہوئی دوا جانداروں کے جسم میں سانس کے ذریعہ داخل ہو کر انہیں بیماری میں مبتلا کر دیتی ہے اور جب چڑیاں زہر سے مرے ہوئے کیڑے کھاتی ہیں تو وہ بھی بیمار ہو کر مر جاتی ہیں۔

دنیا [illegible] دریاؤں کے کنارے صدا ہوتی تھیں لیکن اب یہی دریا [illegible] کا ذریعہ [illegible] جانوروں کی نالیوں کے ذریعہ [illegible] تالابوں میں بہائی جاتی ہے جس [illegible] جاندار مر جاتے [illegible] تبدیلی کے سبب [illegible] جاندار [illegible] ہوتے لگتی ہیں [illegible] پانی کو [illegible] سے صاف کیے بغیر پیا [illegible] ترقی [illegible] پانی [illegible] کی حالت [illegible] پانی بھی خطرناک [illegible] کے ساتھ ساتھ پینے کے پانی کی [illegible] انسان [illegible] یا اس [illegible] خواہ اس کا انجام کچھ [illegible] ہو۔

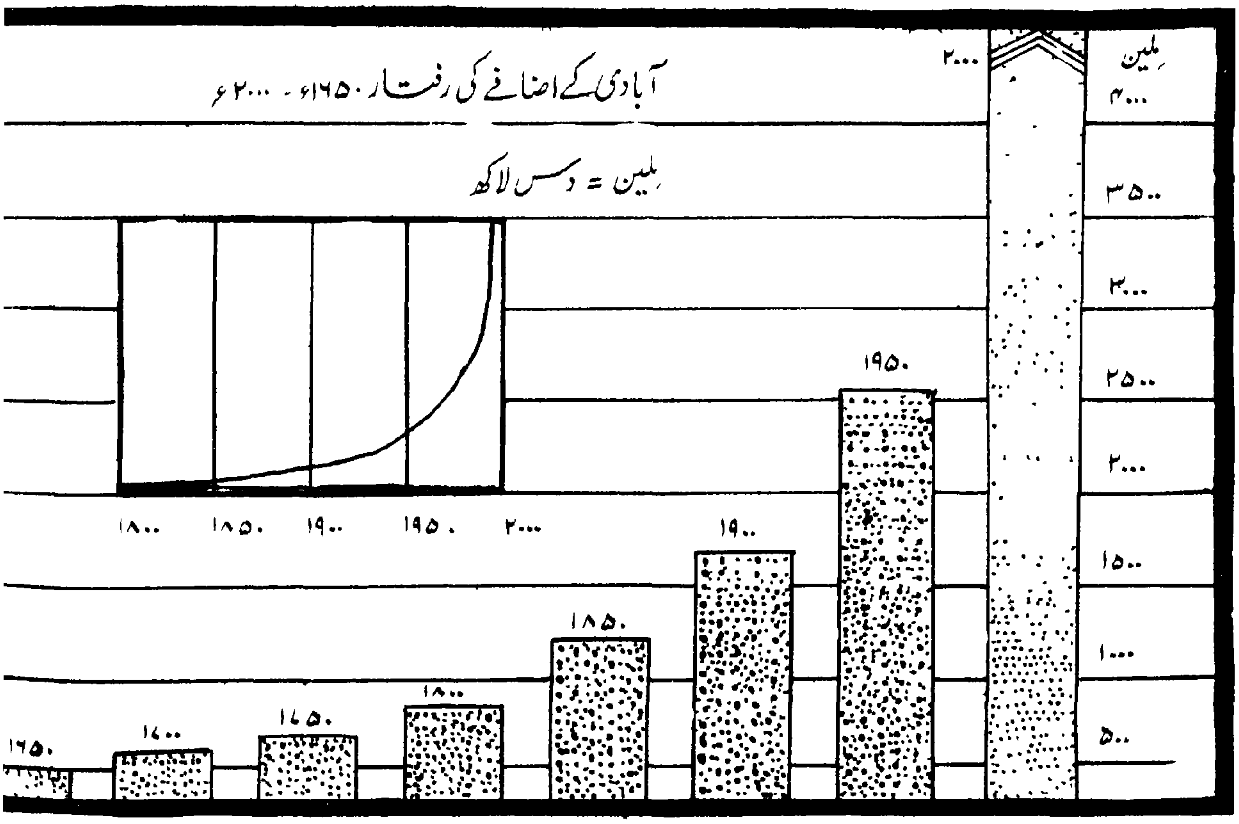
[illegible] کی کہانی انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوتی ہے یعنی صنعتی انقلاب سے، جس سے ایک طرف تو انسانی آبادی اس تیزی سے بڑھنے لگی کہ اسے آبادی کا دھماکہ کہا گیا اور دوسری طرف زمین کی فضا کارخانوں کے دھوئیں سے آلودہ ہونے لگی۔ تب سے زمین کی [illegible] اس سے پہلے دس لاکھ سال کے عرصے میں [illegible] انسان کے ظہور [illegible] صنعتی انقلاب کے آغاز تک [illegible] ہوئی تھی۔

اب یہ عالم ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں کے دیکھا دیکھی غیر ترقی یافتہ ملک [illegible] چلے جاتے ہیں [illegible] کارخانے کھل

رہے ہیں، اس رفتار سے زمین کی فضا میں زہریلی گیسوں (کاربن ڈائی آکسائڈ کاربن مونو آکسائڈ، سلفر آکسائڈ، نائٹروجن آکسائڈ، ہائیڈرو کاربن وغیرہ) کی آمیزش ہو رہی ہے کارخانوں کی چمنیوں سے نکلنے والے دھوئیں سے زیادہ خطرناک موٹروں کا دھواں ہے اور بعض ملکوں میں موٹروں کے اضافے کی شرح انسانی پیدائش کی شرح سے بھی زیادہ ہے۔ دھوئیں کی زہریلی گیسوں میں مختلف دھاتوں کے ذرّے ملے ہوتے ہیں۔ اس دھوئیں سے انسان سانس کی بیماریوں (کھانسی، دمہ وغیرہ) اور کینسر جیسے موذی امراض میں مبتلا ہوجاتے ہیں یہی نہیں شہروں کی آرائش کے لیے جو پیڑ پودے لگائے جاتے ہیں وہ بھی مرجھا جاتے ہیں۔ ٹوکیو ایسے بڑے شہروں کی اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ ٹریفک کی نگرانی کرنے والے سپاہیوں کو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد خالص ہوا (آکسیجن) کے اڈوں پر جاکر مشین کے ذریعہ سانس لینا پڑتی ہے اگر ایسا نہ کریں تو دھوئیں کے اثر سے بے ہوش ہو جائیں۔ علاوہ ازیں پرہجوم شاہراہوں کے نزدیک واقع اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کو گیس ماسک لگانا پڑتے ہیں۔

ستم بالائے ستم یہ کہ ترقی یافتہ ملک (امریکا، روس، چین، فرانس) زیادہ سے زیادہ ہلاکت آفریں ایٹم بم بنانے کے لیے تجربے کرتے رہتے ہیں جس کے لیے وہ اکثر فضا میں ایٹمی دھماکے کرتے ہیں۔ ان ایٹمی دھماکوں کی تابکار راکھ ہوا سے اڑکر دور دور تک پہنچتی ہے اور کھانے پینے کی چیزوں کے ذریعہ انسانوں اور دوسرے جانداروں کے جسم میں داخل ہوکر انھیں کینسر میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جب تابکار عناصر جسم میں پہنچ جاتے ہیں تو ایسے بچے پیدا ہوتے ہیں جن کی جسمانی بناوٹ میں نقص ہوتا ہے۔ جب تک ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری پر دنیا کے جنگ جو ملک پابندی عائد نہیں کرتے ہماری آنے والی نسلوں کا مستقبل تاریک ہے۔ ہم انھیں 'ناقص جسم'، ناقابل علاج امراض اور زہریلے ماحول کے سوا اور کوئی "تحفہ" نہیں پیش کر سکتے ؟

ہوسکتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے جب زمین کی فضا اتنی زہریلی



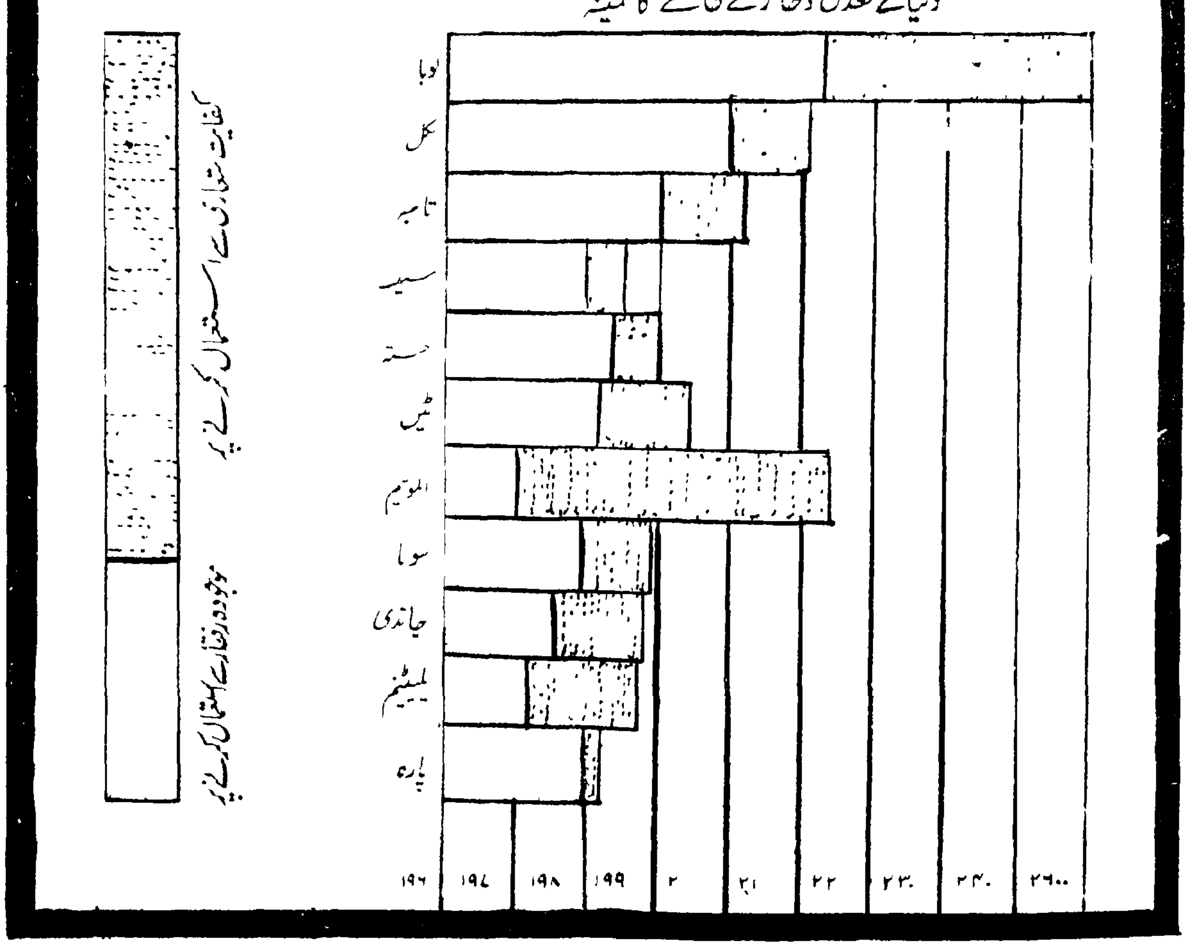
ہو جائے کہ اس میں کوئی بھی جان دار زندہ نہ رہ سکے۔ اس کا ذمہ دار سوائے انسان کے اور کون ہوگا۔ وہی انسان جو اپنے کو اشرف المخلوقات کہتا ہے اور جس کو خدا نے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔

ہریالی غائب، ہوا غائب

بڑھتی ہوئی آبادی کو بسانے اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جس تیزی سے جنگل کاٹے جاتے ہیں اس تیزی سے اُگ نہیں پاتے۔ ساری دنیا میں جنگل سمٹتے جاتے ہیں۔ جنگلوں کی کمی کی وجہ سے زمین کی آب و ہوا تبدیل ہو رہی ہے اور زمین بنجر بنتی جا رہی ہے۔

پیڑ پودے آکسیجن گیس بناتے ہیں، جس کے بغیر کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ پیڑ پودوں کی کمی کی وجہ سے ہوا میں اس تیزی سے آکسیجن کا اضافہ نہیں ہو رہا ہے جس تیزی سے کارخانوں کی چمنیاں اور موٹریں اس میں کاربن ڈائی آکسائڈ اور دوسری زہریلی گیسیں گھول رہی ہیں۔ پیڑ پودوں کی جڑیں مٹی کو باندھے رکھتی ہیں اور جب پیڑ پودے سڑ گل کر مٹی میں مل جاتے ہیں تو زمین زرخیز ہو جاتی ہے لیکن جب پیڑ پودوں کو کاٹ دیا جاتا ہے تو چکنی مٹی کو ہوا اُڑا لے جاتی ہے اور پانی بہا لے جاتا ہے۔ اس طرح زمین رفتہ رفتہ بنجر ہو جاتی ہے زمین

دنیا کے معدنی ذخائر کے خاتمے کا تخمینہ



کو بنجر بنانے میں مویشی خصوصاً بکریاں بھی بڑا حصہ لیتی ہیں وہ چھوٹے پیڑ پودوں کی جڑیں تک کھود کر کھا جاتی ہیں۔ اگر ہمیں زمین کو ریگستان نہیں بنانا ہے اور ہوا کو سانس لینے کے قابل رکھنا ہے تو ہمیں اپنے جنگلوں اور چراگاہوں کی حفاظت کرنا ہوگی۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم لکڑی اور کاغذ کے استعمال میں حد درجہ کفایت شعاری سے کام لیں۔

زمین کی خالی گود

انسان نے زمین سے دھاتوں کو نکالتے وقت کبھی یہ نہیں سوچا کہ یہ خزانے ایک دن ختم ہو جائیں گے۔ قدرت نے جو چیزیں زمین کے اندر کروڑوں سال میں بنا کر جمع کی تھیں، انھیں انسان نے صدیوں میں ختم کر دیا۔ یہ چیزیں نہ تو دوبارہ زمین میں رکھی جا سکتی ہیں اور نہ دوبارہ بن سکتی ہیں۔ اس لیے ایک دن ان کا خاتمہ یقینی ہے۔ بڑھتی بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے جس تیزی سے دھاتوں کا استعمال ہو رہا ہے اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ بعض دھاتیں ۲۰۰۰ عیسوی تک بالکل ختم ہو جائیں گی تانبہ، ٹین اور سیسہ تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ پٹرول اور کوئلہ زیادہ سے زیادہ پچاس سال چلیں گے۔

انسان کے موجودہ تمدن میں تین چیزوں کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، لوہا، پٹرول اور کوئلہ۔ لوہے سے عمارتوں کے ڈھانچے، مختلف سواریاں، مشینیں اور گھریلو استعمال کی سیکڑوں چھوٹی بڑی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ جب لوہا ختم ہو جائے گا تب کیا ہوگا؟ کیا ریلیں ہوائی جہاز اور موٹریں عجائب گھروں کی زینت بن جائیں گے یا نئی سواریاں ان کی جگہ لے لیں گی، لیکن وہ کس چیز سے بنائی جائیں گی اور کس سے چلیں گی؟ پٹرول کی موجودہ قلت نے یورپ اور امریکا والوں کو جس طرح پریشان کر دیا ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ ہندستان میں بھی پٹرول اور کوئلے کی کمی محسوس کی جا رہی ہے۔

لوہے اور پٹرول کی سب سے زیادہ بربادی جنگ میں ہی ہوتی ہے۔ انسان لوہے سے ہوائی جہاز، پانی کے جہاز، آبدوز کشتیاں ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، توپیں، بندوق، راکٹ بم اور گولے تیار کرتا ہے۔ جب وہ جنگ میں ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں تو ان کا ملبہ زنگ آلود ہو کر بے کار ہو جاتا ہے۔ یہی حال پٹرول کا ہے، جس کے بغیر جنگ لڑی ہی نہیں جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ میں پٹرول کے ذخیرے خاص طور پر بمباری کا نشانہ بنتے ہیں۔ لیکن کیا انسان بغیر لڑے زندہ نہیں رہ سکتا؟ دنیا کے کتنے ہی ملک ہیں جو ہر وقت جنگ کی تیاریاں کرتے رہتے ہیں اور قومی آمدنی کا ایک بڑا حصہ دفاع میں صرف کرتے ہیں۔ کارخانے دن رات اسلحہ بناتے ہیں۔ بچے جن کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں ہتھیار چلانے کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ عورتیں جنھیں قدرت نے زمین کو جنت کا نمونہ بنانے کے لیے پیدا کیا تھا، مردوں کے دوش بدوش دنیا کو جہنم بنانے کی تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ ساری دنیا ہر سال دفاع کے لیے جو روپیہ صرف کرتی ہے، اس سے دنیا کی صورت بدل سکتی ہے۔ نہ جانے وہ زمانہ کب آئے گا جب جنگ ایک داستان پارینہ بن کر رہ جائے گی۔ میرے خیال میں جب تک دنیا میں جنگ کا وجود باقی ہے۔ نہ تو انسان کو مہذب کہا جا سکتا ہے اور نہ اشرف المخلوقات۔ درندوں کو فنا کرنے کے بعد وہ خود درندہ بن گیا ہے جانوروں کو مارنے کے بعد وہ خود اپنی نسل مٹانے کے درپے ہے۔ کیا خدا نے انسان کو اسی لیے پیدا کیا تھا کہ وہ زمین کے ایسے حسین سیارے کے حسن کو خاک میں ملا کر خود کشی کر لے؟

مصیبتوں کا علاج

صنعتی انقلاب نے انسان کی زندگی کو آسان تو ضرور بنا دیا ہے لیکن اس آسانی کے بدلے میں اس کا سکون چھین لیا ہے۔ ہر آدمی آرام کی زندگی بسر کرنے کی تمنا میں دن رات محنت کرتا ہے اور جتنی وہ محنت کرتا ہے اتنا ہی آرام اس سے دور ہو جاتا ہے۔ انسان کی ہوس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہر انسان زیادہ سے زیادہ آرام دہ چیزوں کا طلب گار ہے لیکن کیا یہ چیزیں اسے سچا سکھ دے سکتی ہیں؟ روزگار کی تلاش میں لوگ بھاگ بھاگ کر بڑے شہروں میں جاتے ہیں اور جب انھیں وہاں رہنے کے لیے مکان نہیں ملتا

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

پرویز ید اللہ مہدی

(مزاحیہ)

مکاں سے لامکاں تک

جس گھونسلے نما مکان میں کسی بے بال و پر پنچھی کی طرح ہم پچھلے پانچ برس سے رہتے چلے آئے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جس گھونسلے میں پورے پانچ برس تک دھوپ میں سوکھتے، برسات میں بھیگتے اور سردی میں ٹھٹھرتے رہے اسے مکان دار صاحب نے ہمیں قطعی اندھیرے میں رکھ کر اچانک ہی ہراج (نیلام) کرنے کا فیصلہ فرما دیا۔ ویسے ہم جس دن سے اس گھر میں منتقل ہوئے تھے اس روز سے لیکر بے گھر ہونے تک ہر بات کے تعلق سے اندھیرے میں ہی رہے۔ اس مکان کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی کہ لاکھ چراغ قندیل جلانے پر بھی ہمیں کبھی اجالے کا احساس نہیں ہوا۔ رات تو خیر رات ہے کبھی کبھی دن میں بھی ہمیں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ ایسا بھی ہوا ہے کہ اکثر ہم ڈرائنگ روم کے دھوکے میں باتھ روم اور کچن کے دھوکے میں بیت الخلاء میں جا پہنچے۔ غالباً جس انجینیر نے اس گھر کا نقشہ بنایا ہے وہ آنکھ کا نہیں تو عقل کا اندھا ضرور ہوگا۔ اس گھر کو ہم دنیا کا آٹھواں عجوبہ سمجھتے تھے۔ ویسے تو اس مکان میں منتقل ہونے کے دوسرے ہی دن سے ہم نے کسی دوسرے مکان کی تلاش شروع کر دی تھی لیکن مکانوں کی قلت کے اس دور میں موزوں و مناسب مکان ڈھونڈھ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں بلکہ اگر عاشق نامراد فرہاد کو ہماری کو جوئے شیر لانے کے بجائے کسی موزوں و مناسب کرائے کا مکان ڈھونڈھنے کے لیے کہا جائے تو وہ اکبر الہ آبادی کا یہ شعر ذرا سے تصرف کے ساتھ یوں ترنم سے پڑھتے۔ ؎

یہی ٹھہری جو شرط وصل شیریں
تو استعفاء مرا با حسرت و یاس

چنانچہ ہمیں بھی چار و ناچار صبر کرنا پڑا۔ ویسے بھی مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے اور صبر کا پھل غالباً قبر میں ملتا ہے اور ہمارا گھر قبر سے کب کم تھا۔ چنانچہ صبر کرتے رہے اور اس صبر کا پھل کچھ یوں ملا کہ آہستہ آہستہ اس گھر سے مانوس ہوتے چلے گئے۔ پھر تو یہ حال ہو گیا کہ اس مادرالوجود مکان کے آگے ہمیں کنگ کوٹھی بھی ہیچ معلوم ہونے لگی، جیسے چار مینار کے آگے چار کمان۔ چنانچہ ہم نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ اس مکان کو مرتے دم تک نہیں چھوڑیں گے بلکہ یہ وصیت کر جائیں گے کہ مرنے کے بعد ہمیں اسی مکان میں دفن کیا جائے۔ لیکن فلک ناہنجار کو ہمارا اس گوشۂ عافیت میں بخیر و عافیت رہنا ایک آنکھ بلکہ دونوں آنکھ نہ بھایا کمبخت مکان کی چھدری چھت کے ذریعہ ہمیں دن رات ہر حال میں دیکھا کرتا تھا — کہتے ہیں فلک ناہنجار جسکے پیچھے پیچھے جھاڑ کر پڑتا ہے پھر اسے صفحۂ ہستی سے جھاڑ کر ہی دم لیتا ہے۔ وہ تو غنیمت ہے کہ اس نے ہمیں صرف گھر سے جھاڑ پھینکنے پر اکتفا کیا۔ ہمیں اس گھر سے بے گھر ہونے کا بہت قلق ہے۔ برسات کے موسم میں ہم بارش کا دہرا لطف اٹھاتے۔ آسمان اگر دو گھنٹے برستا تو ہماری چھت چار گھنٹے ٹپکتی۔ نتیجۃً گھر کا کونا کونا حسین ساگر جھیل میں تبدیل ہو جاتا اور ہم اپنی کھٹیا کو کشتی کی طرح کھیتے ہوئے ایک کونے سے دوسرے کونے میں پہنچ جاتے۔ اس گھر کی بدولت ہم کشتی رانی کے فن میں کافی ماہر ہو چکے ہیں۔ رات میں جب کبھی نیند ہمیں نخرے دکھاتی ہم اسے منا کر اس کا دماغ خراب کرنے کے بجائے پلنگ پر پڑے پڑے چھدری چھت کے اس پار آسمان کے وسیع آنچل میں ٹنکے ان گنت

تارے گن گن کر ساری رات بتا دیا کرتے۔ چنانچہ اس گھر کی
مہربانی سے ہم فلک کے تمام ستارے، ستارے کئی بار گن چکے ہیں،
نہ صرف رات میں بلکہ دن میں بھی۔ جب بھی کوئی گھر کا کوئی بیرونی
دروازہ کھٹکھٹاتا ساری دیواریں یوں ہلنے لگتیں جیسے خود آگے بڑھ کر
آنے والے کا استقبال بلکہ اس سے مصافحہ و معانقہ کرنا چاہتی ہوں۔
پڑوس میں کسی کے ہاں بھی کپڑے چھانٹے جا رہے ہوں ہماری چھت
سُر اور تال کے ساتھ بھانگڑہ ناچنے لگتی۔ اب آپ ہی کہئے کہ ایسے
مادرا لوجود بلکہ اُم العجائب گھر سے جدا ہونے کا دکھ کیوں کر نہ ہوگا۔ اگر
مکان دار صاحب پہلے ہی اپنے اس خطرناک ارادے سے آگاہ کر دیتے
تو ہمیں اتنا دکھ نہ ہوتا۔ ہم اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس سانحہ کیلئے
تیار کر لیتے لیکن انھوں نے تو ہمیں جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا اور
اچانک ہی بے دخلی کا ہنگامہ کھڑا کر دیا جس نے ہمیں کھڑے کھڑے
بٹھا دیا بلکہ اچھا خاصہ لٹا دیا۔

ہم اس ہنگامے سے صرف دو دن پہلے ان کے اس خطرناک
ارادے سے واقف ہوئے۔ وہ بھی بذریعۂ اشتہار۔ ایک تو کاغذی اشتہار
تھا جس پر مکان کا نقشہ و دیگر تفصیلات درج تھیں اور دوسرا اشتہار
وہ تحریر تھی جو ہمارے مکان کی دیوار پر جلی حروف میں آویزاں ہمارا
منہ چڑھا رہی تھی۔ ہمیں ویسے غصہ بہت کم آتا ہے مگر دیوار پر آویزاں
اس تحریر کو دیکھ کر ہم منتھے سے اکھڑ گئے لیکن ہمارے دوست احباب
نے یہ کہہ کر ہمیں واپس منتھے پر بٹھا دیا کہ ہم صرف کرایہ دار ہیں مالک
مکان نہیں، مکان، مالک کا ہے وہ چاہے نیلام (ہراج) کرے یا
ڈھادے۔؟

بس نیلام (ہراج) شروع ہو گیا۔ مکان سے ملحقہ چبوترے
پر نیلامی (ہراج) کمپنی کے کارکن اسپیکر وغیرہ لے کر جم گئے۔ دیکھتے ہی
دیکھتے محلے کے تقریباً تمام شریف، بدمعاش بچے بوڑھے سبھی اکٹھے
ہو گئے۔ ہر شخص مکان کو کم اور ہمیں زیادہ گھور رہا تھا، گویا نیلام
مکان کا نہیں بلکہ ہمارا ہونے جا رہا تھا۔ لوگوں کی نظروں سے یہ خطرناک
ارادہ بھانپ کر ہم مکان کے اندر روپوش ہو گئے۔ باہر کمپنی کا ایجنٹ
مکان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ کچھ یوں تعریفوں
کے پل باندھ رہا تھا۔ اس مکان کے آگے تاج محل بھی کچھ حقیقت
نہیں رکھتا۔ مکان کے محل وقوع کی کچھ یوں تشریح کر رہا تھا جیسے اس کے
شمال میں کشمیر، جنوب میں اوٹی، مغرب میں سوئٹزرلینڈ اور مشرق
میں مری کا برفانی علاقہ ہے۔ جبکہ حقیقتاً اس مکان کی پچھلی طرف گٹر،
داہنی طرف بلدیہ کا گٹر اور دوسری طرف دونوں سمتوں میں دو کچے
آسیب زدہ مکان تھے۔ ایجنٹ بار بار یہ جملہ دہرا رہا تھا۔ شریف پڑوسی
خوش نصیبوں کو ہی ملتا ہے اور ہم پڑوسیوں اور ان کے بچوں کی
شرافت کے متعلق سوچ کر ہی بید کی مانند کانپنے لگے۔ پتنگوں کے
زمانے میں یوں لگتا تھا جیسے چھت پر گھوڑ دوڑ ہو رہی ہو اور وہ کویلو
جو برسات و دیگر موسمی حادثات کی زد میں آنے سے کسی نہ کسی طرح بچ
جاتے تھے اس گھوڑ دوڑ کی نذر ہو جاتے تھے۔ پڑوس میں جب بھی کسی
کے ہاں کچھ اچھا برا پکتا، اگلے دن ہمارے آنگن میں پڑی ہوئی
ہڈیوں وغیرہ سے پتہ چل جاتا۔ ادھر مکان کی قصیدہ گوئی میں برکت
لگ گیا اور کچھ توقف کے بعد ایجنٹ صاحب اندر تشریف لائے
اور بولے۔ ایک ذرا آپ کو تکلیف ہوگی، مستورات کو کسی ایک کمرے
میں ہٹا دیجئے۔

"کس کی مستورات کو" ہم نے حیرت سے کہا۔

"اپنی مستورات کو، یعنی اپنے اہل و عیال کو"۔ ایجنٹ ایک
ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"قبلہ! جہاں تک بال بچوں کا تعلق ہے بال تو سر پر سلامت
ہیں، اب رہے بچے تو وہ ابھی عالم امکان سے عالم وجود میں نہیں
آئے۔ بلکہ گمان غالب ہے کہ بچوں کی ماں بھی شاید ابھی تک عالم وجود
میں نہیں آئی ہیں۔"

"گویا آپ ابھی تک کنوارے ہیں۔ تعجب ہے۔"

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے قبلہ۔ اس مکان کے دیکھتے
ہوئے کوئی اندھا بھی اپنی بیٹی کا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں دینا پسند
نہیں کرے گا۔"

"یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے، میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں"۔ ایجنٹ
بولا۔ "خیر ناگوار خاطر نہ ہو تو میں کچھ خواہش مند حضرات کو مکان

کی ایک جھلک دکھلا دوں"۔

ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہم نے سوچا کیا عجب کہ اسی بہانے کسی لڑکی کے باپ کو مکان کے ساتھ ہم بھی پسند آ جائیں کچھ توقف کے بعد ایک جم غفیر اندر گھس آیا اور پھر جھلک کے نام پر مکان کا مکمل و مفصل جائزہ شروع ہو گیا۔ ایک صاحب نے باتھ روم کا بنظر غائر جائزہ لینے کے بعد کہا۔ کسی قدر چھوٹا معلوم ہوتا ہے اور نل کی ٹونٹی کافی اونچائی پر ہے، میں سمجھتا ہوں بیٹھ کر نہانے میں تکلیف ہوتی ہوگی۔"

ہم نے فوراً جواباً عرض کیا "میں تو ہمیشہ کھڑے ہو کر نہاتا ہوں اور جب کھڑے کھڑے تھک جاتا ہوں تو نل کے اونچے پائپ سے لٹک جاتا ہوں۔ اس طرح خاصی ورزش بھی ہو جاتی ہے البتہ آپ جو کہ مجھ سے کافی چھریرے ہیں اس لیے بہ آسانی بیٹھ کر نہا سکتے ہیں۔ لیکن سردیوں میں آپ کو بھی کھڑے ہو کر بلکہ لٹک کر نہانا پڑے گا ورنہ ٹونٹی سے نکل کر آپ تک پہنچتے پہنچتے پانی یقیناً برف بن جائے گا۔" لیکن وہ صاحب ہمارے اس جواب سے غالباً مطمئن نہیں ہوئے اور حمام سے باہر ہونے لگے وہ شاید بہ نفس نفیس خود نہا کر اپنا شک دور کرنا چاہتے تھے انھیں باتھ روم میں چھوڑ کر بقیہ اصحاب کے ساتھ ہم بھی دوسری طرف چلے آئے۔ ایک اور صاحب باورچی خانے کی طرف جھپٹے اور پھر اونٹ کی طرح گردن اندر ڈال کر بھرپور جائزہ لینے کے بعد گدھ کی طرح ہماری طرف پلٹے اور اس سے پہلے کہ کچھ پوچھتے، ہم نے فوراً عرض کیا۔

قبلہ! کہنے کو تو یہ باورچی خانہ ہے لیکن سچ پوچھئے تو یہ ایک ایسا خانہ ہے جس میں باورچی کیا باورچی کا بچہ بھی نہیں سما سکتا۔"

جواب میں وہ مسکرا کر بولے:۔

"میرا باورچی اس قدر مختصر ہے کہ ہر خانہ میں بہ آسانی فٹ ہو جاتا ہے۔ البتہ اس باورچی خانہ میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ دھوئیں کی نکاسی کے لیے کوئی معقول راستہ نہیں ہے"۔

"کیوں نہیں، یہ معقول راستہ دیکھئے"۔ ہم نے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ "دھواں اس دروازے سے نکل کر دالان میں سے ہوتا ہوا اس کمرے میں سے گذر کر بہ آسانی دیوان خانہ میں پہنچ جاتا ہے۔ البتہ وہاں پہنچنے کے بعد اگر موڈ میں ہوا تو روشندان اور کھڑکیوں کے ذریعہ باہر پرواز کر جاتا ہے ورنہ دیوان خانہ کی دھواں دھواں فضا آنکھوں کے آگے کشمیر یا اوٹی کی دھواں دھواں وادی کا نقشہ کھینچ دیتی ہے، بشرطیکہ دھوئیں کی وجہ سے آپ کی آنکھیں نہ جل رہی ہوں۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ باہر سے اندر کی دھواں دھواں فضا کو دیکھ کر کچھ ہمدرد قسم کے پڑوسیوں نے فون کر کے فائر انجن کو بلوا لیا ہے۔"

ایک اور صاحب جو چہرے مہرے سے آرٹسٹ لگ ماڈرن آرٹ کا نمونہ لگ رہے تھے، اندر والے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "غالباً یہ ڈرائینگ روم ہے۔"

"جی ہاں۔" ہم نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "اسی کمرے میں بیٹھ کر میں نے کئی ایسے نادر و نایاب ڈرائینگ کے نمونے تخلیق کئے ہیں جو آج تک خود میری سمجھ میں نہیں آ سکے۔"

ایک اور صاحب جن کی آنکھیں یا تو نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں یا پھر ان کی ساخت ہی ایسی تھی۔ ان ماڈرن آرٹسٹ کو گھور کر بولے۔ "مجھے یہ ڈرائینگ روم نہیں بلکہ بیڈ روم لگتا ہے۔" پھر ہم سے مخاطب ہوئے۔ "کیوں صاحب یہاں نیند بہ آسانی آ جاتی ہے"۔

"آپ کا بھی خیال درست ہے۔ یہ بیڈ روم ہے۔" ہم نے پہلے ان کے خیال کی تائید کی پھر دوسرے سوال کا جواب دیا۔ "سوائے نیند کے یہاں ہر چیز بہ آسانی آ جاتی ہے۔ جیسے مکھی، مچھر، کیڑے مکوڑے، جھینگر، چوہے، مینڈک، بچھو، سانپ وغیرہ۔"

ایک اور صاحب بول اٹھے۔ "میرے خیال میں یہ دیوان خانہ ہے"۔

"بالکل ٹھیک۔" "آپ کا خیال درست ہے"۔ ہم نے فوراً ان کے خیال کی بھی تائید کی۔ "یہ دیوان خانہ بھی ہے۔"

"کیا مطلب؟" سب نے ایک ساتھ کہا۔

ہم نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "وہ یوں کہ جب میں اس کونے میں بیٹھ کر ڈرائینگ کے نمونے تخلیق کرتا ہوں یہ کمرہ میری نظر میں ڈرائینگ روم ہوتا ہے اور جب اس کونے والے پلنگ پر لیٹ جاتا ہوں

تب یہ بیڈ روم بن جاتا ہے اور جب اس کرسی پر بیٹھ کر کسی شاعر کا دیوان پڑھتا ہوں تو یہ کمرہ دیوان خانہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔"

ایک صاحب نے مختصر بالشت بھر آنگن کو دیکھ کر کہا:" اس گھر میں آنگن نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔"

ہم نے اسی برجستگی سے کہا:" قبلہ اس گھر کا آنگن گلی کے اس پار ہے جو بچوں کے جھولوں، بار رنگ اور سمینٹ کی پکی بنچوں سے آراستہ ہے۔"

" آپ کا مطلب بلدیہ کے اس پلے گراؤنڈ، یعنی بازی گاہ سے ہے۔" وہ حیرت سے بولے۔

" جی ہاں، اسی پلے گراؤنڈ کو ہم اپنے گھر کا آنگن سمجھتے ہیں۔"

ایک اور خواہش مند پاخانے کی جانب اشارہ کر کے بولے"۔ غالباً یہ بیت الخلاء ہے۔"

" جی ہاں۔" ہم نے کہا۔" اسی بیت الخلاء کی خلاؤں میں میں نے اپنے کئی شعر راکٹوں کی طرح داغے ہیں۔"

وہ ہماری بات پر اچک کر بولے۔" واللہ! کیا واقعی، پھر تو میرے دکھے پھیکے شعروں میں بھی جان پڑ جائے گی۔ پورا گھر نہ سہی لیکن بیت الخلاء کو ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔"

اور پھر جیب سے نوٹ بک اور کان کے پیچھے سے قلم نکال کر بیت الخلاء میں غائب ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد کا نظارہ مت پوچھئے۔ باتھ روم، بیت الخلاء باورچی خانہ غرض ہر جگہ "ریکو" لگ گیا اور بولی لگنی شروع ہو گئی۔ ہر بولی ہمارے حق میں بندوق کی گولی ثابت ہو رہی تھی۔ اسی چیخ و پکار کے دوران کسی کی کمرشیر کی بھنک ہمارے کانوں میں پڑی۔ ایک صاحب کسی سے کہہ رہے تھے:" مجھے تو یہ مکان آسیب زدہ معلوم ہوتا ہے۔"

دوسرے صاحب بولے"۔ یہ آپ کس بنا پر کہہ رہے ہیں۔"

وہ صاحب ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے:" دراصل موجودہ کرایہ دار کی ہئیت ملاحظہ فرمائیں، لگتا ہے ان پر کسی بھوت یا چڑیل کا سایہ ہے۔"

کسی دوسرے صاحب نے ٹانگ اڑائی"۔ قبلہ! مجھے تو یہ خود بھوت نظر آتے ہیں۔"

ایک اور صاحب نے ایجینٹ سے پوچھا" کیا، مکان مکینوں سمیت نیلام (ہراج) ہو رہا ہے۔"

ہم خطرے کی بو اچھی طرح سونگھ چکے تھے، اس سے پہلے کہ ہمیں اپنے مختصر سے سامان سمیت نیلام پر اٹھا دیا جاتا، اپنا بوریا بستر بغل میں دبا کر وہاں سے ایسے غائب ہوئے جیسے گنجے کے سر سے بال ——!!!

★

ہمارا نیا پتہ

ماہنامہ نیا دور کا پتہ تبدیل ہو گیا ہے۔ قارئین نیا دور براہ کرم نوٹ فرمالیں اور آئندہ خط و کتابت نیز مضامین وغیرہ کی ترسیل مندرجہ ذیل نئے پتہ پر کریں۔

پتہ —— ایڈیٹر نیا دور
پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ - لکھنؤ - ۱

رجسٹری کے ذریعہ مضامین وغیرہ اس پتہ پر ارسال کیے جائیں:

ایڈیٹر نیا دور
انفارمیشن ڈپارٹمنٹ، اترپردیش، لکھنؤ

اتر پردیش بجٹ بابتہ ۷۵-۱۹۷۴ء

شری نرائن دت تیواری وزیر مالیات اتر پردیش نے ۱۱ جون ۱۹۷۴ء کو ریاستی بجٹ ایوان میں پیش کیا۔ بجٹ کی خاص خاص باتیں درج ذیل ہیں

بند و بست کیا جائے اور ٹہری شہر جو اس باندھ کے باعث ڈوب جائے گا اسے دوبارہ ایک شہر کی صورت میں آباد کیا جائے۔ اِن دونوں کاموں کے لیے ایک کروڑ روپیہ کا اس سال کے بجٹ میں بند و بست کیا جا رہا

بجٹ ایک نظر میں

کروڑ روپیہ میں

		۷۴-۱۹۷۳ء نظرثانی شدہ تخمینے	۷۵-۱۹۷۴ء بجٹ تخمینے
ابتدائی میزان		۲۰,۴۴ (--)	۲۸,۴۱ (--)
محاصل			
محاصل سے آمدنی ———		۶۵۳,۰۶	۶۸۲,۷۵
قرضوں سے محاصل خالص ———		۱۵۳,۸۹	۱۱۸,۰۶
قرضوں اور پیشگی رقومات سے وصولیابی ———		۴۵,۷۳	۶۲,۲۸
	کل محاصل	۸۵۲,۶۸	۸۶۳,۰۹
اخراجات			
محاصل کے اخراجات ———		۶۴۸,۵۶	۶۹۲,۲۷
سرمایہ کے اخراجات ———		۱۴۹,۱۵	۱۲۴,۲۹
قرضوں اور پیشگی رقومات کی تقسیم ———		۱۲۴,۴۹	۸۶,۸۱
	کل اخراجات	۹۲۲,۲۰	۹۰۳,۳۷
یکجا فنڈ میں خسارہ ———		۶۹,۵۲ (--)	۴۰,۲۸ (--)
اتفاقیہ مصارف فنڈ خالص ———		۵,۵۲ (+)	۸,۵۰ (--)
پبلک اکاؤنٹ (خالص) ———		۵۶,۰۳ (+)	۳۲,۰۸ (+)
نام لیں دین کے خالص سائے ———		۷,۹۷ (--)	۱۶,۷۰ (--)
	اختتامی میزان	۲۸,۴۱ (--)	۴۵,۱۱ (--)

۱۔ ٹہری کثیر مقصدی اسکیم ریاست کے مستقبل کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے قبل کہ اس اسکیم پر کام شروع کیا جائے حکومت پہلے یہ ضروری سمجھتی ہے کہ ٹہری باندھ کی تعمیر سے متاثر ہونے والوں کی بحالی کا

ہے۔ ساتھ ہی باندھ کی تعمیر کے لیے پانچ کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ کا بند و بست کیا گیا ہے۔

۲۔ ریاست کے عوام کے لیے غذائی اشیاء اور دوسری ضروری چیزوں

فراہم کرنے کے لیے ۵۰ لاکھ روپیہ کے سرمایے سے ایک کارپوریشن کی تشکیل کی جارہی ہے۔ یہ کارپوریشن عوام کو بڑے پیمانے پر مناسب قیمت پر ضروری اشیاء فراہم کرنے کے لیے خرید وفروخت کا کام کرے گا۔

۳۔ دیہی علاقوں میں کھولے جانے والے ابتدائی صحت مرکزوں کے ذیلی مرکزوں میں دواؤں کی فراہمی کے لیے کوئی رقم مخصوص نہیں تھی۔ اس بجٹ میں پہلی بار ریاست کے دیہی علاقوں میں واقع ۸۷۵ ابتدائی صحت مرکزوں سے ملحق ۷۰۰۰ دیہی ذیلی مرکزوں کے لیے ۲۰۰۰ روپیہ فی ذیلی مرکز کے حساب سے ایک کروڑ چالیس لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔

۴۔ ریزرو بینک کی ہدایت کے مطابق ایک دیہی زرعی قرضہ استحکام فنڈ (رورل کریڈٹ اسٹیبلائزیشن فنڈ) قائم کیا گیا ہے جس کے تحت اس سال ایک کروڑ روپیہ کی مزید رقم کا بندوبست کیا جارہا ہے۔ اس طریقۂ عمل سے ضرورت کے مطابق قلیل المدتی قرضوں کو درمیانی مدت کے قرضوں میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ ریاست کے شہری اور دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کی فراہمی اور پانی کی نکاسی سے متعلق اسکیموں کے لیے ۴ کروڑ ۲۵ لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔

۶۔ گنڈک، رام گنگا اور شاردا سہایک کمانڈ ایریا کے علاقوں کی ترقی کے لیے دو کروڑ روپیہ کا بندوبست اس سال کے بجٹ میں کیا جارہا ہے تاکہ اس علاقے کے کسان زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔

۷۔ سیلاب کی روک تھام سے متعلق کاموں کے لیے دو کروڑ ۶۷ لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا جارہا ہے۔

۸۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کانپور شہر کی حفاظت اور پینے کے پانی کی فراہمی کے لیے ۲۲ کروڑ ۸۷ لاکھ روپیہ سے گنگا بیراج تعمیر کیا جائے۔ اس کام کو شروع کرنے کے لیے ایک کروڑ روپیہ کی رقم کا بندوبست اس سال بجٹ میں کیا جارہا ہے۔

۹۔ فیض آباد، بریلی اور جھانسی میں یونیورسٹیوں کے قیام کے لیے بجٹ میں بندوبست کیا جارہا ہے۔

۱۰۔ کانپور کے زرعی اداروں کو یونیورسٹی کا درجہ دیے جانے کے لیے بجٹ میں بندوبست کیا جارہا ہے تاکہ مرکزی حکومت کی منظوری حاصل کرنے کے بعد کام شروع کیا جاسکے۔

۱۱۔ جدید انتظامی امور کی ٹریننگ کے لیے منیجمنٹ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کے مقصد سے ۳۰ لاکھ روپیہ کا اس سال بجٹ میں بندوبست کیا جارہا ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ مرکز کی جانب سے قائم کیا جائے گا۔

۱۲۔ لکھیم پور کھیری ضلع میں ۲ کروڑ ۲۵ لاکھ روپیہ کی لاگت سے ایک جوٹ مل کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اس سلسلے میں ابتدائی کام کے لیے اس سال کے بجٹ میں ۴ لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔

۱۳۔ ٹہری گڑھوال ضلع کی پنت نگر۔ یونیورسٹی کا پہاڑی کیمپس قائم کرنے میں ۵ کروڑ روپیہ کی رقم صرف ہوگی۔ اس کے لیے موجودہ بجٹ میں ۴۰ لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔

۱۴۔ ایک امداد باہمی کیمیاوی کھاد کارخانہ "افکو" کے توسط سے قائم کرنے کی تجویز ہے۔ اس کارخانہ کی لاگت ۱۱۰ کروڑ روپیہ ہوگی۔ حکومت ہند، مدھیہ پردیش اور بہار کی ریاستوں کے ساتھ ساتھ ریاست اتر پردیش بھی چھ کروڑ روپیہ کی رقم حصہ پونجی کی صورت میں لگائے گی ۷۵-۱۹۷۴ء کے مالیاتی سال میں چھ کروڑ روپیہ میں سے پچاس لاکھ (۵۰۰۰۰۰۰) روپیہ اس مد میں لگانے کی تجویز ہے۔

۱۵۔ تقریباً چھ کروڑ روپیہ کی لاگت سے قائم کی جانے والی ۱۵ امداد باہمی شکر ملوں کے لیے ۳ کروڑ روپیہ کی حصہ پونجی اس سال کے بجٹ میں مختص کی گئی ہے۔ ریاستی شکر کارپوریشن کی جانب سے چار شکر ملوں کے قیام کی تجویز ہے اور ان کے لیے ایک کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ کی حصہ پونجی کا بندوبست ہے۔

۱۶۔ مراد آباد میں پیتل برتن کارپوریشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا جاچکا ہے۔ اس کے لیے اس سال کے بجٹ میں ۲۵ لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔

۱۷۔ صنعتی واحدوں کے ذریعہ ڈیزل ٹربوسٹیس لگانے پر ۷۰ لاکھ روپیہ مالی امداد دیئے جانے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

۱۸۔ چرم اترقیاتی کارپوریشن کے قیام کا فیصلہ کیا جاچکا ہے۔ اس کے لیے اس سال کے بجٹ میں ۲۵ لاکھ روپیہ کی حصہ پونجی رکھی جائے گی

اس کا صدر دفتر آگرہ میں ہوگا۔

۱۹۔ الیکٹرانکس ترقیاتی تجربہ گاہ کا کانپور کے قیام کا فیصلہ کیا جا چکا ہے اور اس کے لیے بجٹ میں دس لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اتر پردیش الیکٹرانکس کارپوریشن کے لیے اس سال کے بجٹ میں ۷۴ لاکھ روپیہ کی حصہ پونجی ہوگی۔

۲۰۔ ریاست میں کھیل کود کے نظامت کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اس کے لیے بجٹ میں بندوبست کیا جا رہا ہے۔

۲۱۔ آبپاشی کی سہولتوں میں اضافہ کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ دو ٹیوب ویل کارپوریشن قائم کیے جائیں۔ ایک کارپوریشن کے تحت میرٹھ اور آگرہ کے منطقہ شامل ہوں گے اور دوسرے کے تحت لکھنؤ اور بریلی کے منطقہ ہوں گے۔ ۷۵-۱۹۷۴ء کے بجٹ میں مذکورہ دونوں کارپوریشنوں میں سے ہر ایک کے لیے ریاستی حکومت کی جانب سے حصہ خریدنے کی غرض سے ۵۰ لاکھ روپے کی رقم کا بندوبست کیا گیا ہے۔

۲۲۔ نئے صنعت کاروں کو صنعتی واحدوں کے قیام کے لیے صلاح و مشورہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑے سرمایہ داروں کی طرح ان کے پاس سرمایہ دستیاب نہ ہونے سے انھیں دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کو سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے اتر پردیش امداد باہمی کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اس کارپوریشن کی پونجی لاگت ۲۵ لاکھ روپیہ ہوگی اور اس کے لیے بجٹ میں ۵ لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

۲۳۔ جنگلات ترقیاتی کارپوریشن بھی قائم کیا جا رہا ہے۔ اس کام کے لیے اس سال کے بجٹ میں ۱۵ لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔

۲۴۔ کوئمبٹور کی طرح گنے کی تحقیقات کے لیے ایک مرکز قائم کرنے پر غور کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ اس کے قیام کے سلسلے میں حکومت ہند سے پورا پورا تعاون حاصل ہو سکے گا۔

۲۵۔ معدنیاتی ترقی کارپوریشن کا قیام بھی عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اس پر تخمینی لاگت ۵۰ لاکھ روپیہ ہوگی۔ اس سال کے بجٹ میں ۲۵ لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔

۲۶۔ گورنمنٹ پریسیژن انسٹرومنٹ فیکٹری لکھنؤ کو ایک کارپوریشن کی شکل دی جا رہی ہے۔ اس کے لیے بجٹ میں ۳۰ لاکھ روپیہ کی رقم کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

۲۷۔ ریاست میں سرکاری امداد باہمی اور مشترکہ زمروں میں ۲۲ کتائی ملیں قائم کی جا رہی ہیں۔ اس کے لیے ۴ کروڑ روپیہ کی حصہ پونجی کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

۲۸۔ اتر پردیش اصلاحات آراضی و ترقی کارپوریشن (بیہڑ اور بنجر زمین کے تحفظ و ترقی) کے لیے دس لاکھ روپیہ کا بندوبست اس سال کے بجٹ میں کیا گیا ہے۔

۲۹۔ حکومت شاہدرہ، سہارنپور ریلوے لائن کو اولیت دیتی ہے۔ اس سال اس لائن کو دوبارہ چالو کر کے اس کو بڑی لائن میں بدلنے کے لیے حکومت ہند اور ریاستی حکومت کی طرف سے تشکیل دئے جانے والے مشترکہ کارپوریشن کو ۲ کروڑ روپیہ فراہم کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ ریلوے بورڈ اس کام کو تیزی سے مکمل کرائے گا۔

۳۰۔ حکومت نے یہ بھی طے کیا ہے کہ ہریجنوں، بے زمین اور بے گھر لوگوں کے لیے بڑے پیمانے پر مکانات بنانے کے لیے وزیر محکمہ تعمیرات عامہ کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل کی جائے جس میں اجتماعی ترقی، مال اور ہریجن فلاح کے محکموں کے سکریٹری، چیف ٹاؤن اینڈ کنٹری پلانر بھی ہوں۔ یہ کمیٹی حسب ضرورت اپنی ایک ٹیم کیرالا بھی بھیجے گی تاکہ وہاں کے اصلاحات آراضی قوانین پر عمل درآمد، ہریجنوں کے رہائشی مسئلے کا حل اور رہائشی مکانات سے متعلق پروگرام میں عوام کے تعاون وغیرہ سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ حاصل ہو جانے پر حکومت حسب ضرورت اپنے کاموں میں ردوبدل کر لے گی۔

۳۱۔ طلبا کے مفاد کے لیے ایک طلبا فلاح و بہبود کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۳۲۔ ریاست میں لاکھوں افراد رکشا چلا کر گزر اوقات کرتے ہیں۔ جو رکشے چلانے والے بذات خود رکشا کے مالک بننا چاہتے ہیں انھیں بینکوں سے قرض حاصل کرنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ایک "رکشا چالک فائنانس کارپوریشن" کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کے سرمائے کے لیے سنٹرل بینک آف انڈیا نے ۵۰

لاکھ روپیہ قرض دینے کی جو یقین دہانی کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔

۳۳۔ ریاست میں ایک بیورو قائم کیا گیا ہے جو سرکاری زمرے کی مختلف صنعتوں سے متعلق ضروری اعداد و شمار و اطلاعات حاصل کرنے کے بعد ان صنعتوں کے کام کی جانچ اور ان کی کارکردگی کا جائزہ لے گا۔ یہ بیورو ایسی تمام صنعتوں کی کارکردگی میں یکسانیت لانے کے خیال سے اس میں اصلاح کی بھی کوشش کرے گا۔

۳۴۔ حکومت نے یہ بھی طے کیا ہے کہ طلبا کی سہولت کے لیے یونیورسٹیوں میں ہاسٹل قائم کیے جائیں۔ ان ہاسٹلوں کے قیام کے لیے ۵۰ فیصد رقم یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے اور ۵۰ فیصد روپیہ ہڈکو سے حاصل کیا جائے گا۔

۳۵۔ طلبا کو سہولتیں فراہم کرنے کے پیش نظر یہ ضروری سمجھا گیا کہ یونیورسٹیوں میں گزشتہ برسوں سے سرمایہ کی جو کمی چلی آ رہی ہے اسے پورا کر دیا جائے۔ اس لیے تقریباً ایک کروڑ روپیہ یونیورسٹیوں کے خسارے کو پورا کرنے کے لیے مہیا کیا گیا ہے۔ توقع ہے اس سے یونیورسٹیوں کے طلبا کے لیے ضروری سہولتوں کی فراہمی ممکن ہو سکے گی۔

۳۶۔ جن شہروں میں یونیورسٹیاں واقع ہیں ان میں ہاسٹلوں اور کالجوں میں رہنے والے طلبا کو سہولت دینے کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ کنٹرول میں ملنے والے غلے نیز ضروری اشیا کو سستے نرخ پر ہاسٹلوں میں پہنچایا جائے۔

۳۷۔ سرکاری ملازمین سے متعلق ایک جوائنٹ مشاورتی مشینری کی تشکیل کی گئی ہے۔ ریاست کے ایک سینیر ترین افسر کو ملازمین بہبود محکمہ کا سکریٹری مقرر کیا گیا ہے۔

۳۸۔ زیادہ تر لوکل باڈیز کے مالی ذرائع ناکافی ہیں۔ ان کے مالی ذرائع میں اضافہ کرنے کے لیے ایک مرکزی اسسمنٹ اتھارٹی قائم کرنے کی تجویز ہے تاکہ مکان ٹیکس، پانی ٹیکس، پانی نکاسی ٹیکس اور صفائی ٹیکس کا مناسب طور سے تعین کیا جا سکے۔

۳۹۔ شہروں کی منصوبہ بند توسیع و ترقی کے لیے حکومت نے ابتداً ریاست کے پانچ بڑے شہروں میں ڈیولپمنٹ اتھارٹیز قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی کامیاب مثال کے نمونے پر تشکیل ہونے والی یہ ڈیولپمنٹ اتھارٹیز جلد ہی تشکیل پائیں گی۔

۴۰۔ حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ۱۱ دودھ کارپوریشن قائم کیے جائیں تاکہ ہر ڈویژنل کمشنر کے ڈویژن کے کسی ایک ضلع کے اندر یہ کارپوریشن قائم ہو سکے۔ امید کی جاتی ہے کہ ان کارپوریشنوں کے قیام سے دودھ کی پیداوار میں تیز رفتاری سے کام ہو سکے گا۔

۴۱۔ اقوام مندرجہ فہرست اور قبائل مندرجہ فہرست کے افراد کو قرض میں مبتلا رہنے کی برائیوں سے بچانے اور ان کو قرضوں کے بار سے نجات دلانے کے لیے حکومت ایک قانون تیار کر رہی ہے جو مجالس قانون ساز کے سامنے اسی سال پیش ہوگا۔

۴۲۔ ہریجنوں اور اقلیتوں کے مفاد کے تحفظ نیز اس سلسلے میں حکومت کے احکامات کو موثر طور پر عمل میں لانے کے مقصد سے ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج کی سربراہی میں متعدد ممبروں پر مشتمل ایک کمیشن کی تشکیل کی جا رہی ہے جو مجوزہ یک رکنی اقلیتی کمیشن کی جگہ لے گا۔

۴۳۔ حکومت نے وظائف میں میٹرک سے قبل کے درجات میں ۵۰ فیصد اور میٹرک کے بعد کے درجات میں سو فیصد اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے لیے حکومت اس سال سے ہریجن اور قبائل مندرجہ فہرست کے وظائف پر ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے زیادہ خرچ کرے گی۔ یہ سو فیصد اضافہ انجینئرنگ، میڈیکل اور ٹیکنکل درجات کے طلبا کے لیے بھی ہوگا۔

۴۴۔ حکومت نے اتر پردیش خاتمہ زمینداری و اصلاحات اراضی قانون کی دفعہ ۱۹۸ میں ترمیم کرکے زمین کے الاٹمنٹ کے معاملے میں اقوام مندرجہ فہرست اور قبائل مندرجہ فہرست کے بے زمین مزدوروں کو اولیت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ زمین کی زیادہ سے زیادہ حد کے نفاذ کے نتیجہ میں جو فالتو زمین دستیاب ہوگی اس کے الاٹمنٹ کے لیے بھی اسی طرح ان کو اولیت دی جائے گی۔

۴۵۔ حکومت نے اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے ڈھانچہ کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کارپوریشن میں لامرکزیت لانے اور اس کے طریقہ کار کو سدھارنے کے مقصد سے ایک ایسے ادارہ کا قیام زیر غور ہے جس کے مطابق ۴ یا ۵ ریجنل ٹرانسپورٹ کارپوریشن تشکیل کیے

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

ہندستان میں صدر جمہوریہ کا انتخاب

صدر جمہوریہ ہند شری وی۔ وی۔ گری ۲۴ اگست ۱۹۷۴ء کو پانچ سال کی مدت ختم کرنے کے بعد اپنے عہدے سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ ۱۷ اگست ۱۹۷۴ء کو نئے صدر جمہوریہ کا انتخاب عمل میں آئے گا۔

ہندستان کے آئین کے آرٹیکل ۵۴ میں مذکور ہے کہ صدر جمہوریہ کا انتخاب لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے منتخبہ ممبران نیز ریاستوں کی قانون ساز اسمبلیوں کے منتخبہ ممبران کریں گے۔ آئین میں یہ بھی مذکور ہے کہ جہاں تک عملاً ممکن ہوگا صدر جمہوریہ کے چناؤ میں مختلف ریاستوں کی نمائندگی کا پیمانہ یکساں بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ ریاستوں میں اس طرح کی یکسانیت لانے کے خیال سے نیز بحیثیت مجموعی ریاستوں اور یونین کے درمیان برابری قائم کرنے کے نقطۂ نظر سے پارلیمنٹ کے منتخبہ ممبران اور ریاستی قانون ساز اسمبلیوں کے منتخبہ ممبران کی طرف سے ڈالے جانے والے ووٹوں کی تعداد کا تعین ایک خاص طریقے پر کیا جائے گا۔

ریاست کی قانون ساز اسمبلی کے ہر منتخبہ ممبر کے ووٹ کی تعداد کے تعین کے لیے ریاست کی کل آبادی کو قانون ساز اسمبلی کے منتخبہ ممبران کی تعداد سے تقسیم کیا جائے گا اور خارج قسمت کو ایک ہزار سے تقسیم کیا جائے گا۔ اس طرح تقسیم کرنے پر جو باقی بچے اگر وہ پانچ سو سے کم نہیں ہے تو ہر ممبر کے ووٹ کی تعداد میں مزید ایک ووٹ کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

پارلیمنٹ کے کسی ایوان کے منتخبہ ممبر کے ووٹوں کی تعداد کے تعین کے لیے ریاستوں کی قانون ساز اسمبلیوں کے ممبران کے لیے متعین کیے گئے ووٹوں کی تعداد کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے منتخبہ ممبران کی تعداد سے تقسیم کیا جائے گا۔ تقسیم کے بعد جو باقی بچے وہ اگر مقسوم علیہ کے آدھے سے زیادہ ہے تو وہ ایک ووٹ متصور ہوگا اور اگر نصف سے کم ہو تو اسے نظر انداز کر دیا جائے گا۔

خفیہ ووٹ

آئین کی رو سے صدر جمہوریہ کا انتخاب متناسب نمائندگی کے نظام کے مطابق واحد قابلِ انتقال ووٹ کے مطابق ہوگا اور یہ چناؤ خفیہ بیلٹ کے ذریعے ہوگا۔

آئین میں مذکور ہے کہ الکشن میں کھڑا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہندستان کا شہری ہو اور اپنی عمر کے ۳۵ سال پورے کر چکا ہو اور وہ لوک سبھا کے ممبر منتخب ہو جانے کے لیے ضروری کوالیفکیشن (اہلیت) رکھتا ہو۔ آئین میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مرکزی سرکار یا ریاستی سرکار یا لوکل سیلف گورنمنٹ کے ماتحت کسی عہدے پر فائز کوئی شخص صدر جمہوریہ کے الیکشن کے لیے مجاز نہیں ہے۔ البتہ صدر جمہوریہ اور نائب صدر جمہوریہ، ریاستی گورنر، مرکزی سنز ریاستی وزیر اس سے مستثنیٰ ہیں۔

صدر جمہوریہ کے لیے کاغذاتِ نامزدگی کم سے کم دس ارکان کی طرف سے داخل کیے جاتے ہیں اور کم سے کم دس ارکان کی تائید حاصل ہوتی ہے۔

کاغذات نامزدگی کے ساتھ ۲۵۰ روپے زرِ ضمانت داخل کرنا پڑتا ہے۔ یہ رقم ریٹرننگ آفیسر کو کاغذات نامزدگی پیش کرنے

ہوئے نقد ادا کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ رقم ریزرو بینک آف انڈیا یا کسی سرکاری خزانے میں جمع کرائی جا سکتی ہے اور اس کی رسید کا غذات نامزدگی کے ساتھ منسلک کر دینی ہوتی ہے۔

سابقہ انتخابات

اب تک ملک میں ۵ صدارتی انتخابات ہو چکے ہیں۔ یہ انتخابات ۱۹۵۲، ۱۹۵۷، ۱۹۶۲، ۱۹۶۷ اور ۱۹۶۹ میں ہوئے ہیں۔ آئین ساز اسمبلی (CONSTITUENT ASSEMBLY) نے اتفاق رائے سے ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو جبکہ نیا آئین نافذ کیا گیا، ڈاکٹر راجندر پرشاد کو صدر جمہوریہ منتخب کیا۔ گزشتہ پانچ انتخابات میں جن شخصیتوں کا صدر جمہوریہ کی حیثیت سے انتخاب عمل میں آیا ان کے نام یہ ہیں:

صدر جمہوریہ	سال
۱۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد	۱۹۵۲
۲۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد	۱۹۵۷
۳۔ ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن	۱۹۶۲
۴۔ ڈاکٹر ذاکر حسین	۱۹۶۷
۵۔ شری وی۔ وی۔ گری	۱۹۶۹

★

دنیا کی بربادی اور انسان

(صفحہ ۳ کا بقیہ)

تو فٹ پاتھ یا شہر کے کنارے جھونپڑیوں میں جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کولھو کے بیل کی طرح کام کرنے اور لائنیں لگانے میں ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی نل کے سامنے پانی کے لیے کبھی راشن کی دکان پر کبھی سڑک پار کرنے کے لیے کبھی بس کے انتظار میں کبھی دوا لینے کے لیے۔ آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ لائنیں لمبی ہوتی جائیں گی۔ ان کے چھوٹا ہونے کا کوئی امکان نہیں جب تک انسان خود اپنی آبادی کو بڑھنے سے نہ روک دے۔

دنیا کی موجودہ آبادی تین ارب ۹ کروڑ ہے۔ روزانہ تین لاکھ ۵۰ ہزار بچے پیدا ہوتے ہیں اور ایک لاکھ ۳۵ ہزار انسان مرتے ہیں گویا روزانہ ۲ لاکھ ۱۵ ہزار کا اضافہ ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے یہ آبادی دگنی ہو جائے گی۔ دنیا کی موجودہ آبادی کو زندہ رکھنا ہی ہماری زمین کے لیے مشکل ہے۔ ذرا سوچیے ۲ صدی تک یعنی اب سے صرف ۲۶ سال کے بعد انسانوں کی کیا حالت ہوگی؟

آخر اس کا علاج کیا ہے؟ کیا ہماری تہذیب خود اپنے ہاتھوں خودکشی کر لے گی یا انسان ہوش کے ناخن لے گا اور زمین کو مزید بربادی سے بچائے گا؟ ایسی حالت میں آپ کی ذمہ داری کیا ہے؟ اس کا جواب مشکل نہیں۔ اگر آپ اپنی آنے والی نسلوں کو ان مصیبتوں سے بچانا چاہتے ہیں تو آپ کو خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں پر عمل کرنا ہوگا۔ قدرتی وسائل کی حفاظت کرنا ہوگی۔ ہر چیز کے استعمال میں حد درجہ کفایت شعاری سے کام لینا ہوگا اور زمین کی مٹی، ہوا اور پانی کو ہر قسم کی آلودگی سے بچانا ہوگا۔

★

مشتاق احمد

جہانگیر اور نور جہاں

جہانگیر اور نور جہاں تاریخ مغلیہ کے دو اہم رومانی کردار ہیں۔ ان دونوں کے افسانے آج بھی زبان زد خاص و عام ہیں اور اس سلسلے میں بہت سی ایسی باتیں مشہور ہو گئی ہیں جن کی صحت مشکوک ہے۔ مثلاً یہ کہ کیا واقعی شہزادہ سلیم نور جہاں کی محبت میں گرفتار رہا؟ کیا اکبر نے جہانگیر کو نور جہاں سے شادی کرنے سے باز رکھا؟ کیا جہانگیر نور جہاں کے پہلے شوہر شیر افگن کا قاتل ہے؟ اور جب جہانگیر ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہوا تو اس وقت شادی کرنے کے بجائے اس نے ۱۶۱۱ء میں نور جہاں سے شادی کیوں کی؟ جہانگیر نے اس شادی کو کیوں صیغہ راز میں رکھا؟

یہ سب سوالات ایسے ہیں جن کے جوابات بہت مشکل اور تحقیق طلب ہیں اور مورخین اس بارے میں ایک دوسرے سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے، جہانگیر اور نور جہاں کے رومان پر دبیز تہہ چڑھتی جا رہی ہے۔ ایک عقدہ کھلتا ہے تو اس سے بڑی گرہ پڑ جاتی ہے جس سے ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے۔

جہانگیر نے نور جہاں سے ۱۶۱۱ء میں شادی کی، نور جہاں کا اصلی نام مہرالنساء تھا۔ جہانگیر نے شادی کے بعد اسے نور محل کا لقب دیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اسی نے اصل نام کو بدل کر نور جہاں کر دیا۔ نور جہاں کے باپ کا نام غیاث بیگ تھا۔ یہ ایران کا رہنے والا تھا۔ ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا اور اکبر کے دربار میں ایک معزز عہدے پر فائز ہو گیا۔ اکبر نے اسے اعتماد الدولہ کا خطاب دیا۔

نور جہاں کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ایک دلچسپ قصہ مشہور ہے کہ اس کے والدین قحط کے باعث اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور بے سروسامانی کی حالت میں ہندوستان کا رخ کیا۔ راستے میں ان کو طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ غیاث الدین کی بیوی حاملہ تھی۔ راستے میں اس نے ایک بچی کو جنم دیا۔ وہ لوگ اس قابل نہیں تھے کہ بچی کا بوجھ برداشت کر سکتے چنانچہ اس بچی کو راستے میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ابھی غیاث الدین تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ بچی کی ماں کو ممتا نے للکارا اور وہ آہ و زاری کرنے لگی۔ مجبوراً غیاث الدین اس جگہ واپس لوٹا جہاں بچی کو چھوڑ گیا تھا۔ وہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک کالا ناگ بچی کے نزدیک بیٹھا اس پر سایہ فگن ہے۔ غیاث الدین یہ منظر دیکھ کر بے حد خوفزدہ ہوا۔ لیکن سانپ نے غیاث الدین کو دیکھتے ہی بچی کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لی۔ غیاث الدین قدرت کی اس انوکھی رکھوالی پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے بچی کو اٹھا لیا اور ماں کے حوالے کیا۔ یہ لوگ سفر کی مصیبتیں اٹھاتے لاہور پہنچے، جہاں ان کی ملاقات ایک پرانے دوست سے ہوئی۔ اس نے مرزا غیاث الدین کا تعارف شہنشاہ اکبر سے کرایا۔ اکبر نے اسے ایک معمولی سی نوکری دی لیکن بعد میں مرزا غیاث الدین اپنی غیر معمولی ریاضت اور ذہانت کے باعث بہت بڑے عہدے پر پہنچ گیا۔ غیاث الدین کی لڑکی مہرالنساء جب جوان ہوئی تو اس کے حسن کا چرچا محل میں ہونے لگا۔ ولی عہد سلیم مہرالنساء کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ شہنشاہ اکبر نے اس رشتہ کو پسند نہیں کیا۔ اکبر نے مہرالنساء کی شادی اس کے ایک ہم وطن شیر افگن سے کر دی۔ لیکن سلیم مہرالنساء کی محبت کو بھلا نہ سکا۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے شیر افگن

تو قتل کرا کے مہرالنساء کو حاصل کرنا چاہا اور وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا۔ مہرالنساء بادشاہ جہانگیر کے محل میں آ گئی اور شیر افگن کے قتل کے چار سال بعد اس نے مہرالنساء سے شادی کر لی۔ اس نے اسے نور جہاں کا خطاب عطا کیا اور وہ ہندوستان کی ملکہ بن گئی۔

ایک اور روایت ہے کہ شیر افگن جس کا نام اصلی علی قلی استجلو تھا میواڑ کی مہم میں شہزادہ سلیم کے ساتھ تھا۔ یہ ۱۵۹۹ء کا واقعہ ہے۔ اس نے ایک شیر کا شکار کیا۔ سلیم نے خوش ہو کر اُسے شیر افگن کا خطاب دیا۔ کچھ دنوں بعد جب سلیم نے اکبر سے بغاوت کی تو شیر افگن نے اکبر کا ساتھ دیا۔ لیکن جب سلیم بادشاہ ہوا تو اس نے شیر افگن کو معاف کر دیا اور بنگال میں بردوان کا فوجدار بنا دیا اور ۱۶۰۵ء میں جاگیر بھی عطا کی۔ بعد میں جہانگیر کو شیر افگن پر شبہ ہوا کہ وہ بغاوت کا ارادہ رکھتا ہے چنانچہ ۱۶۰۶ء میں اس نے بنگال کے نئے گورنر قطب الدین خان کو جس کا تقرر مان سنگھ کی جگہ پر ہوا تھا، ایک فرمان جاری کیا کہ شیر افگن کو دربار میں حاضر کرے تا کہ سلطنت سے بے وفائی کے جرم میں اسے سزا دی جائے۔

گورنر کے فرمان کے جواب میں شیر افگن ۹ اپریل ۱۶۰۶ء کو اپنے دو وفادار خادموں کے ساتھ قطب الدین کے دربار میں حاضر ہوا گورنر کی فوج نے شیر افگن کو گھیر لیا۔ شیر افگن اس توہین آمیز برتاؤ سے بہت دل برداشتہ ہوا۔ اس نے گورنر سے پوچھا کہ آخر اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جا رہا ہے۔ قطب الدین اس کی وجہ بتانے کو جونہی آگے بڑھا شیر افگن، جو غصہ سے پاگل ہو رہا تھا، تلوار نیام سے نکال کر قطب الدین پر ٹوٹ پڑا اور اُسے قتل کر دیا۔ قطب الدین کے ساتھیوں نے جب دیکھا کہ اس کا آقا قتل کر دیا گیا ہے تو وہ لوگ شیر افگن پر بری طرح ٹوٹ پڑے اور اس کو تلوار کے گھاٹ اتار کر اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ قطب الدین کی موت نے جہانگیر کو غصہ سے پاگل کر دیا۔ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا "شیر افگن جہنم واصل ہوا، جہاں وہ اپنے سیاہ چہرے کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔" جہانگیر شیر افگن کی بیوہ اور اس کی لڑکی لاڈلی بیگم کو اپنے محل میں لے آیا جہاں اس کی نگرانی شہنشاہ اکبر کی بیوہ سلیمہ بیگم کے سپرد ہوئی۔ مارچ ۱۶۱۱ء میں جشن نوروز کے موقع پر جہانگیر نے اتفاقیہ طور پر مہرالنساء کی ایک جھلک دیکھی اور وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ چنانچہ ۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے مہرالنساء سے شادی کر لی۔ شادی کے وقت جہانگیر کی عمر ۴۲ سال اور نور جہاں کی عمر ۳۴ سال تھی۔

جہانگیر کی نور جہاں سے شادی اور شیر افگن کے قتل پر اس عہد اور عصر جدید کے مورخین میں ایک بحث چل پڑی ہے اور اس موضوع پر ہر مورخ نے اپنی اپنی رائے دی ہے۔ ڈاکٹر بینی پرشاد کا کہنا ہے کہ ایک شہزادہ کی حیثیت سے سلیم نے مہرالنساء کو کبھی نہیں دیکھا، اکبر نے سلیم کو شادی سے کبھی نہیں روکا اور جہانگیر کا شیر افگن کے قتل میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اس نے بادشاہ بننے کے بعد نور جہاں کو پہلی مرتبہ مارچ ۱۶۱۱ء میں دیکھا (جہانگیر ص ۱۵۲) فاضل مورخ نے اپنے اس دعوے میں جو نکات پیش کیے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) کسی بھی ہم عصر ایرانی مورخ کی تحریر میں یہ نہیں ملتا ہے کہ سلیم نے مہرالنساء کو دیکھا اور اس نے مہرالنساء سے شادی کرنی چاہی اور اکبر نے اس کی اجازت نہیں دی۔ نہ تو کسی ہم عصر ایرانی حاکم نے جہانگیر پر شیر افگن کے قتل کا الزام عائد کیا۔

(۲) اس عہد کے کسی بھی مغربی سیاح نے اپنی تحریر میں اس قسم کے واقعات نہیں لکھے، جو اس طرح کے واقعات کے لیے بہت زیادہ متجسس رہتے تھے اور شاہی خاندان کی ذرا ذرا سی بات پر نظر رکھتے تھے تا کہ وہ اس کی گرفت کر کے اس کو بدنام کریں اور خود مشہور ہو جائیں۔

۳۔ اکبر کے سلیم کو شادی سے روکنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، جبکہ اس زمانے میں اس طرح کی شادیاں عام تھیں۔

۴۔ اگر واقعی اکبر نے ایسا کیا ہوتا تو وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ شیر افگن کو ۱۵۹۹ء میں سلیم کے ساتھ میواڑ بھیجتا۔ اگر سلیم واقعی شیر افگن کو اپنا رقیب سمجھتا تو اسے ہرگز معاف نہ کرتا اور اس کو بڑا عہدہ نہ دیتا۔

۵۔ قطب الدین کا بنگال میں گورنر کی حیثیت سے تقرر شیر افگن کو سزا دینا نہیں تھا بلکہ مان سنگھ کی طاقت کو ختم کرنا تھا جس سے بادشاہ کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔

۶۔ نور جہاں جیسی بلند کردار اور عفت مآب عورت ہرگز اس کو برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ بادشاہ اس کے پہلے شوہر کو قتل کر دیتا اور وہ اس سے شادی کر لیتی۔

۷۔ شیر افگن کی بیوہ کا دربار میں آنا ایک قدرتی امر تھا کیونکہ یہاں محل سے اس کے باپ اور بھائی پہلے ہی سے منسلک تھے، یہاں وہ سلیمہ بیگم کی نگرانی میں رکھی گئی تھی جو خود ایک بلند کردار عورت تھی۔

ہندستان کے ایک اور مشہور مورخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد لکھتے ہیں کہ "سلیم کا شہزادہ کی حیثیت سے مہرالنسار سے محبت کرنا، شادی کی خواہش کرنا اور بعد میں شیر افگن کا قتل کرنا فرضی یا قیاسی باتیں نہیں ہیں"۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد بھی اپنی دلیل میں ذیل کے نکات پیش کرتے ہیں

۱۔ ڈاکٹر بینی پرشاد کا یہ کہنا کہ سلیم نے شہزادہ کی حیثیت سے مہرالنساء سے کبھی محبت نہیں کی اور شیر افگن کے قتل کے معاملے میں بے گناہ ہے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ بادشاہ وقت کبھی یہ اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ اس کے ذاتی معاملات کو کوئی دائرہ تحریر میں لائے۔ جہانگیر اس معاملے میں بہت محتاط تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ اس زمانے میں اس طرح کی باتیں عام تھیں اس لیے کسی مورخ نے اس واقعہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ عصر جدید کے مورخین نے بسیار تحقیق کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو بھاری وزن رکھتا ہے۔

۲۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بردوان سے جب مہرالنساء اور اس کی بیٹی لاڈلی بیگم دلّی لائی گئیں تو حرم میں سلیمہ بیگم کے ساتھ کیوں رکھی گئیں جبکہ راج بھاٹی میں مہرالنساء کے ماں باپ اور بھائی موجود تھے۔ اس قسم کا کوئی سلوک ان لوگوں کے خاندان کے ساتھ نہیں کیا گیا جو کہ اس بغاوت میں ملوث تھے۔

۳۔ جہانگیر اور نورجہاں کے رومان کے بارے میں اس عہد کے ایک مشہور ڈچ مورخ مسٹر ڈی لیٹ کے اس قول کو جو اس نے اپنی کتاب تذکرہ ھندستان اور جز تاریخ ھندستان میں درج کیا ہے کہ "جہانگیر نے نورجہاں سے شادی میں دیر کیوں کی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ مہرالنسار کو جو اپنے شوہر کے قتل پر بہت زیادہ غمگین اور دل برداشتہ تھی بھیڑ کانا نہیں چاہتا تھا"۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ "کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ثابت کیا جائے کہ واقعی جہانگیر کا دامن شیر افگن کے خون سے آلودہ نہیں ہوا" (ھندستان میں مسلمانوں کی مختصر تاریخ صفحہ ۴۶۵ تا ۴۶۷)

اس داستان کے پیچھے جو قابل غور باتیں ہیں وہ یہ ہیں کہ کیا واقعی جہانگیر ایک شہزادہ کی حیثیت سے مہرالنسار سے شادی کرنا چاہتا تھا اور کیا اکبر نے جہانگیر کو ایسا کرنے سے روکا۔ دوسرے یہ کہ کیا جہانگیر کا شیر افگن کے قتل میں کوئی ہاتھ تھا؟ پہلے سوال کے جواب میں ڈاکٹر بینی پرشاد کا یہ کہنا کہ "اگر سلیم اور مہرالنسار کی شادی میں مخل کیوں ہونے لگا جبکہ اس طرح کی شادیاں عام تھیں" تنقید کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ ابوالفضل کا بیان اس سلسلے میں اہمیت رکھتا ہے کہ اکبر نے سلیم کو اس کی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ زین خان کوکا کی لڑکی سے شادی کرے۔ لیکن اکبر نے جب دیکھا کہ سلیم کی شادی زین خان کوکا کی لڑکی سے نہ ہوئی تو اس کا برا اثر سلیم کی صحت پر پڑ سکتا ہے تب اس نے مجبوراً اس کی اجازت دی تھی (اکبر نامہ جلد تیسری صفحہ ۱۰۵۵)۔ ڈچ مورخ مسٹر ڈی لیٹ کی تحریر کے مطابق کہ اکبر نے سلیم کو مہرالنسار سے شادی کی اجازت کیوں نہیں دی وہ لکھتا ہے۔ "مہرالنساء اور شیر افگن ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، ان کو آپس میں اس طرح کا لگاؤ تھا کہ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چین نہیں آتا تھا"۔ وہ آگے لکھتا ہے "سلیم جب شہزادہ تھا تو وہ مہرالنسار (جو کہ ایک بہت ہی حسین و جمیل دوشیزہ تھی) کی محبت میں گرفتار ہو گیا لیکن چونکہ مہرالنسار کا جھکاؤ شیر افگن کی طرف تھا اس لیے اکبر نے مہرالنسار کی شادی شیر افگن سے کردی۔ ان دونوں کی شادی کے بعد بھی سلیم مہرالنسار کو فراموش نہ کر سکا"۔ ایک مورخ کی ایسی آزاد شہادت کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی جبکہ اس کو شہزادہ سے کوئی پرخاش بھی نہیں ہے۔ بعد کے مسلم مورخین نے ڈی لیٹ کی رائے کو تسلیم کیا ہے۔

ابھی کچھ روز ہوئے پٹنہ کے پروفیسر مسٹر عسکری کو ایک نادر فارسی قلمی نسخہ دستیاب ہوا ہے جس سے یہ رائے مزید مستحکم ہو جاتی ہے مسٹر عسکری کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ سلیم نے مہرالنسار کے ساتھ گستاخی کی۔ مہرالنسار نے اکبر سے شکایت کردی اور داد چاہی۔ چنانچہ اکبر نے سلیم کو مہرالنسار سے شادی کرنے سے روک دیا۔ اس کے علاوہ ہم لوگ جہانگیر کے کردار سے اچھی طرح واقف ہیں کہ وہ عاشق مزاج اور حسن پرست

شہزادہ تھا جس نے نہ صرف زین خان کوکا کی لڑکی سے محبت اور شادی کی بلکہ کئی لڑکیوں سے معاشقے اور شادیاں کیں جن کی تفصیلات ہماری نظروں سے اوجھل ہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں تو سلیم کا مہرالنساء سے عشق کرنا افسانہ نہیں معلوم ہوتا۔

دوسرے سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ جہانگیر کے عہد کے کسی بھی مورخ یا داستان گو نے شیر افگن کے قتل پر روشنی نہیں ڈالی ہے اور نہ اب تک کوئی ایسی تحریر دستیاب ہو سکی ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ شیر افگن کے قتل میں جہانگیر کا ہاتھ تھا۔ لیکن جہانگیر نے جس طرح نور جہاں کو حاصل کیا اس سے اس داستان میں ایک اور الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی بات نور جہاں کی شادی سے متعلق مان لی جائے تو شیر افگن کے قتل کے واقعہ کا ثبوت فراہم ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد بھی کچھ سوالات حل طلب رہ جاتے ہیں اگر جہانگیر نور جہاں کو حاصل کرنے کے لیے اتنا بے قرار تھا تو اس نے ۱۶۰۷ء میں شادی کرنے کے بجائے ۱۶۱۱ء میں شادی کیوں کی؟ وہ ان چار سال تک کیوں انتظار کرتا رہا۔ یہ بھی واضح رہے کہ جب نور جہاں بردوان سے راجدھانی لائی گئی تو حرم میں اس کی نگرانی جہانگیر کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کر رہی تھی جو کہ جہانگیر پر بہت مہربان تھی یہ وہی عورت ہے کہ جب جہانگیر شہزادہ تھا اور اکبر سے اس نے بغاوت کی تھی اور اس لیے اکبر سلیم سے بہت نالاں تھا۔ تب اسی نے باپ بیٹے میں مصالحت کرادی تھی، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سلیمہ بیگم حرم میں جوڑ توڑ میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ جبکہ اس وقت نور جہاں، جہانگیر کے مکمل کنٹرول میں تھی۔

اس کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے وہ یہ کہ جہانگیر جیسا دور اندیش بادشاہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا، جلد بازی کرنے سے نور جہاں برگشتہ یا بدگمان ہو سکتی تھی جس کے دل پر شوہر کی موت کا زخم تازہ تھا۔ دوسرے یہ کہ کہیں عوام بدگمان نہ ہو جائیں کہ بادشاہ نے شیر افگن کو صرف نور جہاں کو حاصل کرنے کے لیے قتل کرایا ہے۔ بادشاہ جو عادل اور سارے ملک کا محافظ ہوتا ہے اس کے لیے اس طرح کی حرکت زیب نہیں دیتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جہانگیر مستقبل کے مورخین کی ملامت کا نشانہ بننا نہیں چاہتا تھا، اس فعل سے جہانگیر کا کردار بھی نمایاں ہوتا ہے اور ہم اس میں اخلاقی جرأت کی بڑی کمی پاتے ہیں لیکن اس سوال کا جواب حل طلب رہ جاتا ہے کہ جہانگیر نے شادی کو چار سال تک پردۂ راز میں کیوں رکھا؟

آج جبکہ اس واقعہ کو تین سو سال کے قریب ہو گئے ہیں عوام کا تجسس ہنوز باقی ہے اور شاید ہمیشہ باقی رہے۔ مورخ ایک باب کھولتا ہے تو دوسرا سامنے آجاتا ہے اور وہ حیران و پریشان ہو کر شکست تسلیم کر لیتا ہے۔

تاریخ مہرالنساء کے بچپن کے بارے میں خاموش ہے اور ہم شیر افگن کے متعلق صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ ایرانی نژاد تھا اور فکر معاش میں ہندستان آیا، جہاں کی آب و ہوا اسے راس نہیں آئی۔ اس نے دنیا کی اُس دور کی ایک حسین اور ذہین عورت سے شادی کی جو اس کے لیے موت کا سبب بنی۔ جہانگیر جو اپنے دور کا ایک عظیم شہنشاہ تھا جس نے ایک بیوہ سے شادی کی، اس کو ملکہ بنایا اور ہمیشہ اس کے زیر نگیں رہا۔ اس کی عظمت تاریخی کتابوں میں بند ہو کر رہ گئی ہے۔

★

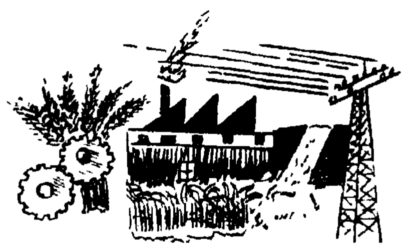
اتر پردیش بجٹ (صفحہ ۳۰ کا بقیہ)

جائیں گے اور ایک ہولڈنگ کمپنی انکو کنٹرول کرنے کے لیے بنائی جائے گی۔

۴۶۔ ریاستی حکومت نے اپنے ملازمین کو مرکزی حکومت کے طرز پر گرانی بھتہ دینا منظور کیا ہے۔ اس فیصلے کے مطابق یکم مئی اور یکم اگست اور یکم اکتوبر ۱۹۷۳ء اور یکم جنوری ۱۹۷۴ء سے گرانی بھتے میں چار اضافے بھی منظور کیے گئے ہیں۔ آخری اضافہ یکم فروری ۱۹۷۴ء سے منظور کیا گیا ہے جس سے ۵۰ء ۱۳ کروڑ روپیہ کا مزید گرانی بھتہ سرکاری ملازمین کو حاصل ہو سکے گا۔

۴۷۔ حکومت نے کم تنخواہ پانے والے اپنے ان سبھی ملازمین کے معاملے میں حد بڑھا دی ہے جو اپنے بچوں کے لیے تعلیمی بھتہ پانے کے حقدار ہیں۔ نئے انتظام کے مطابق ۲۲۵ روپیہ تک تنخواہ پانے والے سبھی ملازمین اب یہ تعلیمی بھتہ پانے کے حقدار ہوں گے۔

★



اتر پردیش شاہ راہ ترقی پر

ریاستی حکومت کے ۳۰ افسران اور ملازمین کو اسٹیٹ ایوارڈ ٭٭٭ فوجی سپاہیوں کی بیواؤں اور ان کے پسماندگان کو مراعات ٭٭٭ سرکاری افسران کو مہنگائی بھتہ حاصل کرنے کا عام اختیار ٭٭٭ شہری لوکل باڈیز اور ریاستی بجلی بورڈ کے ملازمین کے مہنگائی بھتے میں اضافہ ٭٭٭ اتر پردیش میں ایک نیا تفریحی جنگل ٭٭٭ موٹر اسپرٹ، ڈیزل آئل اور الکوہل پر ٹیکس میں ترمیم ٭٭٭ دیہی علاقوں میں عورتوں کو روزگار فراہم کرنے کی اسکیم ٭٭٭ ریاست میں راجستھانی ریگستان کی روک تھام کے لیے شجر کاری ٭٭٭ متفرقات

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے حال میں یہاں ودھان بھون کے تلک حال میں منعقدہ ایک تقریب میں ریاستی حکومت کے ۳۰ افسران اور ملازمین کو ۷۳-۱۹۷۲ء کے دوران قابل ستائش اور نمایاں خدمات انجام دینے کے صلے میں اسٹیٹ ایوارڈ تقسیم کئے۔ یہ ایوارڈ ۵۰۰ روپیہ سے ۱۰۰۰ روپیہ تک کے نقد انعامات اور تعریفی سندوں پر مشتمل ہیں۔ اس سال اسٹیٹ ایوارڈ پانیوالوں میں پانچ آئی۔اے۔ایس افسران، چھ پولیس افسران، چار انجنیئر اور ۱۵ دیگر افسران اور ملازمین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ محکمۂ مالیات کے سابق کمشنر نیز سکریٹری آنجہانی شری بھرت نارائن اور اتر پردیش کے جوائنٹ چیف الکٹورل افسر آنجہانی شری گرودیو سنگھ کو یہ انعامات بعد از مرگ دیئے گئے جبکہ محکمۂ معاشیات و اعداد و شمار کے ڈائرکٹر شری دیال پرشاد اگنیا اور سکریٹریٹ کے سکشن آفیسر شری رمیش چندر تیواری اپنی علالت کے باعث تقریب میں شرکت نہ کرسکے۔ مذکورہ دو افسران کے بعد از مرگ انعامات ان کی بیواؤں نے حاصل کئے جنکی آنکھیں اشک بار تھیں۔

شری بہوگنا نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اتر پردیش ایسے لاتعداد مسائل سے دوچار ہے جو چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے افسران اور ملازمین کا یہ مقدس فریضہ ہے کہ وہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے دگنے حوصلے، ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ حکومت کی مختلف پالیسیوں اور پروگراموں پر عملدرآمد کے لیے بھرپور کوشش کریں۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر آج ہم ایک بحران سے گزر رہے ہیں اس کے علاوہ ہر جگہ انتشار اور برافروختگی کے حالات پیدا ہو گئے ہیں جنھیں دور کرنے کیلئے بھرپور کوششیں کرنا ہوں گی تاکہ سماجی اور معاشی تبدیلی لائی جا سکے۔

اس تبدیلی کے لیے ایک آلہ کی حیثیت سے اہم کردار ادا کرنے کے واسطے افسران اور ملازمین پر زور دیتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ انھیں اپنے فرائض اور ذمہ داریاں عوام کا ایک دوست اور رہبر بن کر انجام دینا چاہئے تاکہ ہمارے خوابوں کا ایک ہندستان تعمیر ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے عوام کا تعاون اشد ضروری ہے۔

اتر پردیش جیسی بڑی ریاست کے مختلف علاقوں کے مختلف مسائل اور تمنائیں ہیں جنکی تکمیل تیز رفتاری سے کرنا ہے تاکہ سماج کے پامال طبقوں اور غریبوں کا تحفظ کیا جا سکے۔ عوام کو نظم و نسق کا اشتراک و تعاون نہیں درکار ہے بلکہ وہ صرف صحیح قیادت اور رہنمائی چاہتے ہیں۔ عوام کو ان دونوں چیزوں کی فراہمی کا فرض سرکاری ملازمین اور افسران پر ہے۔

وزیر اعلیٰ نے امید ظاہر کی کہ آنے والے برسوں میں زیادہ سے زیادہ افسران اور ملازمین انعامات کے لیے خود کو اہل ثابت کریں گے۔

انھوں نے مشورہ دیا کہ انعامات سے متعلق اسکیم کی سرکاری زمرہ کے اداروں میں بھی توسیع کی جانا چاہیے۔

اسٹیٹ ایوارڈ حاصل کرنے والے افسران کے نام یہ ہیں:

شری اجیت کمار داس، ضلع مجسٹریٹ بلند شہر، شری کرشانند سریواستو، ریذیڈنٹ انجینیر، اترپردیش پل کارپوریشن، ڈاکٹر کیدار ناتھ سنگھ، لائیو اسٹاک افسر، غازی پور، شری کے ایس گپتا سپرنٹنڈنگ انجینیر، لوکل سیلف گورنمنٹ انجینیرنگ ڈپارٹمنٹ، لکھنؤ، شری خورشید احمد، ایڈیٹر نیا دور و اسسٹنٹ ڈائرکٹر انفارمیشن ڈپارٹمنٹ لکھنؤ، شری جی ایس سنہا، سپرنٹنڈنٹ پولیس، دہرہ دون، شری گوپی ناتھ سریواستو، لیگل ایڈوائزر لکھنؤ، شری جی ایس سنگھل، ڈپٹی سکریٹری محکمۂ تقرری، شری سی۔ این بھٹ، ایڈ ڈویژنل اسسٹنٹ سکریٹریٹ لکھنؤ، شری رگھوبیر سنگھ، ضلع مجسٹریٹ، اناؤ، شری ناتھو لال، سینیر سپرنٹنڈنٹ پولیس، میرٹھ، شری پی آر شرما، جونیر اسسٹنٹ، اسٹیٹ پلاننگ آرگنائزیشن، شری بلبیر سنگھ بیدی، سینیر سپرنٹنڈنٹ پولیس، علی گڈھ، شری بی پی بجرائے، سکشن آفیسر، ریاستی شکر کارپوریشن، شری رس بہاری لال، او۔ ایس ڈی، سکریٹریٹ، لکھنؤ، شری آر۔ کے سنگھ دیسی، ایڈیشنل ایس ڈی۔ ایم لکھنؤ، شری آر کے گپتا، پولیس ریڈیو انسپکٹر، انسپکٹر جنرل پولیس آفس، لکھنؤ، شری رادھے شیام شرما، ڈائرکٹر نگران ادارہ، لکھنؤ، شری لیلا دھر شرما، پروتی، ڈپٹی ڈائرکٹر، محکمۂ اطلاعات، شری وی۔ کے شرما، پرنسپل، ریاستی آیورویدک کالج، لکھنؤ، شری وی۔ این ماتھر، آفیسر انچارج، میونسپل بورڈ، علیگڈھ، شری شہزاد بہادر، ایگزیکیوٹیو انجینیر، محکمۂ آبپاشی، شری شیام لال، سینیر سپرنٹنڈنٹ پولیس، الہ آباد، شری ستیش چند، دیویدی، اپر ڈویژن اسسٹنٹ سکریٹریٹ، لکھنؤ، شری ستیش چندر دکشت سپرنٹنڈنگ انجینیر، محکمۂ تعمیرات عامہ، وارانسی، شری سیتا رام گپتا، گراف آرٹسٹ، محکمۂ مالیات، شری ایس۔ این پنڈت، ضلع مجسٹریٹ، علی گڈھ اور شری ایچ۔ کے مہرترا، جوائنٹ سکریٹری، محکمۂ مالیات۔

تقریب کا آغاز وزیر اعلیٰ کے استقبال میں محکمۂ تقرری کے سکریٹری شری غلام حسین کی تقریر سے ہوا۔ جلسے کے اختتام پر شری غلام حسین نے وزیر اعلیٰ کا شکریہ ادا کیا اور ایوارڈ حاصل کرنے والوں کو مبارکباد دی۔

⁂ ⁂ ⁂

ریاستی حکومت نے ہند-پاک جنگ میں کام آنے والے فوجیوں کی بیواؤں اور ان کے کنبوں کو اب تک ۲۲،۲۵ لاکھ روپیوں کے نقد انعامات، ۳۰،۱۶ ایکڑ زراعتی آراضی، مکانوں کی تعمیر کے لیے ۸۷ قطعات زمین، ۱۵۱۴ سلائی مشینیں اور ۲۷ تعمیر شدہ مکانات مہیا کیے۔

سابق فوجی ملازمین اور ان کے کنبوں کو تقریباً ۱۹ لاکھ روپیہ کے نقد انعامات کے علاوہ فاضل دفاعی اسٹاک سے ۱۲۲۵ گاڑیاں دی گئیں۔ معذور فوجی سپاہی بھی اسی اثنا میں تقریباً ۷۰۰۰ روپیہ کے نقد انعامات، ۱۴ رہائشی کوارٹر، ۴۸ ریاستی سرکاری ملازمتیں اور ۱۶ مرکزی ملازمتیں حاصل کر چکے ہیں۔

مذکورہ مراعات کے علاوہ ۸۵ بیواؤں اور معذور سپاہیوں کو پٹرول پمپوں اور مٹی کے تیل کے لائسنسوں اور ایجنسیوں کی منظوری بھی دی جا چکی ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

اترپردیش کے اکاؤنٹنٹ جنرل نے ریاستی حکومت کے حکم کے بموجب سرکاری افسران کو وقتاً فوقتاً مہنگائی بھتہ میں ہونے والے اضافے کو حاصل کرنے کا عام اختیار دیدیا ہے۔

ریاستی حکومت نے ۳۰۰ روپیہ ماہانہ سے ۱۲۰۰ روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پانے والے ملازمین کے مہنگائی بھتہ میں ۳ فیصد، ۶ فیصد، ۹ فیصد اور ۱۲ فیصد کی شرح سے یہ اضافہ بالترتیب یکم مئی ۱۹۷۳ء، ۸ اگست ۱۹۷۳ء، یکم اکتوبر ۱۹۷۳ء اور یکم جنوری ۱۹۷۴ء سے منظور کیے ہیں۔

مندرجۂ بالا عام اختیار گزشتہ ۲ فروری، ۴ اپریل اور ۱۳ مئی سے دیا گیا۔ ایسے تمام ریاستی سرکاری افسران جنھیں یہ اضافہ حاصل کرنے کا اختیار نہیں تھا وہ اب متذکرہ بالا اختیار کے حاصل ہو جانے کے سبب یہ اضافہ حاصل کر سکتے ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

سیاحوں، تعطیلات منانے والوں اور سیر و سیاحت کے دلدادہ افراد کی تفریحِ طبع کیلیے لکھنؤ اور کانپور کے درمیان واقع نواب گنج جھیل

کو جلد ہی ایک تفریحی جنگل کی حیثیت سے ترقی دی جائے گی۔

مذکورہ تفریحی جنگل میں مختلف اقسام کے پیڑ، پودوں کے علاوہ متعدد دیگر سہولتیں بھی دستیاب ہوں گی جن میں ایک کیفے ٹیریا، ہرن پارک، پرتکلف ہاؤس بوٹیں اور دوسری چیزیں شامل ہیں، اس کے علاوہ ایک چھوٹے خوبصورت جزیرے کی تعمیر بھی کی جائے گی جس سے نہ صرف اس تفریحی جنگل کی دلکشی میں اضافہ ہو جائے گا بلکہ سیاح وہاں آرام کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اتر پردیش کے مختلف علاقوں اور پڑوسی ریاستوں سے اڑ کر آنے والے پرندوں کا بھی مظاہرہ کر سکیں گے۔

اس سے قبل لکھنؤ کے قریب کُکرائل میں ایک تفریحی جنگل کو ترقی دی جا چکی ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

ریاستی حکومت نے تنخواہ کمیشن کے دائرہ عمل میں آنے والے ریاست کی شہری لوکل باڈیز کے تمام کل وقتی باقاعدہ ملازمین، ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کالجوں کے غیر تدریسی عملہ کو ریاست کے سرکاری ملازمین کو ملنے والے مہنگائی بھتے کے مساوی مہنگائی بھتہ دینا منظور کر لیا ہے۔

مذکورہ منظور شدہ مہنگائی بھتہ گزشتہ یکم جنوری سے ان تمام ملازمین کو ملے گا جو ۳۰۰ روپیہ سے ۱۲۰۰ روپیہ ماہانہ تنخواہ پا رہے ہیں۔

ایسے ملازمین جو ۳۰۰ روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پاتے ہیں انھیں ۱۷ فیصد کی شرح سے مہنگائی بھتہ ملے گا جبکہ ۳۰۰ سے ۹۰۰ روپیہ کے درمیان تنخواہ پانے والے ملازمین کو ۱۲ فیصد کی شرح سے کم سے کم ۴۸ روپیہ اور زیادہ سے زیادہ ۱۰۸ روپیہ ماہانہ مہنگائی بھتہ ملے گا۔ ایسے ملازمین کو جو ۹۲۷ روپیہ سے زیادہ اور ۱۲۰۰ روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پاتے ہیں وہ ۱۸ روپیہ ماہانہ مقررہ مہنگائی بھتہ پانے کے مستحق ہوں گے۔ یہ مہنگائی بھتہ تمام شہری لوکل باڈیز ملازمین کو ملے گا خواہ انھوں نے پرانی شرح تنخواہ قبول کی ہے یا نئی شرح۔

⁂ ⁂ ⁂

اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ کے ملازمین کے عارضی مہنگائی بھتہ میں گزشتہ یکم اپریل سے ۲۵ء۸ روپیہ ماہانہ کے اضافہ سے متعلق بجلی بورڈ کے حالیہ فیصلہ سے تقریباً ۷۰ ہزار ملازمین مستفید ہوں گے۔ یہ اضافہ گزشتہ مارچ کو ختم ہونے والے ہفتہ میں صارفین کی کل ہند قیمت اشاریہ کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

اس اضافہ سے مرکزی، اجرت بورڈ کی سفارشات پر ترمیم شدہ شرح تنخواہ کے بموجب ۷۵۰ روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پانے والے تمام باقاعدہ اور عارضی ملازمین جن میں "کیسا" اور سابق لائسنس یافتہ ایسے نجی اداروں کے ملازمین شامل ہیں جنھیں حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے، مستفید ہوں گے۔ اس کے علاوہ یومیہ اجرت پانے والے اور مسٹر رول ملازمین کو چھوڑ کر ورک چارج ملازمین کو بھی اضافہ کی یہ رقم ملے گی۔

⁂ ⁂ ⁂

حکومت اتر پردیش نے ایک اعلانیہ کے ذریعہ گذشتہ ۲۹ اپریل سے موٹر اسپرٹ، ڈیزل آئیل اور الکوہل پر ٹیکس کی شرح ۱۰ پیسے کے بجائے ۴۰ پیسے کر دی ہے۔ اس اقدام سے ریاستی خزانہ میں ۱۷۱ کروڑ روپیہ کی مزید آمدنی متوقع ہے۔

اس سلسلے میں گزشتہ ۲۳ اپریل کو اتر پردیش میں موٹر اسپرٹ، ڈیزل آئیل اور الکوہل کی فروخت پر بکری ٹیکس (ترمیمی) آرڈی ننس ۱۹۷۴ء نافذ کیا گیا تھا تاکہ الکوہل کو بھی ٹیکس کے دائرہ عمل میں لایا جا سکے۔ اس آرڈیننس کے تحت ریاستی حکومت کو فی لیٹر اسپرٹ پر ۲۵ پیسے، ڈیزل آئیل پر ۱۰ پیسے اور الکوہل پر ۹۰ پیسے کی شرح سے ٹیکس میں اضافہ کا اختیار دیا گیا تھا۔

اعلانیہ کے بموجب یہ ٹیکس پہلی فروخت پر موٹر اسپرٹ کے معاملہ میں فی لیٹر ۲۵ پیسے، ڈیزل آئیل پر فی لیٹر ۱۰ پیسے اور الکوہل کے معاملہ میں فی لیٹر ۴۰ پیسے کی شرح سے عائد کیا جائے گا۔ اب تک یہ ٹیکس موٹر اسپرٹ پر فی لیٹر ۱۰ پیسے، اور ڈیزل پر فی لیٹر سات پیسے کی شرح سے واجب الادا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

ریاست کے دیہی علاقوں میں معاشی اور سماجی طور پر پسماندہ تقریباً ۱۵۰ عورتوں کو ہر سال دستکاری کی تربیت دینے کے لیے ۱۰ لاکھ روپیہ کی ایک اسکیم پہلی بار شروع کی جائے گی۔ اس تربیت کا مقصد عورتوں کو خود کفیل بنانا اور ان کے خاندان کی آمدنی میں اضافہ کرنا ہے۔ اس اسکیم کے تحت ریاستی محکمۂ سماجی فلاح، بلیا

پرتاب گڑھ، جونپور، اعظم گڑھ اور بہرائچ کے اضلاع میں پانچ ماڈل ٹرینگ سنٹر قائم کرے گا۔ جن میں سے ہر ایک میں کم سے کم ۳۰ عورتوں کو تربیت دی جائے گی۔ ایک سال کی مدت کے اس تربیتی کورس کے دوران ۲۵ روپیہ ماہانہ کا وظیفہ دیا جائے گا۔

اب تک اس قسم کے پروگرام رضاکار تنظیموں کی طرف سے صرف شہری علاقوں میں چلائے جا رہے تھے۔

⁂ ⁂ ⁂

ریاستی محکمۂ جنگلات، اتر پردیش کے مغربی اضلاع، خاص طور پر آگرہ اور متھرا کے بعض علاقوں میں جہاں راجستھانی ریگستان کے پھیلنے کے خطرات پیدا ہو گئے ہیں، اس سلسلے میں روک تھام کے خصوصی اقدامات کر رہا ہے۔ اس منطقے میں شجر کاری کا کام جاری ہے۔ تاہم مذکورہ محکمہ کے پاس زمین کی عدم دستیابی کے باعث شجر کاری خاطر خواہ رفتار سے نہیں ہو پا رہی ہے۔ اس سلسلے میں حائل دشواریوں کو دور کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

جنگلات میں درختوں کو غیر قانونی طور پر کاٹنے والے عناصر کی روک تھام کے پیش نظر پانچویں پنج سالہ منصوبہ کے دوران جنگلات کے منطقے میں ۱۰ مسلح دستے قائم کئے جائیں گے جو آتشیں اسلحہ سے لیس ہوں گے۔

متفرقات

اتر پردیش میں نئی شکر ملوں کا قیام : اتر پردیش میں چار شکر ملوں کے قیام کے لیے جائے وقوع کے انتخاب اور ساز و سامان کی فراہمی سے متعلق احکامات جاری کرنے کے واسطے ابتدائی اقدامات کئے جا چکے ہیں۔ یہ شکر ملیں نند گنج (غازی پور) چھاتا (متھرا) چاند پور (بجنور) اور دریاؤ (رائے بریلی) میں قائم کی جائیں گی۔

ان میں سے ہر شکر مل پر تقریباً پانچ کروڑ روپیہ کی لاگت متوقع ہے۔ ان ملوں کی گنا پیرنے کی صلاحیت تقریباً ۱۲۵۰ ٹن یومیہ ہوگی اور یہ ملیں ۸۰۰ سے ۹۰۰ افراد کو روزگار مہیا کریں گی۔

مجاہد آزادی کا خاندان قرض کی ادائیگی سے مستثنیٰ ریاستی حکومت نے ضلع بلیا کے نامور آنجہانی مجاہد آزادی چیتو پانڈے کے خاندان کو اس پر واجب الادا ۷ء۶۵۳۲۲ روپیہ کے قرضے کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ یہ قرضے تقریباً دس سال قبل ایک کولھو کی خریداری اور ایک پمپنگ سیٹ اور ٹیوب ویل لگانے کے لیے حاصل کیے گئے تھے۔ یہ فیصلہ اتر پردیش کابینہ مسٹر پانڈے کی قربانیوں اور ان کے خاندان کے ناسازگار حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا گیا۔ کیونکہ اس وقت ان کے خاندان میں کوئی بالغ مرد نہیں ہے۔

پبلک سروس کمیشن کے امتحانات کی فیس میں چھوٹ ۔ اتر پردیش پبلک سروس کمیشن کے زیر انتظام منعقد ہونے والے مقابلے کے امتحانات اور انٹرویو میں شرکت کے لیے اقوام و قبائل مندرجۂ فہرست کے امیدواروں کو اب مقررہ فیس کی صرف ایک چوتھائی رقم دینا ہوگی۔ امتحان کی فیس میں یہ چھوٹ یکم اپریل ۱۹۷۴ء سے نافذ تصور کی جائے گی۔ ان امیدواروں کو اب تک مقررہ فیس کی ایک تہائی رقم دینا پڑتی تھی۔

درخواستوں کے مقررہ فارم اور درخواست کی فیس کی موجودہ شرحیں بدستور جاری رہیں گی۔

آتشزدگی سے متاثر افراد کو مزید مالی امداد ۔ حکومت اتر پردیش نے آتشزدگی سے متاثر افراد کو مفت مالی امداد مہیا کرنے کے لیے ریاست کے ۱۵ اضلاع کے لیے مزید ۴ء۷۵ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی ہے۔ اس طرح منظور شدہ رقم ۲۵ لاکھ روپیہ سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کے مختلف اضلاع کو امدادی کام سے متعلق دیگر متفرق مصارف کی تکمیل کے لیے ۵۲ ہزار روپیہ مخصوص کیے گئے ہیں۔

کمزور طبقوں کے لیے ریاستی حکومت کے کنٹرول کا کپڑا حالیہ فیصلہ کے بموجب کنٹرول کا کپڑا شہری علاقوں کے ۳۰۰ روپیہ ماہوار آمدنی والوں اور ایک ایکڑ کی جوت رکھنے والے کاشتکاروں کو ہی دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ سماج کے کمزور طبقوں کی مشکلات کو کم کرنے کی غرض سے کیا گیا ہے۔ شہری اور دیہی دونوں علاقوں میں کنٹرول کا کپڑا صرف راشن کارڈ پر دیا جائے گا۔ دیہی علاقوں میں راشن کارڈوں کے اجرا کا کام مکمل ہو چکا ہے

★

REGD. No. LW/NP 17

نیا دور

اگست ۱۹۷۴ء

۵۰ پیسے

وزیر اعلیٰ اتر پردیش
شری ہیم وتی نندن بہوگنا گزشتہ
۲۹ جون کو شمالی کوریا کے سفیر
شری یو سانگ جس سے ان کی لکھنؤ
تشریف آوری پر گفتگو کرتے ہوئے



وزیر اعلیٰ [illegible] شری ہیم وتی نندن بہوگنا ۱۳ جون ۱۹[illegible] کو لکھنؤ میں ایک سادہ تقریب میں اردو کے نامور ادیب شاعر و نقاد نگار
[illegible] جو اردو [illegible] ایک [illegible] عطا کرتے ہیں



۱۹ء

ہماری آزادی از سر نو ملک کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دینے کی متقاضی ہے

یوم آزادی کے موقع پر گورنر شری اکبر علی خان کا پیغام



آزادی کی ۲۷ ویں سالگرہ کے موقع پر میں اپنی جانب سے نیز اپنی حکومت کی جانب سے ریاست کے عوام کو مبارکباد اور ان کی خوشحالی اور بہبودی کے لیے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

آج کے اس مبارک موقع پر ہمارا اولین فریضہ ہے کہ ملک کی آزادی حاصل کرنے اور اس کو مضبوط بنانے کے لیے جن عظیم شخصیتوں نے قربانیاں دیں، تیاگ اور ایثار کا مظاہرہ کیا، ان کی یاد میں ہم ادب کے ساتھ خراج عقیدت پیش کریں۔ وطن کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے والوں کی زندگی، ان کی قربانی اور ان کی خدمات وطن کی خدمت کے واسطے ہمارے لیے مشعل راہ ہے اور ہم کو نئی قوت عمل عطا کرتی ہے اور ہم اس سے ہمیشہ ہی تحریک حاصل کرتے رہیں گے۔

ہماری آزادی کی زندگی کا ۲۶ واں سال جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں کافی مشکلوں اور پریشانیوں کا سال رہا ہے۔ روزمرہ کی استعمال کی چیزوں کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے عوام کو بے حد دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ گزشتہ سال کم بارش ہونے کی وجہ سے رہاند ذخیرۂ آب پوری طرح سے بھر نہ سکا اور ریاست بھر میں بجلی کی سخت قلت ہو گئی تھی۔ یہ دقتیں ایسی ہیں جو ہماری ترقی کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کر رہی ہیں، بالخصوص طور پر بجلی کی کمی کی وجہ سے زراعت اور صنعتوں کو زبردست نقصان پہنچ رہا ہے۔

ریاستی حکومت نے عوام کے اشتراک سے ان تمام دقتوں کا بڑی مستعدی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ سستے غلے کی دکانوں پر راشن کی مقدار بڑھا کر فی یونٹ ۸ کلو کر دی گئی اور پوری ریاست میں تھرمل پاور اسٹیشنوں کی پیداواری صلاحیت ۵۶ فیصد سے بڑھا کر ۸۰ فیصد کر دی گئی جو کہ ہمارے ملک میں ایک ریکارڈ ہے۔ اس کے علاوہ دوسری پڑوسی ریاستوں سے بجلی حاصل کر کے صارفین اور زراعت نیز صنعتوں کی ضروریات کو پورا کیا گیا۔

ہماری حکومت نے گزشتہ سال سے چور بازاری، ذخیرہ اندوزی اور بدعنوانی کے خلاف ایک زبردست مہم شروع کی ہے جس کے تحت اب تک ہزاروں اشخاص قانون کی گرفت میں لا کر کافی بڑی مقدار میں صارفین کے عام استعمال کی چیزیں مثلاً گیہوں، چاول، شکر، بناسپتی گھی، سیمنٹ، صابن وغیرہ اشیاء برآمد کی گئیں۔ یہ مہم ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ جب تک چور بازاری اور بدعنوانی کا خاتمہ نہیں ہوتا اس وقت تک نہ تو ہماری موجودہ مشکلات ہی دور ہوں گی اور نہ سوشلزم کی بنیاد پر دولت کی مساوی تقسیم ہی ممکن ہو سکے گی۔ ایسی صورت میں ریاست کے عوام سے میں اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے حکومت سے پورا پورا تعاون کریں۔ میری یہی خواہش ہے۔ ہماری مرکزی حکومت نے وزیر اعظم کی قیادت میں افراط زر کی روک تھام نیز ضروری اشیاء کی قیمتوں میں کمی کرنے کے لیے کافی بڑے پیمانہ پر جو کارروائیاں شروع کی ہیں ان کو کامیاب بنانے میں ہماری ریاست کسی سے بھی پیچھے نہ رہے۔

ریاست کے عوام کو میں ایک بار پھر مبارکباد دیتا ہوں اور اپیل کرتا ہوں کہ وہ ریاست میں امن و امان برقرار رکھتے ہوئے زراعت اور صنعتی میدان میں مزید محنت سے ان کی پیداوار بڑھائیں۔ ضروری اشیاء کی پیداوار بڑھا کر ہی ہم اپنے ملک اور ریاست کی خوشحالی میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ پیداوار اسی وقت بڑھائی جا سکتی ہے جب ہم سب لوگ باہمی میل ملاپ اور بھائی چارہ کے جذبہ کے تحت دن رات محنت کریں گے۔ آزادی کا تقاضہ ہے کہ ہم آج کے دن از سر نو ملک کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیں۔ جے ہند۔

جمہوریت دشمن عناصر اور انتشار پھیلانے والی طاقتوں سے ہوشیار رہیے

یومِ آزادی کے موقع پر وزیرِ اعلیٰ شری بہوگنا کا پیغام



ہمارا ملک اس وقت انتہائی مشکل حالات سے گزر رہا ہے۔ یوں تو ایک نومولود قوم کی زندگی میں مشکلات کا ہونا فطری امر ہے اور ان مشکلات سے گھبرانا یا خوف زدہ ہونا تو دور کی بات ہے ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہ دشواریاں اور رکاوٹیں ہماری ہمت، ہماری قوت اور صلاحیت کے لیے چیلنج بن کر ہمارے سامنے آتی ہیں اور ہم کو ان پر قابو پانے اور ان پر حاوی ہونے کے لیے ملک کی خاطر ایثار اور قربانی کے اعلیٰ جذبات سے کام لینے کا حوصلہ ملتا ہے لیکن موجودہ مشکلات کچھ ایسی ہیں جن کو بخوبی سمجھ کر ہی ہمیں آگے بڑھنا ہے۔

حصولِ آزادی کے بعد گزشتہ ۲۵ سال سے ہم ملک میں معاشی آزادی کی جو لڑائی لڑ رہے ہیں یا دوسرے الفاظ میں دولت بڑھا کر عوام کی خوش حالی کے لیے جو جد و جہد کر رہے ہیں وہ آج ایک تاریخی موڑ پر پہنچ گئی ہے۔ وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی جرأت مندانہ قیادت میں گزشتہ پانچ برس سے ملک میں سماج وادی نظام کے قیام کی جانب جس ٹھوس اور فعال پالیسی پر عمل کیا جا رہا ہے اس نے مفاد پرستوں اور موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی تبدیلی یا رد و بدل نہ چاہنے والے لوگوں میں کھلبلی پیدا کر دی اور موجودہ حالات کو جوں کا توں بنائے رکھنے کے لیے بری طرح ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ پرامن سماج وادی انقلاب کی مخالفت کرنے والے ان مفاد پرستوں کی پشت پر بڑی بڑی طاقتیں ہیں۔ دائیں بازو کی رجعت پسند سیاسی پارٹیاں اور بائیں بازو کی موقع پرست پارٹیاں اپنی نام نہاد عوامی تحریکوں کی آڑ میں مفاد پرست اور رجعت پسند طاقتوں کی ہمت افزائی کر رہی ہیں۔ اس سازش کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ صنعتی اور دیگر کارخانوں کے مزدوروں کو ہڑتال پر اکسا کر اور تعلیم کے میدان میں بے چینی کی فضا پیدا کر کے سماج وادی جانب بڑھنے والے ہمارے ملک کی ترقی کو روک دیا جائے جس سے مفاد پرستوں کو آزادانہ لوٹ کھسوٹ کا موقع مل سکے۔

ایسے بحرانی حالات اور پرخطر ماحول میں یومِ آزادی کے موقع پر پیغام نشر کرنے میں تکلفات کا استعمال میں مناسب نہیں سمجھتا۔ ہماری آزادی اور جمہوریت آج خطروں سے دوچار ہے۔ ہم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم اپنی پوری قوت سے اس قومی بحران سے نبرد آزما ہوں۔ یہ مقابلہ ہمیں ایک وقت میں دو محاذوں پر کرنا ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں اُن طاقتوں سے نپٹنا ہے جو مفاد کے حصول کی خاطر امن و امان درہم برہم کرنا چاہتی ہیں۔ انتشار اور بدامنی ہماری ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس لیے ان حرکتوں میں جو لوگ حصہ لیتے ہیں یا جو ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں وہ ہمارے دشمن ہیں، وہ ہمارا بھلا نہیں دیکھنا چاہتے۔ ریاست کے عوام بدامنی پھیلانے والے ان عناصر سے ہمیشہ ہوشیار رہیں گے، مجھے اس کی پوری توقع، بلکہ یقین ہے۔

ہمارا دوسرا محاذ سماج دشمن ناپسندیدہ عناصر کے خلاف ہے۔ ریاست میں گزشتہ آٹھ ماہ سے چور بازاری، منافع خوری، اسمگلنگ اور انتظامیہ میں بدعنوانیوں کے خلاف ایک زبردست مہم جاری ہے۔ اس مہم کے ٹھوس نتائج نکلے ہیں۔ ہم اس تحریک کو اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک ہماری سماجی اور انتظامی زندگی صاف ستھری بن کر ان سماجی برائیوں سے ہم کنار نہیں ہو جاتی۔ آج کے جشنِ آزادی کے تہوار کے موقع پر میں ریاست کے عوام سے اپیل کرتا ہوں، انھیں دعوت دیتا ہوں کہ آئیے ہم سب مل جل کر اپنی زندگی کو پاک صاف اور فرض شناس بنائیں کہ کوئی ہم پر انگشت نمائی کی جرأت نہ کر سکے۔

تیسرا اور سب سے اہم مورچہ معاشیات کے تمام زمروں میں پیداوار بڑھانے کا ہے جیسا کہ میں نے شروع میں کہا حالات بہت سنگین ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری بات یہ ہے کہ جو بھی کام ہمیں سونپا گیا ہے اس کو مقررہ وقت سے قبل ہی مکمل کر دیں۔ اس کے لیے ہمیں اپنے ملک کی ان زندہ روایات سے سبق حاصل کرنا ہوگا جس پر ہر زمانے میں ارجن نے عمل کیا تھا۔ "کاریم سادھیامی دیہم وا پاتیامی"

ہندوستان کی یہی روایت ہے جس سے متاثر ہو کر راشٹر پتا مہاتما گاندھی نے جنگِ آزادی کے دوران "کرو یا مرو" کا نعرہ دیا تھا۔ حصولِ آزادی کے بعد ہمارے جوان بھی اسی جذبہ کے تحت سرحدوں پر حملہ آوروں کے چھکے چھڑاتے رہے ہیں۔ دورِ حاضر کا تقاضہ یہ ہے کہ آزاد ہندوستان کا ہر شہری اسی جذبہ کے تحت اپنے اپنے کام میں منہمک رہے۔ یاد رہے کہ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو تاریخ اور آنے والی نسلیں ہمیں کبھی بھی معاف نہ کریں گی۔

میں ریاست کے عوام کو آج کے اس مبارک تہوار کے موقع پر مبارک باد دیتا ہوں اور ان سے امید کرتا ہوں کہ موجودہ حالات میں آزادی کے تقاضوں اور وقت کے مطالبوں کو نظر انداز نہ کریں گے۔

ماہنامہ
نیا دور
لکھنؤ

جلد ۳۰	شمارہ ۵

اگست ۷۴ء

ایڈیٹر خورشید احمد
جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

ناشر ستیہ پرکاش بھٹناگر
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ سو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اترپردیش

قیمت فی شمارہ پچاس پیسے
زر سالانہ پانچ روپے
ترسیل زر کا پتہ سپرنٹنڈنٹ انفارمیشن (سی) ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

پندرہ اگست ہر سال ایک قومی تہوار کی حیثیت سے منایا جاتا ہے اس لیے کہ آج ہی کے دن ۲۷ سال قبل ۱۹۴۷ء میں ہندستان نے غلامی کی زنجیریں توڑ کر ایک انوکھے انداز میں آزادی حاصل کی۔ آزاد ہونے والی کسی قوم کی تاریخ میں یہ نہیں ملتا کہ وہ خون خرابے کے بغیر آزاد ہوئی ہو۔ یہ امتیاز ہندستان کو حاصل ہے کہ اس نے برطانیہ جیسی طاقتور سلطنت سے خونریزی یا میدان جنگ میں اسے شکست دے کر آزادی حاصل کرنے کے بجائے اہنسا کے ذریعے آزادی حاصل کی۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ یہ آزادی ہمیں بلا جد و جہد کیے، بلا قربانیاں دیے اور بلا سختیاں جھیلے مفت ہاتھ آگئی۔ ایسا نہیں ہے۔ یوں تو ابتدا ہی سے یہ کوششیں شروع ہوگئی تھیں کہ غیر ملکیوں کے بحیثیت حاکم اس سرزمین پر قدم جمنے پائیں لیکن ۱۸۵۷ء سے کم و بیش ایک سو سال تک تو لگاتار ہندستانی قوم نے جد و جہد کی ہے، سختیاں جھیلی ہیں، اپنی اور اپنے ناموس کی عزت و آبرو کی قربانی دی ہے۔ دار و رسن کی منزلوں سے گزری ہے، موت کو گلے لگایا ہے تب جاکر ۱۹۴۷ء میں عروس آزادی سے ہمکنار ہوئی ہے۔ ہندستان کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ آزاد ہونے کے بعد سے اس کو جس قدر مشکلات اور ہمت شکن حالات کا سامنا کرنا پڑا اور اپنی آزادی کی مختصر سی مدت میں جتنی دفاعی جنگیں لڑنا پڑی ہیں، نئے آزاد ہونے والے کسی ملک کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن حوصلہ ہارنے اور ان مشکلات سے شکست تسلیم کرنے کے بجائے ہندستان نے نہایت عزم و استقلال سے ان کا مقابلہ کیا اور ہر میدان میں پیش رفت کی ہے۔ آج بھی جب کہ ہماری آزادی کو ۲۷ سال گزر چکے ہیں اور ہندستان سوشلسٹ طرز کے سماج کی تعمیر اور خود کو صنعتی و اقتصادی اعتبار سے مضبوط و طاقتور بنانے، سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی دینے میں مہاشکتی، ایک نئی ترقی پسند طاقت، ایک نیا چیلنج، ایک نیا خطرہ سد راہ بن کر تعمیر ترقی کی ان ساری کوششوں، محنتوں اور اب تک کی ساری کارگزاریوں پر پانی پھیر دینا چاہتا ہے۔ وہ نیا خطرہ اور چیلنج ہے موجودہ سرمایہ دارانہ اور اجارہ دارانہ نظام میں کوئی تبدیلی نہ چاہنے والے مفاد پرستوں اور سوشلسٹ انقلاب کی طرف بڑھتی ہوئی رَو کو روک دینے کی کوشاں انتشار پسند طاقتوں کا۔ اگر ملک میں سوشلسٹ نظام کی بنیادوں کو مستحکم بنانا اور اسے فروغ دینا ہے، دولت کی مساوی تقسیم ہونا ہے، معاشی اعتبار سے ہندستان کو ترقی یافتہ اور خود کفیل بنانا ہے تو ہمیں ہر جگہ امن و امان برقرار رکھنا اور انتشار پسند عناصر اور ان کی ریشہ دوانیوں کو شکست دینا ہوگا۔ چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، منافع بازی، اسمگلنگ اور رشوت ستانی کی لعنت کو ختم کرنا ہوگا اور کھیتوں کھلیانوں، صنعتی اداروں اور پیداواری مرکزوں میں پیداوار بڑھانا ہوگی۔ یہ وہ تین محاذ ہیں جن پر فی الفور لڑکر ہمیں راستہ صاف کرنا اور سماج واد کے کارواں کو آگے بڑھانا ہے۔ اگر اس وقت ہم نے اس میں کوتاہی کی تو ہم اپنی آزادی اور جمہوریت کو درپیش خطرے سے بچا نہ سکیں گے اور آنے والی نسلیں اس کے لیے ہمیں کبھی معاف نہ کریں گی۔

اس لیے آیئے آج کے اس مبارک موقع پر ہم عہد کریں کہ ہمیں جو کام سونپا گیا ہے، ہم پر جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں انھیں ہم وقت سے پہلے ہی دیانتداری کے ساتھ انجام دیں گے اور سماج دشمن و تخریب پسند عناصر کی سرگرمیوں کو ناکام بناکر آزادی اور جمہوریت کے تئیں اپنے فرائض کو پورا کریں گے۔

نکسن کی علاحدگی

امریکا کے صدر مسٹر نکسن کو بالآخر "واٹر گیٹ" کے معاملے، دروغ بیانی سے کام لینے، اپنی قابل گرفت سرگرمیوں کو چھپانے کی کوشش کے سلسلے میں صدارت سے استعفیٰ دے ہی دینا پڑا۔ مسٹر نکسن امریکہ کے پہلے صدر ہیں جنھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا ہے۔ ان کے پیش رو ۳۶ صدروں میں سے ۲۸ نے اپنی میعاد صدارت پوری کرلی، چار برسر اقتدار رہتے ہی قتل کردیے گئے، جن کے نام ہیں ابراہم لنکن، جیمس گارفیلڈ، ولیم میکنلے اور جان کنیڈی۔ باقی چار اپنے عہدے کے دوران قدرتی موت سے فوت ہوئے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ ولیم ہیرسن، زیکری ٹیلر، وارن ہارڈنگ اور فرینکلن ڈی۔ روزولٹ۔

صدر نکسن ۱۹۷۲ء میں جس طرح بڑی اکثریت سے منتخب ہوئے تھے اسی شکل کے ساتھ انھیں ہٹنا بھی پڑا، شاید یہی احساس تھا جس کی بنا پر وہ ٹیلی ویژن بیان دینے سے قبل روئے اور آواز بلند دیر تک روئے جیسا کہ ایک خبر رساں ایجنسی نے اطلاع دی ہے۔ بہرحال مسٹر نکسن کے استعفے سے امریکی جمہوریت کے گرد پھیلی ہوئی تاریکی دور ہوجائے گی اور اس فیصلے سے امریکا کی فوت اور اس کے نصب العین کو جو دھچکا پہنچا ہے اسے کالعدم کرنے اور اس کے وقار کو جلد بحال کرنے میں مدد ملے گی۔ استعفیٰ دے کر مسٹر نکسن نے خود کو مواخذہ کی کارروائی سے بھی بچا لیا ہے۔

—— ایڈیٹر

علی جواد زیدی

اردو میں رامائن

غزلوں کے غلغلے میں دوسرے اصنافِ سخن دب گئے تھے ان کی بازیابی کا سلسلہ اب شروع ہوا ہے۔ اسی طرح بعض اصنافِ سخن پر مذہبیت کا غلط لیبل لگا کر ان سے بے اعتنائی برتی گئی۔ حالانکہ عالمی ادب میں بہت سے کلاسیکی اہمیت کے حامل ادب پارے ایسے ہیں جن کی تحریک مذہب یا روحانیت سے ملی تھی۔ ہمارے قومی ادب میں رامائن اور مہابھارت دو ایسے عظیم رزمیے ہیں جن کی نظیر نہیں۔ ان کے محرکات بھی مذہب و تاریخ و ادب ہیں۔ ان کی چھاپ ہر ہندستانی زبان پر پڑی ہے۔ اردو کا ان عظیم ادبی کارناموں سے محروم رہنا ناممکن تھا۔ جو علاقہ اردو کا خاص گہوارہ ہے اس میں رامائن کی مقبول ترین شکل تلسی داس کی رام چرت مانس رہی ہے۔ یہ گھر گھر خلوص و عقیدت سے پڑھی جاتی ہے۔ قدیم ترین شکل والمیکی کی سنسکرت رامائن کی ہے اس کا چلن نسبتاً بہت کم رہا ہے۔ مجموعی حیثیت سے کیا عالم اور کیا جاہل، کیا گاؤں نواسی اور کیا شہر کا باسی، کیا اردو والا اور کیا تامل اور تیلگو والا، ایسا کون ہوگا جسے رامائن کے بلند قامت کرداروں کی داستان سے ایک سرسری سی واقفیت بھی نہ ہو۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی اس عظیم رزمیے نے بیحد متاثر کیا ہے اور اس تاثر کے نشانات نظم و نثر میں بکھرے پڑے ہیں۔ اس کے باوجود ہم میں سے کم ہی ہوں گے جنھوں نے اردو زبان کی رامائنوں کا مطالعہ تو کیا ان کا ذکر بھی سنا ہو؟ جب آج کوئی یہ کہتا ہے کہ اردو میں رامائن کی ایک درجن سے اوپر روایتیں ہیں اور ان میں سے کم از کم ایک رامائن منظوم ۱۹۲۴ء تک سولہ بار صرف مطبع نول کشور سے چھپ چکی ہے تو وہ حیرت اور استعجاب سے یوں منہ تکنے لگتے ہیں جیسے انھیں اس پر یقین نہ آ رہا ہو۔

رامائن کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا ایک اہم ذریعہ ڈاکٹر محمد عزیز کی کتاب اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ ہے۔ اس کی نوعیت زیادہ سے زیادہ ببلیوگرافی کی ہے جس میں بیحد بیش بہا معلومات یکجا کر دی گئی ہیں اور ہندو مذہب، عیسائیت، جین مت، بدھ مت، سکھ دھرم، زرتشتیت اور بہائیت کے بارے میں لکھی ہوئی کتابوں کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ ان میں سے کچھ ترجمے ہیں کچھ مناظرے کی کتابیں ہیں اور کچھ تشریح و تعبیر کے لیے وقف ہیں۔ ڈاکٹر محمد عزیز نے رامائن کی سات روایتوں کا ذکر کیا ہے لیکن ایک کا نام وہ معلوم نہ کر سکے اور گارسین دتاسی کی ثانوی معلومات پر بھروسہ کر لیا۔ میرا خیال ہے کہ ۱۸۶۶ء میں شائع ہونے والی یہ کتاب رامائن فرحت ہے۔ محمد عزیز نے گارسین دتاسی کے اس بیان پر کہ ۱۸۶۶ء میں رامائن کا ترجمہ چھپا تھا یہ قیاس کر لیا ہے کہ وہ سب سے پہلا ترجمہ ہے۔ حالانکہ خوشتر کا ترجمہ جس کا وہ سب کے آخر میں ذکر کرتے ہیں۔ ۱۸۵۱ء میں مکمل ہو چکا تھا۔ انھوں نے جن سات روایتوں کا ذکر کیا ہے ان میں دو والمیکی کی سنسکرت زبان کی رامائن کے اردو میں نثری ترجمے ہیں۔ ایک ترجمہ پرمیشر دیال کا ہے۔ اس میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے آئے ہیں۔ یہ ترجمہ ۱۹۱۵ء تک دو بار چھپ چکا تھا۔ دوسرا ترجمہ دوارکا پرشاد افق کا ہے۔ یہ ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے اور لاہور سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ انھیں بھی فرحت

کی طرح محاوروں کے استعمال کا شوق ہے۔ صرف نظم و نثر کا فرق ہے۔ دو ترجمے رام چرت مانس کے منظوم وہی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے یعنی خوشتر اور فرحت کے ترجمے بانکے بہاری لال بہار دہلوی ثم سیتاپوری نے بھی ایک رامائن لکھی ہے۔ یہ بالتلخیص ترجمہ ہے۔ خود کہا ہے:

ہے تلسی کرت تلسی داس جی کی

لکھا مطلب عبارت میں کمی کی

ایک اور رامائن سورج نرائن مہر دہلوی کی مترجمہ ہے۔ یہ دلی سے ۱۹۱۴ء میں چھپی۔ اگرچہ یہ رامائن تلسی داس جی کی رام چرت مانس پر مبنی ہے لیکن یہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس میں انھوں نے والمیکی رامائن ادھیاتم رامائن اور یوگ واسشٹ سے بھی مضامین لیے ہیں بن باس کی تیاریوں کا ذکر یوں کرتے ہیں:

کہہ کے یہ کوشلیا رونے لگیں   رام کو چھاتی سے لپٹا کر وہیں

جانکی آئیں اسی اثنا میں واں   اور یہ دیکھا انھوں نے بھی سماں

بیٹھیں چپکے اپنی گردن کو جھکا   سن چکی تھیں حال دل میں ڈر رہا تھا

رام جی جس وقت جنگل کو چلیں   دیکھیے ہمراہ مجھ کو لیں نہ لیں

راست بیانیہ انداز ہے۔ اصل سے قریب رہنے کی کوشش میں شعری خصوصیات سے توجہ ہٹی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں ادبی چاشنی کی کمی صاف محسوس ہوتی ہے لیکن یہ سب رامائن کے تراجم کا اور متعلقات کا ایک حصہ بھی نہیں ہے۔ یہاں تفصیل سے سب کا حال لکھنا ناممکن ہے۔ ان میں دوارکا پرشاد افق کی رامائن یک قافیہ ہے یعنی قصیدے کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ مرثیے کے طرز پر نہیں۔ ان کے علاوہ منشی جانکی پرشاد میکش جائسی کی رامائن منظوم ہے۔ اور بابا ساؤل داس متبحر جونپوری نے سرود رامائن لکھی۔ منشی کرشن سہائے ہنر گوردا سپوری کی رام کتھا شنکر دیال فرحت کی ادبھت رامائن اُن پرستزاد ہے۔ نانک چند نانک لکھنوی نے جو خود مرثیہ گو اور مشہور مرثیہ گو پیارے صاحب رشید کے شاگرد تھے رامائن نانک لکھی۔ یہ پوری رامائن مسدس کی شکل میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ خوب ہے۔ رام سہائے تمنا لکھنوی کا نام رامائن سے متعلق اردو ادب میں یادگار رہے گا۔ اس موضوع سے ان کو خاص شغف تھا اور اس موضوع کے گرد اُن کی کئی تصنیفیں گردش کرتی ہیں۔ ان کے اس محبوب موضوع پر ان کی تصانیف کے نام ہیں:

(۱) رام لیلا (۲) رام بھبوت بوٹی (۳) وچتر رامائن (۴) شکنتلا ولی رامائن (۵) نغمہ رامائن (۶) ترانہ رامائن (۷) سیتا پرتیاگ

پنڈت بشمبھر ناتھ سپرد صابر نے بھی رامائن کو نظم کرنا شروع کیا تھا لیکن وہ اسے تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ قدیم شعرا میں لالہ منسارام سرہندی سے رامائن مہاتم یادگار ہے۔ میرے ایک دوست کے بی شرما کا قول ہے کہ پنڈت رادھے شیام شرما نے بھی ایک منظوم رامائن لکھی تھی۔ میری نظر سے نہیں گزری۔ متفرقات میں سب سے مشہور اور جاذب توجہ پنڈت برج نرائن چکبست کی رام چندر کی رخصتی ہے جو رامائن کا ایک سین" کے عنوان سے معروف ہے۔ اختصار کے باوجود یادبی شاہکار ہے اور مصرعے مصرعے میں مسدس کے سب سے بڑے فن کار انیس کا رنگ جھلکتا ہے:

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام   راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام

منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام   دامن سے اشک پوچھ کے دل سے کیا کلام

اظہار بےکسی سے ستم ہوگا اور بھی

دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال   خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال

دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال   سکتہ سا ہوگیا ہے یہ ہے شدتِ ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے

گویا بشر نہیں ہے وہ تصویر سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بےگناہ   نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ

جنبش ہوئی لبوں کو بھری سرد ایک آہ   لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ

چہرہ کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا

ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں   میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں

سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں   لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں

جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سفید   اندھا کیے ہوئے ہے زر و مال کی امید

انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید　　سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثال بید
لکھی ہے کیا حیات ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

درگا سہائے سرور نے وہ منظر پیش کیا ہے جب سیتا جی رام سے ساتھ لے چلنے کا اصرار کر رہی ہے :

ہمراہ اپنے بن کو مجھے ناتھ لے چلو　　رکھا ہے تمھارے چرنوں کی ہوں ساتھ لے چلو
نازک ہے میرا شیشۂ دل ٹوٹ جائے گا　　چھوٹا تمھارا ساتھ تو جی چھوٹ جائے گا
راتیں نہ کٹ سکیں گی اکیلے فراق میں　　گھڑیاں وہ جس نے جھیلی ہوں جھیلے فراق میں
قسمت نے جب سے باپ کے گھر سے جدا کیا　　سوامی مجھے نہ تم نے نظر سے جدا کیا
پتلی کی طرح آنکھوں میں شام و سحر رہی　　پہلو میں بن کے صبر شکیب جگر رہی
صورت تمھاری دیکھ کے غم بھول جاؤں گی　　صحرا کے ساتھ رنج والم بھول جاؤں گی

کسی غیر ہندو کی لکھی ہوئی مکمل رامائن کا مجھے علم نہیں ہے لیکن سنڈیلہ ضلع ہردوئی کے حفیظ اللہ خاں ماسٹر نے انیسویں صدی کے وسط میں بال کانڈ اور سندر کانڈ کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ اتنا مقبول ہوا تھا کہ ۱۸۸۸ء میں تیسری بار شائع ہوا۔ بال کانڈ کے ایک حصے یعنی گنگا کی کتھا کا میں نے بھی ترجمہ بشکل مثنوی کیا تھا جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔
آج جب کہ ہم تلسی داس کی چوتھی صدی منانے جا رہے ہیں ہمارا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ ہم ان کتابوں میں سے چند کو از سر نو شائع کریں اور دوسروں کی ہمت افزائی کریں کہ وہ اس عظیم رزمیہ کو جدید زبان میں لکھ ڈالیں اور نئی نسل کے ہاتھوں میں اسے محفوظ کر دیں

اس سارے مواد کو ابھی تک ادبی نقطۂ نگاہ سے جانچا اور پرکھا نہیں گیا ہے۔ ہمارے معیار نقد بیشتر غزل اور اس سے کم قصیدے سے مستعار ہیں۔ دوسرے اصناف پر ان کو صرف منطبق کر لیا جاتا ہے۔ مثنویوں، بالخصوص مذہبی مثنویوں، نعتوں، مناجاتوں، منقبتوں وغیرہ کے لیے ابھی تک پیمانے بنائے ہی نہیں گئے ہیں۔ داستانی مثنویوں اور داستانوں کو پرکھنے میں بھی تفریق نہیں کی جاتی کیونکہ مثنویوں کے لیے کوئی معیار نقد بنا ہی نہیں ہے۔ مثنوی کے ڈھانچے میں جو عہد بہ عہد یا موضوعات کے اعتبار سے تبدیلیاں ہوئی ہیں، رزم بزم، محاکات، منظر آفرینی اور مکالموں وغیرہ کے لیے جو طریقے اپنائے گئے ہیں، تاریخی اعتبار سے جو انحرافات ہوئے ہیں ان پر بھی کھل کر گفتگو نہیں ہوئی ہے۔ سروری اور جعفری کی کوششیں ابتدائی تھیں اور ان کا تاریخی دائرہ بہت محدود تھا۔ ادھر ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور سید محمد عقیل نے گہرائیوں میں اترنے کی ہمت کی ہے لیکن کام بہت بڑا اور دقت طلب ہے۔ ایسی فضا میں صرف رامائن کے سلسلے میں یہ امید کیوں کی جائے کہ ناقدین نے تمام ضروری چھان بین کر لی ہوگی ؟

منظوم رامائن کی اکثر روایتیں مثنوی کی شکل میں ہیں۔ ان میں سے بعض روایتوں کو غیر معمولی مقبولیت ملی ہے، بعض اس پر سر دھنتے ہیں اور بعض سرسری تنقید سے ساری کوششوں پر پانی ہی پھیر دینا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں دو طرح کی متضاد رائیں سامنے آئی ہیں جو خوشتر نے اپنی رامائن کے بارے میں اگر یہ لکھا ہو کہ :

نہیں ہیں شعر یہ سلک گہر ہیں　　عذوبت میں برنگ نیشکر ہیں
نگاہ غور سے دیکھیں خردمند　　کہ دریا میں نے کوزے میں کیا بند

تو اس کو شاعرانہ تعلی سمجھ لیا جائے گا۔ لیکن اسی کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ۱۹۲۴ء تک اس کے سولہ ایڈیشن چھپ چکے تھے تو ہمیں اس قبول عام کے اسباب پر غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ایک ناقد نے خوشتر کی دلکش تشبیہات، استعارات اور صنایع و بدایع کا ذکر کیا ہے۔ جانکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ گرجا جی کی پوجا کو جاتی ہیں۔ یہ منظر دیکھیے :

کوئی خوشبو تھی کوئی یاسمن تھی　　کوئی نسریں تھی کوئی نسترن تھی
کوئی شکل سمن تھی نازک اندام　　کوئی سورج مکھی تھی کوئی گلفام
جو دیکھے ان کے گیسو پیچ در پیچ　　کہا سنبل نے اب ہے زندگی ہیچ
نظر آئے وہاں پہ رام و لچھمن　　بہ شکل آفتاب و ماہ روشن
خدا جانے ملک ہیں یا بشر ہیں　　بہ ظاہر صورت شمس و قمر ہیں
زہیں وہ ہمنشیں تھی شوخ و گستاخ　　دکھلائے دونوں گل در پردۂ شاخ
ہوئی سیتا جو دیکھے رام سے شاد　　نہ کی جنبش وہاں سے شکل شمشاد
ادھر سے رام نے سیتا کو دیکھا　　ہوئے سو جان دل سے اس پہ شیدا

دھنک کے ٹوٹنے پر پرسرام اور لچھمن میں جو مکالمہ ہوتا ہے اس

کو چابک دستی سے نظم کیا ہے۔ اسی طرح راجہ رام چندر اور کنبھ کرن کی جنگ کا نقشہ بھی خوبی سے کھینچا ہے۔ لیکن ڈاکٹر گیان چند جین کو زبان کے معرب و مفرس ہونے پر اعتراض ہے اور ان کو ان مثنویوں میں قدیم ہندو کلچر کے مرقعے نہیں ملتے۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی ہے کہ شعرا نے بیشتر ان کا قصہ فارسی کی معرفت لیا۔" اس میں شک نہیں کہ طوطا رام شایاں نے مہابھارت کو اردو کا جامہ پہناتے ہوئے فیضی کی فارسی اصل کو سامنے رکھا تھا لیکن خوشتر نے تو حرف بہ حرف تلسی داس کے رام چرت مانس کی پیروی کی ہے۔ یہی حال شنکر دیال فرحت لکھنوی کی رامائن کا بھی ہے۔ موخرالذکر غلاصہ ہے لیکن اس کی بنیاد رام چرت مانس پر بھی ہے۔ فرحت کی توجہ بھی صنایع و بدایع اور محاورہ بندی پر ہے۔ زبان وہی لکھتے ہیں جو ۱۸۶۶ء میں لکھی جاتی تھی۔ خوشتر نے پندرہ برس پہلے رامائن لکھی۔ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ واجد علی شاہ کے دفتر میں متصدی تھے اور درباری ماحول سے متاثر تھے۔ لیکن خوشتر کے مقابلے میں فرحت کے یہاں قصیدے کا رنگ کم ہے اور کلام زیادہ رواں ہے۔ وہ ثقیل الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر وہ منظر دیکھیے جب سیتا اپنی ساس کوشلیا سے رام کے ساتھ جانے کی اجازت مانگتی ہیں:

جناب جنکی نے جب سنا حال تو جوشِ گریہ سے آنکھیں ہوئیں لال
نہ تھا ضبط و شکیبائی کا یارا ہوئی شوہر کی فرقت ناگوارا
حیا نے آکے گو دامن لیا تھام مگر جوشِ محبت نے کیا کام
خیال آیا کہ ہمراہی میں رہیے صبا بن کے ہوا خواہی میں رہیے
پس پابوسی خوش دامن خاص ہوئیں حاضر براہ لطف و اخلاص
کہا مجھ کو بھی ارشادِ سفر ہو کہ تسکین دل و جان و جگر ہو
سنی جس دم یہ خوش دامن نے گفتار کیے دامن کے پرزے جیب کے تار

رام چندر جی دھنش توڑتے ہیں تو ایک ہنگامے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے:

دھنک کو توڑ کر پھینکا زمیں پر اندھیرا چھا گیا عرشِ بریں پر
ہوئے آثار محشر، مچ گیا شور چھپے گوشوں میں مرغ و ماہی و مور
پرندوں کے اڑے ہاتھوں کے طوطے یکایک چونک اٹھے دریا کے سوتے
جو من میں دیوتا پھولے جز و کل تو کی اوجِ فلک سے بارشِ گل

پھڑک اٹھے جنک، سیتا ہوئیں شاد خوشی سے خانۂ خاطر تھا آباد
بہ ہمراہ جلیساں حسب آئیں جناب جانکی محفل میں آئیں
لباسِ نو عروسی زینت بر با عطر و گلاب و مشک و عنبر
پسینے نے یہ زیور پر جلا کی ہوئی بو موتیوں پر موتیا کی
جناب رام کے پاس آکے فی الحال پنھادی پھول کو پھولوں کی جے مال
ہوئے شاداں دلِ ناشاد ہر سو مچا شورِ مبارک باد ہر سو

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ابتدائی رامائنوں میں خوشتر اور فرحت دونوں ہی نے اس کا خیال رکھا کہ ہندو، مسلم اور سکھ سبھی پڑھنے والے پوری طرح لطف اندوز اور محظوظ ہوں۔ عقیدت کی فضا کہیں مجروح نہیں ہونے پائی ہے۔ جب عقیدت اور بھگتی کا جذبہ طاری ہوتا ہے تو خوشتر یوں گویا ہوتے ہیں:

ہوئے سیتا خود اور سیتا ہوئیں رام ہوئے اس دن سے سیتا رام سرنام
کرے وردِ زباں جو کوئی یہ نام گلستانِ جہاں میں پائے آرام
نجات ہر بشر اس نام سے ہے کہ آخر کام سیتا رام سے ہے
عبادت کا نہیں ہے آج کل کام فقط کافی ہے سیتا رام کا نام
مقام نام کر لو دل کا گوشہ کہ راہِ آخرت کا ہے یہ توشہ

اسی طرح فرحت کی رامائن کا مطلع یہ ہے:

زباں پہ ہر نفس ہے رام کا نام نمو رامو، نمو رامو، نمو رام

اور ان کی ادھیت رامائن کا مطلع یہ ہے:

نثارِ بھگوتی باغِ سخن ہے ریاضِ شاعری گلشن آرین ہے

"جانکی بیجے" کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

طریقِ حمد میں ہو دل سبک سیر کہ سیتا رام سے ہے جان کی خیر

گنیش پران کا پہلا شعر یہ ہے:

بشنائے نمہ زباں سے نکلے ہر ہر لب اِنس و جان سے نکلے
ہر ہر مجھے یاد ہر سحر ہو شیو شیو کا نقش کالجہ ہو

اور "پدم پران" کا آغاز اس انداز سے ہوتا ہے:

ادم بشن بشنائے نمہ کہہ اے دل یاد بھگوتی میں رہ

کیا یہ سب سننے کے بعد یہ کہنا نامناسب ہوگا کہ ڈاکٹر گیان چند جین

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

غزل

سالک لکھنوی

جبیں پہ اپنی تری خاکِ سنگِ در بھر کے نقوش سجدہ کو دیکھا کیا نظر بھر کے

چمن بنا دیا میں نے حقیر دامن کو ترے غموں نے آنکھوں میں اشک بھر بھر کے

بجائے بیخودیِ شوق ہو گیا ہشیار یہ کس نے جام دیا عمرِ معتبر بھر کے

ترے جمال نے پھر دعوتِ نظارہ دی ابھی تو پلٹا تھا میں دامنِ نظر بھر کے

چراغ جل گئے دیکھا جو شامِ غم کی طرف نگاہ یاس میں رنگِ رُخِ سحر بھر کے

اُڑی جو میرے نشیمن کی خاک لیتی ہوئی رہ گرد لے گئی دامن میں کچھ شرر بھر کے

نہ جانے کس کے اشارے سے صحنِ گلشن میں گلوں نے پھینک دیا مٹھیوں میں زر بھر کے

ترے ہی دستِ کرم سے ملے، جو ملنا ہے میں کیا کروں گا یہ دامن اِدھر اُدھر بھر کے

اسیرِ کُنجِ قفس جا سکے نہ گلشن تک ہوائیں لے گئیں دامن میں بال و پر بھر کے

چلے ہیں تیز ہوائے بہار کے جھونکے جدھر چلا ہوں میں گل ہائے چشمِ تر بھر کے

یقین ہے مجھے سالک حیاتِ نَو دو گے
تمھیں پکارا ہے فریاد میں اثر بھر کے

اگست ۱۹۷۴ء

غزل

خمار بارہ بنکوی

عقل کو پیار پر ہنسی آئی
سر کو تلوار پر ہنسی آئی

پیار مجھ سے انھیں نہیں لیکن
شرم انکار پر ہنسی آئی

ابھی واقف نہیں وہ اپنوں سے
جن کو اغیار پر ہنسی آئی

کی جو گھبرا کے روشنی گھر میں
در و دیوار پر ہنسی آئی

ہائے توبہ پہ جس نے رکھ دی جبیں
اس گنہگار پر ہنسی آئی

پیار میں وہ سبق ملے کہ ہمیں
عمر بھر پیار پر ہنسی آئی

رند ہے تو، کہ پارسا ہے خمار
تیرے کردار پر ہنسی آئی

عزت علی صدیقی

پرامن دھماکہ کے لیے بنیاد تشویش

ہندستان نے ۱۸ مئی سنہ ۱۹۷۴ء کو راجستھان کے ریگستانی مقام پوکھران پر زمین کی سطح سے سو میٹر نیچے اپنا جو پہلا ایٹمی دھماکہ کیا ہے وہ اچانک ہونے کے باوجود اچانک نہیں تھا۔ اس ملک میں ایٹمی سائنس تقریباً ۲۰ سال سے ترقی کر رہی ہے اور یہاں اس سائنس کی ترقی کا انداز دوسرے ملکوں سے مختلف رہا ہے ۔ اسی طرح جس طرح کہ سیاسی آزادی کی جدوجہد میں عدم تشدد کا طریقہ یا بین اقوامی تعلقات میں ناوابستگی کی پالیسی۔ اس طریقے اور اس پالیسی کے انوکھے ہونے کی وجہ سے بہت سے ملکوں کو ان کے سمجھنے میں دشواری ہوئی اور کئی ملکوں نے شروع میں ان کے پیچھے کارفرما نیت کو مشکوک اور ان کی افادیت کو مشتبہ قرار دیا، اگرچہ بعد میں زیادہ تر ملک ہندستان کی نیک نیتی اور اس کے طریق کار کی افادیت کے قائل ہو گئے کچھ ایسی ہی کیفیت ہندستان کے ایٹمی تجربے اور اس کے ردعمل کی ہے ۔

اس ملک نے ایٹمی میدان میں پہلا ٹھوس قدم سنہ ۱۹۵۶ء میں اس وقت رکھا جب 'اپسرا' نامی پہلی ایٹمی بھٹی نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ ڈاکٹر بھابھا اس پیش رفت کے نگراں تھے اور جواہر لال جی نے اس کی سمت کا تعین کیا تھا۔ وہ سائنس اور ٹکنالوجی کو ملک کی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے تھے اور انھوں نے ایٹمی سائنس کو ہندستان جیسے پسماندہ اور محدود وسائل رکھنے والے ملک کے لیے غیر معمولی اہمیت کا حامل قرار دیا تھا جیسا کہ انھوں نے کہا تھا محدود وسائل رکھنے والے ملکوں کے لیے ایٹمی توانائی کا حصول مفید ہی نہیں ناگزیر بھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے سنہ ۱۹۵۸ء میں امریکا سے ایٹمی اسلحہ حاصل کرنے کے لیے پاکستان کی کوشش پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہم نے ایٹم بم بنانے کی تکنیکی معلومات حاصل کر لی ہیں اور اگر ہم مطلوبہ مالی وسائل اس سمت میں لگا دیں تو تین چار سال میں اسے بنا بھی سکتے ہیں۔ لیکن ہم نے دنیا کے سامنے عہد کیا ہے کہ ہم کبھی بھی ایسا نہیں کریں گے۔ ہم نیوکلیائی سائنس کے متعلق اپنی معلومات کو کبھی بھی جنگی اغراض کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔"

ہندستان کے دس سالہ منصوبہ

ڈاکٹر بھابھا نے مارچ سنہ ۱۹۴۴ء میں "بنیادی تحقیق" کے ایک ادارے کے قیام پر زور دیتے ہوئے سر دوراب جی ٹاٹا کو ایک خط میں لکھا تھا کہ "اب سے بیس تیس سال بعد جب نیوکلیائی توانائی بجلی پیدا کرنے کے لیے کامیابی کے ساتھ استعمال ہونے لگے گی تو ہندستان کو ماہرین کی تلاش میں کہیں باہر نہیں جانا پڑے گا بلکہ وہ اسے اپنے ہی وہاں تیار مل جائیں گے۔" سنہ ۱۹۶۶ء کے ایک ہوائی حادثے نے ڈاکٹر بھابھا کو ہم سے چھین لیا اور جواہر لال جی اس سے دو سال پہلے ہی اس دنیا سے چلے گئے۔ مگر ان کی بتائی ہوئی راہوں پر ملک آگے بڑھتا رہا۔ قومی ایٹمی توانائی کمیشن نے سنہ ۱۹۷۰ء میں ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال کا ایک دس سالہ منصوبہ تیار کیا اور ستمبر سنہ ۱۹۷۱ء میں ڈاکٹر ہومی سیٹھنا نے جو اب ایٹمی توانائی کمیشن کے چیرمین ہیں اور اس وقت بھابھا ایٹمی ریسرچ سنٹر کے ڈائرکٹر تھے، چوتھی عالمی ایٹم برائے امن کانفرنس کے جنیوا اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اس منصوبے کے مقاصد کا ایک خاکہ پیش کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ

ہندستان تین باتوں پر خاص طور سے توجہ دے رہا ہے۔ (۱) زمین کی گہرائیوں سے تانبہ نکالنا (۲) جنوبی ہند میں مشرق سے مغرب جانے والی ایک نہر بنانا اور (۳) شمال مغرب کے علاقے میں جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے پانی کا ایک بہت بڑا زمین دوز ذخیرہ تعمیر کرنا۔

پوکھران اسی آخر الذکر علاقے میں واقع ہے اور وہاں ہونے والا ایٹمی تجربہ دس سالہ منصوبے پر عمل درآمد میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ اس تجربے سے ان تین مقاصد میں سے کون سا مقصد کس حد تک حاصل ہو سکا ہے اس لیے کہ تجربے کے اثرات و نتائج کے تجزیے اور مطالعے میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ یہ کارروائی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے پھر بھی یہ ایک بالکل ہی بات ہے کہ جو تین مقاصد ہندستانی نمائندے نے جنیوا میں تین سال پہلے بیان کیے تھے ان میں سے کوئی بھی زیر زمین دھماکے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا گویا کہ ہندستان نے دنیا کو بہت پہلے سے بتا دیا تھا کہ وہ اس قسم کا دھماکہ پُرامن اغراض کے لیے کرنے والا ہے۔

معترضین کے مقاصد

اس وقت اس کے خلاف کسی سمت سے کوئی آواز نہیں اٹھائی گئی۔ شاید بعض ملکوں کو ہندستان کی صلاحیت پر اعتبار نہیں تھا۔ اس لیے پوکھران کا دھماکہ ان کے لیے اچانک تھا۔ اب انھوں نے اس کے خلاف آواز یہ سوچ کر اٹھائی ہے کہ ہندستان کے سرخرو نتائج سے نکل آنے کے امکانات بہت بڑھ گئے ہیں۔ احتجاج کا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ بعض طاقتوں نے دنیا میں اپنی نیوکلیائی اجارہ داری بنائے رکھنے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہندستانی دھماکے کے متعلق بعض بیرونی تبصروں میں ایسی باتیں کہی جا رہی ہیں جن سے دوسرے ملکوں میں نیوکلیائی ٹیکنالوجی کی چاہ پیدا ہو سکتی ہے اور نیوکلیائی طاقتیں انھیں اس سلسلے کی معلومات اور متعلقہ ساز و سامان دے کر ان پر اپنے سیاسی اور معاشی اثرات بڑھا سکتی ہیں۔ یہ کارروائی شروع بھی ہو چکی ہے۔

معترضین کی نیت صاف نہ ہونے کی وجہ سے ان کی دلیلوں میں ٹیڑھا پن آگیا ہے۔ اور انھوں نے خود اپنی حرکتوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اعتراض کرنے والی نیوکلیائی طاقتوں میں برطانیہ اور امریکہ پیش پیش رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ جنگی اغراض کے لیے کیے جانے والے دھماکہ اور پُرامن مقاصد کے لیے کیے جانے والے دھماکوں میں کوئی فرق نہیں ہے، حالانکہ روس اور امریکہ کے درمیان حال ہی میں ہونے والے سمجھوتے میں جس کا برطانیہ نے خیر مقدم کیا ہے دونوں طرح کے دھماکوں کے درمیان فرق کیا گیا ہے، اور زیر زمین دھماکوں پر ۱۹۷۶ء سے جو محدود پابندی لگائی گئی ہے اس سے پُرامن اغراض کے لیے کیے جانے والے دھماکوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ در اصل اس سمجھوتے پر دستخط کرنے والے ملک مارچ ۱۹۷۶ء کے بعد ڈیڑھ لاکھ ٹن تک کے دھماکے اسلحہ سازی کے لیے بھی کر سکیں گے، جبکہ ہندستان کا ۱۸ مئی والا دھماکہ جو پُرامن تعمیری اغراض کے لیے کیا گیا صرف دس ۲۰ ٹن کا تھا۔

نیوکلیائی صلاحیت اور نیوکلیائی اسلحہ

ہندستان جیسا کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے کہا ہے ایٹمی یا نیوکلیائی ملک ضرور بن گیا ہے لیکن وہ ایٹمی یا نیوکلیائی اسلحہ والا ملک نہیں بنا ہے۔ اور نہ بننا چاہتا ہے۔ اس طرح اس کی پوزیشن نیوکلیائی اسلحہ رکھنے والے ملکوں ——— امریکا، روس، برطانیہ اور فرانس سے مختلف ہے۔ ان سب نے نیوکلیائی توانائی کو پہلے ہی اسلحہ سازی کے لیے استعمال کیا ہے۔ امریکا نے ان اسلحہ سے کام بھی لیا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں اس نے جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے۔ کوریا اور ویٹ نام کی جنگوں میں اس نے ایسے بم استعمال کرنے کی دھمکی دی تھی۔ ۱۹۷۱ء کے ہند پاک تصادم میں اس کا ایٹمی توانائی سے چلنے والا طیارہ بردار جہاز ہندستان کو ڈرانے کے لیے خلیج بنگال میں بھیجا گیا تھا اور اکتوبر کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو امریکا نے اپنی دنیا بھر میں پھیلی ہوئی نیوکلیائی اسلحہ سے لیس فوج کو چوکنا کر دیا تھا۔ برطانیہ اپنی آزاد ٹکنالوجی رکھنے کے باوجود اس معاملے میں امریکا کے حاشیہ بردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ روس نے امریکا کی نیوکلیائی اجارہ داری توڑنے کے لیے نیوکلیائی اسلحہ تیار کر لیے۔ فرانس نے یورپ اور انجمن اقوام متحدہ

میں امریکا کی چودھراہٹ ختم کرنے کے لیے اپنی فوج کو نیوکلیائی اسلحہ سے لیس کر لیا اور چین نے اپنی تمام قومی ضرورتوں کو پس پشت ڈال کر نیوکلیائی اسلحہ بنا لیے۔ اگرچہ کچھ عرصہ پہلے تک وہ ان اسلحہ کو حقیر سمجھتا اور امریکا جیسی نیوکلیائی طاقت کو "کاغذی شیر" کہتا تھا۔ جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے اس نے ابھی حال میں ایک نیوکلیائی دھماکہ دنیا کی نظروں سے دور امریکا کے تجربے والے میدان نیواڈا میں کیا۔ اور اس کا اقبال اس نے اس وقت کیا جب دھماکہ اس کے بنائے نہ چھپ سکا۔

پھیلاؤ روک سمجھوتہ

ہندستانی تجربے کے متعلق حکومت ہند کی یقین دہانی کو روس اور فرانس نے قبول کر لیا ہے۔ برطانیہ کے ذمہ داروں نے دونوں طرح کی باتیں کہی ہیں۔ چین نے کسی قدر مدھم لہجے میں نکتہ چینی کی ہے اور سب سے زیادہ شور امریکا نے مچایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہندستان کے نیوکلیائی تجربے سے "نیوکلیائی پھیلاؤ روک" سمجھوتے میں ہندی قوموں کی شرکت رک جائے گی۔ لیکن اس سمجھوتے میں سب بڑی طاقتیں بھی شریک نہیں ہیں۔ فرانس اور چین نے ابھی تک اس پر دستخط نہیں کیے ہیں۔ دنیا میں اس سمجھوتے کی مقبولیت یا عدم مقبولیت کا کسی قدر اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۶۸ء میں ۹۵ قوموں نے اس کی زبانی تائید کی تھی لیکن بیس مہینوں میں صرف ۴۷ نے اس کی توثیق کی۔ مغربی یورپ کے صنعتی ملک چار سال تک توثیق میں ٹال مٹول کرتے رہے تاکہ نیوکلیائی تجربوں کے معائنے کا کوئی طریقہ ان کی مرضی کے مطابق درست ہو جائے۔ ان کی بعد کی شرکت کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ کہیں مغربی جرمنی بھی اپنی کوشش یا امریکا کی بخشش سے نیوکلیائی اسلحہ کا مالک نہ بن جائے۔ اس کے ہاتھوں پچھلی دو جنگوں میں یورپ کو جس تاراجی کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کی بنا پر مغربی جرمنی کے نیوکلیائی اسلحہ سے لیس ہو جانے کا تصور ان کو دہشت زدہ کیے ہوئے تھا اور یہی احساس روس کا بھی تھا۔ اسی لیے اس نے امریکا کے ساتھ نیوکلیائی تجربوں پر جزوی پابندی کا معاہدہ کر لینے کے بعد نیوکلیائی پھیلاؤ روک سمجھوتہ کر لیا تھا۔ بعض ترقی پذیر ملکوں نے امریکا اور برطانیہ کے دباؤ میں آ کر اس سمجھوتے پر دستخط کر دیے اور کچھ اس وجہ سے سمجھوتے میں شریک ہو گئے کہ وہ نیوکلیائی ٹکنالوجی میں بہت پیچھے ہیں۔

ہندستان کا موقف

ہندستان نے نہ تو اس سمجھوتے کی خلاف ورزی کی ہے اور نہ اس دوسرے سمجھوتے کی جس کے تحت کناڈا نے اسے اٹمی ری ایکٹر بنانے میں تعاون دیا تھا۔ اپنے دھماکے کے لیے ہم نے پلوٹونیم کناڈا کی مدد سے قائم ہونے والے ری ایکٹر کے بجائے خود اپنے قائم کیے ہوئے ری ایکٹروں سے حاصل کیا ہے۔ اور حکومت ہند نے کناڈا کے ماہروں کو دعوت دی تھی کہ وہ یہاں آ کر اس بات کی جانچ پڑتال کر لیں۔ جہاں تک "نیوکلیائی پھیلاؤ روک" معاہدے کا تعلق ہے۔ اس کی کسی خلاف ورزی کا سوال اس وجہ سے نہیں پیدا ہوتا کہ ہندستان اس میں شریک ہی نہیں ہے۔ شرکت سے اس کے انکار کا خاص سبب یہ تھا کہ اس سمجھوتے میں ایک طرف تو نیوکلیائی اسلحہ رکھنے والی طاقتوں کو ایسے اسلحہ کی تعداد اور ان کی مار بڑھانے اور ان اغراض کے لیے تجربے کرتے رہنے کی کھلی چھوٹ ملی ہوئی تھی اور دوسری طرف نیوکلیائی صلاحیت رکھنے والے ملکوں کو پُرامن اغراض کے لیے بھی نیوکلیائی تجربے کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اس کا مطلب صاف طور سے یہ تھا کہ نیوکلیائی اسلحہ کے ترک یا کم کیے جانے کے بغیر نیوکلیائی توانائی کے پرامن استعمال پر پابندیاں لگا دی جائیں۔ نیوکلیائی اسلحہ رکھنے والی پانچ طاقتوں کو نہ صرف نیوکلیائی اسلحہ سازی بلکہ نیوکلیائی ٹکنالوجی اور نیوکلیائی انجینیرنگ میں اجارہ داری حاصل ہو جائے اور جو ملک نیوکلیائی توانائی کو پرامن اغراض کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں ان کو مستقل طور سے نیوکلیائی اسلحہ رکھنے والے ملکوں کا محتاج بنا دیا جائے۔

اس طرح "پھیلاؤ روک" سمجھوتہ در اصل "مسادات روک" منصوبہ ہے۔ اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس سے نیوکلیائی اسلحہ بندی کی دوڑ یا نیوکلیائی جنگ کے امکان میں کوئی خاص کمی ہو سکتی ہے۔ کم سے کم ابھی تک اس کمی کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ اس کے برخلاف سمجھوتے پر

پر دستخط کرنے والی دو بڑی طاقتوں یعنی امریکا اور روس نے اپنے نیوکلیائی اسلحہ میں تین چار گنا اضافہ کر لیا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان ماسکو معاہدے میں زیرِ زمین دھماکوں پر جزوی پابندی کا جو قرار ہوا ہے اس کا نفاذ بیس مہینے بعد کرنے کا فیصلہ اس خیال سے کیا گیا کہ کب تک نیوکلیائی اسلحہ کے تجربے کر لیے جائیں گے۔ نیوکلیائی اسلحہ نیوکلیائی طاقتوں کے لیے وقار کا نشان بن گئے ہیں اور ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر ان میں سے ایک اپنے حریف کے دس کروڑ آدمی ہلاک کر سکتا ہے تو دوسرے کے پاس کم سے کم بارہ کروڑ انسانوں کو ہلاک کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے اور اگر ایک نیوکلیائی طاقت اپنے حریف کو چار بار برباد کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو دوسری نیوکلیائی طاقت میں اپنے حریف کو چھ بار برباد کرنے کی اہلیت ہونی چاہیے۔

سیاسی تابکاری

ہندستان نیوکلیائی اسلحہ بندی کی دوڑ میں شرکت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ جس طرح وہ بین اقوامی معاملوں سے سرگرم دلچسپی لینے کے باوجود اپنی خارجہ پالیسی میں ناوابستگی کی راہ پہ گامزن ہے اسی طرح اس نے دنیا کے سامنے اس بات کا مظاہرہ کر دیا ہے کہ نیوکلیائی صلاحیت رکھنے کے باوجود نیوکلیائی اسلحہ بندی سے پرہیز کیا جا سکتا ہے۔ اور جبکہ دوسری طاقتوں نے اپنے نیوکلیائی تجربوں میں حیوانات اور نباتات کے لیے مضر اثرات رکھنے والی تابکاری کی کوئی پرواہ نہیں کی ہے اور یہ اثرات غیر نیوکلیائی طاقتوں کے احتجاج اور بین اقوامی مقدمہ بازی کا موضوع بن گئے ہیں، ہندستان کے نیو نیوکلیائی داں نے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ ان کے دھماکے سے کوئی قابل لحاظ تابکاری نہ پیدا ہونے پائے۔ ایسی تابکاری کا امکان فضائی دھماکے میں نسبتاً زیادہ ہوتا ہے اور ہندستان اب سے دس سال پہلے اس قسم کا دھماکہ کر سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا اگرچہ اس وقت تک نام نہاد پھیلاؤ روک سمجھوتہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس احتیاط کے باوجود پوکھران سے تابکار غبار کے پاکستان جانے کی بات کہی گئی ہے، اور یہ بات پاکستان سے پہلے امریکا میں سنائی دی ہے۔

دراصل یہ تابکاری نیوکلیائی نہیں بلکہ سیاسی اور فرضی ہے اس لیے کہ ۱۸ مئی کو یعنی جس روز دھماکا ہوا ہے، ہوا کا رخ مغرب سے مشرق کی طرف تھا اور اگر کوئی نیوکلیائی غبار اٹھتا تو وہ پاکستان کی سمت جانے کے بجائے ہندستان کے اندر ہی دور تک پھیل جاتا۔

اس معاملے میں پاکستان کی شکایت اتنی ہی بے بنیاد ہے جتنا کہ اس کا وہ عذر جس کی بنیاد پر اس نے شملہ سمجھوتے کے تحت ہونے والی رسل و رسائل اور آمد و رفت کی گفتگو کو تاریخ طے ہو جانے کے باوجود غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا ہے۔ وہ ہندستان کے نیوکلیائی تجربہ کو نیوکلیائی اسلحہ بندی کا مظہر اور اپنے لیے خطرے کا باعث قرار دے کر امریکا اور چین سے مزید اسلحہ کی درخواست کر رہا ہے اور پاکستانی حکمرانوں کی واویلا کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ پاکستانی عوام کی توجہ ان ملکوں کی طرف سے ہٹا دی جائے جن کو حل کرنے سے پاکستانی حکومت اپنے غلط طور طریقوں کی بنا پر قاصر رہی ہے۔ چنانچہ مسٹر بھٹو کے مخالفوں نے نہیں بلکہ ان کے رفقائے کار نے بعض بیرونی سفارتی ذرایع کی معرفت حکومت ہند سے کہلوایا ہے کہ ان کے وزیر اعظم کی باتیں پاکستانی عوام کو سنانے کے لیے ہیں اس لیے ان کو کوئی خاص اہمیت نہ دی جائے۔

پاکستان کو پیشکش

پاکستان کے لیڈر نیوکلیائی اسلحہ کے استعمال کے خلاف جو بین اقوامی ضمانت چاہتے ہیں اس سے ہندستان کو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ وہ خود بھی نیوکلیائی اسلحہ کے استعمال اور ان کی پیداوار کے ممنوع قرار دیے جانے کا مطالبہ کرتا رہا ہے اور ہندستان سے ضمانت کا جو مطالبہ کیا جاتا ہے اس کا جواب ناجنگ معاہدے کی وہ پیشکش ہے جو ہندستان کی طرف سے بار بار دہرائی جاتی رہی ہے۔ وزیر خارجہ سورن سنگھ نے حال ہی میں یہ پیشکش بھی کی ہے کہ اگر پاکستان نیوکلیائی توانائی کو پر امن اغراض کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرے تو اسے ہندستان کا تعاون حاصل ہو سکتا ہے۔ اس توانائی کے ایسے استعمال کی ضرورت دونوں ملکوں کو ہے اس لیے کہ ان کے پاس توانائی کے دوسرے ذرائع بہت ہی محدود ہیں۔ اور اپنی پسماندگی دور کرنے کے لیے دونوں کو بہت کم وقت میں بہت زیادہ ترقی کرنا ہے۔

اس معاملے میں نیو کلیائی توانائی کی افادیت کا کسی قدر اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ پہاڑی علاقے میں دو سو میٹر چوڑی تیس میٹر گہری اور اسی میٹر لمبی نہر کھودنے کے لیے تیس ارب روپے کی ڈائنا مائٹ صرف ہوتی ہے جبکہ نیو کلیائی دھماکو اشیا کے استعمال میں صرف تین ارب روپیہ صرف ہوگا۔ اس کے علاوہ نیو کلیائی توانائی کے ذریعے بارش کا اور دریاؤں کا پانی جمع کرنے کے لیے بڑے بڑے تالاب بنائے جا سکتے ہیں، معدنیات کی تلاش کے روایتی طریقوں کی تاخیر کو ختم کیا جا سکتا ہے اور دریاؤں کے دہانے سے دور ساحلی مقامات پر ایسے بندرگاہ بنائے جا سکتے ہیں جن کے ریت اور مٹی سے بند ہو جانے کا ایسا خطرہ جیسا کہ کلکتہ میں پیدا ہو گیا ہے ختم ہو جائے گا۔ نیو کلیائی توانائی بجلی بنانے کے لیے ہندستان میں پہلے ہی سے استعمال ہو رہی ہے اور اسے صنعتی اور زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

رویے کی تبدیلی

اس طرح نیو کلیائی توانائی کی ضرورت ترقی یافتہ ملکوں سے کہیں زیادہ ترقی پذیر ملکوں کو ہے۔ لیکن بعض ترقی یافتہ ملک نیو کلیائی ٹکنالوجی میں اپنی پیش رفت سے فائدہ اٹھا کر نیو کلیائی پیٹنٹ حاصل کر رہے ہیں۔ ہندستان سے ان کی ناراضگی کا سبب یہ اندیشہ نہیں ہے کہ وہ نیو کلیائی اسلحہ بنائے گا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہندستان نے نیو کلیائی انجینئرنگ میں اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کر کے ان کی اجارہ داری میں رخنہ ڈال دیا ہے اور دوسرے ترقی پذیر ملکوں کو نیو کلیائی تحقیق میں اپنا تعاون دینے کی پیشکش کر کے مغربی طاقتوں کے ساتھ مول تول میں اس کی پوزیشن کو مضبوط بنا دیا ہے۔ اب ان طاقتوں کے لیے ان ملکوں سے اپنی من مانی شرطیں پوری کرانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اسی لیے نا وابستہ طاقتوں اور ایشیا و افریقہ کے ترقی پذیر ملکوں نے ہندستان کے تجربے پر تشویش کے بجائے خوشی اور فخر کا اظہار کیا ہے۔ ان ملکوں کا رویہ دیکھ کر اب ان دو تین طاقتوں کا رویہ بھی نرم پڑ رہا ہے جنھوں نے شروع میں ہندستانی تجربے پر خاصے سخت ردعمل کا اظہار کیا تھا۔

★

اُردو میں رامائن ——— (صفحہ ۶ کا بقیہ)

ے صرف خوشتر کی فارسی والی رامائن حمد کو دیکھ کر ایک بہت بڑے ذخیرے کے بارے میں رائے قائم کرنے میں اس احتیاط اور دقت نظر سے کام نہیں لیا جس کے وہ عادی ہیں۔ رامائن کے تراجم میں ہندی تہذیب کی پوری نمائندگی کی گئی ہے۔ ان پیش رووں کا یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس عظیم رزمیے کو مختلف زاویوں اور پہلوؤں سے ہمارے سامنے پیش کر کے اردو والوں کو عالمی ادب کے اس شاہکار سے روشناس کرایا۔ آج یہ کتابیں بازاروں سے غائب ہیں۔ ان کی از سرِ نو طباعت کی طرف فوری توجہ درکار ہے۔

★

جعفر مرتضیٰ

نغمۂ وطن

یہ میرا وطن ہے، مرا رنگین چمن ہے

ہر موڑ کو دھرتی نے نئے روپ میں ڈھالا
تصویر کے انداز میں ہر پھول کھلایا
اک پیار کا سنگم یہ مرا گنگ و جمن ہے
یہ میرا وطن ہے، مرا رنگین چمن ہے

ہر شاخ گل تر سے ہوئی ایسی مرصع
ہے اپنا چمن بلکہ بہاروں کا مرقع
تصویر کے مانند ہر اک برگ سمن ہے
یہ میرا وطن ہے، مرا رنگین چمن ہے

تدبیر نے تقدیر کا یوں شانہ ہلایا
رنگین کو کچھ اور بھی رنگین بنایا
سچ پوچھو تو ہر پھول میں جنت کی کرن ہے
یہ میرا وطن ہے، مرا رنگین چمن ہے

پربت ہو کہ وادی کا کوئی گوشۂ رعنا
قسمت سے ملا ہے ہمیں بھرپور خزانا
حکمت کا خزینہ ہے یہی نازش فن ہے
یہ میرا وطن ہے، مرا رنگین چمن ہے

کلیوں پہ بہاریں ہیں شگوفوں پہ ہے تنویر
ہر شاخ میں پیوست ہوئی عطر کی تاثیر
گلشن یہ بہر طور جوانی کی پھبن ہے
یہ میرا وطن ہے، مرا رنگین چمن ہے

ساغر مہدی

نغمۂ الست

نوجوانانِ وطن شانِ وطن بن جاؤ
تم ہی کشتی بھی ہو ساحل بھی ہو مانجھی تم ہو
اہل الفت کے لیے گوتم و گاندھی تم ہو
وقت پڑ جائے تو ٹیپو سے سپاہی تم ہو
تم نے ہر دور میں رکھی ہے یونہی شانِ وطن
رات تاریک ہے سورج کی کرن بن جاؤ

پاک جمنا کی قسم، عظمتِ گنگا کی قسم
مرمریں تاج کی دیوار اجنتا کی قسم
سر اٹھائے ہوئے اس کوہِ ہمالہ کی قسم
ذرّے ذرّے کے لبوں پر ہے محبت کا بھجن
پیار کی راہ میں تم پریم پون بن جاؤ

اپنی دھرتی کو ہر آفت سے بچانا ہوگا
رنگ اور نسل کی لعنت کو مٹانا ہوگا
سخت چٹانوں کو گلزار بنانا ہوگا
لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی یہ رنگین پھبن
دھوپ ہے تیز بہت سایہ فگن بن جاؤ

رام لعل

افسانہ

دھوپ اور سائے کے بیچ

اگر میں یہ کہوں کہ ہم دو میں سے ایک کی شکست ہوئی تو یہ غلط ہی ہوگا۔ کیونکہ شکست دراصل ایک مفروضہ کیفیت کا نام ہے جسے کوئی بھی اپنے اوپر طاری کرسکتا ہے۔ احساس فتح میں مبتلا ہو کر یا ہار مان کر۔ اپنے طور پر میں اسے ایک خود اختیاری جذبہ ہی کہوں گا کیونکہ جب رما شوری نے جو مجھ سے کافی لمبی تھی، اچانک میرے ساتھ شادی کرلی اور پھر دوسری ہی روز مجھ سے یہ مطالبہ کر دیا۔ "اب تمھیں آفس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہی سروس کرتی رہوں گی۔ ایک تنخواہ میں ہم دونوں آسانی سے گزارہ کرلیں گے"، تو اسے محض خوش دیکھنے کے لیے میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اگرچہ اس کا مطالبہ بے حد عجیب تھا جو کسی نفسیاتی ردعمل کا ہی منتجہ ہو سکتا تھا۔ جب سے وہ اس دفتر میں آئی تھی اس کے سارے رویے ہی خلاف معمول نظر آتے تھے۔ اس نے لباس کے ایسے نیوٹرل فیشنوں کو اختیار کر رکھا تھا جن سے اس کی مردوں کی بالادستی سے آزادی حاصل کرنے کی خواہش کا ہی اظہار ہوتا تھا۔ دفتر کے کتنے خوبرو ساتھیوں کو جو اس کی طرف بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے نظرانداز کر کے وہ مجھ جیسے کوتاہ قد کے ساتھ شادی کر لینے کے بعد اب یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ عورت بھی اپنے مرد کی حفاظت اور پرورش اسی طرح کر سکتی ہے جس طرح وہ عورت کو گھر کے اندر رکھ کر صدیوں سے کرتا آیا ہو۔

رما کے آنے سے پہلے میں جس سکشن میں کام کرتا تھا وہاں صرف لڑکیاں اور عورتیں ہی بیٹھتی تھیں۔ وہ سب کی سب ٹائپسٹ تھیں۔ ڈسپیچر کی ٹیبل اسی کمرے کے ایک کونے میں تھی۔ وہ سب سارا ہی وقت میرے سامنے رہتی تھیں اسی لیے میرے اندر سے وہ بھوک کافی حد تک کم ہو چکی تھی جس کا شکار عام طور پر دوسرے سیکشنوں میں بیٹھنے والے کلرک، ہیڈ کلرک اور افسران تک نظر آتے تھے۔ دھرماتما تماشے دھرماتما آدمی بھی وہاں کسی نہ کسی بہانے سے دن میں ایک آدھ بار ضرور چلا آتا تھا۔ بس ذرا آنکھیں ہی سینکنے کے لیے۔ اگرچہ بیشتر کو تو لڑکیوں کے ساتھ بات کرتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہوتی جبکہ میں بڑی بے تکلفی سے اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے ہی انہی لڑکیوں کو لطیفے سناتا رہتا اور لنچ کے وقفے میں کھانا بھی انہی کے ساتھ کھا لیا کرتا تھا جو کچھ بھی وہ اپنے اپنے گھر سے لے کر آجاتی تھیں۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا وہ میری ہی خاطر اتنی اچھی اچھی چیزیں پکا کر لے آتی ہیں۔ اس طرح میں انھیں نہ صرف بہت قریب سے جان گیا بلکہ ان کے ذاتی مسائل تک سے واقف ہو گیا تھا۔

کُسم ملکانی کے ماں باپ زیادہ جہیز نہ دے سکنے کی وجہ سے اس کی شادی نہیں کر پا رہے تھے۔ مسز شاردا نگم کا اپنے پتی کے ساتھ کئی مہینوں سے جھگڑا چل رہا تھا۔ وہ اس کے تیز مزاج اور ہر بات میں دخل دینے والے بوڑھے باپ کی موجودگی کو برداشت نہیں کر پاتی تھی۔ کبھی کبھی اس کا پتی اس سے ملنے کے لیے آفس میں ہی چلا آتا تو مسز نگم کے چہرے پر پھر سارا ہی دن ایک تناؤ سا طاری رہ جاتا۔ زبانہ تدوانی اپنے مرد سے طلاق حاصل کر چکنے کے بعد اب پھر اسی کی طرف مائل نظر آتی تھی کیونکہ ایسا کیے بغیر ان کی بڑی بیٹی کے لیے رشتہ ملنا مشکل ہو گیا تھا۔

رما شوری ایک اور دفتر سے تبدیل ہو کر وہاں آگئی تو سارا

ماحول ہی جیسے بدل گیا۔ وہ دوسری لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔ ابھی تک کسی لڑکی کے بال اتنے سلیقے سے ترشے ہوئے نہیں دیکھے گئے تھے۔ رما کے بال اس کے چہرے کے دائیں بائیں اور پیچھے پر سدا جھولتے ہی رہتے۔ وہ ہر روز ایک نئے فیشن کا لباس بدل کر آ جاتی۔ کبھی بیل باٹم، کبھی پینٹ سوٹ، کبھی چوڑی دار کبھی کچھ اور۔ گو وہ میک اپ بالکل نہیں کرتی تھی پھر بھی اس کا چہرہ بہت دل کش ہوتا۔ لیکن اس کی شخصیت سے متاثر کرنے والی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سکون پسندی تھی۔ وہ اپنے اردگرد کسی کو بلاوجہ ٹہلتا ہوا یا اتھلی حرکتیں کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسی وجہ سے اس کی آمد نے ایک عجیب سا سنّاٹا پیدا کر دیا تھا۔ جیسے وہ کوئی بہت ہی بارعب شہزادی ہو جس کے سامنے زبان کھولنا اس کی شان کے خلاف گستاخی کرنا ہو۔ ساتھ ساتھ خود کو کنز بھی بنا لینا ہو! لیکن میں اس سنّاٹے کو توڑنے کے لیے مجبور سا ہو گیا کیونکہ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا تھا۔ اسی لیے دوسری لڑکیوں کے ساتھ میں پہلے سے بھی زیادہ بے تکلفی سے پیش آنے لگا تو۔ پہلے تو اس نے میری طرف بڑی ناخوشگواری سے دیکھا۔ پھر بھی میں باز نہ آیا تو اس نے ایک روز برانچ منیجر سے کہہ کر وہاں سے میری میز کرسی ہٹوا دی۔ ایسے میں نے تو ہین سی سمجھا لیکن کر ہی کیا سکتا تھا! پھر بھی کسی نہ کسی بہانے سے وہاں آنا جانا ہی رہا۔

مجھے جلدی ہی احساس ہو گیا وہ دراصل مردوں کی بالادستی کے خلاف نہ صرف ایک انفرادی بغاوت کیے ہوئے ہے بلکہ اس کے لیے دوسری لڑکیوں کو بھی ترغیب دیتی رہتی ہے۔ "تم مردوں کو متوجہ کرنے کے لیے لپ اسٹک وغیرہ مت لگایا کرو۔ چوڑیاں بھی مت پہنا کرو اور یہ روایتی لباس بھی ترک کر دو۔ بلکہ جو جی میں آئے پہنو۔ مردوں کی غلامی سے نکلو۔ ہمیں کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے ان کے دل میں یہ احساس پیدا ہو کہ ہم انھیں خوش کرنے کے لیے ایسا کرتی ہیں۔ ان سے ہم کسی بات میں کم نہیں ہیں۔ ہمیں دفتر میں ٹائپنگ وغیرہ جیسے ہلکے پھلکے کام چھوڑ کر پالیسی، پرچیزز، پروڈکشن، ڈسپوزلز وغیرہ سے متعلق ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے بھی خود کو تیار کرنا چاہیے۔"

وہ خود بھی ایک آدھ مہینے کی کوشش کے بعد اسٹینو کی جاب چھوڑ کر اسی محکمے کی اہم ترین فائلیں دیکھنے لگی جو اب تک کسی عورت کے سپرد نہیں کی گئی تھیں۔ انہی کی بدولت وہ کبھی کبھی مرد کلرکوں کو ڈانٹ ڈپٹ بھی لیتی۔ ایک اسسٹنٹ افسر نے اس کے ساتھ اپنے تعلقات بڑھا لینا چاہے تو رما شوری نے اسے اپنے دفتر سے ٹرانسفر کرا کے ہی دم لیا۔ میرے ساتھ اس کے تعلقات ابھی تک بے حد رسمی اور محتاط قسم کے ہی تھے۔ لیکن اب میں اس کے رویے میں ایک نمایاں تبدیلی بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اب مجھے اپنے پاس بلا کر کچھ پوچھنے کے علاوہ کبھی کبھی خود بھی میری میز پر چلی آتی تھی۔ اسی وجہ سے دفتر کے کئی لوگ میرے حاسد بن گئے۔ انھوں نے مجھ پر کئی موقعوں پر پھبتیاں کسیں اور میرے جیسے ٹھگنے آدمی کے کئی کئی نام رکھ لیے۔ اس سے ان کے زخموں پر کچھ ٹھنڈ تو پڑ ہی جاتی ہوگی۔ گالی دے کر بھی آدمی کچھ نہ کچھ راحت پا ہی لیتا ہے۔ لیکن میں ان کی ایسی حرکتوں کی وجہ سے نہ تو احساس کمتری میں مبتلا ہوا نہ ہی ان کے خلاف بھڑکا۔ میرے لیے تو رما شوری کا ہی رویہ بے حد دلچسپ بنا ہوا تھا۔ وہ مجھ پر اب خاصی مہربان بھی نظر آتی تھی اور میرا جی چاہتا تھا وہ میری اور زیادہ دلجوئی اور سرپرستی کیا کرے۔ خوش رہنے کے لیے اگر ضروری سمجھے تو مجھے کبھی کبھی ڈانٹ بھی لیا کرے۔!

دفتر کے اوقات کے بعد کئی بار وہ مجھے اپنے اسکوٹر پر پیچھے بٹھا کر ریسٹورانوں میں لے گئی۔ مجھے ساتھ لے کر بھیڑ بھاڑ والی جگہوں پر گھومتے ہوئے وہ مطمئن نظر آتی تھی۔ جب لوگ ہم دونوں کی طرف حیرانی سے دیکھتے ان کی نظروں میں حیرانی اور تمسخر دونوں ہی ہوتے جن سے ہم خاصے لطف لیتے تھے۔ ان کے بارے میں گھنٹوں گفتگو کرتے اور قہقہے لگاتے۔ ان لوگوں کا تجزیہ کرتے وقت مجھے احساس ہوتا ہم ایک دوسرے کے کتنے گہرے دوست بن چکے ہیں۔ کافی حد تک ہمارا نقطۂ نظر ایک ہی ہے اور ہم ایک دوسرے میں جو دلچسپی دکھاتے ہیں وہ دراصل ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ہی ہے۔ لیکن میں اس حقیقت کا بھی احساس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ اس نے مجھے اپنے قریب کر کے اور کتنے زیادہ شکیل، ذہین اور طویل قامت

مردوں کو رقابت کی آگ میں بے طرح جلایا ہے اور ایسا کرکے اس نے بے حد تسکین حاصل کی ہے۔

اس نے انتہائی جذباتی لمحوں میں ایک بار مجھے بتایا" میں نے اپنے کم پڑھے لکھے ڈیڈی سے دل ہی دل میں ہمیشہ نفرت کی ہے۔ میری ممی کی موت کا کارن وہی تھے۔ جو ان سے کہیں زیادہ تعلیم یافتہ تھیں۔ ڈیڈی نے ان کی قدر نہیں کی۔ وہ ہمیشہ اُن پر ظلم ڈھاتے رہے۔ پتہ نہیں کیوں میری ممی اُن سے اس قدر دب کر رہتی تھیں! کبھی پروٹسٹ تک نہیں کرتی تھیں! بیماری یا کسی اور مجبوری کی حالت میں بھی وہ ڈیڈی کی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے سے انکار نہیں کر پاتی تھیں۔ گھر کے اندر بالغ ہوتے ہوئے بچے اپنے ماں باپ کے بارے میں کیا کچھ نہیں جانتے! ماں باپ ہی انجان بنے رہتے ہیں۔ انھیں کبھی احساس نہیں ہوتا کہ انہی کے بعض غلط رویے ان کے بچوں کو ان کا کتنا بڑا دشمن بنا دیتے ہیں۔

رما نے اس بات کا بھی اعتراف کیا۔" ایک رات کو میں نے اپنی بیمار ممی کو ڈیڈی کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ شراب کے نشے میں بالکل دھت تھے۔ مجھ سے ممی کی بے بسی نہ دیکھی گئی تو بڑی ہمت کرکے ان کے کمرے میں چلی گئی۔ ڈیڈی کو وہاں سے نکل جانے کے لیے کہدیا۔ پہلے تو وہ حیران سے کھڑے رہ گئے کئی لمحوں تک کچھ بول ہی نہ سکے۔ پھر اچانک انھوں نے ہم دونوں کو پیٹنا شروع کر دیا پیٹتے پیٹتے تھک گئے تو اور شراب پینے کے لیے گھر سے باہر نکل گئے۔ میں آج تک ان کی مار کا درد نہیں بھول سکتی لیکن ان کے چہرے پر جس قسم کی شکست نمودار ہوئی تھی وہ دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی تھی"۔

میرے دل میں رما شوری کے ساتھ بہت ہمدردی پیدا ہوگئی وہ اندر سے کتنی افسردہ تھی کتنی دکھی! باہر سے وہ جس قدر سخت نظر آتی تھی اندر سے ویسی نہیں تھی۔ اس نے شادی کے بعد مجھ سے طویل چھٹی لے کر گھر پر ہی رہنے کے لیے کہا تو ایسا کرنا مجھے بہت دلچسپ سی لگا۔ اسے میں خوش ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے آرام کرنے کا بھی موقع مل گیا۔ دن بھر گھر پر پڑا رہتا۔ میرا مطالعہ کرنے کا شوق روزانہ اخبار پڑھنے تک ہی محدود تھا۔ ریڈیو سے دلچسپی بھی بس واجبی سی تھی۔ فلیٹ کے ٹیرس پر رکھے ہوئے گملوں کی آبیاری بھی آخر کتنی کی جا سکتی تھی! اگرچہ میں خود کو مصروف رکھنے کے لیے کسی نہ کسی کام میں لگا ہی رہتا تھا۔ لیکن میں کچھ ہی روز کے بعد اوب گیا۔ رما شام کو ہی دفتر سے لوٹتی تھی۔ اس نے مجھے وقت کاٹنے کے لیے دفتر جانے سے بھی منع کر رکھا تھا۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ مرد بنا کام کاج کے بھی رہ سکتا ہے۔ اور پھر اپنے ہم جنسوں کی صحبت کے بغیر رہنا تو اور بھی مشکل لگا جن کے ساتھ اکثر ہنسی، مذاق اور گالی گلوج تک ہوتا رہتا تھا۔ آدمی اپنی روایات کا کسی نہ کسی حد تک غلام ہوتا ہی ہے۔ کچھ روایات کو وہ توڑتا ہے کچھ کو سینے کے ساتھ لگائے رہتا ہے مجھے اپنی زندگی ادھوری ادھوری سی معلوم ہونے لگی۔ حرکت اور طوفان سے کٹی کٹی سی جو زندگی میں امنگ پیدا کرتے ہیں۔ جینے کے لیے حوصلہ دیتے ہیں۔

میرے گھر کے آس پاس دور دور تک فلیٹ ہی فلیٹ تھے ـــــ ویران پڑی ہوئی بالکونیاں، دھوپ میں خاموشی سے جلتے ہوئے لان اور سڑکیں جن پر گزرنے والی بسوں اور موٹروں کی مخصوص آوازوں سے میں رفتہ رفتہ مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ مرد دفتروں میں چلے جاتے تو مکانوں میں عورتیں یا ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ہی رہ جاتے تھے۔ کسی کسی عورت کو میں اپنے ٹیرس پر کھڑے ہو کر بال جھٹکتے یا دھوپ میں کپڑے پھیلاتے ہوئے دیکھ لیتا تو میرے پاؤں وہیں گڑے سے رہ جاتے ـــــ عورتیں کبھی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ بات کرتیں۔ تو میرے کان ادھر ہی متوجہ ہو جاتے۔ وہ پھیری والوں سے ترکاری، کپڑا، برتن، کراکری یا کبھی کبھی قالین وغیرہ خریدنے کے لیے نیچے اترتیں تو میں بھی نیچے چلا جاتا۔ میری وجہ سے دو ایک بار ان کا سودا بہت سستے داموں میں پٹ گیا تو وہ بہت خوش نظر آئیں۔ میں نے ردی والے کے ہاتھ اپنے پرانے اخبار، ڈبے اور بوتلیں اچھے خاصے داموں میں بیچ لیں تو انھوں نے بھی اس معاملے میں میری مدد چاہی۔ اب تو وہ مجھے آواز دے کر بلا لیتیں۔ اس میں انھیں کوئی جھجک نہ ہوتی۔ چھوٹے قد کے آدمی کو عورتیں عام طور پر بے ضرر ہی سمجھتی ہیں۔ اس کے ساتھ مذاق کرنے، اس سے وقت بے وقت کوئی فرمائش تک کر بیٹھنے میں عار نہیں سمجھتیں۔ وہ میرے منہ پر ہی میری تعریف کرنے لگتیں جو

یقیناً خوشامد سے ہی ملی ہوتی تھی تو مجھے اپنی پوری شخصیت کے تنزل پذیر ہونے کا احساس تو ضرور ہوتا لیکن ان کی قربت اور چھیڑ چھاڑ سے جو بے اندازہ لطف حاصل ہوتا وہ اس احساس کو بالکل بھلا ہی دیتا تھا۔

میری ہی تجویز پر وہ دن میں گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے میرے ساتھ رمی کھیلنے پر بھی آمادہ ہوگئیں تو گھر پر میرا بھی جی لگنے لگا۔ پہلی سی بیزاری اور بوریت کم ہوتی نظر آئی۔ ان کا وقت بھی خوش اسلوبی سے کٹنے لگا۔ میں جب چاہتا ان سے چائے، کافی یا کوئی اور لذیذ شے تیار کرا لیتا۔ ہمارے درمیان جلدی ہی بے تکلفی اور اپنے پن کا ایک عجیب سا رشتہ استوار ہوگیا۔ یہ خلوص، پاکیزگی اور دوستی پر ہی مبنی تھا۔ اس میں کسی قسم کا خوف بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مسز چاہدری اور مسز چاولہ دونوں کے پتی بھی جانتے تھے۔ کبھی کبھی میں ان کی موجودگی میں بھی ان کے ساتھ تاش کھیلتا تھا۔ رمی میں ہار جانے پر ہم ایک دوسرے پر طرح طرح کے جرمانے بھی کر دیا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو فلمیں دکھانے یا ایک دوسرے سے کپڑے تک دھلوانے کے۔ میں نے کئی مرتبہ ان دونوں سے اپنے کپڑے دھلوا لیے تھے۔ اس بات کا سب ہی کو احساس تھا کہ ہم اپنے اپنے گھر میں نظر بند ہیں۔ قیدی ہیں۔ ایک دوسرے سے دوستی کیے بغیر وقت کاٹنا ناممکن ہے۔

ایک روز دوپہر کو ہمارے فلیٹ میں دونوں عورتیں رمی میں ہار جانے پر میرے کپڑے پریس کرنے میں لگی ہوئی تھیں کہ اچانک رما آفس سے لوٹ آئی۔ اس نے اپنی تعلیم یافتہ پڑوسنوں کو ہنس ہنس کر گھر میں کام کرتے ہوئے دیکھا تو حیران سی رہ گئی۔ اس وقت میں شیشے کے سامنے کھڑا شیو بنا رہا تھا اور کوئی لطیفہ بھی سنا تا جا رہا تھا۔ لیکن رما کے ماتھے پر کوئی بل نہ دکھائی دیا۔ وہ بھی ہماری ہنسی میں شریک ہوگئی۔ اس نے جلدی جلدی ہم سب کے لیے کافی بھی بنا دی۔ جب دونوں پڑوسنیں رخصت ہوگئیں تو رما نے بڑے پیار سے میری طرف دیکھا۔ کہا، "سوچتی ہوں، تم اپنی چھٹی کینسل کیوں نہ کرا لو! دفتر میں تمہارا من اچھی طرح لگ سکے گا!"

میں نے اس کی ہنسی سے بھری ہوئی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ لیکن وہاں مجھے کوئی بھی مبہم سا خوف یا کوئی بھی نامعلوم سی شکست نظر آسکی۔ شاید وہ اپنے جذبات پر قابو پا لینا بخوبی جانتی تھی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ بھی میری طرف بڑھا دیا تو میں نے مسکرا کر اسے تھام لیا اور کہا "ضرور!"



سید نواب افسر

منظر لکھنوی

سید جعفر حسین منظر مرحوم، لکھنؤ اسکول کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جو انقلابی پیش رفت کی دوسری منزل میں تھا۔ معیار کے دور میں صفی، عزیز وغیرہ نے قدیم مذاق سخن کی افراط و تفریط میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے تلامذہ نے جدید ادب کی زلفیں سنواریں۔ چکبست اور جوش نے نئے معماروں میں نام پیدا کیا اس دور کے آخر آخر "معیار" کی قائم مقام انجمن معین الادب کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے آل انڈیا مشاعروں کی فضا میں ایک "ینگ پارٹی" ابھرتی ہوئی نظر آئی۔ یہ پارٹی سراج، منظر، شمس، نذیر وغیرہ پر مشتمل تھی۔ ینگ پارٹی مقصدی حیثیت سے کسی انقلاب کی محرک نہیں تھی۔ رنگین نورانی شوخی اور زبان کی مباحثگی کی طرف ان لوگوں کا فطری میلان تھا۔ پرانے رنگ کی صنعت گری اور مضمون بندی سے دور کا بھی لگاؤ نہیں تھا۔

قدیم لکھنؤ اسکول میں داخلی اور خارجی، اصلاحی تحریکوں کے علاوہ جو دورِ رفتارِ زمانہ کے فطری اثر سے غیر شعوری طور پر جو تبدیلیاں آتی گئیں ان کا تفصیلی مطالعہ اور تجزیہ لکھنؤ کی ادبی تاریخ کا اہم پہلو ہے جو اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے پھر بھی چونکہ ہم عبوری دور سے تعلق رکھنے والے ایک مقبول شاعر کے خصوصیات کلام پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں لہٰذا اس دور کی انقلابی رفتار اور اقدارِ سخن کی تبدیلیوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری ہے۔

اب تک دبستانِ لکھنؤ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا بیشتر حصہ نوابی دور کی صنعت گری، رعایت لفظی اور مضمون بندی کے نقائص پر مشتمل ہے۔ اچھی شاعری کے نمونے نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔ اوّل اوّل لکھنے والوں نے ناسخ کے زمانہ سے امیر تک چند مشہور شعراء کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے اس پورے عرصہ میں اقدارِ سخن کی یکسانیت محسوس کی اور ایک مستقل رائے قائم کر لی۔ پھر بعد میں آنے والے رسمی نقاد وہی سب نقل کرتے رہے جو پہلے لکھنے والوں سے ان کو ملا تھا۔ یہ اک واضح حقیقت ہے کہ ایسے نقاد جو صرف معلم کی حیثیت رکھتے ہیں اپنے دورِ طالب علمی میں اپنے اساتذہ کے خیالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور اساتذہ بھی اپنی ذاتی کاوش و تحقیق کے بجائے تنقیدی لٹریچر سے استنباط کرتے ہیں۔ اصل مواد کا تنقیدی مطالعہ بہت کم ہوتا ہے۔ بہرحال یہ تسلیم ہے کہ لکھنؤ میں ایک دور ایسا گذرا ہے جب زبان و فن کی تحقیق و صحت پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ خیالات میں حقیقت اور صحت مندی کم تھی صنائع و بدائع کی طرف غیر معتدل رجحان تھا۔ "ہنوٹ" اور "تخیئل" کی اصطلاحیں اس دور کے عناصر سخن کا پتہ دیتی ہیں لیکن یہ سب تکلفات جاگیردارانہ تمدن اور بیکاری کی دین تھے جس کی عمر کم ہوتی ہے۔ صرف لکھنؤ پر منحصر نہیں ہے اس زمانہ میں ہر طرف یہی حال تھا۔

دلی کے استاد ذوق دیکھئے کیا کیا کہہ رہے تھے:

اس نے جب مال بہت رد و بدل میں مارا   ہم نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا

نالہ جب دل سے چلا سینہ میں پھوڑا ٹکا   چلتی گاڑی میں دیا عشق نے روڑا اٹکا

کٹ سکا صیدِ محبت کا نہ قاتل سے گلا   رگڑا پتھر پہ یہ اس نے کہ ہوا چاقو گرم

نہ جھاڑا غیر کو تو نے کہ ہو کر جھاڑ لپٹا تھا   مجھی پر گالیوں کا جھاڑ تو نے بدگمان باندھا

اس نزاکت سے بسر کرتا ہے وہ رشک پری   بال بھی باندھے جو مسّہ پر تو زلف حور کا

عشق کے مکتب میں ہو فرہاد سب سے تیز ذہن
تیں دن چاٹے اگر تعویذ میری گور کا
ذوق راہ عشق وہ کوچہ ہے جس کی خاک میں
ہے در تاج سلیماں بیضہ بیضہ مور کا
حاتی یہ زلفوں کی لٹک دل سے ہمارے
افسوس کچھ ایسا ہمیں ٹلکا نہیں آتا
دریائے غم سے میرے گزرنے کے واسطے
تیغ خمیدہ یار کی لوہے کا پل ہوا

دراصل سارا دھوکا یوں ہوا کہ دبستان لکھنؤ کے متعلق یکساں تبصرہ اور یکساں فیصلہ کی بے سمجھے بوجھے تکرار ہوتی گئی تنقید کے سائنٹفک اصول سے عاری ان ناقص تبصروں پر عمارت اونچی ہوتی چلی گئی اور مزید دیکھ بھال کا دروازہ بند ہوگیا۔ مواد کا تفصیلی مطالعہ کرنے والے اور اچھی شاعری کے نمونوں پر بھی نظر رکھنے والے سامنے نہیں آئے حالانکہ انیسویں صدی کے آخر سے اب تک رجانے کتنے انقلاب آ چکے ہیں حالات کی عام اور فطری اثراندازی سے لکھنؤ مستثنیٰ نہیں رہ سکتا تھا۔ مختلف مقامات کے مختلف خصوصیات کے تحت یہ تو ممکن ہے کہ تغیر کی رفتار اور نوعیت میں تھوڑا بہت فرق ہو لیکن ایک حالت کا قائم رہنا کہیں بھی ممکن نہیں ہے۔

قدیم اسکول کی قدر و قیمت کے تفصیلی جائزہ سے قطع نظر کرتے ہوئے کم ازکم یہ بات دیکھنے کی ہے کہ خود لکھنؤ والوں نے اس رنگ کے نقائص دور کرنے کے لیے کافی کام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اہل لکھنؤ خود اپنا ایک مرکز قائم کیے ہوئے تھے یان کا احساس برتری واضح طور پر کوئی بیرونی تحریک انقلاب ہیں قبول کر سکتا تھا۔

یہاں اصلاح مذاق کا جو رجحان پیدا ہوا وہ غیر شعوری اثرپذیری کے باوجود اسی سرزمین کی پیداوار تھا۔ جہاں بھی کسی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے زمانہ خود اس سرزمین سے انقلاب برپا کرنے والے پیدا کر دیتا ہے چنانچہ خود لکھنؤ کی خاک سے ایسے شاعر بھی پیدا ہوئے جنھوں نے مصنوعیت سے پرہیز کیا۔ خود ناسخ کے زمانے میں اور ان کے بعد جب تک اس رنگ کی گرفت قائم رہی ایسے شاعر بھی موجود رہے جو ماحول کے دباؤ کے باوجود اپنے فطری میلانات کی بدولت انفرادی خصوصیت کے مالک رہے۔ جیسے آتش، انیس، شوق، تعشق وغیرہ۔ ان لوگوں کی طبیعت میں اک خود اعتمادی اور استغنا کی کیفیت تھی۔ روساء اور دیگر معززین شہر کی صحبتوں میں شاعری کا جو سکہ چل رہا تھا اس سے بلکہ روایات کے پورے نظام سے ایک حد تک بے نیاز رہنے والے ان شعرا کا مقبول عام اور مرکز توجہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ لکھنؤ والے شاعری کی کیفیتوں سے کسی دور میں ناآشنا نہیں رہے جہاں بھی شعریت کے فطری جمال کی جھلک نظر آتی تھی اس کی قدر کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد لکھنؤ کے تمدن نے پھر اک سنبھالا لیا بچے کھچے رئیسوں کی ڈیوڑھیاں قومی تباہی کے کھنڈر پر پھر آباد ہوئیں۔ مشاعرے جمنے لگے۔ اس نشاۃ ثانیہ کی کوئی محکم بنیاد نہیں تھی۔ پھر بھی ہم اس کو کم ازکم نصف صدی تک کارفرما دیکھتے ہیں۔ انیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے صفیؔ اور عزیزؔ وغیرہ بزم ادب میں داخل ہوئے ان لوگوں نے جماعتی طور پر ایک رسالہ "معیار" جاری کیا مصنوعی مضمون آفرینی اور صنعتوں کے جنوں کے خلاف تحریک چلائی اور ادبی حلقوں میں تنقیدی شعور پیدا کیا۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس دور کے بعض غیر لکھنوی مشہور شاعر جو کسی نہ کسی طرح لکھنؤ سے قریب تھے یہاں کے حالات سے متاثر نہیں ہوئے۔

رشیدؔ اور آرزوؔ اگرچہ داعیٔ انقلاب نہیں تھے لیکن خود اپنا انفرادی مذاق رکھتے تھے جو نوک اور صنعت گری سے بڑی حد تک پاک تھا۔ رشیدؔ مضامین کی سادگی اور زبان کی شیرینی کے دلدادہ تھے آرزوؔ میں کچھ میرؔ کا انداز تھا کچھ اپنی الگ ساخت پرداخت تھی۔ انھوں نے ہندی الفاظ بکثرت استعمال کئے (شاید فراقؔ سے زیادہ) خالص اردو کے نام سے اک مجموعہ مرتب کیا جس میں فارسی عربی الفاظ کا مطلق دخل نہیں ہے۔ آرزوؔ کے شاگرد بہ کثرت تھے۔ رشیدؔ کے شاگردوں میں سراجؔ اور قدیرؔ بہت مقبول ہوئے۔ اسی زمانہ میں کچھ اور نوجوان شاعر بھی ابھر رہے تھے ان میں آثرؔ، رواںؔ، آل رضا

اور سید جعفر حسین منظر بہت نمایاں تھے۔ منظر کی شاعری ان کے فطری شاعرانہ مزاج کی پیداوار تھی۔ لکھنؤ کے مشہور ڈرامہ نویس مہدی حسن صاحب احسن کے بھانجے اور مشہور خوشگو شاعر منے مرزا صاحب شرر کے بھتیجے ہونے کی حیثیت سے ادبی ماحول میں پرورش پائی اور ان لوگوں سے فنی استفادہ کیا لیکن شعر ہمیشہ اپنی افتاد مزاج کے مطابق کہا۔ مشاعروں میں سراج اور قدیر کا ساتھ ہونے لگا۔ ہم عمر اور ہم مذاق ہونے کی بنا پر آپس میں دوستی بڑھی اور جذبۂ تعاون پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے شمس اور سحر وغیرہ کو ساتھ لیکر ایک "ینگ" پارٹی بنائی۔ یہ پارٹی بہت مقبول اور اثر انداز ہوئی۔ یہ لوگ جس مشاعرہ میں جاتے تھے۔ سب ایک سلسلہ میں غزل پڑھتے تھے۔ یہ سب کے سب خوشگو بھی تھے اور خوش نوا بھی تھے۔ ان لوگوں کی غزل خوانی سے مشاعرہ میں ایک مخصوص فضا قائم ہو جاتی تھی اور مشاعرہ نقطۂ عروج پر پہونچ جاتا تھا۔ پھر کچھ وقفہ کے بعد دوسرے دور میں لکھنوی اور غیر لکھنوی اساتذہ اپنا کلام سناتے تھے۔ اس پارٹی کی سربراہی پہلے آشفتہ نے کی۔ پھر سراج کا نام سرفہرست آ گیا۔ منظر اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے اور ان کی سوسائٹی بھی محدود تھی لیکن ان کی شاعری میں اتنی شوخی اور دل آویزی تھی کہ مشاعروں میں بے پناہ داد حاصل کرتے تھے۔ انجمن معین الادب کے بعض یادگار مشاعروں میں منظر کی غیر معمولی کامیابی کے مناظر مدتوں لوگوں کی نگاہوں میں پھرتے رہے ہیں۔

منظر کی شاعری تمام تر عشقیہ اور واردانی ہے۔ انکی شاعری کے مختلف دور قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے ان کا ایک مستقل رنگ ہے جو نوجوانی سے آخر عمر تک یکساں قائم رہا۔ ان کی شاعری میں زیادہ تر داخلی کیفیت کی ترجمانی ہے۔ روزمرہ کی بے تکلف زبان استعمال کرتے ہیں۔ الفاظ کی نشست میں ایسا بے ساختہ پن ہوتا ہے جیسے کوئی زندہ دل آدمی باتیں کر رہا ہو۔ جذبات کے اظہار میں ندرت اور دلکشی ہے۔ حالات اور تقاضوں کی مسلسل تبدیلیوں سے وہ کچھ بے نیاز معلوم ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کچھ اپنی فطرت اور کچھ عام مطالعہ کی کمی کی وجہ سے وہ زمانہ کے ساتھ بدل نہیں سکے۔

وہ خالص غزل کے شاعر ہیں کسی مقصد کے مبلغ نہیں ہیں محبت اور انسان دوستی کے علاوہ ان کے پاس کوئی سیاسی یا انقلابی پیغام نہیں ہے وہ مسائل حیات کا تفصیلی جائزہ نہیں لیتے۔ لیکن محبت کو ہر مسئلہ کا حل سمجھتے ہیں۔ وہ سماج اور سیاست کی الجھنوں میں کسی منزل کی نشان دہی نہیں کرتے پھر بھی ان کی شاعری میں بجائے خود ایک زندگی ہے۔ وہ سیدھی سیدھی محبت اور شرافت کے علم بردار ہیں۔ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے ترجمان ہیں۔ ان کا اہم موضوع حسن و عشق ہے۔ حسن و عشق کا رابطہ فطری اور غیر فضائی ہے۔ منظر کی غزل اسی رابطہ کی تفسیر ہے۔ واردات حسن و عشق کے بیان میں سنبھلا ہوا ستھرا مذاق جس میں داغ کا عیاشانہ ابتذال نہیں ہے۔ استعاروں میں فنکارانہ ندرت، بندش میں ہمواری اور ترنم زبان میں لوچ اور شیرینی۔ یہ سب ہیں منظر کی شاعری کے خصوصیات۔

ظاہر ہے کہ آج ادبی تقاضوں کی روا اپنا رخ بدل چکی ہے۔ شاعری کے قدیم بنیادی عناصر کی جگہ نئے مسائل آ گئے ہیں۔ غزل کو زندہ رہنا تھا تو وقت کے مطالبات بھی پورے کرتے تھے۔ چنانچہ آج اس ہلکی پھلکی نازک صنف سخن میں فکر و نظر بھی ہے تغزل بھی ہے اور مسائل حیات بھی ہیں۔ یہ چیزیں بھی اگرچہ جد و جہد آزادی کے زمانہ سے غزل پر اثر انداز ہو رہی تھیں لیکن تیس چالیس سال پہلے موجودہ وسعت اور توانائی نہیں تھی۔ پھر بھی کل اور آج میں محبت حوصلہ مندی اور مختلف فطری جذبات کی ترجمانی خصوصاً وجدانیات قدر مشترک ہیں۔ زندگی دراصل مختلف مظاہر اور مختلف تقاضوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ فکر و تدبر کے حرکت و عمل، اور جہد و بقا اگر زندگی کے تقاضے ہیں تو ایک لمحۂ سکون و فراغت بھی تقاضائے زندگی ہے۔ تھکے ہوئے ذہنوں کو تازہ حوصلہ دینے کے لیے انسانیت کے لطیف جذبوں کے تار چھیڑنا اور ان پرکیف نغموں سے ایک روحانی لذت حاصل کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا خارجی زندگی کی تعمیر و تہذیب کے لیے فکر و کاوش اور جوش و توانائی۔ شعر و ادب کو کشمکش حیات کی عملی منزلوں میں اگر نقیب کارواں بننا ہے رہبر و رفیق بننا ہے تو کبھی کبھی نسیم خوشگوار اور شجر سایہ دار بھی بننا ہے۔

کسی قدر روحانی انبساط حاصل ہو جانے کے بعد عملی زندگی کیلیے نئی طاقت حاصل ہو جاتی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اچھے شعر جو بغیر کسی مقصد کے ذہنی لذت و انبساط پیدا کرتے ہیں۔ بجائے خود ایک بڑے مقصد کے حامل ہوتے ہیں۔ منظر کی غزل میں اس قسم کے شعر بکثرت ملتے ہیں۔ ان کے کلام میں اک وجد آفریں غنائیت اور کیفیت ہے۔ ان کی گفتگو کی سنجیدہ شوخی اور مہذب رنگینی میں بڑی دلآویزی ہے۔ اس میں زندگی کی حقیقتوں سے فرار نہیں ہے بلکہ زندگی کے لیے سامان توانائی ہے۔

ان کا دیوان جو شائع ہوا ہے کوئی اچھا انتخاب نہیں ہے۔ یا تو انھوں نے مشاعروں میں اپنی غزلوں کی کامیابی کو معیار بنا کر خود انتخاب کیا ہے یا پھر اسی ماحول کے پروردہ ان کے کسی دوست نے یہ خدمت انجام دی ہے۔ ضرورت تھی کہ یہ کام کسی ایسے شخص کے سپرد کیا جاتا جو مذاق شاعری کے پیہم تغیرات سے واقف ہوتا۔ کیا ضروری ہے کہ جن اشعار پر تیس چالیس سال پہلے مشاعرہ لوٹ لیا گیا ہو وہ سب اشعار آج کے شعور تنقید سے بھی ویسی ہی داد حاصل کر سکیں۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جن اشعار پر اس وقت داد نہیں ملی تھی وہ سب خارج کر دینے کے قابل ہوں۔ بہرحال موجودہ صورت میں جو کچھ ہے وہ منظر کی شخصیت منظر کے کردار اور منظر کے مذاق و اسلوب کی اچھی خاصی نمائندگی کرتا ہے۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کسی اچھے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی مسرتیں جب خلاف توقع ناکامی کی تلخیوں سے بدل جاتی ہیں تو انسان کو کتنا دکھ ہوتا ہے۔ اس جذبہ کی ترجمانی مختلف صورتوں سے کی گئی ہوگی منظر کا شعر سنئے:

جتنے تھے پھول مقدر سے ہو گئے کانٹے
بہار ہائے ہمارے لیے بہار نہیں

اپنی محبت پر بھروسہ، معشوق کے تغافل کا شکوہ اس کی مشق ستم کے لیے اپنے دل کی پیش کش سب پرانی پامال باتیں ہیں لیکن منظر کی فنکاری نے انھیں فرسودہ باتوں میں ندرت اور تاثیر پیدا کی ہے:

ناوک فگنی اور در و دیوار کے اوپر
ناراض ہو یا دل مرے پہلو میں نہیں ہے

عشوہ و ناز کو ناوک فگنی سے تعبیر کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن جھوٹے مدعیان عشق کو در و دیوار کہنا بہترین استعارہ ہے۔ پھر انداز خطاب دیکھئے۔ اپنی خود اعتمادی کے اظہار سے پہلے "ناراض ہو" کہہ کر شکوۂ ظلم کو خلوص محبت میں تبدیل کر دیا ہے۔

اسی غزل کا ایک اور شعر سنئے۔ جب انسان کوئی کام اپنے دل پر رکھ لیتا ہے تو پھر وہ ہر دشواری کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے:

مرنے پہ جب آئے تو کسی شرط سے کیا کام
بستر ہے تو بستر ہے زمیں ہے تو زمیں ہے۔

ایک اور شعر میں دشواریوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت دیکھئے:

مجھ کو ہے غم سوز محبت میں بھی جینا
پروانہ نہیں ہوں جو قضا ڈھونڈھ رہا ہوں

آج کے اسلوب بیان میں "غم سوز محبت" کے بجائے "غم زیست کے شعلوں" کہہ لیجئے۔

اسی غزل کے ایک اور شعر میں دیکھئے خلوص و محبت کے اظہار میں کتنی تاثیر ہے:

محروم ہی محروم رہوں عمر بھر اے دوست
کچھ اور اگر تیرے سوا ڈھونڈھ رہا ہوں

خالص تغزل میں بھی عجب دلکشی ہوتی ہے۔ شاعر حسن کی ایک ایک ادا کی مصوری کرتا ہے:

بہکی بہکی نگہ ناز خدا خیر کرے
حسن میں عشق کے انداز خدا خیر کرے

لطف زبان کے ساتھ اسلوب کی شوخی دیکھئے۔ جذبات اور شگفتہ بیانی کے امتزاج سے کیسے کیسے خوبصورت شعر تیار ہوتے ہیں:

مدت سے سوئے چرخ بریں ہاتھ اٹھائے ۔۔۔ بیٹھا ہوا الفاظ دعا ڈھونڈھ رہا ہوں

آیا ہی تھا خیال بہار آ گئی بہار ۔۔۔ اس وقت کاش مانگتے تم کو خدا سے ہم

سادہ ورق جواب میں اک لا کے دے دیا ۔۔۔ دیوانہ جانتا ہے مرا نامہ بر مجھے

ہے وقت ابھی ہو سکتی ہے شکووں کی تلافی
کیا فائدہ محشر میں ادھر تم ہو ادھر ہم

الفت کا جواب الفت ہوتا تو مزا ہوتا
اک جام پلایا تھا اک پی بھی لیا ہوتا

مدتوں بعد کبھی اے نظر آنے والے
عید کا چاند نہ دیکھا تری صورت دیکھی

یہ مانا برق کو گلشن سے لاگ ہوتی ہے
تو کیا چمن میں ہمارا ہی آشیانا تھا

نہ دل میں لہو ہے نہ آنکھوں میں آنسو
غموں کی یہ جھڑی ہوئی آستیں ہوں

گلوں سے کھیل رہے ہیں نسیم کے جھونکے
قفس میں بیٹھا ہوا ہاتھ مل رہا ہوں میں

منظر صرف زبان اور تغزل ہی کے شاعر نہیں ہیں وہ عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تبصرے بھی کرتے ہیں:

مطمئن کب کسی تعبیر پہ انسان ہے ابھی
ہر خیال اپنی جگہ خواب پریشاں ہے ابھی

ہم چمن سے دور ہیں منظر تو ہوں دنیا پریشاں
فصل گل خیر آئی تو ہم کو نہ راس آئی تو کیا

ڈوبا ہے ہم کو لے کے سہارا کبھی کبھی
منجدھار بن گیا ہے کنارا کبھی کبھی

انداز برق پھول دکھائیں تو کیا کریں
گل ہی چمن میں آگ لگائیں تو کیا کریں

سارے گلشن سے ہے مجھ کو الفت
سارا گلشن مرا آشیاں ہے

سب سے آگے ہیں میرے ارادے
سب سے پیچھے مرا کارواں ہے

★



مظہر امام

نئے راستے نئی منزلیں

مرے عزیز! مہ و سال کی گزرگاہیں
ترے شعورِ سفر سے ہیں لَو لگائے ہوئے
وہ دیکھ عارضِ گلگونِ شاہدِ فردا
کہاں چلا ہے تو ماضی کی لاش اٹھائے ہوئے

ہے تیرا ساغرِ دل سوزِ آرزو سے تہی
تری خودی کو ابھی کچھ گداز ہونا ہے
خدا کرے کہ تجھے کوئی آستاں مل جائے
کہ تیرے ناز کو رشکِ نیاز ہونا ہے

ہے امتحاں ترے ذوقِ چمن طرازی کا
کہ بے شمار گل و لالہ در کفِ خاک است
"گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است"

ترا شباب ہو گر آندھیوں سے گرمِ ستیز
دل و نظر کے گلستاں لہک بھی سکتے ہیں
اگر یہ غازۂ برق و شرار سے کھیلیں
تری حیات کے عارض چمک بھی سکتے ہیں

تو سوئے منزلِ مقصد قدم بڑھا تو سہی
وہ مصرِ شوق، وہ شہرِ نگار راہ میں ہے
"سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے"

سیّد ابراہیم خلیل

تعمیرِ نشیمن

یہ آزادی صدیوں کی ہے جد و جہد کا ایک نتیجہ
لاکھوں انسانوں کی یہ قربانی اور ایثار کا ثمرہ
آزادی کے مل جانے سے ہوا ہے اپنا مقصد پورا
اس کی حفاظت کرنا اب ہم لوگوں کا ہے اک فریضہ
دیتے رہے ہیں درسِ اخوت، پڑھتے رہے ہیں پیار کا نغمہ
رکھتے ہیں ہمدردی سب سے وہ اپنا ہو یا کہ پرایا
سارے عالم میں شہرت کا باعث ہے اپنا یہ فسانہ
ہم ہیں عبث کے پرچارک، واقف ہم سے سارا زمانہ
ظلم و تشدد کے ماحول میں ہم نے امن کے نغمے گائے
جہل و جمود کی تاریکی میں علم و عمل کے دیپ جلائے
دل میں منزل کی جانب سے آگے بڑھنے کا اک جذبہ
رکھتے ہیں ہم ہندستانی اک فولادی عزم و ارادہ
ذہنوں میں ہے بھارت کی تعمیر و ترقی کا اک نقشہ
منزل کو پالینے کا ہم رکھتے ہیں اک سر میں سودا
اپنی جو کچھ پونجی ہے، وہ یہی ہے، اور یہ ہے گنجینہ
حکمت و فن اور علم و ہنر کا رکھتے ہیں پاس اپنے سرمایہ
لے کے چلے ہیں مستقبل کے کتنے حسین خوابوں کا تصوّر
اپنی منزل کے ہیں ہم ہی خود ہی راہی خود ہی رہبر
طرح طرح کے رنگیں پھولوں سے معمور ہے اپنا گلشن
اور عنادل اس گلشن کے کرتے ہیں تعمیرِ نشیمن
سب کے آگے آگے رہیں گے، ملک کی تعمیرِ نو میں ہم
اپنے ملک کی خوش حالی کے ہوں گے اسبابِ اہم
جب سب شہری مل کر اس کی تعمیرِ نو میں ہوں کوشاں
کیوں نہ بہاروں کا مسکن ہو پھر اپنا پیارا یہ گلستاں
تم کو خلیل اس ملک کے شہری ہونے کا اعزاز ہے حاصل
قافلۂ تعمیر و ترقی میں تم بھی ہو جاؤ شامل

جنگ آزادی کے اہم مقدمے

• عشرت علی صدیقی

اور

• ایس۔کے۔ ورما

چوری چورا کیس

اور

آئی۔این۔اے کیس

"جنگ آزادی کے اہم مقدمے" کے عنوان سے آل انڈیا ریڈیو سے کئی تقریریں نشر کی گئیں۔ ذیل میں ان میں سے دو تقریریں درج کی جا رہی ہیں۔ ایک چوری چورا کے واقعہ سے متعلق مقدمہ پر اور دوسری آئی این اے کے مقدمہ پر ہے۔ اول الذکر تقریر مسٹر عشرت علی صدیقی ایڈیٹر قومی آواز کی ہے اور دوسری ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس شری ایس۔ کے ورما کی ہے۔

گورکھپور ضلع کا مقام چوری چورا جنگ آزادی کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا ہوا ہے مگر اس سنہرے رنگ میں سرخی بھی شامل ہے۔ یہ سرخی کچھ تو ان ١٩ شہیدوں کے خون کی ہے جنھیں پھانسی کی سزا دے دی گئی تھی اور کچھ بدیسی حکومت کے ان کارندوں کے خون کی جنھیں قتل کر دیا گیا تھا۔ مگر چوری چورا کی کہانی صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ کچھ لوگوں نے کچھ آدمیوں کو قتل کر دیا اور تھانے کو جلا دیا اور بدیسی حکومت نے اپنی عدالت میں ان پر مقدمہ چلا کر انھیں پھانسی دے دی۔

آتش زنی اور قتل کا واقعہ ایک المیے کا صرف ایک سین ہے۔ اس ڈرامے میں کئی سین اور بھی ہیں۔ سنہ ١٩٢١ء کی ترک موالات کی تحریک میں گورکھپور اتر پردیش کے مشرقی اضلاع کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا۔ اس مرکز کی تیاری میں گاندھی جی، جواہر لال جی اور کئی دوسرے بڑے لیڈروں نے حصہ لیا تھا۔ سنہ ١٩٢٠ء میں گاندھی جی نے بالے کے میدان میں تقریر کرتے ہوئے کئی بار زور دے کر کہا تھا کہ ہمیں غلامی کی زنجیر کو توڑ دینا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے یہ نسخہ تجویز کیا تھا کہ بدیسی کپڑوں کا مکمل بائی کاٹ کیا جائے، بدیسی سرکار کے قائم کیے ہوئے انگریزی اسکولوں کو چھوڑ دیا جائے اور لوگ چرخہ کات کر اپنے کپڑے بنانا اور پہننا شروع کر دیں۔ جواہر لال جی اور دوسرے لیڈروں نے ضلع کے حصوں اور دیہاتوں کا دورہ کر کے باپو کے اس پیغام کو دور دور تک پہنچایا۔ بدیسی سرکار نے اس پرچار میں رکاوٹ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی جہاں جہاں لیڈروں کی آمد کی خبر ملی وہاں دفعہ ١٤٤ نافذ کر کے جلوسوں کی ممانعت کر دی جاتی۔ مگر ایسے احکام آزادی کے لیے پائے جانے والے جوش کو ختم نہیں کر سکے۔ اکثر جگہ احکام اور حکام کے پہنچنے سے پہلے جلسے کر لیے جاتے اور کبھی کبھی پورا جلسہ مجمع سمیت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا۔ یہ تدبیریں ستیہ گرہ کی تیاری کا ایک حصہ تھیں۔

ان تیاریوں کے لیے ایک مضبوط تنظیم قائم ہو گئی تھی جس کی جڑیں ضلع سے لے کر دور دور کے دیہات تک پھیل گئی تھیں۔ تحریک کا بگل بجتے ہی تاڑی شراب گانجہ اور بدیسی کپڑے کی دکانوں پر دھرنا ستیہ گرہ شروع ہو گئی۔ نتیجہ اور چوری چورا میں بھی تحریک چلانے کا فیصلہ ہوا۔ ان دنوں چوری چورا بدیسی کپڑوں کی ایک بڑی منڈی تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر وہاں ستیہ گرہ بھی پورے زور اور پوری تیاری سے چلائی گئی۔ ہر سنیچر کو وہاں بازار لگتا تھا بڑے پیمانے پر بدیسی کپڑے کی خرید فروخت ہوتی تھی۔ اس دن ستیہ گرہی بھی خاص طور پر مظاہرے کرتے تھے۔ دو مہینے سے وہ بدیسی کپڑے اور تاڑی شراب کی دکانوں پر دھرنا دے رہے تھے۔ تحریک کا زور توڑنے کے لیے بدیسی حکام نے پولیس کو خاص ہدایتیں دے دی تھیں اور انھیں زمینداروں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ ستیہ گرہیوں کو نہ صرف گرفتار کیا جاتا بلکہ ان پر لاٹھیاں بھی برسائی جاتیں۔ لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ —

"بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد"

ایک طرف جوش اور اُمنگ اور دوسری طرف ظلم و ستم بڑھتا رہا۔ گھوڑا سوار رسالے بلائے گئے اور ستیہ گرہیوں پر گھوڑے دوڑائے گئے۔ کتنے ہی زخمی ہوئے اور کتنوں ہی کے ہاتھ پیر ٹوٹ گئے۔ مگر جفا رو رح پر در بنتی گئی۔ البتہ جب ظلم حد سے آگے نکل گیا تو مظلوموں نے اپنی حکمت عملی بدل دی۔ پنڈت موتی لال نہرو اس علاقے کے لیے ستیہ گرہ کے نگراں یا رہ نما مقرر ہوئے تھے۔ انھوں نے ہدایت کی کہ ستیہ گرہی بڑے بڑے جتھوں کے بجائے چھوٹے چھوٹے جتھوں میں جائیں اور جب ایک جتھا پٹ جائے تو دوسرا جتھا بھیجا جائے۔

اس اثنا میں ضلع کانگریس کمیٹی سے مزید کمک آ گئی۔ ۴ جنوری ۱۹۲۲ء کو تحریک کا تیسرا اسنیچر پڑتا تھا۔ اس روز آزادی کے متوالوں نے اپنی طاقت کے بھرپور مظاہرے کا پروگرام بنایا۔ طے پایا کہ چاہے کتنے ہی ظلم ہوں پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ چار سو ستیہ گرہی دور دور سے آ کر اکٹھا ہوئے۔ جنھیں الگ الگ جتھوں میں بانٹ دیا گیا۔ اور جلوس برہم پور کے کانگریس دفتر سے چوری چورا کی طرف چل پڑا۔ وہاں کے پولیس انسپکٹر نے یقین دلا دیا تھا کہ اگر جلوس پُرامن رہے گا تو اس سے کوئی مزاحمت نہیں کی جائے گی۔ مگر تھانے میں مزاحمت کی بھرپور تیاری پہلے سے کر لی گئی تھی۔ شاید انسپکٹر کی یقین دہانی دھوکا دینے کے لیے تھی۔ بہرحال جب جلوس کا زیادہ تر حصہ تھانے سے آگے نکل گیا تو جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے ان کو پولیس والوں نے گالیاں دیں اور ان پر لاٹھیاں برسائیں۔ مار اتنی تیز تھی کہ ستیہ گرہیوں نے خطرے کی سیٹی بجا دی۔ ان کی آواز سُن کر آگے پیچھے سے دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ پولیس والے ان پر گولیاں برسانے لگے۔ کئی ستیہ گرہی ہلاک اور سیکڑوں زخمی ہو گئے۔ آخر پولیس والوں کے پاس کارتوسوں کا اسٹاک ختم ہو گیا۔ اور تب وہ اپنی جان بچانے کے لیے تھانے کے اندر بھاگ گئے۔ مجمع میں شامل کچھ لوگوں نے تھانے میں آگ لگا دی۔ اس کے بعد ایک روایت یہ ہے کہ جو لوگ اندر بند تھے وہ وہیں جل گئے اور ایک دوسری روایت یہ ہے کہ آگ لگنے پر وہ باہر نکل آئے اور مجمع نے انھیں قتل کر کے آگ میں جھونک دیا۔

مہاتما گاندھی نے اس واقعے پر گہرے رنج و الم کا اظہار کیا۔ ستیہ گرہ کی تحریک روک دی۔ اور کفارے کے طور پر برت رکھا لیکن بدیسی حکومت اور اس کے کارندوں کا غصہ شدید تر ہو گیا اور انتقام کی آگ تیزی سے بھڑک اُٹھی۔ کوشش یہ تھی کہ کچھ لوگوں کی غلطی کو بہانہ بنا کر آزادی کی تحریک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کچل دیا جائے۔ چنانچہ ۲۳۲ افراد کا چالان کیا گیا جن میں سے ۲۲۸ سشن سپرد کر دیے گئے۔ ان میں سے دو مقدمے کے دوران فوت ہو گئے اور ایک پر سے مقدمہ اُٹھا لیا گیا۔ عدالت سشن نے جن ۲۲۵ ملزموں کا فیصلہ سُنایا ان میں سے ۱۷۲ کو پھانسی اور دو کو دو دو سال قید سخت کی سزا دے دی گئی۔ پنڈت مدن موہن مالوی نے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی اور وہاں ۱۹ کے لیے پھانسی کی سزا بحال رہی۔ ۱۴ کو کالے پانی کی سزا دی گئی ۳۸ چھوڑ دیے گئے اور باقی کو ۸ سال سے دو سال تک کی قید سخت

کی سزا ہوئی
یہ فیصلہ ۳۰ اپریل ۱۹۲۳ء کو سنایا گیا۔ پھانسی کی سزا پانے والوں کی رحم اپیل وائسرائے نے پہلی جولائی کو خارج کردی اور دوسری جولائی کو سبھی ۱۹ آدمیوں کو پھانسی دے دی گئی ان میں سے تین اٹاوہ جیل میں تھے اور اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جس شخص نے تھانے دار کی بیوی کو جلنے سے بچالیا تھا اسے بھی بعد میں پھانسی کی سزا ہوئی۔

چوری چورا کے المیے کا ایک ڈرامائی نتیجہ یہ نکلا کہ گاندھی جی نے جو اس وقت باردولی میں ستیہ گرہ کی تیاری کر رہے تھے پورے ملک میں سول نافرمانی روک دی۔ انھوں نے کہا کہ جب ہندستان عدم تشدد کا رہبر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور عدم تشدد کے راستے سے آزادی کے تخت پر پہنچنے کی امید رکھتا ہے تو عوامی پیمانے پر تشدد چاہے وہ زبردست اشتعال کے جواب ہی میں کیوں نہ ہو، ایک بُرا شگون ہے۔ جن لوگوں کو گاندھی جی کے فیصلے سے مایوسی ہوئی انھیں سمجھانے کے لیے انھوں نے اپنے اخبار ینگ انڈیا میں لکھا کہ اگرچہ باردولی کے لوگ میری رائے میں ہندستان بھر میں سب سے زیادہ پرامن ہیں لیکن باردولی ہندستان کے نقشے پر صرف ایک نقطہ ہے۔ اس کی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک ملک کے دوسرے حصوں سے سب کو مکمل تعاون نہ ملے جس طرح زہر کا ایک ذرّہ دودھ کے پورے پیالے کو ناقابل استعمال بنادیتا ہے، اسی طرح سول نافرمانی کی تحریک میں چوری چورا کا قاتل زہر مل جانے سے باردولی میں شروع ہونیوالی تحریک کے پُرامن رہنے پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

اس سانحے سے چند ہی روز پہلے گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں وائسرائے کو ایک خط لکھا تھا جس میں مطالبات پورے نہ ہونے کی صورت میں تحریک کو شدید تر کردینے کا الٹی میٹم دیا گیا تھا۔ دوسرے لوگوں کی طرح گاندھی جی کے دل میں بھی یہ سوال پیدا ہوا کہ اس الٹی میٹم کے فوراً بعد تحریک روک دینے کے فیصلے سے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں ان کی بات کا وزن کم ہو جائے گا لیکن انھوں نے اسے شیطان کی آواز کہا۔ ان کا یہ فیصلہ اس اصول پر مبنی تھا کہ "انسان صحیح راہ سے اپنے انحراف کو برقرار رکھ کر کبھی اپنی منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔" یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ عملی پروگرام کی تبدیلی ممکن ہے سیاسی اعتبار سے نامناسب اور غیر معقول ہو انھوں نے کہا کہ مذہبی اعتبار سے یہ تبدیلی مناسب ہے اور اس معاملے میں میری جو ذلت ہوئی ہے اور میں نے غلطی کا جو اعتراف کیا ہے اس سے ملک کو فائدہ پہنچے گا۔ ...... ہمارے مخالفوں کو اگر ہماری ذلت یا نام نہاد شکست پر خوشی ہوتی ہے تو ہو۔ بزدلی یا کمزوری کا الزام لگنا اس سے بہتر ہے کہ ہم اپنی قسم توڑنے اور خدا کے خلاف گناہ کرنے کے مجرم بن جائیں۔ دنیا کے سامنے بے وفا ظاہر ہونا اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ ہم اپنے ساتھ بے وفائی کریں۔

گاندھی جی نے چوری چورا کا کفارہ ادا کیے جانے پر بھی زور دیا۔ انھوں نے لکھا کہ جو لوگ اس معاملے میں اپنے کو قصوروار سمجھتے ہیں اور اپنے قصور پر نادم ہیں انھیں میں صلاح دوں گا کہ وہ رضاکارانہ طور پر اپنے کو سزا کے لیے حکومت کے حوالے کردیں اور صاف صاف اقبال جرم کرلیں۔ چوری چورا میں جو تشدد ہوا اس کے لیے گاندھی جی یا کسی دوسرے لیڈر نے کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔ پھر بھی گاندھی جی نے تحریک کے بانی کی حیثیت سے اپنے کو قصوروار قرار دیا۔ اور کہا کہ بدقسمتی سے میری پوزیشن ایک ایسے سرجن کی سی ہے جو ایک مسلمہ خطرناک مریض کے علاج میں نااہل ثابت ہو گیا ہے۔ مجھے یا تو کام چھوڑ دینا چاہیے یا اپنے میں اور زیادہ اہلیت پیدا کرنا چاہیے۔

اس مقصد کے تحت انھوں نے پانچ روز کا برت رکھنے کا فیصلہ کیا اور کہا کہ میرے لیے کوئی چیز ایسی مفید اور پاکیزگی بخش نہیں ہے جیسا کہ برت جس میں ذہن کا تعاون بھی شامل ہو میرا برت ایک تپسیا بھی ہے اور سزا بھی۔ اور سزا برسرعام ملنی چاہیے۔ میرے لیے یہ ایک تپسیا ہے اور جن لوگوں کی سیوا کی میں

کوشش کر رہا ہوں ان کے لیے یہ سزا ہے گاندھی جی کے نزدیک محبت میں سزا کا واحد طریقہ ایثار اور قربانی کا تھا۔ اسی لیے انھوں نے دوسروں کو بیرت رکھنے سے منع کر دیا۔

چوری چورا کے مقدمے میں بدیسی حکومت کی عدالت نے جو سزائیں دی تھیں وہ انتقامی اور بہت زیادہ سخت تھیں ان کا مقصد یہ تھا کہ آزادی کے طلبگاروں میں دہشت پیدا کر کے تحریک کو ختم کر دیا جائے۔

اس کے برخلاف گاندھی جی نے محبت آمیز سزا کا جو طریقہ اختیار کیا اس سے جہاں ایک طرف تشدد کے رجحان پر موثر بریک لگ گیا وہاں دوسری طرف آزادی کے لیے عوام کا جوش ٹھنڈا پڑنے کے بجائے اور زیادہ تیز ہو گیا۔ اس جوش کو گاندھی جی نے تعمیری راہوں پر لگا کر تحریک کو پختہ کر دیا۔ اگرچہ آگے بڑھنے کی رفتار سست رہی مگر آخرکار قوم آزادی کی منزل تک پہنچ ہی گئی۔

آئی۔ این۔ اے کیس

جنگ آزادی کے اہم مقدموں میں آئی. این. اے ٹرائل کے نام سے جو مقدمہ مشہور رہے وہ تواریخی سیاسی اور قانونی تینوں ہی نقطۂ نظر سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے مگر ظاہر ہے کہ اس کے ان سبھی پہلوؤں کا مفصّل ذکر بیان اتنے کم اور محدود وقت میں ممکن نہیں وقت کی اس پابندی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی ممکن اور مناسب ہوگا کہ اس مقدمہ سے وابستہ جو ضروری واقعات ہیں، اس میں جو قانونی بحث پیش کی گئی ہے اور جو فیصلہ دیا گیا، میں صرف انھیں کا ایک مختصر و عام فہم تذکرہ کروں۔

اس مقدمے کا بنیادی تعلق سبھاش چندر بوس اور ان کے بنائے ہوئے آزاد ہند فوج کے بہادر سپاہیوں اور افسروں کے کارناموں سے ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں ایک ایسا وقت آیا کہ جاپان فتح پر فتح حاصل کرتا جا رہا تھا اور جب اس نے انگریزوں سے سنگاپور چھین لیا تو اسے تقریباً چالیس ہزار ہندستانی بطور جنگی قیدی (پرزنرز آف وار) ہاری ہوئی انگریزی حکومت کی طرف سے سونپا گیا۔ ان جنگی قیدیوں کو جاپانی حکومت کی طرف سے یہ موقع دیا گیا کہ وہ اپنی ایک الگ فوج بنالیں جو جاپانی فوج کی مدد سے ہندستان کو انگریزی حکومت کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ ان جنگی قیدیوں نے اس مشورہ پر عمل کیا اور ان کی ایک الگ فوج مرتب ہوئی۔ مگر یہ فوج اس وقت تک کوئی مستحکم قدم نہ اٹھا سکی جب تک اسے سبھاش چندر بوس کی رہنمائی حاصل نہ ہو پائی۔ سبھاش چندر بوس نے نہ صرف اس فوج کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی بلکہ ہندستانیوں کو ایک عارضی حکومت (پراویزنل گورنمنٹ) بنانے کی بھی تجویز پیش کی۔ لہٰذا ایک ایسی حکومت قائم ہوئی۔

حکومت کا مقصد رکھا گیا ہندستان کو انگریزی حکومت سے آزاد کرنا اور اس کے بعد ہندستانیوں کی ہی ایک مستقل حکومت بنانا۔ اس عارضی حکومت کو اٹلی، جاپان، جرمنی کچھ اور ملکوں نے تسلیم کر لیا۔ اس کے خرچ کے لیے بیس کروڑ روپے اکٹھا کیے گئے اور جاپان نے اس حکومت کو انڈمن اور نکوبار کے جزائر بھی سونپ دیے۔ اس طور پر اس عارضی حکومت کے پاس وہ سبھی چیزیں ہو گئیں جو ایک حکومت کے لیے ضروری مانی جاتی ہیں اس حکومت نے امریکہ اور برطانیہ حکومت کے خلاف جنگ کا باقاعدہ اعلان کیا مگر بدقسمتی سے اس حکومت کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ حاصل ہو پائی۔ اس کی کامیابی جاپان کی فتح پر مبنی تھی جو کہ چند روزہ ثابت ہوئی کیونکہ جاپان جنگ میں ہارنے لگا تھا سبھاش بوس کو اس کا اندازہ لگ گیا تھا۔ اس لیے وہ آزاد فوج کے سپاہیوں اور افسروں کے ہتھیار ڈال دینے کا انتظام کر کے ایک ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ٹوکیو کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس ہوائی جہاز میں آگ لگ گئی اور زخمی ہو کر اسپتال میں بھرتی ہو گئے مگر اس کے بعد کیا ہوا کچھ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا لیکن ان کی موت کا اعلان کر دیا گیا۔ آزاد ہند فوج کے سپاہیوں اور افسروں کو انگریزی حکومت نے قید کر لیا ان میں سے کچھ کو تو مار ڈالا گیا اور بقیہ کو قید کر کے ہندستان لایا گیا۔ اس کے بعد انگریزی حکومت نے ان میں سے تین افسروں پر فوجداری کا مقدمہ چلانا طے کیا۔ یہ تین افسر تھے کیپٹن شاہ نواز خاں، کیپٹن سہگل اور لفٹننٹ ڈھلن، ان پر دو جرم عاید کیے گئے۔ پہلا یہ کہ انھوں نے انگریزی سرکار کے خلاف جنگ کی، اور دوسرا یہ کہ انھوں نے خون کیا اور خون کرنے میں مدد کی۔

ان تینوں افسروں پر چلائے گئے مقدمے کی خبر ملک کے کونے



وزیر اعلیٰ

شری ہیم وتی نندن بہوگنا گزشتہ
۲۰ جون کو چھترپتی شیواجی کی تاجپوشی
کی تیسری صد سالہ تقریب کے موقع
پر شیواجی کے مجسمہ کو ہار پہناتے ہوئے



وزیر اعلیٰ

شری ہیم وتی نندن بہوگنا اپنی
سرکاری رہائش پر گزشتہ ۱۵ جون
کو مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ شری
ر س بھٹاچاریہ سے مصروف
گفتگو ہیں



سنگیت ناٹک اکاڈمی کے صدر شری گردیو سنگھ گرتہ ۲۹
ریاست کے سینئر آرٹسٹوں سشر یمتی شریدھولیتوری .ز



وزیر محنت و نقل و حمل شری راج منگل
"آم نسیم

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا گزشتہ
۲۰ جون کو بھانگر لکھنؤ میں سورگیہ چندر شیکھر
آزاد کے مجسمہ کی نقاب کشائی کرتے ہوئے







یہ لکھنو میں اترپردیش سنگیت ناٹک اکاڈمی کی جانب سے
بیگم اختر کو اعزاز پیش کرتے ہوئے

۲۹ جون کو رویندرالیہ لکھنؤ میں کل ہند
... ہیں

تھائی کوریا کے راج ستری یو۔ سا گر
جس کو وزیر اعلیٰ اترپردیش کی
سے وزیر محنت ولقل وحمل تر
راج منگل پانڈے گرتے ۲۹ جون
کلارک اودھ ہوٹل میں ایک خوبصورت
مرادآبادی آرٹ پیش کرتے ہوئے





اعلیٰ منتری ہیم وتی نندن بہوگنا گزشتہ ۱۵ جون کو ایک ہندی ہفتہ وار سیو اگرام کے خریف خصوصی شمارہ کی رسم
ادا کرتے ہوئے تصویر میں درمیان میں ایڈیٹر قومی آواز منتری حشمت علی صدیقی بھی بیٹھے ہوئے ہیں



یدیش کے وزیر مالیات منتری
ن دت تیواری اتر پردیش کے
لانہ بجٹ (۵، ۴، ۱۹ء) کو آخری
شکل دیتے ہوئے

کرنے میں پہنچ گئی اور سارے ملک میں حب الوطنی کی ایک عجیب و غریب لہر پھیل گئی۔ انگریزی حکومت کے اس برتاؤ کے خلاف ہر جگہ مظاہرے ہوئے۔ چنانچہ کانگریس نے ان کی دفاع کا فیصلہ کیا۔ سترہ وکیلوں کو کیا گیا جن میں بھولا بھائی ڈیسائی، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو اور پنڈت جواہر لال نہرو خود بھی تھے۔

مقدمہ ایک فوجی عدالت کورٹ مارشل کے سامنے پیش ہوا جو دلی کے لال قلعہ میں بیٹھی تھی۔ مقدمہ ۵ نومبر ۱۹۴۵ء کو شروع ہوا اور ۳۱ دسمبر ۱۹۴۵ء تک اس کی کارروائی لگاتار چلتی رہی۔ ان تینوں افسروں کی طرف سے بھولا بھائی دیسائی کے ہاتھ میں مقدمہ کی پیروی کی باگ ڈور تھی، اور انھوں نے نہایت قابلیت و ذہانت کے ساتھ اس ذمہ داری کو انجام دیا۔ مقدمہ میں زیادہ تر گواہان کی جرح اور شہادت ختم ہو جانے کے بعد کی بحث، دونوں انھوں نے ہی کی۔ وہ بیمار تھے اور مقدمہ ختم ہونے کے کچھ مہینے بعد تک زندہ رہ سکے مگر محنت میں انھوں نے کوئی کمی نہیں کی۔

ان کی وکالت کی قابلیت کا اندازہ ان دو باتوں سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ بھولا بھائی دیسائی نے جو شہادت ان افسروں پر جرم ثابت کرنے کے لیے انگریزی حکومت کی طرف سے پیش کی گئی تھی زیادہ تر اسی کا استعمال افسروں کی بے گناہی ثابت کرنے میں کیا۔ دوسرے یہ کہ اس بات کا علم رکھتے ہوئے کہ مقدمہ تجربہ کار و قانون داں ججوں کے سامنے نہیں ہے بلکہ ایک فوجی عدالت کے سامنے ہے انھوں نے اپنی بحث میں ایسی سلیس زبان اور طرز اظہار سے کام لیا کہ اس عدالت کے ممبران کو مشکل سے مشکل قانونی نقطے آئینے کی طرح نظر آ سکیں۔

بھولا بھائی دیسائی کی بحث کے خاص نقطے یہ تھے:

۱۔ بین الاقوامی قانون (انٹرنیشنل لا) کے تحت کسی قوم یا اس کے حصّے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسری قوم کے خلاف اعلان جنگ کر سکے اور اس قوم کا آزاد تسلیم ہونا ضروری نہیں ہے۔

۲۔ اگر آزادی اور جمہوریت کی اہمیت دنیا کے کچھ ٹکڑوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کی اہمیت دنیا کے ہر حصّے کے لیے ہے تو ہر ملک کے عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنے ملک کی آزادی کے لیے جنگ کر سکیں۔

۳۔ چونکہ آزاد ہند کی عارضی حکومت کے پاس وہ سبھی چیزیں مثلاً خزانہ، زمین، فوج وغیرہ، تھیں جو کہ ایک حکومت کے وجود کے لیے ضروری ہوتی ہیں، اس لیے اسے یہ پورا حق حاصل تھا کہ وہ اعلان جنگ کر سکے۔ اور ایسا اس نے باقاعدہ اور کھلے عام کیا بھی۔

۴۔ یہ مان لینے پر کہ آزاد ہند کی عارضی حکومت ایک باضابطہ قائم شدہ حکومت تھی، اور اس نے اعلان جنگ کیا تھا، اسے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ایسی صورت میں اس جنگ کی موزونیت اور مناسبت کی بابت کوئی سوال نہیں اٹھایا جا سکتا۔

۵۔ اگر ایک قوم یا حکومت یا سیاسی جماعت ایسی حیثیت رکھتی ہو اور اس کے پاس ایسے ذرائع ہوں کہ وہ اعلان جنگ اور جنگ کرے تو دوران جنگ اس قوم، حکومت یا جماعت کے کسی بھی ممبر کے کسی بھی فعل پر عام قانون عائد نہیں ہوتا۔

۶۔ چونکہ یہ افسران ایک ایسی ہی قوم، حکومت یا سیاسی جماعت کے ممبر تھے، اس لیے ان پر لگائے ہوئے جرم عاید نہیں ہوتے۔

۷۔ جہاں تک یہ سوال ہے کہ ان افسران نے آزاد ہند فوج میں شامل ہو کر فرماں برداری کے اس حلف کے خلاف قدم اٹھایا تھا جو ان پر انگریزی حکومت کی فوج میں ہونے کے ناطے عائد تھی۔ اس کے جواب میں یہ بات عیاں ہے کہ فرماں برداری کا وہ حلف مصنوعی تھا اور واقعتاً ان کی فرماں برداری صرف اپنے ملک اور قوم کے لیے ہی تھی۔ اور اگر انھیں باغی بھی تصور کیا جائے تو قانون یہ ہے کہ جب باغی اپنے ملک کے لیے لڑتے ہوں تو کسی طرح بھی فرماں برداری کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

۸۔ جہاں تک ان کے جنگی قیدی ہونے کا سوال ہے، یہ بات عیاں ہے کہ جوں ہی وہ آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے، وہ جنگی قیدی نہیں رہے۔ بہر صورت، جنگی قیدی کو بھی اپنے ملک کی آزادی کے لیے لڑنے کا حق حاصل ہے۔

۹۔ لہٰذا ان افسران پر کسی بھی نقطۂ نظر سے ان پر لگائے گئے

ہم عاید نہیں ہوتے۔

یہ قانونی نقطے اگر قانون داں اور تجربہ کار ججوں کی عدالت میں رکھے گئے ہوتے تو ان کی صحیح قدر ہو پاتی اور بہتر انصاف ہوتا۔ بھولا بھائی دیسائی نے جس قابلیت سے اس مقدمے میں بحث کی اس کی تعریف دنیا کے مانے ہوئے قانون داں لوگوں نے کی۔ انگلینڈ کے لارڈ چیف جسٹس کے تعریفی الفاظ یہ تھے کہ بھولا بھائی دیسائی نے فوجی عدالت کے سامنے ایک نہایت عمدہ تقریر کی جو بلند قانونی روایات کے بموجب تھی اور انصاف پر مبنی تھی۔ مگر فوجی عدالت کا فیصلہ تو جانا ہوا ہی تھا۔ فوجی عدالت نے بھولا بھائی دیسائی کے پیش کیے ہوئے قانونی نقطوں کو نیا اور عجیب قرار دیتے ہوئے تینوں افسران کو قصور دار ٹھہرایا اور ان کو تا عمر قید کی سزا دی۔ مگر اس وقت کے کمانڈر انچیف جنرل آچنلیک نے وائسرائے کو یہ مشورہ دیا کہ ان افسران کو فیصلے کے مطابق سزا دینے سے وہ شہید تصور ہونے لگیں گے اور ایک خطرناک صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ اس مشورہ کو مان لیا گیا اور ان افسران کو رہا کر دیا گیا اور یوں یہ قصہ ختم ہوا۔

★

ماہنامہ نیا دور۔ لکھنؤ کی ایجنسی کے شرائط

1- ایجنٹ حضرات کو نیا دور کی جتنی کاپیاں درکار ہوں ان کی چھپی ہوئی رقم کی دوگنی رقم بطور ضمانت پیشگی جمع کرنے پر ڈپارٹمنٹ سے نیا دور کی کاپیاں بھیجی جاتی ہیں اور یہ رقم اس وقت تک جمع رہتی ہے جب تک ایجنسی برقرار رہتی ہے ایجنسی کے ختم ہو جانے پر یہ رقم واپس کر دی جاتی ہے
2- کم سے کم پانچ کاپیوں کی خریداری پر ایجنسی دی جاتی ہے۔
3- غیر فروخت شدہ کاپیاں ڈپارٹمنٹ واپس نہیں لیتا۔
4 ایجنٹ حضرات کو نیا دور پر ۲۰ فیصد کمیشن دیا جاتا ہے
5 مطلوبہ کاپیاں بعد وضع کمیشن ذریعہ وی پی بھیجی جاتی ہیں وی پی کے اخراجات ڈپارٹمنٹ خود برداشت کرتا ہے۔
6 کاپیاں ڈپارٹمنٹ باقاعدہ شمار کرکے احتیاط کے ساتھ بھیجتا ہے۔ اگر راستے میں کاپیاں کم ہو جائیں یا ان کو کسی قسم کا نقصان پہنچ جائے تو ڈپارٹمنٹ پر اس کی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

ترسیل زر کا پتہ — سپرنٹنڈنٹ انفارمیشن سی ڈپارٹمنٹ
اترپردیش، لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن ڈپارٹمنٹ
اترپردیش، لکھنؤ

کے۔ صلاح الدین

دُمدار ستاروں سے وابستہ توہم پرستی

تاریخی پس منظر میں

میں یہ کہہ کر بات ختم نہیں کر دوں گا کہ دُمدار ستارہ نکلنے تو بیسیوں حضرات اس وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اب نہ جانے کیا بلا آنے والی ہے کون سی آفت نازل ہوگی۔ نہ جانے کس بڑے آدمی کی موت کا سبب بنے گا یہ تارہ، قحط نازل ہوگا یا طاعون پھوٹ پڑے گا جنگ ہوگی یا قحط سالی وغیرہ وغیرہ۔

میں یہاں اس بات کا تفصیلی جائزہ لینا مناسب سمجھتا ہوں کہ کس زمانے سے انسان اس وہم میں مبتلا ہے؟ یا وہ کون شخص تھا جس نے ان خیالات کا بیج بویا جو آگے چل کر تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا اور آج ہم اس ایٹمی دور ATOMIC AGE (جسے میں PLASTIC AGE کہنا زیادہ مناسب اس لیے سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور کے انسان کو پلاسٹک نے ہر شعبۂ زندگی میں جس ڈھنگ سے اپنا ممنون کیا ہے وہ ایٹم نہ کر سکا۔ اور نہ آئندہ توقع کی جا سکتی ہے اس لیے کہ انسان کی ہوس ہمیں ایسا سوچنے کی اجازت نہیں دیتی) میں پیدا ہونے کے باوجود اسی درخت کی چھاؤں میں پڑے ہانپ رہے ہیں۔

یوں تو ہر صاحب عقل سے لے کر معمولی ذہن رکھنے والے انسان کے لیے بھی آسمان پر جو بھی چیز نظر آتی ہے وہ حیرت افزا ہے لیکن روز روز کے مشاہدے نے سورج، چاند ستاروں وغیرہ کی وقعت اس حد تک کھو دی ہے کہ ہم انھیں دیکھ کر نہ تو حیرت زدہ ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے وہم کا شکار۔ "اس کے خلاف "کسوف و خسوف" کا ظہور کم ہوتا ہے اس لیے ہم ان کو دیکھ کر ایک قسم کا خوف و قلق محسوس کرتے ہیں۔" اور دمدار ستارے جو کہ کبھی کبھی نظر آتے ہیں اس لیے ان کا اثر قوی اور دیرپا ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے ظہور کو (عام حضرات) کسی مصیبت کا پیش خیمہ سمجھ کر گھبرا اٹھتے ہیں۔ ان کے بارے میں جدید سائنس نے بڑی تفصیلی معلومات ہم کو دی ہیں۔ ان دمدار ستاروں کے بارے میں بڑی عجیب عجیب باتیں کہتے ہیں۔ پہلے جس شخص نے دمدار ستاروں کا ذکر کیا تھا وہ ایک یونانی فلسفی تھا۔ نام "دیموقریطس" بتایا جاتا ہے۔ جو مسیح سے قریباً پانچ سو سال قبل پیدا ہوا۔ اس نے بیان کیا کہ دمدار ستارہ نتیجہ ہے دو ستاروں کے مجتمع ہونے کا۔ ارسطو دیموقریطس کے خیال سے انحراف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ستاروں کے اقتران کا نتیجہ نہیں بلکہ نتیجہ ہے ان اجزا کا جو زمین سے اٹھ کر بلند ہو...

حضرت مسیح سے ایک سو سال قبل پیدا ہونے والے ایک حکیم سنیکا رومانی نے بھی علم و حکمت کو پیش نظر رکھ کر بحث کی۔ ان قدما میں کسی نے بھی خیال ظاہر نہیں کیا کہ دمدار ستاروں کے ظاہر ہونے سے بلائیں آتی ہیں۔ اگر دنیا کی قدیم ترین تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو دمدار ستاروں کا ذکر سب سے پہلے اہل چین کے پاس ملتا ہے لیکن تعجب تو اس بات کا ہے کہ اہل چین جیسے عجیب و غریب فطرت والے بھی دمدار ستاروں کے طلوع کو فال بد تصور نہیں کرتے بلکہ اس کے طلوع و غروب اور واقع ظہور سے بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ پھر انھیں فال بد سمجھنے کی بدعت کہاں سے اور کب شروع ہوئی؟ آیئے اس پر غور کریں۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ دمدار ستارہ سے وابستہ توہم پرستی کو ہوا دینے والے فلسطینی باشندے ہیں۔ کیونکہ یہودی خیال کرتے تھے کہ یہ خدا کے قہر و غضب کی تلوار ہے جس کے ذریعہ فرشتے گناہگاروں کو ہلاک کرتے ہیں۔ چنانچہ اس خیال نے بڑھتے بڑھتے قرون وسطیٰ میں مستحکم قلعہ کی صورت

اختیار کرلی۔

جب ۴۲ قبل مسیح میں دمدار ستارہ نظر آیا تو لوگوں نے کہا یہ جولیس سیزر کی روح ہے جو دیوتاؤں کے پاس جارہی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ جولیس سیزر کو ایک سازش کے تحت قتل کیا گیا تھا ورنہ عوام میں وہ بڑا ہر دلعزیز تھا اور اس کے بارے میں عوام اچھی رائے رکھتے تھے۔

ابن اثیر ۸۳۷ء (۲۲۳ھ) کے حوادث کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اسی سال قبلہ کے بائیں جانب سے ایک ستارہ نمودار ہوا جو مسلسل چالیس راتوں تک دکھائی دیا یہ بہت طویل اور دمدار تھا جسے دیکھ کر لوگ بہت دہشت زدہ ہوئے۔" یورپ کے لوگوں پر اس دمدار ستارہ کو دیکھنے سے جو خوف وہراس چھایا رہا اس کے متعلق خود شاہ فرانس (لوئیس اول) کے رئیس المنجمین نے جو لکھا ہے وہ بھی سنئے۔

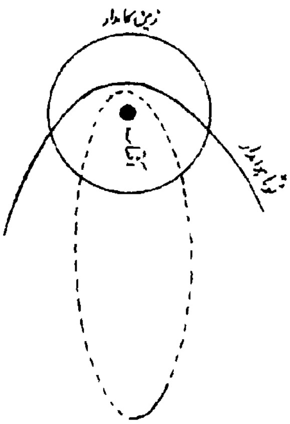
"جب بادشاہ کو اس ستارہ کے طلوع کی خبر معلوم ہوئی تو وہ سخت مضطرب ہوا اور تمام علمائے دربار کو جن میں میں بھی شامل تھا طلب کرکے دریافت کیا کہ اس ستارہ کے طلوع کا کیا مطلب ہے اور یہ کس مصیبت کی نشاندہی کرتا ہے میں نے عرض کی کہ کل تک کی مہلت عطا ہو اس نے کہا میں جانتا ہوں کہ اس کا نتیجہ ایک بادشاہ کی موت اور دوسرے کی تخت نشینی ہے۔ تم اس خبر کو مجھ سے چھپانا چاہتے ہو۔ لہٰذا ابھی تم سب محل کی چھت پر جاؤ اور سارا حال دریافت کرکے مجھے بتاؤ۔ جب تمام منجموں نے دیکھا کہ بادشاہ کے دل سے یہ خیال نکل نہیں سکتا تو سب نے متفقہ طور پر کہہ دیا کہ اس کا ظہور گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے ہو رہا ہے چنانچہ اس خیال کے اظہار کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ اپنے چال چلن اور اخلاق کی درستی کی طرف مائل ہوگیا اور متعدد گرجے تعمیر کر دیئے۔"

اسی طرح صلیبی جنگوں کے دوران میں اس قسم کے ستاروں کو بڑی اہمیت دی گئی تھی۔ جب کبھی اس ستارے کی دم منحنی یا آڑی ترچھی ہوتی تو اسے نیمچہ سے تعبیر کیا جاتا اور سیدھی ہوتی تو بھالے سے۔

دور کیوں جایئے اس زمانہ میں بھی عام طور پر لوگ دمدار ستارے کو نحوست کی علامت سمجھتے ہوئے اسی قسم کے توہمات کے شکار ہیں۔ دمدار ستارے کو اس قدر مطعون ٹھہرانے کی وجہ صرف اس کی دُم ہے اگر اس کے دُم نہ ہوتی تو شاید لوگ اسے نظر انداز بھی کر دیتے اور "جھاڑو تارے" کا نام اسے دے کر اس غریب کے منھ پر جھاڑو نہ پھیرتے۔

ہیلی کا دمدار ستارہ جو ۱۹۰۹ء میں طلوع ہوا تھا دورہ کرنے والے ستاروں میں سے ہے اور پچھتّر سال کے وقفہ سے نظر آتا ہے ۱۰۶۶ء میں جب یہ ظاہر ہوا تو اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا جب ولیم نے انگلستان فتح کیا تھا اس لیے انگلستان والوں نے اپنے مصائب کی بنیاد اسی کو قرار دیا۔ ابن اثیر بھی اسی ستارے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

" ۱۰۶۶ء (۴۵۸ھ) میں ۱۰ جمادی الاول ایک بڑا ستارہ مشرق کی طرف رونما ہوا جس کی دم بہت لانبی تھی اور وسط آسمان تک چلی گئی تھی۔ یہ ستارہ ۲۷ جمادی الاول تک نظر آتا رہا اور پھر غائب ہو کر غروب آفتاب کے وقت اس مہینہ کے آخر میں دکھائی دیا۔



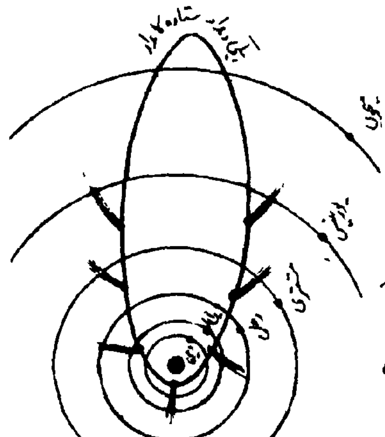
رات ہو جانے پر جنوب کی طرف اس کی دم پھیلی ہوئی نظر آنے لگی اور اس طرح دس دن تک برابر نظر آیا۔ اس واقعہ نے لوگوں میں سخت اضطراب پیدا کر دیا۔"

یہی ستارہ جب ۱۴۵۶ء (۸۶۰ھ) میں نظر آیا تو وہ حسن اتفاقاً طلوع ہوا تھا اور اس زمانے میں اسے بے پناہ اہمیت دی گئی تھی۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب قسطنطنیہ حال ہی میں فتح ہوا تھا اور سلطان محمد ثانی کی فتوحات کا شور وغوغا یورپ میں بلند ہو رہا تھا۔ اس دمدار تارے کے ظہور کے متعلق ابن ایاس کیا کہتا ہے یہ بھی سنئے۔

"۸۶۰ھ کے وسط جمادی الاول میں ایک طویل دمدار ستارہ ظاہر ہوا جو مشرق کی طرف سے طلوع ہوتا تھا یہ برابر دو ماہ تک

نظر آتا رہا۔ اس کے بعد ہی مصر میں طاعون پھوٹ پڑا، پھر اسکے بعد آگ لگ گئی "۔

یورپ کے مورخ بھی اسی انداز میں ان ستاروں کا ذکر کرکے توہم پرستی کو مواد دیتے رہے۔ لیکن سائنس کیا کہتی ہے؟ آئیے سائنس کی روشنی میں ان دمدار ستاروں کا انتہائی طائرانہ انداز میں جائزہ لیتے چلیں آپ تو جانتے ہونگے کہ یہ دمدار ستارے ہوتے تو دو اقسام کے ہیں ایک میعادی دوسرے غیر میعادی یعنی ایک وہ جو مقررہ سالوں میں برابر نظر آجاتے ہیں اور دوسرے وہ جو ایک بار ہی نظر آکر غائب ہو جاتے ہیں۔ ذرا تفصیل سے سنیے۔ نظام شمسی کے تمام سیارے سورج کے گرد ایک معینہ خط پر گردش کر رہے ہیں (جنھیں مدار کہتے ہیں) جس میں ہماری زمین بھی شریک ہے۔ دمدار ستارے بھی ہمارے نظام شمسی کے ماتحت ہیں اس لیے وہ بھی سورج کے اطراف پھرا کرتے ہیں لیکن ان میں بعض بہت وسیع دائرہ (یہاں دائرہ کا لفظ غلط استعمال ہوا ہے اس لیے کہ ایسے دمدار ستاروں کا مدار بے حد بیضوی ہوتا ہے جیسے ہیلی[1] دمدار ستارہ کا) بناتے ہیں۔ نیچے دیے ہوئے خاکہ میں میں نے ہیلی کے دمدار ستارہ کے مدار کو ظاہر کیا ہے۔



اسے دیکھنے کے بعد سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ ہیلی کا دمدار ستارہ ۷۵ سال کا وقفہ دے کر کیوں ظاہر ہوتا ہے اس کے برخلاف " انکی دمدار ستارہ " سورج سے قریب رہ کر اپنا دائرہ قائم کرتا ہے

یہی وجہ ہے کہ وہ ۳ۢ سال کے وقفہ سے نظر آجاتا ہے۔ اور بعض کا مدار اس درجہ بیضوی (ELLPTICAL) ہوتا ہے کہ وہ ہزارہا سال بعد اپنی جھلک دکھا پاتا ہے مثلاً ۱۸۱۱ء میں جو دمدار ستارہ رونما ہوا تھا وہ اب تین ہزار سال سے زیادہ عرصہ بعد نظر آئے گا۔ اور بعض دمدار تاروں کا بیچ میں سے کٹا ہونے کی وجہ سے وہ چھوٹے ٹکڑے ایک بار نظر آجاتے ہیں پھر اس کے بعد وہ ہوتے ہیں۔ اور کائنات کی ناقابل اظہار وسعتیں اور ہم نے ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ کہتے رہ جاتے ہیں۔

اس کی دُم کیوں نکل آتی ہے؟ یہ بات ہر ایک کے ذہن میں سوالیہ نشان بن کر آسکتی ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ " دمدار تاروں کا قلب شہاب ثاقب کے نہایت چھوٹے چھوٹے اجسام سے ترکیب پاتا ہے جو سورج کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ جب وہ سورج سے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں تو ان میں حرارت بہت بڑھ جاتی ہے اور سورج کی شعاعیں اپنی قوت دافعہ سے ان کے گیسی مادہ کو ڈھکیلتی ہیں جو ایک طرف دم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور سورج کی روشنی کی وجہ سے روشن ہو جاتا ہے "۔

دمدار ستارہ چاہے کسی بھی مدار پر گردش کرے اس کی دم سورج کی مخالف سمت میں رہے گی۔ اس کے خلاف کبھی ہوا ہے اور نہ ہوگا۔

★

[1] ہیلی کے دمدار ستارہ کو ہندوستان کے اکثر اصحاب نے ۱۹۰۹ء میں دیکھا ہوگا۔

سعید عارفی

آتش کی شاعری میں رنگ و آہنگ

آتش کی شاعری پر گفتگو شروع ہوتے ہی دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کی فنی اور لسانی باہمی آویزش اور ناسخ اور آتش کی معاصرانہ چشمک کی گتھیاں کچھ اس طرح سامنے آجاتی ہیں کہ کلام آتش کی فنی اور لسانی خصوصیات، رجحانات اور محرکات کی بھرپور پرکھ ناممکن ہو جاتی ہے ناسخ اگر دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر ہیں تو آتش کے رجحانات پر دہلویت کی چھاپ نظر آتی ہے. مگر اس بات کا محاکمہ بہت کم کیا جا سکا ہے کہ کیا واقعی آتش دہلویت کی قبیل میں ہیں یا پھر لکھنؤ اسکول کی صاف ستھری اور صالح روایات کے نمائندہ شاعر ہیں.

اس ضمن میں سب سے پہلے ہمیں "لکھنویت" کیا ہے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنا چاہیے۔ تفصیلات میں نہ پڑ کے اگر ہم اجمال سے کام لیں تو کہا جا سکتا ہے کہ لکھنویت خوش باشی، خوش اوقاتی، طرب انگیزی لذت کوشی اور نشاط پرستی کے رجحانات سے عبارت ہے۔ نفاست پسندی، سلیقہ مندی مینا کاری اور مرصع سازی اس کے اجزائے ترکیبی ہیں: تکلف اور تصنع لکھنویت کی جان ہیں. شعر کی دنیا میں یہ رجحانات لفظ کی مرکزیت کے روپ میں ابھرتے ہیں۔ جہاں خیال اور جذبہ لفظ کے تابع ہے کیونکہ مرصع سازی کا عمل الفاظ کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ شاعری کی ساری اساس رعایت لفظی پر ہوتی ہے۔ آمد، بے ساختگی اور تکلف کے بجائے لکھنؤ اسکول کی شاعری آورد کی پروردہ ہے خیال بندی اور مضمون آفرینی کے سہارے یہ شاعری اپنے قدم آگے بڑھاتی ہے. محاورہ بندی اور صنعتوں کا التزام یہ وہ خصوصیات ہیں جو لکھنؤ اسکول کی شناخت بن گئی ہیں۔ آتش کے یہاں بھی یہ رنگ اپنی پوری آب تاب کے ساتھ نظر آتا ہے دور از کار مضامین جن کی تحریک جذبہ کی صداقت اور جوش سے نہیں ہوتی، تراش خراش کے بعد ڈھل ڈھلائی شکل میں اشعار کی صورت اختیار کرتے ہیں اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے

ہوائے تند سے پتہ کوئی اگر کھڑکا
سمندِ بادِ بہاری کو تازیانہ ہوا

خیال آیا ہے ہم کو ان دنوں مضمون گیسو کا
زمین شعر پر نازل بلائے آسمانی ہے

بیرنگ روزگار سے آتش عجب نہیں
چھلا اتار لے دزدِ حنا دست یار سے

راہ میں اکثر کنواں بنواتے ہیں لوگ آپ بھی
فی سبیل اللہ چاہِ زنخداں کیجیے

آتش بھی حد اعتدال سے پرے مبالغہ سے کام لے کر جدت طرازی کا حق ادا کرتے ہیں تخیل کی ندرت اور جدت خیال کی بلند پرداری اور پیچیدگی تصور میں دور از کاری لکھنؤ کا فن تھا۔ آتش نے بھی زمانے کے مزاج کی خوشنودی اور اپنی استادی کا لوہا منوانے کے لیے اس رنگ میں شعر کہے اور بڑی تعداد میں کہے۔ مگر یہ فن کاری آتش کے کلام کی امتیازی خصوصیت نہیں ہے. برخلاف اس کے آتش کی شاعری کا امتیازی نشان یہ ہے کہ دبستان لکھنؤ کی عمومی خصوصیات (جن میں اعتدال اور غیر فطری عناصر کی بڑی حد تک کارفرمائی تھی) سے الگ ہٹ کر لکھنویت کے عطر کو اپنی شاعری میں سمو دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ لکھنویت کا عطر کیا تھا جسے آتش نے اپنی شاعری میں سمولیا۔ درحقیقت خوش دلی اور خوش وضعی، خوش مزاجی، خوش افعالی اور خوش گفتاری کی فضا لکھنؤ پر تمام وکمال محیط تھی۔ ان اوصاف کا مطاہرہ مختلف طبائع مختلف سطح پر کر رہے تھے۔ ابتذال اور رکاکت کی سطح پر یہی چیزیں لذتیت، تعیش، ہوسناکی اور بدمستی کے روپ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ مگر تہذیب کی منزل پر پہونچ کر ان کا رنگ شائستہ لطف اندوزی، خوش طبعی اور خوش باشی ہو جاتا ہے۔ پروفیسر سید وقار عظیم نے اسی نکتے کی وضاحت بہت خوبی کے ساتھ کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "لکھنؤ مزاج کی وہ آزادروی جو ایک سطح پر اپنے آپ کو ہر قید و بند سے آزاد سمجھتی ہے، جب تہذیب و شائستگی کی پابندی اختیار کرتی ہے تو صرف اس اصول پر عمل پیرا ہوتی ہے کہ انسان غم کے احساس سے چھٹکارا پاکر خوشی کے ساتھ ربط پیدا کرے اور زندگی کو حسرت و ناکامی کے بجائے امید وکامرانی کا سرچشمہ جانے۔ بیان کے تکلف و تصنع میں جب شرافت شائستگی اور تہذیب، نفاست اور نزاکت پیدا ہوتی ہے تو بیان لطافت آمیز اور پرکار سادگی بندش کی کیف آور چستی اور دل نشیں و دلکشا رعنائی کی صورت اختیار کرتا ہے لکھنؤ کی اعلیٰ تہذیبی سطح پر یہی چیزیں لکھنؤ کے معاشرتی تہذیبی مزاج کی لازمی قدریں ہیں اور یہی وہ قدریں ہیں جنھیں آتش نے اپنایا اور برتا ہے اور اپنا کر اور برت کر اپنی شاعری کو ایسا لہجہ دیا ہے جس میں لکھنویت کے بانکپن اور تیکھے پن کے ساتھ وہاں کی تہذیب اور شرافت کا رنگ بھی جھلک رہا ہے اور اس کے نغموں کی گونج اور مہک بھی سنائی دے رہی ہے۔"

آتش کی شاعری کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ لفظی صنعت گری، پُرتکلف مبالغہ آرائی اور محاورہ بندی کے شوق میں جکڑی ہوئی زبان سے کام لے کر جو تصویریں وہ بناتی ہے ان میں جذبہ احساس کے گرم خون کی روانی بھی ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لکھنویت اپنی ترقی یافتہ صورت میں ان کے اشعار کا جزو بنی ہے۔ ان کے یہاں لفظوں کے استعمال کا بانکپن حقیقی جذبات اور واردات کے انشراح میں رکاوٹ نہیں بنتا بلکہ اسے ایک نئی جہت اور چستیٔ بندش عطا کرنے کا سبب بنتا ہے:

ہوائے دورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

جنوں میں خاک اڑاتا ہے ساتھ ساتھ اپنے
شریکِ حال ہمارا غبار راہ میں ہے
تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گل مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

نہ پوچھ حال مرا چوب خشکِ صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

شربت وصل تو ناممکن و ناپیدا ہے
زہر ملتا تو علاج شب ہجراں کرتے

آتش کے اشعار میں لکھنؤ کا معاشرہ اپنی تمام تر لطافت، آزادروی اور نشاط کوشی کے ساتھ پرتو فگن ہے۔ ان کے یہاں بنیادی طور پر راحت و بےغمی کی فضا ملتی ہے۔ ان کے یہاں اس مرکزی تصور کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں۔ راحت کا احساس، راحت کی تمنا اور کبھی کبھی راحت کی حسرت بھی نظر آتی ہے مگر یاس و ناامیدی نہیں۔ ان کے یہاں طلب اور طرب کا دور دورہ ہے، آتش کے اپنے بے پروا، وسیع المشرب، فقیر منش اور ان کی دوست مزاج نے بھی سرخوشی و سرمستی کی اس فضا کو استحکام بخشا۔ چنانچہ حسین خیال اور رنگینیٔ فکر سے کام لے کر آتش نے ذوق لطیف، شوق فراواں، ہوش طرب اور نشاط غم کی جن تصویروں میں رنگ آمیزی کی وہ خود ان کے اپنے مزاج کی تخلیق کردہ ہونے کے باوجود معاشرہ کے مزاج سے بھی ہم آہنگ ہوگئیں۔ تکلف اور تصنع کے واضح رجحان کے باوجود جذبہ کی گرمی اور احساس کی تڑپ ان اشعار میں جاری وساری ہے۔ چنانچہ شاعر کی فکر رنگیں خیال کا خاکہ کھینچ دیتی ہے۔ اور الفاظ کی بندش مرصع ساز کے فن کارانہ ہاتھوں فن کے اعلیٰ معیاروں کی حامل بن جاتی ہے۔

تہذیب و شائستگی نزاکت اور طہارت کی پابندیوں کی آنچ میں تپ کر لکھنؤ کا خارجیت پسند عشق آتش کے اشعار میں کندن بن کر دمکتا ہے۔ آتش کے عشقیہ اشعار میں "جسم کی آنچ" تو بہت ملتی ہے لیکن ہوسناکی اور سوقیت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ محبت اپنے تمام تر خلوص، سچائی

اور پاکیزگی کے ساتھ نہیں فطری انداز اپنے جنسی نیز صحت مند اور ترقی یافتہ تربیت یافتہ اور دارمنی ہونے کے باوجود رفعتوں کی حامل نظر آتی ہے۔ مصحفی کے سلسلہ تلمذ کی بدولت اور لکھنؤ کے معاشرے پر عورت کے غلبہ کی بنا پر محبوب کی شخصیت میں حقیقت کا رنگ نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں حسن کے مختلف رنگ خوشبو، لباس کی شوخی اور جسم کی لطافت کے منظر دکھائی دیتے ہیں۔ آتش کی اردو عشقیہ شاعری کو سب سے بڑی دین یہ ہے کہ انھوں نے حسیات کو فروغ دیا۔ قوت شامہ اور لامسہ کی بیداری نے جسم کی خوشبو دار لطافت کے تذکرہ کو عام کیا۔ آتش کے کلام میں شامہ کی برانگیختگی ملاحظہ ہو :

مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت بوئے پیرہن تیری

خوشبو سے ہو رہا ہے معطر دماغ جاں
چلتی ہے کس طرف کی ہوا کچھ نہ پوچھیے

بدن میں جان تازہ آ گئی ہے سونگھے سے آتش
عجب خوشبو ہے اس گل پیرہن کے باسی ہاروں کی

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

تار تار پیرہن میں بھر گئی ہے بوئے دوست
مثل تصویر خیالی میں ہوں یا پہلوئے دوست

آتش کا معاملۂ عشق خیالی یا محض روحانی رابطہ نہیں ہے بلکہ ان کا محبوب ہماری آپ کی دنیا کا جیتا جاگتا گوشت پوست کا محبوب ہے۔ محبوب سے ان کا اختلاط بھی ہوتا ہے۔ وہ محبت کی گرم جوشی میں برابر کا شریک ہے۔ آتش کے نزدیک محبت افلاطونی جذبہ نہیں ہے بلکہ دو انسانوں کے درمیان جسم اور جسمانیات کے تمام تقاضوں سے بھرپور ایک تعلق ہے۔ یہ رجحان ان کے ذیل کے اشعار سے اور واضح ہو جائے گا :

شب وصل تھی، چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا، خدا مہرباں تھا

ہوا مہماں آکر رات بھر وہ شمع رو برسوں
رہا روشن مرے گھر میں چراغ آرزو برسوں

حسن تکلیف لب بام اسے کرتا ہے
شرم سمجھاتی ہے سایہ پس دیوار نہ ہو

جو دیکھتے تری زنجیر زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

حال مجنوں تو نہیں نوع دگر دیکھا کچھ
سارباں آج ہے کیوں چہرۂ لیلیٰ اترا

عشقیہ شاعری کے سلسلے میں آتش کا کارنامہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر محبت کی ارضیت کے باوجود اس میں ابتذال کا کوئی پہلو نہیں پیدا ہونے پاتا۔ ان کے یہاں محبت کا معاملہ خالص انسانی سطح پر قائم ہے۔ ان کا محبوب بھی عاشقوں کی طرح محبت کرنے والا دل رکھتا ہے اور نشاط محبت میں عاشق کے ساتھ برابر کا شریک ہے۔ وہ خود عاشق کی پریشانی سے پریشان ہو جاتا ہے۔ سپردگی اور جاں سپاری کے تمام تر جذبات محبوب کے دل میں موجزن ہیں۔ یہ عشق خالصتاً ارضی ہے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور "اس میں جسم کی آنچ، اعضا کا نقش جمیل، زخم کی مہک، جذبے کی گرمی اور ذوق شوق کی لذت ہے۔ آتش اردو کے پہلے عاشق سرشار ہیں۔" ربودگی، سرشاری اور والہانہ پن کی کیفیات سے مملو چند اشعار دیکھیے :

کوچۂ یار میں چلیے تو غزل خواں چلیے
بلبل مست کی صورت سے غزل خواں چلیے
دن بسر ہوتا ہے یوں سودے میں کوئے یار کے
دھوپ سے اٹھے تو بیٹھے سائے میں دیوار کے

رتن سنگھ

افسانہ

اصل مالک

پہلے دن جب اس نے اپنے دفتر کی عظیم الشان عمارت میں قدم رکھا تھا تو اس نے محسوس کیا تھا کہ اس عمارت کی بڑی بڑی دیواریں، ہال، کمرے، برآمدے، برآمدوں کے ستون، یہاں تک کہ اس کا ایک ایک پتھر ایک ایک اینٹ، سب کے سب زندہ تھے اور باقاعدہ سانس لے رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ جس طرح اس کے جسم میں لہو دوڑ رہا ہے لیکن محسوس نہیں ہوتا اسی طرح اس عمارت کے ذرّے ذرّے میں ہمارے عوام کے دل دھڑک رہے ہیں، اس عمارت کی رگوں میں خون دوڑ رہا ہے اور زندگی رواں دواں ہے۔

اور جب اپنی کرسی پر بیٹھ کر اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی تھی تو چاروں طرف دور تک بکھری ہوئی میزوں پر جھکے ہوئے انسانوں کو اپنے اپنے کام میں مصروف دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا تھا کہ کہیں دماغ کام کر رہے تھے۔ کہیں آنکھیں کچھ تلاش کر رہی تھیں، کہیں ہاتھ تیزی سے کام کر رہے تھے اور کہیں قدم حرکت میں تھے۔ اور اس طرح وہ سب کے سب ایک جسم، زندہ جسم کی طرح مصروف عمل تھے اور ان کے گرد اونچی اونچی دیواریں، بڑی بڑی چھتیں، اور چھتوں کو سہارا دیتے ہوئے بڑے بڑے ستون بڑے فخر سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔

پھر اس نے اپنی پہلی فائل کھولی۔ پہلے کاغذ کو چھو کر دیکھا ایک میلا سا مڑا تڑا کاغذ۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی تحریر پڑھتے پڑھتے دور کسی گاؤں میں، اپنے کھیتوں میں اپنے ہل کی نوک سے قوم کی قسمت تحریر کرتا ہوا کسان، سر پر بڑی سی میلی سی پگڑی باندھے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا گڑگڑا رہا تھا۔

”حجور آپ ہمرے مائی باپ ہیں۔ ہمرے ساتھ بڑا جلم ہوئی گوا۔ بٹیا کی سادی پر بنیا سے ستوروپے ادھار لین رہا۔ تو ان اب ہم سے پانچ سو، حجور، پورے پانچ سو مانگت ہے۔ ہم گریب منئی اتی بڑی رکم نہیں دے سکت ہے۔۔۔ میں آپ کے پائے لاگت ہوں حجور۔“

عرضی پڑھتے پڑھتے اس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ غریب کسان سچ مچ اس کے سامنے کھڑا ہو، جیسے سچ مچ اس نے اس کے پاؤں چھو لیے ہوں۔ اور اسے بہت برا لگا ہو کہ وہ کسان، جو ساری قوم کا کاتب تقدیر ہے، وہ جو اپنا خون پسینہ بہا بہا کر زمین کی کوکھ سے اناج پیدا کرتا ہے۔ اناج جس کے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا اور وہ جو اپنے ووٹ سے حکومت چلانے کے لیے اپنا نمائندہ بھیجتا ہے وہ اُن عوام کا ایک فرد ہے جو ساری حکومت، حکومت کے بڑے بڑے دفتروں اور ایوانوں کے مالک ہیں۔ جہاں قوم کا نشان، قومی جھنڈا لہراتا ہے۔ جس کے سامنے ساری قوم سرنگوں ہوتی ہے۔ اسی طرح اس نے محسوس کیا کہ اس کے سامنے میلی کچیلی پگڑی باندھے ایک غریب کسان ہاتھ جوڑے نہیں کھڑا ہے۔ بلکہ ساری حکومت کا مالک اور ایک طرح سے اس کا حاکم اعلےٰ کھڑا ہے جو اس کے سامنے اپنی عرضی نہیں لایا بلکہ حکم دے رہا ہے کہ اس کا یہ کام ہونا چاہیئے۔

اسے بڑی شرمندگی کا احساس ہوا کہ اس کے سامنے اس کا

مالک تو ہاتھ جوڑے کھڑا ہے اور وہ کرسی پر جس شان سے بیٹھا ہے وہ جلدی سے اٹھا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا جیسے وہ اس کسان سے کہنا چاہتا ہو "حضور آپ تشریف رکھیں۔ میں ابھی آپ کا حکم بجا لاتا ہوں"۔

اس نے سامنے دیکھا۔ سامنے کوئی نہیں تھا۔ ایک کونے میں اس کا چپراسی وردی پہنے چاق وچوبند کھڑا تھا۔ اپنے افسر کو کھڑا دیکھ کر وہ جلدی سے آگے بڑھا اور بولا "حضور کوئی حکم"۔

اس نے ایک نظر سامنے دیکھا۔ اس کے تصور میں اس کی نگاہوں میں کسان اب بھی ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے ہی فائل پر لگے ہوئے اس میلے، مڑے تڑے کاغذ کو دیکھا اور پھر حکم لکھا کہ کوآپریٹو بینک ایک ہفتہ کے اندر اندر اس کسان کو قرضہ دے تاکہ وہ بنیے کے قرض سے نجات حاصل کر سکے اور جلدی سے فائل چپراسی کے ہاتھ دے دی۔

اس نے قلم رکھ کر اس عمارت کی دیواروں، اور ستونوں کی طرف دیکھا۔ ان کی رگوں میں زندگی کا خون تیزی سے دوڑنے لگا تھا"۔

★

آتش کی شاعری میں رنگ وآہنگ

(صفحہ ۳۷ کا بقیہ)

چنانچہ اسے یہ سوچنے کی نہ فرصت ہوتی ہے اور نہ مہلت کہ شاعر نے فکر و خیال کے اظہار کے سلسلے میں الفاظ کو کس طرح استعمال کیا ہے اور شعر میں لفظی خوبیاں کون کون سی ہیں۔ بڑی شاعری کی پہچان بھی یہی ہے کہ مواد اور ہیئت میں ایسی ہم رنگی پیدا ہو کر دونوں میں امتیاز کرنا غیر ممکن ہو جائے۔ آتش کے لہجہ کی انفرادیت کا راز ان کے مزاج کی قلندرانہ آزاد روی میں پنہاں ہے۔ ان کے لہجے کی ہماہمی، معرکہ آرائی اور جاں سپاری انبساط ونشاط، سرمستی اور آلودگی کی کیفیت ہی ان کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ آتش کے کلام پر مولانا محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں تبصرہ کرتے ہوئے ان کے فکر وفن پر جو رائے دی ہے وہ اپنی صحت کے اعتبار سے آج بھی آخری سند کا درجہ رکھتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے۔ "آتش کی آتش بیانی نے استاد کے نام کو روشن کیا بلکہ کلام کی گرمی اور چمک دمک نے استاد شاگرد کے کلام میں اندھیرے اجالے کا امتیاز کیا"۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "جو کلام ان کا ہے حقیقت میں محاورۂ اردو کا دستور العمل ہے اور انشا پردازی ہند کا اعلیٰ نمونہ۔ شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اسی سے معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے شعر کہہ دیے ہیں۔ ان کے کلام نے پسند خاص وقبول عام کی سند حاصل کی اور نہ فقط اپنے شاگردوں میں بلکہ بے غرض اہل انصاف کے نزدیک بھی مقبول اور قابل تعریف ہوئے"۔

★

مہدی پرتاب گڑھی

۱۵ اگست

عزیزو! ہم وطنو! پھر اگست آیا ہے نئے حیات پیامِ نشاط لایا ہے
ہر ایک دشت و دمن آج مسکرایا ہے وطن کا اپنے اک اک ذرہ جگمگایا ہے
ہر ایک خار ہے رعنائیٔ حیات لیے
ہر ایک ذہن ہے تعمیر کی صفات لیے

مآل ہے یہ شعورِ بشر کی محنت کا وطن میں اپنے جو دور آیا ہے مسرت کا
صلہ ملا ہمیں یک جہتی و محبت کا ہر ایک ذہن سے پھوٹا ہے نور حکمت کا
فضائے امن و مسرت ملے ہے ہر جانب
حیاتِ نو کی علامت ملے ہے ہر جانب

اک "آفتاب" کی خاطر بجھے ہزاروں نجوم سنائیں جو سنی گزریں ہزار ہا حلقوم
قدم ڈگا نہیں پایا، یہ موتیوں کا ہجوم زمانہ رکھ نہ سکا دیر تک ہمیں محکوم
اگست آ ہی گیا لے کے منزلوں کا سلام
ہوا یہ خانۂ تاریک آفتاب تمام
نہ جانے کتنے ہی برسوں کی جستجو ہے اگست چمن کی آن ہے غنچوں کی آبرو ہے اگست
متاعِ حسنِ بہاراں ہے رنگ و بو ہے اگست رگِ حیات میں بہتا ہوا لہو ہے اگست
اگست بن کے جب آیا سفیر آزادی
فضائے ہند میں گونجی نفیر آزادی

اگست راہ گزر بھی ہے اور منزل بھی اگست موجِ رواں بھی ہے اور ساحل بھی
اگست خلوتِ جاناں بھی اور محفل بھی اگست ہی رگِ جاں بھی ہے قوتِ دل بھی
اگست ایک امانت ہے اس کی قدر کرو
جب آئے وقت تو خونِ جگر بھی نذر کرو

تابش صدیقی

سب ساتھ چلیں

اک پرچم اونچا کرنے کو ہم اہلِ جنوں کے ہاتھ اٹھیں
یہ جہدِ حیات ہے دیوانو لازم ہے کہ ہم سب ساتھ اٹھیں

ساقی کے اشاروں پر چل کر
محفل کی نئی تنظیم کریں
اک دوسرے کی تعظیم کریں
اک دوسرے کے دمساز رہیں
ہر موقع پر ہم رنگ ملیں
ہر بزم میں ہم آواز رہیں

ہیں فرقہ پرست لبوں کو سیئے چھپ زرداری کا سپیرا ابھی
ہم جس کے لیے مر مر کے جیئے اب دور نہیں وہ سویرا ابھی

ڈھل جائے گی دکھ کی رات چلیں
ہاتھوں میں دیے ہم ہاتھ چلیں
منزل کی طرف سب ساتھ چلیں

حضرات کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ایسا اسلوب رائج کیا جس کے ذریعہ ہندی زبان اور ادب کو پھلنے پھولنے کے مواقع میسر ہوئے۔

حقیقت میں بھارتیندو بابو ہریش چند کے تعمیر کیے ہوئے راستے پر گامزن ہونے کی وجہ سے ہی آج ہندی زبان اور ادب دنیا کی تمام زبان اور ادب کے سامنے اپنا سر بلند کئے ہوئے ہے۔ ان کے عہد میں ہندی زبان کا فطری ارتقا ہوا۔ اس سلسلے میں ان کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ ہندی کے پہلے نثر نگار ہونے کی وجہ سے ان کی ذمہ داری بھی عظیم تھی۔ اس ذمہ داری کو انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ پورا کیا۔ اسی لیے ہندی زبان و ادب کے عظیم محقق ادیب اور تنقید نگار رام چندر شکلا نے لکھا ہے کہ ہندی زبان کی نکھری ہوئی صاف ستھری شکل بھارتیندو بابو کی فکر اور فن کے ساتھ ظہور میں آئی۔ انھوں نے ادب کو ایک نئی راہ دکھلائی اور "ادب برائے زندگی" کی شاہراہ پر گامزن ہو کر ادب اور زندگی کے بیچ کی خلیج کو پُر کیا۔ ان عظیم الشان خدمات کی بنا پر ہندی زبان و ادب کی تاریخ میں بھارتیندو بابو ہریش چند کا خصوصی اور ناقابل فراموش مقام ہے۔

★

غزل

احترام اسلام اشک

اس کی تصویر سینے میں ہے آج بھی
جس کو کہنا پڑا تھا کبھی اجنبی

تازہ خبروں پہ آؤ سنیں تبصرہ
سامنے ہی تو دکان ہے چائے کی

اس کی باہوں میں سمٹی رہی رات بھر
وہ مری کلپناؤں میں کھوئی ہوئی

کیا پکاروں کسی کو کہ معلوم ہے
میری آواز صحرا میں کھو جائے گی

کل کی ہر بات کیوں یاد ہے آج تک
کل کو گزرے ہوئے ایک مدت ہوئی

مصلحت کی تمازت بھری دھوپ میں
ہر کلی آرزوؤں کی کمھلا گئی

زہر پینا پڑا سوچ کر یہ مجھے
مار ڈالے نہ احساسِ تشنہ لبی

جوں ہی یادوں کے مندر میں داخل ہوا
مل گئی سامنے ہی تری مورتی

اشک آنکھوں میں اس نے بٹھایا مجھے
اس کے کمرے میں ٹوٹی ہوئی کھاٹ تھی

احمد جمال پاشا

مزاحیہ

بھولنا

ان لوگوں پر بڑی حیرت ہوتی ہے جنھیں پیدائش سے پیتر کے زمانے تک کے واقعات اس طرح یاد ہوتے ہیں جیسے آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہوں۔ پیتّر کے زمانے کی یادگار تو اب صرف وہ پیتر دل لوگ رہ گئے ہیں جن کو مجوبہ سے فائر بریگیڈ تک بے شمار ٹیلی فون نمبر، دوستوں اور دشمنوں کے پتے زبانی یاد ہوتے ہیں۔ یہ آپ کو بتائیں گے کہ ۵۰ سال پہلے فلاں راجہ صاحب کے پوتے کے مونڈن میں کلکٹر صاحب کے کس جملے پر محفل لوٹ پوٹ ہو گئی تھی جس کی نقل دادا جان کے منھ چڑھے ملازم بھوندو نے کتنی مزیدار اتاری تھی۔ پھر یہ آپ کو فلمی اداکاروں، کرکٹ کے کھلاڑیوں، جرائم پیشہ حضرات اور آس پاس تک کے خاندانوں کے شجرے، تاریخ پیدائش، سالگرہ، تعداد رومان، اسکینڈل، شادی، انتقال اور عروج و زوال کی داستانیں اس تفصیل سے سنائیں گے کہ آپ حیرت میں پڑ جائیں۔

مجھے یہ سب سن کر اس لیے حیرت ہوتی ہے کہ یہاں تو یہ تک نہیں یاد رہتا کہ کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں۔؟ دن تاریخ پوچھنے کے بعد بھول جاتا ہوں" بجلی کا بل جمع کرنا ہو تو ڈاکخانے کی لائن میں لگ جاتا ہوں۔ اگر کوئی داہنے یا بائیں طرف جانے کو کہے تو مجھے اس کا داہنا، بایاں پوچھنا پڑتا ہے۔

ایک ماہر نفسیات نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آخر کتنے لوگ بھلکڑ ہونے کے باوجود (چاہے وہ مرد ہوں یا عورت) بلا کپڑے پہنے گھر سے باہر نکل آتے ہیں۔ گھر کے باہر تو ایک دن صبح صبح میں بھی دودھ ڈبل روٹی لینے نکلا، ہر شخص مجھے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ بھلا بھُنا گھر میں گھسا تو گھر والی کا ہنسا کھل گیا۔ لیکن میرے آپے کے اندر ہونے سے پہلے انھوں نے یہ بتا کر شرمندہ کر دیا کہ "میں ان کا پاجامہ پہنے ہوئے ہوں۔" میری شرمندگی اس وقت دور ہوئی جب اپنا پتہ پوچھنے والے صاحب اپنا نام تک بھول گئے۔ خیر وہ تو صبح کے بھولے تھے اور شام کو گھر لوٹنا چاہتے تھے۔ مجبوری یہ تھی کہ ان کی ڈائری کھو گئی تھی جس میں ان کا نام پتہ درج تھا۔ مگر وہ ان لوگوں سے بہتر تھے جو بوتل میں ڈوبنے اور تاش کی میز پر ابھرنے کے بعد ہفتوں گھر نہیں پہنچتے تو گھر کیا! گھر بھر انہی کے پاس چلا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو آپ نے کبھی غسل خانے میں کھانا کھاتے، باورچی خانے میں نہاتے اور چارپائی کے نیچے سوتے دیکھا ہو گا۔

لیکن اس بھولنے کا کوئی مقابلہ دوا پینے کی پابندی سے نہیں کیا جا سکتا۔ دوا خرید لینا اور پرچہ ترکیب استعمال سمجھ لینا بیحد آسان ہے۔ ہر دوا کھانے یا ناشتے سے پہلے یا بعد میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے یاد آنے کے لیے ناشتے یا کھانے کا سامنے آ جانا بہت کافی ہے۔ لیکن اس کے باوجود مریض کیا ڈاکٹر تک دوا پابندی سے استعمال نہیں کر پاتے۔

ماہرین نفسیات نے اس کی وجہ "بھولنا" بتائی ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ ماہر نفسیات، مریض سے زیادہ بھلکڑ ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک میرے بھی چچا ماہر نفسیات ہیں اور ہر قسم کی دواؤں کے عاشق چچا زندگی بھر دوائیں خریدنے کے باوجود ایک بار بھی وقت پر دوا نہ پی سکے۔ میرے نزدیک ان میں اور ان لوگوں میں کوئی فرق نہیں جنھیں زبردستی پکڑ کر دوا پلائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے چچا کا خیال ہے کہ 'دوا علاج

ں فرسودہ نظام میں اگر انقلابی تبدیلیاں فوراً نہیں لائی گئیں
نقلاب آجائے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ "ہر ڈاکٹر ڈبل فیس وصول کرلے
ے دوا کی دوسری اسے پلانے کی تاکہ ڈاکٹر صبح شام مریض کے گھر جاکر
ے زبردستی دوا پلا سکے۔ اگر مریض شورہ پشت ہو تو ڈاکٹر اس کی
ں میں رپٹ لکھا دے تاکہ پولیس کا اڑن دستہ پہنچ کر مریض کو
یٹ کر دوا پلا دے"۔ چچا کو یقین ہے کہ جب کبھی اس سلسلے میں حکو
ری کمیشن بٹھالا، تو وہ ان کے قیمتی مشوروں سے ضرور فائدہ اٹھا
گا۔

جن دواؤں کی پبلسٹی زیادہ ہوتی ہے ان کا تعلق مرض سے زیادہ
دھ بھارتی اور ریڈیو سیلون کے تازہ ترین فلمی گانوں سے ہوتا ہے۔
ا تیر بہدف دوائیں ہمیشہ چچا کی جیبوں میں ناجائز استعمال کی
ر رہتی ہیں ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ "نورانی تیل" تو ہمیشہ چچا خریدتے
، مگر فائدہ ہم اٹھاتے ہیں۔ "امرت دھارا" وہ لاتے ہیں مگر استعمال
، آتا ہے چچی کے۔

دوا تو شاید کبھی غلطی سے چھاپے وقت استعمال کر لیتے ہوں مگر
خانے میں خط ڈالنا، آخر کسے یاد رہتا ہے۔؟ اس معاملے میں اس
ہ دار آدمی تک پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا جو سیدھا ڈاکخانے جا
ہو یا ڈاکیہ ہو۔ نہ اس کی قسم پر بھروسہ کرنے کی ہمت کی جا سکتی ہے۔
فرمائش اگر کوئی مجھ سے کر بیٹھے تو میں سمجھوں گا کہ اس نے مجھے پہچانا نہیں
لہ جب میں کوئی بہت ضروری خط پوسٹ کرنے کے لیے اسے احتیاطاً
ں میں دبا کر نکلتا ہوں تو کئی ڈاکخانے اور لیٹر بکس گزر جانے کے بعد
یر احتیاط کے لیے خط جیب میں رکھ لیتا ہوں۔ پھر کوئی بے تکلف
ست چائے خانے میں لے جاتا ہے۔ گپ لڑا کر ہم رخصت ہو جاتے
ں۔ آخر سال بھر بعد وہ شخص عذاب کی طرح نازل ہو جاتا ہے جس
خط کا مجھے جواب پوسٹ کرنا تھا۔ میں ڈاکخانے کی بھاگ دوڑ سے
نے کے لیے یہ خط اسے اس لیے دے دیتا ہوں کہ وہ آدمی ہے کوئی لیٹر بکس
یں۔ دستی خط میں یہی فائدہ ہوتا ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ پہنچ جاتا ہے۔
ے پوسٹ کرنے کے لیے بھٹکنا نہیں پڑتا۔ خط کے سلسلے میں مجھے بھی
ست خانہ جنگیوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ایک دفعہ مجھ پر خط کھو دینے

کا الزام لگ گیا۔ ثبوت کے طور پر میں نے خط جیب سے نکال کر اس
سے دست برداری کا جب اعلان کیا تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔
"بھلا آپ کو میرے ماں باپ کی بیماری سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے؟"
اور پیر پٹکتی ہوئی ڈاکخانے چلی گئیں۔ کئی دن بعد انتہائی ڈرامائی طور پر
یہ ان کے پرس سے اس طرح نکلا جیسے لیٹر بکس سے خط۔ احتیاطاً ہم دونوں
اسے ایک ساتھ پوسٹ کرنے نکلے۔ ان کی راستے ہی میں شروع ہو جانے
والی خریداری سے واپسی کے بعد ہم پر یہ خوف طاری ہو گیا کہ آخر یہ تاریخی
خط کب تک اسی طرح ہمارا پیچھا کرتا رہے گا۔

خیر میں تو ڈاک میں خط ڈالنا ہی بھولتا ہوں لیکن یار لوگ
تو دوسروں کے یہاں سائیکل، جھولا، چھتری اور چھڑی تک بھول
جاتے ہیں۔ چھڑی، سائیکل اور جھولا تو آدمی انتخابی وعدوں کی طرح
یاد بھی رکھ سکتا ہے مگر چھتری یاد رکھنا عملاً ناممکن ہے۔ مجھے چھتری لے کر
چلنے کا اسی طرح شوق ہے جیسے دل پھینک نوجوانوں کو گرل فرینڈ
کا چھتری کھونے کی رفتار سے میں خریدتا بھی رہتا ہوں مگر میں کبھی کبھی
جاؤں، ہر واپسی پر ایک اور چھتری گمشدگی کی دنیا میں پہنچ جاتی
ہے۔ علاوہ میری اس پھٹی پرانی چھتری کے، جسے جو ژنگ بڑے خلوص
سے واپس کر جاتے ہیں۔ اس میں تیلیاں اور کپڑا تقریباً نہ ہونے کی
وجہ سے اب یہ چھتری سے زیادہ چھڑی کا کام دیتی ہے۔ دن میں
بچے اس سے گھوڑ گھوڑا کھیلتے اور پیٹتے ہیں۔ رات میں اس سے میں
کتے بھگانے کا کام لیتا ہوں۔

پھر بھی بارش اور دھوپ سے بے تعلق اگر یہ پرانی چھتری کھو بھی
جائے تو مجھے اتنی پریشانی نہ ہو گی جتنی ریل یا بس پر بکس اور بستر بند
تک بھول جانے والے مسافروں کو ہوتی ہے۔ اسٹیشن پر ایک بار
دو ٹرینوں اور دو باراتوں کا کراس ہوا۔ سامان بدل جانے کی وجہ سے
باراتی بے حد پریشان اور دولہا میاں پسینہ پسینہ تھے۔ میں نے ہمدردی
کرتے ہوئے پوچھا: "آپ لوگ کیا چیز بھول گئے؟" دولہا میاں نے
مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اجی بھولے سے دلہن بدل گئی۔!"

کہا جاتا ہے کہ بھولنے والے اچھی یادداشت نہ رکھنے کی وجہ
(باقی صفحہ ۵۲ پر)

خدا حافظ صدیقی

یوم آزادی

میکشوں میں صبحِ عشرت کا پیام آہی گیا　　ہاتھ میں ساقی لیے بادہ و جام آہی گیا
جذبۂ مردکشاں بھی آج کام آہی گیا　　جشنِ آزادیٔ "بھارت" کا پیام آہی گیا

ہے اگست کی پندرہ تاریخ اپنی عید ہے
یہ ہمارے جاودانی عیش کی تمہید ہے

میکدہ میں ہو رہا ہے جشنِ عشرت ہر طرف　　چشمِ انساں کو یہ حیرت ہے وہ دیکھے کس طرف
پیکرِ حسن و ادا ہیں مے بہ ساغر بہ کف　　میکشوں کو حکمِ ساقی ہے "تکلف برطرف"

ہوشیار میکدہ میں ہر طرف مینا و دف
پیرِ میخانہ کا یہ ارشاد ہے "ساغر بہوش"

آج کے دن پیرِ میخانہ کا فیضِ عام ہے　　میکدہ ہے، بربط و مینا ہے، خم ہے، جام ہے
کہتا ہے ساقی مری جانب سے اذنِ عام ہے　　پی سکو جتنا بھی، پینا تمہارا کام ہے

میکدہ میں میکشوں کے واسطے تنگی نہیں
آج کے دن ساغر و مینا پہ پابندی نہیں

آج کا دن ہے ہمارے واسطے یوم النجات　　جاں دے کر ہم نے پائی دیکھیے راہِ حیات
یہ نہ تھا ممکن ہمیں ملتی کبھی راہِ نجات　　"ہند" میں پیدا نہ ہو جاتی جو گاندھی جی کی ذات

سرفروشانِ وطن کا جب کبھی آئے گا نام
حرفِ زریں میں لکھا جائے گا گاندھی جی کا نام

بھر دیا ہے آج ساقی نے مئے عشرت کا جام　　جشنِ آزادی میں شامل ہیں تمامی خاص و عام
آج گو ہم میں نہیں وہ مصلحانِ ذی کرام　　خون جو اپنا بہا کر کر گئے "بھارت" کا نام

آشتی و صلح کا جو دے گئے ہم کو پیام
ہم کو لازم ہے کریں یاد ان کی با صد احترام

سوچیے کیا ہم کو باپو کی نصیحت یاد ہے؟　　کیا جواہر کی ہم کو وہ محبت یاد ہے؟
ملک تو آزاد ہے آزادی بھی کیا یاد ہے؟　　جاں فروشی بادہ نوشانِ وفا کیا یاد ہے؟

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

آئیے ہم پھر کریں تجدیدِ پیمانِ وفا　　ہاتھ سے اپنے نہ چھوٹے اب کبھی دامانِ وفا
ڈگمگانے پائے اب ہرگز نہ ایمانِ وفا　　اب نہ بجھنے دیجیے شمعِ شبستانِ وفا

پھر اسی شوکت سے اپنا "ہند" میں جینا ہے
پھر ہمیں میکش ہیں ساقی ہے مینا ہے

اوم پرکاش بجاج

اے وطن پیارے وطن

اے وطن پیارے وطن تجھ کو مرے سو سو سلام
مطلعِ مشرق سے نیا اُبھرا ہوا تارا ہے تو
تیرے ہر باسی کا شیوہ امنِ عالم کا قیام
دہر میں انسانیت کا اصل گہوارہ ہے تو

تیرے پربت اونچے اونچے تیرے جھرنے دلفریب
سر بسر اُمید سے لبریز ہیں تیرے چمن
تیرا پرچم ہے فضا میں عظمتوں کا اک نشاں
ضامنِ تنویر تو ہیں تیرے فن کاروں کے فن

ارضِ گاندھی دھوم ہے تیرے عمل کی ہر طرف
ایک ہیں تیری نظر میں شیخ ہوں کہ برہمن
تیرے میخانے سے ملتی ہے شراب اشتراک
قابلِ تقلید ہے تیرا زمانے میں چلن

تیری ہستی کر رہی ہے آج ہر غم کا علاج
تجھ کو دنیا تکتی ہے رہبری کے واسطے
جب اُبھرتی ہے کہیں کالی گھٹا آلام کی
ملتجی ہوتے ہیں سارے روشنی کے واسطے

بیگم شارق علوی

اُتر پردیش سائنس اور ٹیکنولوجی کے میدان میں

ایک مشہور و معروف مفکر چارلس لنڈبرگ نے لکھا ہے کہ سائنسداں کے لیے یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ اس کے پاس ایسے ذرائع موجود نہیں ہیں جن سے وہ اپنی ایجادات کو صرف تعمیری کاموں کے لیے مخصوص رکھ سکے اور انھیں تخریبی کاموں میں استعمال نہ ہونے دے۔ وہ اپنی تحقیقات کو اس طرح محفوظ بھی نہیں رکھ سکتا کہ اس کے دشمن خود اس کی ایجادات و تحقیق سے اس کو ہی تباہ و برباد نہ کر سکیں۔ آج وہ اپنے کو جن حالات میں محفوظ و مسرور پاتا ہے کل وہی حالات اس کو تباہی اور بربادی کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔"

لنڈبرگ کا یہ قول حقیقت کی غمازی کرتا ہے اور ہر سائنسداں اس سے واقف ہے لیکن پھر بھی وہ اپنی دھن میں مگن قدرت کے خفیہ خزینوں کی تلاش میں لگا ہوا ہے اور آئے دن انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ پرکیف و پرمسرت بنانے کے لیے نئی نئی ایجادات کرتا رہتا ہے۔ آج ہم کو جو بے بہا نعمتیں سائنسدانوں نے عطا کر رکھی ہیں۔ وہ ہمارے بزرگوں کو میسر نہ تھیں۔ دنیا جس تیز رفتاری سے ارتقا کی منزلیں طے کر رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آنے والی نسلوں کو ہم سے بھی کتنی زیادہ سہولتیں اور آسائش کے ذرائع فراہم ہوں گے۔ ساتھ ہی ساتھ سائنس و ٹیکنولجی کی ترقی سے دنیا جس تباہی و بربادی سے ہمکنار ہو سکتی ہے اس کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے ایٹم بم اس کا مظہر ہیں۔

سائنس کے مطالعہ کو دو حصّوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے، ایک تو خالص علمی جسے PURE SCIENCE کہتے ہیں اور دوسرا وہ کہ جس میں سائینس کی مدد سے ضروریات زندگی کی چیزوں کو مہیا کرنے میں مدد ملتی ہو جسے APPLIED SCIENCE یا ٹیکنولجی کہتے ہیں۔"

اوّل الذکر میں صرف نظریاتی کھوج بین ہوتی ہے اور اصول مرتب ہوتے ہیں جبکہ موخر الذکر میں انھیں نظریاتی اصولوں کو عملی شکل دینے کے لیے اور ان سے زندگی کی ضروریات آسانی و خوش اسلوبی سے کس طرح پوری کی جائیں اس کا مطالعہ ہوتا ہے۔

درحقیقت یہ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں ایک معمولی سی مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی نیوٹن نے سب سے پہلے اس بات کا پتہ لگایا اور ثابت کیا کہ سورج کی روشنی سات رنگوں یعنی بینگنی، اودی، نیلی، ہری، پیلی، گلابی اور لال رنگوں کی روشنی سے مل کر بنتی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے اور بہت سے خالص علمی نظریات و اصول پیش کیے جو عام آدمی کے لیے سوائے اس کے کہ اسکی عام معلومات میں اضافہ کریں زیادہ معنی نہیں رکھتے لیکن یہی خالص علمی نظریات اور اصول ٹیکنولجی کے میدان میں کام کرنے والے سائنسداں کے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انھیں اصولوں کی روشنی میں اس نے ایسے آلات تیار کیے جو مختلف طریقوں سے انسان کے لیے معین و مددگار ثابت ہوئے۔ ان میں سے اسپیکٹروگراف اور اسپیکٹرومیٹر کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسپیکٹروگراف کسی چیز میں دھات یا ان کے مرکب کے اجزا کا جن کی مقدار خواہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو، تجزیہ بآسانی کر دیتا ہے۔

اس کا اندازہ آپ یوں لگا سکتے ہیں کہ اگر کسی مردہ انسان کے بارے میں یہ شبہ ہے کہ اس کی موت زہر کھانے سے ہوئی ہے تو اسپیکٹروگراف کی مدد سے صرف اس کے سر کے ایک بال کی جانچ سے اس میں زہر کی موجودگی کا پتہ چل جاتا ہے۔ لوہے، المونیم اور دیگر دھات کے کارخانوں میں اسپیکٹروگراف کی مدد سے سکنڈوں میں کسی بھی مرکب کے مختلف اجزاء کے تناسب کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ اسپیکٹرو فوٹومیٹر کی مدد سے رقیق اشیاء جن میں ادویات بھی شامل ہیں، کے صحیح تجزیے میں مدد ملتی ہے۔

سائنس کے مختلف نظریات و اصولوں کا سہارا لے کر انسانی زندگی کو کافی حد تک پرسکون و پرمسرت بنایا جا سکتا ہے۔ حصول آزادی کے بعد ہماری قومی سرکار نے اس طرف کافی توجہ دی ہے۔ ملک بھر میں اعلیٰ پیمانے کی قومی سائنٹفک لیبارٹیریز قائم کی گئی ہیں جہاں سائنس کے مختلف شعبوں میں ہندوستانی سائنسداں تحقیق و مطالعہ میں لگے ہوئے ہیں اور نئی نئی چیزوں کی تلاش و جستجو ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں اتر پردیش میں واقع دو تجربہ گاہیں یعنی سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور نیشنل بوٹینیکل گارڈنس قابل ذکر ہیں۔ اوّل الذکر میں ادویات سے متعلق مسئلوں پر کام ہوتا ہے جبکہ موخر الذکر میں علم نباتیات سے تعلق رکھنے والی چیزوں کی کھوج بین ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ اتر پردیش میں چونکہ گنے کی پیداوار کافی ہوتی ہے اس لیے حکومت ہند نے لکھنؤ میں ایک اعلیٰ پیمانہ کا قومی ادارہ نیشنل شوگر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی کھول رکھا ہے جہاں گنے کی پیداوار سیز گنے کے علاوہ دوسری اشیاء سے شکر تیار کرنے کے کام پر تحقیقات و مطالعے میں ہمارے سائنسداں مصروف ہیں۔

ہندوستانی سائنسداں اور ٹکنولجسٹ جس مہم میں لگے ہوئے ہیں اس کا اندازہ ان صنعتوں کے مطالعے سے کیا جا سکتا ہے جن کا ذکر آگے کیا جا رہا ہے۔ ان میں کافی مشہور و مقبول صنعت کیمیائی علموں سے تیار ہونے والے کپڑوں کی ہے جیسے نائیلون (NYLON) ٹیریلین وغیرہ۔ نائیلون کے کارخانے ہندوستان میں گجرات، راجستھان اور مہاراشٹر میں کافی عرصے سے چل رہے ہیں۔

اتر پردیش بھی ان ریاستوں سے پیچھے نہیں ہے اور یہاں بھی اس صنعت کی طرف ضروری توجہ دی جا رہی ہے۔ چنانچہ کانپور میں (SYNTHETIC FIBRES) کے کئی کارخانے کھل گئے ہیں جہاں اعلیٰ معیار کا کپڑا تیار کیا جاتا ہے۔

پلاسٹک بھی سائنسدانوں کی ایجاد ہے جس سے طرح طرح کی مفید اور کارآمد چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ ہمارے صوبے میں سرکار نے اٹاوہ میں ایک سرکاری پلاسٹک فیکٹری کھول دی ہے جہاں جدید قسم کی مشینوں سے پلاسٹک کا سامان تیار ہوتا ہے۔

شیشے کی صنعت بھی روز بروز ترقی پر ہے۔ شیشہ دراصل مختلف کیمیات کا مرکب ہے اور اس کی مختلف قسمیں اس بات پر منحصر ہیں کہ ان میں کون کون سے اجزاء شامل کئے گئے ہیں۔ کلکتہ میں شیشہ پر تحقیق و مطالعہ کے لیے ایک قومی پیمانے کی تجربہ گاہ حکومت نے قائم کر رکھی ہے۔ اتر پردیش میں فیروز آباد شیشے کی صنعت کا ایک خاص مرکز ہے۔

سائنس اور ٹیکنولجی کا ایک اور نمایاں کارنامہ ہے کاغذ کی صنعت۔ کاغذ بنانے کے لیے ایک خاص قسم کی لکڑی جس کو TOFT WOOD TIMBER کہتے ہیں استعمال ہوتی ہے۔ اس کو پانی میں اُبال کر لیپ تیار کیا جاتا ہے جس کو مشینوں کے ذریعے ریشوں میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ ریشوں کی لمبائی اور موٹائی کو گھٹا بڑھا کر مختلف قسم کا کاغذ بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً سوختے کا کاغذ بنانے کے لیے ریشوں کو چھوٹا اور ڈھیلا رکھا جاتا ہے اور چکنا کاغذ بنانے کے لیے ریشوں کو بڑا اور ایک دوسرے میں جکڑ کر رکھا جاتا ہے۔ ان ریشوں کو چھان کر پانی سے الگ کر لیا جاتا ہے اور پھر مشین سے دبا دیا جاتا ہے جس سے ریشے ایک دوسرے سے جم کر کاغذ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ہمارے ملک کے مختلف شہروں میں جن میں لکھنؤ اور سہارنپور بھی شامل ہیں کاغذ کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہیں۔

زراعت کی ترقی: زمین کو ہموار کرنے اور اس کو کاشت کے لائق بنانے پر ہی منحصر ہے کھیتوں کو جوتنے، بونے اور فصل کو کاٹنے

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

درگا دت پنت

ایک بادشاہ کی دلی واپسی

نہ دلی کا لال قلعہ تھا نہ جامع مسجد اور نہ تخت طاؤس ہی جسے نادر شاہ پہلے ہی اٹھالے گیا تھا۔ لیکن پھر بھی مغل شہزادے کی رسم تاج پوشی ادا کی جارہی تھی ـــــ دلی سے بہت دور جنوبی بہار کے ایک چھوٹے سے گاؤں چھوٹولی میں جہاں اس وقت شہزادہ خیمہ زن تھا۔ یہ شہزادہ شاہ عالم تھا جسے اس واقعہ سے دو سال قبل وزیراعظم عمادالملک کی سازش کے تحت دلی کے بادشاہ وقت اور اس کے پدر بزرگوار عالم گیر نے باغی قرار دیدیا تھا اور جس کے بارے میں وزیراعظم نے مغلیہ حکومت کے عہدیدار اور کمپنی بہادر کے ملازم رابرٹ کلایو کو ایک خط لکھ کر یہ توقع ظاہر کی تھی کہ وہ شاہ عالم کو گرفتار کرکے دلی دربار میں حاضر کردے گا۔ لیکن مختلف وجوہ کے باعث کلایو نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔

شاہ عالم ابھی تک اپنے قدم جمانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اور اپنے بعض معتمد اور بہادر سرداروں، فوجیوں اور ملازمین کے ساتھ خانہ بدوشوں کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسی حالت میں اس کو ۲۴ر دسمبر ۱۷۵۹ء کو تیس سال کی عمر میں اپنے والد عالم گیر کی وفات کی خبر ملی، جس کو عمادالملک نے ایک سازش کے تحت قتل کرادیا تھا۔

ایسی المناک خبر کے ملنے کے بعد تاج پوشی کی رسم ادا کی گئی۔ ایک کرسی کو بیش قیمت کپڑوں سے منڈھ کر تخت شاہی کی شکل دی گئی۔ اس پر شاہ عالم کو بٹھا کر ایک قیمتی چتر اس کے سر پر لگایا گیا، سردار، ملازمین اور دیگر حاضرین رسم کے مطابق کورنش بجالائے۔ بادشاہ سلامت کو نذرانے میں گنیاں پیش کی گئیں۔ اس خوشی کے موقع پر شاہی باورچی نے حاضرین کو سونے کی رکابیوں میں بہترین مٹھائیاں تقسیم کیں۔ شہنائیاں بجائی گئیں اور خوشیاں منائی گئیں۔ اس کے بعد بادشاہ سلامت کا شاہی جلوس نکلا جس میں سردار، فرانسیسی فوجی افسر جین لا، بانکے رو بیلے گھوڑے سوار پیدل سپاہی اور تماشائی سب ہی شامل تھے۔ بادشاہ نے جلوس پر حسرت بھری نظریں دوڑائیں اور پھر اس خستہ حالت میں بھی جھولیوں میں ہاتھ ڈال کر، چاندی کے سکے اور معمولی قسم کے جواہرات فیاضی سے لٹا دیئے۔ ایک معتوب حکمراں اس سے زیادہ کرہی کیا سکتا تھا!

جلوس مسجد کی جانب بڑھا۔ دلی ہوتی تو اس دن جامع مسجد کی شان ہی کچھ اور ہوتی۔ لیکن وہاں تو گاؤں کی ٹوٹی پھوٹی اور اینٹ گارے سے بنی مسجد تھی۔ پھر بھی اسے حتی الامکان سجا دیا گیا تھا۔ وہاں پہنچنے پر بادشاہ سلامت اور شاہی جلوس نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ اور نماز پڑھی۔ لوگوں نے شاہ عالم کی عمر درازی کے لیے دعائیں مانگیں۔ اس طرح تاج پوشی کی رسم پوری ہوئی۔ حالانکہ بعد کو بھی کتنے ہی دنوں تک اس سلسلے میں جشن منائے جاتے رہے۔ اسی موقع پر شاہ عالم نے اودھ کے نواب شجاع الدولہ کو اپنا وزیر مقرر کرنے کا اعلان کیا۔

حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد شاہ عالم کو دارالحکومت کی یاد ستانے لگی اور اس کے دل میں دلی۔ پہنچنے کی تمنا مچلنے لگی۔ صدیوں سے دلی اس ملک کی سیاست کا مرکز رہی تھی۔ دلی کے

تخت پر جو شخص بھی بیٹھتا وہ ملک کا بادشاہ کہلاتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی بار بار دلّی کی جانب کیوں نظریں اٹھاتے۔ پیشوا اور سکھ اس پر لالچ بھری نظر کیوں رکھتے۔ دلّی دلّی تھی۔ ملک کا دارالسلطنت تھی۔ دلّی کو فتح کرنا ملک کو فتح کرنا تھا یعنی ہندستانی قومیت اور دلّی کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔

اس عہد میں دلّی کے روز بروز بدلتے حالات، پرانے وزیر عمادالملک کے مشکوک کردار، پیشوا اور سکھوں کے حملہ آور رُخ، صوبیداروں اور نوابوں کی خودمختاری کے جذبہ کے پیش نظر بادشاہ سلامت کے صلاح کاروں کو یہ یقین نہ تھا کہ شاہ عالم کا وہاں شاہانہ استقبال کیا جا سکے گا۔ اس لیے انھوں نے بادشاہ کو دلّی کی جانب رخ کرنے سے روک دیا۔ اسی موقع پر شجاع الدولہ نے بادشاہ کو پٹنہ پر حملے کرکے بہار کے نواب کو وفادار رہنے کا سبق دینے کی صلاح دی۔ جس پر عمل کیا گیا۔ لیکن بہار کے نواب کو کمپنی بہادر کی فوج کی مدد حاصل ہوجانے کی مدد سے پٹنہ، شاہ عالم کے ہاتھ آتے آتے رہ گیا۔ آخر شاہ عالم کو اگست ۱۷۶۰ء میں اودھ کی جانب اپنا رخ کرنا پڑا۔

برسات ختم ہونے پر شاہ عالم نے ایک بار پھر پٹنہ پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ اس بار بھی اسے شکست ہی کا منھ نہیں دیکھنا پڑا۔ بلکہ کمپنی کی فوج کے سامنے ۶ر فروری ۱۷۶۱ء کو اسے خود کو سپرد کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ برطانوی سپہ سالار کارنیک شاہ عالم کو باعزت پٹنہ لے گیا۔

کمپنی کو بھی بادشاہ کی سخت ضرورت تھی۔ ۱۶۳۴ء میں کمپنی کو تجارت کرنے کا جو حق حاصل ہوا تھا وہی برقرار تھا۔ اسے ملک کی سیاست میں دخل دینے کا قانونی حق حاصل نہیں تھا۔ کمپنی صوبوں میں اپنی پسند کے نوابوں کا تقرر کرانا چاہتی تھی لیکن اس کے لیے دلّی کے سلطان کی مہر لگنا ضروری تھی۔ اس لیے کمپنی کو بادشاہ کی ضرورت تھی اور اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے شاہ عالم کو باعزت پٹنہ لانا ضروری تھا۔

پٹنہ کے برطانوی علاقہ میں ایک بڑے ہال کی سجاوٹ دیکھنے کے قابل تھی۔ کچھ میزوں کو بیش قیمت کپڑوں سے ڈھک کر تختِ شاہی کی شکل دی گئی! ایک سجے سجائے ڈولے میں بادشاہ کو لایا گیا! انگریزی فوجی ٹکڑی نے سلامی دی یہیں بنگال کا نواب میر قاسم قیمتی نذرانے کے ساتھ بادشاہ سلامت کے سامنے پیش ہوا اور بادشاہ نے اس کی تقرری پر اپنی مہر ثبت کردی۔ اس طرح کمپنی نے بنگال کی سیاست میں دخل دینے کے لیے ایک مہرہ قابو حاصل کرلیا۔

اسی اثنا میں شاہ عالم کو احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی زبردست شکست کی خبر ملی۔ کچھ ہی عرصہ بعد اسے ابدالی کا یہ بھی پیغام ملا کہ وہ دلّی آکر سلطنت سنبھالے۔ ابدالی نے اپنے اس فیصلہ سے خطوط لکھ کر ہندستان کے اہم راجاؤں اور نوابوں کو بھی آگاہ کردیا تھا۔ ان حالات کے تحت شاہ عالم نے پھر ایک بار دلّی جانے کا ارادہ کیا۔

اسی موقع پر شجاع الدولہ نے اس کو ایک بار پھر بہار پر قبضہ کرنے کا مشورہ دیا۔ میر قاسم بھی اسی رائے سے متفق تھا۔ اس کا اصل منشا بعد کو بنگال پر پوری طرح قبضہ کرکے انگریزوں کو وہاں سے نکال باہر کرنا تھا آخر کار شاہ عالم، شجاع الدولہ اور میر قاسم نے ملکر ایک بار پھر بہار کے نواب پر حملہ کردیا۔ ساتھ میں سمرو بھی تھا۔ لیکن چونکہ یہ حملہ کسی منظم اور منصوبہ بند اسکیم کے تحت نہیں ہوا تھا اس لیے ناکام رہا اور انھیں بکسر میں شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ شجاع الدولہ کو تو شکست کے بعد اپنے دارالسلطنت لکھنؤ کی جانب بھاگنا پڑا۔ لیکن میر قاسم جنگلوں میں کہیں ایسا غائب ہوا کہ پھر تاریخ میں اس کا نام ہی نہ سنا گیا اور سمرو کسی نئے موقع کی تلاش میں دلّی کی جانب کھسک گیا۔ جہاں کی سیاست میں بیگم سمرو نے کافی عرصہ تک خصوصی کردار ادا کیا۔

شاہ عالم نے برطانوی افسر منرو کے پاس پیغام رساں کے ذریعہ شجاع الدولہ کے خلاف یہ شکایت بھیجی کہ وہ تو بہار پر حملہ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا لیکن وزیر کی گرفت میں ہونے کے باعث وہ مجبور تھا۔ اس نے منرو کے ذریعہ برطانوی تحفظ حاصل کرنے کی درخواست کی۔ کمپنی کے صدر مقام کلکتہ سے احکام آنے پر منرو ایسا کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ کمپنی بادشاہ کو اپنے ہاتھ کا کھلونا بنانے کے موقع کو نہیں کھونا چاہتی

تھی۔ کمپنی کے احکام کے مطابق منرو نے فروری ۱۷۶۵ء میں شجاع الدولہ کے ایجنٹ سے الٰہ آباد کا قلعہ لے لیا اور وہیں شاہ عالم کو پناہ دی۔ بادشاہ سلامت کو شجاع الدولہ کی گرفت سے تو رہائی ملی لیکن کمپنی بہادر کی گرفت میں آنا پڑا۔

کچھ عرصہ بعد کلایو خود الٰہ آباد پہنچا اور اس نے آگے کے لیے شاہ عالم سے شرطیں طے کرنا چاہیں۔ شاہ عالم ہند کا بادشاہ تھا اور کلایو اس کا خادم اور کارندہ؛ بات چیت کے دوران اس نے کلایو سے کہا کہ بنگال پر ہند سرکار کی جو کئی سال کی رقم باقی ہے اسے فوراً ادا کرنے کا انتظام کیا جانا چاہیئے۔ کلایو بھلا شہنشاہ کی شان اور مرضی کے خلاف کہہ ہی کیا سکتا تھا۔ اس نے شاہ عالم اور شاہی عملہ کے خرچ کے لیے پچیس (۲۵) لاکھ روپیہ سالانہ سے بھی زیادہ دینے کا وعدہ کیا۔ بادشاہ سلامت نے اس شرط کو مان کر بنگال میں نئے نواب کا تقرر کیا اور کمپنی کو بنگال کی دیوانی دے دی۔ اس طرح کمپنی پہلی مرتبہ قانونی طور پر دلّی سلطنت کا ایک حصہ ہو گئی اور دوعملی حکومت کا قیام عمل میں آگیا۔

پھر بھی شاہ عالم دلی جانے کا خواہشمند تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ دلّی کے تخت پر متمکن ہونے کے بعد ہی اس کی بادشاہت کو حقیقی اہمیت اور عزت مل سکتی تھی۔ لیکن کمپنی نہیں چاہتی تھی کہ وہ دلی جائیں۔ اسی اثنا میں کمپنی جنوبی ہند کے جھگڑوں میں پھنس گئی۔ اسی زمانے میں شاہ عالم نے مرہٹوں کے پاس ۱۷۷۰ء میں قاصد بھیج کر کہلوایا کہ وہ اُسے دلّی پہنچنے میں مدد دیں۔ مرہٹوں کو دلّی کے بادشاہ کو اپنے قابو میں کرنے کا یہ ایک اچھا موقع ہاتھ آیا اس لیے وہ کچھ شرطوں کے ساتھ رضامند ہو گئے۔

آخر ۱۳ اپریل ۱۷۷۱ء کا وہ دن بھی آگیا جب بادشاہ سلامت نے اپنے عملے کے ساتھ دلّی کی جانب کوچ کیا۔ وزیر شجاع الدولہ نے بھی اپنے کچھ فوجی ساتھ کر دیئے۔ وہ خود تو ساتھ نہ جا سکا لیکن اس نے سفر کے لیے ضروری ساز و سامان مہیا کر دیا' اور بارہ لاکھ روپیہ نقد نذر کیے۔ کمپنی کا فوجی افسر جنرل بارکر بھی اپنے لشکر کے ساتھ ٹھور تک بادشاہ کے ہمراہ گیا۔ فرخ آباد کے پاس مہاداجی سندھیا نے شاہ عالم کا استقبال کیا۔ لیکن اسی عرصہ میں برسات کا موسم آگیا اور شاہی قافلہ کو وہیں قیام کرنا پڑا۔ ۱۷۷۲ء کے سال نو کے روز شاہ عالم دہلی کی سرحد کے قریب جا پہنچا جہاں دو دن بعد شہزادہ اور خاندان کے دوسرے افراد اس سے ملنے آئے۔

اس کے بعد ۶ جنوری ۱۷۷۲ء کو عید کے مبارک موقع پر شہنشاہ بادشاہ دلّی کے لال قلعہ میں داخل ہوا اور تاج پوشی کے تیرہ برس بعد اپنے بزرگوں کے تخت پر متمکن ہونے کا شرف حاصل کیا۔

★

بھولنا — صفحہ ۴۶ کا بقیہ

سے بالکل ہی معمولی لوگ رہ جاتے ہیں جبکہ اچھی یادداشت رکھنے والے بڑی ترقی کرتے ہیں۔ مگر مجھے تو اچھی یادداشت رکھنے والے ہی زیادہ معمولی لوگ نظر آتے ہیں۔ ایران و توران کی اڑانے والے بے کار بوڑھے اچھے وقت اور ایک ہی قسم کے قصوں کو یاد کرنے والے سماج کے کمزور لوگ، معلومات کا سمندر بہانے والے ناکام ادیب، فلم میں کام نہ ملنے والے ایکسٹرا' اور محلے کی سطح کے سیاسی نیتا ذرا کم ہی کچھ بھولتے ہیں — انھیں اپنی ایک ایک ناکامی حفظ ہوتی ہے۔

آپ کسی بھی کامیاب ادیب کو دیکھئے اسے معلوم ہی نہ ہوگا کہ دنیا میں آخر ہو کیا رہا ہے؟ کسی بڑے سیاسی لیڈر کو دیکھئے اس کا ہر بیان بھولنے کی وجہ سے اپنے پچھلے بیان کے خلاف ہوگا۔ یا خود اس کے خلاف ایسی صورت میں، میں یہ دعویٰ کرنے کی ہرگز ہمت نہیں کر سکتا کہ میری یادداشت ذرا بھی اچھی ہے۔ میں بھی دوسروں کی طرح ہر بات بھول جاتا ہوں۔ کئی بار تو یہ تک بھول چکا ہوں کہ میں کون ہوں۔ اور اب مجھے یہ نہیں یاد آرہا ہے کہ "میں آخر آپ سے کہہ کیا رہا تھا کیا

★

اتر پردیش میں سماج دشمن عناصر کے خلاف بھرپور مہم

اسی مقصد کے تحت ہمیں ایک ایسے سماج کی تشکیل کرنا ہے جس میں ہر فرد کو اپنی قوت اور صلاحیت کے مطابق کام کرنے اور بہتری کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ ساتھ ہی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے حکومت اتر پردیش پوری مستعدی سے سرگرم عمل ہے۔ ہوگا سرکار نے اس سلسلے میں ہریجنوں اور سماج کے ان کمزور طبقوں کو، جو عرصہ دراز سے استحصال اور بے توجہی کا شکار رہے ہیں ترقی کرنے کے وافر مواقع دیے ہیں۔ چنانچہ اس غرض سے کہ ہریجنوں اور سماج کے دوسرے پسماندہ طبقوں کو سماجی انصاف مل سکے، ان کو رہائش، تعلیم، کاروبار اور ملازمت کی مناسب سہولتیں حاصل ہوں۔ اتر پردیش کی نئی حکومت اس سمت میں تیزی سے کام کر رہی ہے۔ برقی قوت ہو یا زراعت، آب پاشی ہو یا صنعتی ترقی، تعلیم ہو یا اردو کی ہمت افزائی، پہاڑی علاقوں کی خوشحالی ہو یا ریاست کے دوسرے پسماندہ علاقوں کی ترقی، مرد و زن کی فلاح و بہبود ہو یا سرکاری ملازمین کے لیے سہولتیں، موجودہ ریاستی حکومت ہر میدان میں اتر پردیش کی ہمہ گیر ترقی کے لیے پوری طرح کوشاں اور سرگرم عمل ہے۔ مختلف میدانوں میں ترقی کے لیے ایک اہم ضرورت یہ بھی ہے کہ سماج دشمن عناصر سے سختی کے ساتھ نپٹا جائے اور ایسے حالات پیدا کرنے کا موقع نہ دیا جائے جو سماجی زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیں۔ چنانچہ سماج دشمنوں کی کارروائیوں کے خلاف ایک بھرپور مہم موجودہ حکومت نے شروع کر رکھی ہے جس کی ایک جھلک سطور ذیل میں پیش کی جا رہی ہے۔

اتر پردیش میں آج سے تقریباً آٹھ ماہ قبل، شری ہیم وتی نندن بہوگنا کے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالتے ہی ریاست گیر پیمانے پر ایک مہم شروع کی گئی۔ یہ مہم ان سماج دشمن اور ناپسندیدہ عناصر کے خلاف شروع کی گئی ہے جنہوں نے موجودہ اقتصادی مشکلات کا بے جا فائدہ اٹھا کر عوام کے روزمرہ استعمال میں آنے والی ضروری اشیا کی خرید و فروخت میں دھاندلی مچا رکھی ہے۔ یہ مہم اگر ایک طرف ان ذخیرہ اندوزوں اور چور بازاری کرنے والوں کے خلاف ہے جو بازاروں میں مصنوعی قلت کی حالت پیدا کر کے عوام کا استحصال کر رہے ہیں تو دوسری طرف ان سماج دشمنوں کو تادیبی گرفت میں لانے کے لیے ہے جو خورد و نوش کی اشیا اور دواؤں وغیرہ میں ملاوٹ کر کے عوام کی زندگی سے کھیل رہے ہیں۔ یہ مہم ان سرکاری افسروں اور ملازموں کے خلاف بھی ہے جو اپنے عہدوں کا غلط استعمال کر کے اپنے ذاتی مفاد کے لیے سماج دشمن عناصر سے سازباز کر کے عوام کے روپیے کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کی قیادت میں چلائی جانے والی یہ مہم کتنی کارگر ثابت ہوئی ہے اور سماجی اور انتظامی مشینری میں پھیلی ہوئی بدعنوانیاں کس حد تک کم ہوئی ہیں اس کا اندازہ لگانے کی ضرورت نہیں، اعداد و شمار خود دلیل رہے ہیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔؟

گزشتہ ۲۲ جون تک گیہوں، اور دوسری ضروری اشیا کی ذخیرہ اندوزی کے سلسلے میں ریاست کے ۴۴ ضلعوں میں مجموعی طور پر ۲۳۴۴ چھاپے مارے گئے جن کے نتیجے میں ۳۲۲۲۴۷ کوئنٹل گیہوں وصول ہوا۔

اسی مدت میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں لاپروائی برتنے یا رشوت خوری وغیرہ کے جرم میں پانچ ضلع سپلائی افسروں، تین ڈپٹی ریجنل مارکٹنگ افسروں، دو ڈپٹی ریجنل کنٹرولروں، ایک اسسٹنٹ کنٹرولر (ناپ تول) اور ایک ریجنل راشننگ افسر کو جبری طور پر ریٹائر کر دیا گیا۔ مزید برآں پانچ ڈپٹی ریجنل مارکٹنگ افسروں، ایک اسسٹنٹ ریجنل فوڈ کنٹرولر اور ایک ضلع سپلائی افسر کی تنزلی کی گئی اور چار ضلع سپلائی افسروں، ایک ڈپٹی ٹاؤن راشننگ افسر، ایک ڈپٹی ریجنل فوڈ کنٹرولر، ایک ڈپٹی ریجنل مارکٹنگ افسر اور دو ایریا راشننگ افسروں کو معطل کیا گیا۔

اس کے علاوہ تین گریڈڈ افسروں کو جبریہ طور پر ریٹائر کیا گیا، ۳۰ کے عہدے میں تنزلی

کی گئی۔ ۶۰۰ کو معطل کیا گیا اور ۳۲۴ کی ملازمتیں ختم کر دی گئیں۔

کامیابی کا سبب۔ وزیر اعلیٰ کی فعّال شخصیت

سماج دشمن اور ناپسندیدہ عناصر کے خلاف چلائی جانے والی اس مہم کی کامیابی کا اصل سبب ریاست کے وزیر اعلیٰ کی بیدار مغزی اور فعال شخصیت اور ان کی تیز رفتاری سے کام کرنے کی صلاحیت ہے۔

انھوں نے انتظامی مشینری میں برسہا برس سے چلی آنے والی کاغذی گھوڑے دوڑانے والی روایت کا پوری طرح خاتمہ کر دیا ہے اور مختلف مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک نیا نقطۂ نظر ایک نیا "اپروچ" اپنایا ہے جس سے ہر معاملہ کا حل آناً فاناً نکل آتا ہے۔ مثلاً صبح کے وقت روزانہ وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ پر عوام و خواص کی بھیڑ جمع ہوتی ہے۔ بہوگنا جی ہر خاص و عام سے ملتے ہیں۔ ان کی شکایتیں سنتے ہیں اور فوری کارروائی کا حکم دیتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ کسی خاص شخص کی شکایت متعلقہ محکمہ کو بھیجیں اور روایتی طریقہ پر لال فیتہ میں وقت برباد کرنے والی کارروائی شروع کی جائے وزیر اعلیٰ براہ راست متعلقہ ضلع حکام کو حکم دیتے ہیں اور اگر ضروری ہوا تو صدر مقام سے کسی افسر کو موقع پر بھیج کر تحقیقات اور ضروری کارروائی کراتے ہیں۔ اب تک ریاست کے متعدد ضلعوں میں وزیر اعلیٰ ایسے افسر کار کو کارروائی کے لیے بھیج چکے ہیں۔

ناکہ بندی اور عوام کا تعاون۔

مہم کو کامیاب اور موثر بنانے کی خاطر ریاست بھر میں ۹۰ ایسی چوکیاں قائم کی گئی ہیں جو عوام کے روزمرہ کے استعمال میں آنے والی ضروری اشیاء کی متعلقہ علاقوں سے باہر جانے کی روک تھام کرتی ہیں۔ یہ چوکیاں دن رات چوبیس گھنٹے اپنے اپنے علاقے سے آنے جانے والے مال پر سخت نگرانی رکھتی ہیں اور مجرموں کو پکڑ کر فوراً قانون کے حوالے کر دیتی ہیں۔ ساتھ ہی ان چوکیوں پر تعینات ملازمین پر نگرانی رکھنے کے لیے نصف درجن ایسے گشتی دستوں کی تشکیل کی گئی ہے جو ان کے کاموں کی لگاتار دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ منافع خوروں، چور بازاری کرنے والوں اور اسمگلروں کو گرفت میں لانے کے لیے ڈپٹی انسپکٹر جنرل کی نگرانی میں ایک ویجیلنس سیل بھی قائم کیا گیا ہے جو خفیہ طور پر ان سماج دشمن عناصر کی کارروائیوں پر نگاہ رکھتا ہے اور انھیں رنگے ہاتھوں پکڑنا اور قانون کی گرفت میں لے آتا ہے۔ پولیس کا یہ اعلیٰ افسر بہ اعتبار عہدہ اڈیشنل فود کمشنر کی حیثیت سے بھی کام کرتا ہے اور اس طرح پولس اور محکمہ غذا کی مربوط کارروائی ممکن ہوتی ہے۔

سماجی اور انتظامی بدعنوانی روکنے کے اس کام میں ریاستی حکومت نے عوام کے تعاون کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ حکومت کی جانب سے نوجوانوں اور سماجی کارکنوں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے کہ وہ سماج دشمن عناصر اور ناپسندیدہ عناصر کی کارروائیوں کی اطلاع خفیہ طور سے حکومت کو دیں تاکہ اس عذاب سے جلد از جلد نجات حاصل کی جا سکے۔

منافع خوروں کو قانون دفاع ہند کے تحت سزا دینے کا انتظام پہلے سے ہی تھا لیکن موجودہ صورت حال کے پیش نظر اب اس قانون کا نفاذ زیادہ سختی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ ضروری اشیا قانون، ۱۹۵۵ء میں ترمیم کرکے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ قانون کی نافرمانی کرنے والوں کو چھ ماہ سے لے کر سات سال تک کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اسمگلنگ کے لیے کم از کم دو سال کی سزا رکھی گئی ہے۔

قانون دفاع ہند اور ضروری اشیاء کے علاوہ منافع خوروں، چور بازاری کرنے والوں اور اسمگلنگ کرنے والوں کے خلاف اندرونی تحفظ قانون اور تعزیرات ہند کے تحت بھی کارروائی کی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ متذکرہ بالا جرائم میں پکڑے جانے والے شخص پر فوری مقدمہ چلا کر اسے قید کی سزا تو یقینی طور پر دی جاتی ہے اور اس سلسلے میں بیوپاریوں اور سرکاری ملازموں میں کوئی تفریق نہیں برتی جاتی۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے ۲۲ جون کو ایک آرڈیننس کے ذریعہ حکومت ہند نے بھی ضروری اشیاء قانون ۱۹۵۵ء میں ترمیم کر دی ہے جس کے مطابق سزا کی مدت پانچ سال سے بڑھا کر سات سال کر دی گئی ہے۔ حکومت ہند کی ترمیم میں بیشتر انھیں باتوں کا ذکر ہے جو ریاستی حکومت کے ذریعہ کی جانے والی ترمیم میں رکھی گئی ہے۔

ریاست کی جمہوری اور سماج وادی قیادت کا یہ نظریہ ہے کہ محض امن وامان کو برقرار رکھنا اور انتظامی مشینری کو چلانا عوامی حکومت کو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں کرتا۔ عام لوگ اور خاص طور پر کمزور طبقوں کے لیے زندگی کی ضروریات مہیا کرنا اور انھیں معاشی اور سماجی انصاف دینا موجودہ حکومت اپنی سب سے بڑی ذمہ داری سمجھتی ہے۔ مذکورہ مہم میں جہاں ایک طرف ان مقاصد کی تکمیل ملحوظ رکھی گئی ہے وہاں دوسری طرف یہ کوشش بھی کی جارہی ہے کہ ساتھ ہی ساتھ انتظامی مشینری کی بھی اصلاح ہوتی چلے۔ اس عمل میں گزشتہ چھ ماہ میں محکمہ پولیس کے ۲۲۲ نااہل گزیٹڈ افسروں اور ملازموں کو جبری طور پر ملازمت سے سبکدوش کیا گیا۔ ان میں ایک انسپکٹر، ۴۵ ہیڈ کانسٹبل اور ۱۷۶ کانسٹبل شامل ہیں۔ اس کے ساتھ حکومت کے دوسرے محکموں میں بھی افسروں اور ملازموں کی اسکریننگ کی جارہی ہے تاکہ نااہل، نکمے اور ناپسندیدہ افراد کو ہٹایا جاسکے اور اس طرح ریاست کو ایک صاف ستھری اور چست انتظامی مشینری حاصل ہوسکے۔

اقلیتی کمیشن کی نو تشکیل

ریاستی حکومت اقلیتوں کے مفاد و حقوق کے تحفظ کے لیے پوری طرح مستعد ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی مختلف مشکلات و مسائل کا مکمل جائزہ لینے اور ان کے حل کے لیے حکومت کو وقتاً فوقتاً ضروری صلاح و مشورہ دینے کے لیے جو ریاستی اقلیتی کمیشن مقرر تھا گزشتہ ۲۶ رجون کو اس کی نو تشکیل کردی گئی ہے۔ اس کمیشن کی سربراہی ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس شری نصراللہ بیگ کے سپرد کی گئی ہے۔ اس کمیشن کے ممبران میں مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں، مندرجہ فہرست اقوام اور مندرجہ قبائل کا ایک ایک نمائندہ شامل ہوگا۔

★

اترپردیش سائنس اور ٹیکنالوجی کے

(صفحہ ۴۹ کا بقیہ)

لیے جدید قسم کے آلات کا استعمال نیز کیمیاوی کھاد سے مٹی میں زیادہ اناج پیدا کرنے کی صلاحیت و قوت پیدا کرنے کے ذرائع سائنسدانوں نے ہی کسانوں کو فراہم کئے ہیں۔ کیمیاوی کھاد کے دو بڑے کارخانے سندری اور ننگل میں سب سے پہلے قائم ہوئے تھے جنھیں، جدید ہندستان کی تاریخ میں کافی اہمیت حاصل ہے۔ اترپردیش میں کانپور اور گورکھپور میں بھی کیمیاوی کھاد تیار کرنے کے کارخانے قائم ہوگئے ہیں۔

آج کل ایٹمی توانائی کو قابو میں لاکر اس سے مختلف مفید کام لیے جارہے ہیں۔ ایٹم جو مادے کا ایک بہت ہی معمولی ذرّہ ہوتا ہے جسے آنکھ سے دیکھا بھی نہیں جاسکتا اس کے پیٹ کو کیمیاوی ذریعے سے چیر کر سائنسدانوں نے وہ بے پناہ قوت اپنے قابو میں کرلی ہے جس کے سامنے بڑی بڑی طاقتیں سربسجود ہیں۔ بھاپ اور بجلی جنھیں انسان نے مختلف طریقوں سے انسانی خدمات کے لیے قابو میں کیا تھا اور جو مدتوں انیاسکہ جمائے رہیں اب ایٹمی توانائی کے سامنے ہیچ ہیں۔ دنیا کے اور ترقی یافتہ ملکوں سے ہمارا ملک بھی پیچھے نہیں ہے ٹرامبے اور تارا پور میں قائم ایٹمی توانائی سے متعلق ادارے مفید کام کر رہے ہیں اور ابھی حال ہی میں جو نیوکلیائی دھماکہ راجستھان کے ریتیلے میدان میں کیا گیا ہے اس نے ملک اور قوم کا سر کافی بلند کردیا ہے۔

اترپردیش میں بلند شہر کے قریب نرورا میں ایٹمی توانائی سے بجلی پیدا کرنے کی بھٹی کے قیام سے اس ریاست کی ترقی اور خوشحالی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگیا ہے۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ آج کی دنیا کی خوشحالی، تحفظ اور بقاء کا سارا دار و مدار سائنس اور ٹیکنولوجی پر ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبے میں پیوست ہوچکی ہے۔ اور شاید وہ دن اب زیادہ دور نہیں جب ہمارا سائنسداں یہ پکار اٹھے ؎

"یہ جاکے مہرتاباں سے کہہ دو کہ اپنی کرنیں وہ گن کے رکھ لے
میں اپنے صحرا کے ذرّہ ذرّہ کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں"

★

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں

ماہنامہ شاہکار ادبی ڈائجسٹ کا احتشام حسین نمبر

مدیر: محمد ظہیر۔ نومبر، دسمبر ۱۹۷۳ء
ضخامت ...۳ صفحات۔ قیمت: پانچ روپے۔ جیامت ۵" × ۷" پتہ: دفتر شاہکار، ہدیرہ، دارانسی

ماہنامہ شاہکار ادبی ڈائجسٹ بنارس نے اپنے نومبر، دسمبر ۱۹۷۳ء کے مشترکہ شمارہ کو احتشام حسین نمبر کی حیثیت سے شائع کیا ہے۔ اس خصوصی نمبر کے مرتبین ندیم بنارسی، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر جعفر رضا، ڈاکٹر علیم مسرور اور شوکت مجید ہیں۔ کاغذ، کتابت، طباعت اور گیٹ اپ کے اعتبار سے یہ خصوصی شمارہ دیدہ زیب دلکش ہے۔ رسالہ میں مرحوم احتشام حسین صاحب کی متعدد تصاویر بھی شامل ہیں۔

اس خصوصی نمبر کی ترتیب میں سلیقہ سے کام لیا گیا ہے۔ نثری اور شعری تخلیقات کو حسب ذیل چھ عنوانات کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔

(۱) شمع ماتم خانہ۔ اس عنوان کے تحت احتشام صاحب کے قریبی عزیزوں نے نظم و نثر میں احتشام صاحب کی حیات و وفات سے متعلق اپنے خیالات و تاثرات پیش کیے ہیں۔ سوگواروں کی اس بزم غم میں احتشام صاحب کے صاحبزادے، بھائی اور ہم زلف بھی شریک ہیں۔ احتشام صاحب مرحوم کی حیات و شخصیت کے بعض وہ پہلو جو عام طور پر روشنی میں نہیں آئے ہیں اس حصہ میں روشن ہوتے ہیں۔

(۲) رفیقان رہ شوق: اس عنوان کے ضمن میں مرحوم کے استاد، احباب اور رفقائے کار کی نگارشات شامل ہیں جن کی مدد سے احتشام صاحب کی حیات و سیرت کے بعض اہم گوشے اُجاگر ہوتے ہیں۔ اس حصہ میں احتشام صاحب کے استاد ڈاکٹر اعجاز حسین اور فراق گورکھپوری نے اپنے شاگرد رشید کی وفات پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مرحوم کی طالب علمی کے زمانے کے حالات و واقعات بیان فرمائے ہیں۔ یہاں احتشام صاحب کے ذہن و کردار کی ابتدائی نشو و نما اور دورِ طالب علمی میں تشکیل ہوتی ہوئی شخصیت کے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ دوستوں اور رفیقوں میں علی جواد زیدی، آل احمد سرور، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر مسیح الزماں اور ڈاکٹر جعفر رضا کے تاثراتی مضامین ہیں جن میں احتشام صاحب کی حیات کی سوانحی جھلکیاں، اور ان کی شخصیت کے متعدد تشکیلی عناصر نمایاں ہوئے ہیں۔ اس حصہ میں احتشام صاحب کے مزاج کی مختلف کیفیات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

(۳) روشن چراغ۔۔ یہ حصہ سولہ مضامین پر مشتمل ہے جن میں ملک کے مشہور صاحبانِ قلم کی نگارشات شامل ہیں۔ اس حصہ میں مولانا عبدالماجد دریا بادی، ڈاکٹر گیان چند، ظ۔ انصاری، فکر تونسوی، ڈاکٹر سید مسعود، شمس الرحمٰن فاروقی، مہندر ناتھ، اعجاز صدیقی، ستیش بترا، رق آشیانوی اور اخلاق حسین عارف وغیرہ کی نگارشات شامل ہیں جن کی روشنی میں احتشام صاحب کے قلب و ذہن کی مختلف کیفیات اور ان کی متعدد انسانی صفات کے نقوش ابھرتے ہیں۔

(۴) گنجِ معنی کا داددار۔۔ اس عنوان کے تحت آٹھ مضامین ہیں جن میں احتشام صاحب کی تنقید نگاری، افسانہ نگاری اور دوسری ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصہ میں ملک کے اہم و معروف صاحبانِ قلم کے مضامین ہیں جن میں مرحوم سجاد ظہیر، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر محمود الٰہی، ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی، ظفر ادیب، ڈاکٹر سید محمد عقیل، مظہر امام، یونس اگاسکر شامل ہیں۔

(۵) آنسو کی شبنم:۔۔ اس حصہ میں احتشام صاحب کے متعلق کہی جانے والی مختلف اہم و مشہور شعراء کی ۱۲ نظمیں اور قطعات وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں ہمیں علامہ جمیل مظہری، وامق جونپوری، علی جواد زیدی، فضا ابن فیضی، قمر بلوری، شوکت مجید، ساغر مہدی، حیات وارثی، حفیظ بنارسی، سعید عارفی اور دیگر شعراء احتشام صاحب کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ آغا حیدر حسین نے اپنی منظوم تخلیقات میں احتشام صاحب کی ہجری اور عیسوی میں وفات کی تاریخیں نکالی ہیں۔

(۶) نقشِ لازوال:۔۔ اس حصہ میں احتشام صاحب کا ایک اہم مضمون "تیشے نے کو بکن شامل ہے جس پر جدیدیت کے دعوے داروں نے کافی توجہ فرمائی تھی اور جو ماہنامہ شب خون الہ آباد کے صفحات پر ایک گرماگرم مباحثہ کی بنیاد ثابت ہوا ہے۔

اس مضمون کے علاوہ اس حصہ میں احتشام صاحب کا ایک خطبہ اور بعض منظوم تخلیقات بھی شامل ہیں۔ آخر میں احتشام صاحب کی زندگی کے اہم ادوار و واقعات پر مشتمل سوانحی اشارے ہیں۔ جن میں ان کی تصانیف اور ادبی کارناموں وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس فہرست میں احتشام صاحب کی غیر مطبوعہ نگارشات بھی شامل ہیں۔

شاہکار کے احتشام حسین نمبر کے مختلف اجزا کے اس اجمالی جائزے سے اس کی افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ احتشام صاحب کے سلسلے میں مختلف جریدوں نے اپنے اپنے خصوصی نمبر شائع کیے ہیں۔ جن میں ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، آج کل دہلی، ترسیل لکھنؤ، آہنگ گیا۔ سب رس حیدرآباد، فروغ اردو لکھنؤ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ماہنامہ شاہکار ایک ادبی ڈائجسٹ ہے اس نے اپنے احتشام حسین نمبر کے لیے متذکرہ بالا جریدوں میں سے زیادہ تر کے صفحات کو کھنگال کر مفید مواد کو اپنے نمبر میں پیش کر دیا ہے۔ فروغ اردو لکھنؤ کا ضخیم احتشام حسین نمبر چونکہ شاہکار کے نمبر کے بعد نکلا ہے لہٰذا اس کی نگارشات کی شمولیت سے شاہکار محروم رہا ہے لیکن اس کے علاوہ دوسرے رسائل میں احتشام صاحب پر شائع ہونے والا مواد شاہکار نے یکجا کر دیا ہے اور اگر کسی کو مختلف جرائد کے احتشام حسین نمبروں تک ایک ہی رسالہ کے ذریعہ بآسانی رسائی حاصل کرنا ہو تو اسے شاہکار میں مختلف رسائل کے ذریعہ اس موضوع پر شائع ہونے والے اہم مضامین اور دیگر مواد کی جھلکیاں دیکھنے کو مل سکتی ہیں۔ احتشام صاحب نے شاہکار کی جس طرح سرپرستی فرمائی ہے اس کے پیشِ نظر اس جریدہ کی جانب سے مرحوم کی خدمت میں ایک معیاری درجہ کا خصوصی شمارہ پیش کرنا ضروری تھا اور پیشِ نظر شمارہ اسی مطالبہ کی عملی شکل ہے۔

لکھنؤ ——— کاظم علی خاں

جنبشِ لب

شاعر: ایاز بلگرامی۔ ناشر: سید اخلاق حسین ۳۹۴، حسن پورہ، منصور نگر، لکھنؤ ۳۔ سالِ اشاعت: جنوری ۱۹۷۱ء، قیمت: چار روپے، ضخامت ۱۷۶ صفحات

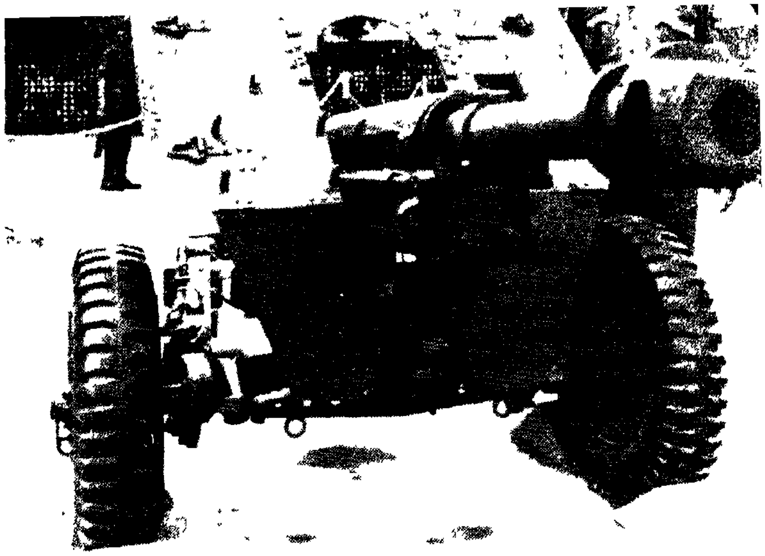
جناب ایاز بلگرامی اردو کے خوش فکر اور نوجوان شاعروں میں ہیں۔ یہ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو نظموں، غزلوں، قطعات اور متفرق اشعار پر مشتمل ہے جن میں روایتی غزل گوئی کا بھی انداز ہے اور جدید تجربوں کی آمیزش بھی نظر آتی ہے۔ جنبشِ لب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایاز بلگرامی کی شاعری میں فکر و ذہن کا اتصال شدید احساسات اور جذبات پر مبنی ہے۔ ایک دبی ہوئی چنگاری ہے جو ہر لمحہ بے ثباتیِ حیات کا افسانہ دہرانا چاہتی ہے اور روح کا کرب فن کی ماہیت کے پیشِ نظر فن کار سے اظہارِ حقیقت کا طالب ہے۔

ایاز کی شاعری ابھی ارتقائی منزلوں میں ہے جو ابھی ان سے اور خونِ جگر چاہتی ہے۔ اگر انھوں نے صداقتِ جذبات اور قوتِ ادراک و احساس سے کام لیا تو ان سے اردو شاعری کو توانائی حاصل ہوگی۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔

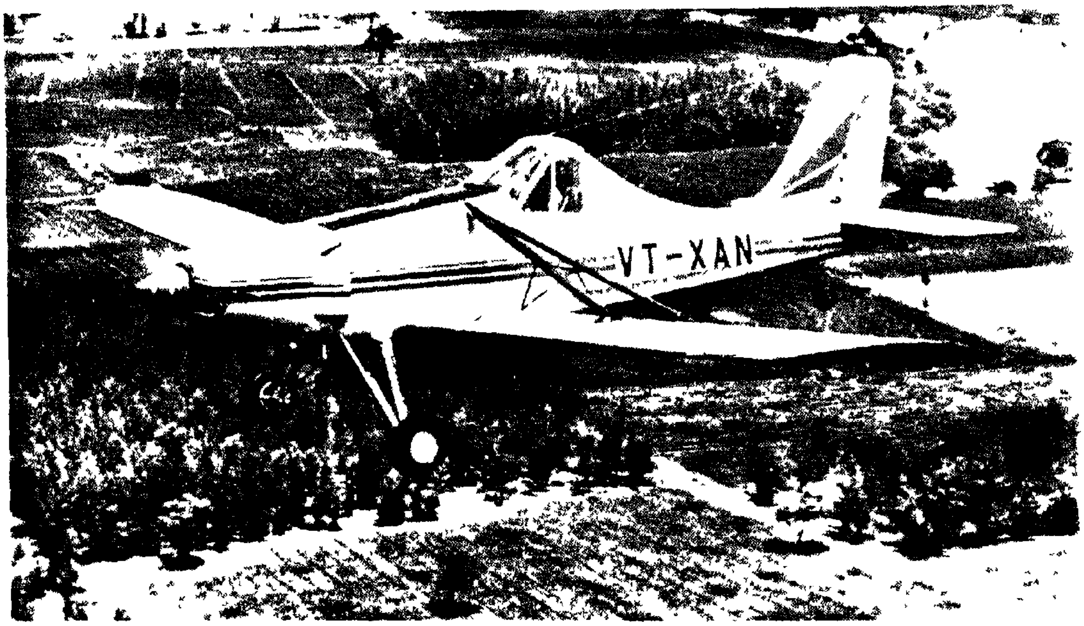
——— ڈاکٹر فضل امام

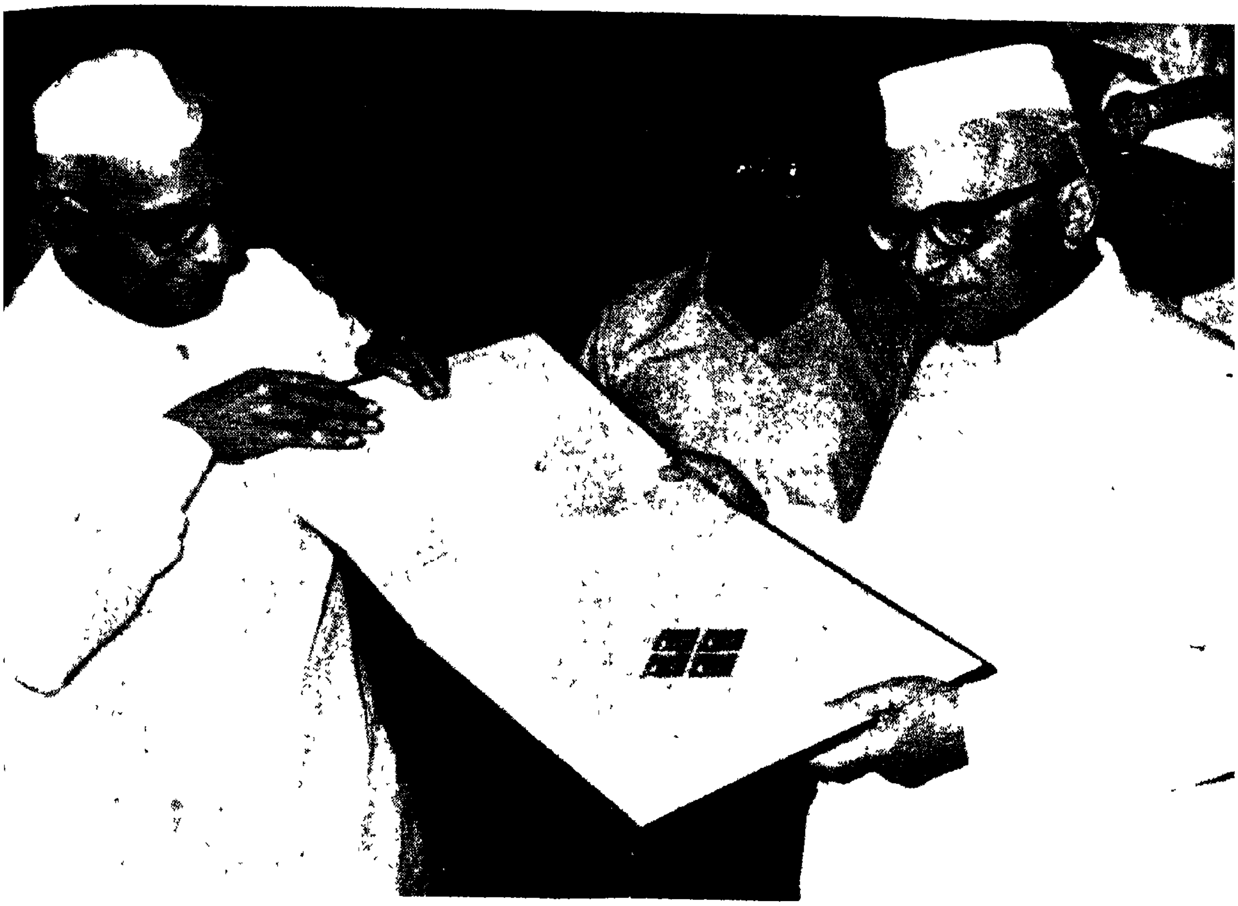


اور خچروں پر لاد کر پہاڑوں کی بلندی تک پہنچایا جا سکتا ہے



تان ایروناٹکس نے حال ہی میں مرکزی وزارت رسد و زراعت کو دوائیں چھڑکنے کے لیے آٹھ ہوائی جہازوں کا پہلا دستہ پیش کیا۔ تصویر میں ایسے ایک ہوائی جہاز کو اڑان کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے





نائب صدر جمہوریہ شری جی۔ ایس۔ پاٹھک نے گزشتہ یکم اگست کو نئی دہلی میں ایک تقریب میں کملا نہرو خصوصی ڈاک ٹکٹ کا اجرا
کیا۔ تصویر میں مرکزی وزیر مواصلات شری برہمانند ریڈی شری پاٹھک کو ٹکٹوں کا ایک البم پیش کر رہے ہیں

نیا دور

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں ظاہر کئے گئے خیالات کا اظہار کیا جانا ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے پوری طرح متفق ہو

نیا دور

جلد ۳۰ نمبر ۶

ستمبر ۱۹۷۴ء

ایڈیٹر خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

سرورق حامد

پبلشر ستیہ پرکاش بھٹناگر
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات، اتر پردیش

پرنٹر اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

قیمت فی شمارہ ۔ پچاس پیسے
زر سالانہ ۔ پانچ روپے

ترسیل زر کا پتا سپرنٹنڈنٹ انفارمیشن (سی) ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتا: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ ۔ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

اپنی بات

شری فخرالدین علی احمد نے جمہوریۂ ہند کے نئے صدر کی حیثیت سے ۲۴ اگست ۱۹۷۴ء کو اپنا عہدہ سنبھال لیا ہے۔ آپ جمہوریہ ہند کے پانچویں صدر ہیں۔ شری فخرالدین علی احمد سے قبل ملک کی جو محترم شخصیتیں اس عہدے پر رونق افروز رہ چکی ہیں ان کے نام ہیں ڈاکٹر راجیندر پرشاد، ڈاکٹر رادھا کرشنن، ڈاکٹر ذاکر حسین اور شری وی۔ وی گری۔ آپ ۸۰ فیصد ووٹ کی بھاری اکثریت کے ساتھ صدر منتخب ہوئے ہیں۔

شری فخرالدین علی احمد ہمارے ملک کی زنگا رنگ، محبوب اور بزرگ سیاسی شخصیت ہیں۔ اس سے قبل آپ مختلف اعلیٰ عہدوں پر رہ کر ملک کی اہم خدمات انجام دے چکے ہیں۔ آپ کا شمار ملک کے عظیم اور بزرگ سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ آپ ہمیشہ قوم پرور رہے ہیں اور تحریک آزادی میں آپ نے اہم رول ادا کیا تھا۔ آپ ۱۹۳۱ء سے ہی انڈین نیشنل کانگرس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ حصول آزادی سے قبل آپ نے آسام میں مسلم لیگ سے براہ راست ٹکر لی تھی۔ جنگ آزادی کے دور میں آپ کو متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنا پڑیں۔ صدر جمہوریہ ہونے سے قبل آپ مرکزی کابینہ میں ۱۹۶۶ء سے ایک سینیئر وزیر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دے رہے تھے۔ شری فخرالدین علی احمد دوسرے مسلمان صدر ہیں جو ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے بعد صدر منتخب ہوئے ہیں۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوریت اور سیکولرزم کی جڑیں بہت گہرائی تک پہنچ چکی ہیں۔ صدر جمہوریہ کی حیثیت سے شری فخرالدین کے انتخاب پر ادارۂ نیا دور پرخلوص ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

مصنفین کو انعامات۔ گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں نے گزشتہ ۴ اگست کو راج بھون میں ایک سادہ اور موثر تقریب میں اردو، ہندی اور سنسکرت کے ۹۰ ممتاز ادیبوں کو انعامات اور سندیں تقسیم کیں۔ انعامات میں پانچ پانچ ہزار کے دو خصوصی انعامات بھی شامل ہیں۔ ایک خصوصی انعام بنارس کے ممتاز عالم شری ہیرانند سرسوتی کرپاتری کو اور دوسرا خصوصی انعام اردو، فارسی اور عربی کے ممتاز عالم اور رضا لائبریری رام پور کے ڈائرکٹر مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کو دیا گیا۔ مولانا عرشی کو ۵ روپیہ کا خصوصی انعام تنقید، تحقیق کے فن کو پروان چڑھانے، غالب شناسی اور تدریس ادبی اور علمی خدمات کے صلے میں پیش کیا گیا ہے۔ عرشی صاحب اعلیٰ پایہ کے محقق اور مصنف ہیں۔ ملک اور بیرون ملک میں ممتاز عالم، دانشور محقق اور مصنف کی حیثیت سے ان کا درجہ بہت بلند مانا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی انتھک کوششوں سے رضا لائبریری کو ایک عالمگیر شہرت عطا کی ہے۔ وہ ۵۰ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں "اردو پر پشتو کا اثر" اور دیوان غالب نسخہ عرشی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا عرشی کے علاوہ جن اردو ادیبوں کو انعامات دیے گئے ہیں ان میں مشتاق احمد، ڈاکٹر اکبر حیدری، بسم اللہ جاوید، بشیر بدر، خاور، رحیمہ بانو شامل ہیں۔ مشتاق احمد صاحب (کلکتہ) کو ان کی تصنیف سیویں صدی میں معرکے بنگال کے اردو شعراء پر اکبر الہ آباد انعام دیا گیا۔ ڈاکٹر اکبر حیدری (سری نگر) کو ان کی تصنیف میر ضمیر پر غالب انعام، وسیم بانو قدوائی صاحبہ (بھوپال) کو سبھدرا کماری چوہان انعام دیا گیا۔ بشیر بدر (میرٹھ) کو ... جاوید صاحب (دہلی) کو ملا وجہی کے انعام، محمد حامد رضا صاحب (آگرہ) کو متاعی سبھاش چندر بوس پر اور رحیمہ بانو صاحبہ (لکھنؤ) کو چراغ جو روشنی پر انعام ملا ہے۔ ہم ان سب ادیبوں کو مبارکباد دیتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ خود بھی اپنی تصانیف کے ذریعہ علم و ادب کے خزانے کو مالا مال کرتے رہیں گے اور نئے لکھنے والوں کو بھی روشنی دیتے رہیں گے۔

آہ فرحت اللہ انصاری۔ گزشتہ ۱۲ اگست کو تقریباً ڈھائی بجے دن میں یہ المناک خبر ملی کہ ہمارے فرحت اللہ انصاری صاحب کو موت کے ظالم پنجوں نے ہم سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا۔ فرحت صاحب نے محکمۂ اطلاعات میں جرنلسٹ کی حیثیت سے ملازمت شروع کی تھی اور چھ سات ماہ قبل اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ کون جانتا تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سب کو داغ مفارقت دے جائیں گے۔ فرحت صاحب فرنگی محل کے ایک مشہور و معروف مذہبی اور علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی



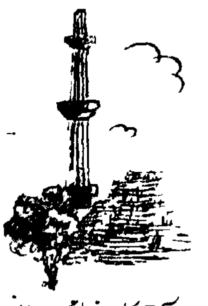
ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کے معاصرین میں علی سردار جعفری، سبط حسن، مجاز مرحوم اور علی جواد زیدی قابل ذکر ہیں جن سے ان کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ ایک اچھے مقرر اور خطیب کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی ان کو گہری دلچسپی تھی چنانچہ "ادب اور تہذیب" کے عنوان سے ان کے مختلف مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اور بھی بہت سے مضامین اور مقالے لکھے ہیں جو متعدد اخباروں اور ادبی رسالوں کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کی شخصیت بڑی باغ و بہار تھی۔ وہ جس محفل میں بھی ہوتے اپنے شوق طبع اور بذلہ سنجی سے اس پر چھا جاتے۔ وہ اگرچہ کینسر کے موذی مرض میں دو سال سے مبتلا تھے لیکن اس تمام عرصے میں وہ بڑی پامردی سے اس کا مقابلہ کرتے رہے جس سے ان کے مزاج کی اس کیفیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ حالات سے مایوس ہونا اور مشکلات سے خائف ہونا نہیں جانتے تھے۔ لیکن موت سے کس کو رستگاری ہے۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا کہ فرحت صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے مگر حقیقت کو چارو ناچار گوارا ہی کرنا ہے ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد حسن

تصویر دلّی کی



خطوط، روزنامچوں اور سفرناموں میں

۱۶ر جولائی ۱۹۷۴ء۔ آج کا روزنامچہ میرا نہیں دلّی کا ہے۔ دلّی کے نقوش خطوط، روزنامچوں اور سفرناموں میں تلاش کرنے بیٹھا ہوں گزرے زمانے کی ہزاروں تصویریں آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی ہیں چند منظروں میں کوئی انھیں یک جا کرے تو کیونکر:

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب　رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

ممکن ہے یہ مبالغہ ہو مگر اتنا ضرور ہے کہ ملکوں ملکوں کے اہلِ ہنر، سیاح، تاجر اور سیاسی مدبر ہندستان کی اس قدیم راجدھانی کا رخ کیا کرتے تھے۔

زیادہ دور کیوں جائیے۔ فرانسیسی ڈاکٹر برنیر، اوس صدی کے آخر میں دلی آتا ہے اور اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی تخت نشینی کی جنگ اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور اپنے قلم سے ذاتی مشاہدے کی بنا پر بیان کرتا ہے۔ دلی کی شان و شوکت آن بان عیش و عشرت کا یہ تماشائی اور مبصر اس دور کی دلی کی جیتی جاگتی تصویریں آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے پھر شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ہیں جن میں اس دور کے نشیب و فراز بے کم و کاست بیان ہوئے ہیں۔ تنقید سخت ہے اور باتیں کڑوی لیکن یہ گویا تصویر کا ایک رخ ہے۔ اس کے کچھ ہی زمانے بعد درگاہ قلی خاں اپنی یادداشت مرقع دہلی کے نام سے سپرد قلم کرتے ہیں اور گویا محمد شاہی دلی ہمارے تخیل کے پردے پر انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔

آج کی بات نہیں، لگ بھگ ڈھائی سو سال پہلے کی کرنسی میں جب روپیہ کی قیمت حید اتنی کم نہ تھی کہ ایک امیرزادے کو اپنی سسرال سے ایک لاکھ روپیہ دہلی کی سیر کے لیے ملتا ہے۔ ہوادار پر سوار دہلی کے خاص خاص بازاروں کی سیر کرتا اور اپنے شوق کی چیزیں خریدتا جاتا ہے۔ چند گھنٹوں میں یہ رقم ختم ہو جاتی ہے اور دہلی کی سیر اور خرید و فروخت کا ارمان جی کا جی ہی میں رہ جاتا ہے۔ اس زمانے کی دلّی چاندنی چوک، دریا گنج اور جامع مسجد اور لال قلعے کے نواح کی دلی ہے۔ بازار کے بیچ نہر جاری ہے اور جگہ جگہ درخت ہیں۔ نہ موٹروں کا شور ہے نہ اسکوٹروں کے ریلے، ہوادار، پالکی، نالکی، گھوڑے، گاڑیاں البتہ گزرتی ہیں۔ راستے میں دکانوں پر بھیڑ ہے۔ کہیں ٹکڑے جمع ہیں اور روزمرہ کے واقعات پر جوش گپیں ہو رہی ہیں۔ ہمارا امیرزادہ چوک سعد اللہ خاں سے گزر رہا ہے تو دیکھتا ہے کہ اسلحہ بیچنے والے ہتھیار علم کرتے ہیں۔ برابر کی دکانوں پر ولایتی اور ہندی میوے بک رہے ہیں۔ ایک طرف طرح طرح کے پرندے فروخت ہو رہے ہیں۔ ایسی ہی کسی دکان سے جانِ عالم نے ایسا طلسمی طوطا خریدا ہوگا۔ چاندنی چوک تو سیرگاہ موزوں ہے نہر رواں ہے ہر گوشہ اجناس و اشیا سے معمور ہے۔ عطریات کی مہک دماغ معطر کر رہی ہے۔ شیشے اور چینی کے برتنوں کی دکانیں جگمگا رہی ہیں، شام کا جھٹ پٹا ہوا اور ایک طرف دلداری اور نظر بازی کا بازار گرم ہوا تو دوسری طرف داستان گو اپنے نت نئے قصے بیان کر رہے ہیں۔ تیسری طرف "راویانِ معتبر" مسجدوں کی چوبی کرسیوں پر بیٹھے ہر ماہ اور ہر روز کے مطابق مضمون بیان کر رہے ہیں۔ رمضان کا مہینہ ہے تو فضائل صوم کی گفتگو ہے، محرم ہے تو "روضۃ الشہدا" کے واقعات۔ ایک طرف نجومی اور رمّال اپنی پوتھی بچھائے بیٹھے ہیں دوسرے کونے میں حکیم اور دوا فروش اپنی دکانیں سجائے بیٹھے ہیں۔

دلّی اس زمانے میں سینما تھیٹر اور ہوٹلوں کی دلّی نہ تھی۔ تفریح کا

ذریعہ یا تو میلے ٹھیلے، عرس تہوار ہوتے تھے یا تقریبات اور دیوانخانوں کی صحبتیں اور ارباب نشاط کی محفلیں کبھی پھول والوں کی سیر ہے تو کبھی سلونوں، کبھی نوروز، کبھی ہولی کبھی کشتی اور تیراکی کے مقابلے ہیں تو کہیں قوالی اور طوائفوں کے مجرے اور رقص۔

اسی دور کی ایک اہم تہذیبی اور تاریخی دستاویز ہے، آنند رام مخلص کا سفر نامہ نما روزنامچہ۔ مخلص محمد شاہی دور کے اہم امراء میں سے تھے۔ مخلص کا مکان شہر سے باہر وکیل پورہ محلے میں تھا۔ گھر کے سب کاروبار امیرانہ تھے۔ مکان کے مردانہ اور زنانہ حصے جدا جدا تھے۔ ہر شخص کی خواب گاہ بھی جدا تھی۔ باہر ڈیوڑھی پر بکسریوں کا پہرہ چوکی اور ہر کام کے لیے نوکر جدا، قلماقنیاں حاضر اور دوسری کنیزیاں موجود۔ نوکروں میں ایک نوکر گھنشیام بھی تھا جو کھانے کے حق میں متھرا کا چوبا تھا۔ مخلص کو حقے کا بے حد شوق تھا۔ گھر میں شیشے کے حقے بھی تھے مگر نوکروں نے اکثر حقوں میں بال ڈال دیئے تھے۔ نواح دلی میں مخلص کا ایک باغ بھی تھا۔ اصطبل میں کثیر تعداد میں گھوڑے اور اونٹ۔ سواری کے لیے ہاتھی۔ مکان میں جا بجا نہر جاری۔ انگور کی بیل چھائی ہوئی اور ساتھ میں گلکاری بھی تھی۔ نمی کی بدولت مچھروں کی کثرت تھی۔ گرمی کے دنوں میں صحن میں چار نلیاں نصب کر کے پنکھے کا سامان کیا تھا۔ دھرم یاترا کے طور پر گڑھ مکتیسر کا سفر ۱۷۴۳ء میں درپیش ہوا تو بیٹوں اور رشتہ داروں کے علاوہ اپنے شاعر دوست میر شرف الدین علی پیام کو بھی ساتھ لے گیا۔ ایک مرتبہ افواہ مشہور ہوئی کہ وکیل پورے کی ایک عورت نے ستی ہونے کی ٹھان لی ہے۔ لوگ جوق در جوق دیکھنے کو آ گئے۔ امراء تک لباس بدل کر بازاروں میں نکل پڑے مگر مخلص پر خدا ترسی اور انسان دوستی کا وہ غلبہ ہوا کہ یہ منظر دیکھنے کی تاب نہ لا سکا اور شہر چھوڑ کر مہرولی کا رخ کیا اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر جا کر دم لیا جن کا وہ انتہائی عقیدت مند تھا۔"

اسی طریق کی ایک اور روزنامچہ نما خود نوشت سوانح عمری اردو کے مشہور شاعر سعادت یار خاں رنگین کے والد طہماسپ بیگ خاں کی تصنیف طہماسپ نامہ ہے۔ یوں تو ان کی اپنی کہانی بڑی دلدوز داستان ہے۔ نادر شاہ کے فوجیوں نے ترکستان کے ایک گاؤں کو لوٹنا شروع کیا اور پانچ سال کی عمر کے ایک بچے کو ماں کی گود سے چھین لیا۔ بڑے بھائی نے غاصب شہسوار کا پیچھا کیا تو اسے نیزہ مارا۔ ماں باپ زخمی بیٹے کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ شہسوار پانچ سالہ لڑکے کو لے کر بھاگ گیا۔ یہی لڑکا نادر شاہی لشکر میں شامل ہوا اور ترک سرداروں کے ساتھ پنجاب آیا۔ ترک سرداروں نے اسے پنجاب کے صوبہ دار معین الملک کی نذر کر دیا۔ بعد کو یہ فوجی عہدے دار کی حیثیت سے نجف خاں کے دور حکومت میں دلی پہنچتا ہے۔

دلی کے امن و امان اور عیش و عشرت کا طہماسپ نے تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہر گھر عیش و عشرت سے معمور ہے۔ ہر طرح کی چیزیں شہر میں بیچی اور خریدی جاتی ہیں۔ نئی نئی عمارتیں بن رہی ہیں۔ محلہ بلی ماراں میں مکان خرید کر مستقل سکونت اختیار کرتا ہے۔ مکان چھوٹا تھا اس لیے پاس پڑوس کے مکانات خرید کر ایک بڑی حویلی تعمیر کرالی۔ گھی منڈی کے علاقے کو خرید کر وہاں ایک باغ لگوایا۔ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو الگ الگ مکانات، گھوڑے اور ملازمین دیے۔

اس ضمن میں حدیقۃ الاقالیم کے مصنف الہ یار خاں کے بیانات بھی قابل ذکر ہیں۔ مصنف محمد شاہ کے دربار میں بھی بار پا چکا تھا۔ محمد شاہی دربار کے سلیقے اور قرینے کی تعریف کرتا ہے۔ طلائی مرصع گلاب پاشوں سے گلاب پاشی ہو رہی ہے۔ منصب دار اور امراء اپنے اپنے منصب کے مطابق دست بستہ کھڑے ہیں۔ "حشمت و شکوہ شاہی" دیکھتا ہے اور لکھتا ہے کہ "بادشاہ ہندوستان خدائی می کند"۔ یہ بھی کہ اس نازک مزاجی اور آسائش طلبی نے شاہجہاں آباد کو ویران اور سلطنت ہندوستان کو خراب و ابتر کیا ہے۔"

پھر لگ بھگ بیس سال بعد عالمگیر ثانی کے دور میں پھر دلی آتا ہے تو لکھتا ہے:

"شہر کی نہر خشک ہو گئی ہے۔ شہر نہایت ویران ہے۔ قلعہ بادشاہی کے سامنے گل کی بجائے گلخن اور لوگوں کے ہجوم کے بجائے چند گدھے تھے۔ قلعہ کے اندر دیوان عام کی عمارت میں نجیب خاں کے نوکر تھے۔ گھوڑے بندھے تھے اور جگہ جگہ ان کی گندگی کے ڈھیر تھے۔ میں علی قلی خاں شش انگشتی کے ساتھ چوک سعد اللہ خاں اور

چاندنی چوک سے سوار ہو کر گزرا۔ اللہ چند لوگ ہی نظر آئے۔ بازار خانم اور کھاری باؤلی میں البتہ کچھ رونق تھی۔ دکیل پورہ بالکل ویران ہو گیا ہے اور چور اچکوں کے ڈر سے حضرت قطب صاحب اور حضرت نظام الدین کی درگاہ تک جانا مشکل ہو گیا ہے۔"

اس سلسلے کی نایاب سب سے اہم اور دلچسپ تصویر اورنگ زیب عالمگیر کی پوتی کے نواسے اور شاہ عالم ثانی کے ہم جد شہزادہ میرزا محمد ظہیر الدین علی بخت اظفری دہلوی کا روزنامچہ ہے۔ یہ شہزادہ چونکہ شاہان مغلیہ کے سلسلے سے تعلق رکھتا تھا اور وارث تخت میں ہو سکتا تھا لہذا اسے اس دور کے دستور کے مطابق لال قلعہ کے اندر سلاطینی قید میں رکھا گیا جہاں وہ طرح طرح کی تکالیف جھیلتا ہے اور آخر کار فرار ہو جاتا ہے۔ یہیں غلام قادر روہیلے نے شاہ عالم کی آنکھیں نکالیں، لال قلعہ کی تباہی کا منظر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ لال قلعہ سے فرار کا حال مختصراً سنیے۔

" اتفاق سے اس دن لوہاری دروازے کی چول کی مرمت ہو رہی تھی جو پہلے سے شکستہ تھی اس وجہ سے اس دروازے سے کوئی شخص نہیں گزرتا تھا۔ چار و ناچار ہم نے بھی دلی دروازے کا رستہ اختیار کیا اور بغیر کسی نقصان کے قلعہ مبارک سے باہر نکل گئے۔ جامع مسجد سے نیچے پہنچ کر ڈاک کے آدمیوں کی تلاش میں کوئی آدھ گھنٹہ لگا۔ اس اثنا میں مجھے مسجد کی سمت سے نیچے کی سیڑھی پر بیٹھنا پڑا۔ نیر گاسم نے وہاں کی تھوڑی سی خاک پاک اٹھا کر اپنی پیشانی پر ملی . اس کے بعد دوڑ دھوپ کر کے ہم اجمیری دروازے کی کھڑکی سے باہر نکل گئے "

قلعہ والوں اور دلی والوں کی خوش عقیدگی اور توہم پرستی کا حال بیان کرتے ہوئے مختلف قصے نقل کرتا ہے۔ شاہ عالم جب شہزادے تھے اور الہ آباد میں مقیم تھے تو ان کی بیگم نے ایک مکار فقیر کو ایک لاکھ روپیہ اس وعدے پر دیا کہ وہ بیگم کا پلنگ جنات کے ذریعے الہ آباد بھجوا دے گا۔ فقیر کی ہدایت کے مطابق بیگم کھلے آسمان کے نیچے سوئیں مگر پلنگ نہ اڑا۔

میر تقی میر اسی زمانے کی دلی کے نغمہ خواں اور نوحہ گر ہیں۔ دلی میں احمد شاہ ابدالی کی آمد اور قتل عام سب کچھ میر کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ خود میر کا مکان منہدم ہو گیا

" بندہ اپنی عزت بچائے شہر میں بیٹھا رہا۔ شام کے بعد منادی ہوئی کہ بادشاہ نے امان دے دی ہے رعایا کو چاہیے کہ پریشان نہ ہو مگر جب گھڑی بھر رات گزر رہی تو غارت گروں نے ظلم و ستم ڈھانا شروع کیے شہر کو آگ لگا دی۔ گھروں کو جلا دیا . بے رحم لوگ بے چارے شہر کو تاراج کرنے میں لگ گئے . مردوں کے سر ننگے تھے اور عورتوں کے پاس اوڑھنی بھی نہ تھی "

مکاتیب کے سلسلے میں ایک مسز میر حسن کے خطوط ہیں۔ یہ ایک یورپین خاتون تھیں جنھوں نے اس دور کے ایک با اثر امیر میر حسن سے شادی کی تھی۔ انھوں نے لگ بھگ بارہ برس یہاں قیام کیا اور ہندوستانی سماج کے بارے میں اپنے یورپین احباب و اعزا کو خطوط لکھے جو ۱۸۳۲ء میں دو جلدوں میں لندن سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ انگریز خاتون دلی بھی آئی تھی اور قلعہ معلیٰ کی حرم سرا میں بھی باریاب ہوئی تھی۔

بعد کے دور میں شیخ ریاض الدین امجد کا ۱۸۶۱ء کا لکھا ہوا سفر نامہ سیر دلی ہے جو روزنامچے کے طرز میں لکھا گیا ہے:

" ۲۴ جولائی کو کچھ رات سے اٹھا۔ دن نکلتے نکلتے دلی دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ یہاں سے قلعہ کے دلی دروازہ تک بازار بہت وسیع نہایت قطع دار ہے بیچ میں نہر سنگ سرخ اور کاٹھ کے برآمدے انگریزی و ہندوستانی وضع کے کمرے جن میں طرح طرح کا نقش و نگار ہے . زینت المساجد میں گورے رہتے ہیں سرکاری توپ کی جائے گاہ ہے۔ نگو اباری کا محلہ تمام ٹوٹ گیا ہے بالکل تباہ ہے صابر بخش کی سرائے خالی ہے میوہ فروشوں نے بالفعل اپنوں کی منڈی ڈالی ہے اکبر آبادی مسجد کے عقب میں میدان ہے یہ محلہ سب کا سب ویران ہے "

پھر غالب کے خطوط ہیں جو گویا دلی کی جیتی جاگتی تصویروں کا مرقع ہیں۔ مٹتی ہوئی مٹتی ہوئی مگر عظیم دلی اور حق یہ ہے کہ دلی کے اس عظیم الشان زوال کو اس سے بڑا مصور نہ مل سکتا تھا۔ غالب کے خطوط کے اقتباس عام ہیں اور ان کے نقل کرنے کا یہ محل نہیں صرف چند جملے کافی ہیں:

" بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

• سعادت نظیر

میکسم گورکی

اک دور تھا ایسا بھی کہ دنیا تھی پریشاں — ہر دل تھا لرزتا سا چراغ تہہِ داماں
ہر باغ میں مسموم ہواؤں کا اثر تھا — تا حدِ نظر غم کی فضاؤں کا اثر تھا
تھے کتنے کڑے وقت کے بدلے ہوئے تیور — اک آہِ مسلسل تھی غریبوں کے لبوں پر
ماحول میں بے رُوح اشارات بہت تھے — اسلاف کے فرسودہ روایات بہت تھے
آپس میں مفادات کا تھا ایسا تصادم — جیسے ہو سمندر میں بلاخیز تلاطم
ہر سمت مسلط تھی قیامت کی شبِ تار — اُبھرا "اُفقِ روس" پہ اک مہرِ ضیا بار
اک روشنی سی آئی اندھیروں سے نکل کر — انساں کا رہا زاویۂ فکر بدل کر
تہذیب کی راہوں میں ملی عقل کی منزل — اخلاق بنے بحرِ کمالات کا ساحل
اے گورکی! مزدور کے، دہقاں کے طرف دار — محکوم کے، مظلوم کے، مجبور کے غم خوار
ہے دل میں ترے مادرِ گیتی کی محبت — نظروں میں تری ہے غمِ جمہور کی قیمت
ہے ذہن میں تیرے، نئی تعمیر کا عالم — ہر بات میں پوشیدہ ہے تاثیر کا عالم
تو خالقِ ماحول ہے دنیا کی نظر میں — معیارِ تفکر دلِ بینا کی نظر میں
امیدِ جفاکش کو توانائی عطا کی — گویا گلِ پژمردہ کو رعنائی عطا کی
انساں پہ کیا آئینہ، انسان کا کردار — تصنیف ہے جو تیری، حقیقت کا ہے شہکار
پیدا ہے صداقت ترے اندازِ رقم سے — کچھ اور بڑھی عظمتِ فن تیرے قلم سے
اے مطلعِ امروز کی تنویر کے عکاس — ماضی کی بدلتی ہوئی تقدیر کے عکاس
بیدار ہوا ذوقِ نظر تیرے قلم سے — کھینچی گئی تصویرِ سحر حُسنِ رقم سے
نباضِ جہاں، تیری نگارش ہے گہر خیز — لفظوں سے معانی کی تراوش ہے گہر ریز
ہے سحر کہ اعجاز تری شوخیِ تحریر؟ — یا چادرِ آبی پہ کسی چاند کی تصویر
کیا جوہرِ احساس ہے! کیا قدرتِ ادراک — اظہارِ حقیقت میں زباں ہے تری، بے باک
کیا جوش ہے، کیا زور ہے، کیا حسنِ بیاں ہے! — اک عالمِ معنی ترے لفظوں میں نہاں ہے
جو تیرا تصور تھا، وہ دنیا میں ہوا عام — سب کے لیے اک درسِ عمل ہے ترا پیغام

انسان ستاروں کو جب آباد کرے گا
پروازِ تخیل کو تری یاد کرے گا

ہمیں اپنے دیش میں سوشلزم قائم کرنا ہے

یوم آزادی کے موقع پر گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں کی تقریر



آج کا دن ہم سب لوگوں کے لیے خوشی کا دن ہے۔ آج کے دن ہی ۲۷ سال قبل ہم نے راشٹر پتا گاندھی جی کی رہنمائی میں اپنے ملک کو بدیشی حکومت سے آزاد کیا تھا۔ آج ہم اسی دن کی سالگرہ منا رہے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم جشن آزادی کے دن کی خوشی منائیں، ہم کو ان لاکھوں کروڑوں شہیدوں، ستیہ گرہ کرنے والوں اور ظلم و تشدد کے خلاف لڑنے والوں کو ادب کے ساتھ یاد کرنا ہے۔ جن کی قربانی، تیاگ، لگن اور تپسیا سے ہم آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوسے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اب ہمارے درمیان میں نہیں رہے اور آزادی کو بھی نہیں دیکھ پائے۔ لیکن ان میں دیش پریم کی آگ تھی ظلم سے لڑنے کی طاقت تھی اور ملک کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے کو وہ ثواب کا کام سمجھتے تھے تاکہ آنے والی نسلیں آزادی کی کھلی فضا میں سانس لے سکیں اور وہ جس طرح کا اپنا دیش بنانا چاہیں اسے بنانے میں ان کو کوئی رکاوٹ اور دشواری نہ ہو۔

ہماری آزادی کی لڑائی کی دوسری مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی یہ لڑائی اہنسا کے ہتھیار سے لڑی گئی۔ مہاتما گاندھی نے ہمیں اہنسا کا سبق سکھایا اور یہ بھی بتایا کہ اہنسا کی طاقت کو کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کے دوسرے ملک ہتھیاروں کی مدد سے جنگ کرکے آزاد ہوسے لیکن یہ فخر صرف ہمارے ہندستان کو حاصل ہے کہ اس نے ہتھیاروں کے بجائے اہنسا کے ذریعہ آزادی حاصل کی۔

آزادی کے بعد ہمیں اپنے ملک کو بنانے اور سنوارنے کا موقع ملا۔ نئے ہندستان کی عمارت کی بنیادیں رکھنے کا کام قوم کے رہنما شری جواہر لال نہرو نے انجام دیا۔ انھوں نے جمہوریت، سیکولرزم اور صلح داد کے اصولوں پر ملک کی بنیادیں رکھیں۔ ہمارے ملک نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ یہاں کے تمام باشندوں کو اپنے اپنے مذہب اور دھرم پر چلنے کی پوری پوری آزادی ہوگی۔

ہمیں اپنے دیش میں سوشلزم قائم کرنا ہے سوشلزم کا مطلب پیداوار اور تقسیم پر سرکار کا کنٹرول ہے تاکہ لوٹ کھسوٹ اور نابرابری کا خاتمہ ہو سکے سوشلزم کے ذریعے ہمیں آرتھک سماج لانا ہے آزادی ملنے کے وقت ملک کافی غریب تھا۔ اس کے پاس سادھن کی کمی تھی اقتصادی حالت اچھی نہ تھی۔ اس کو مناسب سمت دینے اور رفتار لانے کے لیے ہم نے منصوبہ بندی کا سہارا لیا۔ منصوبہ بندی یا پلاننگ کا دور ۱۹۵۱ء میں شروع ہوا تھا۔ اس وقت سے یہ برابر جاری ہے۔ گزشتہ پہلی اپریل

سے ہم نے اپنے دیش اور ریاست میں پانچواں پنج سالہ منصوبہ شروع کیا ہے۔ اس دوران میں ہمارے دیش اور پردیش نے کافی ترقی کی ہے۔ اگرچہ ہمیں طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، لڑائیوں سے بھی سابقہ رہا، کچھ بڑی طاقتیں ناراض بھی ہوئیں لیکن ہم اپنے راستے سے نہیں ہٹے اور مضبوطی سے اپنے اصولوں پر قائم رہے۔

ہماری ریاست بنیادی طور سے کسان ریاست ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ کھیتی باڑی کی ترقی پر اور کسانوں کی حالت سدھارنے پر ہم زیادہ دھیان دیں۔ اس میدان میں اتر پردیش نے جو ترقی کی ہے یہ اسی سے ظاہر ہے کہ تیسری یوجنا کے دوران غلے کی مجموعی پیداوار ۶۷۸،۹ لاکھ ٹن ہوئی تھی لیکن چوتھی یوجنا میں جو اسی مارچ ۱۹۷۴ء کو ختم ہوئی ہے یہ پیداوار بڑھ کر ۸۸۴،۸۶ لاکھ ٹن ہو گئی۔ اس سال یعنی پانچویں یوجنا کے پہلے ہی سال میں ۲۱۰ لاکھ ٹن اناج پیدا کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

چونکہ کھیتی باڑی ایک فنی ٹکنیکل اور سائنٹفک سبجکٹ بن چکی ہے اس لیے کاشتکاری کے لیے سائنسی طریقوں پر زور دینا ضروری ہو گیا ہے۔ اسی بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے فیض آباد میں ایک زراعتی یونی ورسٹی اور پہاڑی علاقوں کے لیے پنت نگر زراعتی یونی ورسٹی کا ایک کیمپس قائم کیا جا رہا ہے۔ کانپور کے زراعتی سائنسی ادارے کو ایک مکمل زراعتی یونی ورسٹی میں بدلنے کی کارروائی ہو رہی ہے۔

سینچائی کی صلاحیت کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے لیے رام گنگا، گنڈک اور شاردا سہائک علاقوں کے لیے الگ الگ ڈولپمنٹ اتھارٹیوں کا قیام عمل میں آیا ہے۔ چوتھی یوجنا کے ختم ہونے تک ۹۲،۶۰ لاکھ ہیکٹر آراضی کے لیے سینچائی کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ اس سال مزید ۶،۰۳ لاکھ ہیکٹر آراضی کے لیے سینچائی کی سہولتیں مہیا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

زراعت و صنعت کی ترقی کے لیے بجلی انتہائی ضروری ہے۔ بجلی کی پیداوار بڑھانے پر کافی زور دیا جا رہا ہے۔ لیکن پچھلے سال مانسون کے دوران پہاڑی علاقے میں بارش کم ہونے کے باعث ہمارے پردیش کو بجلی کے معاملے میں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس صورت حال پر قابو پانے کے لیے تھرمل بجلی گھروں کی پیداواری صلاحیت کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ پچھلے مہینوں میں ان بجلی گھروں کی ۵۸ فیصدی پیداواری صلاحیت کا استعمال کیا گیا جو ملک میں سب سے زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ پڑوسی ریاست سے بھی بجلی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ مرکزی حکومت سے اتر پردیش کو بجلی کے کچھ اور پراجکٹ الاٹ کرنے کی درخواست کی گئی۔ اتر پردیش میں نرورا (ضلع بلند شہر) میں ایک ایٹمی بجلی گھر قائم کیا جا رہا ہے۔

حکومت نے بجلی کے سلسلے میں زراعت اور صنعت کی زیادہ سے زیادہ مانگ پوری کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ چوتھی یوجنا کی مدت کے ختم ہونے پر ریاست میں بجلی کی پیداواری صلاحیت ۱۶۸۰ مگاواٹ تھی۔ پانچویں یوجنا کے آخر تک اسے بڑھا کر ۴۵۰۸ میگاواٹ کر دینے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس سال ۴۵ میگاواٹ مزید بجلی پیدا ہونے لگے گی۔

صنعتوں کی ترقی پر خصوصی توجہ کی جا رہی ہے۔ سولہ نئی سوتی ملوں اور ۱۲ نئی شکر ملوں کے لائسنس مرکزی حکومت سے حاصل ہو گئے ہیں۔ ریاست میں سرکاری زمرے میں کئی ادارے قائم ہونے والے ہیں۔

دست کاری اور دیہی صنعتوں پر کافی زور دیا جا رہا ہے۔ بجلی کے سامان اور چمڑے کی صنعت کے لیے کارپوریشن بنا دیے گئے ہیں، ریاستی ہینڈلوم اور پاورلوم فائی نینس و ترقیاتی کارپوریشن زیادہ سے زیادہ مدد دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ جھانسی اور نظام آباد (اعظم گڑھ) میں پاٹری (POTTERY) ترقیاتی مرکز کھولے جا رہے ہیں۔ سوتی کپڑے کی کمی کو دور کرنے کے لیے آٹھ نئی سوتی ملوں کے قیام کا کام شروع ہو گیا ہے جن میں سے ہر ایک میں ۲ لاکھ تکلے ہوں گے۔ شکر کارپوریشن، سیمنٹ کارپوریشن، ہینڈلوم کارپوریشن، پک اپ (PICUP) صنعتی ترقیاتی کارپوریشن، برآمدات (EXPORT) کارپوریشن اور دوسرے ادارے صنعتی ترقی کی رفتار بڑھانے اور صنعتی ماحول کو بہتر بنانے کی بھرپور کوششیں کر رہے ہیں جس سے پردیش کی دوگنی

ترقی میں تیزی لائی جا سکے۔

سڑکوں اور پلوں کا نرمان تیزی سے ہو رہا ہے۔ پچھلے سال ۱۱۴ کلومیٹر سڑکیں بنی تھیں لیکن ۸۸۵ کلومیٹر بنیں۔ ۸ نئے پلوں کو بھی پورا کیا گیا۔ پانچویں یوجنا میں ۱۱۶۵ کلومیٹر نئی سڑکوں کے بنانے کا ارادہ ہے جس سے پردیش میں آنے جانے کی آسانیاں بڑھیں گی اور جنتا کو راحت ملے گی۔ چوتھے پنج سالہ منصوبے میں علاج کی سہولتیں میں اضافہ کیا گیا اور ۱۸۶ نئے اسپتال کھولے گئے۔ اس سال ۲۲ نئے ایلوپیتھک اسپتال، ۱۵ آیورویدک اور یونانی اور ۲۶ ہومیوپیتھک اسپتال کھولے جائیں گے۔

پردیش کے سبھی میڈیکل کالجوں میں اقوام مندرجہ فہرست اور قبائل مندرجہ فہرست کے لیے ۱۰ فیصد سیٹیں محفوظ کر دی گئی ہیں۔

جنگ آزادی کے سورماؤں اور ورکنگ جرنلسٹوں کے لیے پردیش میں پہلی بار سرکاری ملازموں کے برابر علاج کی سہولتیں دی گئیں۔

تعلیم کے میدان میں بنیادی سدھار کیے جا رہے ہیں تاکہ طالب علموں کی خاطر خواہ ترقی ہو سکے۔ وائس چانسلروں کی میٹنگ میں پیش ہونے والی تجویزوں پر غور کیا جا رہا ہے۔ ثانوی درجوں کے نصاب کے بعض مضامین میں ترمیم کر دی گئی ہے۔ بیسک تعلیم کے تمام پہلوؤں پر وچار کیا جا رہا ہے۔ ثانوی تعلیم کو قومیانے کا سوال حکومت کے زیر غور ہے۔ امتحان کے طریقوں میں اصلاح کی جا رہی ہے۔

کمایوں اور گڑھوال ڈویژنوں کے لیے دو نئی یونیورسٹیاں قائم کی جا چکی ہیں، کاشی ودیا پیٹھ کو یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا ہے۔ بقیہ بانی روہیل کھنڈ اور بندیل کھنڈ میں یونیورسٹیوں کے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ ایک اعلیٰ تعلیمی امدادی کمیشن بھی قائم کیا جا رہا ہے۔

اردو تعلیم کی ترقی کے لیے کئی قدم اٹھائے گئے ہیں۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت ریاستی ثانوی اسکولوں میں اردو ٹیچروں کو تعینات کیا جا رہا ہے۔ جونیر ہائی اسکولوں میں پانچ ہزار اردو ٹیچر مقرر کیے گئے ہیں۔ درجہ ایک سے درجہ ۸ تک کی کتابیں اردو میں تیار کرا دی گئی ہیں۔

مزدوروں کی بھلائی کے لیے کئی قدم اٹھائے گئے ہیں اور کئی صنعتوں کے مزدوروں کی اجرتوں اور بھتوں میں اضافہ کیا گیا۔ ڈیکوم میں شکر صنعت، چمڑے کی صنعت، انجینیرنگ صنعت اور سوتی کپڑے، سوٹ اور اون کی صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو اس سے فائدہ پہنچا۔ غیر منظم صنعتوں اور گھریلو صنعتوں کے مزدوروں کی کم سے کم اجرت نئے سرے سے طے کی گئی۔ پہلی بار کھیتی باڑی سے متعلق صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی کم سے کم اجرتیں مقرر کی گئیں۔ غیر منظم صنعتوں کے مزدوروں کو یونینیں بنانے اور انھیں مفت قانونی صلاح دینے کے لیے ایک یونین ترقیاتی افسر اور لیبر وکیلوں کی تقرریاں کی گئیں۔

کمزور ورگوں کو سماجی انصاف دلانے کے لیے پردیش میں کئی کارگر قدم اٹھائے گئے اور اقوام و قبائل مندرجہ فہرست اور دوسرے پس ماندہ طبقوں کی بہبودی کے لیے اس درمیان کئی اسکیمیں شروع کی گئیں۔ گزشتہ سال کے مقابلے میں اس سال ۳ کروڑ روپے زیادہ خرچ کیے جائیں گے۔ اس طرح اس سال ۱۴ کروڑ روپے کا انتظام کیا گیا ہے۔ دیہی گاؤں میں ۵،۷۵ مکانات بنائے جا رہے ہیں اور ہریجن بستیوں میں کنوئیں بنوائے گئے ہیں۔ بے زمین کھیت مزدوروں خاص طور سے اقوام اور قبائل مندرجہ فہرست کے خاندانوں کو اپنے ذاتی مکان بنانے کے لیے ۱۵۰ مربع میٹر فی خاندان کے حساب سے مفت زمین تقسیم کی جا رہی ہے۔ گزشتہ اپریل تک ۹،۲۲ لاکھ خاندانوں کو ۱۴ ہزار ہیکٹر زمین دی جا چکی تھی۔ اس کے علاوہ اقوام اور قبائل مندرجہ فہرست کے بے زمین مزدوروں کو قابل کاشت زمینیں بانٹنے کے معاملے میں ترجیح دی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں قانون میں ضروری ترمیم کی جا رہی ہے۔

ہریجنوں اور اقلیتوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا ہے جس کے چیرمین ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ چیف جسٹس بنائے گئے ہیں۔

اقوام اور قبائل مندرجہ فہرست کے طالب علموں کو پہلے سے زیادہ تعلیمی سہولتیں دی جا رہی ہیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے ہوسٹلوں میں ان کے لیے ۱۸ فیصد جگہیں محفوظ کر دی گئی ہیں۔ میٹرک تک کے درجوں میں پڑھنے والے طالب علموں کو جو وظیفے دیے جاتے

تھے ان میں ۵۰ فیصد کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور میٹرک سے آگے کے درجوں اور انجینئرنگ، میڈیکل اور ٹکنیکل درجوں کے وظیفوں میں ۱۰۰ فیصدی کا اضافہ کیا گیا ہے۔

سرکاری ملازمتوں میں اقوام اور قبائل مندرجہ فہرست کے لوگوں کا فیصد تناسب کم تھا۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے بھی ٹھوس قدم اٹھائے گئے ہیں۔ اور ایسی کوشش کی جا رہی ہے کہ ان کا مقررہ کوٹہ پورا ہو جائے۔ اسی لیے پروموشن کوٹے میں ان کی جگہیں بڑھا دی گئی ہیں محکمہ پولیس میں تو چوتھے درجہ کی خالی جگہوں میں سے ۵۰ فیصدی جگہیں ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دی گئی ہیں۔

سماج کے کمزور اور پس ماندہ طبقوں کے لوگوں پر ظلم و زیادتی کی شکایتیں حکومت کو ملتی رہی ہیں۔ ان کی حفاظت اور ان کے مفاد کی دیکھ بھال کے لیے سرکار نے کئی کارگر قدم اٹھائے ہیں۔ افسروں، ضلع مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو احکامات جاری کیے گئے ہیں کہ جب بھی وہ دورے پر جائیں تو ہریجنوں اور کمزور طبقے کے لوگوں کے مفاد کی دیکھ بھال کی جانب خاص دھیان دیں اور ان کی شکایتوں کی بذات خود جانچ پڑتال کریں اور جو انھیں تنگ کریں ان کے خلاف سخت کارروائی کریں ہریجنوں پر ہونے والے ظلم و زیادتی کی جانچ کے لیے پولیس کے ایک ڈپٹی انسپکٹر جنرل کی نگرانی میں ایک مخصوص سیل (CELL) بھی بنا دیا گیا ہے۔

ہمارے پردیش نے ہر میدان میں نمایاں ترقی کی ہے لیکن کچھ کارنوں کی وجہ سے جن پر ہمارا بس نہیں تھا ہمارے یہاں ضروریات کی چیزوں کی کمی رہی جو ہم سب کے لیے پریشانی اور تشویش کا باعث ہے۔ اس موقع کا فائدہ کچھ بیوپاریوں، ذخیرہ بازوں، اسمگلروں اور دوسرے سماج دشمن عناصر نے اٹھانے کی کوشش کی۔ قلت اور مہنگائی سبھی ملکوں میں ہے۔ ہمارا ملک بھی اس سے اچھوتا نہیں ہے۔ یہ ایسا دور ہے جہاں سبھی کو، سرکار اور جنتا سا دونوں کو، ہوشیار رہنا ہے اور اس صورت حال کا مقابلہ ہمیں ہمت کے ساتھ کرنا ہے۔ موجودہ صورت حال کا تقاضہ ہے کہ ہم سب حکومت اور عوام یکساں طور پر ہوشیار رہیں اور دور اندیشی سے کام لیں۔ حکومت نے ذخیرہ بازوں، چور بازاری کرنے والوں اسمگلروں اور دوسرے سماج دشمن عناصر کی ریشہ دوانیوں کے خلاف کڑے قدم اٹھائے ہیں۔ قانون کو زیادہ سخت بنا دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے خلاف ڈی۔ آئی۔ آر اور اندرونی امن و امان قانون

(MAINTENANCE OF INTERNAL SECURITY ACT)

کا استعمال بھی کیا جا رہا ہے۔ بڑے پیمانے پر چھاپے مار کر مجرموں کو پکڑا جا رہا ہے اور ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جا رہی ہے۔

ہمارا اتر پردیش ایک بڑا پردیش ہے اس کی تہذیب، اس کا کلچر اور یہاں کی پرم پرائیں مہان رہی ہیں۔ آنے والے سال میں اسے اور زیادہ خوشحال اور ترقی یافتہ بنانے کے لیے ہمیں انتھک کوشش کرنا ہے۔

★

● مسعود علی ذوقی

کامنی

نین چرائے، نظر جھکائے
یہ کون نازک سی کامنی ہے؟
خرام کا لوچ کہہ رہا ہے، گویا
ندی کی خاموش راگنی ہے

حسین قامت کی شوخیوں میں
عجب قیامت کی دلکشی ہے
کہ جیسے چمپا کی نرم ٹہنی
ہوا کی رَو میں لچک رہی ہے

نگاہ اٹھ اٹھ کے رک رہی ہے دراز پلکوں کی چلمنوں میں
کہ جیسے سہمے ہوئے پرندے جھجک رہے ہوں نشیمنوں میں

حسین آواز، نرم لبوں سے
پھوار بن کر ٹپک رہی ہے
بسنت کی چاندنی میں گویا
ترنم سے شبنم چھلک رہی ہے

شباب یوں مسکرا رہا ہے
رخِ حسیں کی ملاحتوں میں
کنول کھلے جیسے منہ اندھیرے
سحر کی دھندلی صباحتوں میں

سیاہ زلفوں کی کچھ لٹیں مستیوں میں عارض کو چومتی ہیں
کہ جیسے ساون کی نم گھٹائیں افق پہ لہرا کے جھومتی ہیں

عمیق جھیلوں کی ظلمتیں ہیں
سیاہ آنکھوں کی دلکشی میں
شفق کی گل رنگ سرخیاں ہیں
لبوں کی نورس شگفتگی میں

جمالِ رخ کے سلونے پن میں
عجب طلسمی صباحتیں ہیں
ملاحت افروز تازگی سے
حباب کی سی نزاکتیں ہیں

ابھی ابھی سانولا تھا چہرہ، ابھی ابھی رنگ کھل گیا ہے
کہ جیسے کچنار کا شگوفہ کہ مینہ برسنے سے دھل گیا ہے

حسیں یہ معصومیت کا سایہ
نظر میں عفت کی سادگی ہے
یہ وہم ہے شوق کے فسوں کا
کہ واقعی مسکرا رہی ہے؟

لبوں پہ ہلکا سا کچھ تبسم
مگر تبسم ملول سا ہے
لٹا ہوا ہے حسین چہرہ
حسین چہرہ جو پھول سا ہے

حیا میں کچھ ایسی تمکنت ہے کہ سب کی آنکھیں جھکی ہوئی ہیں
اگرچہ حیرت کا ہے یہ عالم کہ سب کی سانسیں رکی ہوئی ہیں

● مظفر حیات متیں

آمدِ بہار

شاخیں لچکی، سرو جھوما اور لچکی پروائی
بادل نے اپنے خم جالے سے مستی برسائی
دور کہیں باغوں کے پیچھے بجلی سی لہرائی
آئی وہ مستی میں ڈولی اور لہرائی آئی
آئی وہ برکھا کی رانی جیون کا سکھ لائی

ماتھے کی نورانی سی سورج کو شرمائے
اس کے ہونٹوں کی رنگینی سو جلوے برسائے
اس کے گھنگھروؤں کی جھنکاروں سے دھرتی لہرائے
بیاکل آگ لگانے کو وہ دیپک بن کر آئی
آئی وہ برکھا کی رانی جیون کا سکھ لائی

رم جھم رم جھم میگھا برسے اور امرت برسائے
جس سے فطرت اور فطرت کی ہر شے جھومی جائے
ایسے میں گاگر لے کر وہ جل بھرنے کو آئے
جل بھرنے کو آئی وہ دیکھو جل بھرنے کو آئی
آئی وہ برکھا کی رانی جل بھرنے کو آئی



غالب کی آرزومندی

ڈاکٹر سید محمد علی زیدی

انیسویں صدی میں اردو ادب میں پہلی عظیم شخصیت غالب کی ہے۔ حالانکہ اس دور میں اور بھی قابل توجہ شخصیات ہیں لیکن غالب کی شخصیت ایسی مجموعی رنگارنگی، جامعیت، کمالِ ذہانت، ژرف نگاہی، جدت پسندی، مہذب رندی اور فطری صلاحیتوں کی وجہ سے سب پر غالب ہے۔ غالب کی شخصیت کے جس پہلو پر بھی غور کیا جائے ان کی عظمت کا معترف ہونا پڑتا ہے غالب کی شخصیت کے بہت سے نقش ابھرے اور ابھرتے جا رہے ہیں۔ ہر نقش اچھے سے اچھا اور ان کی شخصیت کو نکھارنے والا ہوتا ہے بقول پروفیسر آل احمد سرور "نئے نئے پہلو سامنے آتے رہتے ہیں اور ان کی روشنی میں غالب کے بت بنتے اور ٹوٹتے ہیں مگر موضوع ابھی فرسودہ نہیں ہے۔ اس میں ایک ابدی تازگی ہے ایک ترشے ہوئے ہیرے کی طرح اس میں سیکڑوں پہلو ہیں۔" ہر پہلو ایک کشش اور جاذبیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف خیال اور مختلف ذوق کے دماغ اپنے اپنے لیے دعوت کام و دہن کا سامان ان کے کلام میں سے ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ کسی کو غور و فکر کا سامان مل جاتا ہے تو کسی کو لطف زباں کا، کسی کو حسن پرستی کا تو کسی کو درویشی و رندی کا، کسی کو فلسفیانہ موشگافیوں کا، تو کسی کو فنکارانہ کمالات کا۔ غرض بقول ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری "زندگی کا وہ کون سا نغمہ ہے جو ساز کے ان تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں" وہ کون سا رنگ ہے جو اس تصویر میں نہیں وہ کون سی تصویر ہے جو اس نگارخانہ میں نہیں وہ کون سا سُر ہے جو اس ساز میں نہیں اور وہ کون سا پھول ہے جو اس گلستاں میں نہیں اور یہی غالب کی عظمت کا ثبوت ہے۔

غالب کی شخصیت کی تکمیل بہت سے رنگوں کے امتزاج سے ہوئی تھی۔ وہ ایبک ترک نسل سے تھے اس لیے ان کی فطرت میں سخت کوشی اور عیش پسندی تھی۔ اور ان میں جرأتِ رندانہ کی بھی کمی نہ تھی۔ وہ ہندوستانی تھے اس لیے اُن کے خمیر میں وفاداری بشرطِ استواری اور غور و فکر کا جذبہ تھا۔ انھوں نے بقول خود اُن کے ایرانی نژاد مُلّا عبدالصمد سے فارسی کی تعلیم پائی تھی اس لیے ان کی طبیعت میں نفاست اور حسن پرستی تھی۔ انھوں نے چند سال کلکتہ میں مغربی تہذیب و تمدن کی چمک دمک بھی دیکھی تھی اور مغربی خیالات سے دوچار ہوئے تھے اس لیے اُن کے مزاج میں ترقی پسندی اور تغیر پسندی تھی اور اندیشہ ہائے دور و دراز کی صلاحیت بھی۔ انھوں نے زوال آمادہ جاگیردارانہ نظام میں پرورش پائی تھی اس لیے ان کی جبلت میں وضع داری اور رکھ رکھاؤ تھا اور ان سب سے بڑھ کر مبداء فیاض نے انھیں شوخی، بلند خیالی اور ذہانت کی نعمتوں سے نوازا تھا ایجاد و اختراع کی صلاحیت عطا کی تھی یہی مختلف دھاگے

ان کی شخصیت میں آخر وقت تک کام کرتے رہے۔ اس دور میں جب ایک تہذیب دم توڑ رہی تھی ایک فرسودہ نظام درہم وبرہم ہو رہا تھا اور معاشی ڈھانچہ منتشر ہو رہا تھا، پرانی اقدار ختم ہو رہی تھیں اور ان کی جگہ لینے کے لیے دوسری تہذیب، دوسرا نظام اور دوسری قدریں واضح شکل میں سامنے نہیں آئی تھیں غالب کی شخصیت علاحدہ ہی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی انفرادیت کو اپنے سینے سے لگائے الگ ہی نظر آتے ہیں۔ اور اس کی وجہ اُن مختلف اور متضاد دھاروں کی اندرونی کشمکش ہے جو غالب کی شخصیت میں کام کر رہی تھی۔ تاہی کے اس دور میں وہ پہلے انفرادیت پرست تھے۔ مغلیہ شہنشاہیت کے اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو روشن رکھنے کے لیے مذہبی جذبے کی امداد کی ضرورت تھی۔ بہت سے شعراء جس میں مومن بھی شامل ہیں اس رو میں بہہ گئے لیکن غالب کی وسیع المشربی اور انفرادیت نے ان کو علاحدہ رکھا باوجودیکہ اُن کا بدنصیب مغل بادشاہ سے براہِ راست تعلق تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی طبیعت کے بانکپن اور ان کی شخصیت کے انفرادی جذبے نے ان کو درباداری کی مجبوریوں کا پابند نہ ہونے دیا۔ انھیں اپنی فن کاری اور خودداری کا پوری طرح احساس تھا اور انھوں نے اپنے عزتِ نفس کے بے بہا گوہر کو کسی کی نذر نہیں کیا۔ بلکہ ہر موقع پر اس کی بڑی ہمت سے حفاظت کی۔ خواہ وہ دلی کالج کی مدرسی کا تقرر ہو یا شاہ اودھ کے نائب السلطنت معتمد الدولہ آغا میر سے ملاقات کا موقع یا نواب کلب علی خاں والیِ رام پور سے تعلقات کا معاملہ ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

غالب کی شخصیت کا ایک اور پہلو جو بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے اور جسے غالب کا بڑے سے بڑا مخالف بھی نظر انداز نہیں کر سکتا وہ ہے اُن کی حوصلہ افزائی اور آرزومندی ان کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالنا ہی میرا مقصد ہے۔ غالب کی زندگی ایک جہدِ مسلسل ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مصائب و آلام میں گزرا وہ غمِ عشق میں تو کم لیکن غمِ روزگار میں بہت زیادہ مبتلا رہے لیکن اس کے باوجود بھی ان آلام و مصائب کا تاریک سایہ نہ اُن کی شاعری پر نظر آتا ہے نہ زندگی پر بلکہ اس کے برخلاف وہ آسودگی اور آسائش کی خواہش کی تلقین کرتے ہیں۔ ایسے عظیم صدمات اٹھانے کے بعد بھی نہ وہ قنوطی ہوئے نہ رجائی اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ شاعر کی ذاتی زندگی کے حالات کی صدائے بازگشت اس کی ادبی تخلیقات میں سنائی دیتی ہے۔ میر جیسا عظیم شاعر غمِ عشق اور حادثاتِ روزگار سے اتنا متاثر ہوا کہ ان کی تمام شاعری پر غم والم اور سوز وگداز مسلط ہو گیا۔ درد نے پرآشوب زمانے کے حالات سے متاثر ہو کر مستقل درد اپنا لیا۔ انشا جیسا شوخ وطباع شاعر شاہِ اودھ کی نظروں سے گرتے ہی اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنی برائے نام بادشاہت کی بساط اُلٹتے دیکھ کر اپنی غزلوں میں مرثیہ کا رنگ بھرا۔ فانی نے صدموں کی تاب نہ لا کر امام یاسیات بن گئے لیکن یہ غالب کی بلند حوصلگی اور عالی ہمتی تھی کہ انھوں نے صدموں پر صدمے اٹھائے، مصیبتوں پر مصیبتیں جھیلیں لیکن غم پرست نہ ہوئے۔ یہ ایک صحت مند ذہن اور زندگی کی حسین چیزوں سے محبت کرنے کی علامت ہے۔

غالب نے غمِ گیتی بہت سہے اور اُن کا یہ کہنا حقیقت پر مبنی تھا کہ ع "دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھ کو داغوں کی بہار" میں اُن تمام سانحات اور صدمات کا جو غالب کو اٹھانے پڑے اعادہ نہیں کروں گا۔ محض اُن داغوں کی طرف اشارہ کروں گا۔ غالب کی تقریباً تمام عمر مالی پریشانیوں میں گزری یہاں تک کہ آخری دم تک ان پریشانیوں نے ساتھ نہ چھوڑا۔ مرزا کے سات بچے ہوئے لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی لیکن کوئی پندرہ مہینے سے زیادہ زندہ نہیں رہا اور مرزا کو داغ پر داغ اٹھانا پڑے جب اپنا کوئی بچہ زندہ نہ رہا تو انھوں نے نواب زین العابدین خاں عارف کو متبنیٰ کر لیا۔ مرزا انھیں بہت چاہتے تھے لیکن عارف نے بھی چھتیس (۳۶) سال کی عمر میں جواں مرگی کا داغ دیا اور مرزا بڑی حسرت سے فلکِ پیر کا شکوہ کر کے رہ گئے ؎

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

غالبؔ کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف نے ایسی حالت میں انتقال کیا کہ شہر میں ہنگامۂ دار و گیر شباب پر تھا۔ غالبؔ اس کس مپرسی کے عالم میں آہِ سرد کھینچ کر رہ گئے اور تجہیز و تکفین و تدفین میں بھی شریک نہ ہو سکے۔ عزیزوں کے داغ ایک طرف اور داغِ حسرتِ دل دوسری طرف، پنشن کے بند ہونے، مقدمہ میں ناکامیاب ہونے، بہت زیادہ مقروض ہو جانے سے غالبؔ کی خوش حالی اور امیرانہ زندگی بسر کرنے کی حسرت دم توڑ چکی تھی۔ دربار میں شرکت اور خلعت بند ہو جانے سے خاندانی وقار ختم ہوا۔ رہی سہی عزت، خانہ نشینی اور قید و بند کی ذلت نے خاک میں ملا دی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے غالبؔ کی حالت بہت زیادہ خستہ کر دی۔ اس پر آشوب زمانے میں غالبؔ نے جس طرح زندگی کے دن گزارے اس کا کچھ حال نواب یوسف علی خاں کو تحریر کیا ہے۔ "دریں ہنگامہ خود را بکنار کشیدم و بدیں اندیشہ کہ مبادا اگر یک قلم ترکِ آمیزش کنم خانۂ من بتاراج رود و جان در معرض تلف افتد بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا ماندم۔" اور آخر ہوا بھی یہی جان تو بچ گئی لیکن گھر تاراج ہو گیا۔ کالوں کے ہاتھوں نہ سہی گوروں کے ہاتھوں سہی۔ یہ دور غالبؔ پر بہت سخت گزرا۔ غالبؔ کے خطوط اس زمانے کے عام حالات اور خود ان کی ذہنی کیفیت کی جھلک دکھاتے ہیں۔ انھیں کچھ بد باطن لوگوں کی سب و شتم کا نشانہ بھی بننا پڑا۔ مختصر یہ کہ غالبؔ کو زندگی میں بار بار مرنا پڑا لیکن پھر بھی انھوں نے زندگی سے گریز اور فرار کی راہ اختیار نہیں کی۔ وہ ان تمام حادثات کو بازیچۂ اطفال ہی سمجھتے رہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ غم سے مفر نہیں اور یہ زندگی کا لازمی جز ہے۔ وہ غم پر آنسو بہا کر نئی امنگ اور نئی آرزو پیدا کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ واقعہ چاہے کتنا ہی سخت ہوا انھیں جان عزیز تھی۔ انھوں نے غموں میں مسکرانا سیکھ لیا تھا اور غم کا خرد سے ابدی تعلق معلوم کر لیا تھا۔

غالبؔ کی زندگی کے آخری سال طویل علالت میں گزرے۔ بڑھاپا شباب پر تھا اور بیماریوں نے ان کی حالت قابلِ رحم بنا دی تھی۔ ضعف کا یہ عالم تھا کہ "اٹھ نہیں سکتا اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ بن کر اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔" بیماری کا یہ حال تھا کہ "عوارضِ فسادِ خون میں مبتلا ہوں بدن پھوڑوں کی کثرت سے سروِ چراغاں ہو گیا۔" لیکن اس حالت میں بھی غالبؔ کی زندگی کی حرارت اور آرزو کی خلش کم نہ ہوئی۔ اگر غالبؔ کے اس دور کے خطوط کا موازنہ مشہور مزاح نگار شاعر اکبرؔ الٰہ آبادی کے آخری دور کے خطوط سے کیا جائے تو فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ اکبرؔ زندگی بھر ہنستے ہنساتے رہے مگر آخرِ وقت کی علالت نے رونے پر مجبور کر دیا۔ لیکن غالبؔ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ عزت، اور غمِ علالت سب میں لذت محسوس کرتے ہیں وہ تلخی میں شیرینی تلاش کر لیتے ہیں۔ بدن کے پھوڑوں کو 'سروِ چراغاں' بنا لیتے ہیں اور جب سب بلائیں تمام ہو جاتی ہیں تب بھی مرگِ ناگہانی کی آرزو پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ یاس شکستہ اور مایوس ہونا نہیں جانتے تھے۔

انھوں نے غم کو ایک نئی وسعت اور گہرائی دی اور غم میں مسرت کا عنصر شامل کر کے غم کو نیا مفہوم دیا۔ انھوں نے آپ مئی کو جگ بیتی بنا دیا۔ وہ غم آشنا تھے غم پرست نہیں تھے۔ وہ حسرت پرست تھے اور حسرتِ تعمیر کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ انھوں نے حسرت، آرزو اور ارمان کا ذکر اپنی تخلیقات میں جگہ جگہ کیا ہے۔ وہ آرزوؤں کے رنگ محل بناتے ہیں ان کی شکستگی کا بڑے کرب و اضطراب سے نظارہ کرتے ہیں لیکن سوگوار نہیں ہوتے بلکہ اگر ایک رنگ محل منہدم ہوتا ہے تو دوسرا تعمیر کر لیتے ہیں۔ اگر ارمانوں کا ایک آئینہ خانہ شکستہ ہوتا ہے تو دوسرا بنا لیتے ہیں۔ وہ حال سے بیزار ہیں لیکن خوش آئند مستقبل کے آرزومند، وہ غم کدہ کو حسرتوں کا صنم کدہ بنا لیتے ہیں لیکن افسردگی اور اضمحلال کو خود پر مسلط نہیں ہونے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا دیوان نہ 'درد و غم' کا مجموعہ ہے نہ 'شکستِ آرزو' کا مرثیہ، نہ اس میں عام بیزاری اور چڑچڑاپن ہے نہ 'عمرِ گزشتہ کی میت' ہے، بلکہ ان کی آرزومندی اور ہمتِ عالی کی داستان ہے، حسرت و آرزو کا ایک تر و تازہ اور شگفتہ گلدستہ ہے۔ وہ ایک مجمع مردہ

نہیں بلکہ سلگتی ہوئی آگ ہے۔ اس میں ایک ابدی تازگی ہے۔ اس میں ان کی زندہ دلی اور جاندار اندازِ نظر کے خیالات کی رنگینی اور دل کشی ہے۔ غالبؔ کی یہی آرزومندی اور دلاوری موجودہ نسل کی ذہنی اور جذباتی آہنگ سے بہت قریب ہے۔

غالبؔ قحط سالی اور مفلسی میں بھی عشق کرتے ہیں۔ غالبؔ کا عشق غم سے آشنا ہے لیکن حوصلہ افزا اور کیف پرور بھی ہے۔ ان کے عشق میں لذیت اور جذباتی آسودگی کا جذبہ بھی ہے۔ ان کے عشق میں وہ والہانہ پن، سپردگی اور سوز وگداز نہیں ہے جو غم پرستی کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے عشق میں مذہبی اور اخلاقی اقدار کا سہارا بھی نہیں لیا ہے اور عشق کو غم پرستی کا ذریعہ بھی بنایا ہے۔ ان کا عشق صحت مند عشق ہے جس میں واردات وکیفیات کی رنگارنگی ہے جذبات کی بوقلمونی ہے۔ اس کی بنیاد انسانی اقدار اور آرزومندی پر ہے۔ ان کا عشق بھی ان کی شخصیت کے اس پہلو کا آئینہ دار ہے۔

غالبؔ کی جمالیاتی حس غم سے زنگ خوردہ نہیں ہوتی۔ اُن کے تخیل کی بلند پروازی غم سے مفلوج نہیں ہوتی ان کی قوت ایجاد واختراع غم سے مضمحل نہیں ہوتی ان کے انداز کی شگفتگی اور تازگی غم سے مرجھاتی نہیں۔ ان کی شوخی غم سے قنوطیت میں تبدیل نہیں ہوتی، ان کی شوخی تحریر غم سے نقش فریادی نہیں بنتی۔ مصائب وآلام کی کالی گھٹائیں بھی ان کے انجمن آرائی کے ولولہ کو ختم نہیں کرسکیں ہر ناکامی ان میں عزمِ تازہ کا جذبہ پیدا کرتی ہے غم وآلام ان میں نیا حوصلہ اور نئی امنگ پیدا کرتے ہیں۔ وہ موت کی تلخی میں نشاطِ کار کی ہوس دیکھتے ہیں۔ انھیں گھر کی ویرانی کے آثار میں سامان بہار نظر آتا ہے۔ وہ درد کو ہی درد کا درماں بنا لینے کا حوصلہ رکھتے ہیں اگر اُن کا نالہ زبونیٔ کشش نا رسا نہیں ہوتا تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ وہ لوحِ غم میں بھی نغمۂ شادی سننے کی آرزو کرتے ہیں۔ یہ ہے غالبؔ کی شخصیت کی بلندی اور ان کی آرزومندی۔ اُن کی شخصیت کا یہ پہلو بھی کتنا عظیم ہے ان کے چند اشعار جن میں خون جگر پی کر خوش وخرم رہنے کا سبق دیا گیا اور جس اصول پر وہ عمر بھر کاربند رہے ملاحظہ ہوں۔ یہ اشعار ان کی مثنوی ابر گہر بار سے اخذ کیے گئے ہیں ؎

بہ دانش غم آموزگار من است	خزان عزیزاں بہار من است
غمے کز ازل در سرشت من است	بود ور رخ اما بہشت من است
زمن جوئی دربند کو ریستن	جگر خوردن وتازہ رو زیستن
شگفتن زداغے کہ بر دل بود	نہفتن سرارے کہ در دل بود

یعنی یہ غم اور دکھ ہی ہے جس نے مجھے دانش کا سبق پڑھایا۔ وہی غم جو دوسروں کو اجاڑ دیتا ہے مجھے بہار بخش گیا۔ غم تو ازل سے ہی میری تقدیر میں لکھا تھا۔ کتنا ہی اذیت ناک ہو لیکن میرے لیے جنت کا مرتبہ رکھتا ہے۔ سیکھنا ہو تو مجھ سے سیکھو کہ بُرے حالات میں مرنے کی زندگی کیوں کر گزاری جائے اور اپنا جگر کھا کر کیسے خوش وخرم زندگی بسر کی جائے۔ دل پر جو داغ لگے ہیں ان پر مسکرا دینا اور اندر جو چنگاریاں سمائی ہوئی ہیں انھیں اپنے وجود میں چھپا لینا۔ یہ ہے غالبؔ کی حوصلہ مندی اور آرزومندی۔ وہ دل پر جو داغ لگتا ہے اس پر مسکراتے ہیں۔ خونِ جگر پی کر خوش ہوتے ہیں۔ غموں میں مسکراتے ہیں اور حسرت وآرزو کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

غالبؔ کو انتقال کیے ہوئے سو سال سے زیادہ ہو گئے۔ مگر ان کی روح زندہ ہے ان کی حسرتیں اور آرزوئیں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی۔ وہ مر گئے مگر ان کی تخلیقات زندہ ہیں اور حیات ابدی حاصل کر چکی ہیں۔ اگر غالبؔ نہ ہوتے تو بہت سے شاعر نہ ہوتے۔ اقبالؔ اور جوشؔ بھی نہ ہوتے۔ غالبؔ اپنے معاصرین کو متاثر نہ کر سکے لیکن آنے والی نسلوں کو متاثر کرنے کا سامان چھوڑ گئے۔ ان کا دل غمِ عشق اور غمِ دوراں کی آگ میں تپ کر کندن بن گیا۔

یہ ہے غالبؔ کی عظیم شخصیت کا ایک پہلو!

★

غزل

وسیم بریلوی

کھولیے چل کے غمِ دل کی دکاں اور کہیں ماند پڑجائیں نہ زخموں کے نشاں اور کہیں

بادِ کم ظرف نے گلشن میں ٹھہرنے نہ دیا ڈھونڈتا ہے پڑا خوشبو کو مکاں اور کہیں

ساتھ اس شہر کے صدیوں کی تن آسانی ہے درس تحریک دے اے کارِ جہاں اور کہیں

وادیٔ سنگ میں پھر جشن کی تیاری ہے کیا کوئی بن گیا شیشے کا مکاں اور کہیں

جسم و احساس تو بستے رہیں اس بستی میں اور کہتے ہوئیں کھولوں تو زباں اور کہیں

بند کمرے میں جلاتے رہو لفظوں کے چراغ بات لے جائے نہ معنی کا دھواں اور کہیں

قیس و فرہاد تو ملتے رہے دنیا میں وسیم
پیار کو مل نہ سکا شاہجہاں اور کہیں

الطاف حسین ندوی

اردو میں محاوراتی اسلوب

اُردو میں محاوراتی اسلوب کے تمام ترنمونے افسانوی ادب میں دستیاب ہوتے ہیں۔ قصہ کہانی اور افسانے کے سلسلے میں محاوراتی اسلوب جتنا کامیاب اور کارگر نظر آتا ہے، سادہ اور مرصع اسلوب اتنے کامیاب نظر نہیں آتے۔ محاورات سے جو کہ ہمیں مختلف حقائق و معارف اور معلومات و مسائل کا علم ہوتا ہے اور ان کی دلکشی و خوشگواری ہمارے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے اس لیے فطرتی طور پر ہم اس سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور اس سے ظاہر ہونے والی کیفیات کا اثر جلد قبول کرتے ہیں۔ محاورات کی وجہ سے افسانوی ادب میں جو خاص لطف اور تاثر پیدا ہوتا ہے اس سے قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے اور اس طرح وہ باآسانی ذہنی طور پر فنکار کا شریکِ سفر بن جاتا ہے۔ تفریح، تجسس اور حیرت زائی جو کہانی کے مقاصد میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، محاوراتی اسلوب ان کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔ لطف اور تفریح کا جو سامان محاورہ بندی اور روزمرّہ کے وسیلے سے حاصل ہوتا ہے وہ سادگی اور مرصع کاری کے ذریعہ ممکن نہیں ہوتا۔ سادہ اسلوب سے قصے میں وہ دلکشی اور لطافت نہیں آپاتی جو حاصلِ قصہ بن سکے۔ مرصع نگاری میں بناوٹ اور تصنع کے عناصر کا غلبہ ہوتا ہے اس لیے اس سے کہانی کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ خیال، آرائشِ کلام اور ندرتِ الفاظ کے التزام میں الجھنے لگتا ہے اور کہانی کے ربط و تسلسل میں جھول پڑ جاتا ہے۔ طرزِ بیان کی کشش اور تاثیر سے کہانی کو سبک اور خوشگوار بنانے میں روزمرہ اور محاورہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تھوڑے اور کم الفاظ میں کسی حقیقت یا کیفیت کو جس خوبی اور قوت کے ساتھ محاورے کے ذریعہ بیان کیا جاسکتا ہے وہ سادہ بیان یا مرصع انداز میں ممکن نہیں۔ داستان سنانے اور کہانی کہنے کے لیے کتابی انداز اور بناوٹی زبان سے کام نہیں چلتا کیونکہ اس میں رکھ رکھاؤ اور تصنع ہوتا ہے۔ قصے میں تاثیر اور بے ساختگی پیدا کرنے کے لیے عام فہم گفتگو اور محاورہ بندی بڑی کارگر تکنیک ہے میر امّن نے "باغ و بہار" میں اسی تکنیک سے کام لیا ہے افسانوی ادب میں انھیں اپنے اسلوب کے اعتبار سے سب پر سبقت حاصل ہے۔

محاوراتی اسلوب میں روزمرہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسے نظرانداز کرکے محض محاورہ سے پوری بات نہیں بنتی مولانا حالی کے نزدیک تو اہلِ زبان کے روزمرہ یا بول چال یا اسلوبِ بیان ہی کا نام محاورہ ہے۔ زبان وہی فصیح ہوتی ہے جس میں روزمرہ کا استعمال کیا جائے اس سے کلام دلکش اور پُراثر ہوجاتا ہے اور اگر محاورہ ہو تو اس میں مزید کیفیت، فصاحت اور لطافت پیدا ہوجاتی ہے میر امّن کے اسلوب کی بنیاد روزمرہ پر قائم ہے اور اس میں محاورات کا اضافہ ہے کتاب کا موضوع چونکہ علمی یا ادبی ہونے کے بجائے کہانی کہنا ہے اس لیے عبارت میں بے حد لطف پیدا ہوگیا ہے۔ ایک مثال سے اس کیفیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

"دوست آشنا جو دات کالی روٹی کھاتے تھے اور جیجہ بھر خون اپنا بات بِن زبان سے نثار کرتے تھے کافور ہوگئے۔ بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں ملاقات ہوجاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے۔" (باغ و بہار)

یہاں برمحل محاورات کے ساتھ ساتھ چونکہ گفتگو روزمرہ اور عام بول چال کے مطابق استعمال کی گئی ہے اس لیے یہ زیادہ فصیح ہے اور اس میں لطف بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ پوری عبارت بولتی چالتی اور جیتی جاگتی معلوم ہوتی ہے۔ بے تکلفی، روانی اور سلاست نے اس کی تاثیر میں بے حد اضافہ کر دیا ہے اثر آفرینی کی ایک اور وجہ انسانی جذبات اور ذہنی رجحانات

صحیح عکاسی ہے۔ میرامّن نے دہلی کے مخصوص سماج اور ماحول کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ عام انسانی کیفیات اور احساسات کی ترجمانی کا کام بھی انجام دیا ہے۔ اخلاق و مسرت، ہمدردی و شجاعت، شرافت، مہمان نوازی، مردانگی و مروت جیسے خصائص و خصائل ان کے یہاں محاورات میں ایسا عکس دکھاتے ہیں اور نثر میں ایک شان دل ربائی پیدا کر دیتے ہیں۔ ایک بہن کس طرح اپنے مصیبت زدہ بھائی کی دل جوئی کرتی ہے اور اسے غیرت و حمیت دلا کر روزی کمانے پر اکساتی ہے اسے دلکش پیرائے اور ٹھیٹھ محاوراتی انداز میں ادا کیا گیا ہے جس سے ہر سامع متاثر ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے

"اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں، باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے۔ گھر میں بیٹھے رہنا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔" (باغ و بہار)

میرامّن نے محاورات اور روزمرہ کے استعمال میں ہر جگہ موقع و محل کا لحاظ رکھا ہے اور انھیں اس طرح برتا ہے کہ وہ ان کے اسلوب اور لب و لہجہ کا جزو لاینفک ہو گئے ہیں۔ کسی بھی موقع پر یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان کا استعمال غیر ضروری یا نامناسب ہے۔ ہر محاورہ اپنی جگہ ٹھیک نظر آتا ہے اور کہانی کے ربط و تسلسل اور اس کی دلچسپی میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ واقعات کے بیان، تقریبات کی مرقع کشی، تہذیب و تمدن کے نقش و نگار اور سیر و تفریح کے حالات میں ان کا محاوراتی اسلوب بالکل ظاہر ہے۔ یہ جس قدر عیاں ہے اسی قدر کامیاب ہے۔ واقعات کی تفصیل اور قصہ گوئی کے سلسلے میں جہاں کہیں مکالموں کا موقع آیا ہے وہاں یہ اسلوب اور بھی چمک اٹھا ہے اور اس نے کہانی کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے۔ ذیل کے مکالمہ میں محاورات کی کارفرمائی دیکھیے :

"ہنس کر، بگڑی ہو، تیوری چڑھا کر، خفگی سے بولی، چہ خوش! آپ ہمارے عاشق ہیں؟ مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ اے بے وقوف! اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں بنانی خیال خام ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ بس

چپ رہ۔ یہ کچی بات چیت مت کر۔ اگر کسی اور نے یہ حرکت بے معنی کی ہوتی، پروردگار کی سوں، اس کی بوٹیاں کٹوا، چیلوں کو بانٹتی۔ پر کیا کروں، تیری خدمت یاد آتی ہے۔ اب اسی میں بھلائی ہے کہ اپنی راہ لے۔ تیری قسمت کا دانا پانی ہماری سرکار میں یہیں تلک تھا۔" (باغ و بہار)

کہانی میں دلکشی اور دلچسپی پیدا کرنے میں مکالماتی رنگ اور روزمرہ کے مطابق بات چیت کو بڑا دخل ہے۔ سامعین کو ان ہی کی بول چال میں جب قصہ سنایا جاتا ہے تو وہ اس سے یک گونہ تعلق خاطر محسوس کرتے ہیں اور انھیں اس میں اپنائیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ قصہ کہانی کے لیے محاوراتی اسلوب اختیار کرنا اور واقعات و حکایات کو روزمرہ کے لباس میں بیان کرنا نہایت نازک اور مشکل کام ہے۔ عام فہم زبان اور بولی ٹھولی کو تحریر میں برتتے وقت فنکار کبھی کبھی سوقیت اور سطحیت کی دلدل میں جا پھنستا ہے اور اس طرح اس کے اسلوب و بیان کے مبتذل ہونے کا خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اس خطرے سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ روزمرہ اور بولی ٹھولی کی اس شکل کو اپنایا جائے جو عوام کے علاوہ خواص میں بھی مروج ہو۔ میرامّن نے باغ و بہار میں اسی اصول کی پیروی کی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ سوقیت و ابتذال کا بہت کم شکار ہوئے ہیں۔ باغ و بہار کے دیباچے میں انھوں نے اس اصول کی طرف واضح طور پر اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ قصہ ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں ہے جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں۔"

داستان کا بنیادی مقصد تجسس اور استعجاب ہے۔ میرامّن نے اس مقصد کو شروع سے آخر تک برقرار رکھا ہے۔ اسی مقصد کی خاطر انھوں نے کہیں کہیں سوقیت بھی گوارا کر لی ہے لیکن ایسا کرتا وقت قصہ کی اصلیت اور متعلقہ امور کی حقیقت بیانی کے پیش نظر تھا۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"اس خاطر سے پیچ و تاب کھا کر، میں چُپکی ہو رہی لیکن دل اسی وقت مکدّر ہوا اور بادشاہی مزاج پر چھا گئی۔ جس پر شامت آئی، ایسے پیسے لے کر، کی، کہ ساقی آپ چھنال کو بنایا۔" (باغ و بہار)

یہاں "چھنال" کے بجائے کسی دوسرے لفظ سے بھی مفہوم ادا ہو سکتا تھا لیکن اس سے وہ حقیقی رنگ نہ پیدا ہوتا جو فنکار کے پیش نظر تھا۔ کردار کی حالت اور اس کی سطح کے مطابق اگر کوئی مبتذل لفظ استعمال کیا جائے

تو وہ سوقیت کی تعریف میں داخل نہیں ہوتا بلکہ ضرورت کے اعتبار سے اس میں بلاغت اور خوشگواری کا عنصر شامل ہو جاتا ہے ضرورت اور موقع و محل اس قسم کے الفاظ میں ابتذال کی کیفیت پیدا نہیں ہونے دیتے۔

محاوروں کا استعمال امراؤ جان ادا میں بھی ہوا ہے لیکن اس کا انداز باغ و بہار سے جدا ہے۔ امراؤ جان ادا میں متعدد واقعات کا جال بچھا ہوا ہے اور جو نکہ ہر واقعہ نقطۂ عروج کی طرف بڑھتا ہے اس وجہ سے یہاں محاوراتی اسلوب کی راہیں تنگ پڑ گئی ہیں۔ باغ و بہار کا معاملہ اس سے مختلف ہے یہاں ہر درویش اپنا قصہ رات میں شروع کرتا ہے اس کے پاس وقت کافی ہوتا ہے اس لیے وہ کسی قسم کی جلدی اور گھبراہٹ میں مبتلا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس میں جزئیات نگاری اور تفصیلات حکایت کی زیادہ گنجائش نکل آتی ہے اور محاوراتی اسلوب کو نکھرنے کا زیادہ موقع مل جاتا ہے۔

انسانی زندگی اور اس کی مختلف کیفیات سے محاورات کا گہرا تعلق ہے۔ جس طرح اخلاقی اقدار اور تہذیبی روایات کا وجود معاشرے کے متواتر عمل اور تعامل سے سامنے آتا ہے اسی طرح محاورات بھی ان اقدار اور روایات کے تسلسل اور تعامل کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ہماری تہذیبی و تمدنی زندگی اور ذہنی رجحانات کے رنگا رنگ نقوش کی جھلک پائی جاتی ہے اسی بنا پر ہم ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور گہرا تاثر قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ افسانے اور کہانیاں جن میں ہماری سماجی زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے وہاں محاوراتی اسلوب بے حد کامیاب نظر آتا ہے۔ سماجی کردار نگاری کی انجام دہی کے لیے اس سے زیادہ اثر انگیز اور طاقتور اسلوب کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا مولانا نذیر احمد کے یہاں اس میں طاقت اور زور و اثر پیدا ہونے کا راز یہی ہے کہ انھوں نے اپنے قصوں میں سماجی مسائل، مشکلات اور الجھنوں سے بحث کی ہے اور ان مسائل و مشکلات کو خاص طور پر نسائی کرداروں کے مکالموں، گفتگوؤں اور لہجوں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اس طرح ان کے یہاں بے تکلف محاورات اور اردو کے ٹھیٹھ روزمرہ کا زوردار عنصر خود بخود شامل ہو گیا ہے اور اس میں ایک ٹکسالی شان پیدا ہو گئی ہے۔

مولانا نذیر احمد نے متعدد ناول لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور اخلاقی و مذہبی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان سب میں ان کا اسلوب محاورات کا رہین منت ہے لیکن اس کا سب سے گہرا اور پختہ رنگ صرف ان کے قصوں میں نظر آتا ہے۔ نذیر احمد کے قصے فن ناول کے نقطۂ نظر سے اگرچہ خام ہیں اور مقصد کے اعتبار سے بھی ان میں کوئی نیا پیغام نہیں ملتا لیکن اسلوب اور طرز ادا کے معاملہ میں یہ بے حد دلچسپ اور پرکشش ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر ناولوں میں طبقۂ نسواں کی نمائندگی کی ہے اور ان کے تاثرات، ان کی زبان اور ان کے لب و لہجہ میں کہانی کے تانے بانے بُنے ہیں قصہ گوئی میں وہ بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ اپنی طول کلامی اور لمبے لمبے مکالمات میں وہ دلی کی ٹکسالی زبان اور بیگماتی محاورات کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔ ان محاورات کے ذریعہ انھوں نے اظہار و ابلاغ کے بڑے بڑے فائدے اٹھائے ہیں ان کے لباس میں انھوں نے عورتوں کی سماجی زندگی کی سچی تصویر کشی کی ہے اور ان کے خانگی حالات کے حقیقی مرقعے کھینچے ہیں۔ اجتماعی مناظر، ظرافت کے انداز، لڑائی جھگڑوں کے طور طریقے، وعظ کے ڈھنگ، قہر و عتاب کے تیور اور ڈانٹ ڈپٹ کے طریقے غرض زندگی کے ہر موڑ کی ترجمانی کی ہے ان کا کمال یہ ہے کہ بیان میں ہر جگہ شوخی، جوش اور دلکشی برقرار رہتی ہے۔ وہ عورتوں کے مکالموں کے بادشاہ ہیں اور ان کے الفاظ و محاورات پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے۔ اصغری نے اپنے میاں سے جو گفتگو کی ہے، اس سے اس کا ہلکا سا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"سو بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ نوکری تقدیر سے ملتی ہے۔ بڑے لائق منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اگر خدا کو منظور ہوتا ہے تو بے وسیلہ بلا تلاش چھپر پھاڑ کر دیتا ہے گھر سے بلا کر دیتا ہے۔ تقدیر سے زیادہ کوئی نہیں سکتا۔" (توبۃ النصوح)

نذیر احمد کے قصوں میں زور بیان اور سلاست و روانی کے ساتھ ساتھ نظم و ترتیب کا شعور بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ جب کسی واقعہ، حالت یا کیفیت کی مصوری کرتے ہیں تو اس میں منزل بہ منزل اور درجہ بدرجہ رنگ بھرتے ہیں اور اس کی تکمیل مختلف مدارج کے ارتقاء کے ذریعے کرتے ہیں نعیمہ جو ماں باپ کی لاڈلی، چنچل اور کج بحث بیٹی ہے ماں اسے ایک دن کسی بات پر طمانچہ مار بیٹھتی ہے۔ اس حادثہ کے بعد درجہ بدرجہ اس کی جو کیفیت

صحیح عکاسی ہے۔ میر امّن نے دہلی کے مخصوص سماج اور ماحول کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ عام انسانی کیفیات اور احساسات کی ترجمانی کا کام بھی انجام دیا ہے۔ اخلاق و سیرت، ہمدردی و شجاعت، شرافت، دیانت اور مردانگی و مروت جیسے خصائص و خصائل ان کے یہاں محاورات میں اپنا عکس دکھاتے ہیں اور نثر میں ایک شانِ دل ربائی پیدا کر دیتے ہیں۔ ایک بہن کس طرح اپنے مصیبت زدہ بھائی کی دل جوئی کرتی ہے اور اسے غیرت و حمیت دلا کر روزی کمانے پر اکساتی ہے، اسے دلکش پیرائے اور ٹھیٹھ محاوراتی انداز میں ادا کیا گیا ہے جس سے ہر سامع متاثر ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے

"اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے۔ گھر میں بیٹھے رہنا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔" (باغ و بہار)

میر امّن نے محاورات اور روزمرہ کے استعمال میں ہر جگہ موقع و محل کا لحاظ رکھا ہے اور انھیں اس طرح برتا ہے کہ وہ ان کے اسلوب اور لب و لہجہ کا جزو لاینفک ہو گئے ہیں۔ کسی بھی موقع پر یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان کا استعمال غیر ضروری یا نامناسب ہے۔ ہر محاورہ اپنی جگہ جڑا ہوا نظر آتا ہے اور کہانی کے ربط و تسلسل اور اس کی دلچسپی میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ واقعات کے بیان، تقریبات کی مرقع کشی، تہذیب و تمدن کے نقش و نگار اور سیر و تفریح کے حالات میں ان کا محاوراتی اسلوب بالکل ظاہر ہے۔ یہ حسن جو یہاں ہے اسی قدر کامیاب ہے واقعات کی تفصیل اور قصہ گوئی کے سلسلے میں جہاں کہیں مکالموں کا موقع آیا ہے وہاں یہ اسلوب اور بھی چمک اٹھا ہے اور اس نے کہانی کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے۔ ذیل کے مکالمہ میں محاورات کی کارفرمائی دیکھیے:

"یہ سن کر بگڑی ہو، تیوری چڑھا کر، خفگی سے بولی، اچھے چوچلے! آپ ہمارے عاشق ہیں؟ مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ لے بے دیوانے، اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں بنانا، خیال خام ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات، بس

چپ رہ۔ یہ کمی بات جیت مت کر۔ اگر کسی اور نے یہ حرکت بے معنی کی ہوتی پروردگار کی سوں، اس کی دو شاخیں کٹوا، چیلوں کو بانٹتی۔ پر کیا کروں تیری خدمت یاد آتی ہے۔ اب اسی میں بھلائی ہے کہ اپنی راہ لے۔ تیری قسمت کا دانا پانی ہماری سرکار میں یہیں تلک تھا۔" (باغ و بہار)

کہانی میں دلکشی اور دلچسپی پیدا کرنے میں مکالماتی رنگ اور روزمرہ کے مطابق بات چیت کو بڑا دخل ہے۔ سامعین کو ان ہی کی بول چال میں جب قصہ سنایا جاتا ہے تو وہ اس سے یک گونہ تعلق خاطر محسوس کرتے ہیں اور انھیں اس میں اپنائیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ قصہ کہانی کے لیے محاوراتی اسلوب اختیار کرنا اور واقعات و حکایات کو روزمرہ کے لباس میں بیان کرنا نہایت نازک اور مشکل کام ہے۔ عام فہم زبان اور بولی ٹھولی کو تحریر میں برتتے وقت فنکار کبھی کبھی سوقیت اور سطحیت کی دلدل میں جا پھنستا ہے اور اس طرح اس کے اسلوب و زبان کے مبتذل ہونے کا خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اس خطرے سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ روزمرہ اور بولی ٹھولی کی اس شکل کو اپنایا جائے جو عوام کے علاوہ خواص میں بھی مروج ہو۔ میر امّن نے باغ و بہار میں اسی اصول کی پیروی کی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ سوقیت و ابتذال کا بہت کم شکار ہوئے ہیں۔ باغ و بہار کے دیباچے میں انھوں نے اس اصول کی طرف واضح طور پر اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ قصہ ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں ہے جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں۔"

داستان کا بنیادی مقصد تجسس اور استعجاب ہے۔ میر امّن نے اس مقصد کو شروع سے آخر تک برقرار رکھا ہے۔ اسی مقصد کی خاطر انھوں نے کہیں کہیں سوقیت بھی گوارا کر لی ہے لیکن ایسا کرنا قصہ کی اصلیت اور متعلقہ امور کی حقیقت بیانی کے لیے ناگزیر تھا۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اسی خاطر پیچ و تاب کھا کر میں چپکی ہو رہی لیکن دل اسی وقت کا ندر ہوا اور اس کی مزاج پر چھا گئی۔ بس بہ ظاہر میں ایسے بیسوے کی بکساتی اسی چھنال کو بنایا۔" (باغ و بہار)

یہاں "چھنال" کے بجائے کسی دوسرے لفظ سے بھی مفہوم ادا ہو سکتا تھا لیکن اس سے وہ حقیقی رنگ نہ پیدا ہوتا جو فنکار کے پیشِ نظر تھا۔ کردار کی حالت اور اس کی سطح کے مطابق اگر کوئی متبدل لفظ استعمال کیا جائے

تو وہ سوقیت کی تعریف میں داخل نہیں ہوتا بلکہ ضرورت کے اعتبار سے اس میں بلاغت اور خوشگواری کا عنصر شامل ہو جاتا ہے ضرورت اور موقع و محل اس قسم کے الفاظ میں ابتذال کی کیفیت پیدا نہیں ہونے دیتے۔

محاوروں کا استعمال آرائش محفل میں بھی ہوا ہے لیکن اس کا انداز باغ و بہار سے جدا ہے۔ آرائش محفل میں متعدد واقعات کا جال بچھا ہوا ہے اور چونکہ ہر واقعہ نقطۂ عروج کی طرف بڑھتا ہے اس وجہ سے یہاں محاوراتی اسلوب کی راہیں تنگ پڑ گئی ہیں۔ باغ و بہار کا معاملہ اس سے مختلف ہے یہاں ہر درویش اپنا قصہ رات میں شروع کرتا ہے اس کے پاس وقت کافی ہوتا ہے اس لیے وہ کسی قسم کی جلدی اور گھبراہٹ میں مبتلا نہیں ہوتا۔ لہذا اس میں جزئیات نگاری اور تفصیلات حکایت کی زیادہ گنجائش نکل آتی ہے اور محاوراتی اسلوب کو نکھرنے کا زیادہ موقع مل جاتا ہے۔

انسانی زندگی اور اس کی مختلف کیفیات سے محاورات کا گہرا تعلق ہے۔ جس طرح اخلاقی اقدار اور تہذیبی روایات کا وجود معاشرے کے متواتر عمل اور تعامل سے سامنے آتا ہے اسی طرح محاورات بھی ان اقدار اور روایات کے تسلسل اور تعامل کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ہماری تہذیبی و تمدنی زندگی اور ذہنی رجحانات کے رنگا رنگ نقوش کی جھلک پائی جاتی ہے اسی بنا پر ہم ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ افسانے اور کہانیاں جن میں ہماری سماجی زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے وہاں محاوراتی اسلوب بے حد کامیاب نظر آتا ہے۔ سماجی کردار نگاری کی انجام دہی کے لیے اس سے زیادہ اثر انگیز اور طاقتور اسلوب کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ مولانا نذیر احمد کے یہاں اس میں طاقت اور زور و اثر پیدا ہونے کا راز یہی ہے کہ انھوں نے اپنے قصوں میں سماجی مسائل، مشکلات اور الجھنوں سے بحث کی ہے اور ان مسائل و مشکلات کو خاص طور پر نسائی کرداروں کے مکالموں، گفتگوؤں اور لہجوں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اس طرح ان کے یہاں بے تکلف محاورات اور اردو کے ٹھیٹھ روزمرہ کا زوردار عنصر خود بخود شامل ہو گیا ہے اور اس میں ایک ٹکسالی شان پیدا ہو گئی ہے۔

مولانا نذیر احمد نے متعدد ناول لکھے ہیں ان کے علاوہ انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور اخلاقی و مذہبی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان سب میں ان کا اسلوب محاورات کا رہین منت ہے لیکن اس کا سب سے گہرا اور پختہ رنگ صرف ان کے قصوں میں نظر آتا ہے۔ نذیر احمد کے قصے فن ناول کے نقطۂ نظر سے اگرچہ خام ہیں اور مقصد کے اعتبار سے بھی ان میں کوئی نیا پیغام نہیں ملتا لیکن اسلوب اور طرز ادا کے معاملہ میں یہ بے حد دلچسپ اور پرکشش ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر ناولوں میں طبقۂ نسواں کی نمائندگی کی ہے اور ان کے محاورات، ان کی زبان اور ان کے لب و لہجہ میں کہانی کے تانے بانے بُنے ہیں۔ قصہ گوئی میں وہ بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ اپنی طول کلامی اور لمبے لمبے مکالمات میں وہ دہلی کی ٹکسالی زبان اور نسائی محاورات کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔ ان محاورات کے ذریعہ انھوں نے اظہار و ابلاغ کے بڑے بڑے فائدے اٹھائے ہیں ان کے لباس میں انھوں نے عورتوں کی سماجی زندگی کی سچی تصویر کشی کی ہے اور ان کے خانگی حالات کے حقیقی مرقعے کھینچے ہیں۔ اجتماعی مناظر، طعن و تشنیع کے انداز، لڑائی جھگڑوں کے طور طریقے، وعظ کے ڈھنگ، قہر و عتاب کے تیور اور ڈانٹ ڈپٹ کے طریقے غرض زندگی کے ہر موڑ کی ترجمانی کی ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ یہاں ہر جگہ شوخی، جوش اور دلکشی برقرار رہتی ہے۔ وہ عورتوں کے مکالموں کے بادشاہ ہیں اور ان کے الفاظ و محاورات پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے۔ اصغری نے اپنے میاں سے جو گفتگو کی ہے اس سے اس کا ہلکا سا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"سو بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ نوکری تقدیر سے ملتی ہے۔ بڑے لائق منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اگر خدا کو منظور ہوتا ہے تو نہ وسیلہ نہ لیاقت چھپر پھاڑ کر دیتا ہے گھر سے بلا کر دیتا ہے۔ تقدیر سے بڑھ کر نہیں سکتا۔" (توبۃ النصوح)

نذیر احمد کے قصوں میں زور بیان اور سلاست و روانی کے ساتھ ساتھ نظم و ترتیب کا شعور بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ جب کسی واقعہ، حالت یا کیفیت کی مصوری کرتے ہیں تو اس میں منزل بہ منزل اور درجہ بدرجہ رنگ بھرتے ہیں اور اس کی تکمیل مختلف مدارج کے ارتقا کے ذریعے کرتے ہیں نعیمہ جو ماں باپ کی لاڈلی، چنچل اور کج بحث بیٹی ہے ماں اسے ایک دن کسی بات پر طمانچہ مار بیٹھتی ہے۔ اس حادثہ کے بعد درجہ بدرجہ اس کی جو کیفیت

ہوتی ہے اور وہ جس قہر و غضب کا اظہار کرتی ہے، ذیل کے اقتباس میں اس کی بھرپور ترجمانی ملاحظہ کیجیے :

" فہیمہ نے ایک آفت توڑ ماری۔ سب سے پہلے تو اس نے دے دُھواں دھوں، دے دُھواں دھوں اپنے معصوم بچے کو پیٹ ڈالا اگر لوگ اس کی گود سے بچے کو نہ چھین لیں تو وہ لڑکے کا خون ہی کرچکی تھی۔ اس کے بعد تو اس نے عجیب عجیب میل مچایے۔ گھٹنوں تو پیٹھاں کھایا کی، کپڑوں کا ایک تار باقی نہ رکھا۔ یہ معلوم اس کا سر تھا یا لوہے کا گولا تھا کہ ہزاروں دوہتڑیں پڑیں۔ آدھے سے زیادہ بال کھسوٹ ڈالے۔ سیکڑوں ٹکریں دیواروں سے ماریں۔ رات کو صالحہ کے بڑے اصرار پر نام چار کو کھانا کھایا اور صبح سویرے ہی اپنے بچے کو لے کر خالہ کے گھر چلی گئی۔"

عورتوں کے احوال ان کے کوائف اور ان کی گفتگو کے بیان میں مولانا نذیر احمد نے نسوانی انداز تکلم، طرز گفتگو، الفاظ و محاورات اور روزمرہ پر کامل دسترس کا ثبوت دیا ہے اور ان کا استعمال بڑی چابکدستی سے کیا ہے لیکن مردوں کی گفتگو قلم بند کرتے وقت یا خود اپنی زبان لکھتے وقت انھوں نے عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ کے ذریعہ محاورات کی روانی اور بے ساختگی کو مجروح کر ڈالا ہے۔ جہاں جہاں انھوں نے ایسا کیا ہے ان کا اسلوب ناہمواری کا شکار ہوگیا ہے وہ یقیناً ایک صاحب طرز انشاپرداز ہیں اور ان کی نثر میں شوخی ہے لیکن عربی اور فارسی کے الفاظ کی ثقالت نے ان کی تحریروں کو دوغلہ بنا دیا ہے اور وہ بقول مہدی افادی "گنگا جمنی" ہوگئی ہیں۔ توبۃ النصوح کی ایک مثال بطور نمونہ درج کی جاتی ہے :

" نصوح یوں ہی دل کا کچا تھا۔ ہیضہ کی گرم بازاری سُنی تو دل سرد اور چہرہ زرد ہوگیا۔ یہ اسباب ظاہری جو تدبیریں انسداد کی تھیں سب کیں۔"

اس عبارت میں محاورات کا برمحل اور رواں دواں استعمال مسلّم ہے مگر عربی الفاظ اور محاورات کی آنکھ مچولی نے اسلوب میں جو کھردرا پن پیدا کر دیا ہے وہ بھی ناقابل انکار ہے۔ اسی طرح نصوح کا یہ قول بھی ناہمواری کی نذر ہوگیا ہے :

" افسوس کتنی دولتِ خداداد اس بے ہودہ نمائش اور تکلف اور آرائش میں ضائع کی گئی ہے۔ کیا اچھا ہوتا یہ روپیہ محتاجوں کی امداد اور غریبوں کی کاربراری میں صرف ہوتا۔"

عبارت میں زور اور بہاؤ بے شک ہے لیکن وہ روانی نہیں ہے جو عورتوں کے مکالمات میں پائی جاتی ہے۔

نذیر احمد کے قصے سوقیانہ پن اور ابتذال سے پاک ہیں۔ ان کا انداز بیان اور لب و لہجہ صاف ستھرا ہے۔ ان قصوں کا مقصد چونکہ اخلاقی اور اصلاحی ہے اس لیے ان میں سطحیت اور گراوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حفظ مراتب کے لحاظ میں کہیں کہیں ان سے بے احتیاطی بھی ہوئی ہے اور بعض کرداروں کی زبان میں وہ ایسے محاورے برت گئے ہیں جو ادب کے منافی ہیں۔ مثال کے طور پر حضور اکرمؐ کی ہجرت کے بارے میں لکھا ہے کہ پیغمبر صاحب چپکے سے اندھیرے میں مکہ سے "سٹک گئے"۔ سٹک جانے کا محاورہ بذات خود کوئی معیوب نہیں ہے، لیکن اس میں ابتذال اس وجہ سے آگیا کہ اس کا استعمال پیغمبرؐ کی شان کے بالکل منافی ہے۔

حقیقت گوئی میں مولانا نذیر احمد کی صحیح جانشینی کے حق دار صرف راشد الخیری ہیں مولانا نذیر احمد رشتے میں راشد الخیری کے حقیقی پھوپھا تھے۔ پھوپھا کی طرح بھتیجے کے پیش نظر بھی اصلاح نسواں کا کام تھا۔ ان کی عمر اسی طبقہ کی خدمت میں صرف ہوئی۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں عورتوں کی تعلیم و ترقی پر خصوصی دھیان دیا اور ان کے مصائب و مسائل کو اہم موضوع کی حیثیت سے اختیار کیا۔ ان کے اس قسم کے ناولوں میں نوحۂ زندگی، صبح زندگی، شام زندگی، حبت الوقت اور وداع خاتون خاص طور پر مشہور ہیں۔ وہ ایک اچھے ادیب اور کامیاب انشاپرداز تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حقائق و واقعات کی مرقع کشی اور نسوانی فطرت کی عکاسی میں وہ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ انھوں نے روزمرہ اور محاورات کی زبان میں مختلف حالات اور خیالات کا اظہار بڑے دلنشیں پیرائے میں کیا ہے۔ انسانی کیفیات کی دردانگیزی اور باطنی جذبات کی اثرآفرینی میں انھیں منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ بجا طور پر مصوّرِ غم کہے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کے بیانات کی دردانگیزی، دلکشی اور تاثیر میں ان کے محاوراتی اسلوب کا زبردست ہاتھ ہے۔ حد سے زیادہ جزئیات نگاری اور مفصل بیانی میں بھی

محاورات کے جادو سے وہ ایسی شیرینی، سلاست اور لطافت پیدا کر دیتے ہیں کہ اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی بلکہ موضوع کے ساتھ قاری کا ذوق و شوق برابر بڑھتا رہتا ہے۔ ذیل کی عبارت میں ان کے بیان کا زور، روانی اور اسلوب کی سحر طرازی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے:

"مینھ کا یہ حال کہ دو گھنٹے جم کر پڑا۔ ذرا ہلکا ہوا۔ ابھی تھما نہ تھا کہ پھر اندھیری دے آیا اور دھائیں دھائیں پڑنے لگا۔ مینھ سے زیادہ ہوا تھی کہ کسی طرح کم ہی نہ ہوتی تھی۔ وہ جھکڑ چلتے کہ الاماں والحفیظ۔ ساتویں روز آدھی رات کے وقت اس زور کا پانی پڑا کہ دیکھا نہ سنا۔ مکان بول اٹھے اور خلقت چیخ اٹھی۔ ہر طرف سے دھواں دھڑ کی آواز آتی تھی۔ مکانوں کا ستھراؤ ہو گیا۔ کچی اور پکی محل سرا اور حویلی، سب کا اللہ بیلی۔ ٹپکا تو کبھی کا لگ چکا تھا مگر اس سے صرف بے آرامی تھی، بااب جان کے لالے پڑ گئے۔ جس کے جہاں سینگ سمائے گھس گیا کہ کسی طرح جان تو بچے۔" (ست الوقت)

طرز تحریر کا یہ زور، یہ رنگ اور یہ کیفیت مناظر کشی، مرقع کشی اور حلیہ نگاری، غرض ہر جگہ قائم و دائم ہے۔ اس سے قصہ کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور قاری کو اس میں جمالیاتی حظ محسوس ہوتا ہے۔ ست الوقت میں ایک مغل کا حلیہ ملاحظہ ہو:

"سے تو بڈھے بھی ھونس، مگر مردانگی کس بل موجود تھا۔ ڈاڑھی چڑھی ہوئی، مونچھیں مڑی ہوئی خضاب لگا ہوا، کمر پٹکا بندھا ہوا۔"

راشد الخیری کے قصوں کا اصل مقصد چونکہ صنف نازک کی اصلاح اور ان کی فلاح تھا، اس لیے وہ قدرتی طور پر ان کے فطری جذبات اور نفسی کیفیات کی ترجمانی میں زیادہ کامیاب ہیں۔ انھوں نے جہاں جہاں اس مقصد کے سلسلہ میں قلم اٹھایا ہے وہاں تحریر کے جوش، اس کی دل آویزی اور روانی میں بے انتہا شدت آگئی ہے۔ نازک جذبات کی عکاسی اور نسائی کردار نگاری میں محاوراتی اسلوب کی سحر کاری کا نمونہ ذیل کے اقتباس میں دیکھیے:

"تم کو یاد نہ ہو، خیال نہ ہو، مگر میرے دل پر ابھی وہ الفاظ نقش ہیں اور صرف موت ہی ان کو بھلا سکتی ہے۔ تم نے یہ ہاتھ، جو ہمیشہ بلند رہے، چشم زدن میں زیر کر دیے، اور یہ آنکھیں جو ہمیشہ شیر رہیں آناً فاناً دوسرے کا منہ تکنے والی بنا دیں۔ جن کا منہ خوشامد کرتے کرتے خشک ہوتا تھا، انھوں نے بات کرنی بھی چھوڑ دی۔ جس سیج پر عورت مکھی تک بیٹھنی روا نہیں رکھتی تھی اس پر سوکن آگئی، مگر تیوری پر بل نہ آیا۔ میں نے ہائے کی اور تم نے نئی دلہن کے ساتھ قہقہے لگائے۔" (نوحۂ زندگی)

راشد الخیری ایک اچھے قصہ گو ہیں۔ وہ قصہ میں حیرت، دلچسپی اور تجسس کے عناصر سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ اس کے لیے وہ بچھے دار باتیں کرتے ہیں، ظرافت کا سہارا لیتے ہیں، کبھی زندہ دلی کو وسیلہ بناتے ہیں اور موقع پڑنے پر طنز و مزاح سے بھی نہیں چوکتے۔ ان کے یہاں یہ تمام چیزیں محاورات کے پیکر میں ظاہر ہوئی ہیں اور قارئین کے لیے لطف و مسرت کا باعث بنی ہیں۔ ایک مثال بطور شہادت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

"جہاں آرا کی ہڈیاں گل کر خاک ہو چکیں مگر ماتا کی ماری ماں کے ... مائیں دو معصوم ترین جرأت نسوانی کی عدیم المثال ہستی ... قبرستان میں بھولے بھٹکے انسان کی نظر جب ان تین قبروں پر پڑتی تو سہمے سہمے مزاروں کی لے کسی اور لے بسی اس کا دل کھینچ لیتی ہے۔ یہاں گلاب کے پھول ہیں، نہ سبزہ، نہ آبِ رواں، دریا کا کنارہ ہے نہ ستھری چہل پہل ایک ہُو کا میدان اور ویرانی کا سناٹا ہے۔" (نوحۂ زندگی)

طنز و مزاح اور ظرافت و زندہ دلی میں ان کا دامن ابتذال سے ملوث نہیں ہوتا۔ اس کی اصل وجہ ان کے موضوع کی سنجیدگی اور نزاکت ہے۔ سنجیدگی اور نزاکت نے انھیں کھل کھیلنے کا موقع نہیں دیا ہے۔ ویسے ان کے ہاں عورتوں کی زبان سے کہیں کہیں طعنے اور کوسنے ضرور سننے میں آئے ہیں۔ یہ خصوصیت عصمت چغتائی کے ہاں بھی پائی جاتی ہے۔

عصمت چغتائی کا موضوع اگرچہ طبقۂ اناث ہے لیکن ان کے پیش نظر اصلاح اور مظلومیت کے بجائے اس گروہ کی آزادی اور بغاوت کا جذبہ ہے۔ وہ افسانہ کے میدان میں ایک آزاد اور باغی ذہن کے ساتھ داخل ہوئی ہیں۔ اسی لیے ان کی نثر میں جذباتیت ہے اور اس میں ایک بے جھجک انداز پایا جاتا ہے۔ باغیانہ نقطۂ نظر کی بنا پر وہ بہت سی باتوں کو شدت کے ساتھ محسوس کرتی ہیں اور ان کا اظہار بھی اسی قوت اور صاف گوئی سے کرتی ہیں۔ مافی الضمیر کے اظہار میں شدت کا لازمی

نتیجہ یہ ہوا ہے کہ فقروں میں چستی، باتوں میں طنز اور لہجہ میں کچھ بے دردی پیدا ہوگئی ہے۔ مجموعی طور پر ان کا اسلوب محاوراتی ہے اور اس میں طنز کی آمیزش ہے طرز ادا میں روزمرہ کا استعمال اور تشبیہ و استعارہ کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شوخی اور انفرادیت ملتی ہے۔ "چوتھی کا جوڑا" نامی افسانہ میں کوئی بچہ ماں کے دودھ سے شکم سیر نہ ہونے کی بنا پر روتا ہے تو عصمت اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتی ہیں کہ بچہ رسد کی کمی کی دہائی دیتا تھا۔ اس قسم کے جملے ان کی اپنی انفرادی ادا ہے۔

عصمت نے مسلمانوں کے اوسط گھرانے کی نوجوان اور شباب کی منزلوں میں قدم رکھنے والی لڑکیوں کی زندگی کی ترجمانی کی ہے۔ ان کا دائرہ اگرچہ محدود ہے لیکن اس محدودیت نے انھیں مسائل کی تہہ اور نفسیات کی گہرائی سے پوری طرح واقف کرادیا ہے۔ وہ جب اس عمر کی لڑکیوں کی مادی اور ذہنی زندگی کی تصویر بناتی ہیں تو ان کا مشاہدہ کبھی خطا نہیں کرتا۔ نوجوان لڑکیوں کے ماحول اور ان کے مسائل کی عکاسی کرتے وقت ان کے اسلوب میں شوخی، رعنائی اور چستی کے ساتھ ساتھ بلا کا طنز آجاتا ہے۔ "ایک شوہر کی خاطر" کا حال دیکھیے:

"ایک دم سے ریل جو رکی تو ایک دم سے جیسے پٹریاں ٹوٹ پڑیں۔ انساں تو کم آئے، بچے اور پُٹلیاں زیادہ۔ بچے ایسے جو قحط زدہ سے آرہے تھے کہ آتے ہی خوراک پر پل پڑے دودھ پینے والوں کو تو خیر تیار معاملہ مل گیا اور وہ جُٹ گئے۔ باقی تلملانے اور تڑپنے لگے۔"

عصمت کے اسلوب کی ایک اور خصوصیت شگفتگی اور بیباکی ہے وہ روزانہ کی معمولی بول چال کے الفاظ میں ایسی ندرت اور وسعت پیدا کردیتی ہیں جس سے ایک نئی اور معنی خیز تصویر سامنے آتی ہے "اُف یہ بچے"! میں وہ لکھتی ہیں:

"دس بچوں کی ماں ہونے کی یہی سزا ہے گھر کیا ہے محلّہ کا محلّہ ہے۔ مرض پھیلے، وبا آئے، دنیا کے بچے پٹا پٹ مریں مگر کیا مجال جو یہاں ایک بھی ٹس سے مس ہو جائے۔ ہر سال ماشاء اللہ گھر ہسپتال بن جاتا ہے پیچلیوں کی بہن ماں وادا یکٹ رہا ہے، سروں کو نیند آرہی ہے پھوڑے پھنسی کے زمانے میں مرہم کا خرچ دال روٹی سے زیادہ۔ جس کونے میں دیکھو پڑے بہاے اور مرہم کی ڈبیاں چپ چپا رہی ہیں۔"

عصمت کے مکالمے ان کے طرز کا سب سے بہتر اور قومی نمونہ ہیں۔ ان میں عصمت کے برمحل فقرے، تیکھا طنز، شوخ انداز اور لطیفے عجیب شانِ رعنائی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ وہ افسانوں میں رنگینی اور تفریح کی ملی جلی فضا پیدا کردیتی ہیں اور عبارت کو نہایت پُرلطف اور دل نشین بنادیتی ہیں۔ ایک چھوٹی سی مثال پیش کرنا کافی ہوگا

"آگ لگے اس موئے حقہ کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے حوال بیٹی کی طرف دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر۔" (چوتھی کا جوڑا)

عصمت کے افسانوں میں محاوروں کا بے تکا استعمال نہیں ملتا وہ غیر ضروری تفصیل اور بے موقع کلام سے اجتناب کرتی ہیں۔ ان کے اسلوب میں ہمدردی، روانی اور چستی پائی جاتی ہے۔ محاوروں کا استعمال انھوں نے افسانویت کی تکمیل کے لیے کیا ہے اور ان کے ذریعہ ان میں دل کشی، لطافت اور تاثیر داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔

افسانوی ادب کے سلسلہ میں محاوراتی اسلوب شروع سے کامیاب اور کارگر رہا ہے۔ محاوروں میں چونکہ دل کشی، دل نشینی اور خوش گواری ہوتی ہے اور قارئین کے کان ان سے آشنا ہوتے ہیں اس لیے وہ اس اسلوب میں اپنا پن محسوس کرتے ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں۔ اردو کے بہت سے ادیبوں نے اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق اسے داستانوں، ناولوں اور کہانیوں میں برتا ہے لیکن میر امن، مولوی نذیر احمد، مولوی راشد الخیری اور عصمت چغتائی اس اسلوب کے خاص ارکانِ اربعہ ہیں — ان فنکاروں نے اپنے اپنے قصّوں اور افسانوں میں خصوصی طور پر اسی کو اپنایا ہے۔ موجودہ عہد میں اس اسلوب کا چلن عام نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب سے ہمارے افسانوں اور ناولوں میں علاقائی مسائل اور تہذیبی اقدار کا بیان شروع ہوا ہے، اسی وقت سے ان کی حقیقت اور اصلیت کا اظہار علاقائی محاورات اور روزمرہ میں ہونے لگا۔ یہ بالکل فطری اور ناگزیر تھا۔ علاقائی الجھنوں اور پریشانیوں کا بیان علاقائی محاورات ہی میں بہتر طور پر ہوسکتا ہے۔ اس طرح محاوراتی اسلوب مختلف علاقائی محاورات میں تقسیم ہوگیا۔ اور اس کی وحدت

ٹوٹ گئی۔ اب ادباء اور اہل قلم اپنے علاقوں کے مختلف مسائل اور معاملات پیش کرنے کے لیے اودھی، دکنی، پنجابی اور بہاری محاوروں کا سہارا لیتے ہیں۔ محاوراتی اسلوب کو دراصل افسانوی ضروریات کے پیش نظر اختیار کیا گیا تھا اور اب اسی ضرورت نے اس کی مرکزیت کو علاقائیت میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کی تاریخی اور ادبی حیثیت بہرحال اب بھی مسلم ہے۔ یہ اب بھی اپنے اندر افادیت رکھتا ہے۔

افسانوں اور کہانیوں میں محاوراتی اسلوب کی افادیت اور اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ آج یہ اپنی افادیت ہی کی وجہ سے زندہ ہے لیکن اس کا ایک عیب یہ ہے کہ اس کی عمر محدود ہوتی ہے۔ تقریباً ہر سو سال کے بعد روزمرہ اور محاورہ میں تبدیلی آ جاتی ہے یا اس کا رواج متروک ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کے محاورات اور روزمرہ کی افادیت اور لطافت موجودہ دور کے قارئین کے لئے کارگر ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ اب یہ متروک ہو چکے ہیں:

۱۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر بیٹھتا ہے
۲۔ اس کے منہ پر روہٹ آئی۔
۳۔ جب یہ چرچا ہوا بھیڑ چھٹ گئی، لوگ ادھر ادھر ہو گئے

(باغ و بہار)

اس اسلوب کا دوسرا نقص یہ ہے کہ ہر محاورہ اور روزمرہ کا مفہوم متعین ہوتا ہے۔ اس متعین اور مخصوص مفہوم کے اندر کوئی دوسرے معنی پیدا کرنا محال ہے، اس لیے فنکار کے خیالات محاورات کے مانند ہو جاتے ہیں اور اسے مخصوص معاملات و مسائل ہی کے اظہار پر قانع ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس میں "چوتھی کا جوڑا" جیسی کہانی جتنی آسانی اور عمدگی سے لکھی جا سکتی ہے، "کفن" جیسی کہانی نہیں لکھی جا سکتی۔

★

غزل

آزاد گورداسپوری

اے جنوں اس کی کوشش برابر رہے عمر بھر دولتِ سرمدی کم نہ ہو
آگ الفت کی دل میں بھڑکتی رہے، داغ جلتے رہیں روشنی کم نہ ہو

حسن کی پہلی نظر تیر برسا گئی وہ شگفتہ رہیں تازگی کم نہ ہو
میرے غم میں اضافہ ہوا ہے تو ہو ان کے ہونٹوں کی لیکن ہنسی کم نہ ہو

ان کے آنے سے تسکینِ خاطر نہیں ان سے جلووں کا کیونکر تقاضا کروں
شربتِ دید پینے سے کیا فائدہ جبکہ پینے سے بھی تشنگی کم نہ ہو

عشقِ صادق کی معراج کہیے اسے پائمالِ ستم کی تمنا ہے یہ
میرے حصے میں آ جائیں دنیا کے غم لیکن اس بے وفا کی خوشی کم نہ ہو

مینگ بڑھتی رہے چھیڑ ہوتی رہے سلسلہ دل نوازی کا قائم رہے
بے مروت مگر دھیان اس کا رہے دل لگا ہے تو دل لگی کم نہ ہو

جذبۂ شوق کو آزماتا رہے ٹھوکریں در بدر کی یہ کھاتا رہے
حسنِ خوددار کی آرزو ہے یہی عشقِ رسوا کی آوارگی کم نہ ہو

رنگ عہدِ وفا کا نکھرتا رہے داستانِ محبت سنورتی رہے
آستانے پہ ہم سجدہ کرتے رہیں عمر بھر حسرتِ بندگی کم نہ ہو

گلفشانی کا انداز قائم رہے محفلِ شعر کا حسن بڑھتا رہے
فکرِ آزاد موتی لٹاتی رہے اہلِ فن کی مگر پیروی کم نہ ہو

عائشہ صدیقی

سراب

(افسانہ)

اسے عجیب سی بے چینی گھیرے ہوئے تھی جو آج سے پہلے اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی وہ پریشان سی ادھر ادھر تکے جا رہی تھی لاکھ کوشش کر رہی تھی کہ دھیان اس طرف سے ہٹ جائے لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا خود پر کوئی اختیار ہی نہیں رہا ہے وہ آنکھوں کو لاکھ سمیٹ رہی تھی ادھر ادھر اٹھا رہی تھی لیکن اللہ کی پناہ —— اسے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے جسم پر آنکھیں ہی آنکھیں اگ آئی ہوں یا جیسے وہ خود وہ نہ ہو ایک آنکھ ہو۔ آنکھ —— جو دو جوڑے نیلے پیالوں میں پیوست ہوئی جا رہی تھی اور وہ نیلے —— لگتا تھا کوئی آہنی دیوار ہو جو اسے آر پار دیکھنے سے روک رہی ہو یا جیسے کوئی بہت اونچی فصیل ہو جس پر وہ کھڑی ہو اور دیکھ دور دور کے سارے منظر دھندلا گئے ہوں پھر اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسے اس فصیل سے نیچے دھکا دے دیا ہو اور وہ نیچے —— بہت نیچے کسی گہرے سمندر میں گر پڑی ہو۔ وہ خود کو بہت تنہا تنہا اور بے سہارا سا محسوس کرنے لگی۔ یہ احساس تو اس میں ہمیشہ ہی رہا تھا اکثر بھری بھری سڑکوں سے گزرتے ہوئے وہ خود کو کھو دیتی تھی۔ سارے چہرے بدل جاتے تھے، آوازیں معنی کھو دیتی تھیں۔ تب وہ یوں محسوس کرتی تھی جیسے چاروں طرف طوفانی لہریں اٹھ رہی ہوں، پانی کا شور بڑھتا جا رہا ہو اور وہ بس ڈوبنے ہی کو ہو۔ وہ جب آس پاس نظر ڈالتی تو بڑے بڑے خوفناک آبی جانور ہی دکھائی دیتے۔ دور دور کہیں کوئی آدمی نظر نہ آتا۔ جب کبھی بھی ایسا ہوتا تھا تو وہ اس طرح ہانپتی ہوئی گھر پہنچتی جیسے زندگی کے اتنے بڑے بوجھ کو تنہا اپنے کاندھوں پر لے کر چلتے ہوئے بے دم ہو گئی ہو۔ بڑی دیر تک وہ خود کو بے جان سا محسوس کرتی۔ کچھ ایسا ہی اسے اس وقت بھی لگا۔ اسے لگا جیسے آس پاس کالی کھوری بہت سی چٹانیں بکھری ہوئی ہیں اور وہ سہارے کے لیے چاروں طرف ہاتھ پیر مار رہی ہے۔ اچانک ان کے بیچ سے ایک چٹان ابھر ابھر کر اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کرنے لگی۔ وہ جھپاک سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کسی نے ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔

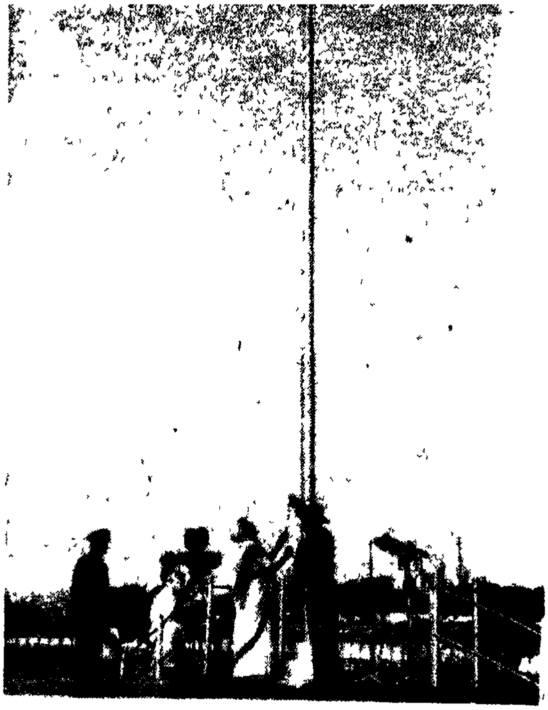
"ارے ارے ایسی کیا گھبراہٹ ہے؟ ذرا ان سب کو نکل تو جانے دو۔ اُف تم تو پسینہ میں بھیگی ہوئی ہو۔ کیا ہوا؟"

وہ بری طرح چونک گئی۔ اس نے دیکھا۔ اپنے ساتھ پڑھنے والوں کی بھیڑ میں وہ حیران پریشان کھڑی تھی ہال سے طلبا غول بنائے زور زور سے باتیں کرتے ہوئے نکل رہے تھے۔ وہ بھی جیسے خواب میں چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ یہ سب جو بھیڑ بن کر سامنے سے گزر گئے تھے اور گزر رہے تھے انھیں تو وہ پہچانتی تھی لیکن وہ کون تھا —— اسے تو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا شاید یہ نیلے اس سے پہلے اس کے سامنے نہ آئے تھے لیکن محسوس ہوتا تھا کہ انھیں کہیں دیکھا ہے۔ ذہن کے کسی گوشے سے وہ مٹی مٹی تصویر ابھر رہی تھی جو بارہا سایہ بن کر سامنے سے گزری تھی۔ ——

اکثر اس نے اسے خواب میں دیکھا تھا۔ وہ دیکھتی —— وہ کسی صحرا سے گزر رہی ہے، تپتی ہوئی ریت میں پیر جھلسے جاتے ہیں اور ایسے میں کوئی چلتے چلتے اس کی انگلی تھام لیتا ہے۔

یا کسی گھنے ویران جنگل میں کوئی تناور درخت انسانی جسم دھار لیتا اور اپنی باہیں پھیلا کر اسے اپنی طرف بلاتا۔ لیکن ہر خواب ادھورا رہ جاتا تھا۔ نہ تو وہ کبھی باہیں پھیلائے جسم کا چہرہ دیکھ پائی اور نہ کبھی اس مجسمہ نے پیچھے پلٹ کر اپنی شکل دکھائی جس کے کرتے کا پچھلا دامن پکڑے پکڑے اس نے جانے کتنی راتیں کاٹ دی تھیں۔

خواب اور حقیقت کی دھوپ چھاؤں میں سفر کرتے ہوئے اس نے اتنے برسوں کا راستہ طے کر لیا تھا۔ وہ ایک دبلی پتلی کمزور سی لڑکی تھی۔ سانولی رنگت اور بڑی بڑی حیران آنکھیں —— ہر چہرے میں کچھ ڈھونڈھتی ہوئی۔ ماں باپ کی اکیلی بیٹی۔ ماں باپ کی کیوں صرف ماں کی۔ باپ تو اسے دیکھے بغیر ہی ماں سے نجانے کب آنے کا وعدہ کر کے گئے تھے کہ پلٹے ہی نہ تھے۔ سب نے تو بچپن سے آج تک یہی بتایا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں واپس نہیں آئیں گے لیکن اسے اس پر کبھی یقین نہیں آیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ مرے نہیں ہیں ورنہ اماں کبھی کبھی یوں چونک کر دروازہ کیوں دیکھنے لگتیں جیسے ابھی ابھی



وزیراعظم شریمتی اندرگاندھی' ۱۵ اگست ۷۴ء کو' لال قلعہ
دہلی کی فصیل پر پرچم کشائی کرتے ہوئے



گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں یوم آزادی کے موقع پر
۱۵ اگست کو راج بھون لکھنؤ میں پرچم کشائی کرتے ہوئے

وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری ہیم وتی نندن بہوگنا گزشتہ ۱ر جولائی کو نیوزی لینڈ کے ہائی کمشنر شری آر آر میگم کو
کلارک اودھ ہوٹل لکھنؤ میں ایک مراد آبادی منقش آفتابہ بطور تحفہ پیش کر رہے ہیں







داہنے — گورنر اترپردیش شری اکبر علی خاں راج بھون لکھنؤ میں یوم آزادی کی تقریب کے موقع پر وزیر اعلیٰ اترپردیش شری ہیم وتی نندن بہوگنا کو ریاست میں سیلاب سے متعلق امدادی کاموں کے لیے پچیس ہزار روپے کا چیک دے رہے ہیں

وسط میں — شہید شرومنی بادھم سنگھ کی استھیاں سبھا کے ریاستی وزیر شری یوگیندر پال سنگھ اور اترپردیش کے وزیر اجتماعی ترقیات شری بابو سنگھ آریہ ہر کی پیڑی ہردوار میں گزشتہ ۳ راگست کو سیراتے ہوئے

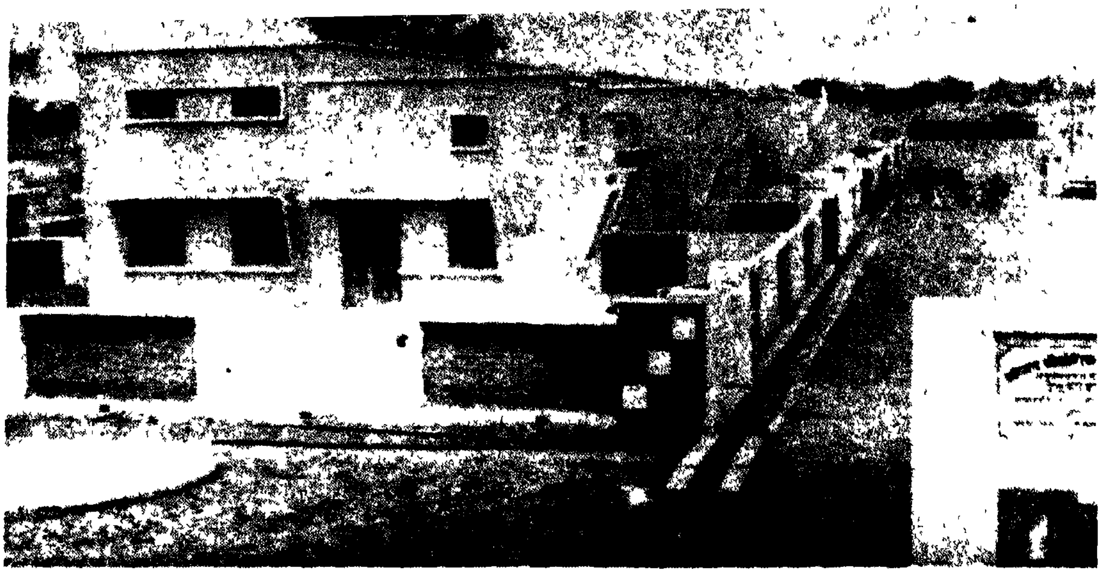
بائیں — گورنر شری اکبر علی خاں گزشتہ ۱۰ رجولائی کو ریاستی پہلا کرکٹ کے دوسرے مقابلہ میں لکھنؤ یونی ورسٹی کی فتح یاب ٹیم کی کپتان کو شیلڈ عطا کر رہے ہیں

نیچے — صدر ہندی سمیتی، شری امرت لال ناگر گزشتہ ۲۶ رجولائی کو ہندی سمیتی میں تلسی کتھا رگھوناتھ کی نمائش کا افتتاح کرنے کے بعد نمائش دیکھ رہے ہیں









کالی ہمالوں) میں ہریجنوں کے لیے تعمیر ہونے والی صنعتی بستی

مرزاپور میں ڈالا سیمنٹ کارخانے کی توسیع۔ تصویر اس علاقے سے متعلق ہے جہاں توسیعی پروگرام

بروئے کار لایا جا رہا ہے



کوئی دستک دے کر اندر آئے گا۔ کسی آواز کو سن کر پہروں کھڑکی سے جھانکا کرتیں۔ ایسے موقعہ پر اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو جاتا تھا۔ اسے لگتا دور ـــــــ کہیں بہت دور سے کوئی اسے بیٹی کہہ کر پکار رہا ہے کبھی کبھی اماں جیسے کوئی کہانی سنانے بیٹھ جاتیں۔

"تمہارے ابا بہت بڑے مقرر تھے وہ بولتے تھے تو ساری آوازیں ماند پڑ جاتی تھیں۔ بہت گہری اور سنجیدہ آنکھیں تھیں دراز قد۔ چوڑے چوڑے شانے۔ ہاتھوں کی انگلیاں سخت سخت تھیں۔ گھنے بالوں سے ڈھکے ہوئے ہاتھ ہزاروں میں پہچانے جا سکتے تھے۔ شلف میں لگی ہوئی یہ موٹی موٹی کتابیں انھیں مضبوط ہاتھوں نے لکھی ہیں۔" اور وہ گھنٹوں ان کتابوں کے اوراق پر ہاتھ پھیرا کرتی۔ جیسے ان ہاتھوں کے لمس کو محسوس کر رہی ہو۔ الماری میں بند کرم خوردہ رسالوں کی دھول جھاڑنے لگتی اور کبھی کبھی دھول کے مرغولوں میں اسے ایک دھندلی دھندلی شبیہ نظر آتی۔ چوڑا ماتھا گھنی بھنویں۔ اس صورت کے نقوش اجاگر کرنے کے لیے وہ گھنٹوں کتابوں کی گرد صاف کرتی۔ سارا کمرہ غبار آلود ہو جاتا لیکن وہ شکل نہ ابھرتی اور جب وہ اس بند کمرے سے نکلتی تو گھنٹوں گم سم رہتی۔ اماں شفقت سے پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر پوچھا کرتیں کہ اسے کس کتاب کی تلاش تھی اور وہ بس خالی خالی نظروں سے انھیں تکا کرتی۔

"تم بتاؤ تو بیٹی۔ تمہارے ابا ایک ایک کتاب کو اس طرح قاعدے سے رکھتے تھے کہ ایک ورق بھی ادھر سے اُدھر نہیں ہوتا تھا۔ میز پر رکھی ہوئی کتابیں کوئی ایک انچ بھی نہیں کھسکا سکتا تھا اور آج بھی سب کچھ ویسے ہی رکھا ہوا ہے۔ بس"

اور وہی ایک شکل تھی جسے وہ ڈھونڈھ نہ پاتی تھی۔ ان الگ الگ اعضا سے وہ کوئی ہیولی تیار نہ کر پاتی۔ کتنی ہی دھندلی دھندلی تصویریں ابھریں مگر کوئی سایہ بھی تو ایسا نہ تھا جسے وہ باپ کا نام دے سکتی۔ محرومیوں اور مایوسیوں کے اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی یہ لڑکی اس ایک مرد کا ذکر اس طرح ماں سے سنتی جیسے پریوں کی کوئی کتھا سن رہی ہو۔ وہ ڈوب ڈوب جاتی تھی ان ان دیکھی یادوں کے بھنور میں اس دلدل سے نکلنے کی اس نے بارہا کوشش کی تھی۔ اور کئی مضبوط ہاتھوں نے اسے سہارا دے کر اپنی طرف کھینچا تھا۔ کئی خوبصورت مردوں نے اسے محبت کی حسین وادیوں کی سیر کرانا چاہی تھی لیکن وہ نجانے کیسی کشش تھی کہ جب بھی کوئی نوجوان اس کے قریب آنا چاہتا وہ ڈری ہوئی ہرنی کی طرح بدک کر دور چلی جاتی اس کے دل میں یہ جذبے جاگتے ہی نہ تھے ہاں ایک تلاش آنکھوں میں ابھرتی تھی۔ دل ایک انوکھے احساس سے بے چین رہتا تھا۔ کسی کو پانے کی تمنا کی دستک وہ بھی دل پر محسوس کرتی تھی لیکن وہ کون تھا؟ وہ کبھی نہ سمجھ پائی۔

آج ان کتابوں کو دیکھ کر اسے بہت سکون کا احساس ہوا تھا۔ ایکدم محبت ابل پڑی تھی۔ دل بے قابو ہوا جاتا تھا۔ دل چاہتا تھا ایک بار وہ اسے اپنی طرف پھیر کر اس کا چہرہ ہی دیکھ لیتی۔ وہ دن بھر بے کل رہی۔ بار بار کوئی نہ کوئی سایہ سامنے سے گزر جاتا اور وہ چونک پڑتی۔

اگلے دن وہ دیر سے لکچر روم پہنچی تھی اسی لیے وہ ندامت سے سر جھکائے پیچھے کی سیٹ پر ہی بیٹھ گئی۔ روشنائی ختم ہو گئی تھی اس لیے اس نے برابر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف قلم بڑھا دیا اور جب وہ اسے واپس لے رہی تھی تو ایک بار پھر بری طرح چونک گئی۔ گھنے بالوں سے ڈھکے ہوئے مضبوط ہاتھ لانبی لانبی انگلیاں۔ پورے وقت وہ پریشان رہی۔ بار بار نظر بھٹک کر انھیں ہاتھوں پر جا کر رک جاتیں۔ دل یہی چاہتا تھا کہ وہ ان ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لے اور پھر کبھی نہ چھوڑے۔ وہ ایک لفظ نہ لکھ سکی۔ وقت کب ختم ہوا اسے پتہ ہی نہ چلا۔ نہ یہ احساس ہوا کہ وہ کب باہر آئی۔ وہ تو بس ایک سایہ کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی تھی چوڑے چوڑے شانوں والا ایک جسیم پیکر اس کے آگے تھا اور وہ گیلی زمین پر اس کے پیروں کے نشان ڈھونڈتی ہوئی چل رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد اس تک پہنچ جانا چاہتی تھی اس کا دل چاہتا تھا کہ ان شانوں سے سر لگا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے، اتنا روئے کہ یہ دھندلکے جنھوں نے اس کے گرد حصار کھینچ رکھا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھٹ جائیں۔

اسے اپنا توازن قائم رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ آخر وہ اس تک پہنچ ہی گئی۔ "سنئے" وہ اس سے مخاطب تھی۔

"میں آپ ـــــــ آپ کی تلاش میں ـــــــ"

اس نے سر اٹھا کر اپنے خوابوں کی تعبیر کو دیکھنا چاہا۔ لیکن وہ پروقار شخصیت تو یکسر بدلی ہوئی تھی۔ سنجیدہ آنکھوں میں جوانی کی شوخی ابھر آئی تھی چہرے پر جذبات کے لہریے تھے۔ وہ اشتیاق سے اسکی طرف جھکا تھا۔

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

رام پرکاش راہی

ہوا برسات کی

بے تکلف آتی جاتی ہے ہوا برسات کی
گنگناتی، سرسراتی ہے ہوا برسات کی

سرگموں کو چھیڑتی ہے بوندیوں کے سار پر
جھوم کر ملہار گاتی ہے ہوا برسات کی

پھول پتوں کے جھکتے جھرمٹوں کی گود میں
نکہتوں کو گدگداتی ہے ہوا برسات کی

کونپلوں، کلیوں کے مسکاتے لبوں کو کھول کر
اک نیا پیغام لاتی ہے ہوا برسات کی

دیج بھر دیتا ہے اسمیں بھیگی ہریالی کا لمس
سماتی، لہلہاتی ہے ہوا برسات کی

ہیں گھٹا کی شوخ زلفیں اسکے شانے کا سنگار
خود گھٹا کو ڈھونڈ لاتی ہے ہوا برسات کی

؛ڑھ کر کالی، ردپہلی، اُودی اُودی بدلیاں
ن گنت آنچل اڑاتی ہے ہوا برسات کی

بادلوں سے جب برستی ہے پھواروں کی شراب
مستیوں میں ڈوب جاتی ہے ہوا برسات کی

رپودے سب نہا کر تانت ہو جاتے ہیں جب
، محابا سناتی ہے ہوا برسات کی

پنگھٹوں کے پاس بل کھاتی ہے جب جھولے کی ڈور
قہقہوں کے گل کھلاتی ہے ہوا برسات کی

مین کر کچھ بجلیاں ہمجولیوں کی چھیڑ سے
، بدن میں کوند جاتی ہے ہوا برسات کی

دیکھ کر قوسِ قزح کی ہفت رنگ انگڑائیاں
رشک میں پھر تھرتھراتی ہے ہوا برسات کی

ہے اسی کے دم سے راہی یہ بھرے ساون کا روپ
رنگ و رس کے جام لاتی ہے ہوا برسات کی

سید نظو برنی

فرقہ پرستی

فرقہ بندی سے بچو، یہ قوم کا ناسور ہے
ہاں، یہی خنجر بکف ہے، قاتلِ جمہور ہے

قتلِ انسانی یہ ڈائن قہقہہ بردوش ہے
ہائے اِس ظالم کے ہاتھوں میں ہمارا ہوش ہے

اِس کے جبڑوں میں لہو ہے آج بھی انسان کا
یہ ہے مردم خور اس کا روپ ہے شیطان کا

ہندو مسلم سکھ عیسائی میں کراتی ہے یہ جنگ
اسکے ہاتھوں میں ہیں نیزے برچھیاں تیر و تفنگ

اس کے لب پر نعرۂ تخریب ہے اُف، الاماں
اس کے چہرہ پر سیاہ دھبوں کے ہیں کتنے نشاں

یہ وہ ناگن ہے نہیں ہے جسکے کاٹے کا علاج
مانگتی ہے قوم کے ہر فرد سے اپنا خراج

یہ ہے فاسسٹوں کی اور سرمایہ داروں کی حلیف
اسکے ہتھکنڈوں سے بچ سکتا نہیں کوئی شریف

آؤ اس ڈائن کو بڑھ کر موت کا پیغام دیں
اسکے کرتوتوں کے بدلے زہر کا اک جام دیں

نفرت و بغض و عداوت کے قلعے ڈھاتے چلیں
صحنِ گلشن کو گلوں کے رس سے مہکاتے چلیں

سیکولر قدروں کو سینے سے لگانا چاہیئے
جان بھی جائے بلا سے مسکرانا چاہیئے

صفدر مرزا پوری

ایک نثر نگار، ایک شاعر

تسنیم فاروقی

ایجاد و اختراع کے اس دور میں جبکہ انسان اور مشین کا فرق تقریباً اٹھ چکا ہے۔ کلوں اور کارگاہوں کی گہما گہمی اور اس کے لوازمات سے آدمی کے مزاج میں ایک خاص قسم کی اکتاہٹ پائی جاتی ہے۔ غالباً یہ فرار بشری طبائع میں موجودہ زمانے کی سیاسی ناتمامی، سماجی ناہمواری ایجاد و صنعت اور آئے دن تجربات کی تیز رفتاری سے پیدا ہے۔ مشاہدہ یہ کہتا ہے کہ با حالات متواتر یکسانیت انشاد طبع پر بار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آج کی زندگی کے ہر خانے میں سرعت سے کچھ تغیرات نمودار ہوتے جا رہے ہیں۔ اس عبوری دور میں مغربی وسائل سے ہپی ازم کی تحریک بھی اسی بحران کی دین ہے۔

عام اس سے کہ برقی اور سائنسی ترقی اپنے نقطۂ انتہا کی کھوج میں ہے تاہم انسان کا ذہن بھاگا بھاگا سا رہتا ہے کئی مثالیں نہ بیان کرتے ہوئے مختصراً، گوری تہذیب کا ایک عصری رجحان یہ بھی ہے کہ بعض بیرونی کلبوں، رقص گاہوں، میخانوں اور ہوٹلوں میں اب قدیم زمانے کی طرح بڑی بڑی شمعوں سے میزیں سجی رہتی ہیں، شاید اس انداز میں لوگ ضرور کچھ سکون محسوس کرتے ہوں گے حالانکہ یہ شمعی اجالا ہماری دنیا میں پرانے زمانے سے رائج ہے۔ مگر ایک قدرتی اور بنیادی نوع کی دستی اُپج ہے اس لیے آدمی اس کے ذریعے حیاتی تشکل سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ماضی کے بہت سے حقائق ہمارے روزمرہ میں پھر سے آنے لگے ہیں دراصل ماضی سے رشتہ توڑ کر حال یا مستقبل کے ساتھ گام بہ گام چلنا سہل ہی نہیں ہے۔ ماضی ایک ایسا سبب ہے جس پر عمارت قائم کیے بغیر ہر احساس معلق اور ادھورا رہ جاتا ہے۔ اس بارے میں انگریزی کے کسی ادیب کا قول ہے کہ "ماضی کا تحفظ ہی ہمارے زندہ ہونے کا اصل ثبوت ہے"۔ ماضی نام ہے ایک معاشرت، ایک تہذیب اور ایک یادگاری تمدن کا جس سے اس بسیط و عریض عالم کی دیواریں قائم ہیں۔ ماضی کے سماج کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہ چند قدریں جن پر انسانی حرکات و افعال اور اشتغال کا انحصار ہے ان میں فنون لطیفہ کی ایک اچھی جگہ ہے۔ اس خصوصیت کو اگر ہم زندگی کے مختلف شعبوں میں بانٹیں تو یہ نظر آئے گا کہ یہ حیات انسانی کا ایک قابل اعتنا ورثہ ہے مصوری، حکایت گوئی، شاعری، اور مجسمہ سازی وغیرہ آدمی کے قدیم ساتھی ہیں۔

اس کائنات کی بیتی ہوئی صدیوں کا وہ کینوس جس پر انسانی انگلیوں کی گلکاریاں اور نشانات آج بھی طلسم نظارہ ہیں ہماری اپنی زندگی کا بچا کھچا سرمایہ ہیں۔ اگر ہم تائیدی نگاہ سے جانچیں تو جدید آرٹ بھی اس کے شاہدین میں سے ایک ہے۔ آدمیت کے وہ ابجد تصورات، قدیم تصویر نگاری اور رنگ تراشی STYLES پھر اپنی پرانی جگہ لوٹ رہے ہیں۔ یہی پرستش قدامت جو آج کی جدیدیت کا مافی الضمیر بنی ہوئی ہے اس نے شعر و ادب میں خود کو تحلیل کر دیا ہے میرے نزدیک تو شاعری کا تصور یہ ہے کہ اسے ماضی سے متعارف کرائے بغیر کوئی فنکارانہ احساس نیا پن اختیار ہی نہیں کر سکتا۔

عہد قدیم کی وہ تہذیب جس نے کئی قسموں کے فنون کی داغ بیل ڈالی ہے اس کو بحث بنائے بغیر آرٹ کی مکمل سوانح تو کیا اس کا ایک ورق بھی ترتیب سے نہیں گزارا جا سکتا۔ ماضی کے اس تعلق کے بل پر اس کی گزشتہ روایت کو دہرانا بھی ایک طرح کا ادبی ثواب ہے۔ اس سے ہمیں کچھ نئے راستے ملے ہیں اور اس کی آوازِ بازگشت نے ہمیں حال اور مستقبل کے دوراہوں سے ملایا ہے۔ عہد رفتہ کے دوسرے محاسن کے علاوہ ہماری شاعری بھی ایک بہت بڑی تاریخ کی آئینہ دار ہے۔ اسی اثر کے تحت میں ماضی کی چہرگی اور اس کی تفصیلات کے ضمن میں ادب کے ایک ستون کا ذکر چھیڑ کر انکے کچھ ادبی کارناموں کو حال کی پونجی بنانا چاہتا ہوں۔ یوں تو اردو ادب میں امیر مینائی کو سب ہی جانتے ہیں۔ امیر مینائی سے جس مکتب فکر کے ایک غول کا نشو و نما ہوا ان میں جلیل مانک پوری ایک نمایاں مہرہ تھے۔ یہ تسلسل فیض محدود نہ تھا اس کی روانی نے ایک ادبی بیل کی طرح فکر و فن کی دھرتی کو آبیاری کا موقع دیا چنانچہ جلیل مانک پوری کے ادارۂ افکار سے منسلک صفدر مرزا پوری مرحوم بھی دنیائے ادب میں خود کو منوائے بغیر نہ رہ سکے۔

آپ کا نام محمد صفدر علی تھا اور صفدر تخلص فرماتے تھے۔ انتہائی تلاش و جستجو کے بعد بھی آپ کی سنہ ولادت کا پتہ نہیں چل پایا۔ اتنا معلوم ہو سکا کہ آپ مرزا پور کے محلہ واصل پور میں رہتے تھے۔ لکھنؤ میں شادی ہوئی تھی اور شادی کے بعد لکھنؤ کے ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ یہاں جھوائی ٹولہ میں حکیموں والی گلی سے قریب ہی کہیں رہتے تھے۔ ان کے انتقال کو تقریباً چالیس سال گزر چکے ہیں۔

صفدر مرزا پوری میں فن کے وہ باوثوق عناصر جو ایک رچے بسے اور منجھے ہوئے اہل قلم میں ممکن ہیں اپنی جملہ صفات کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے بعد کئی ایسے کتابی نادرات مطبوعہ صورت میں چھوڑے ہیں جن کا ذکر نہ کرنا ایک ادبی غفلت سے کم نہیں۔ میں یہاں ان کی بعض قابل ذکر کتابوں کی اچھائی اور ان کی افادیت کو بساطِ قلم بنا رہا ہوں ان کی ایک کتاب "بزم خیال" (مطبوعہ ۱۵ر جنوری ۱۹۱۸ء پانچواں ایڈیشن) ہے جس میں فارسی اور اردو کے اکابر غزل گویان کے حالات اور ان کے مجلسی لطائف درج ہیں۔ شاید ہی اتنی تحقیق سے پرانے ذخیروں میں ایسی کوئی کتاب مل سکے، اس سے نہ صرف ان کے لطف طبع کا احساس ہوتا ہے بلکہ ان کا عمیق مطالعہ، معلوماتی مزاج اور ان کی بزم کیش فطرت کا درک ہوتا ہے وہ بجائے خود اَحسن اسلوب میں ایک شاعر ایک بہتر ادیب اور ایک مناسب محقق کی ذمہ داری رکھتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی کتاب "بزم خیال" کی یہ ہے کہ لطیفے مختصر، ٹھوس، ادبی، اور جامع ہیں۔ ان میں لطیفوں کی (بعض حالات میں) وہ ابتذالی کیفیت نہیں ہے جو ذہن کو صرف قہقہوں تک پہنچا کر ایک سطحی نتیجے پر ڈال دیتے ہیں۔ ایک متوازن اور مہذب مذاق جو آج سے نصف صدی پہلے خوش وضع ادب میں پایا جاتا تھا، ایک درباری قسم کا رکھ رکھاؤ جو خصوصاً دکن، اودھ اور دہلی کا طرۂ امتیاز رہا ہے پیش پیش ہے۔ اس میں فارسی کے شعرا حافظ شیرازی، فردوسی، عرفی شیرازی، ملا فیضی، زیب النسا مخفی، شیخ علی حزیں، اور نور جہاں بیگم (ملکۂ جہانگیر) کے معیاری اور خوش مزاق حقایق پر منحصر لطیفے ملتے ہیں۔

فقہا اور صوفیا میں حضرت نظام الدین دہلوی، حضرت سرمد شاہ وغیرہ کے لطائف دلکش اور عالمانہ ہیں۔ علمائے کرام میں شاہ ولی اللہ، مولانا عبدالقدوس گنگوہی، مولانا محمد یوسف، مولانا قطب الدین احمد جیسے مرحومین کے دقتی اور مجلسی قسم کے صاف ستھرے اور دلچسپ تذکرے ہیں کتاب کا وہ حصہ جو فلسفیوں اور مشہور طبیبوں کے لطیفوں پر مشتمل ہے، اس میں حکیم بوعلی سینا مرکز توجہ ہیں۔ "بزم خیال" کی خوبی صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اس میں کچھ لطیفے اکٹھا کر دیئے گئے ہیں بلکہ تاریخی اور ادبی واقعات بھی ہیں۔ لطیفے جن لوگوں سے منسوب ہیں ان کی معتبر کتب، مضامین اور ان کے حوالوں کے ساتھ منقول ہیں اور زیادہ سے زیادہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ لطیفہ گو کی زندگی کا بھی کچھ عکس مختصراً بیان ہو۔

کئی جگہ مفتاح التواریخ، تاریخ فرشتہ، تاریخ نگارستان جیسی حکیمانہ دستاویزوں کا سیر حاصل مطالعہ اور وسیلہ بھی ہے متفرقات

کے سوانح ایک مضمون جس میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے ذکر کے ساتھ سلطان سنجر کے سلسلے میں ایک قطعہ بزبان فارسی اپنی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ عبدالواسع جبلی جو محض ایک دہقان تھا اس کی شاعرانہ برجستگی، اور سلطان سخن جز سے وابستگی نیز ہندستان وہ مغل سلاطین جن کی تاریخی حیثیت کے علاوہ ادبی صلاحیت، شاعرنوازی اور سخن سنجی کے بہت کم واقعات لوگوں کے کانوں تک پہنچے ہیں اس کتاب میں موجود ہیں۔ بالخصوص عالمگیر اورنگزیب جہانگیر، زیب النساء بیگم اور بہادر شاہ ظفر وغیرہ کے سبق آموز اور مستند کوائف جو لطیفے کی مہذب اقدار کے ضمانت ہیں تشکیل بزم خیال ہیں۔

دلّی، اودھ اور دکن سے مربوط چند وہ بزلہ سنج اہل علم جو سلاطین یا امراء کے مصاحب تھے اور اپنی ظریفانہ کوشش، خوش فعلی یا دلنوازی کے صلے میں سلاطین کی محفلوں کا حصہ تھے ان میں ملّا دوپیازہ، شاہ نصیر مرحوم، شیخ عبدالرحمان ہُدہُد، اپنے منفرد طرز و آہنگ کے لحاظ سے شریک مضامین ہیں۔ نوابین میں واجد علی شاہ اور نواب سعادت علی خاں بھی شامل ہیں۔ عشرت کدۂ اودھ سے مشہور و مجبور طوائف و شاعرہ امراؤ جان اداؔ بھی زینت بزم خیال ہے۔ نادر شاہ کے تذکرے سے معنون سلونا بھانڈ اور مشتری طوائف بھی شریک سطور ہیں۔ ہندستان میں اردو ادب کے وہ متقدمین جن پر اردوئے معلّٰی کو رہتی دنیا تک ناز رہے گا، میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ، انشاءؔ، سوداؔ، آتشؔ، ناسخؔ، دیا شنکر نسیمؔ، جرأتؔ لکھنوی، میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، امیر مینائی، ریاضؔ خیرآبادی، جلالؔ لکھنوی، جلیلؔ مانک پوری، نخچؔو موہانی، آرزوؔ لکھنوی، عزیزؔ لکھنوی اور سراجؔ لکھنوی کے گراں پایہ واقعات اور لطیف تذکار جزو اوراق ہیں۔

مرقع ادب" (حصہ اوّل و دوم) ۱۹۲۴ء میں نہایت ضخامت کے ساتھ مرتب ہو کر شائع ہوئی۔ کتاب کا مقدمہ حیدرآباد دکن کے مولانا محمد عثمان جعفری ایم۔اے (عثمانیہ) نے لکھا۔ کتاب میں اس دور کے معروف شاعروں، ادیبوں، ناقدوں اور روٗسار ریاست کے خطوط کا ایک مجموعہ ہے جس میں اس زمانے کے حسن خط کا مظاہرہ ہی نہیں کیا گیا ہے بلکہ بہت ہی نایاب اور اچھے خطوں کا مواد ملتا ہے ان خطوط کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے جو ادب۔ رموز و مسائل پر استفسار و استفہام کی مثال رکھتے ہیں۔ غالبؔ کے چار پانچ خطوط شعر و ادب کے اسقام و محاسن پر اختیاری اور دیگر لوازمہ کے حامل ہیں۔ خطوط جو تین سو بارہ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ انھیں حقیقی طور پر مرقع ادب کی سند حاصل ہے۔ عجیب و غریب ادبی، شعری، رموزی اور فنی نقد و تبصرہ کے مضامین سے پر ہیں بعض بعض مکاتیب میں دیرینہ کیفیات ماحول اور موسموں کا ذکر بھی خوش سلیقگی سے ملتا ہے۔ کچھ تحریروں میں تو ایسا لگتا ہے جیسے موجودہ دور کے اردو داں ان آداب سے مطلقاً ناشناس ہیں ا[illegible] عالمانہ بصارتوں کے مشاہدے اس کتاب میں ملتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کئی بار پڑھیے۔ لائق ذکر تحریروں میں مولوی سید سلیمان ندوی، مولینا شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، نظم طباطبائی، [illegible] بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق، امیر مینائی، عزیز لکھنوی اکبر [illegible] مولانا عبدالحلیم شرر، ریاضؔ خیرآبادی، حکیم برہم، خواجہ عبدالرؤف عشرت، سائل دہلوی سید یہدم، محشر لکھنوی ہادی مچھلی شہری [illegible] باسط بسوانی، اور بی مشتری کی انشا پردازی اور [illegible] قیمتی ملفوظات جن میں بحور، محاورات، اوزان، حسن فن زبان اور خصوصیات شعر پر چٹکلوں، بحثوں اور فیصلوں کے ساتھ اپنی مفکرین کے احساسات اور اشعار بکثرت ہیں۔ شعر و سخن سے متعلق [illegible] اور خوبیوں کے زمرے میں پُر دلایل وہ تمام علائم موجود ہیں [illegible] خطوط کے ذیل سے ہٹا کر ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو [illegible] پر ایک پر وقار نسخہ تیار کیا جا سکتا ہے۔

ملفوظات کی اوٹ میں جو کچھ پڑھنے میں آیا ہے اس میں ان ادبی ہمہ گیری اور پیرائے کی دلچسپی ہے، ایک طرح کا [illegible] ہے اور کہیں کہیں تو ان میں موسمیت اور منظریت کوٹ کوٹ کر سموئی گئی ہے۔ بعض جگہ شعراء نے مشاعروں میں شرکت اور [illegible] کا تذکرہ کیا ہے جس سے ان یادگاری قافلوں کے غروب ہو جانے کا شدید قلق ہوتا ہے۔ میں نے پہلے کی سطروں میں موسم کا ذکر کیا ہے نمونتاً خطوط کے ایک آدھ حصے نقل ہیں:

"برسات کا پیارا موسم فلک مینائی پر کالی کالی گھٹائیں، ابر کے ٹکڑے پیل مست کی طرح ادھر سے اُدھر پھر رہے ہیں، موسم برشگال کی روح افزا ہوائیں، ساقیٔ ہوش کی مہربانیاں، ہارمونیم کی سُریلی دلکش آواز اور آنکھوں کے سامنے کوئی مست ناز ایسے پرلطف سماں میں کسی خوش نصیب حسن پرست سے آپ کوتاہ قلمی کی شکایت کریں تو یقینی بے موقع ہے آپ کے حسن بیان کا ایک زمانہ معترف ہے سندیلے کے مشاعرے میں آپ کا مطلع واقعی مطلع آفتاب ہے اس کا جواب اب ہو نہیں سکتا۔ کیا خوب کہا ہے ؎

گیا اب آفتاب حشر کا بھی جلوہ گر ہونا؛
شب فرقت ہماری ہے یہ کیا جانے سحر ہونا

(قاضی زاہد حسین بنام صفدر مرزا پوری)

"...کل ۹ رکو یاران نجد کے ساتھ سینما دیکھنے گیا تھا۔ شکنتلا کا فلم تھا۔ اسٹیج اس طرح سے بھرا ہوا تھا۔ جس طرح کسی حرماں نصیب عاشق کے دل میں حسرت و ارماں کا ہجوم۔ بسمل یقین کرو کہ سارا کھرستان ٹوٹ پڑا تھا۔ ہائے اجتماع رنگ و بو بھولنے کی چیز نہیں ساریاں، قوس و قزح کے رنگ میں ڈوبی ہوئی جہاں ہم جاکر بیٹھے وہاں ایک سترہ برس کی دوشیزہ کی برق نظر نگاہوں کو خیرہ کئے دیتی تھی یہ کلی کشمیری گلاب کی تھی اس کی بھینی بھینی خوشبو نے یاران نجد کی حالت تباہ کر دی۔"

دوسرا خط ــــ "ایک جسم رریں مگر بلا کی چم خم، قیامت کا توڑ مروڑ، کشیدہ قامتی، وہ لہریں لیتے والی کمر، اُف اُف آسمانی ساری مگر زمیں والوں کے لیے بلائے ناگہانی۔ سر کھلا، سر کا ایک ایک بال کھلا، چوٹی کھلی اور اس کا ہر پیچ و خم کھلا۔ گردن کھلی اور اس کی رگوں کا ہر سہر حال کھلا، سینہ کھلا اور اس حد تک کھلا کہ اگر اس کے آگے ذرا اور کھل جائے تو دیکھنے والی نگاہیں شرما کے خود آپ ہی جھک جائیں۔"

(خطوط دیگر بنام بسمل بریلوی)

لسواں۔ یکم ستمبر ۱۵ ۱۹ء۔

بھائی صفدر، سلام مسنون۔ آپ کا خط ملا تھا جواب میں تاخیر ہوئی۔ پہلے سرگزشت سن لیجئے پھر خفا ہوئے گا۔ پرسوں شب کو کھانا کھا کر عشاء کی نماز پڑھ کر جو بستر پر دراز ہوئے تو برسات کی پیاری کالی رات اور گھنگھور گھٹائیں دیکھ کر طبیعت جو مزے میں آئی تو اپنی پرانی غزل کا ایک شعر حسب حال گنگنانے لگا ــــ "آج سا کچھ بھانڈ طبلہ سارنگی چھوڑ برساتی تھاپ کی چوٹ دلوں میں لیے ہوئے رُوں رُوں کے بجائے توبہ یا اللہ توبہ کی راگنی دل سے چھیڑتے ہوئے مع عیال و اطفال جامع مسجد کی کوٹھریوں میں مقبروں میں خانقاہوں میں جا دھمکے میں تو ان کی اپج کو مانتا ہوں کہ خوب سوجھی کہ اگر اللہ میاں تم نہیں مانتے ہو تو ہم تمھارے ہی گھر میں بستر لگاتے ہیں

(ماسٹر باسط بسوانی بنام صفدر مرزا پوری)

اسی طرح سے کئی مکتوبات میں یہ دلچسپیاں مطالعے کو رجوع کرتی ہیں، خطوط میں اس دور کے آثار اور تمدن کی واقفیت کی بنا پر بڑی صداقت کے ساتھ انشاء نگاری کے مرقعات شامل ہیں۔ اپنی دو جلدوں پر مبنی موقع ادب ایک دور ایک تہذیب اور ایک مؤدب معاشرے کی ترجمان ہے۔

مشاطۂ سخن معروف بہ شمع سخنوری۔ مطبوعہ ۱۹۱۸ء کتاب کا باقاعدہ سنِ اشاعت حاصل نہ ہونے کی صورت میں مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کا مقدمہ اس بات کا غماز ہے کہ ابتدا میں سالِ اشاعت ہی درست ہے تمہید کے عنوان سے صفدر مرزا پوری کا ایک مضمون مقدمے کے بعد موجود ہے۔ اقتباسی انداز میں مؤلف کے چند جملے سپرد قلم ہیں

"بے اصلاحی غزلوں کا رواج اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب اصلاح لینا گویا فیشن کے خلاف ہو گیا ہے۔ ایک مرتبہ حکیم ناطق نے لکھنؤ کے خوشگویوں سے کہا کہ آپ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو غزل سنا لیا کریں تاکہ مخالفین پر یورش کرنا آسان ہو میں نے اور بعض احباب نے ان سے یہ خواہش کی کہ آپ ایک تنقیدی رسالہ نکالیے جس کے مضامین سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اصلاح کے بغیر کیا نقائص رہ جاتے ہیں اور اصلاح کی کس قدر شدید ضرورت ہے۔ حضرت نے اس شرط پر وعدہ کیا کہ اگر یہ روش حسد پر محمول

نہ کی جائے تو میں تیار ہوں انھیں خرابیوں کی طرف جو اُردو اد ب کی تخریب و تنزلی میں جزو اعظم ہیں توجہ دلانے کی ضرورت سمجھ کر یہ ایک دلچسپ پیرایہ اختیار کیا گیا ہے جس کا منشا ر یہ ہے کہ حصۂ نظم کی آرائش ہو اور اسی سے اس کا نام مساطۂ سخن رکھا گیا' ـــــ مجھے زبان اُردو سے محبت ہے اس کی خدمات جہاں تک میرے امکان میں ہیں کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہوں گا اور اس وقت جہاں تک اصلاحیں اساتذ سابق وحال کی مجھے سعی اور کوشش سے مل سکیں ان کو کتابی صورت میں ملک کے سامنے پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں اور جو کچھ مل جائیں گی انشاء اللہ اگر حیات مستعار باقی ہے تو طبع آئندہ میں اس کا اضافہ ہوگا۔"

'مشاطۂ سخن' ان متقدمین کی اصلاحوں اور چھیڑ چھاڑ پر درق بند ہے جن کو اردوئے معلّٰے کے رنگا رنگ مکاتب افکار میں سند دینے کا ممتاز درجہ حاصل ہے۔ مرتب نے کتاب میں اس کا خاص طریقے پر التزام کیا ہے کہ شعر و شاعری کی دائرہ بندی کیلیے جتنے معائب و محاسن ممکن ہو سکیں ان پر بحث و اصلاح کے ذریعے روشنی ڈالی جائے۔ فن شاعری کے اتنے بڑے سمندر کا احاطہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ متعدد معتمد سندوں کے ساتھ یہ کتاب صرف اصلاحوں، تنقیدوں اور بحثوں کا ایک آئینہ ہے، ایک ایسا مکمل شجرہ ہے جس کے توسط سے بآسانی یہ پتہ چل سکتا ہے کہ کون سا شاعر کس استاد کے سلسلے سے وابستہ ہے۔ کتاب کے خاص شعرا میں مرزا غالب اور ان کے تلامذہ کے علاوہ ذوق، مومن، مصحفی، امیر مینائی، شاد عظیم آبادی، منشی امیر اللہ تسلیم، سید ضامن علی جلال، منیر شکوہ آبادی، عبدالحلیم شرر، وصل بلگرامی، دیا شنکر نسیم، ناسخ، آتش اور اکبر الہ آبادی وغیرہ کے وہ مخطوطات زیب کتاب ہیں جن میں انھوں نے اپنے شاگردوں اور دوستوں کو کچھ اہم ادبی مسائل پر مدلل و مفصل مشورے دیے ہیں، یہاں غالب کا ایک خط ملاحظہ فرمائیں جو انکے دیگر خطوط کے ماسوا ہے۔!

"جان غالب! کل تمھاری دونوں غزلیں بعد اصلاح ٹکٹ دار لفافے کے اندر رکھ کر بھجوا دی ہیں۔ مطلع تو تم نے میری زبان سے کہا ہے ؎

ادائے یوسفی ہے لوٹ قاتل کے لڑکپن پر
سوادِ دیدۂ یعقوب کے دھبّے ہیں دامن پر

اس زمین میں میری بھی ایک غزل ہے اور ناسخ و آتش کی غزلیں بھی میں نے دیکھی ہیں۔ تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے گردن کا قافیہ بھی مجھے پسند آیا ؎

نزاکت ان کی وقت قتل مقتل میں یہ کہتی ہے
یہ اتنے خون ناحق جس سے اُٹھیں اُنکی گردن پر

غرض کہ ساری غزل بے مثل اور لاجواب ہے۔ کیوں نہ ہو ابھی تمھارا شباب ہے زمین شعر کو آسمان پر پہنچا دیا ہے اس غزل میں تم نے جوانی کا زور دکھایا ہے۔ بندہ پرور میرا کلام کیا نظم کیا نثر، کیا اُردو کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا دو چار دوستوں کو اس کی فکر ہوئی، وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کرتے تو ان دوستوں کا زمانہ غدر میں گھر ہی اُجڑ گیا نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا پھر میں اپنا کلام نظم و نثر کہاں سے لاؤں۔ مولوی فرید علی اخگر کا کون شخص مشتاق نہ ہوگا حسن صورت اور حسن سیرت دونوں ان میں جمع ہیں۔ فقیر تو ان سے مل کر بہت خوش ہوا آنکھیں ان کے حسن صورت سے روشن اور دل ان کے حسن سیرت سے مسرور ہو گیا۔ اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔ میں یوں ہی خدمت گزاری کو حاضر ہوں حسب چاہیں ان کا کلام بھیج دیں میرا سلام اور یہ پیام کہہ دیجئے گا۔

تمھارے دلدار کا طالب۔ غالب
۱۳ر جولائی ۱۸۶۷ء

(بنام امیر الشعرا مولانا احمد حسین تمنا[1] مرزا پوری)

مشتے نمونہ از خروارے کے مانند میں نے یہ عبارت نقل کر دی۔ ورنہ اس طرح کے بے شمار عظام ادب کے خطوط اور قابل ذکر اقتباسات اس کاغذی صحیفے کی روح ہیں اس دور کے کتنے ہی اہل لسان ادب،

[1] ایک جگہ یہی نام تمنا مرزا پوری بھی لکھا ہے جو غالبًا کتابت کی غلطی کے سبب ہے۔

اشعار، اور ہلناؤں کی کاوشیں اور تحریریں اس کتاب کے حجم میں محصور ہیں۔ ظاہر ہے کہ صفدر مرزا پوری مرحوم کو ایک مکمل شخصیت بنانے کے لیے یہ ساری علامتیں ناکافی نہیں ہیں۔ ان کی دوسری تالیفات میں بھی کچھ اسی قسم کی بیش بہا بعلوماتی اور تحقیقی کتابیں ہیں۔ صفدر مرزا پوری کے ہمدرد نوجوان شعرا میں علامہ محوی صدیقی (بھوپال) بقید حیات ہیں۔ جن کی عمر اب نو ۹۰ے برس سے بھی متجاوز ہے ان سے صفدر کی کچھ ایسی کتابوں کا بھی علم ہوا جو باوجود تلاش تمام کے دستیاب نہ ہوسکیں۔ جنھیں اب قریب قریب نایاب سمجھنا ہوگا۔ انکی فہرست کتب میں دو رذلک، حسن ادب، دیوان صفدر، مشاطۂ سخن، بزم خیال، مرقع ادب، (دو جلدوں میں) ہنوز موجود ہیں۔ ان کتابوں کو چھونے کے بعد یہ علم بھی ہوا کہ کئی کئی بار شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں چنانچہ رقمطراز کے وسائل میں ایک کتاب کا پانچواں ایڈیشن ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں چھپنے والی یہ کتابیں ایک ایسا سرمایہ ہیں جن کی حفاظت اردو کے لیے سرچشمۂ فیض سے کم نہیں۔

موصوف لکھنؤ کی ادبی انجمنوں میں ایک لائق اعتماد شمع تصور کیے جاتے تھے۔ انھوں نے قیام لکھنؤ سے قبل الٰہ آباد سے ایک ماہنامہ اجرا بھی کیا جو عرصے تک اردو کارناموں کا نشان رہا۔ ان کا ایک قلمی دیوان جو غالباً ان کی کلیات پر مشتمل ہے ایک عرصے تک پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے کتب خانے کی امانت بنا رہا جواب ان کے صاحبزادہ کو جناب مذکور نے عنایت فرما دیا۔

کلیات صفدر سے ماخوذ کچھ اشعار (غیر مطبوعہ) ملاحظہ ہوں

حقیقت پوچھتا ہے مجھ سے کیا او باغباں میری
چمن کے پتے پتے پر لکھی ہے داستاں میری

گل ہوئی شمع دمِ صبح یہ کہہ کر صفدر
کل پھر آنا ہے اسی بزم میں جلنے کے لیے

میں ادھر ہوں سامنے رکھا ہوا ہے آئینہ
میرے ان کے بیچ میں دیوار کچھ یوں ہی سی ہے

بگڑ بگڑ کے دمِ صبح کوئی کہتا ہے
تمام رات پریشاں کیا جگا کے مجھے

برا نہ مان سلامت ترا شباب رہے
فقیرِ حسن ہوں عادت مری دعا کی ہے

مجھ سے کہتی ہے یہ وحشت میری
گھر میں رہنے کی ضرورت کیا ہے

خیالِ آمدِ فصلِ بہار رہتا ہے
جنوں خزاں میں بھی سر پر سوار رہتا ہے

دل کھنچتی ہے زلف یہ کھنچتا ہے سوئے زلف
دل اختیار میں ہے نہ زلف اختیار میں

لے گئی لوٹ کے صبر و خرد و ہوش و حواس
پا کے تنہا مجھے لوٹا شب تنہائی نے

مجھ کو کیا اہلِ ہنر یاد کریں گے صفدر
بعد میرے جو چھپا بھی کبھی دیوان مرا

★

چندر پرکاش جوہر بجنوری

غزل

جو تیری راہ تری انجمن سے گزرے ہیں
وہ پہلے منزلِ دار و رسن سے گزرے ہیں

کوئی مقامِ طلب ہو مگر یہ اہلِ جنوں
بڑے وقار، بڑے بانکپن سے گزرے ہیں

یہ بزمِ انجم و خورشید و ماہ کیا ہم لوگ
تری تلاش میں ہر انجمن سے گزرے ہیں

روش روش پہ جل اُٹھے چراغِ لالہ و گل
کچھ اس ادا سے وہ صحنِ چمن سے گزرے ہیں

دماغ ان کا مہکتا ہے بوئے گل کی طرح
جو میرے گلشنِ شعر و سخن سے گزرے ہیں

انہی سے پوچھئے جوہر مقامِ خاکِ وطن
کبھی جو وادیِ گنگ و جمن سے گزرے ہیں

غزل

نقی کاظمی لکھنوی

اب تو کچھ بھی نہیں، اپنے کسی غمخوار کے پاس
آؤ، دو چار گھڑی بیٹھ لیں اغیار کے پاس

فخرِ افلاس بھلا سود چکائے، تو یہ
زندگی رہن نہ ہوگی، کسی زردار کے پاس

ہم تو ناکامِ تمنا تھے، چلو بیٹھ گئے
آپ کیوں آئے ہیں اِگرتی ہوئی دیوار کے پاس

ہر صدی یوں صدیِ نَو کے گلے لگتی ہے
جیسے جائے کوئی روگی، کسی بیمار کے پاس

کچھ کٹے سر ہیں تو دو چار برہنہ بازو
کیا ہے اور اس کے علاوہ رسن و دار کے پاس

جو پھرا کرتے تھے سر اپنا ہتھیلی پہ لیے
آج آتے نہیں ٹوٹی ہوئی تلوار کے پاس

بے ہنر کھیل رہے ہیں زر و جوہر میں نقی
غم کی دولت ہے فقط آج کے فن کار کے پاس

• شمیم سبزواری



چودھری سمیع الزماں
مغل آرٹ کے
آخری باکمال
مصوّر



چودھری سمیع الزماں

پرسی براؤن اور رابندرناتھ ٹیگور کی امنگوں کے مطابق تمام ادوار کی رنگینیوں میں پروان چڑھنے والے مغل آرٹ کے مشہور اور آخری باکمال مصوّر چودھری سمیع الزّماں جنھیں موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے ہمیشہ کے لیے چھین لیا ۱۸۸۶ء میں قصبہ سیہا ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے تھے۔

چودھری سمیع الزماں بجنور ضلع لکھنؤ کے معزز و موقّر چودھری خاندان کے ممتاز فرد تھے۔ ان کے والد چودھری ثمد الزّماں عہدۂ تحصیلداری پر فائز تھے۔ اگرچہ ضلع لکھنؤ کے باحیثیت تعلقداروں میں شمار کیے جاتے تھے مگر قول و عمل کی یکسانیت، راست گوئی و راست بازی اور عبادت و ریاضت نے ان کو حلقۂ احباب سے لے کر عوام تک میں مشہور و مقبول بنا دیا تھا۔ ان کے چار صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں — صاحبزادی گذشتہ لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر محمد وسیم مرحوم سے منسوب تھیں، صاحبزادوں میں حسن اتفاق سے ہر ایک اپنے اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھا لیکن شہرت کے اعتبار سے چودھری سمیع الزّماں اور چودھری خلیق الزّماں کا پلّہ بہت بھاری نظر آتا ہے۔

چودھری سمیع الزّماں نے باپ کے سایۂ عاطفت میں ہوش سنبھالا گھر میں مال و دولت، عیش و عشرت اور جاہ و ثروت کے چاروں طرف انبار دیکھے لیکن شرافت اور بےنفسی کو گلے کا ہار بنایا۔ وہ ابتدا ہی سے انتہائی نیک، مرنجاں مرنج، بے لوث، مخلص اور ہمدرد واقع ہوئے تھے۔ شباب تک پہونچتے پہونچتے "سارے جہاں کے درد کا پیکرِ جمیل بن گئے۔ زمانہ طالب علمی میں جب آگرہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جبلی کالج لکھنؤ میں داخل ہوتے تو کوئی غریب ہم سبق اُن کا ایسا نہ تھا جو ان کی امداد و اعانت سے محروم رہا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ چودھری صاحب ہمیشہ سے رواداری، انسان دوستی اور بھائی چارگی کے زبردست وکیل اور پرستار تھے۔ ان کا مسلک "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" پر مبنی تھا۔ اس سلسلے میں گھر میں اکثر بھائیوں سے بحث مباحثہ ہو جایا کرتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد جب ان کا سارا خاندان پاکستان منتقل ہو گیا اور وہ صرف اپنی بیوی، بچوں سمیت تنہا رہ گئے تب بھی ان کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی۔ وہ جس خاک سے پیدا ہوئے

تھے اسی میں مل جانا اپنی خوش بختی تصور کرتے رہے۔ حالانکہ زمینداری ختم ہونے کے بعد اُن کی آمدنی قلیل رہ گئی تھی مگر پاکستان کے سرکاری اعزاز کا لالچ انھیں اپنے وطن عزیز سے جدا نہ کر سکا۔ بالآخر ان کی وصیت پوری ہوئی اور انتقال کے بعد لکھنؤ کے اموسی ہوائی اڈے کے قریب اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیے گئے۔

چودھری سمیع الزّماں لکھنؤ کے قدیم شائستہ کلچر کے امین تھے مگر انتہائی باغ و بہار شخصیت کے حامل تھے۔ اگر مزاح سے فطری لگاؤ تھا تو شوخی انفرادِ طبع کا ایک جزو بن گئی تھی اور علمِ مجلسی پر قدرتِ کاملہ حاصل تھی۔ ہزاروں تاریخی واقعات، داستانیں، مزاحیہ قصّے اور اردو، فارسی اور نیز ہندی و سنسکرت کے سیکڑوں اشعار انھیں ازبر تھے۔ بات بات میں ظرافت، بذلہ سنجی، پھبتی، طنز اور صوفیانہ مذاق کے نئے نئے پہلو تلاش کرنا ان کا کام تھا۔ ان کے سُنائے ہوئے دو قصے آج تک زباں زد عوام ہیں جن میں "کرہو کا" اور "نہ ٹِڑک لے گا نہ ٹھڑک بمار موا تھا آجھو اس ٹھاڑھ ہے" شامل ہیں ایک تاریخی واقعہ کے سلسلے میں جو "طلسم ہوشربا" کی تصنیف سے متعلق ہے مشہور ناول نگار حضرت مائل ملیح آبادی یوں رقم طرازہیں۔ اس سے چودھری صاحب کی معلومات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"اس کتاب (طلسم ہوشربا) کی تصنیف کا بھی عجیب حال رہا ہے مشہور مصوّر جناب چودھری سمیع الزماں صاحب لکھنوی نے اس کتاب کے بارے میں بتایا کہ نظیر آباد میں جہاں آج کل بسارا ز کی عمارت ہے میدان پڑا ہوا تھا سامنے پچھم کی طرف مکان تھے یہاں طوائفیں بھی رہتی تھیں شام کو میدان میں فرش لگتا تھا، گاؤ تکیے رکھ دیے جاتے تھے۔ احمد حسین صاحب قمر کے پانچ، چھ شاگرد افیون کی کٹوریاں اور قلم، دوات، کاغذ لے کر فرش پر بیٹھ جاتے تھے۔ قمر صاحب کی کٹوری چاندی کی ہوتی تھی شاگردوں کی سفالی کٹوریاں ہوتی تھیں۔ قمر صاحب ایک چسکی لیتے تھے، پھر کسی شاگرد سے پوچھتے تھے آپ کو کہاں تک لکھایا تھا وہ کل کی لکھی ہوئی دو تین سطریں سناتا تھا۔ کہتے تھے آگے لکھیے اور داستان شروع ہو جاتی تھی پھر دوسرے شاگرد سے اسی طرح سوال کرتے تھے اور اسے دوسری داستان لکھاتے تھے۔ اسی طرح سب شاگردوں کو الگ الگ داستانیں لکھاتے رہتے۔ سُننے والوں کی بڑی بھیڑ ہو جاتی تھی سن ۱۸۹۰ء کا واقعہ ہے۔"[1]

لیکن چودھری صاحب کا شہرۂ آفاق کمال اور اصل فن ان کی مصوّری ہے زمانۂ طالب علمی سے انھیں مصوّری کا شوق تھا اکثر اپنی کاپیوں پر طرح طرح کی تصویریں بناتے تھے اور نت نئے مناظر کی تصویر کشی کیا کرتے تھے جس کی پاداش میں کبھی کبھار اپنے اساتذہ کی ڈانٹ بھی کھاتے رہتے تھے۔ مشہور مصوّر حکیم خاں اس وقت کلکتہ آرٹ اسکول کے طالب علم تھے۔ چودھری صاحب کا شغف اور دلچسپی ان سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ ۱۹۰۹ء میں وہ از راہِ دوستی لکھنؤ تشریف لائے اور چودھری صاحب کے یہاں ہوئے۔ واپسی میں وہ انھیں فن مصوری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے کلکتہ لیتے آئے اس وقت پرسی براؤن (PERSI BROWN) آرٹ اسکول کے پرنسپل تھے جو انتہائی شفیق، منکسر المزاج اور فن کے سچے قدرداں تھے۔ یہیں داخلہ کے وقت اوبندر ناتھ ٹیگور سے بھی ملاقات ہوئی جو اس دور کے عظیم مصور تصور کیے جاتے تھے۔ چودھری صاحب نے انھیں اپنی بنائی ہوئی کچھ تصویریں دکھائیں، پہلی ہی نظر میں وہ چودھری صاحب کی آرٹ اور ان کی خداداد صلاحیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے گھر پر عملی آرٹ کی تعلیم دینے کے لیے بغیر کسی تکلف کے راضی ہو گئے۔ چودھری صاحب روزانہ دوارکا ناتھ ٹیگور لین جاتے اور شام تک مصوّری کی تعلیم حاصل کرتے رہتے۔ ٹیگور کے گھر میں اچھے خاصے آثار قدیمہ موجود تھے جن میں ملک اور بیرون ملک کے عظیم مصوّروں کی حسین مصوّری کے نادر و نایاب نمونے کمروں میں اسکرینوں پر لگے ہوئے تھے۔ وہیں چودھری صاحب نے کچھ مورتیاں بھی دیکھیں جن میں مہاتما بدھ کی مورت نہایت دلکش اور ٹیگور کے فن کا حسین ترین شاہکار تھی۔

تقریباً ایک سال ٹیگور کی ہدایت کے مطابق کام سیکھنے کے بعد

---

[1] ماہنامہ بزم مشاعرہ لکھنؤ بابت ستمبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۲۴

چودھری صاحب وہاں سے فارغ ہوئے۔ اس عرصہ میں چودھری صاحب نے ٹیگور کی نگرانی میں بہت سی تصویریں بنائیں اس کے بعد وہ عملی مُصوّری کی طرف رجوع ہوئے۔ اگرچہ ٹیگور اب انھیں کوئی ہدایت نہیں دیتے تھے لیکن ان کے ہر کام کو بغور دیکھتے تھے اور بہت تعریف و توصیف کرتے تھے۔ جب چودھری صاحب نے اپنی مشہور تصویر" شاہجہاں کی موت،، بنائی تو ٹیگور نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا یہ وہی شاہکار تصویر تھی جسے" لارڈ مانٹیگو اور کارل مائیکل (LORD MON-TEGUE AND CARL MICLE) نے چودھری صاحب سے خریدا تھا۔ رفتہ رفتہ چودھری صاحب مغل آرٹ میں مشہور ہونے لگے۔ کلکتہ اور بیرونِ کلکتہ انھیں قدر کی نظروں سے دیکھا جانے لگا لیکن جب چودھری صاحب نے اپنی ایک اور مشہور تصویر" اورنگ زیب کی شکار سے واپسی،، بنائی تو ملک بھر میں مغل آرٹ کے ایک عظیم مصور کی حیثیت سے انھیں مان لیا گیا۔ کلکتہ میں بہت اہتمام سے جلسہ منعقد کیا گیا جس میں چودھری صاحب کی مغل آرٹ کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی بنائی ہوئی اس تصویر سے کلکتہ میوزیم کو رونق بخشی گئی جو آج تک کلکتہ میوزیم میں محفوظ ہے۔

چودھری صاحب اب مغل آرٹ کے عظیم مصوّر کی حیثیت سے کافی مشہور ہو چکے تھے۔ ہر طرف سے ان کے فن پر داد و تحسین کی صدائیں آرہی تھیں۔ مداحوں اور قدرشناسوں کا حلقہ وسیع ہوتا جارہا تھا۔ ابنیدر ناتھ ٹیگور بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے اور اکثر اوقات ان کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ چودھری خلیق الزماں اپنی خود نوشت سوانح حیات میں



چودھری سمیع الزّماں کی مغل آرٹ کا حسین ترین نمونہ نورجہاں کی پیدائش

لہ شاہراہ پاکستان از چودھری خلیق الزماں صفحہ ۱۱ تا ۱۲ ناشر انجمن اسلامیہ پاکستان کراچی

دھری صاحب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"مصوّری کا شوق تھا۔ انھوں (چودھری سمیع الزماں) نے کلکتہ آرٹ اسکول میں جس کے رابندر ناتھ ٹیگور پرنسپل تھے شریک ہو گئے اور کئی برس کلکتہ میں رہے ٹیگور ان کے فن کے اس قدر معترف تھے کہ انھوں نے ان کے سرٹیفکیٹ میں یہ لکھا تھا کہ مغل آرٹ کی باریکیاں اور اس کے راز ان سے زیادہ ہندستان میں کوئی نہیں جانتا ۱۹۳۴ء میں تصاویر کی ایک نمائش لندن میں ہوئی جس کے لیے انڈین گورنمنٹ نے انھیں بھی لکھا کہ اپنی دو تصویریں بھیج دو۔ ان کی دو تصاویر کو نمبر (۱) و (۲) کر کے گورنمنٹ آف انڈیا نے لندن بھیج دیں۔ ابھی حال ہی میں اخبار نیشنل ہرالڈ نے ان کے آرٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندستان میں ان سے بہتر مغل آرٹ کا کوئی ماہر نہیں ہے۔"

چودھری سمیع الزماں کئی برس تک کلکتہ میں رہنے کے بعد اب وطن لوٹنے کے خواہش مند تھے انھیں شام اودھ کی رونقیں، دوستوں کی صحبتیں اور گھر کی محفلیں پکار رہی تھیں لیکن کلکتہ کی محبت کے نقوش اس قدر ماند ہونے والے نہیں تھے۔ کلکتہ نے انھیں بہت کچھ دیا تھا۔ دن گزرتے گئے آخر ۱۹۱۶ء میں ٹیگور کی دعائیں لے کر لکھنؤ چلے آئے۔

چودھری صاحب نے مغل آرٹ کی مصوری کا جو کام اپنے ہاتھ میں لیا تھا وہ آسان نہ تھا۔ اس کے لیے انھیں خود ہی رنگوں کو بنانا پڑتا تھا۔ اس کے لیے ایک مشکل مسئلہ یہ تھا کہ بہت سی چیزیں اس وقت یہاں دستیاب نہیں ہوتی تھیں لیکن چودھری صاحب نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ سنہرے رنگ کو وہ سونے سے بناتے تھے جس کی چمک دمک آج بھی ان کی تصویروں میں ویسی ہی نمایاں ہے۔ کاغذ کا مسئلہ بھی یہاں بہت پریشان کن تھا۔ مغل آرٹ کے مصور چار قسم کے کاغذوں کا استعمال کرتے تھے (اب ان کے بنانے والے موجود نہیں ہیں) چودھری صاحب کاغذ کی تلاش میں گلیوں گلیوں اور دکانوں دکانوں گھومتے تھے اور کسی طرح پرانی کتابوں نیز بنیوں کی بہیوں کے ہاتھ سے بنے ہوئے کاغذ حاصل کر کے مصوّری کا کام انجام دیتے تھے اس سلسلے میں بہت سی تصویروں کے کاغذ خراب نکل جانے کے باعث انھیں کچھ عرصہ کے لیے کام بھی بند کرنا پڑا تھا

چودھری صاحب نے مصوّری ہمیشہ اپنی خواہش اور ذہن کے مطابق کی۔ وہ تصویروں کے لیے ماڈل کی مدد کے محتاج کبھی نہیں رہے۔ ان کی اکثر تصاویر مختلف موضوعات پر مبنی ہیں جن میں ادب، موسیقی اور تاریخ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی مشہور تاریخی تصاویر 'نورجہاں کی پیالیس' جہانگیر کا انصاف، 'مینا بازار' دربار اکبری' شاہجہاں کی موت'، اورنگ زیب کی شکار سے واپسی'، اورنگ زیب کی دکن سے متعلق فتوحات'، بہادر شاہ ظفر کے دربار کا مشاعرہ'، اکبر کی شیخ سلیم چشتی کے مزار پر حاضری'، نورجہاں سے شہزادہ سلیم کا کبوتر اڑجانا وغیرہ وغیرہ شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ موسیقیت پر مبنی ان کی مشہور تصاویر جو بہ ہوست نکالوں سے میخانے سے تان سین کی دیپک راگ کی محفل' ہندستانی، ایرانی اور یوروپی رقص، بانسری والا'، آپ اپنی نظیر اور مصوّری کا حسین ترین مرقع ہیں۔

مغل آرٹ کی تصویروں میں "دوری" کے اصولوں پر اس قدر توجہ نہیں دی جاتی تھی جتنی بعد میں دی گئی تھی مگر چودھری صاحب کی بنائی ہوئی تصویریں ہمیشہ سے اس کے برعکس ہیں۔ ان کی تصاویر میں افق کے ماحول تک کو ابھارا گیا ہے۔ دوری دکھانے کے لیے ان کے قلم کی باریکی اور رنگوں کا اتار چڑھاؤ قابل تعریف ہے۔ قلم کی باریکی تو ان کی سبھی تصویروں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اگر خوردبین سے دیکھا جائے تو ایک ایک اسٹروکس الگ الگ دکھائی دے گا حتیٰ کہ پلکوں کے ڈیٹیلس (DETAILS) اور کپڑوں کے نقش بھی صاف صاف دکھائی دیں گے ان تصویروں کو جس قدر وقت کی ضرورت ہوتی تھی وہ لگاتے تھے۔ ان کی بعض بعض تصاویر پر تو دس دس پندرہ پندرہ سال تک بورڈ پر رہی ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہر تصویر میں چودھری صاحب نے اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔

مغل آرٹ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ایک بار چودھری صاحب نے ایک قصّہ سنایا کہ شہنشاہ اکبر کو انگلستان کی ملکہ الزبتھ نے تحفہ کے طور پر گلاب کا ایک پھول بھیجا۔ بادشاہ نے اپنے خاص مصور عبدالصمد سے پوچھا

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

غزل

عزیز بارہ بنکوی

فصلِ بہار شرحِ گریباں تو کر گئی
لیکن گلوں کی شدتِ احساس مر گئی

برہم وہ جب ہوئے تو جوانی نکھر گئی
جب مسکرا دیے تو قیامت گذر گئی

دل توڑ کر بنا گئی دردآشنا ہمیں
ان کی نگاہِ ناز بڑا کام کر گئی

شمعِ حریمِ ناز ہو یا برقِ طور ہو
جو آگ بھی جلی وہ پتنگوں کے سر گئی

آیا نہ ہم کو راس مداوائے دردِ دل
ہمراہِ درد مرحمتِ چارہ گر گئی

اک روز اس نے پیار میں وحشی جو کہہ دیا
وحشت کہیں نہ چھوڑ کے پھر میرا گھر گئی

میری نظر تھی چہرۂ صیاد پر ہنوز
اس کی نگاہ جرأتِ پرواز کر گئی

جب تیری رحمتوں کی نہیں کوئی انتہا
پھر کیا ہوا جو میری خطا پر نظر گئی

روٹھیں ہم اُن سے یا کہ منائیں انھیں عزیز
اس کشمکش میں عمرِ دو روزہ گذر گئی

غزل

نینا جوگن

نہ ترنم نہ تبسم نہ گلابی نہ سبو
کہیں ٹوٹا ہوا شیشہ کہیں ساغر خالی

آ گیا روپ جو سبزے پہ تو کلیاں چٹکیں
غنچہ و گل میں تتلی خیر سے ڈالی ڈالی

پھر چھما چھم کی بہاروں سے کھلے دل کے کنول
صحنِ گلشن میں ہوا آ گئی اُتّر والی

ہائے کیا رت ہے کیا فصل ہے کیا موسم ہے
کیف سے جس کے ہر اک آنکھ ہوئی متوالی

یہ ہوائیں یہ نظارے یہ بہاریں یہ سماں
دیکھتی ہے وہی تتلی جو ہے قسمت والی

کوئی سنتا ہی نہیں نینا کہانی آ کر
جی میں آیا تو خود اپنے ہی لیے دُہرا لی

جعفر عباس

(افسانہ)

بڑی حویلی

پتا نہیں مرزا کو یہ وہم تھا کہ ابھی وہ جوان ہیں حالانکہ ان کی عمر کافی ڈھل چکی تھی اور ان کی عمر کے دوسرے لوگ مرکھپ کر اللہ کو پیارے بھی ہو چکے تھے اور جو باقی بچ گئے تھے وہ بھی زیادہ تر مسجدوں میں اللہ اللہ کرنے یا میلاد اور مجلسوں میں اپنا وقت گذارتے تھے اور جس وقت مرزا کے دوسرے ساتھی اللہ کی یاد میں سر بہ سجود ہوتے اس وقت مرزا شیروانی پہنے، نازک سی چھڑی ہاتھ میں لیے، پان کی ڈبیا ہاتھ میں اور کچھ گلوریاں منھ میں دبائے لوک ماتھ چلے جاتے وہاں کچھ میٹھا نمکین چکھنے کے بعد اگر زیادہ ترنگ میں ہوتے تو آگے میر گنج میں کسی منّی جان کے یہاں بھی ضرور دو گھڑی بیٹھا کرتے۔

مرزا کی یہ عادت ہماری پیدائش کے پہلے بھی تھی اور مرزا ہم نوجوانوں کو بہت حقارت سے دیکھتے اور جب کبھی ہم کیرم، لوڈو، یا تاش میں سر کھپا رہے ہوتے اس وقت مرزا ہمارے سروں پر مسلط ہو جاتے اور کہتے:

"لا حول ولا قوۃ — تم لوگ بھی اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہو اور جب ہم تمہاری عمروں کے تھے تو " اور یہ قصہ ہم اس قدر سُن چکے تھے کہ اب یہ قصہ ہم کو خود اپنا ہی لگنے لگا تھا۔ لیکن مرزا جوانی کے رنگین قصے سناتے اور ہماری اٹھتی جوانیوں کو للکارتے اور ایک آدھ روپیا ہمارے ہاتھوں پر پھینک کر چلے جاتے۔

اب ہم بھی مرزا کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ اگر کسی دن مرزا نہ آتے تو ہم سب کو تشویش ہونے لگتی لیکن ایسا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوتا کہ مرزا ہماری محفلوں میں سے غیر حاضر رہتے ہوں۔ مرزا کا کوئی دوست نہ تھا۔ اس لیے وہ اپنا زیادہ تر وقت سونے میں یا پھر ہم جوانوں کے درمیان ہی گذارتے اور ہم لوگ بھی جیسے مرزا کے لیے وقف ہو چکے تھے۔ اِدھر سورج نکلا اور ہم چائے ناشتے سے فارغ ہو کر مرزا کی حویلی کی طرف لپک جاتے

مرزا کی حویلی کی ٹوٹی پھوٹی محرابیں، اونچے کنگورے اور منقش چھتیں عظمتِ رفتہ کا پتا ضرور دیتی تھیں لیکن مرزا کی زندگی ہی میں جنگلی کبوتروں چڑیوں چمگادڑوں اور دوسرے پرندوں نے اس حویلی پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ ہم نے کئی بار مرزا کی توجہ اس طرف دلائی مگر وہ بھی آخر مرزا ہی تھے ہماری باتیں اس قدر غور سے سنتے کہ ہمیں یقین ہو جاتا کہ دکھ رہے ہیں لیکن جب ہم اپنی بات ختم کر ڈالتے تو مرزا اس طرح منھ پھلاتے جیسے وہ روٹھ گئے ہوں انھیں ہماری سب عادتیں اور سب باتیں جان سے زیادہ عزیز تھیں لیکن وہ حویلی کا ذکر نہ تو کبھی خود کرتے اور نہ ہی وہ اسے سننا پسند کرتے لیکن ہم بھی انھیں موقعہ بہ موقعہ چھیڑنے کی خاطر حویلی کا قصّہ ضرور چھیڑ دیتے۔

مرزا کے آبا و اجداد کہیں باہر سے آئے تھے اور یہ حویلی کسی راجا نے ان کے دادا کے والد سے خوش ہو کر انھیں سونپ دی تھی۔ ممکن ہے یہ حویلی کبھی خوبصورت، دلکش اور بہت بڑی رہی ہو مگر اب تو حالت یہ ہے کہ دن بھر سارے شہر بھر کے دھوبی وہاں کپڑے سکھاتے یا کتے ٹہلتے ہوتے اور یا پھر لڑکے گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے نظر آتے۔

ہم جب چھوٹے سے تھے تو ہم بھی اپنی دادی اماں کے ساتھ اس حویلی میں کئی بار گئے۔ بڑے بڑے آنگن، اونچی اونچی چھتیں، خوبصورت منقش محرابیں اور دیواروں پر لگی ہوئی بڑی بڑی مونچھوں والے لوگوں کی تصویریں جن میں زیادہ تر تصویریں ایسی تھیں کہ جنھیں دیکھ کر واقعی تعظیم کرنے کو جی چاہتا تھا۔ شیر اور چیتے کی کھالیں، بارہ سنگھے اور نہ جانے کیا کیا اس حویلی میں موجود تھا۔ جب ہم وہاں سے آتے تھے تو ہمیں اپنا گھر بہت چھوٹا بہت ٹوٹا پھوٹا اور حقیر لگتا۔ کیونکہ وہ سب چیزیں ہمارے گھر نہ تھیں

جو ہم مرزا کی حویلی میں دیکھ کر آتے۔

اکثر اور ایسا عموماً اسی وقت ہوتا جب ہم دادی اماں کے ساتھ ڈولی میں بیٹھ کر اس حویلی کی کسی تقریب میں جاتے۔ اس تقریب میں دعوت اور شربت کے علاوہ گانے بجانے والی کئی ٹولیاں بھی آتیں اور جب ہم رات گئے وہاں سے واپس ہوتے تو بہت دیر نیند نہ آتی اور خواب میں ہم بھی ایسا ہی محل دیکھتے اور خود کو کسی راجکمار سے کم نہ سمجھتے لیکن یہ اثر زیادہ دیر تک نہ رہ پاتا کیونکہ صبح اٹھ کر والدین کی گھڑکیاں ہمیں خواب سے حقیقت میں بدل دیتیں اور ہم چھوٹا سا ناشتہ دان ایک میلے سے رومال میں باندھے اپنے کام پر چلے جاتے اور شام کو واپس آتے تو ہم یہ بھول چکے ہوتے تھے کہ اس شہر میں کوئی حویلی بھی ہے۔ دادی اماں عموماً وہاں کام کرنے جاتی تھیں اور اکثر ہم بھی ان کے ساتھ اس بڑی حویلی کو دیکھنے کی خاطر چلے جاتے۔ چلے تو جاتے مگر ہر چیز کو چھوتے ہوئے ایک عجیب سا خوف محسوس ہوتا اور ایسا لگتا کہ اگر کسی چیز کو چھو لیا تو شاید یہ ٹوٹ جائے اور پھر اس خیال سے ہی خون جمتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔

لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ حویلی اپنے حدود اربعہ میں سمٹ ہوتی گئی اور جیسے جیسے یہ حویلی کھنڈر میں بدلتی گئی میں نے وہاں جانا ترک کر دیا۔ اور ایک دن ایسا بھی ہوا کہ میری دادی اماں کو نوکری سے نکال دیا گیا وہ دن ہماری زندگی کا سب سے زیادہ المناک اور دردناک دن تھا، کیونکہ گھر میں صرف دو ہی آدمی کمانے والے تھے یا تو میں تھا اور یا پھر دادی اماں لیکن دادی اماں کی نوکری چھٹنے کے بعد ساری ذمہ داری ہم پر آ گئی اور ہم بھی پیٹ جوڑنے کے چکر میں کچھ اس طرح پڑ گئے کہ اس حویلی کا نقشہ تک یاد نہیں رہا۔ بمبئی، دلی، کلکتہ اور نہ جانے کہاں کہاں روٹی روزی کی خاطر بھٹکنے کے بعد جب پچیس برس بعد اپنے شہر واپس آئے تو شہر کا نقشہ ہی بدلا ہوا ملا۔ جو بچے تھے وہ جوان ہو چکے تھے اور جو جوان تھے وہ پکی عمروں کے ہو چکے تھے اس لیے بہت دنوں تک عجیب بے کیفی کے عالم میں دن گزرے پھر جب دھیرے دھیرے مانوس ہوئے تو اسی حویلی کی طرف رخ کیا اور اس کو دیکھ کر تو دم بخود رہ گئے۔ اب وہاں حویلی نام کی کوئی چیز نہ تھی پاس پڑوس کے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں رہنے والے لوگ کہاں چلے گئے، کسی نے معقول جواب نہ دیا۔ ہم نے اس حویلی کو چاروں طرف سے دیکھا لیکن وہ تو ہمیں ہر طرف سے ایک ہی سی نظر آ رہی تھی۔ نہ وہ دیواریں تھیں، نہ وہ بڑی بڑی تصاویر تھیں اور نہ ہی وہ جھاڑ فانوس تھے جنہیں دیکھ کر میں ڈر اڈر سا رہتا تھا۔ بہت دیر تک ایک ٹوٹے ستون کا سہارا لیے کھڑا رہا۔ چمگادڑیں اڑ رہی تھیں، جنگلی کبوتروں کے گھونسلوں کے تنکے ہوا میں بھٹکتے ہوئے اڑ رہے تھے اور ایسا ہو کا عالم تھا کہ میں خود بھی اعصابی کشمکش کا شکار ہو چکا تھا۔

بہت ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ جب میں آگے بڑھا تو ایک بوڑھا شخص، لنگڑا، جا بجا سفید داغ، داڑھی بڑھی ہوئی، میری طرف گھور رہا تھا اور اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میری طرف اپنا تانبے کا گندہ، میلا اور ٹیڑھا میڑھا پیالہ بڑھا دیا اور میرے بھی اس دن کسی قسم کی کمی نہیں اٹھا رکھی تھی۔ جتنی بھی ریزگاری محنت مزدوری سے کما کر لایا تھا وہ سب کی سب میں نے اس کے کٹورے میں ڈال دی اور اپنے بے گھر اور خوبصورت مکان کو اسی وقت چھوڑ کر چلا گیا۔

یہ ڈائری کے اوراق آج بھی میرا سرمایہ حیات ہیں، میں تنہا نہیں ہوں، لوگ کہتے ہیں کہ میں تنہا ہوں، اداس ہوں، میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ ڈائری میرے پاس ہے اور اس میں وہ حویلی مرزا صاحب، ممی جان اور نہ جانے کیا کیا لکھا ہوا ہے اب آپ ہی سوچیے کیا سچ مچ میں اکیلا دکھائی دے رہا ہوں۔؟

★

تصویر دلّی کی ★ ـــــــ (صفحہ ۵ کا بقیہ)

کی ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ یا یوں اب نہیں پھر کہو دلی کہاں!"

دلّی نے اس زمانے سے آج تک کئی بار جنم لیے۔ ہر بار نئی دلّی بسی اور پرانی اجڑی اور بستی بگڑتی دلّی کی تصویریں اسی طرح خطوط اور روزنامچوں میں ابھرتی رہیں کہ ان سب کو کوئی یکجا کرے تو طلسم ہوش ربا کا نیا دفتر تیار ہو جائے۔

★

محمد حسین رضوی

اردو کے علمی رسائل

بیسویں صدی کے اوائل تک

پرتگالیوں نے ہندستان میں پہلا چھاپہ خانہ ۶ ستمبر ۱۵۵۶ء کو گوا میں قائم کیا۔[1] بمبئی میں پہلا چھاپہ خانہ ۱۶۷۴ء میں نصب کیا گیا۔[2] ۱۷۷۲ء میں مدراس میں ایک چھاپہ خانہ کھولا گیا۔ بنگالی زبان کا ٹائپ ۱۷۷۸ء میں ہگلی کے مقام پر سر چارلس ولکنس (SIR CHARLES WILKINS) نے تیار کیا۔ چارلس ولکنس ہی نے فارسی رسم الخط کا ٹائپ بھی تیار کیا۔ فارسی ٹائپ کا پہلا نمونہ ۴ مارچ ۱۷۸۴ء کے کلکتہ گزٹ کے صفحہ اول پر ایک کالم میں "خلاصہ اخبار دربار معلیٰ بہ دارالخلافہ شاہجہاں آباد" فارسی ٹائپ میں چھپا۔ یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا۔ ۱۸۳۶ء میں لیتھو کی طباعت شروع ہوئی۔

اردو کا پہلا جریدہ "جام جہاں نما" ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے جاری ہوا۔ درحقیقت اس کو فارسی کو جریدہ سمجھا جاتا رہا۔ شروع میں اس کی حیثیت ایک اردو کے رسالے کی ہی تھی لیکن کچھ شمارے نکالنے کے بعد جب یہ محسوس کیا گیا کہ اس کی کھپت فارسی میں ہے تو اس کو فارسی میں بھی جاری کر دیا گیا۔ ایک سال کے بعد اس کا اردو ضمیمہ بھی شائع ہونے لگا جو پانچ سال تک نکلتا رہا۔[3] اردو کا پہلا مکمل جریدہ "دہلی اردو اخبار" تھا جس کو ۱۸۳۶ء میں محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر نے جاری کیا۔ اس سے پہلے اپریل ۱۸۱۸ء میں ہی رامپور سے "دگ درشن" کے نام سے ایک بنگالی رسالہ جاری ہوا جس کی ادارت ڈاکٹر مارش مین کے سپرد تھی۔ یہ رسالہ بیک وقت بنگالی اور انگریزی زبانوں میں نکلتا تھا۔ اس رسالے کے ایک صفحہ پر انگریزی متن ہوتا تھا اور اس کے مقابل اس کا بنگالی ترجمہ ہوتا تھا "دگ درشن" میں شائع ہونے والے مضامین کی اطلاع انگریزی اخبار "فرینڈس آف انڈیا" (FRIENDS OF INDIA) میں شائع ہوتی تھی۔[4] بنگالی زبان میں ایک اور رسالہ "سمبد کھومدی" نکلتا تھا جس کو ۱۸۲۲ء میں راجہ رام موہن رائے نے خود نکالنا شروع کیا۔

سرام پور سے ۲۳ مئی ۱۸۱۸ء میں "سماچار درپن" نامی ہفت روزہ جریدہ بنگالی زبان میں جاری ہوا لیکن یہ مطبوعہ رسالہ نہیں تھا۔[5] ۳۰ مئی ۱۸۲۶ء کو "اودنت مارتنڈ" کے نام سے ایک جریدہ کلکتہ سے منو ٹھاکر کی ادارت میں نکلا۔ چھ ماہ بعد یہ جریدہ بند ہو گیا اور اس کے دس سال بعد یعنی ۱۸۳۶ء میں کلکتہ ہی سے "پرجا متر" جاری ہوا اور وہ بھی ناکام رہا۔ ۱۸۴۹ء میں "جگ دیپک بھاسکر" نکلا۔ یہ بھی بہت مختصر عرصہ تک جاری رہا۔

---

[1] THE PRINTING PRESS IN INDIA, BY ANNAT KAKBA PRIOLKAR, 1958 P 7

[2] IBID P 32 [3] کلکتہ منتھلی جرنل۔ جلد اول ص ۳۹۵ [4] ہندوستانی اخبار نویس۔ از محمد عتیق صدیقی۔ ص ۱۲۲ [5] انگریزی عہد میں ہندوستان کی تمدنی تاریخ از عبداللہ یوسف علی۔

گجراتی زبان میں "بمبئی سماچار" یکم جولائی ۱۸۲۲ء کو فریدون جی مرزبان اور ملا فیروز نے جاری کیا۔ گجراتی زبان میں دوسرا جریدہ ہفتہ وار "جام جمشید" ۱۸۳۱ء میں پیسٹن جی مانک جی موتی والا نے جاری کیا۔ مراٹھی زبان کا پہلا جریدہ "بمبئی درپن" ۱۸۳۲ء میں جاری ہوا۔ یہ پندرہ روزہ تھا۔ اس میں انگریزی اور مراٹھی دونوں زبانوں میں مضامین چھپتے تھے۔ چند مہینے نکلتے رہنے کے بعد یہ بند ہو گیا۔ مراٹھی زبان کا پہلا ماہنامہ "دگ درشن" ۱۸۴۰ء میں جاری ہوا۔ تامل زبان میں پہلا رسالہ "تامل میگزین" ۱۸۳۱ء میں جاری ہوا۔ اس کو عیسائی مشنریوں نے نکالا تھا۔ ۱۸۵۵ء میں "راج درتی بودھنی" کے نام سے ایک جریدہ نکلا جو ہفتہ وار تھا۔ پنجابی زبان میں "کوہ نور" نام کے ایک جریدہ کے جاری ہونے کا اعلان ۱۸۵۱ء میں ہوا۔ لیکن اس کا کوئی بین ثبوت نہیں ملتا کہ یہ جاری ہوا بھی یا نہیں۔

فارسی زبان میں "جام جہاں نما" کے علاوہ ایک دوسرا جریدہ "مراۃ الاخبار" راجہ رام موہن رائے نے اپریل ۱۸۲۲ء میں نکالا۔ محمد عتیق صدیقی اپنی کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی" صفحہ ۱۴۹ پر لکھتے ہیں کہ راجہ رام موہن رائے نے مارچ ۱۸۲۲ء میں "مراۃ الاخبار" کے نام سے فارسی کا رسالہ شائع کیا لیکن اس کا پہلا شمارہ ۲۰ اپریل ۱۸۲۲ء کو شائع ہوا۔ اس کے دوسرے سال اس کے اڈیٹر نے "جام جہاں نما" کا اردو ضمیمہ بھی نکالنا شروع کیا۔ فارسی کا ایک اور جریدہ کلکتہ ہی سے "شمس الاخبار" کے نام سے ۶ مئی ۱۸۲۳ء کو جاری ہوا۔

۱۸۲۲ء سے ۱۸۵۷ء تک ملک کے مختلف علاقوں سے فارسی اور اردو رسائل شائع ہوئے۔ جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ اردو زبان میں ہفتہ وار جریدہ دہلی سے محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر نے "اردو اخبار" کے نام سے جاری کیا۔ اس جریدہ میں خبریں ہوتیں، تبصرے ہوتے اور حکومت کے بعض کاموں کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا۔ شعر و ادب پر بحثیں ہوتیں اور ہر شمارہ میں بادشاہ کی ایک غزل لازماً شامل کی جاتی۔ ۱۸۳۷ء میں سر سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد نے "سید الاخبار" نکالا۔ بعد میں اس میں سرسید کے مضامین بھی شائع ہونے لگے۔ "سراج الاخبار" ۱۸۴۱ء میں قلعۂ معلی سے فارسی زبان میں شائع ہوتا رہا۔ اس میں ذوق اور بہادر شاہ ظفر کا فارسی کلام بھی چھپتا تھا۔ اس کی ایک اشاعت مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۸۴۳ء سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۳ء میں مولانا محمد باقر نے ایک اخبار "مظہر حق" کے نام سے شائع کیا تھا لیکن گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں اس کے اڈیٹر کا نام محمد علی بتایا ہے۔

یہ تمام ہفتہ وار جریدے اطلاعات تو ضرور بہم پہنچاتے تھے۔ اور ان میں کچھ ادبی چاشنی بھی ہوتی تھی لیکن ہمیشہ یہی محسوس کیا جاتا رہا کہ علمی مقاصد کے لیے ماہانہ رسائل کا اجرا بہت ضروری ہے چنانچہ جرائد کی تاریخ میں علمی رسائل کی ابتدا اور نشو و نما میں مسیحی مشنریوں نے سب سے اہم رول ادا کیا ہے۔ اس طرح پہلا علمی رسالہ ۱۸۳۰ء میں مرزاپور سے آر۔ سی۔ ماتھر کی ادارت میں "خیر خواہ ہند" کے نام سے جاری ہوا۔ اس رسالہ میں نستعلیق اور رومن دونوں رسم الخط میں مضامین شائع ہوتے تھے ۱۸۵۷ء میں یہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۸۶۱ء میں اس رسالہ کا دوبارہ اجرا ہوا اس بار یہ دیوناگری اور نستعلیق رسم الخط میں شائع ہوا۔ لیکن باعتبار زبان یہ مضامین اردو ہی میں ہوتے۔ ۱۸۶۰ء کے "خیر خواہ ہند" کے دور اول میں چھپے ہوئے مضامین کے دو مجموعے شائع ہوئے[1]۔ ایک کا نام "منتخب العالم" تھا اور دوسرے کا نام "مفرح القلوب"۔ ان کتابوں میں نئی نئی ایجادات، ہاتھ کی مشینوں، چھاپے خانوں، اور طریقۂ طباعت وغیرہ پر مضامین شامل ہیں۔

دہلی سے ماسٹر رام چندر نے بھی ایک رسالہ "خیر خواہ ہند" کے نام سے ۱۸۴۶ء میں جاری کیا جس کا نام بعد میں بدل کر "محب ہند" کر دیا گیا۔ سیدہ جعفر اس کو اردو کا پہلا رسالہ شمار کرتی ہیں[2] "فوائد الناظرین" جو ماسٹر

---

[1] یہ دونوں کتابیں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہیں۔

[2] ڈاکٹر سیدہ جعفر۔ ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ حیدرآباد۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ ۱۹۶ء صفحہ ۲۱۔ اور صفحہ ۳۶۔ ۳۷

رام چندر نکالا کرتے تھے۔ اس کے (جلد ۲ شمارہ ۱۸، ستمبر ۱۸۴۷ء) صفحہ ۱۴۵ پر درج ہے کہ رسالہ "خیر خواہ ہند" ..... بتاریخ یکم ستمبر ۱۸۴۷ء کو جاری ہو گیا۔ "خیر خواہ ہند" کا نام بدلنے کی وجہ "فوائد الناظرین" میں خود ماسٹر رام چندر نے یہ بتائی ہے کہ اسی نام کا ایک رسالہ مرزا پور سے جاری ہوتا تھا۔ بہرحال اب تک کی معلومات کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرزا پور کا "خیر خواہ ہند" علمی رسالوں کی دنیا میں اولین ہے۔ ماسٹر رام چندر کا رسالہ "محب وطن" ۱۸۵۲ء تک نکل کر بند ہو گیا۔

ماسٹر رام چندر کا دوسرا رسالہ "فوائد الناظرین" ایک سائنسی اور تاریخی رسالہ تھا اور باتصویر تھا جس کے ہر شمارہ میں مشہور عمارتوں، سائنس دانوں اور مشاہیر کی تصاویر شائع ہوتی تھیں اور ان تصویروں پر مضامین ہوتے تھے۔ محمد حنیف صدیقی کی تحریر کے مطابق یہ رسالہ ابتدا میں پندرہ روزہ تھا۔ اس کے سال آغاز کے سلسلہ میں بھی اختلاف ہے۔ عتیق صدیقی کی تحقیق کے مطابق اس کا سال آغاز ۱۸۴۵ء ہے۔ لیکن پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اسے ۱۸۴۶ء بتاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے خیال کے مطابق یہ رسالہ ۱۸۴۷ء میں جاری ہوا۔ راقم الحروف کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ ۱۸۴۶ء میں ہی جاری ہوا کیونکہ ستمبر ۱۸۴۷ء میں جلد ۲ کا شمارہ ۱۸ شائع ہوا تھا اور اگر ابتدائی کچھ شمارے پندرہ روزہ تھے تو گویا ۱۲ ماہانہ شمارے ستمبر ۱۸۴۷ء تک شائع ہو چکے تھے۔ اس حساب سے یہ رسالہ اوائل ۱۸۴۶ء میں شائع ہونا شروع ہوا ہوگا۔

۱۸۴۵ء میں دہلی سے ایک اور پندرہ روزہ جریدہ "قران السعدین" نکلا جس کے مدیر پنڈت دھرم نارائن بھاسکر تھے جو دلی کالج میں استاد تھے۔ یہ اخبار بارہ برس تک جاری رہا۔ گارساں دتاسی لکھتا ہے کہ اس میں ادبی اور سیاسی بحثیں ہوتی تھیں اور ساتھ ہی سائنسی معلومات بھی۔ اس رسالہ کو دہلی کالج کے پرنسپل "اسپرنگر" نے جاری کیا تھا۔ چنانچہ اسپرنگر خود لکھتا ہے کہ اس نے اس رسالہ کے ذریعہ پینی میگزین (PENNY MAGAZINE) کے طرز پر ایک باتصویر رسالہ کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام "قران السعدین" رکھا۔[۱] وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ بارہ برس کے بعد جب وہ ہندوستان سے رخصت ہوا تو اس رسالہ کی تقلید میں بارہ سے زیادہ رسالے نکل رہے تھے۔[۲]

۱۸۴۵ء ہی میں مولوی کریم الدین نے ایک ماہنامہ "گل رعنا" کے نام سے اور ایک ہفت روزہ "کریم الاخبار" کے نام سے شائع کیا۔ "گل رعنا" میں شعراء کے کلام پر تبصرہ شائع ہوا کرتا تھا۔ درحقیقت مولوی کریم الدین اپنے مکان پر ہر ماہ ایک مشاعرہ کرتے اور اس میں شامل شعراء کا کلام "گل رعنا" میں شائع کرتے۔ یہ ایک طرح کا مخصوص رسالہ تھا جو صرف شاعری کے لیے ہی وقف تھا۔

۱۸۴۹ء میں قانونی مسائل اور عدالتی فیصلوں پر مشتمل ایک ہفتہ وار جریدہ "فوائد الشائقین" پربھو دیال کی زیر نگرانی نکلا۔ آگے چل کر ۱۸۵۶ء میں قانونی موضوعات اور مقدمات کے فیصلوں کے لیے آگرہ سے ایک ماہنامہ "معدن القوانین" بھی شائع ہوا۔ ۱۸۴۸ء میں آگرہ سے ایک پندرہ روزہ رسالہ "معیار الشعراء" نکلا۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک شاگرد شیو نرائن "آرام" اس سے منسلک تھے۔ بنارس سے بابو کیدار ناتھ گھوش اور کالی پرشاد نے ایک ماہنامہ "مرأت العلوم" اگست ۱۸۴۸ء میں جاری کیا۔ اس رسالہ کے بانیوں نے ایک گلدستہ "گلزار ہمیشہ بہار" کے نام سے بھی شائع کیا۔ "مرأت العلوم" کے اڈیٹر ہربنس لال تھے جو تاریخ اور زراعت کے مضامین شائع کرتے تھے۔ اس رسالہ کے صرف تین شمارے شائع ہو سکے۔ اس کے بعد یہ بند ہو گیا۔ "تحفۃ الحدائق" ۱۸۴۸ء میں دلی کالج کے ایک استاد سید محمد نے جاری کیا۔ یہ ایک ماہ میں دو بار شائع ہوا کرتا تھا۔[۳] اس رسالہ کا ذکر مسٹر جے۔ نٹراجن نے اپنی کتاب (HISTORY OF INDIAN JOURNALISM) میں کیا ہے جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی ہے۔ گارساں دتاسی کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۵۲ء میں صرف

۱؎ دلی کالج میگزین۔ قدیم دلی کالج نمبر صفحہ ۱۳۶۔ ۲؎ دلی کالج میگزین۔ قدیم دلی کالج نمبر صفحہ ۱۳۶۔ ۳؎ صوبہ شمال و مغربی کے اخبارات و مطبوعات از محمد عتیق صدیقی علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ۱۹۶۲ء۔

یو پی کے بارہ شہروں میں ۴۲ چھاپے خانے تھے جن میں ۱۲ میں ہندستانی اخبارات اور رسالے چھپتے تھے۔ یکم جنوری ۱۸۵۴ء تک چھاپہ خانوں کی تعداد چالیس اور رسائل اور جرائد کی تعداد ۳۴ تک پہنچ گئی تھی۔

دہلی کے علاوہ لکھنؤ میں محمد یعقوب فرنگی محلی نے ہفتہ وار رسالہ "طلسم" ۱۸۵۶ء میں جاری کیا۔ مصنف 'اختر شہنشاہی' نے اس کا سال اجراء ۱۸۵۷ء تحریر کیا ہے۔ لیکن محمد رضا انصاری فرنگی محلی کی تحریر کے مطابق "طلسم" کا پہلا پرچہ جولائی ۱۸۵۶ء میں نکلا[1]۔ "ہندستانی اخبار نویسی" کے مصنف نے ایک اور رسالہ "سحر سامری" کا ذکر کیا ہے جس کے اڈیٹر گھیر زائن "عیاش" اور پنڈت برج ناتھ تھے[2]۔ لکھنؤ سے ۱۸۵۹ء میں منشی نول کشور نے "اودھ اخبار" جاری کیا۔ ۱۸۷۷ء میں یہ "اودھ اخبار" روزنامہ ہوگیا اور ۱۹۴۴ء میں بند ہوگیا۔ "اودھ اخبار" کی تعریف سرسید نے بھی "تہذیب الاخلاق" میں کی ہے[3]۔ اس کے اڈیٹروں میں پنڈت رتن ناتھ "سرشار" اور مولانا عبدالحلیم "شرر" لکھنوی رہے ہیں۔ ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ سے "اودھ گزٹ" مسٹر جیکب نے جاری کیا اور منشی گنگا پرشاد کو اس کا مدیر بنایا۔ "اودھ گزٹ" کے مالک مسٹر جیکب نے "دیوان گلدستہ" کے نام سے شعر و سخن کا ایک اور رسالہ بھی ۱۸۶۰ء میں شائع کیا۔ لکھنؤ سے ایک اور مشہور اخبار "کارنامہ" یکم جنوری ۱۸۶۵ء میں جاری ہوا جو ۴۲ سال تک جاری رہ کر ۱۹۰۷ء میں بند ہوگیا۔

حیدرآباد میں علمی رسالوں کا آغاز ۱۸۵۹ء میں ایک طبّی رسالہ کے اجراء سے ہوا۔ ۱۹۰۰ء سے قبل حیدرآباد سے شائع ہونے والے کم از کم چھ رسالے ایسے ہیں جو قابل ذکر ہیں۔ ان میں سب سے پہلا "مخزن الفوائد" ہے جو ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا۔ اس کے اڈیٹر مولوی سید حسین بلگرامی المخاطب بہ نواب عماد الملک مرحوم تھے۔ یہ ریاست حیدرآباد میں ناظم تعلیمات تھے۔ اس رسالہ میں سائنس اور جدید موضوعات پر مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اس کے مضامین لکھنے والوں میں نواب مشتاق حسین "وقار الملک"، نواب مہدی علی خاں (محسن الملک) اور نواب عماد الملک وغیرہ شامل تھے۔

حیدرآباد ہی سے منشی محمد مشتاق مالک مطبع علوم و فنون نے ۱۸۸۲ء میں دو رسالے جاری کیے ان دونوں کے وہ خود ہی اڈیٹر تھے۔ ان میں ایک رسالہ کا نام معدن تھا جس میں تجارت، صنعت و حرفت، باغبانی اور زراعت وغیرہ سے متعلق مضامین شامل ہوتے تھے۔ یہ رسالہ چار سال تک جاری رہ کر بند ہوگیا۔ دوسرا رسالہ "مذاق سخن" تھا جو ادبی موضوعات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ اس میں ہندستان کے مختلف شعرا کی طرحی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ ۱۸۸۰ء میں رسالہ ادیب المخبر اخوان الصفا حیدرآباد کی جانب سے شائع ہوا۔ اس کے اڈیٹر ملا عبدالقیوم تھے۔ دراصل یہ رسالہ انجمن مذکور کا آرگن تھا۔ حیدرآباد سے ایک اور اہم رسالہ حسن اگست ۱۸۸۸ء میں جاری ہوا جس کے اڈیٹر حسن بن عبداللہ تھے جن کو عماد نواز جنگ کا خطاب ملا تھا۔ یہ رسالہ ہر اچھے مضمون پر ایک اشرفی انعام میں دیا کرتا تھا۔ اس کے انعام یافتہ مضامین میں "النظر فی التاریخ" از خواجہ غلام الثقلین، عربوں کی سویلیزیشن کی تاریخ از محمد یوسف علی، کتب خانہ ہائے اسلامی از محمد شبلی نعمانی اور سلطان محمد خاں ثانی اور قسطنطنیہ کی فتح از عبدالحلیم شرر وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس رسالہ میں تاریخی مضامین کے علاوہ ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ جیسے علم اللسان از سید علی بلگرامی، ہندستان کے حیوانات کی تاریخ از ادمیر، آواز اور اس کی کیفیت از محی الدین حسن خاں وغیرہ۔

۱۸۹۶ء سے ایک اور رسالہ افسر شائع ہونا شروع ہوا۔ ابتدا میں اس کے اڈیٹر محب حسین تھے۔ بعد میں مولوی عبدالحق (بابائے اردو) اس کے اڈیٹر ہوگئے۔ پہلے یہ رسالہ فوج سے متعلق تھا اور صرف فوج ہی سے متعلق مضامین اس میں شائع ہوتے تھے۔ لیکن ۱۹۰۰ء سے اس میں علمی

---

[1] آجکل دہلی جلد ۹۔ شمارہ ۱۱۔ جون ۱۹۵۱ء۔ [2] ہندستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد۔ از محمد عتیق صدیقی علی گڑھ، ص ۳۱۶
[3] تہذیب الاخلاق۔ ج ۴ شمارہ ۹۔

اور ادبی مضامین بھی شائع ہونے لگے۔

۱۹۰۰ء کے بعد کے اہم رسائل میں دکن ریویو جس کے اڈیٹر مولانا ظفر علی خاں تھے، ذخیرہ از ہوش (جو بعد میں نواب ہوش یار جنگ ہوگئے تھے) اور معلم نسواں جس کے اڈیٹر محب حسین تھے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تمام رسائل کو بلند پایہ ادیبوں اور مصنفوں کا تعاون حاصل تھا۔

اردو زبان میں خواتین کے لیے مخصوص رسائل کا اجرا انیسویں صدی عیسوی کے اواخر سے شروع ہوا۔ ۱۸۸۰ء میں لکھنؤ سے رفیق نسواں کے نام سے عورتوں کا پہلا رسالہ جاری ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں فرہنگ آصفیہ اور لغات النساء کے مؤلف سید احمد دہلوی نے اخبار النساء نکالا۔ لاہور سے منشی محبوب عالم نے شریف بیوی کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی اور محمدی بیگم نے عورتوں کا مشہور رسالہ تہذیب نسواں ۱۸۹۸ء میں لاہور سے جاری کیا۔ ۱۹۰۸ء میں علامہ راشد الخیری نے خواتین کے لیے دہلی سے ماہنامہ عصمت جاری کیا۔ ۱۹۱۱ء میں علامہ راشد الخیری نے ایک اور پرچہ تمدن نکالا جس میں خواتین کے حقوق کی حمایت ہوتی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں دہلی سے جوہر نسواں نکلا جس کی مدیروں میں عزیز فاطمہ اور آمنہ نازلی وغیرہ شامل تھیں ان ہی دنوں صدائے نسواں نام سے ایک رسالہ امت الکریم نے نکالا جن کی سرپرست بیگم مولانا محمد علی جوہر تھیں۔ بانی گرلز کالج مسلم یونیورسٹی شیخ عبد اللہ مرحوم نے خواتین کے لیے علی گڑھ سے ایک ماہنامہ خاتون کے نام سے ۱۹۰۴ء میں جاری کیا۔ ۱۹۲۹ء میں میرٹھ سے خورشید اقبال حیا میرٹھی کی ادارت میں ماہنامہ خاتون مشرق جاری ہوا۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والے خواتین کے رسالہ معلم نسواں کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے

انیسویں صدی کے اواخر میں دو ادبی رسالے مخزن اور زمانہ نکلنے شروع ہوئے۔ مخزن کو لاہور سے سر شیخ عبد القادر نے اپریل ۱۹۰۱ء میں جاری کیا تھا اور "زمانہ" کانپور سے منشی دیا نرائن نگم کی ادارت میں ۱۹۰۳ء سے جاری ہوا۔ زمیندار مولانا ظفر علی خاں کے والد سراج الدین احمد نے ایک ہفتہ وار ادبی رسالہ کی صورت میں نکالا۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے زمانہ میں یہ روزنامہ ہوگیا یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی سے مولانا محمد علی جوہر ہمدرد اور لکھنؤ سے وحید الدین سلیم مسلم گزٹ اور کلکتہ سے مولانا ابو الکلام آزاد الہلال نکالا کرتے تھے۔ اسی دوران الہ آباد سے دو ادبی رسالے ادیب اور العصر نکلے۔

علی گڑھ سے سرسید احمد خاں نے مارچ ۱۸۶۶ء میں ہفت روزہ اخبار سائنٹفک سوسائٹی جاری کیا جس کا نام بعد میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ہوگیا دسمبر ۱۹۲۰ء تک یہ اسی نام سے شائع ہوتا رہا قیام یونیورسٹی کے بعد ۱۹۲۱ء میں اس کا نام تبدیل کرکے "مسلم یونیورسٹی گزٹ" کردیا گیا اور آج تک یہ جریدہ اسی نام سے شائع ہو رہا ہے۔ ۱۸۷۰ء میں سرسید ہی نے علی گڑھ سے ایک اور رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ ۱۸۷۶ء تک یہ پابندی سے نکلتا رہا۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفہ کے لیے اس کی اشاعت مسدود ہوتی رہی مارچ ۱۸۹۷ء میں اس کی انفرادی حیثیت ختم ہوگئی اور یہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ضم ہوگیا۔ اس میں سیاسی، اخلاقی اور مذہبی مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جاری ہونے والے ۱۳ رسائل کی جلدیں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہیں۔ "ریاض نور" کے نام سے ایک رسالہ ملتان (مغربی پنجاب) سے جاری ہوا۔ اس کی جلد نمبر ۴ اور ۵ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہیں جو علی الترتیب ۱۸۵۴ء اور ۱۸۵۵ء میں شائع ہوئیں۔ کتب خانہ میں موجود شماروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ نہایت پابندی سے شائع ہوتا رہا اس حساب سے اس کا اولین شمارہ جنوری ۱۸۵۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے قبل بنگال اور یوپی سے بہت سے علمی رسائل جاری ہوئے لیکن ایسے رسالے اب بہت ہی نایاب و کمیاب ہیں۔

انیسویں صدی کے مزید وہ رسالے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں ان میں لاہور سے شائع ہونے والا قدیم ترین رسالہ "کوہ نور" ہے جو ۱۸۵۵ء میں جاری ہوا تھا لاہور سے شائع ہونے والے ایک اور رسالہ اشاعۃ السنۃ النبویہ" جو ۱۸۷۰ء میں جاری ہوا اس کی بھی کچھ جلدیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ علامہ ریاض خیرآبادی نے گورکھپور سے ۱۸۷۲ء میں ریاض الاخبار نام سے ایک جریدہ جاری کیا جس کی ایک جلد کے کچھ شمارے بھی موجود ہیں۔ اودھ پنچ جو ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ

سے جاری ہوا تھا اس کی جلد ۱۶، ۱۷، ۱۰۱ اور ۲۳ نیرنگ خیال، تحفہ عشاق،
آزاد، حسن ادب، انتخاب اور روشنی وغیرہ جرید ے بیک وقت کئی جگہ سے جاری ہوئے
ان کی بھی کچھ جلدیں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں
موجود ہیں۔ نظام الملک نام کا ایک رسالہ ۱۸۸۴ء میں مرادآباد سے شائع
ہونا شروع ہوا جس کی جلد ۱۲ اور ۱۳ بھی موجود ہیں۔ بہار سے شائع ہونے والے
انیسویں صدی کے رسائل میں سے چار جریدوں کی کچھ جلدیں موجود ہیں جن
میں سے بانکی پور سے الپنچ کے نام سے ایک رسالہ ۱۸۸۵ء میں جاری ہوا جو
بظاہر اودھ پنچ کے طرز کا جریدہ تھا۔ اس کے علاوہ الہادی (۱۸۹۶ء) اور
پٹنہ سے تحفہ حسنیہ (۱۸۸۷ء) اور اصلاح (۱۸۹۰ء) میں جاری ہوئے۔
ان تینوں رسالوں کا رجحان مذہبی تھا قنوج سے گلزار خلد نام سے ایک
ماہنامہ جاری ہوا۔ اس کی پانچ جلدیں بھی کتب خانہ میں موجود ہیں۔ لیکن
اس کے کسی بھی شمارہ پر جلد نمبر اور شمارہ نمبر درج نہیں ہے اس لیے یہ کہنا
مشکل ہے کہ اس کا آغاز کس سال ہوا۔ بہر حال ۱۸۸۵ء کی جلد مولانا آزاد
لائبریری میں موجود ہونے کی صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۸۵ء
سے قبل یہ رسالہ جاری ہوا ہوگا۔ ۱۸۹۶ء میں شاہجہاں پور سے ایک ماہنامہ
ارمغان نام سے جاری ہوا۔ اسی نام کا ایک اور رسالہ دہلی سے بھی ۱۹۳۲ء
میں جاری ہوا۔ حیدرآباد کے رسالہ حسن کی جلدیں بھی مسلم یونیورسٹی کے
کتب خانہ میں موجود ہیں اس رسالہ کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس کی جلدیں
جو ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۴ء کی مدت میں شائع ہوتی رہیں وہ بھی اس کتب خانہ میں
دستیاب نہیں۔

ایک ہی نام کے کئی کئی رسالے بھی جاری ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو
مختلف مقامات سے نکلے لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی شہر سے مختلف زمانوں
میں ایک ہی نام کے کئی رسالے شائع ہوئے۔ مثلاً آزاد نام کے ۴ آفتاب ۴،
آئینہ ۲، آہنگ ۲، ادب ۲، ادیب ۴، اردو ۳ اور اردو ادب ۲۔

اکثر ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک ہی رسالہ کے مقامات اشاعت
بدلتے رہے ہیں۔ مثلاً دلگداز، اردوئے معلیٰ، نگار اور عصر جدید وغیرہ۔ ان
میں دلگداز لاہور، حیدرآباد، لکھنؤ اور اورنگ آباد سے شائع ہوا۔ اردوئے
معلیٰ علی گڑھ اور رام پور۔ نگار بھوپال، لکھنؤ اور رام پور، کراچی سے،
عصر جدید میرٹھ، مالیر کوٹلہ (پنجاب) اور لکھنؤ سے شائع ہوئے۔ ایک ہی

رسالے کے ناموں کی تبدیلیوں سے واقفیت بھی نہایت ضروری ہے۔ جیسے
محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کا نام تبدیل ہو کر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ
گزٹ ہوا اس کے بعد یہ علی گڑھ منتقل ہوا اور اب علی گڑھ میگزین ہے
اخبار سائنٹفک سوسائٹی کے پہلے شمارہ ہی سے اس کا نام انگریزی میں
علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھی شائع ہوتا رہا۔ جلد ۱۲ شمارہ ۱۲ (جون ۱۸۷۷ء)
سے اس کا اردو نام اخبار سائنٹفک سوسائٹی حذف کر دیا گیا اور علی گڑھ انسٹی
ٹیوٹ گزٹ ہی اردو زبان میں بھی لکھا جانے لگا۔ ۵ مئی ۱۸۹۱ء سے ہر شمارہ
کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی شائع ہونے لگا۔ جو جولائی ۱۸۹۴ء سے گزٹ سے نکل
کر علاحدہ رسالہ کی شکل میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کے نام سے
شائع ہونے لگا۔ سرسید کے انتقال کے بعد مئی ۱۸۹۸ء میں یہ گزٹ محمڈن
اینگلو اورینٹل کالج میں ضم ہو گیا۔ لیکن فروری ۱۹۰۱ء میں نواب محسن الملک
نے اسے جداگانہ حیثیت سے پھر جاری کیا دسمبر ۱۹۲۰ء تک یہ اسی نام سے
شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۲۱ء میں اس کا نام تبدیل کر کے مسلم یونیورسٹی گزٹ
کر دیا گیا جو آج تک اسی نام سے شائع ہو رہا ہے۔ جلد ۱۲ شمارہ ۲۳
(۵ مئی ۱۸۷۷ء) سے اس میں رسالہ "مودگرلس" ضم کر دیا گیا
جسے سرسید احمد خاں کے ایک محب خاص بجنور سے نکالا کرتے تھے۔

۱۸۹۰ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق بھی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں
شامل کر دیا گیا۔ ساتھ ہی گزٹ کی جلدوں کا پہلا سلسلہ ختم کر کے دوبارہ سلسلہ
جدید جلد اول سے شروع کیا گیا اس کا وقفہ اشاعت ہفت روزہ تھا اکتوبر
۱۹۲۰ء میں ۱۳ غیر معمولی اشاعتیں شائع ہوئیں۔ اس دوران یہ ہفتہ میں تین بار
شائع ہوا۔ ۵ جنوری ۱۹۲۱ء سے اس کا وقفہ اشاعت پھر ہفت روزہ ہو گیا۔ جلد
۱۱ میں شمارہ ۱۰ کے بعد شمارہ ۱۹ دیا گیا ہے لیکن تاریخ اور صفحات کی ترتیب سلسلہ وار
ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شمارہ ۱۹ کا اندراج غلط ہے۔ اس کو شمارہ ۱۱ ہونا
چاہیے اس طرح جلد ۲۳ میں شمارہ ۹۹ کے بعد شمارہ ۱۰۱ درج ہے حالانکہ
تاریخ اشاعت اور صفحات کی ترتیب سلسلہ وار ہے یعنی یہاں بھی شمارہ ۱۰۱
کے بجائے شمارہ ۱۰۰ ہونا چاہیے۔ غیر معمولی اشاعتوں پر جلد نمبر اور شمارہ درج
نہیں ہے اس طرح ۱۹۳۵ء کے رسالوں پر بھی جلد نمبر درج نہیں ہے۔

ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اردو رسائل کا اجرا اس بات کی
غمازی کرتا ہے کہ ان علاقوں میں نہ صرف یہ کہ زبان اردو داں طبقہ معتدبہ

تعداد میں موجود تھا بلکہ اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان رسائل کی وہاں کھپت بھی ممکن تھی۔ آسنسول (بنگال) جاورہ (مدھیہ پردیش) جھالرا پاٹن (راجستھان) اور ویلور (تامل ناڈو) جیسے مقامات سے اردو رسائل کا اجرا اردو کی وسیع تر مقبولیت کو ظاہر کرتا ہے جہاں بظاہر اردو داں طبقہ محدود تعداد میں سمجھا جاتا رہا ہے بہرحال یوپی، بہار، پنجاب، حیدرآباد، کشمیر، بمبئی، جیسے مقامات سے اردو رسائل بکثرت شائع ہوتے رہے ہیں۔ جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان علاقوں میں اردو عوام کی مقبول اور محبوب زبان ہے۔

★

سراب ——— (صفحہ ۲۵ کا بقیہ)

اور ——— اور وہ بری طرح گھبرا گئی۔ آنکھوں میں مایوسیوں کا سمندر امڈ آیا غم سے آواز رندھ گئی۔

"آپ ——— آپ کون ہیں؟ میں نے آپ کو کب پکارا تھا"

کب پکارا تھا۔ آپ کو کب" اس کی آواز دھیمی ہوتی جارہی تھی، وہ منھ ہی منھ میں بڑبڑاتی ہوئی چلی جارہی تھی اور وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

★

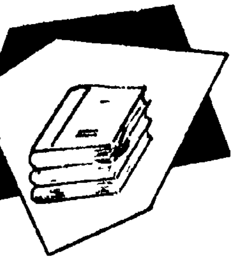
مغل آرٹ کے آخری باکمال مصوّر۔ (صفحہ ۳۷ کا بقیہ)

عبدالصمد یہ کیا ہے؟ گلاب ہے جہاں پناہ، اور ہم کیا سالے ہیں؟ ہم تو خوشبو بناتے ہیں جہاں پناہ"———

حقیقت یہ ہے کہ چودھری سمیع الزماں نے ساری زندگی گلاب کی خوشبو کی تصویر کشی میں گزاری۔ وہ فن مصوّری کے صحیح مفس تناسی اور مغل آرٹ کے آخری صاحبِ کمال مصوّر تھے۔ انھوں نے جس قدر تصاویر بنائی ہیں وہ اپنے رنگ و روغن، دلکشی و رعنائی، صفائی و پاکیزگی، جمال و کمال اور نزاکت و نفاست کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں اور مغل آرٹ کا نادر روزگار مرقع ہیں۔ ان کی تصویریں انگلینڈ، ترکی اور دیگر ممالک کے آثار قدیمہ سے متعلق سرکاری عجائب خانوں اور ذاتی عجائب گھروں میں آج تک ان کی فنی صلاحیتوں کی یاد دلا رہی ہیں افسوس کہ ایسے ملک کے ایسے ایسے گوہر گراں مایہ کی ہم لوگ اب تک کوئی شایان شان یادگار نہ قائم کرسکے ہیں

★

نقد و تبصرہ



(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

آہنگ خیال

شاعر:- حیات وارثی   سنہ اشاعت - ۱۹۶۳ء
قیمت پانچ روپے   صفحات ۸۰ صفحات
ناشر:- کل ہند، ہندی اردو سنگم، لکھنؤ ۳

حیات وارثی لکھنؤ کے جانے پہچانے شاعر ہیں ان کی شرکت سے کل ہند مشاعرہ کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے لگ بھگ تیس سال سے اردو شاعری کی خدمت کر رہے ہیں۔ حیات وارثی کو باصلاحیت شاعر تسلیم کرنے کے لیے صرف اسا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ سراج لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سراج اور مضطر' دبستان لکھنؤ کے آخری جھلملاتے ہوئے چراغوں میں تھے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ لکھنوی شاعری کی منفرد خصوصیات اپنے تمام تر التزامات کے ساتھ آج بھی جلوہ گر ہیں اس کے ثبوت کے لیے 'آہنگ خیال' کو پیش کیا جا سکتا ہے

زیر تبصرہ مجموعہ چار نظموں اور چھیالیس غزلوں پر مشتمل ہے جس کی ابتدا اثر لکھنوی، ابر احسنی گنوری اور ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کے تعارف، تبصرے اور جائزے سے ہوئی ہے اس کے بعد خود شاعر نے 'اندیشہ فکر' کے عنوان سے فن شاعری کے متعلق اپنے تاثرات سپرد قلم کیے ہیں۔

'آہنگ خیال' کے مطالعے کے بعد حیات وارثی کے فن کے متعلق یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کا مزاج شعری، قدیم و جدید نظریۂ فن کے حسین امتزاج کا ایک اچھا نمونہ ہے طرز ادا میں جدت، انداز بیاں میں ندرت، لہجے میں تیکھا پن، تخیل میں برجستگی، زبان کی شگفتگی اور بے ساختگی، اس مجموعۂ کلام کی مجموعی خصوصیات ہیں۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ امید ہے کہ ادبی و شعری حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر فضل امام

شعاؤں کی صلیب

مصنف کرامت علی کرامت
ناشر ساہتیہ پبلیکیشنز بخشی بازار کٹک ۱

یہ کرامت علی کرامت کا شعری مجموعہ ہے۔ پروفیسر کرامت کے اشعار خوبصورت اور رنگین ہونے کے ساتھ ساتھ قاری کو دعوت فکر و نظر بھی دیتے ہیں۔

کرامت علی صاحب علم ریاضی کے پروفیسر ہیں اور کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں ان کا رنگ شاعری منفرد ہے اور ان کے وسیع مطالعہ کی جھلکیاں ان کے کلام میں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے اڑیا، بنگالی اور ہندی کی دلکش نظموں کو اردو کا شعری جامہ پہنا کے دیگر زبانوں کے شعرا کے جذبات سے ہمیں روشناس کرانے کی جو سعی کی ہے وہ یقیناً لائق تحسین ہے کرامت صاحب نئی نسل کے نقادوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے فیشن زدہ جدیدیت کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے۔ کرامت صاحب کی تنقیدی تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علم ریاضی کے پروفیسر ہیں۔ فن شاعری کا تعلق دل سے ہے، لیکن وہ شاعری کو بھی علم ریاضی کے اصولوں سے جانچتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ وہ خود بھی اپنے گداز دل کی داستان کو جب شعری جامہ پہناتے ہیں تو دوسرے شعرا سے مختلف دکھائی نہیں دیتے پھر بھی نقد و تبصرہ کے ساتھ ساتھ وہ فن شعر گوئی کا دامن نہ صرف مستقل مزاجی سے پکڑے ہوئے ہیں بلکہ اس سلسلے میں خوب سے خوب تر کی تلاش میں منہمک بھی رہتے ہیں۔

کرامت صاحب کسی خاص نظریے کے ڈھنڈورچی نہیں ہیں اور نہ چند جامد اصولوں کی تبلیغ کرتے ہیں بلکہ وہ زندگی کے حقائق کو اپنی شاعری کے ذریعے منظر عام پر لاتے ہیں ان کی شاعری کا موضوع محدود نہیں ہے۔ ان کے کلام میں رنگا رنگی ہے جس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو سکتا ہے۔

میں کھیلتا ہوں اس سے مگر جانتا ہوں یہ
اک دن مجھے ڈسے گا ہی دوستی کا سانپ

حیات ہم کہہ رہے ہوس کو وہ اک کڑی ہے تباہی کی
لقب جسے موت کا دیا ہے وہ ایک قدم ہے زندگی کا

حسن مطلق تو ازل ہی سے تھا جلوہ اندوز
کھل سے واقف تھا مگر کون بشر سے پہلے؟

یہ حوصلہ ہے ہمارا کہ اپنے ہاتھوں سے
ساکے پھونک دیا ہم نے آشیانے کو

دل کی چبھن، نظر کی خلش اور جگر کا سوز
سوغات ہیں یہ سینہ فگاروں کے واسطے

لیے چراغ جستجو، میں پھر رہا ہوں چار سو
کہ آدمی کو ڈھونڈنا ہے آدمی کے شہر میں

شعور ذات میں احساس کائنات کا عکس
کوئی بتائے کہ اس کے سوا خودی کیا ہے

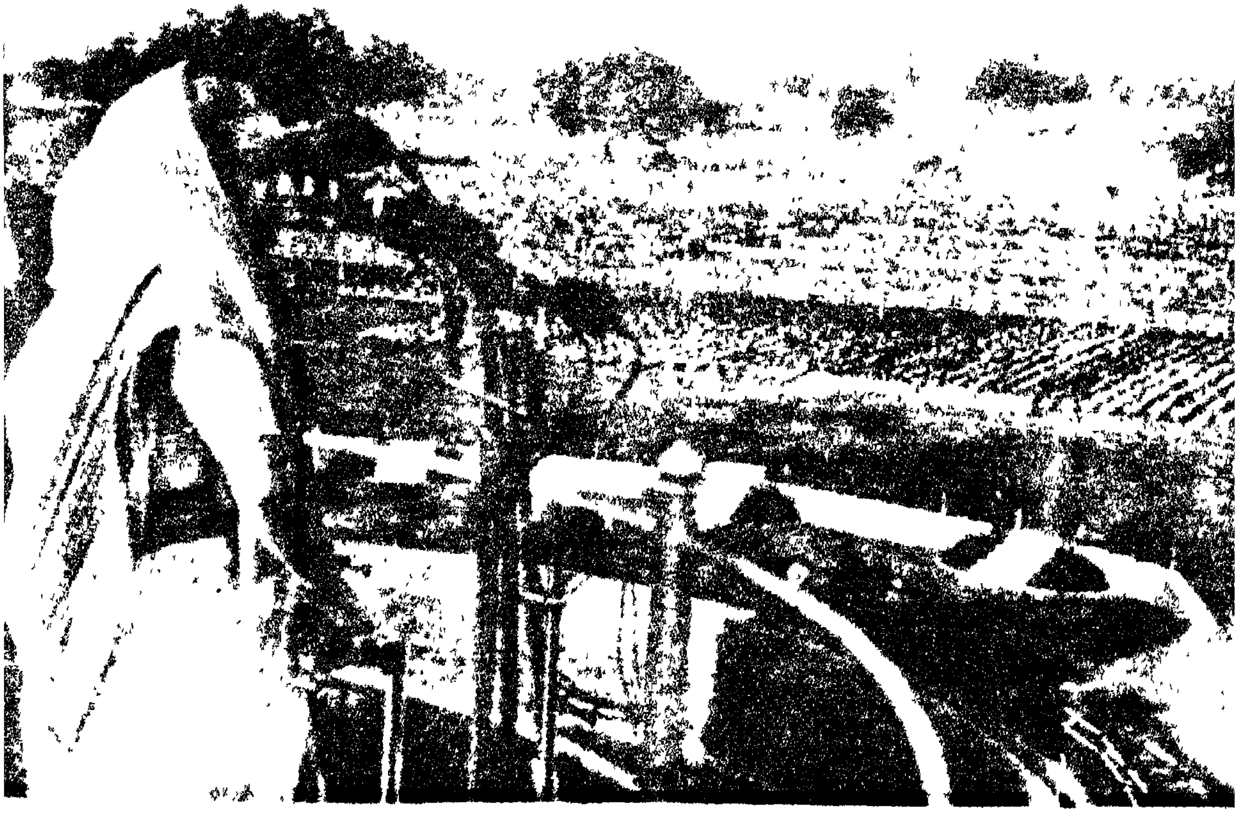
ان کی نظمیں "غالب اور نئی نسل"، "جاگے" اور "بھوک اور کلا" خاص طور پر پسند کی جائیں گی۔ ان نظموں کے مطالعے سے ان کی نظم نگاری کی صلاحیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ شعاؤں کی صلیب ایک کامیاب شعری مجموعہ ہے۔

قمر صدیقی

★

Regd No LW/NP. 17



وزیر اعظم، شریمتی اندرا گاندھی ۱۵ اگست ۱۹۷۴ء کو لال قلعہ دہلی کی فصیل سے قوم کو خطاب کر رہی ہیں


نیا دور
اکتوبر ۱۹۷۴ء
۵۰



گاندھی جی کی چند قیمتی یادگاریں

نیا دور

جلد ۳۰ | نمبر ۷

اکتوبر ۱۹۷۴ء

ایڈیٹر خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

منتظم ستیہ پرکاش بھٹناگر

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

قیمت فی شمارہ پچاس پیسے
زر سالانہ پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ سپرنٹنڈنٹ انفارمیشن (سی) ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ
دفتر ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

ملک بھر میں ۲ اکتوبر کو گاندھی جینتی ہر سال کی طرح اس سال بھی سادگی اور پُروقار طریقے سے منائی جائے گی اور اس موقع پر قوم کے باپو کو گلہائے عقیدت پیش کیے جائیں گے۔ اسی دن ۱۰۵ سال قبل ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو ہمارے جنگ آزادی کے سپہ سالارِ اعظم اور ملک کے نجات دہندہ نے کاٹھیاواڑ کے ایک علاقے پوربندر میں جنم لیا تھا۔ گاندھی جی دورِ حاضر کی وہ عظیم المرتبت شخصیت ہیں جنھوں نے ظالم اور طاقتور حکومتوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے دنیا کے مظلوم نہتے اور بےکس عوام کو عدمِ تشدد کا راستہ دکھایا۔ یہ گاندھی جی ہی کی سیاسی بصیرت اور سوجھ بوجھ تھی جس نے دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ وہ دنیا کے ایک عظیم ترین سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست سماجی مصلح اور روحانی مفکر بھی تھے۔ انھوں نے سیاست کو صداقت اور مادیت کو روحانیت کی اساس دے کر دنیا کی رہنمائی کی۔ عدم تشدد ان کا نصب العین تھا اور سچائی، سادگی اور بے لوث خدمت ان کا دین و ایمان۔ ان کا قول و عمل بلکہ سارا کردار عدیم المثال تھا۔

ہمارا ملک اس وقت معاشی مشکلات کے دور سے گزر رہا ہے۔ اتر پردیش بھی اس صورت حال سے دوچار ہے۔ قحط، آبپاشی کے لیے پانی [illegible] اور دوسری طرف ضروریاتِ زندگی کی قلت اور گرانی نے زبردست مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ اس بحران پر قابو پانے اور ان مشکلات کو دور کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ پیداوار زیادہ سے زیادہ بڑھائی جائے، امن و امان برقرار رکھا جائے، ایمانداری، فرض شناسی اور عوام کی خدمت کے سچے جذبے سے کام لیا جائے، چھوٹے سے چھوٹا کام اپنے ہاتھ سے انجام دینے میں کوئی عار نہ سمجھا جائے جو گاندھی جی کی تعلیم ہے۔ ہماری موجودہ مشکلات اور دقتیں اندولنوں، ایجی ٹیشنوں اور آئے دن کے بندوں سے دور نہیں ہو سکتیں۔ ان حربوں سے مشکلات میں اضافہ ہی ہو سکتا ہے کیوں کہ اس نازک موقع پر اگر اندولن شروع کیے جاتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ضروری اشیاء کی پیداوار اور ان کی تقسیم کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا، آمد و رفت اور نقل و حمل کے ذرائع مسدود ہو جائیں گے، بدنظمی پھیلے گی، سماج دشمن عناصر سر اٹھائیں گے، ذخیرہ بازوں، منافع خوروں اور چور بازاری کرنے والوں کی بن آئے گی۔ اس طرح اصل مسائل حل ہونے کے بجائے ملک نئے نئے مسائل سے دوچار ہو جائے گا۔ احتجاج اور اندولن کے سلسلے میں گاندھی جی کا خیال تھا کہ "ایک جمہوری نظامِ حکومت میں اگر کچھ شکایات پائی جاتی ہیں تو عوام کو سرکار کی توجہ ان کی طرف مبذول کرا کے سکون محسوس کرنا چاہیے۔ اگر ان کی خواہش ہو تو وہ سرکار کو ہٹا بھی سکتے ہیں لیکن انھیں اس کے خلاف احتجاج کر کے اس کے کام میں رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیے۔" آج کی ساری بے چینی اور خلفشار کا بنیادی سبب یہی ہے کہ ہم نے گاندھی جی کی تعلیمات اور اصولوں کو بڑی حد تک بھلا دیا ہے اور اپنی ذمے داریوں سے نگاہیں موڑ کر صرف حقوق پر زور دینے لگے ہیں۔ گاندھی جینتی کے اس مبارک موقع پر ملک کے نجات دہندہ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ اپنا محاسبہ کرے اور دیکھے کہ وہ گاندھی جی کے اعلیٰ اقدار اور زریں اصول پر کس حد تک عمل پیرا ہے۔

اگر ہم حقوق کے ساتھ اپنے فرائض کا صحیح احساس رکھیں اور روزمرہ کے معاملات اور سماج کے تئیں اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنے میں خلوص، لگن اور دیانتداری سے کام لیں اور اپنے مفاد کے مقابلے میں ملک و قوم کے مفاد کو بالاتر رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ موجودہ مشکلات پر قابو نہ پایا جا سکے۔

—— ایڈیٹر

شری فخرالدین علی احمد

نئے صدر جمہوریہ



شری فخرالدین علی احمد ۱۳ مئی ۱۹۰۵ء کو دہلی میں پیدا
ہوئے۔ آپ کا اصل وطن آسام تھا۔ آپ کے والد، کرنل
... احمد کا آسام کی با اثر اور معزز شخصیتوں میں شمار ہوتا
ہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم ضلع گونڈہ (اتر پردیش) میں ہوئی۔ آپ
۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی سے پنجاب یونیورسٹی
کی میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلے
گئے جہاں انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی کے سینٹ کیتھرین کالج میں
داخلہ لیا اور ۱۹۲۷ء میں کیمبرج سے ہسٹری ٹرپی پاس
(HISTORY TRIPOS) میں گریجویشن کیا اور ۱۹۲۸ء
میں انر ٹیمپل لندن نے آپ کو بار ایٹ لا کی ڈگری دی۔
ہندوستان واپس آکر آپ نے کچھ عرصے تک پنجاب اور
لاہور میں وکالت کی مگر آپ کا زیادہ تر وقت آسام میں ہی گذرا۔
۱۹۲۵ء میں آپ انڈین نیشنل کانگریس کے ابتدائی ممبر ہوئے۔
۱۹۳۵ء میں آپ نے ایک غیر مسلم نشست سے اسمبلی کا الکشن لڑا
اور آسام کے حریف مسٹر سعداللہ کی شدید مخالفت کے باوجود
آسام اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ آپ ۳۹-۱۹۳۸ء میں آسام
کی پہلی کانگریسی وزارت (باردولی کیبنٹ) میں وزیر مال و مالیات
کی حیثیت سے شامل ہوئے اور بعض انقلابی اقدامات کر کے
ریاست کے مالیات میں دوگنا سے زیادہ کا اضافہ کر دیا۔ ۱۹۴۰ء
میں مہاتما گاندھی کے حکم پر انفرادی ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔ تحریک
آزادی میں شری احمد نے متعدد بار قید و بند کی مصیبتیں برداشت کیں۔
آپ ۱۹۴۶ء میں آسام کے ایڈووکیٹ جنرل بنائے گئے اور کچھ دنوں بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر چنے گئے۔ ۵۳-۱۹۵۲ء میں آپ راجیہ سبھا کے کانگریسی ممبر منتخب
ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں آپ نے روس جانے والے ہندوستانی وکلا کے وفد کی سربراہی کی۔ ۱۹۵۷ء میں ہندوستانی ڈیلی گیٹ کے ایک رکن کی حیثیت سے شری احمد اقوام متحدہ
تشریف لے گئے۔ ۱۹۵۷ء میں آپ نے آسام اسمبلی کے انتخابات میں بھاری اکثریت سے دوبارہ کامیابی حاصل کی اور اگلے سال ریاستی کابینہ میں بحیثیت وزیر شامل ہوئے۔ ۱۹۶۲ء
میں آپ پھر آسام اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور وزارت کے عہدے پر فائز رہے۔ آپ نے ۱۹۶۴ء میں امریکا، جاپان اور ہانگ کانگ کا اور ۱۹۶۵ء میں ملیشیا، کولمبو
کا دورہ کیا۔ ۱۹۶۶ء میں شری احمد راجیہ سبھا کے ممبر منتخب ہوئے اور ۲۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو آبپاشی اور بجلی کے وزیر کی حیثیت سے مرکزی کابینہ میں شامل ہوئے۔ ۱۹۶۷ء اور
۱۹۷۲ء کے عام انتخابات میں آپ لوک سبھا کے ممبر کی حیثیت سے آسام سے کامیاب ہوئے۔ آپ نے غیر ممالک کے متعدد کامیاب دورے کیے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں رباط کانفرنس
میں آپ نے ہندوستان کی نمائندگی کی۔ ستمبر ۱۹۷۰ء میں آسٹریلیا میں ہونے والی غذا اور زراعت کانفرنس میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت کی اور جاپان، ملایا، انگلستان کا
اور ہانگ کانگ کا دورہ کیا۔ آپ نے ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۳ء میں غذا اور زراعت کاؤنسل کے روم میں ہونے والے اجلاس میں ہندوستانی وفد کی قیادت کی اور ہندوستانی موقف کی کامیاب وکالت کی۔
بنگلا دیش میں پاکستان کے مظالم کے دوران لیبیا، عراق اور انگلستان کا دورہ کیا اور آپ نے بنگلا دیش میں پاکستان کے مظالم کے دوران لیبیا، عراق اور انگلستان کا دورہ کیا۔ حال
آپ ۱۹۶۴ء سے کل ہند کانگریس ورکنگ کمیٹی اور پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر ہیں۔ سیاست کے علاوہ کھیل کے میدان میں آپ نے زبردست دلچسپی لی ہے۔
ہی میں آپ نے صدر جمہوریہ ہند کے انتخاب میں شاندار کامیابی حاصل کی ہے۔

اکتوبر ۱۹۷۴ء



نائب صدر جمہوریہ

بی۔ ڈی جتّی

شری بسپّا دنپّا جتّی میسور کے بیجاپور ضلع میں ساولگی کے مقام پر ۱۰ر ستمبر ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم بیجاپور گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہوئی۔ راجہ رام کالج کولہاپور سے بی۔ اے کی سند حاصل کرنے کے بعد آپ نے کولہاپور کے لا کالج سے ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری لی۔

شری جتّی نے جامکھنڈی میں وکالت شروع کی اور بعد میں آپ جامکھنڈی ریاست میں وزیر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد ازاں شری جتّی اس ریاست کے وزیر اعلیٰ بھی بنائے گئے۔ شری جتّی بمبئی قانون ساز اسمبلی کے رکن نامزد کیے گئے جہاں آپ نے ریاست میسور (کرناٹک) کے ضم کیے گئے علاقوں کی نمائندگی کی۔ آپ بمبئی کے اس زمانے کے وزیر اعلیٰ شری بی۔ جی کھیر کے پارلیمانی سکریٹری ہوئے اور بعد میں انھیں کی وزارت میں ۱۹۵۲ء میں صحت عامہ و امور محنت کے نائب وزیر مقرر کیے گئے۔

ریاستوں کی از سر نو تنظیم کے بعد شری جتّی میسور قانون ساز اسمبلی کے ممبر رہے۔ آپ اصلاحات آراضی سے متعلق کمیٹی کے سربراہ بھی رہ چکے ہیں۔ آپ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک میسور کے وزیر اعلیٰ بھی رہے۔ شری جتّی ۱۹۶۲ء میں میسور قانون ساز اسمبلی کے لیے جامکھنڈی حلقۂ انتخاب سے دوبارہ ایم۔ ایل۔ اے منتخب ہونے کے بعد ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک وزیر مالیات اور ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک وزیر خوراک رہے۔

شری جتّی ۱۴ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو پانڈیچری کے لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوئے۔ پھر ۸ر نومبر ۱۹۷۲ء کو اڑیسہ کے گورنر بنائے گئے۔ نائب صدر کے عہدے کے لیے نامزد ہونے پر آپ ۲۰ر اگست ۱۹۷۴ء کو مستعفی ہوگئے اور ۳۱ر اگست کو جمہوریۂ ہند کے نائب صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔

اکتوبر ۱۹۷۴ء

مولانا عبدالماجد دریا بادی

اردو کے چند کمیاب لغات

ایک دور اردو لغت پر ایسا گزرا ہے جب اردو لغت فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ اس وقت اگرچہ اردو بھی بہ حیثیت زبان کے وجود میں آ چکی تھی پھر بھی فارسی نہ صرف سرکاری زبان کا درجہ رکھتی تھی بلکہ ہندی و علمی زبان کے لحاظ سے بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتی تھی

(۱) پرکھنے والوں کا بیان ہے کہ اردو کا سب سے پرانا لغت عہد عالمگیری کا فارسی کا مختصر لغت غرائب اللغات ہے جو ندرتاً بہت غلطی ہے اور جو ہونا چاہیے بھی تھا کیونکہ ہر فن کی ابتدائی اور بنیادی کتاب غلطی بھی ہوتی ہے اور مختصر بھی۔ بہرحال غرائب اللغات ایک عرصے تک غیر مطبوعہ رہی یہاں تک کہ سراج الدین خان آرزو کا دور آ گیا اور ان کا نوادر الالفاظ بھی تیار ہو گیا۔ خان آرزو نے غرائب کو تمام تر اپنے نام منسوب کر لیا اور اس کی خوب تفصیل و تکمیل اور بہتر اور تصحیح کر دی۔ غرائب کا سب سے قدیم نسخہ بقول ڈاکٹر عبداللہ لاہوری ۱۱۵۹ھ/۴۶-۱۷۴۵ء کا ہے۔ نوادر الالفاظ کا سال تصنیف ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء ہے۔ ان دونوں لغات کی اشاعت کا فخر بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی انجمن ترقی کو حاصل ہے۔ متوسط تقطیع اور متوسط ضخامت کے ساتھ انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان نے اسے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا ہے اور ایک پُرمعلومات اور عالمانہ مقدمہ ۴۸ صفحہ کا ڈاکٹر سید عبداللہ ایم۔اے اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی کا لکھا ہوا شامل ہے۔

غرائب اللغات کا الگ اور مستقل وجود نہیں بلکہ غرائب کا وجود نوادر میں شامل ہے (ڈاکٹر صاحب کے مقدمے سے یہ تفصیل اور معلومات ماخوذ ہیں)

نوادر کے ان صفحات پر سے تمام لغات پر سرسری نظر ڈالی۔ ان میں کل لغات کی تعداد ۴۸۰۰ ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ باوجود ڈاکٹر صاحب کی اسی محنت و قابلیت کے متن کتاب میں غلطیاں بڑی ہی کثرت سے رہ گئی ہیں۔ اور سنہ جہاں بھی درج ہیں وہاں تو تقریباً ہمیشہ ہی بدل کر بجائے سنہ ہجری کی علامت (ھ) کے عیسوی کی (ء) کی ہو گئی ہے۔

غلطیاں لازمہ بشریت ہیں اور متقدمین میں سے کوئی بھی متاخرین کی نکتہ چینی سے محفوظ نہیں رہ سکا ہے۔ اس کلیہ سے خان آرزو بھی نہیں بچ سکے ہیں حالانکہ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے وقت کے بہترین فاضل اور محقق گزرے ہیں۔ نوادر الالفاظ کے مصنف شعور تنقیدی سے بہرہ وافر رکھتے تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ کے حاشیے کثرت ہی سے نہیں بلکہ ماہرانہ بھی ہیں۔

(۲) فرہنگ اور لغت مترادفات لکھے گئے ہیں اور صد سال قبل فرہنگ جہانگیری اور فرہنگ رشیدی فارسی میں اور ان کے بعد گویا حال میں اردو میں فرہنگ آصفیہ اور فرہنگ آنند راج اور فرہنگ آثر کو بھی بے تکلف لغت ہی کے معنی میں لیا گیا ہے۔ لیکن دونوں لفظوں کے معنی میں ایک بڑا باریک فرق ہے ضرور۔ فرہنگ میں مترادفات تو بہرحال ہوتے ہیں لیکن تذکیر و تانیث اور تصرفات صرفی و نحوی وغیرہ نہیں ہوتے۔

(۳) نفائس اللغات مدون لغت اسی دور کا ہوا ہے۔ اس کی تلخیص الحص النفائس مستقل ہے اور بجائے لغت کے اسے فرہنگ کہنا بہتر ہوگا۔ ضخامت ۲۱۹ صفحوں کی اور تقطیع عام سائز کتابی ۲۰×۲۶ ہے۔ اندر اس میں نہ سنہ کا دیباچہ ہے لکھنؤ کے مطبع حسینی میر حسن رضوی کی چھپی ہوئی ہے تاریخ ٹائٹل پر درج نہیں البتہ آخر میں جو قطعہ تاریخ لکھا ہوا ہے۔ اس میں سنہ ۱۲۶۱ھ درج ہے اور ایک نثری عبارت میں سنہ طباعت یہی درج ہے یعنی ۱۸۴۵ء ہوا ہے اور یہ زمانہ نواب امجد علی شاہ اودھ

کا تھا۔ مولف نے اپنے کو میر حسن ولد میر حسین عرف میر کامل ساکن محمود نگر لکھنؤ بتایا ہے۔ اور اس کتاب کی تالیف میں اپنے کو دستِ نگر اس وقت کے دو مشہور ماہرین لغت مولوی اوحدالدین بلگرامی اور مولوی قدرت اللہ گوپاموی کا بتایا ہے۔ دیباچہ میں مناسبت لفظی کا پورا لحاظ کیا گیا ہے جیسا کہ اس وقت کے منشیوں کا دستور تھا دو ایک فقرے آپ بھی سنتے چلیئے۔

"نفیس ترین لغتے کہ متضمن معنی قبول بود حمد حکیمیست کہ گنبد گرداں
از قاموس صنعتش تو لی بیش نیست و انیس ترین کلمہ کہ منتہی الادب
اہل کنت باشد شکر علیمیست کہ صحاح ذخار را بہفت قلزم حکمتش
عینی است"

قاموس منتہی الادب کشف اللغات۔ ھفت قلزم" مشہور لغات کی جانب تلمیحات ہیں کتاب کی ظاہری حالت ویسی ہی ہے جیسے کہ ایک سو سوا سو برس پرانی کتاب کو ہونا چاہیے جا بجا کتاب کرم خوردہ ہے اور کہیں کہیں پانی کا اثر پہنچ گیا ہے۔ پھر بھی کتاب کے پڑھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔

طریق تالیف عام اور اکثر لغات سے بالکل جدا ہے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے۔ انداز تحریر لغت کا متن فرہنگ سے ملتا ہے گویا کتاب لغت نہیں بلکہ کتاب مترادفات کی ہے۔ مولف پہلے ایک کالم میں اردو لفظ دیتا ہے اور اس کے بعد دوسرا اور تیسرے کالموں میں فارسی عربی مترادفات دیتا جاتا ہے گویا ہر صفحہ میں چھ چھ کالم ہوتے ہیں دو اردو لغات کے دو فارسی کے دو عربی کے۔ کوئی عبارت سمجھانے والی نہیں بلکہ صرف فارسی عربی مترادفات کے الفاظ حفظ ہوتے جاتے ہیں۔ جدا اول وار عبارت کی تین تین سطریں نقل کی جاتی ہیں جن سے کتاب کی نوعیت پوری طرح ذہن میں آجائے گی۔

اردو	فارسی	عربی
آبخورا	آبخور	کوب و کوں
آبنوس	آبنوس	آبنوس
آبریز	آبریز	مصب الماء
آبرو	آبرو	عرض
آپ ہی مارے	خود میزند	فلاں یضرب
آپ ہی چلائی	خود فریاد میکند	فلاں یصیح

کتاب میں غلطیاں کثرت سے ہو گئی ہیں چنانچہ ایک صفحہ محض اغلاط نامہ کی صورت میں ہے۔

(۴) اسی دور کا ایک مشہور لغت میر علی اوسط رشک (شاگرد ناسخ) کا نفس اللغۃ تھا۔ رشک کی شاعری جیسی کچھ بھی ہو ان کی زباں دانی اور لغت دانی مسلم ہے یہ لغت غالباً ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۵ء میں تالیف ہوا لیکن مدت دراز تک غیر مطبوعہ رہا یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء میں منیر پریس لکھنؤ سے اس کا پہلا اڈیشن نستر کاکوروی نے اپنے ۲۱ صفحے کے مفصل عالمانہ اور دلچسپ دیباچے کے ساتھ شائع کرایا۔ یہ لغت دو کالمی صفحے کے ۱۵۰ صفحوں کی ضخامت میں آیا۔

اس کے پہلے حصے میں صرف چار حرف آئے ہیں۔

الف = ۱-۴۰ صفحہ، ب = ۴۰ - ۹۳ صفحہ

پ = ۹۳-۱۳۱ صفحہ، ت = ۱۳۱-۱۵۰ صفحہ

اور الفاظ کلی میں نے گن ڈالے جو تعداد میں ۱۳ ہوتے ہیں۔ خدا معلوم کل کتاب میں کتنے الفاظ ہوں گے۔ قیاس تو بہت زیادہ کا نہیں ہوتا۔

نمونے کے طور پر چند الفاظ مع معنی کے درج کیے جاتے ہیں:

آپس بروزن واپس ف یکدیگر و باہم - ع مابین
آپے میں آنا۔ ف بہوش آمدن و بخود آمدن
آپ ھی۔ ف خود ع بالنفس
آتا جاتا۔ ف آمدہ رفتہ
آٹھ آٹھ آنسو رونا۔ ف زار زار گریستن
بچھونا ف بستر ساط بالکسر
بحالی۔ بروزن سفالی مقابل بر طرفی بود
بحثنا۔ گفتگوے کردن
ترس۔ بروزن جرس ع رحم بالفتح

لغت نویسی کا کام اگرچہ مسلک جمہوریت کی پیروی ہے ۔۔۔ تاہم رشک نے اپنا مرتبہ اجتہادی قائم رکھا ہے اور جہاں جہاں انھوں نے جمہور سے الگ ہو کر داد انفرادیت دی ہے وہاں اپنا مرتبہ معاصرین سے منوا لیا ہے۔ ★

نیا دور

لسٹ پر سدر

غزل

پروں میں نور ہے، پرواز میں حرارت ہے
لہو ہوا میں کسی برج کی شہادت ہے

کسی کا پیار مجھے دیر تک نہ روک سکا
مرے بدن پہ ہوا کی کوئی علامت ہے

فضا میں دھنکی ہوئی روئی کے ریزے ملے
کہاں کہاں مرے احساس کی لطافت ہے

سفید برف کے خرگوش گدگدانے لگے
لطیف سردیوں میں نرم نرم حدت ہے

رگوں میں سیکڑوں برفیلی سوئیاں اتریں
مگر لہو میں ابھی تک وہی تمازت ہے

میں اپنے ہاتھوں میں اک آئینہ سا لے کر
بغور دیکھوں مری واقعی جو صورت ہے

سیاہ سانپ کے سر پہ سفید پھول کھلا
روایتوں میں بڑی پیچ دار جدت ہے

صبا کی دھوپ نہ چمکے تو گھر اجڑ جائے
شمال مندروں میں گھنٹیوں سے عظمت ہے

اکتوبر ۱۹۷۲ء

صالحہ عابد حسین

ہندستانی عورت کا محسن گاندھی



عورت کے حقوق و فرائض

گاندھی جی ان مصلحوں اور رہنماؤں میں تھے جو محض وعظ و تلقین کو قوموں کی اصلاح کے لیے کافی نہیں سمجھتے بلکہ ہر مسئلے پر عملی پہلو سے نظر ڈالتے ہیں اور اس کے حل کرنے کے لیے مناسب تدبیریں اختیار کرتے ہیں۔ انھوں نے صرف زبان و قلم سے ہندستانی عورتوں سے ہمدردی اور ان کے حقوق کی حمایت نہیں کی بلکہ ان مشکلات کا پتہ چلایا جو ان کی اصلاح اور ترقی میں حائل ہیں۔ گہری نظر سے ہندستانی سماج کی حالت کو دیکھا تو ان پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ عورتوں کو کچھ غلط قسم کے رسم و رواج کی بندشوں میں اس بری طرح جکڑ دیا گیا ہے کہ جب تک وہ ختم نہ ہوں گی نہ ان کو برابری کا درجہ مل سکتا ہے اور نہ سکھ کا سانس لینا نصیب ہو سکتا ہے چنانچہ انھوں نے دل میں عزم کر لیا کہ ان رسموں اور رواجوں کے خلاف آخری دم تک لڑیں گے۔

انھوں نے دیکھا کہ کم سنی کی شادی اور بیوہ کو زبردستی زندگی بھر بیوگی کی حالت میں رکھنے کی مذموم رسم عورتوں کو گھن کی طرح کھا رہی ہے۔ پردے کی بے جا بندشوں نے عورتوں کے جسموں ہی کو نہیں ذہنوں کو بھی قید کر لیا ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ برابری، محبت اور دوستی کا رشتہ ہونا چاہیے، وہ حاکم اور محکوم کا تعلق بن چکا ہے۔ شوہر بیوی سے اپنا ہر جائز اور ناجائز حکم منواتا ہے۔ من مانی، سختی اور ظلم کرتا ہے جس کی نہ کہیں داد ہے نہ فریاد اس لیے کہ وہ بھگوان کا روپ ہے۔ مجازی خدا ہے اور اس کی اطاعت اور خدمت عورت کا پہلا اور آخری فرض ہے۔ اس راہ میں اس کی جان بھی چلی جائے تو اس کے لیے باعث نجات ہے۔ یہ سب گاندھی جی کی باریک بین نظر نے دیکھا ان کے حساس دل نے محسوس کیا اور وہ ان جھوٹے بتوں کو توڑنے پر تل گئے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ بہت مشکل کام ہے لیکن انھوں نے سوچا کہ اگر اس رسم اور دستور پر ضربیں نہ لگائیں گے تو عورت کی آزادی اور مساوات بے معنی لفظ بن کر رہ جائیں گے۔

وہ عورت کو مرد کی ساتھی، رفیق، گھر کی ملکہ، بچوں کی محافظ، خاندان کی سردار سمجھتے تھے اور اسی حسین روپ میں اسی کا جلوہ دیکھنا چاہتے تھے۔ خدمت اور محبت اس کے دل کے ساگر کی لہریں ہیں اس کے خزانے کے انمول موتی ہیں جن کو وہ لٹاتی ہے اور

لٹاتی رہے گی۔ مگر دل کے اندر سے ابھرنے والے ان جذبوں کو وہ اپنی خوشی سے، اپنی دل کی مسرت اور سکون کی خاطر لٹائے — اس لیے نہیں کہ وہ کسی کی باندی ہے اور ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ جو کام مجبوری سے کسی کی زبردستی سے کیا جائے اس کی کیا اہمیت کیا قدر ہو سکتی ہے۔؟

میاں بیوی کی حیثیت سے مرد اور عورت کا آپس میں کیسا سلوک ہونا چاہئے؟ اس سلسلے میں کہتے ہیں:۔

"میرے نزدیک مثالی بیوی سیتا ہے اور مثالی شوہر رام، گرسیتا، رام کی لونڈی نہ تھیں یا پھر یہ دونوں ایک دوسرے کے داس تھے۔"

جو لوگ ان مہان ہستیوں سے عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور ان کی آدرش زندگی، محبت اور رفاقت کی داستان کو جانتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس چھوٹی سی مثال میں گاندھی جی نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ وہ بتانا چاہتے تھے کہ جو برابری کا سلوک رام اور سیتا میں تھا وہی ہندوستانی مرد عورت کے رشتے میں ہونا چاہئے۔

گاندھی جی عورت کو یہ حق بھی دیتے ہیں کہ سچائی کی خاطر وہ شوہر سے اختلاف کر سکتی ہے۔

"جب بیوی کو یقین ہو کہ وہ حق پر ہے اور شوہر کی مرضی کے خلاف کام کسی اعلیٰ مقصد کے لیے کر رہی ہے تو اسے پورا حق ہے کہ وہ اپنی الگ راہ چلے اور اس کے جو کچھ نتیجے ہوں انھیں خاموشی اور عاجزی سے برداشت کرے۔"

گاندھی جی کے نزدیک عورت کو پوری آزادی ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی روشنی میں عمل کرے۔ ہاں وہ یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اس سلسلے میں اگر اسے شوہر کی خفگی یا مخالفت سہارنی پڑے تو لڑے جھگڑے کر نہیں بلکہ صبر و برداشت سے اس صورت حال کا مقابلہ کرے اس لیے کہ ان کے نزدیک جو صبر کے ساتھ سچائی کا پالن کرے آخر میں اسی کی جیت ہوتی ہے۔

ہندوستانی رواجوں میں جس خراب رواج کا خود گاندھی جی شکار رہے وہ کمسنی کا بیاہ تھا اسی لیے بچپن کی شادی کے مضر اور خراب اثرات کا انھیں ذاتی تجربہ تھا اور اس رسم کے وہ حد سے زیادہ مخالف تھے۔ یوں تو کم عمری کی شادی کو وہ مرد عورت دونوں کے لیے برا سمجھتے تھے۔ انھیں اس کا بڑا دکھ تھا کہ جو زمانہ ان کی ذہنی نشو و نما کا تھا بیاہ کے بعد جنسی خواہشات کے بھنور میں پھنس کر وہ اس قیمتی وقت سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اپنی آپ بیتی تلاش حق میں اس کا ذکر انھوں نے بڑے دکھ اور شرم کے ساتھ کیا ہے:

"میرا بہت جی چاہتا ہے کہ مجھے یہ بات نہ لکھنا پڑے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کہانی کے دوران مجھے بہت سے ایسے کڑوے گھونٹ پینا ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میرا دردناک فرض ہے کہ اپنی شادی کا حال بیان کروں جو تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ جب میں اس عمر کے لڑکوں کو دیکھتا ہوں جو میری نگرانی میں ہیں تو مجھے اپنے اوپر افسوس ہوتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ انھیں مبارک باد دوں کہ وہ اس مصیبت سے محفوظ رہے ہیں جو مجھ پر پڑی تھی۔ ۔ ۔ ۔"

گاندھی جی نے ان خطروں سے بچنے کے لیے جن سے وہ خود گزرے تھے بار بار بچپن کی شادی کے برے اثرات پر زور دیا اور لوگوں کو تنبیہ کی کہ اس رسم کو جتنی جلدی مٹا سکتے ہو مٹا دو۔ وہ جانتے تھے کہ صرف قانون بنا دینے سے کوئی رسم یا رواج مٹ نہیں سکتا اس کے لیے سماجی شعور کے جاگنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ لوگ خود سمجھیں کہ یہ چیز کتنی بری ہے اور اس کے نتیجے کیسے تباہ کن ہوتے ہیں۔

اس لیے انھوں نے بار بار سمجھایا کہ لڑکے اور لڑکی جب تک سن شعور کو نہ پہنچ جائیں ان کی شادی کرنا برا ہی نہیں گناہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکی کی شادی بیس سال کی عمر میں ہونی چاہئے (اور سولہ برس سے کم میں تو کسی حالت میں نہیں کی جانی چاہئے)، اس لیے کہ کم عمری کی شادی سے ایک طرف اس کی جسمانی بالیدگی ماری جاتی ہے، دوسری طرف ذہنی اور دماغی نشو و نما میں رکاوٹ پڑتی

ہے اور یہ صرف افراد ہی کا نقصان نہیں قومی نقصان ہے۔ ایک جگہ انھوں نے کہا :۔

"بچپن کی شادی کی رسم اخلاقی حیثیت سے بھی بری ہے اور جسمانی صحت کے لیے بھی مضر ہے۔ اس لیے کہ اس سے ایک طرف ہمارے اخلاق کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور دوسری طرف جسمانی قوت گھٹ جاتی ہے۔ ایسی رسموں کی بدولت ہم خدا سے بھی دور ہو جاتے ہیں اور سوا راج سے بھی۔ جو شخص ایک بچّی کی کم سنی پر دھیان نہیں دیتا اسے خدا کا دھیان بھی نہیں آتا۔ وہ مرد جن کی باڑھ ماری جائے آزادی کی لڑائی لڑنے کے قابل نہیں رہتے اور اگر آزادی مل بھی جائے تو اسے قائم نہیں رکھ سکتے۔ سوا راج کی لڑائی کے لیے محض سیاسی بیداری کی نہیں بلکہ سماجی، تعلیمی، اخلاقی، معاشی، ہر طرح کی بیداری کی ضرورت ہے ..... "

گاندھی جی یہ بھی جانتے تھے کہ بچپن کی شادی کے برے نتیجے لڑکوں سے کہیں زیادہ لڑکیوں کو بھگتنے پڑتے ہیں۔ خاص کر اس لیے کہ لڑکی مر جائے تو رنڈوا لڑکا دھڑلے سے بیاہ رچاتا ہے۔ مگر کمسن بیوہ کو عمر بھر رنڈاپے کے نرک میں زندگی کاٹنی پڑتی ہے۔

"یہ ایشور کا بہت بڑا گناہ ہے کہ دو بچوں کے بندھن کو شادی کہا جائے اور جب نام کا پتی مر جائے تو بچاری بچی کو عمر بھر بیوہ رکھا جائے۔"

گاندھی جی بچپن کی شادی کے جتنی سختی سے مخالف تھے اتنی ہی شدّت سے بیوہ کی شادی کے حامی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستانی سماج میں بیوہ کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے اور اسے کیسی کیسی کٹھنائیاں، مصیبتیں اور ذلتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ انھوں نے بار بار اپنی تقریروں میں کہا، تحریروں میں لکھا، بات چیت میں سمجھایا کہ عورت کو بیوگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنا بہت بڑا سماجی جرم ہی نہیں اخلاقی اور مذہبی گناہ بھی ہے وہ کہتے تھے کہ بیوہ کو دوسری شادی کرنے کا بالکل اسی طرح حق ہے جس طرح رنڈوے مرد کو نیا بیاہ رچانے کا ہے۔ ایک بار انھوں نے نوجوانوں کے ایک مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا :۔

"کیا آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم اس وقت تک اپنے یا دوسروں پر حکومت کرنے قابل ہو سکتے ہیں، یا تیس کروڑ آدمیوں کی قوم کے مستقبل کی تعمیر کر سکتے ہیں جب تک کبھی ایک بیوہ کو بھی زبردستی اس کی بنیادی خواہشوں کو پورا کرنے سے روکا جائے؟ یہ مذہب نہیں لا مذہبی ہے"

اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ گاندھی جی چاہتے تھے کہ ہر عورت کو دوبارہ شادی کرنے پر مجبور کیا جائے۔ بیاہتا زندگی کو حد سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ سب جانتے ہیں کہ خود گاندھی جی نے جوانی ہی میں اپنی بیوی کی خوشی سے برہم چریہ (تجرد) کی زندگی اختیار کر کے اپنے آپ کو نفسانی خواہشوں کے چکر سے آزاد کر لیا تھا تاکہ یکسوئی سے حق کی تلاش اور آزادی کے حصول کی کوشش کر سکیں۔ وہ انسان کی روحانی ترقی کے لیے تجرّد کو بہت اہمیت دیتے تھے اور جو لوگ سچے دل سے ایسی زندگی کو اپنائیں اور اپنی نفسانی خواہشوں پر پورا قابو پا کر اپنے آپ کو کسی اعلیٰ مقصد کے لیے وقف کر دیں ان کی گاندھی جی کے دل میں بڑی قدر تھی۔ لیکن اس بات کو کہ بیوہ عورتوں کو زبردستی رنڈاپے کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جائے وہ وحشیانہ دستور سمجھتے تھے :

"میں نے بار بار کہا ہے کہ بیوہ عورت کو دوبارہ بیاہ کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی رنڈوے مرد کو۔ اپنی مرضی سے بیوگی کی زندگی اختیار کرنا ہندو دھرم میں ایک بڑی نعمت ہے لیکن زبردستی بیوہ رکھنے پر مجبور کرنا بڑی لعنت ہے۔"

گاندھی جی جب کسی کم سن بیوہ لڑکی کو دیکھتے یا اس کے بارے میں سنتے تو انھیں سخت صدمہ ہوتا اور وہ دگنے جوش سے اس لعنت کو ختم کرنے پر تل جاتے۔ اس سلسلے میں گاندھی جی نے مسلسل انتھک کوشش کی اور اس مہم میں انھیں زبردست کامیابی ہوئی۔ ہندوستان میں ایک طرف کم عمری کی شادی کا

رواج بہت کم ہوگیا ہے اور دوسری طرف بیوہ عورتوں کی شادیاں کثرت سے ہونے لگیں۔ آج یہ بات بڑی معمولی سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی سماج میں یہ ایک انقلاب عظیم تھا جس نے ہندوستانی عورت کی زندگی کو بدل ڈالا اور اسے بہت سے عذابوں سے چھٹکارا دلا دیا۔

ستی کی رسم قدیم زمانے سے ہندستان میں رائج تھی بعض عورتیں شوہر کے مرنے کے بعد اس کی لاش کے ساتھ زندہ جل جاتی تھیں یا جلا دی جاتی تھیں اور یہ عورت کی عفت اور پرستش کا ایک بیمثال ثبوت سمجھا جاتا تھا شہنشاہ اکبر نے قانوناً اس رسم کو ممنوع قرار دیا جس کی بدولت ہزاروں معصوم کم سن یا نوجوان عورتیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی تھیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے کتنی اپنی خوشی سے یہ "جوہر" کرتی تھیں اس لیے کہ قدرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ انسان کو ہر حال میں اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ بہر حال ستی کی ممانعت کا قانون بننے کے بعد بھی اکثر اس کی خلاف ورزی ہوتی رہی۔ انگریزی حکومت نے بڑی سختی سے اس قانون کو نافذ کیا پھر بھی ڈھکے چھپے اکا دکا "ستی" کے واقعات ہوتے رہے اور اب بھی کبھی کبھار یہ سننے میں آجاتا ہے کہ فلاں جگہ کوئی عورت اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ جل مری۔

ظاہر ہے مظلوموں کے حامی حق کے پرستار گاندھی جی، اس رسم کو کس نظر سے دیکھتے ہوں گے! لیکن انھوں نے "ستی" کو برا کہنے کے بجائے نئے معنی پہنائے۔ اس کی ایسی تعبیر کی جو ہندستانی عورت کے شایان شان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مردہ شوہر کے ساتھ جل مرنا ستی ہونا نہیں سچی "ستی" کے معنی ہیں کہ عورت عمر بھر اپنی آبرو کی حفاظت کرتی رہے۔ کہتے ہیں:

"ستی عفت کا جوہر ہے لیکن عفت جان دینے سے نہیں ملتی یہ تو اس طرح ملتی ہے کہ عورت اس کے لیے دن رات اپنے کو کھپاتی اور مٹاتی رہے۔"

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں گاندھی جی عورت کو عفت کی مورتی سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ عورت کو آبرو جان سے زیادہ پیاری ہوتی ہے اور وہ آخری دم تک اپنے اس بے بہا جوہر کی حفاظت کرتی ہے سوا اس کے کہ اسے بے بس و مجبور کر دیا جائے یا غلط راہ پر ڈال دیا جائے۔ وہ عورت کی عفت و عزت کا محافظ مرد کو نہیں خود اسی کو مانتے ہیں۔ بلکہ مرد نے عورت کی حفاظت کے نام پر اس کے گرد اوہام و رسوم کی جو آہنی دیواریں کھڑی کر دی ہیں، وہ ان کو توڑنا چاہتے تھے۔ اسے پردے کی قید سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ اور یہ بھی ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے عورت کو ان بیجا قیدوں سے آزاد کرا کے آزادی کی جدوجہد میں حصہ دار بنایا، اور دوسری ہزاروں راہیں اس کے سامنے کھول دیں۔

گاندھی جی کا عقیدہ تھا کہ ستونتی عورت ہر پابندی سے آزاد رہ کر بھی ہزاروں تحریصوں کے باوجود اپنی آبرو کے موتی کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔ اس سلسلے میں گاندھی جی نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اس قابل ہے کہ ہر مرد اس پر غور کرے اور اس کے معنی سمجھے اور ہر عورت اسے حرز جان بنا لے۔

"عفت کوئی ایسا پودا نہیں جسے گرم خانے میں رکھا جائے . . . . بہ زبردستی عائد کرنے کی چیز نہیں۔ اس کی حفاظت پردے کی دیواریں کھڑی کر کے نہیں کی جا سکتی۔ یہ ایسی چیز ہے جسے (عورت کے) دل کے اندر سے اگنا چاہیے عفت اور عصمت قابل قدر اسی وقت ہے جب ہر ظاہری تحریص اور ترغیب کے باوجود باقی رہے۔"

اسی لیے وہ پردے کی رسم کے بہت خلاف تھے۔ وہ پردے کو عورت کی ترقی اور خود اعتمادی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے اور اس کی توہین تصور کرتے تھے۔ ایک جلسہ میں انھوں نے عورتوں کو پردے کے پیچھے بیٹھے دیکھ کر کہا تھا:

"اس پردے کو دیکھ کر جس کے پیچھے میری سننے والیاں بیٹھی ہوئی ہیں مجھے بہت دکھ اور ذلت کا احساس ہوا میں نے سوچا ہندستان کی عورتوں کے ساتھ مرد کتنا ظلم کر رہے ہیں کہ ایک وحشیانہ رسم سے اب تک چمٹے ہوئے ہیں جو ممکن ہے شروع میں مفید ہو مگر اب تو بالکل بے کار ہے۔ بلکہ اس سے

ملک کو بہت نقصان ہو رہا ہے۔"

گاندھی جی عورت کو صحیح معنوں میں خوددار اور خود مختار اور اپنے پر اعتماد رکھنے والی، گھر گرہستی کا بوجھ سنبھالنے کے ساتھ ساتھ ملک اور قوم کی خدمت کرنے والی دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے اور کہتے تھے کہ ہندستان نہ تو اس وقت تک حقیقی آزادی حاصل کر سکتا ہے اور نہ سچی ترقی کر سکتا ہے جب تک ہندستانی عورت کو صحیح تعلیم و تربیت نہ ملے، عمل اور رائے کی آزادی نہ نصیب ہو۔ اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب اس پر سے بے جا بندشیں اٹھالی جائیں۔

گاندھی جی نے عورتوں کو جائز حقوق ملنے پر بہت زور دیا ہے مگر وہ ہر مسئلے کے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ صرف حقوق مل جانے سے کسی قوم یا کسی طبقے کی بھلائی اور ترقی نہیں ہو سکتی جب تک اسے اپنے فرائض کا بھی پورا احساس نہ ہو اور وہ انھیں دل و جان سے ادا کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اسی لیے جہاں انھوں نے عورتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی وہاں خود عورتوں کو بھی بار بار سمجھایا کہ ان کا فرض کیا ہے اور انھیں کس طرح اپنے گھر بار، بال بچوں، دیس اور سماج کی سیوا کا عظیم کام انجام دینا چاہیے۔ وہ عورت کی آزادی اس غرض سے چاہتے تھے کہ اس کے عمل کا دائرہ وسیع ہو۔ اسے پردے کی قید سے اسی لیے چھڑانا چاہتے تھے کہ وہ اپنے گھر اور باہر کے فرائض اپنے بل بوتے پر انجام دے سکے۔ وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ آزاد ہونے کے بعد ہندستانی عورت اپنے اصلی کام کو چھوڑ کر سیر و تفریح، نمود و نمائش کی زندگی کے بھنور میں پھنس کر اپنے فرض کو کیا خود اپنے کو بھول جائے۔

پرانی لکیر کے فقیر، رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑی ہندستانی عورت میں جو خامیاں جہالت اور بے جا قید و بند کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں وہ گاندھی جی کی نظر سے پوشیدہ نہ تھیں اور انھوں نے اسے ان کا احساس دلایا اور ان کو دور کرنے کی تاکید کی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ نئی نسل کی تعلیم یافتہ لڑکی میں تتلی بننے کا شوق بھی پیدا ہو رہا ہے اور کئی جگہ انھوں نے اس مسئلے پر بھی اظہار رائے کیا اور عورت کو تنبیہ کی کہ یہ راستہ وہ نہیں جس پر اسے جانا ہے۔

گاندھی جی کی نظر سے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی چھپ نہ سکتی تھی۔ اور موقع موقع سے وہ عورتوں کو بتاتے رہتے تھے کہ معمولی معمولی رسمیں اور رواج بھی برے اثرات پیدا کرتے ہیں اور جب تک وہ انھیں نہ چھوڑیں گی آزاد ملک کی آزاد شہری نہیں بن سکتیں۔ اس سلسلے میں عورت کے زیور کا شوق انھیں بہت ناگوار تھا انھوں نے عورت کو سمجھایا کہ وہ اپنے کو سونے چاندی کی ان زنجیروں سے آزاد کرے جن کو وہ اپنا سنگار اور حسن سمجھتی ہے۔ انھوں نے کہا ہے

"عورت کا اصلی زیور اس کا کیرکٹر اور پاکیزگی ہے۔ دھات اور پتھر کبھی حقیقی زیور نہیں بن سکتے۔ سیتا اور دمینتی جیسی عورتوں کی عزت ان کی بے داغ عصمت کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ ان زیوروں کی وجہ سے نہیں، جن کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ پہنتی بھی تھیں یا نہیں"

انھیں ہندستانی عورتوں کو سونا چاندی پہنے دیکھ کر اس لیے اور زیادہ دکھ ہوتا تھا کہ جس ملک میں کروڑوں آدمی پیٹ بھر کھانا اور تن ڈھکنے بھر کے کپڑے کے محتاج ہیں وہاں کچھ عورتیں زیوروں میں لدی پھریں یہ بے حسی اور سنگ دلی نہیں تو اور کیا ہے؟ اور عورت کا سنگ دل ہونا ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ ایک بار انھوں نے کہا

"اس ملک میں جہاں کروڑوں آدمیوں کو فاقہ کرنا پڑتا ہے اور سو میں سے اسّی باسیوں کو کافی غذا میسر نہیں، عورتوں کو زیور پہنے دیکھنا آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔"

گاندھی جی ان لوگوں میں تھے جن کا قول اور عمل ایک ہوتا ہے۔ دوسروں کو اپدیش دینا اور نصیحت کرنا آسان ہے، دنیا میں ہزاروں آدمی یہ کام کرتے رہتے ہیں لیکن کتنے ہیں جو اس پر خود بھی پوری طرح عمل کرتے ہوں، گاندھی جی جو کہتے تھے وہی کرتے تھے اور اپنے قریب ترین عزیزوں اور دوستوں (اور اپنے ان پیرووں سے جو ان کے ساتھ رہنے اور ان کے اصولوں پر چلنے کا عہد کرتے تھے) ان سے بھی ان اصولوں کی پابندی کراتے تھے۔ گاندھی جی کی زندگی کا ایک واقعہ سنئے جس سے یہ

ثابت ہو جائے گا کہ عورتوں سے زیور چھڑانے کا کام انھوں نے خود اپنے گھر سے شروع کیا۔

جنوبی افریقہ کے برسوں کے قیام اور وہاں کے ہندی باشندوں کی ان تھک سیوا کے بعد جب وہ واپس ہندستان آنے لگے تو لوگوں نے انھیں بہت محبت اور دکھ کے ساتھ رخصت کیا۔ گاندھی جی نے ان کو غلامی کی بھی بدتر زندگی سے نجات دلائی تھی اور اس کے لیے خود اتنے دکھ اٹھائے تھے جتنے ان سے کم لوگوں نے اٹھائے ہوں جب وہ جنوبی افریقہ سے روانہ ہونے لگے تو لوگ زار و قطار رونے لگے ان میں سے بہت سے خوشحال تاجر تھے ان لوگوں نے گاندھی جی کو بڑی محبت سے قیمتی تحفے دیے اور کستوربا کو کئی زیور بھینٹ کیے۔ گاندھی جی پیسے والوں سے روپیہ لے کر غریبوں کے فائدے کے کام بڑے شوق سے انجام دیتے تھے۔ انھوں نے یہ سب تحفے بھی اسی فنڈ میں جمع کر لیے۔ کستوربا چاہتی تھیں کہ جو زیور ان کو ملے ہیں وہ اپنی بہوؤں کے لیے رکھیں مگر بھلا گاندھی جی اپنے اصول سے ہٹ سکتے تھے ؟ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہمارے گھر میں قیمتی زیور نہیں تھے کیونکہ ہم روز بروز سادگی اختیار کرتے جاتے تھے۔ ہم سے سونے کی گھڑیاں باندھنا، سونے کی زنجیریں اور انگوٹھیاں پہننا کیسے ہو سکتا تھا انھیں دنوں میں لوگوں پر تاکید کر رہا تھا کہ زیوروں کی ہوس چھوڑ دیں پھر میں ان زیوروں کو کیسے لیتا ؟"

چنانچہ وہ سب چیزیں قومی فنڈ میں دینے کا فیصلہ کیا گیا جو باکو بہت ناگوار گزر رہی تھی ان کے اپنے زیور پہلے ہی بیچ باچ کر گاندھی جی قومی کاموں میں صرف کر چکے تھے۔ وہ عورت تھیں، ماں تھیں۔ اپنے لیے نہ سہی اپنی ہونے والی بہوؤں ہی کے لیے وہ چاہتی تھیں کہ دو چار زیور پڑے رہیں تو اچھا ہے۔ اس مسئلے پر دونوں میاں بیوی میں خوب بحث ہوئی۔ گاندھی جی نے بڑے دلچسپ انداز میں اس کا ذکر لکھا ہے۔ بیوی کا کہنا تھا۔

"تمہارے بچے زیور نہیں چاہتے نہ چاہیں۔ انھیں تم پھسلا کر جو چاہو کہلوا لو مگر میری بہوئیں جو آئیں گی، ان کو زیوروں کی ضرورت ہو گی یا نہیں ؟ کسی کو کیا خبر کل کیا ہونے والا ہے ؟

مجھ سے یہ نہ ہو گا کہ لوگوں نے جو تحفے اتنی محبت سے دیے ہیں ان کو لوٹا دوں۔"

مگر گاندھی جی پر نہ ان کی ضد کا اثر ہوا نہ رونے دھونے کا۔ ان کے پاس جواب موجود تھا:۔

"ہم ایسی بہوئیں نہیں لائیں گے جو زیوروں کی شوقین ہوں"

پھر بات ٹالنے کے لیے کہہ دیا "چلو ایسی ہی ضرورت آ پڑی تو میں اور بنوا دوں گا۔"

بیوی بھلا ان کی باتوں میں کہاں آتیں۔

"میں نے اتنے دن تمہیں خوب دیکھ لیا۔ تم نے میرے پیچھے پڑ کر میرا سارا زیور لے لیا۔ بہوؤں کے لیے تم ضرور خرید دو گے نہیں صاحب میں یہ زیور واپس نہیں ہونے دوں گی۔ اور یہ تو کہو میرا ہار واپس کرنے کا تمھیں کون سا حق ہے ؟"

گاندھی جی نے فوراً کہا:۔

"آخر یہ ہار تمھیں میری ہی خدمت کی وجہ سے تو ملا ہے یا کستوربا بھلا دینے والی تھیں ؟

اور میں نے جو تمہارے کام کی خاطر دن رات مشقّت اٹھائی وہ کسی گنتی ہی میں نہیں ؟ تم نے دنیا بھر کے مرد لا کر میرے گھر میں بھر دیے مجھے آٹھ آٹھ آنسو رلایا اور مجھے ان کی مرہم پٹی کرنی پڑی ؟"

گاندھی جی بھلا کیوں مانتے ساری دنیا کی عورتوں کو سیدھی راہ دکھانے والا مرد اپنی بیوی کو کیسے غلط راستے پر چلنے دیتا۔ وہ کستوربا کو ہدایت کرنا اپنا حق بھی سمجھتے تھے اور فرض بھی۔ یہ شوہری دھونس نہ تھی۔ اس سے تو وہ بہت پہلے توبہ کر چکے تھے۔ مگر وہ محض کستوربا کے شوہر ہی نہ تھے ایک مصلح، رہبر بھی تو تھے۔ اور وہ یہ جانتے تھے کہ جس شخص کے بیوی بچے اسی کے اصولوں کو نہ مانیں دنیا میں کوئی اس کی بات کیوں سنے گا ؟ چنانچہ انھوں نے کستوربا سے اصرار کیا کہ سب زیور قومی کام کے لیے دے دیں آگے چل کر انھوں نے لکھا ہے:۔

"مجھے آج تک اپنے اس فعل پر افسوس نہیں ہوا اور رفتہ رفتہ میری بیوی کو بھی یقین ہو گیا کہ یہ سمجھداری کا کام تھا اس نے

ہمیں بہت سی تحریکوں سے بچا لیا ... "

گاندھی جی کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ کم سے کم ہندستانی عورت کے دل میں زیور کی جو حد سے زیادہ محبت تھی وہ کم ہو گئی اور یہ بات اسکی سمجھ میں آ گئی کہ زیور سے اس کی عزت و وقار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ عورتوں میں زیور گھڑ والنے کے شوق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نہ اس وقت جائیداد میں اس کا حصہ تھا نہ باپ اور شوہر کی کمائی پر کوئی حق تھا۔ یہاں تک کہ خود اپنی جائیداد اور پیسے بھی اس کے قبضہ میں نہ رہتے تھے۔ بس زیور ہی اس کا واحد سہارا تھے۔ اس لیے اس نے شاید غیر شعوری طور پر اپنے کو اور دوسروں کو یہ یقین دلا رکھا تھا کہ زیور عورت کا حسن بھی ہے اور مرد کی شان بھی اسی میں ہے کہ اس کی بیوی زیادہ سے زیادہ زیور پہنتی رہے۔ مگر جب عورت کو سماج میں حقوق ملنے لگے، اس کی جائیداد میں حصہ ملا، خود پیسہ کمانے، اپنا پیسہ اور جائیداد اپنے قبضے میں رکھنے کا حق ملا تو زیوروں کا شوق اور اہمیت خود بخود کم ہو گئی۔

اور گاندھی جی کی زندگی کے زمانے میں تو ان کے اس اپدیش کا اثر بہت زیادہ پڑا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کسی قومی کام کے لیے گاندھی جی پیسے کے لیے اپیل کرتے تو عورتیں اپنے جسم کے زیور اتار اتار کر ان کو دے دیتی یا بھیج دیتی تھیں۔ وہ عورتیں جو ان کے ساتھ مستقل کام کرتی اور ان کی تعلیم و تربیت سے براہ راست فیض حاصل کرتی تھیں، انھوں نے تو "اوہام کی زنجیروں کو" بالکل توڑ دیا تھا اور "مائش پسندی، آرام طلبی، قیمتی ریشمی کپڑوں اور سونے چاندی کے زیوروں کے شوق سے اپنے کو آزاد کر لیا تھا۔ وہ موٹے کھدر کی سوتی ساڑھیاں پہنتی تھیں اور ملک و قوم کی سیوا کو ہی اپنا سنگار اور زیور سمجھتی تھیں۔ سہاگ کی نشانی ماتھے پر لال بندی اور ہاتھوں میں کانچ کی چند چوڑیاں ان کے لئے کافی تھیں۔

گاندھی جی کی تعلیم تو عورت کے لیے یہ تھی۔

" ہندستان کا مستقبل تمہاری گود میں پلتا ہے کہ تم نئی نسل کی پرورش کرتی ہو۔ تم چاہو تو بچوں کی ایسی تربیت کر سکتی ہو کہ وہ سادگی پسند، خدا سے ڈرنے والے بہادر مرد اور عورتیں بنیں اور چاہو تو اس طرح بھی کر سکتی ہو کہ وہ کمزور اور بزدل بنیں اور اس قابل نہ رہیں کہ زندگی کے طوفان سے لڑ سکیں۔"

جس ہستی پر ایسی عظیم ذمہ داریاں ہوں اس کی سیرت گاندھی جی انتہائی بلند دیکھنا چاہتے تھے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عورت کو بچوں کی پرورش اور تربیت ہی کے قابل سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس کی زندگی گھر کی چار دیواری ہی میں محدود رہے۔ ان کی باریک نظر اور گہرے مشاہدے نے ان پر اس حقیقت کو بھی آشکارا کر دیا تھا کہ عورت کے اندر کتنی صلاحیتیں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے عورتوں اور مردوں دونوں کو یہ بھی سمجھایا کہ عورت کے فرائض گھرداری سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمارے دیس میں اکثر۔

" عورت کا زیادہ وقت گھر کے ضروری کاموں کو انجام دینے میں نہیں بلکہ اپنے پتی دیو کی نفس پروری کا سامان مہیا کرنے اور خود اپنے بناؤ سنگار میں صرف ہوتا ہے۔ میرے نزدیک عورت کی یہ گھریلو غلامی ہمارے وحشی اور غیر مہذب ہونے کی نشانی ہے۔ میرے نزدیک رسوئی کی غلامی بھی اسی وقت کی یادگار ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ عورت کو اس بوجھ سے نجات ملے۔ عورت کا سارا وقت گھر بار کے کام میں صرف نہیں ہونا چاہیے۔"

گاندھی جی کو بھروسہ تھا کہ جب عورت قوم کی خدمت کے کام کو ہاتھ میں لے گی تبھی ملک آزاد ہوگا، ترقی کرے گا، اسی میں ایکتا۔ محبت، اہنسا کا راج ہوگا۔ انھوں نے بار بار کہا کہ عورت ستیہ (حق) اور اہنسا (عدم تشدد) کی امین ہے اور یہی اس کا اصلی جوہر ہے۔ اگر وہ اس جوہر کو پرکھ کر، اس پریم اور سیوا کے جذبے کو وسعت دے کر جو اس کی فطرت ہے، انسانیت کی بھلائی کے کام کرنا شروع کر دے تو وہ کیا نہیں کر سکتی؟ گاندھی جی نے تو یہاں تک کہا کہ دنیا کے امن کا عظیم اور بظاہر محال کام بھی اگر انجام پا سکتا ہے تو صرف عورت کے ہاتھوں۔ ان کو پکا یقین تھا کہ اگر عورت اس محبت اور ممتا کے جذبہ کو جو اُسے اپنے بچوں سے ہوتی ہے، سارے انسانوں کے لیے وقف کر دے اور مرد کی نفسانی خواہشوں کی بدولت اُسے جو سہنا پڑتا ہے، اُسے بھول جائے تو وہ بہت کچھ کر سکتی ہے کیا کر سکتی ہے خود گاندھی جی کے لفظوں میں سنیے:

"..... تو پھر وہ مرد کے برابر اس کی ماں، اس کی

پالنے والی اور اس کی خاموش رہنما کی شان سے کھڑی ہو سکے گی۔ اس میں یہ جوہر ہے کہ وہ جنگ جو دنیا کو جو امن کے آبِ حیات کی پیاسی ہے، امن کا ہنر سکھائے وہ رہنمائی کر سکتی ہے ستیہ گرہ کی راہ میں جس کے لیے کتابی علم لازمی نہیں۔ بلکہ اسی محبت کی ضرورت ہے جو سچی عقیدت اور دکھ اٹھانے کی صلاحیت سے پیدا ہوتی ہے . . . . . . "

گاندھی جی کی زندگی ہی میں تعلیم یافتہ طبقے کی لڑکیوں اور عورتوں نے آزادی کا غلط فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ اکثر لڑکیاں خودنمائی بے حجابی اور بے باکی کی حرکتوں سے مردوں کی ہوس ناک نگاہوں اور اشارہ بازیوں کو دعوت دیتی ہیں۔ ایک بار انھوں نے ایک لڑکی کے خط کے جواب میں کہا تھا،

" مجھے اندیشہ ہے کہ ماڈرن لڑکی خود بھی درجن بھر رومیو کی جولیٹ بننا چاہتی ہے . . . . . . وہ ہوا پانی سردی گرمی سے بچنے کے لیے کپڑے نہیں پہنتی ہیں بلکہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے اپنی خوب صورتی بڑھانے کے لیے وہ چہرے پینٹ کرتی ہیں تاکہ نمایاں نظر آئیں . . . عام تشدد کا ہتھیار ایسی لڑکیوں کے لیے نہیں ہے . . . "

دو ایک اور خطوں میں بھی انھوں نے اس مسئلے پر روشنی ڈالی کہ اگر لڑکے اور مرد لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کریں یا بدتمیزی پر اتر آئیں تو لڑکیوں کا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے؟ انھوں نے ہدایت کی کہ سادگی اور شرافت سے رہیں سہیں اور ایسے مردوں کے کرتوتوں کو چھپائیں نہیں بلکہ ان کی شکایت کریں، ان کے نام اور پتے اخباروں میں شائع کریں تاکہ ان کو شرم آئے! انھوں نے بتایا کہ جرم اندھیرے میں پنپتے اور روشنی سے بھاگتے ہیں۔

آج گاندھی جی ہوتے اور اس زمانے کی لڑکیوں کا رہن سہن پہننا اوڑھنا، بناؤ سنگار دیکھتے تو کیا کہتے؟ کیا انھوں نے اسی لیے ہندستانی عورت کی آزادی کے لیے پچاس سال جدوجہد کی تھی کہ وہ گھٹیا قسم کی چھچھوری مغربی عورت کا نمونہ بن جائے؟

گاندھی جی کا پیام

ہم نے مختصر طور پر اسی جدوجہد کی یہ ایک جھلک پیش کی جو گاندھی جی پچاس برس تک عورت کو اس کے حقوق دلانے کے لیے کرتے رہے۔ یہ دکھانے کی کوشش بھی کی ہے کہ وہ ہندستانی عورت کے کیا فرائض سمجھتے تھے اور اسے ان کو ادا کرنے کی کتنی سخت تاکید کرتے رہے تھے۔ مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندستانی عورت کے دل میں آزادی پر نچھاور ہونے کا جذبہ گاندھی جی ہی نے ابھارا تھا اور ان ہی کی تربیت سے اس میں ایک نئی زندگی پیدا ہوئی تھی، خود اعتمادی اور خودشناسی کا جوہر۔ جو صدیوں سے سونا پڑا تھا بیدار ہوا تھا۔

لیکن آج ہم دکھ اور شرم کے ساتھ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندستانی عورتوں نے بھی گاندھی جی کی تعلیم کو اور اسی احسان کو جو انھوں نے ان پر کیا تھا بھلا سا دیا ہے۔ یوں بظاہر ہمارے دیس کی عورتوں نے بہت ترقی کی ہے لڑکیوں کے ہزاروں اسکول اور کالج ہیں۔ باہر کے ملکوں سے بھی عورتیں بڑی بڑی ڈگریاں لے کر آتی ہیں سیاست میں حصہ لیتی ہیں بڑے سے بڑے اور ذمے دار سے ذمہ دار عہدے پر آپ عورت کو دیکھ سکتے ہیں وہ ملک کی سیاسی سماجی۔ معاشی زندگی میں ہر طرح شریک ہیں نوکریاں کرتی ہیں، کاروبار کرتی ہیں۔ ٹیچر، ڈاکٹر، وکیل، کلرک، آرٹسٹ، ادیب، شاعر کیا نہیں ہیں؟ لیکن ان میں سے اکثر یہ نہیں جانتیں کہ ان حقوق کے لیے وہ کس عظیم ہستی کی مرہونِ منت ہیں اور ایسی عورتیں تو اور بھی کم ملیں گی جو ان فرائض کو ادا کرنے کی لگن دل میں رکھتی ہوں جن کی گاندھی جی ان سے امید رکھتے تھے۔

گاندھی جی نے کہا تھا کہ عورت ستیہ اور اہنسا کا اوتار ہے یعنی وہ سمجھتے تھے کہ عورت کی یہ فطرت ہے کہ وہ تشدد سے اور نفرت سے دور رہے سچائی کا ساتھ دے اور محبت اور سیوا کی راہ پر چلے۔ لیکن آج کتنی عورتیں ہیں جو اپنے ضمیر کو ٹٹول کر سچے دل سے یہ کہہ سکیں کہ وہ گاندھی جی کے اسی معیار پر کس حد تک پوری اترتی ہیں۔

ہم ہندستانی عورتیں . خاص کر نئی نسل کچھ اتنے اتھلے مزاج کی ہوتی جا رہی ہیں کہ زندگی کے اٹل اور اہم مسئلوں پر بہت کم غور کرتی ہیں اور خود پرستی، خودنمائی اور فرضی دکھوں کے جال میں کچھ اس طرح پھنس گئی ہے کہ ان اٹل قدروں، ان گہری سچائیوں

اور کٹھن فریضوں، ان بنیادی حقوق اور ان سے پیدا ہونے والے ان فرائض کو جو اس پر عائد ہوتے ہیں۔ نظر انداز کر دیا ہے! آج ہر ہندی عورت کو، وہ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا پارسی، عیسائی، کسی بھی مذہب اور فرقے سے تعلق رکھتی ہو، یہ سوچنا چاہیے کہ وہ کیا ہے، کیسی ہے؟ عورت ہونے کے ناتے اس کا کیا فرض ہے؟ کیا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ مہلک اور روحانی بیماریوں سے جو ہماری قوم اور ملک کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں، لڑے اور اپنے بچّوں کو ان سے محفوظ رکھے؟ ان کو صحت مند ذہن، اور وسیع قلب رکھنے والے انسان بنائے؟ وہ عورت ہے جو محبّت کا ساگر، مذہب کی امین، سچّائی کی پالن ہار ہے؟ جو انسان کی ماں ہے۔ جو قوموں کو بنا سکتی ہے۔ اور بگاڑ بھی سکتی ہے!

عورت کا دائرۂ عمل خواہ کتنا ہی محدود ہو، اس کی کوششوں کا اثر خواہ صرف گھر کے دو چار افراد اور چند ہمسایوں پر ہی پڑے، لیکن اس پر بہر حال یہ فرض عائد ہوتا ہے اور اسی کو ادا کر کے وہ عظیم کام انجام دیتی ہے۔ لوگوں کے دلوں سے نفرت اور تشدد، خود پرستی اور خود غرضی کے جذبات کو دور کرنا، انسانیت، شرافت اور خدمت کی لگن لگانا عورت کا سب سے اہم اور مقدس فرض ہے۔ اگر دس بیس فیصدی ہندستانی عورتیں بھی اس فرض کو انجام دیں تو ساری قوم کی زندگی سدھر سکتی ہے! اسی طرح ہم گاندھی جی کے احسانوں کا بدلہ اُتار سکتے ہیں، اسی طرح ہم اپنے عظیم رہنما کی آشاؤں کو پورا کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ اسی طرح یہ ثابت کر سکتے ہیں گاندھی جی نے عورت کے بیے نیکی کی مورتی، پاکیزگی کی تصویر، روحانیت کی دیوی اور کردار کی بلندی اور سیرت کی پختگی کا جو خلعت بخشا وہ ان کا حُسنِ ظن ہی نہ تھا بلکہ سچ مچ ہندی عورت کا یہی سچا روپ ہے۔

★

> "ایک جمہوری نظام حکومت میں اگر کچھ غلطیاں پائی جاتی ہیں تو عوام کو سرکار کی توجہ ان کی طرف مبذول کرا کے سکون محسوس کرنا چاہیے، اگر اُن کی خواہش ہو تو وہ سرکار کو ہٹا بھی سکتے ہیں لیکن انھیں اس کے خلاف احتجاج کر کے اس کے کام میں رُکاوٹ نہیں ڈالنا چاہیے۔"
>
> ——— مہاتما گاندھی

فضا ابن فیضی

رُباعیات

اک شعلۂ سرکش ہوں بجھا دے مجھ کو
اکسیر ہوں، مٹی میں دبا دے مجھ کو
مجرم ہوں کہ زندہ ہوں اس آشوب میں بھی
اچھا ہے کہ سولی پہ چڑھا دے مجھ کو

سوزِ نفس و آتشِ جاں پھیلائے
دامانِ صد آشوب و زیاں پھیلائے
بازارِ گل و لالہ میں کب تک آخر
بیٹھا رہوں زخموں کی دُکاں پھیلائے

کیلیں مرے پہلو میں جڑے گی کتنی
آلام کی تہہ مجھ پہ چڑھے گی کتنی
دشوار ہوئی جاتی ہے اپنی پہچان
چہرے پہ مرے گرد پڑے گی کتنی

جو شخص گرا، اپنے ہی چکر میں گرا
ہر دائرہ، خود ساختہ محور میں گرا
طوفاں سے جو نکلے بھی تو جاؤ گے کہاں
کٹ کٹ کے وہ ساحل بھی سمندر میں گرا

صحرا ہو، مگر ذرّوں میں بٹ جاؤ گے
آہن ہی سہی، پگھلو گے، کٹ جاؤ گے
چمکے گی سروں پر جو یہ حالات کی دھوپ
خود اپنے ہی سائے میں سمٹ جاؤ گے

اساس کا یہ کرب گھٹا تو ہوتا
کچھ چارۂ تکلیفِ نوا تو ہوتا
بندوں کی طرح یوں تو نہ پھرتا نادار
اے کاش کوئی میرا خدا تو ہوتا

سائے تھے جہاں، نور وہاں پھیلے ہیں
ہر سطح پہ معنی و بیاں پھیلے ہیں
میں بول کے خاموش ہوا تو دیکھا
افسانے کراں تا بہ کراں پھیلے ہیں

غزل

ساحر لکھنوی

انساں کھلونا ہے حالات کے ہاتھوں میں
کس درجہ ہے مایوسی اس طرح کی باتوں میں

ان میں ہی کہیں ہوگا اب ذکر ہمارا بھی
جو بن کے کتابیں ہیں دنیا ترے ہاتھوں میں

کتنے ہی فسانوں کے عنواں ہوا کرتے ہیں
الجھی ہوئی سانسوں میں بہکی ہوئی باتوں میں

اے رات کے سناٹے یہ راز بتا تو ہی
کیوں جسم سلگتے ہیں بھیگی ہوئی راتوں میں

اب اُن کو کہاں ڈھونڈیں انساں جنھیں کہتے ہیں
کچھ بٹ گئے قوموں میں، کچھ بٹ گئے ذاتوں میں

یکسانیت اس درجہ اچھی تو نہیں ساحر
آتی ہوئی صبحوں میں، جاتی ہوئی راتوں میں

غزل

ساحر بھوپالی

طلبگارِ سکونِ دل نہیں ہیں
کسی کے لطف کا سائل نہیں ہیں

میں اک آوارۂ صحرائے غم ہوں
کسی آغوش کے قابل نہیں ہیں

کھٹکتا ہوں میں خود اپنی نظر میں
کہ اب شایستۂ محفل نہیں ہیں
اک انبوہِ حریصاں ہے یہ دنیا
مگر اس بھیڑ میں شامل نہیں ہیں

جہاں کا عقدۂ مشکل ہوں لیکن
تمہارے واسطے مشکل نہیں ہیں

مجھے ہر حال نے اپنا لیا ہے
کسی بھی حال سے بددل نہیں ہیں

نگاہِ لطف سے مت دیکھ مجھ کو
تری نفرت کے بھی قابل نہیں ہیں

میں پروردہ ہوں طوفانوں کا ساحر
ہلاکِ حسرتِ ساحل نہیں ہیں

مرزا جعفر حسین

حکیم صاحب عالم

لکھنوی تہذیب کی آخری یادگار

حکیم صاحب عالم مرحوم کا نام سنتے ہی نظروں کے سامنے ان کی صورت اور حافظے کی سطح پر ان کی خوبیاں اور خصوصیات ایک ایک کر کے نمودار ہونے لگتی ہیں، گول چہرہ، گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، خشخشی ڈاڑھی، کتری ہوئی مونچھیں، وہرا جسم، پستہ قد، جسم پر شیروانی، چوڑی دار پائجامہ۔ سر پر دو پلی کالی ٹوپی، ایک ہاتھ میں چھڑی دوسرے ہاتھ میں تسبیح، میٹھے میں میں آراستہ حلیے میں ہمہ تن شرافت، یہ تھا ظاہر اس بزرگ ہستی کا جس کا نام تھا سید محمد قاسم اور عرف تھا صاحب عالم۔ اس شہر کے عمائدین زیادہ تر اپنے اپنے عرف سے مشہور تھے، یہ بھی صاحب عالم ہی کہلائے اور اسی نام سے پکارے جانے لگے۔

سیرت و کردار میں محاسن اخلاق کا مجموعہ تھے۔ سلامت روی سے چال چلتے، میٹھی بولی بولتے تھے۔ گراں گوش تھے مگر صاحب فہم و بصیرت تھے۔ محبت سے بھرا دل اور تفکر و تعقل سے دماغ لبریز تھا۔ خدا ترسی و خدا پرستی سے قریب اور عصبیت و تنگ نظری سے دور تھے۔ "با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا" ان کا شعار تھا۔ بےحد متواضع تھے اور ہر ایک کے ساتھ برادرانہ تعلقات رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے کلچر کی وہ یقیناً آخری یادگار تھے۔ راقم الحروف سے عزیزداری بھی تھی مگر ہم عمر تھے، لڑکپن سے باہمی ملاقاتیں تھیں اس لیے بے تکلف اور پرخلوص دوست بھی تھے۔

حکیم صاحب کا آبائی پیشہ طبابت تھا۔ ان کے والد مرحوم حکیم سید فضل علی مرحوم نہ صرف مجسمۂ شرافت و انسانیت بلکہ طبیب حاذق بھی تھے۔ وہ بھی اپنے عرف سے مشہور تھے، حکیم میرن صاحب کہلاتے تھے۔ ان کی حیات میں بھی ان کا اصل نام بہت کم لوگ جانتے تھے اور آج تو شاید ان کے حقیقی نام سے کوئی بھی واقف نہ ہوگا مگر حکیم میرن صاحب اور ان کا طبیب حاذق ہونا دنیائے طب کو تسلیم ہے۔ حکومت برطانیہ سے شفاء الملک کا خطاب ملا تھا۔ مگر انھوں نے خطاب یافتہ ہونے پر کبھی فخر نہیں کیا۔ حکیم میرن صاحب کی وضعداری میں وقت کی پابندی بھی داخل تھی۔ وہ نماز صبح اول وقت پڑھتے تھے اور اندھیرے منہ اپنے مکان واقع چاہ کنکر سے ٹہلنے کے لیے چوک کمپنی باغ تک پیدل جاتے تھے اور طلوع آفتاب کے قبل ہی واپس آجاتے تھے۔ جاتے اور واپس آتے ہوئے برابر تلاوت کلام ربانی بہت بلند آواز میں فرماتے تھے تاکہ تمام ملحقہ آبادی اور محلوں سے بلائیں دور رہیں اور رحمت خداوندی کا نزول ہوتا رہے۔ حکیم صاحب عالم نے انسانی ہمدردی کی خصلت بھی دوسرے اوصاف و محامد کی طرح اپنے والد مرحوم سے ترکہ میں پائی تھی۔ علمی قابلیت، فنی کمالات، محاسن اخلاق اور سیادت و شرافت و نجابت کی بنا پر ان دونوں بزرگوں کا روسا و عمائدین لکھنؤ شہر کے ہر طبقے میں بےحد احترام ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں بھی ان دونوں صاحبان کے کردار و سیرت پر کبھی کوئی نکتہ چینی نہیں ہوئی اور نہ انھوں نے کسی کو کبھی کسی تنقید کا موقع دیا۔ ان کی سب سے بڑی یہ خصوصیت تھی کہ عمائدین شہر اور خوشحال گھرانے سے متعلق ہوتے ہوئے بھی کبھی کوئی ایسا شوق نہیں کیا جو فی زمانہ بھی قابل اعتراض یا فعل قبیح قرار دیا جا سکے۔ ان کے اوقات ایسے تفریحی مشاغل سے ہمیشہ پاک و صاف رہے جس کو تضیع اوقات کہا جا سکے یا لہو و لعب میں شامل کیا جا سکے۔

صاحب عالم مرحوم نے کچھ مدت تک سلطان المدارس میں عربی تعلیم اور فقہ و اصول کے مدارج طے کیے تھے مگر ان کی اصل تعلیم و تربیت اپنے گھر ہی میں ہوئی تھی۔ درسی کتب اور فارسی و عربی ادب کے علاوہ طب

کی کتابیں بھی اپنے والد مرحوم ہی سے پڑھی تھیں۔ معلم بھی شخص تھا اور درس لینے والا بھی صلاحیت والمیت کا مالک تھا اس لیے صاحب عالم ابھی عنفوان شباب ہی میں نہ صرف علوم و ادبیات بلکہ فن طب میں بھی اعلیٰ تعلیم مکمل کر چکے تھے اور اپنے والد مرحوم کے ہمراہ اپنے دواخانہ موسومہ معدن الادویہ واقع محلہ سہاس میں مطب کرنے لگے تھے۔ بہت جلد ان کا شمار بھی اطبائے حاذق میں ہونے لگا تھا۔ اس کے علاوہ ان میں حسن انتظام کا بھی بڑا سلیقہ تھا۔ ان کا دواخانہ ملک بھر میں مشہور و معروف تھا اور یہ ترقی و مقبولیت حکیم صاحب عالم مرحوم کی کاوشوں اور جانفشانیوں کی بدولت تھی۔ دواخانہ کی اس ترقی سے ان کی مالی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی۔

اس زمانے کے بیشتر اطباء عام مریضوں سے مطب کے علاوہ ان کے گھروں پر جانے کی بھی فیس لیتے تھے۔ طب کا پیشہ خدمت خلق کے لیے مخصوص تھا اور اس خدمت کا معاوضہ درگاہ قاضی مطلق سے حاصل کرنے کی توقع پر منحصر رہتا تھا مگر درباروں اور امراء کے درباروں اور محلوں میں جانے پر فیس کے علاوہ دوسرے ناموں اور طریقوں سے معاوضہ پیش ہوتا اور قبول کیا جاتا تھا۔ حکیم صاحب عالم اس داد و دہش سے کبھی ہمیشہ محفوظ رہے۔ ان کے دوستانہ تعلقات تمام اونچے گھرانوں سے تھے۔ بعض عمائدین سے بے تکلفانہ تعلقات تھے۔ ان حالات میں رسم زمانہ کے تحت دوستانہ دوستوں میں خواہ وہ حیثیت سے متعلق ہی ملاقات کیوں نہ ہو کسی معاوضہ یا نذر و قیمت کا سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ بسا اوقات دوستانہ تعلقات کی بنا پر دوائیں بھی بلا قیمت پیش کر دی جاتی تھیں۔ راقم الحروف کے علاوہ ان کے بہت سے دوسرے دوست ایسے تھے جن کو وہ قیمتی سے قیمتی دوائیں تجویز کر کے پیش کر دیتے تھے اور ان کی قیمت لینا کبھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح حضرات علمائے کرام کے کئی بڑے بڑے خاندان ایسے تھے جن سے دواؤں کی قیمت ملنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ غرباء کو بلا قیمت دوائیں دینے کا بالاعلان طریقہ تھا۔ اس اعلان کی وجہ سے اُن کے مطب میں غریبوں کا انبوہ لگا رہتا تھا اور ان سب کے لیے مفت دوائیں نقد عام تھیں۔ ان تمام طبقوں کے علاوہ طالب علموں کے ساتھ بھی رعایت ہوتی تھی۔ علم دین حاصل کرنے والوں کے لیے قیمت ادا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ دوسرے طالب علموں کے لیے بھی زیادہ تر بخشش کرم ہی جاری رہتی تھی۔ مختصر یہ کہ دواخانہ سے معتدبہ مقدار میں دوائیں مفت نکل جانے کے بعد بھی مرکبات اور شربتوں وغیرہ سے وافر آمدنی ہو جاتی تھی۔

حکیم صاحب کو فلاح عامہ کی بڑی فکر رہتی تھی اور ادبی مذاق بھی بہت بلند تھا۔ اسی شوق میں انھوں نے ایک ماہوار رسالہ فن طب اور مختلف امراض کے معالجات سے متعلق جاری کر دیا تھا۔ اس ماہنامہ میں بہترین مضامین اور بہت سی نثری تصاویر شائع ہوتی تھیں۔ لیکن اس رسالہ کے گراں قدر ہونے کے باوصف یہ کارنامہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ زیادہ تعداد میں مضامین کی خود انھیں کو لکھنا پڑتی تھی۔ مطب کرنے اور دواخانہ کی نگرانی کے بعد ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا تھا کہ وہ مضامین نویسی کی طرف زیادہ توجہ کر سکیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے مزاج میں بہت زیادہ مروت تھی۔ رسالے کے چندے باقی رہ جانے اور خسارہ پر خسارہ ہوتا رہا۔ مفت دوائیں تقسیم کرنے کے بعد اس نقصان کا مزید تحمل ان کے امکان میں نہیں رہا لہٰذا اس علمی اور ادبی مشغلہ کو ترک کر دینا ہی انھوں نے مناسب سمجھا۔

ان کے ذہنی مشاغل میں سب سے زیادہ ان کا رجحان شعر و سخن کی طرف تھا۔ سخن فہم بھی تھے اور سخن سنج بھی۔ طبیعت بہت زیادہ موزوں تھی اور بہت جلد شعر کہہ لیتے تھے مگر قصیدوں کے علاوہ اور کسی صنف سخن کی طرف توجہ نہیں کی۔ ان کا رنگ تغزل قصائد کی تشبیب میں صرف ہو جاتا تھا۔ یہ قصیدے نعت و منقبت میں ہوتے تھے۔ پڑھنے کا طرز بیحد سادہ تھا مگر لطف لے کر پڑھتے تھے۔ ان صحبتوں کے علاوہ خود اپنے دوستوں کو مخصوص طور پر مدعو کر کے اپنے قصیدے بہت شوق سے سناتے تھے۔ کبھی کبھی مطب ہی میں دو چار دوست آ جاتے تو مریضوں سے فراغت کر کے قصیدہ خوانی کی محفل گرم ہو جاتی تھی۔ ایسی طلب کردہ مخصوص صحبتوں میں نیز ان اتفاقیہ اجتماعات میں جو مطب میں ہوتے تھے حکیم صاحب کے لیے اپنے دوستوں کو کھانا کھلانا بیحد ضروری ہوتا تھا۔ بغیر کھانا کھلائے رخصت ہونے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ ظاہر ہے کہ قصیدہ خوانی میں بہت زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا تھا۔ صرف

وہ ایک قصیدہ سناتے جو زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر اشعار کا ہوتا تھا مگر ان کے یہاں ایسی مختصر صحبتوں میں بھی گھنٹوں وقت خرچ ہو جاتا تھا کیونکہ بات میں بات نکلتی اور بہت سے ادبی مباحثے اور مذاکرے نکل آتے تھے۔ ان کے سامعین بھی سب پڑھے لکھے اور بہترین ادیب ہوتے تھے، جن میں خصوصیت کے ساتھ علی عباس حسینی، علامہ اختر علی تلہری اور مولانا ثاقب حسین کا ہونا ہمیشہ ضروری قرار پاتا تھا۔ اگر کسی مخصوص دعوت میں قصیدہ خوانی ہوتی تو صدر محفل جوش ملیح آبادی ہوا کرتے تھے۔ حکیم صاحب کے ان قصائد کا مجموعہ بہت ضخیم تھا مگر ہمارے ملک میں ان کا کوئی قصیدہ کبھی طبع نہیں ہوا۔ ان کی طبیعت نام و نمود کی خواہش سے بالکل پاک صاف تھی اس لیے قرینہ یہی ہے کہ ان کے کسی قصیدے نے اشاعت حاصل نہیں کی اور وہ سارا کلام یقیناً تلف ہو گیا ہوگا۔

دوستوں کی ملاقاتوں کے سلسلہ میں ان کی دعوتوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ خود معدودے چند احباب کے گھروں پر صرف ملاقات کی غرض سے جانے کے خوگر تھے۔ عید وغیرہ یا تقریبات کے مواقع پر ہر جگہ مدعو ہونے پر جاتے تھے لیکن ملاقات کرنے کی غرض سے صرف دو چار دوستوں کے یہاں کبھی کبھی چلے جاتے تھے۔ دوستی کے علاوہ عزیزداری کہیے یا یہ کہ ہمارے درمیان کوئی روحانی ارتباط ایسا تھا جس کی کشش سے وہ میرے یہاں تقریب قریب ہر روز شام کو میں موجود ہوں یا نہ ہوں مگر میرے گھر میں ضرور آتے تھے۔ یہ شرف کسی اور کو کبھی حاصل نہیں ہو سکا۔ البتہ ان کا یہ اصول تھا کہ جب ملاقاتوں کو یا کسی مخصوص دوست کی ملاقات کو دل چاہتا تو وہ سب دوستوں کی دعوت کر دیا کرتے تھے۔ ان کے ایسے دوستوں کی تعداد بھی ایک درجن یا ڈیڑھ درجن سے زیادہ کبھی نہیں بڑھی۔ ان دوستوں میں ادیب، غیر ادیب اور ہر مذاق کے مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ حکیم صاحب کا ذوق کھانوں کے بارے میں بہت بلند تھا۔ خود بھی ہر روز بہت لذیذ اور عمدہ کھانے کھاتے تھے اور دعوتوں میں انتظامات و التزامات اور زیادہ وسیع ہو جاتے تھے۔ ان کے دسترخوان پر لکھنؤ کے مخصوص کھانے اور اپنے اصلی و صحیح رنگ میں پکے ہوئے ملتے تھے۔ یہ دعوتیں کبھی دن کو اور کبھی رات کو ہوتی تھیں۔ ہر دعوت میں قریب قریب سب دوستوں کی شرکت ضروری ہوتی تھی البتہ ادیبوں کی صحبتوں میں یک رنگی کا خیال رکھا جاتا تھا اور ایسے مدعو کردہ لوگوں میں اگر کوئی نہ آسکتا تو اگلی دعوت تک جب بھی سامنا ہو جاتا اور یہ سامنا دوسرے اور تیسرے دن ہو جانا لازمی ہوتا تھا، اس سے شکایتیں کرتے تھے۔ ابتداءً رات کی دعوتوں میں جوش صاحب کو باوجود انتہائی خلوص و محبت کے مدعو نہیں کرتے تھے اس لیے کہ ان کے رات والے معمولات حکیم صاحب کی متشرع اور مقدس طبیعت پر بہت گراں گزرتے تھے مگر رفتہ رفتہ ان کے ساتھ خلوص و محبت میں اتنی فراوانی ہو گئی تھی کہ تقدس و ورع کے حدود میں بھی جوش کے لیے جگہ نکل آئی تھی۔ بہر حال ان دعوتوں میں وقت کے تناسب سے کھانے کھلائے جاتے تھے۔ مثلاً یہ کہ دن کو پوریاں ہوتی تھیں تو رات کی دعوت میں زعفرانی پراٹھے۔ دن کو سادہ پلاؤ یا مٹر پلاؤ کھلاتے تو رات کو دو گوشتہ مٹر پلاؤ یا جو گوشتہ پلاؤ ہوتا تھا۔ شیرینی غذاؤں میں دن کو یاقوتی ہوتی تھی تو رات کو متنجن یا شاہی ٹکڑے اور بالائی ہوتی تھی۔ اُن کی ان جہتم بالشان تواضع کا حال طشت ازبام ہو چکا تو ہر دوست کے ساتھ اس کے دو ایک دوست بھی ہمراہ جا کر شریک دسترخوان ہو جایا کرتے تھے مگر ان کا خوان نعمت اتنا وسیع تھا کہ وہاں کبھی قلت یا کمی محسوس نہیں ہوئی۔ زندگی کے آخری دور میں اپنی گرتی ہوئی صحت کو سہارا دینے کے لیے انھوں نے رات کا کھانا ترک کر دیا تھا اسی کے ساتھ رات کی دعوتیں بھی دن ہی کے اوقات میں بدل گئی تھیں اور اب ہر دو سنیچر یا اتوار کو یہ دعوتیں ہو جایا کرتی تھیں۔ پھر بھی اگر کوئی دوست اپنی کسی مصلحت کے تحت کبھی رات کی دعوت مانگ دیتا تھا تو وہ اس کو بخوشی قبول کر لیتے تھے مگر ایسی دعوتوں میں اسی مخصوص دوست کے فرمائشی کھانے کھلائے جاتے اور اسی کی تجویز سے دوسروں کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ کھانے کھلانے کے بعد ہر دعوت میں سب ہی پان کھلاتے تھے۔ حکیم صاحب کے یہاں کے پانوں کی شہر بھر میں شہرت تھی۔ وہ خود بہت اچھے پان دن بھر کھاتے اور کھلایا کرتے تھے۔

لکھنؤ کے دیسی و سوری پان ہمیشہ مشہور رہے ہیں۔ روسا و عمائدین کے یہاں یہی پان تربیت دے کر فروخت کیے جاتے تھے۔ یہ تربیت بڑے ریاض اور بہت محنت کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچتی تھی۔ ایسے

تیار کیے ہوئے پان پستئی کہلاتے تھے کیونکہ ان کا رنگ پستہ سے ملتا جلتا ہو جاتا تھا۔ ان پانوں میں لذّت، لطافت اور نزاکت پیدا ہو جاتی تھی۔ پان بنانا بھی ہنر تھا۔ راقم الحروف نے اپنی ساری عمر میں صرف چار گھروں میں ایسے پان کھائے ہیں جن کا مثل و نظیر کسی دوسری جگہ نہیں ملا اور یہ چاروں گھر بھی ایسے نہیں تھے جہاں کسی دو مقامات پر یکسانیت ملی ہو۔ چاروں گھروں کے چار مزے اور ہر مزہ اپنی جگہ پر لاجواب تھا۔ ایک گھر چودھری اُن کا تھا جہاں کے پان بڑے بڑے معززین اور مقتدر لوگ فرمائشیں کرکے بنوا کر منگواتے تھے۔ چودھری اُن کے گھر میں چونا اور کتھ دونوں مخصوص طرز پر تیار کیے جاتے تھے۔ ان کے یہاں کے پانوں میں انھیں دونوں اجزاء کی حکمت عملی کی وجہ سے لذت تھی۔ دوسرا گھر شیخ علی عباس مرحوم کا تھا۔ یہاں بھی کتھ اور چونا پر بڑا ریاض ہوتا تھا۔ مگر کوئی چیز ایسی شامل کردی جاتی تھی کہ ذائقہ بدل جاتا تھا۔ تیسرا محل مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں صاحب کا تھا جہاں کے پانوں کے بارے میں کبھی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے بنائے جاتے ہیں۔ کتھ چونا ڈلی الائچی ہر چیز ہر جگہ بہتر ہوتی تھی وہی یہاں بھی تھی مگر پان بنانے کا یہ سلیقہ تھا کہ ہر حصہ پان تک برابر کا کتھ چونا اور یکساں مقدار میں باریک کٹی ہوئی ڈلی پہنچ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بہت بڑی گلوری بنتی تھی اور اس ہنرمندی سے بنائی جاتی تھی کہ کسی کو کھینچ کر مار دی جاتی تو پوری گلوری ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی مگر اپنی اصلی جگہ سے نہیں کھلتی تھی۔ حکیم صاحب کے یہاں گلوریاں چھوٹی اور ڈلی کم مگر الائچی زیادہ ہوتی تھی۔ ان کے یہاں کے پانوں میں سادگی، لطافت نزاکت اور ذائقہ میں اعتدال ہوتا تھا۔ انھیں مثالوں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ لکھنؤ کلچر میں پان کی تربیت، اس کے مسالوں کی تیاری اور گلوری بنانے کے کاروبار کو بھی فن کا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔

صاحب عالم صاحب کے یہاں کی یہ دعوتوں والی نشستیں بڑی لمبی لمبی ہوتی تھیں۔ تصبرہ خوانی نہ بھی ہوتی تب بھی پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں بڑے اچھے اچھے اور کارآمد تذکرے اور مباحثے ہو جایا کرتے تھے البتہ اختلافی مسائل نہیں چھیڑتے تھے۔ ان کی خود طبیعت مرنجان مرنج تھی اس کے علاوہ ان کا سارا طرز زندگی اور ساری معاشرت کا انداز لکھنؤ کے خالص کلچر میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ہر اختلاف سے دور رہنے کے قائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی عملی زندگی میں سیاسیات کو بہت کم دخل تھا۔ ان کی سیاسی معلومات میں کوئی کمی نہیں تھی، ذاتی طور پر سیاسی رجحانات بھی رکھتے تھے، پکے نیشنلسٹ تھے اور ان کے مخصوص دوستوں میں بابو موہن لال سکسینہ اور بابو گوپی ناتھ سریواستو کے ایسے ممتاز کانگریسی رہنما بھی شامل تھے جن سے ان کو محبت بھی تھی گاندھی اور نہرو کا بیحد احترام کرتے تھے لیکن پھر بھی وہ سیاسیات سے اتنا عملاً دور رہتے تھے کہ سیاسی اختلافی مسائل میں نہ کبھی کوئی حصہ لینے اور نہ کبھی کسی ایک پارٹی کی دوسرے کے مقابلے میں کھل کر تائید کرتے تھے۔ ان کی ہمدردیاں انفرادی رہتی تھیں جن میں ذاتی تعلقات کو بہت دخل رہتا تھا۔

حکیم صاحب عقائد کے پکے اور پابند مذہب بھی تھے۔ شریعت کا ہر قدم پر لحاظ و احترام کرتے تھے لیکن عصبیت و تنگ نظری سے بہت دور تھے۔ احکام شرع کے پابند عقلاً تھے رسماً نہیں تھے۔

ان کا دواخانہ کچھ مدت کے بعد نقصان سے چلنے لگا تھا اس خسارہ کو گھر کی آمدنی سے پورا کرتے رہے۔ ان کی اہلیہ بھی بہت خوشحال تھیں، آخر عمر میں گھر کا خرچ بھی انھیں کی آمدنی سے چل رہا تھا۔ جہاں تک مجھے اطلاع ہے کبھی کبھی مقروض بھی ہو جاتے تھے مگر نہ دریا دلی میں کبھی کمی آئی اور نہ وضعداری کا پاس و لحاظ کبھی جانے دیا۔ البتہ تواضع والی دعوتوں میں کسی قدر کمی ہوگئی تھی۔ پھر بھی وہ کمی ایسی نہ تھی جسکو ہر شخص محسوس کرسکتا۔ صرف انتہائی بے تکلف دوست اور پوری طرح مزاج داں احباب اس بدلی ہوئی صورت حال کو سمجھ سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ حالات بدلنے پر بھی مخصوص دوستوں کے ساتھ جو برتاؤ تھا وہ بالکل اسی طرح برقرار رہا جو فارغ البالی اور خوشحالی کے زمانے میں تھا۔ جن دوستوں سے جتنا زیادہ خلوص تھا اور جتنی زیادہ محبت تھی اتنا ہی ان کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ بھی شدت رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں جوش ملیح آبادی سے ان کے روابط قابل ذکر ہیں۔ جوش صاحب سے ان کی ملاقات، دوستی کی منزل تک پہنچی اور پھر ان کو ایک طرح کا ان سے والہانہ قلبی لگاؤ ہو گیا۔ یہ قلبی تعلق اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ انھوں نے اپنے جذبۂ تقدس و ورع کو بھی ان کی خوشی کے لیے ان پر نثار کر دیا تھا۔ حکیم صاحب کا جوش صاحب کے ساتھ یہ برتاؤ دوستی اور

محبت کی دنیا میں قابلِ رشک مثال تھی۔

جوشؔ صاحب سے ہم لوگوں کی ملاقات لڑکپن ہی کے زمانہ سے تھی۔ ان میں اسی وقت سے کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ جو بھی زیادہ قریب سے ملاقی ہوتا وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ انھوں نے نوعمری سے شعر کہنا بھی شروع کر دیا تھا۔ حکیم صاحب کو بھی اسی زمانہ سے شعر کا اچھا ذوق تھا اس طرح ان دونوں آدمیوں میں اس یک رنگیٔ مذاق نے ایک دوسرے سے منسلک کیا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا میں جوشؔ صاحب سے ایک منزل اور قریب تھا۔ اس زمانہ میں طوائف کچھ اور ہی چیز تھی اور اس کے کوٹھے پر شرفا کا جانا عیب نہیں تھا۔ چنانچہ ہم دونوں یعنی جوشؔ اور میں ایک طوائف ظہیرن نامی کے یہاں ہر روز شام کو جانے لگے تھے۔ ایک مرتبہ گرمی کے موسم میں شام کو پہنچے۔ وہ چوک میں پارک کی جانب مشرق بالاخانہ پر رہتی تھی۔ مغربی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں ظہیرن کی پیشانی پر پڑیں، عرق کے قطرات اس کے ماتھے پر دمکنے لگے۔ میں نے اور جوشؔ نے اس کیفیت کو ایک ساتھ محسوس کیا اور جوشؔ نے اٹھ کر فوراً وہ دروازہ بند کر دیا۔ ظہیرن نے ماتھے کا پسینہ پونچھ ڈالا اور میری زبان پر بے ساختہ بدر چاچ کے شعر کا یہ دوسرا مصرع آ گیا کہ "ہزار دانۂ پروین بر آفتاب چکید"[1] وہاں سے چراغ جلنے کے بعد ہم لوگ اٹھے تو نخاس میں حکیم صاحب کے مطب پہنچ گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جوشؔ نے حکیم صاحب سے مزاحاً کہا کہ "ہمارے مرزا نے یعنی میں نے ایک شعر کہا ہے، تم اس کے معنی بتاؤ اور مطلب سمجھاؤ۔" اس کے بعد مجھ سے یہ کہا کہ پورا شعر اپنا کہہ کر سنا دو۔ حکیم صاحب گراں گوش تھے۔ ہم لوگوں کی سرگوشیاں دیکھ کر کچھ سمجھ نہ سکے اور مجھ کو حکم دیا کہ شعر سناؤ۔ میں نے شعر پڑھ دیا اور وہ فوراً کہنے لگے کہ "تم دونوں بدمعاش ہو، یہ شعر تمہارا نہیں، شعر ہے یا چیستان ہے۔" مختصر یہ کہ اسی گفتگو کے دوران میں ان کو سارا واقعہ صحیح صحیح بتا دیا گیا۔ وہ خفا تو نہیں ہوئے البتہ جوشؔ صاحب سے بے تکلفی بہت بڑھ گئی۔ ہم لوگ برابر ملتے رہتے اور اب حکیم صاحب سے ہم لوگ طوائفوں کے تذکرے بھی کر دیا کرتے۔ وہ کبھی مسکراتے اور کبھی ہم لوگوں پر خفا ہوتے۔ ان کا تقدس ان باتوں کو سننے کی بھی اجازت نہیں دیتا تھا مگر رواداری اور پرخلوص دوستی میں ان کے لیے چارہ بھی کیا تھا بجز اس کے کہ ہم لوگوں کی ان حرکتوں کو برداشت کریں۔ کچھ مدت کے بعد جوشؔ ملازم ہو کر حیدرآباد چلے گئے۔

حیدرآباد میں ملازمت کے دوران کئی کئی برس کے بعد جوشؔ صاحب لکھنؤ آتے اور سہ پہر کو حکیم صاحب کے دواخانہ میں شعر و سخن کی محفل جما کرتی تھی۔ سبز چسکی کے ساتھ حکیم صاحب اپنے دوستوں کی چائے اور فواکہات وغیرہ سے تواضع کرتے اور نماز مغرب کے وقت تک یہ دلچسپیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی دوپہر کو بھی کھانے سے تواضع ہو جاتی تھی لیکن اس دور میں یعنی جوشؔ کے حیدرآباد والے طویل وقفہ ملازمت میں وہ جب بھی آئے غالباً ایک بار بھی رات کو کوئی ان کی دعوت نہیں ہوئی۔ ان کا خلوص برقرار تھا، وہ جوشؔ سے اسی طرح محبت کرتے تھے اور ان کے کلام کے دلدادہ تھے۔ شعر اور اچھا شعر حکیم صاحب کے لیے بہت بڑی نعمت تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد نواب صاحب مرحوم سرکار آصفیہ میں ملازم تھے۔ حکیم صاحب انھیں کی معرفت حیدرآباد سے جوشؔ صاحب کا کلام حاصل کیا کرتے تھے اور جب بھی کوئی نئی نظم آ جاتی اس کو پڑھ کر خود بھی مسرور ہوتے، دوسروں کو بھی سناتے اور مجھے تو خاص طرح سے بار بار سناتے۔

جوشؔ صاحب حیدرآباد سے سبکدوشی حاصل کر کے کچھ مدت تک دلی میں رہے۔ وہاں سے ایک ماہانہ رسالہ نکالا جو چند اشاعتوں کے بعد بند ہو گیا پھر لکھنؤ آ کر مستقل طور سے سکونت پذیر ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت میرے علاوہ کوئی دوسرا بے تکلف دوست انکو فی الفور دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس وقت بنارسی باغ میں رہتے

---

(۱) بدر چاچ کا طرہی چیستان تھا۔ وہ معشوق کی یہ تصویر پیش کرتا ہے کہ اس نے اپنے ہاتھ کی ایک انگلی ٹیڑھی کر کے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا ہے اور پسینے کے قطرات اس کے رخسار پر ٹپک پڑے ہیں۔ اس خیال اور اس تصویر کو وہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے ؎

ہلال یک شبہ را برسر دو ہفتہ کشید   ہزار دانۂ پروین بر آفتاب چکید

تھے، میں گولہ گنج میں اور حکیم صاحب وکٹوریہ اسٹریٹ پر رہتے تھے۔ میرا مکان ان دونوں کے مکانات کے عین وسط میں تھا۔ اس لیے یہی ٹھکانا مشترکہ اجتماع کے لیے موزوں تھا۔ حکیم صاحب بلا ناغہ روز ہر شام کو میرے یہاں آتے بھی تھے۔ ان کی یہ وضعداری مرض الموت میں مبتلا ہونے کی شام تک برقرار تھی۔ میری لڑکیوں سے بیحد مانوس تھے بالخصوص بڑی لڑکی کو جو اس وقت مشکل سے چھ، سات برس کی تھی بہت چاہتے تھے۔ لڑکی بھی ان سے بہت ہلی ہوئی تھی ان کو "آپ" کہہ کر پکارتی تھی۔ مختصر یہ کہ جوش نے اپنی شام کی نشست کے لیے میرا مکان پسند فرمایا مگر ان کی موجودگی میں حکیم صاحب کبھی نہیں ٹھہرتے تھے۔ جوش شغلۂ بادہ خواری میں شدت کے ساتھ وقت کے پابند تھے، حکیم صاحب کو یہ حقیقت میری اہلیہ سے معلوم ہو گئی تو انھوں نے یہ طے کر لیا تھا اور اسی پر عمل کرتے رہے کہ وہ بچوں کو دیکھ کر اور ہم لوگوں کے پاس ذرا دیر بیٹھ کر رخصت ہو جاتے تھے۔ جوش ان کو لاکھ روکنے کی کوشش کرتے مگر وہ نہ مانتے تھے اس تبدیلی کے علاوہ اُن کے برتاؤ، اخلاق اور رکھ رکھاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میری سیہ کاری بہرحال پردۂ راز میں تھی۔ ایک شام کو جوش نے کہا کہ حکیم صاحب روزانہ بھاگ جاتے ہیں ان کو روکنا اور بٹھانا چاہیے۔ میں نے جواب دیا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ مسکرائے، ایک خاص انداز سے گردن ہلائی۔ گلاس منھ کو لگایا اور پھر رکھ کر استفساریہ طرز میں کہا "یہ نہیں ہو سکتا؟" میں نے پھر کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ چپ ہو گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ دو یا تین روز کے بعد رخصت ہوتے وقت کہا کہ "کل دوپہر کو آجانا، کچھ کاغذات دکھا کر مشورہ لینا ہے۔" میں نے وعدہ کر لیا۔

رات کو جو وعدہ کر چکا تھا اسی کے مطابق میں دوسرے روز جوش کے یہاں پہنچا۔ ان کے بھائی رئیس احمد خاں موجود تھے اور رندان بادہ آشام کی حوصلہ افزائی کے لیے موسم بھی سازگار تھا یعنی برکھا کی فصل بنگال تھی، گھنگھور گھٹائیں گھر گھر کر آ رہی تھیں اور میرے وہاں تک پہنچتے پہنچتے بے اختیار یہ شعر زبان پر آ رہا تھا:

فدائے شیوۂ رحمت کہ در لباس بہار
بہ عذر خواہی رندان بادہ نوش آمد

مگر یہ بات بھی یقینی تھی کہ بادہ نوشی کا وقت نہیں آیا تھا۔ ہمارے دونوں نے غروب آفتاب کے قبل مے نوشی کو کبھی جائز قرار نہیں دیا۔ جوش کا تو یہ قول تھا ؎

جب مہر نمایاں غروب ہو جاتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

اس لیے میں تو یہ سمجھ کر پہنچا تھا کہ کاغذات دکھائے جائیں گے اور کچھ مشورہ ہوگا مگر وہاں دونوں بھائی ایک مکمل اسکیم تیار کر چکے تھے جو میری معیت میں چلانا تھی اور جو عین وقت تک مجھ سے بقصد بڑا اہتمام مخفی رکھی گئی۔ جوش نے مجھ سے صرف اتنا کہا کہ اس موسم میں گھر میں بیٹھنے کو دل نہیں چاہتا، آیئے شام تک بھیگا جائے اور برسات کے مزے لوٹے جائیں۔ غرضکہ ہم تینوں آدمی تانگہ پر چلے، حضرت گنج گھومے، پھر دریا کی طرف رخ کیا، میڈیکل کالج والی شاہ مینا روڈ تک پہنچتے وقت بھی غروب آفتاب میں گھنٹہ بھر سے زیادہ کا وقت باقی تھا۔ وہاں سے آگے بڑھے شراب کی بوتل خریدی گئی اور تانگہ والے کو ہدایت دی گئی کہ نخاس کی طرف سے امین آباد چلو مگر وکٹوریہ اسٹریٹ پر حکیم صاحب کے مکان کے سامنے دفعتاً تانگہ رکوا دیا گیا۔ جوش صاحب تیزی سے اترے، رئیس احمد بھی پیچھے پیچھے لپکے، میں خود یہ نہ جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے اس لیے ساتھ ہو لیا۔ بارش شدت سے ہو رہی تھی۔ ہم لوگ بھیگ کر شرابور ہو چکے تھے۔ جوش نے دروازہ پر زور سے دستک دی۔ ایک عورت باہر نکلی، جوش صاحب نے کہا کہ حکیم صاحب سے کہدو کہ مریض کی حالت خراب ہے اس کو دکھانے لائے ہیں۔ وہ گھر میں جا کر پھر آئی اور کہا کہ حکیم صاحب نے آپ کا نام پوچھا ہے۔ جوش نے کہلا بھیجا کہ کہدو "عبدالصمد آیا ہے، فوراً آیئے، مریض جاں بلب ہے۔" بیچارے حکیم صاحب چھتری لگائے گھبرائے ہوئے باہر نکلے تو ہم لوگوں کو دیکھ کر قہقہہ لگایا۔ جوش نے بھی اسی انداز میں ایک ٹھٹا مارا اور کہا کہ "جان من ہم سب بھیگے ہوئے ہیں، کپڑے شرابور ہیں۔ مطب چلو تو کپڑے نچوڑ لیں تب حواس درست کر کے بات کر سکیں گے۔" حکیم صاحب اتنے سیدھے سادے فرشتہ خصلت انسان تھے کہ وہ یہ سوچ بھی نہ سکے کہ ان پر کیا جال ڈالا جا رہا ہے میں خود اس وقت تک کچھ نہ سمجھ پایا کہ آخر ہوگا کیا۔ حکیم صاحب

نے فرمایا کہ تم لوگ چلو، میں آتا ہوں"۔ مختصر یہ کہ ہم لوگ آگے بڑھ کر مطب پر تانگہ سے اترے، تانگہ چھوڑ دیا گیا اور جوش صاحب بوتل در بغل کوٹھے پر چڑھ گئے جو مطب کے اوپر تھا اور جہاں دعوتیں ہوا کرتی تھیں۔ قبل اس کے کہ حکیم صاحب تشریف لائیں، بوتل کھل گئی اور میگساری کا شغل شروع ہو گیا۔ گلاس اور پانی وہاں موجود ہی تھا اور ہم لوگوں کے ہاتھوں میں جام و سبو اٹھانے کی سکت تھی اس لیے کسی ضرورت کے لیے کسی آدمی کو بھی آواز نہیں دینا پڑی۔ ہم سب کی زندگی میں یہ سب سے پہلا اور یقیناً سب سے آخر موقع تھا جو روز روشن میں سیاہ کاری کے گنہگار ہوئے تھے۔

تھوڑی سی دیر کے بعد حکیم صاحب تشریف لائے اور اپنے کمرہ میں ایسی بدعت شعاری دیکھ کر کچھ برہمی اور کچھ تلطف کی آواز میں فرمایا "ارے یہ میرے کمرہ میں!" خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اور کیا کہتے اور کیا کیا کہنے والے تھے کہ جوش نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور فی البدیہی وہ نظم اپنے مخصوص لحن میں پوری طاقت سے شروع کر دی جس کا مطلع یہ ہے ؎

اٹھا ساغر کہ انساں کشتۂ آلام ہے ساقی
یہ ساغر ہے وہ مے آگے خدا کا نام ہے ساقی

بلا لحاظ اس امر کے کہ حکیم صاحب پر کیا گزر رہی ہے اور وہ کیا کیا سوچ رہے ہیں، جوش اپنی نظم کے سب اشعار ایک ایک کر کے پڑھتے گئے۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے تو حکیم صاحب کے چہرہ کی غصہ و برہمی والی سرخی ماند پڑ رہی تھی ؎

لڑکپن صدمے سہتا تھا جوانی دل کو روتی ہے
نہ جب آرام تھا ساقی نہ اب آرام ہے ساقی

اور جب یہ مقطع پڑھا تو حکیم صاحب کے مزاج کی کیفیت بدل چکی تھی اور وہ اپنے اصل موڈ میں آ چکے تھے

ادب کر اس خراباتی کا کہ جس کو جوش کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

جوش نے اسی نظم پر اکتفا نہیں کی بلکہ بلا توقف اور یکے بعد دیگرے اپنی نظمیں سناتے رہے۔ پے بہ پے جام چل رہے تھے اور بہ برتۂ مصاحب وقت کے تحت نظمیں اور اشعار ڈھل رہے تھے۔ یہاں تک کہ حسب ذیل شعر پر بوتل ختم ہوئی۔

خدا تیرے تخیل میں ہے قہار   بشر یاں رحمۃ للعالمیں ہے

اس نظم کو اس شعر پر ختم کیا تھا کہ

"صدا یہ دے رہا ہے عرش سے کون   کوئی کہہ دو مجھے فرصت نہیں ہے"

یہ رات ہماری زندگی میں ایسی پہلی اور آخری رات تھی جب بھیگے کپڑے ہمارے بدنوں پر رہے۔ جوش نے مسلسل اور پوری طاقت سے تین گھنٹے سے زیادہ مدت تک غزل سرائی کی اور حکیم صاحب کا غصہ اس جملہ پر ختم ہوا کہ "اس مردود نے بھی میرے سامنے پی لی"۔ اشارہ میری طرف تھا مگر "مردود" کا لفظ پر خلوص محبت کے صدہا سمندر اپنی معنویت میں جذب کیے ہوئے تھا۔ محفل ختم ہونے کے قبل بازار کی پوریوں اور کباب سے ہماری تواضع ہوئی، گھر کا کھانا نہیں منگایا البتہ برتن سب وہی تھے جو مخصوص دعوتوں میں استعمال کے لیے وہیں کوٹھے پر رکھے رہتے تھے۔ دوسرے روز صبح کو میں معذرت خواہی کے لیے حاضر ہوا تو فرمایا کہ اکرام مہمان شرعاً واجب ہے اس لیے تم لوگوں نے جو چاہا کر لیا میں برداشت کر گیا۔ رخصت ہوتے وقت آبدیدہ ہو کر مجھ سے بغل گیر ہوئے۔

جوش ملیح آبادی کی رندی و میخواری اور حکیم صاحب کے تقدس و ورع میں اتنا شدید بنیادی اختلاف تھا کہ ان دونوں محترم ہستیوں کا بیک وقت اور اس حالت میں کہ ایک سبحہ بدست اور دوسرا جام بکف ہو ایک جگہ مجتمع ہونا امر محال تھا۔ مگر جوش صاحب نے حکیم صاحب کی ادب پرست کمزوری اور ان کے محبت بھرے دل کی گہرائی کا جائزہ لے کر ایک ایسی اسکیم بنائی اور ایک ایسا ڈرامہ کھیلا کہ وہ امر محال ایک کھلا ہوا ممکن بن گیا۔ حکیم صاحب کا جذبہ اخلاص و تواضع نے ہماری سیاہ کاری گوارا کی اور ساغر انقلاب کی بادہ خواری کو تھوڑی سہی مگر خندہ پیشانی کے ساتھ انگیز کر لیا۔ دوسرے روز اسی وقت مقررہ پر میرے یہاں آئے لیکن جب رخصت ہونے کا ارادہ کیا تو جوش نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور وہ بیٹھ گئے۔ اور دیر تک شعر و شاعری سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ روزانہ اس طرح کی بہت دلچسپ صحبتیں گھنٹوں رہتی تھیں۔

جن کا سلسلہ برسوں چلا۔ جوش صاحب کبھی سنجیدہ کلام کرتے، کبھی ایسا کلام سناتے، کبھی فحشیات پر اتر آتے اور یہ سب کچھ قریب قریب ہر روز ہوتا تھا اور ہمہ وقت حکیم صاحب شریک رہتے تھے۔ ہر ہفتہ میں صرف ایک رات شبِ جمعہ ہوتی تھی جب ان کی عدم موجودگی ہم سب بری طرح محسوس کرتے تھے۔ وہ شب ان کے لیے زیارات و عبادات کے لیے مخصوص رات ہوتی تھی۔ قارئین کرام کے پیشِ نظر جوش کا سارا کلام ہوگا اس لیے وہ کیا کیا پڑھا کرتے تھے کوئی شعر یا نظم مثالاً پیش کرنا بھی بے سود ہے، ان کے ستری لطائف و ظرائف کو من و عن نقل کر دینا بھی مشکل ہے۔ اسی طرح ان کے مکتوبات کا نمونہ پیش کرنے کا بھی یہ موقع نہیں، ورنہ ان کے ایک خط کا پورا متن درج کیا جا سکتا تھا۔ یہ خط انھوں نے میرے احتشام مرحوم اور حکیم صاحب کے بارے میں ایک بار تحریر فرمایا تھا۔ خط میرے نام تھا، پشت پر دوسری عبارت حکیم صاحب کے نام تھی جو ان کو دکھا کر خط محفوظ کر لیا گیا۔ یہ خط بھی ان کے دوسرے خطوط کے ہمراہ میرے پاس محفوظ ہے

زبانی تفریحی گفتگو میں جو بے تکلف دوستوں سے ہلکی پھلکی بات چیت میں ہوتی ہیں، فحشیات کا اس قدر شدت ماضی کی دنیا میں بھی رواج تھا مگر اس آزادی پر بھی پابندیاں تھیں۔ صحبت میں کوئی بزرگ، کوئی خورد یا کوئی استاد دوست یا ملاقاتی آجاتا جس سے بے تکلفی زیادہ نہ ہوتی تو گالی بکنا عیب میں داخل تھا۔ اسی طرح آپس میں دوستوں کو گالی دینے میں بھی یہ خیال رہتا تھا کہ اس بدکلامی کی چھینٹیں مخاطب کے بزرگوں پر یا اس کے چھوٹوں پر نہ پڑیں۔ عمائدین کے دربار میں انھیں اصولوں کے تحت مصاحبین آپس میں گالم گلوج کر لیا کرتے تھے لیکن مہاراجہ ایک تبسم زیر لب سے زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے۔ عالموں اور ثقات کی محفلوں میں گالیاں تو درکنار رکیک اور پست باتوں سے بھی سختی کے ساتھ اجتناب کیا جاتا تھا۔ بازار میں یا باعلان شرفا میں کبھی فحشیات کا دستور نہیں تھا۔ حکیم صاحب کا شمار اہل ثقات میں تھا اور وہ ثقہ تھے بھی۔ ان کی زبان سے کبھی کوئی مبتذل لفظ نہیں نکلا مگر جوش صاحب کی صحبتوں میں ہم ایسے بے تکلفوں کو خوب سناتے تھے جس کو ہم سب بخوشی خاطر قبول کرتے تھے۔ میرے یہاں رات کی صحبتوں میں متعدد بار ساری صحبت اسی قسم کے تفریحی خرافات میں ختم ہو جایا کرتی تھی۔ ایسی ساری باتیں نظم میں ہوتی تھیں اور ایسے اشعار زیادہ تر جوش صاحب ہی فی البدیہہ کہہ کر سنایا کرتے تھے موجود ہو۔ کسی غائب کے بارے میں ایسی باتیں کہنا نہ صرف معیوب بلکہ گناہ سمجھا جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ واقعات سننا بھی ناگوار ہوں مگر ہم ایسے پرانی تہذیب کے پرستار ان فحشیات کو انھیں کے مخصوص محل و مقام پر سن کر بہت لطف اندوز ہوتے تھے ہماری شام کی نشستیں ایسے ہی فحشیات کے سبب سے اور زیادہ پرلطف اور دلکش ہو جاتی تھیں لیکن ایسی تفریحیں صرف جوش کی بدولت نصیب ہوتی تھیں۔ سنجیدگی اور متانت سے فکری اور ذہنی مذاکروں یا شعر سخن کی گرمیوں میں حکیم صاحب کا بھی برابر کا حصہ تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ ساری رونق جوش اور صاحب عالم کے دم سے تھی۔ صاحب عالم کے شریک ہونے کے قبل ان انجمنوں میں شعریت تھی مگر سخن نہیں تھا، یہ ابر گلستاں تھا مگر بہار نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اشعار کی داد زبان و عمل سے دینے والا حکیم صاحب کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ آئے دن وہ لذیذ غذاؤں سے تواضع کرتے تھے۔ یہ چیزیں مخصوص طور پر ان کے گھر سے پک کر آیا کرتی تھیں جن سے صرف بادہ آشنایانِ جوش کام و دہن لذت اندوز ہوتے تھے۔ سامعین میں بڑی تعداد حضرات ثقات کی ہوتی تھی جو اس بزم میں صرف ضیافت گوش کے قائل تھے۔ لذت زبان ان کے عقیدۂ حرمت شراب نے ان پر حرام کر رکھی تھی۔ اس سلسلے میں بے شمار دعوتوں میں سے ایک تواضع کا واقعہ دلچسپ بھی ہے اور حکیم صاحب کی سیر چشمی اور دریا دلی کی بہترین مثال ہے۔ جوش صاحب قریب قریب ہر شام کو اپنا کلام سناتے تھے۔ سننے والے اگر صاحب مذاق ہوں اور ان سے شاعر کو صحیح داد ملنے کی توقع ہو تو اس کا بھی دل بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنا اچھے سے اچھا کلام بہتر سے بہتر طریقے پر ایسے لوگوں کو سناتا ہے۔ یہی حال ہمارے یہاں تھا۔ سننے والے سب ہی بلند ترین مذاق کے حامل تھے اور سخن فہمی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے جوش صاحب بھی پوری طاقت سے اپنا تازہ ترین اور بہترین کلام سنایا کرتے تھے۔ ایک شام کو انھوں نے اپنی وہ نظم پڑھی جس کے قوافی اور ردیف "جہاں میں تھا، وہاں میں تھا" تھے۔ ساری نظم مرصع تھی مگر حاضرین اس

ملک کے ممتاز ادیبوں کو





راتر پردیش، شری اکبر علی خاں نے گزشتہ ۴ اگست کو
ج بھون لکھنؤ میں ملک کے ممتاز ادیبوں اور مصنفوں
عامات تقسیم کیے (اوپر) تصویر میں ہندی کے مشہور
یب اور ناول نگار شری امرت لال ناگر (وسط میں)
سہ نسیم بانو قدوائی اور (نیچے) شری لیلادھر شرما پرتبھ
رے انعامات حاصل کرتے ہوئے



۷۳-۷۴ء کا ادبی ایوارڈ



ایچ۔اے۔ایل (H A L) فیکٹری لکھنؤ میں کام کا ایک منظر



اسکوٹرانڈیا لکھنؤ کارخانہ کی ایک جھلک



خاندانی منصوبہ بندی کیمپ ہردوئی میں دیہات کے باشندوں کو خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں صلاح دی جارہی ہے



کھُرولی (ضلع مرزاپور) میں باشندگان موضع کے لیے سوگیلن کی پینے کے پانی کی ٹنکی

شعر پر وجد میں آگئے۔

کنارِ آبِ جو میدان کے دھندلے کنارے پر
محبّت کا کلیجن کھولے خراماں تھی جہاں میں تھا

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور یہ شعر بار بار پڑھوایا۔ اس نشست کی یہ آخری نظم تھی۔ جوش کی زبان میں جیسا کہ وہ اس نشست میں کہا کرتے تھے روحانیت ختم ہوکر مادیت کی باری آگئی تھی یعنی یہ کہ مے گساری ختم اور کھانا شروع ہونے کی منزل تھی۔ دفعتاً جوش نے حکیم صاحب سے تفننِ طبع میں کہہ دیا کہ کل کوئی اچھی چیز کھلاؤ تو اس سے بہتر نظم سناؤں گا۔ حکیم صاحب بیقرار ہوکر کرسی سے کھڑے ہو گئے اور کئی بار کہا جو کہو وہ کھلاؤں گا" جوش نے برجستہ کہا" مرغ مسلّم، لیکن ایک مرغ۔" حکیم صاحب نے فرمایا کہ" فرمائش منظور لیکن یہ بھی بتادو کہ کتنے مرغ آئیں گے اس لیے کہ یہاں کھانے والوں کی تعداد معین نہیں ہے کسی روز چھ سات ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی بس گیس بھی ہو جاتے ہیں"۔ مختصر یہ کہ کافی غور و خوض کے بعد سات عدد مرغ مسلّم کی تعداد طے ہوگئی۔ دوسرے روز حکیم صاحب نے صرف سات مرغ مسلّم ہی پکوا کے نہیں بھیجے بلکہ ان کے ساتھ کثیر تعداد و مقدار میں گاؤ زبانیں اور بالائی بہت عمدہ قسم کی بھیجی۔ بادہ آشاموں نے اس روز اپنے پیٹ کو اسا بٹ نہیں سمجھا اور انتقامی جذبہ کے ساتھ خوش خوراکی کی حد کر دی۔ حکیم صاحب اور دیگر حاضرین کی قسمت میں" دور کا جلوہ" شامل حال رہا۔

حکیم صاحب مالمرحوم کی محبت و اخلاص اور جذبہ نوازش کا کچھ ذکر اوپر آچکا لیکن ان کی شرافت نفس کا مختصراً ہی سہی مگر کچھ بیان آجانا بھی ضروری ہے۔ ہم میں سے بعض بادہ نوش ایسے بھی تھے جو تنگ حوصلہ اور سگِ طرف تھے۔ ان کے لغویات کو جوش کنٹرول کرتے رہتے تھے پھر بھی وہ کبھی کبھی اتنے بدلگام ہو جاتے تھے جب کو لکھنؤ کی متانت اور تہذیب برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ حکیم صاحب ایسے مواقع پر زبان سے کبھی کچھ نہیں کہتے تھے۔ البتہ شائستگی کے ساتھ اہل ورع ساتھیوں کی طرف مخاطب ہوکر انتہائی سادگی کے ساتھ جوش کی توجہ لغویات کی طرف مبذول کرا دیتے تھے۔ ان کے اس مہذب کردار کی مثال ملنا بہت دشوار تھا۔ ایسی لغویات کے ہم لوگ بھی مجرم ہوئے تھے مگر صرف ایک مرتبہ جس کے نتیجہ میں حکیم صاحب کو غیر معمولی زحمت اور ہم سب کو غیر معمولی خفت برداشت کرنا پڑی تھی۔ ایک رات کو نشست ختم ہونے کے بعد کھانے سے فراغت کرکے سب رخصت ہونے لگے تو حکیم صاحب نے ان سے کہا کہ تم لوگ کھانا کھاتے رہتے ہو ہم دیکھا کرتے ہیں، جی چاہتا ہے کہ ایک وقت تمھارے ساتھ کھانا کھائیں" جوش صاحب نے فرمایا کہ جب کہو انھوں نے کہا کل دوپہر کو ہی سہی" جوش صاحب نے منظور کر لیا اور یہ بھی وعدہ ہو گیا کہ وہ رئیس احمد خان اور مجھ کو ساتھ لے کر ان کے یہاں ایک بجے دوپہر تک پہنچ جائیں گے۔ شومیِ قسمت سے اس گفتگو اور ایسے معاہدہ کا مجھے علم نہ ہو سکا اور جوش صاحب نے رات کی ساری بات دن کو بھلا دی۔ انھوں نے اپنے گھر پر اور میں نے اپنے یہاں کھانا کھا کر فراغت حاصل کر لی مگر حکیم صاحب مع اپنے دیگر احباب کے کھانا تیار کرائے برابر انتظار کرتے رہے بالآخر دو بجے مجھے رقعہ لکھ کر حالات سے مطلع کیا۔ میں فوراً جوش کے یہاں گیا، ان کو اور رئیس احمد کو ساتھ لے کر حکیم صاحب کے یہاں پہنچا تو سہ پہر کے ۳ بج رہے تھے، دس بارہ حضرات جو مدعو تھے بھوکے بیٹھے تھے اور حکیم صاحب نے بڑی پرتکلف دعوت کا انتظام کئے ہوئے بجید ملول ہم لوگوں کے انتظار میں مایوسی کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ مگر واہ ری شرافتِ نفس اتنی بڑی لغویت کو بھی انھوں نے ہم لوگوں کو دیکھ کر دو جملوں میں ٹال دیا۔ ہم بھی خجالت کے ساتھ حاضرین سے معذرت خواہی کرکے مطمئن ہو گئے۔

اس گردشِ لیل و نہار میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ چار ہم خیال، ہم مذاق اور ہم رنگ دوست احباب ہمیشہ مل جل کر اور ہنس کے اپنی پوری زندگی گزار دیں، ہر بہار کے لیے خزاں اور ہر وصال کا خاتمہ ہجر پر ہوتا ہے۔ پھر بھی ہماری یہ نشستیں اور ملاقاتیں بہت دنوں تک چلتی رہیں مگر بالآخر ختم ہوکر رہیں۔ جوش کے لیے کسبِ معاش کی ضرورت سخت سے سخت تر ہوتی گئی۔ حصول آزادی کے بعد جب حکومت قومی نمایندوں کو تفویض ہوئی تو ہر شعبہ کا انتظام ہمارے ہاتھوں میں آیا، مرکزی حکومت کے ماہانہ اردو رسالہ کے لیے ایک اچھے مدیر کی ضرورت پیش ہوئی اور اس جگہ پر جوش کا تقرر ہو گیا۔ وہ دلی چلے گئے۔ تخمیناً ایک سال کے بعد کچھ دنوں کے لیے لکھنؤ آئے اور ہم لوگوں نے ایک

بار پھر مل بیٹھنا مناسب اور ضروری سمجھنا۔ اس صحبت میں سب پرانے دوست تھے اور بہت سے نووارد بھی تھے۔ جوش صاحب کے چلے جانے کے بعد میرے مکان کی ہیئت بدل گئی تھی وہ قطعۂ زمین جو پہلے سبزہ زار تھا اور جہاں شام کو ہماری نشستیں ہوا کرتی تھیں اب میں نے اس کو زیر کاشت کر لیا تھا۔ مجھے ترکاریاں بونے کا شوق بچپن ہی سے تھا جو عہد شباب میں عدیم الفرصتی کے سبب سے چھوٹ گیا تھا۔ جوش کے چلے جانے کے بعد فراغت کی بہتات نے اس ذوق کی طرف پھر آمادہ کر دیا جس کے نتیجہ میں کل جہاں ہم رندان بے پروا اخرام بیٹھا کرتے تھے آج منظم کیاریاں بنی ہوئی تھیں جن کو دیکھ کر کچھ لوگ خوش ہوئے مگر جوش نے صاحب عالم کو مخاطب کر کے برجستہ یہ شعر پڑھا۔

بچھتی تھی شعر و بادہ کی جس جا کبھی بساط
اب وہ زمین کھیت میں تبدیل ہو گئی

حکیم صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور یہ بزم آزردگی کی فضاؤں میں شروع ہو کر بہت جلد ختم بھی ہو گئی۔ وہی شاعر انقلاب تھا اور وہی پہلے والے سامعین تھے مگر جدائی کے ایک بہت طویل وقفہ کے بعد یہ وصال نصیب بھی ہوا تو اس طرح کہ بہت جلد منتشر ہو جانے کا خدشہ سامنے تھا۔ گزشتہ بزم آرائیوں کے تسلسل کا حسن مٹ چکا تھا اور آئندہ کے لیے اتنی توقع بھی نہ تھی کہ کل پھر ایک دوسرے کے ساتھ اسی جگہ اور اسی مقصد کے لیے مجتمع ہو سکیں گے۔ بہرحال چند گھنٹوں میں جو بھی جیسی بھی مسرتیں بٹوری جا سکیں بٹور لی گئیں اور وہ محفل اس طرح ٹوٹی کہ پھر کبھی ایک بار بھی جمنا نصیب نہ ہو سکا۔ جوش صاحب کا دلی سے آنا بھی دو ایک بار ہوا تھا اس طرح کہ آج آئے اور کل چلے گئے۔ دو روز کے لیے آئے تو ایک دن ملیح آباد میں گزرا اور دوسرے روز فرداً فرداً لکھنؤ کے دوستوں سے ملاقاتیں کر لیں۔ بالآخر وہ ادھر ہی سے پاکستان منتقل ہو گئے۔ حکیم صاحب باقی رہ گئے مگر ان کے لیے دوسرا سفر مقدر ہو چکا تھا۔

حکیم صاحب کی وضعداری بھی اپنی آپ مثال تھی۔ میں نے جنوری ۱۹۴۰ء میں اپنے موجودہ مکان میں سکونت اختیار کی تھی اسی دن سے شاید ہی کوئی شام بلاوجہ ایام عزا یا کسی خاص معذوری کے ایسی رہی ہو جس دن وہ نہ آئے ہوں۔ جوش کی محفلیں بند ہونے کے بعد بھی وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ضرور قیام فرماتے تھے۔ آخری آنا ایسا تھا کہ نصف گھنٹہ سے زیادہ نہ ٹھہرے۔ اس مختصر دوران قیام میں وہ زیادہ تر خاموش رہے اور آخر خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ ان کے بدلے ہوئے حالات کو نہ صرف میں نے بلکہ میری کم سن لڑکی نے بھی محسوس کیا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے فی الفور یہ جملہ کہا کہ "آپ" آج کچھ بہت پریشان ہیں۔ میں نے طے کیا تھا کہ صبح کو جا کر تنہائی میں تغیر و تردد کی وجہ دریافت کروں گا مگر رات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دو بجے جگا دیا گیا۔ حکیم صاحب بیمار تھے اور مجھے فوراً یاد کیا تھا۔ میں بلا تاخیر پہنچا تو دیکھا کہ درد دل کی وجہ سے شدید کرب میں تڑپ رہے تھے۔ ڈاکٹر آ گئے۔ انجکشن لگتے رہے، دوا علاج ہوتا رہا مگر نہ مرض گیا اور نہ کوئی قابل لحاظ افاقہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ مرض جان کے ساتھ رہے گا، قلب کے شرائین کو جو نقصان پہنچ چکا ہے اس کا ازالہ ناممکن ہے۔ خود بھی حکیم تھے، اپنی حالت اچھی طرح سمجھتے تھے اس لئے دنیا کو ہر وقت خیرباد کہنے کے لیے آمادہ رہنے لگے۔ پھر نہ کبھی چہرے پر بشاشت آ سکی اور نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ میل ملت کا وہ دلدادہ جو ہمہ وقت دوستوں کی صحبت کا متلاشی رہتا تھا اب دائمی طور پر گھر کی چار دیواری اور تنہائی میں مقید رہنے لگا تھا۔ عیادت کرنے والوں سے بھی دو چار جملوں سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ گھر میں ان کے علاوہ صرف ایک دائمی مریض ان کی اہلیہ رفیقۂ حیات تھیں۔ ان کے صاحبزادگان پاکستان میں برسر ملازمت تھے۔ ان کو یہاں کے حالات معلوم ہوئے تو وہ لوگ آ کر اپنے والدین کو ساتھ لے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد یہ خبر ملی کہ حالت روبا صلاح ہے۔ مگر بہت جلد یہ بھی سن لیا کہ اچھے خاصے تھے، جوش ملیح آبادی جو بہت پہلے سے پاکستان منتقل ہو چکے تھے، ان سے ملنے آئے، ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ دوران گفتگو میں کسی بات پر ایک قہقہہ مارا اور فوراً حرکت قلب بند ہو گئی۔ یعنی یہ کہ ہنس بول کر اس دنیا سے جھلا گئے اور دوسری منزل آباد کر لی۔

پاکستان جانے کے بعد ہمارے درمیان صرف ایک بار مراسلت

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

غزل

صوفی حیدرآبادی

خدارا کیجیے کوئی بات تو حضرت، ٹھکانے کی
یہ باتیں آپ کی باتیں ہیں آنے کی نہ جانے کی

مری دوری کا غم، اے ہم نشینو پھر سے کر لینا
منا دو خیر پہلے اپنے اپنے آشیانے کی

کبھی یونہی بہ فرطِ ضبطِ غم ہم پھوٹ پڑتے ہیں
کہاں فرصت بھلا فکرِ سخن میں سر کھپانے کی

کمال و فن کی شہرت میں کمال و فن کا فقداں ہے
کہیں کیا ہم زمانے کو، یہ حالت ہے زمانے کی

کیا پامال ایسا ہم کو بیدادِ زمانہ نے
قدم کیسا، نہیں ہم میں سکت سر تک اٹھانے کی

بھلے ہیں اور بھلے بھی ساری دنیا سے بھلے ہیں وہ
بُرے ہم ہیں، برائی ہم میں ہے سارے زمانے کی

ملائیں "ہاں" میں "ہاں" تو دوست، سچ کہیے تو دشمن ہیں
بتاؤ اب کہ خود بدلیں کہ خو بدلیں زمانے کی

بنائیں لاکھ باتیں، ہم صفیرانِ چمن لیکن
نہیں ہم کو توقع اب بہارِ رفتہ آنے کی

فلک سے تارے، آنکھوں سے مری آنسو برستے ہیں
ادا جب یاد آتی ہے کسی کے مسکرانے کی

خدا رکھے سلامت میری دنیائے تصور کو
کہیں اب مجھ کو جانے کی ضرورت ہے نہ آنے کی

عداوت پیٹھ پیچھے، منہ پہ باتیں دوستوں کی سی
یہ عادت تو پرانی ہے، ارے ناداں، زمانے کی

کہی ہم نے غزل یہ طرفہ بیماری کی حالت میں
کہ تھی منظور ہم کو لاج رکھنی دوستانے کی

نہ جانے، کیوں یہ اب محسوس ہوتا ہے مجھے صوفیؔ
زمانے کو نہیں، مجھ کو ضرورت ہے زمانے کی

افسانہ

پتھر کے صنم

★ ———— م۔ ق۔ خان

ریل گاڑی کی سست رفتاری سے وہ بُری طرح اُکتا گئی تھی۔ اُسے کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ اس نے باہر دیکھا۔ باہر چٹیل میدان بے آب گیاہ کسی بیوہ کی آنکھوں کی طرح ویران تھا۔ تاحدِ نظر اجاڑ اور سنسان منظر سے ٹکرا کر اس کی نگاہ لوٹ آئی۔ وہ پاس پڑی کتاب کے اوراق الٹنے لگی۔ اجنبی نگاہ سے ابھی دو چار جملے ہی پڑھے تھے کہ گاڑی اسٹیشن پر آرکی۔ سامنے والی برتھ پر بیٹھی عورت کی دونوں بچیاں مچلنے لگیں۔ وہ ہر ہاکر سے کچھ نہ کچھ خریدنا چاہتی تھیں۔ ماں نے انھیں کندھے پکڑ کر اپنی نشستوں پر بیٹھا دیا۔ وہ بُری طرح جھنجھلا گئی تھی اور بچوں کو ڈانٹ پھٹکار رہی تھی۔ ماں کے اس سفاکانہ برتاؤ سے اس کا دل رو اٹھا لیکن وہ خاموش رہی۔ مسافروں کی ریل پیل شروع ہو چکی تھی اور اس کے خیالوں کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

چند منٹوں کے بعد گاڑی اسٹیشن کی ٹیڑھی میڑھی، بل کھاتی لائنوں سے گزرتی ہوئی شہر سے باہر آ گئی۔ لائن کے دونوں جانب ہرے بھرے کھیتوں میں شام کی خنک ہوا سرسرا رہی تھی اور گرما دھان کے پودے مستانہ وار جھوم رہے تھے۔ اس کی بے چین نگاہیں پودوں سے پھسلتی دُور افق کی پہنائیوں میں جہاں نیل گگن دھرتی سے گلے مل رہا تھا کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ نگاہوں سے بھی تیز رو تخیل کے شہپر ماضی کی حسین و جمیل وادیوں میں اڑان بھر رہے تھے۔ وہ آنکھیں بند کرتی تو اعجاز آنکھوں کی پُتلی میں سمٹ کر سما جاتا اور آنکھیں کھولتی تو ہوا میں تحلیل ہو جاتا جیسے کوئی واہمہ ہو! وہ انھیں بھول بھلیوں میں کھوئی تھی کہ اس نے محسوس کیا کوئی اس کا آنچل کھینچ رہا ہے۔ وہ سمٹنے لگی جیسے لاجونتی ہو لیکن گرفت اور مضبوط ہو گئی تو وہ چونک پڑی۔ سامنے بیٹھی چھوٹی بچی اس کے پاس آ کر کہہ رہی تھی "ماں، ماں، میں تم سے نہیں بولتی۔ میں آنٹی سے بات کروں گی۔ آنٹی کے گھر جاؤں گی۔ ہے نا آنٹی؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن سپنوں کے شیش محل چکنا چور ہو گئے۔ اعجاز اس کی پیاسی آنکھوں سے بالکل دور ہو گیا۔

"آنٹی، آپ کہاں جا رہی ہیں، میکے یا سسرال؟"

اس معصوم سوال نے اُسے عجیب کش مکش میں ڈال دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس بچی کی جانب دیکھنے لگی۔ بچی نے گم سُم دیکھا تو ایک سوال اور کر دیا "کیوں آنٹی، آپ بھی کسی سے روٹھی ہیں کیا؟"

لوگ ہنس پڑے۔ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رُکی۔ قہقہے اترنے والے مسافروں کے ہنگاموں میں گم ہو گئے۔ وہ تر برلڑکی اُچک کر ماں کے قریب چلی گئی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی کم سے کم ایک گھنٹہ اور گاڑی پر رہنا تھا۔ شام کے سرمئی آنچل میں شفق سرخی کی بیل لگا رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی اس کی آرزو میں دلہن بننے کو ہیں یا ان کی چتا روشن تھی۔ اب ریل ایک گاؤں کے قریب سے گزر رہی تھی مویشیوں کے گلے قلانچیں مارتے، ڈکارتے گھروں کی جانب جا رہے تھے اور چرواہے، چرواہے مُرلی گنگا کی ریت پر بیٹھ کر اعجاز کے ساتھ گزری شاموں کی یاد آ گئی۔

اگلے اسٹیشن پر سامنے کی برتھ خالی ہو گئی۔ گو وہ ان کی موجودگی سے بے تعلق سی تھی لیکن ان کے جاتے ہی اسے عجیب سی خلا کا احساس ہونے لگا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ باہر کی دنیا نے سیاہ لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ تاریکی ہر شے کے خدوخال نگل چکی تھی۔ البتہ کھڑکی سے ترچھی

اچھلتی روشنی اس تاریکی سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ ماحول پر مسلط افسردگی جیسے اس کے اپنے دل کی ویرانی کی غمازی کر رہی تھی۔ خیال آیا "اعجاز اتنی بلندی پر پہنچ کر اسے یکسر بھول نہ گیا ہو" اس کا دل ڈوبنے لگا۔ آنسوؤں کے موتی آنکھوں کی سیپ سے نکل نکل کر رخسار پر آویزاں ہو رہے تھے۔ نہ کسی فیصلے پر دل ٹھہرتا نہ کسی نقطۂ نگاہ پر! چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے کھڑکی پر سر ٹیک دیا۔ باہر سے ہوا کا ایک سرد آوارہ جھونکا اس کے گال تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا۔ دل کے کسی گوشے سے آواز آئی "اعجاز پتھر کا صنم نہیں۔ وہ محبت کا خدا ہے" اور اعجاز کی وہ تصویر جب وہ انگلینڈ کے لیے رخصت ہو رہا تھا اس کی نظروں میں پھر گئی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ آنکھیں روتے روتے لال ہوگئی تھیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ شک وشبہ کا عفریت اس کے ذہن کے ہی ہر دریچے سے جھانکنے لگا۔

جب کسی صورت صبر و قرار کا دامن ہاتھ نہ آیا تو اس نے خط نکال کر پڑھنے کی کوشش کی۔ کمپارٹمنٹ کا قمقمہ مفلس کے چراغ سا بجھا بجھا سا تھا۔ اس کی اونگھتی روشنی میں حروف آپس میں گڈمڈ ہوتے ہوئے معلوم پڑنے لگے۔ ذرا اور نظریں گڑائیں تو آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ نینوں کے کٹورے چھلک پڑے۔ حروف رینگتے کیڑے معلوم پڑ رہے تھے۔ وہ ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکی۔ اس نے گردو پیش کا جائزہ لیا کہ کہیں کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ چونک پڑی کہ گاڑی بانکی پور جنکشن میں کھڑی تھی اور سارا ڈبّا پہلے ہی خالی ہو چکا تھا۔ وہ اتر کر پلیٹ فارم پر آگئی۔ لوگوں کا جم غفیر اوور برج (OVER BRIDGE) پر گتھم گتھا اسٹیشن سے باہر جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پیر من من بھر بھاری ہو رہے تھے۔ وہ جوں توں ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ اس کی زبان پر فیض احمد فیض کا یہ شعر تھا ؂

سلجھائیں بے دلی سے یہ الجھے ہوئے سوال
واں جائیں، یا نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم

وہ اسی ادھیڑ بن میں اسٹیشن سے باہر آگئی۔ قدم بڑھتے گئے، ایک انجانی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ ایک رکشا پر سوار ہو گئی۔ رکشے کا پہیا چکر کاٹنے لگا۔ راستہ کٹنے لگا۔ اس کی متجسس نظریں پیڈل پر مرکوز ہو گئیں جو ہوا میں دائرے بنا رہا تھا اور رکشے والا زیر لب کسی فلم کا گانا گنگنا رہا تھا۔

وہ گہری سوچ میں تھی کہ دور سے ہی الفسٹن کی جگمگاتی عمارت اور فلموں کے بڑے بڑے، نظروں کو خیرہ کر دینے والے پوسٹر سے اس کا طلسم خیال چھناک سے ٹوٹ گیا۔ طالب علمی کا وہ خوشگوار سہانا زمانہ یاد آگیا جب دونوں ایک ساتھ اس ہال میں پکچر دیکھتے تھے یا لان میں گھاس پر بیٹھ کر گھنٹوں بات کرتے تھے۔ رکشا بڑھتا ہوا عدالت کے پاس سے گزرا۔ شہر رنگ و نور میں نہا رہا تھا۔ سڑک پر آدمیوں کا سیلاب سا امڈا ہوا تھا۔ رکشا سبزی باغ سے ہوتا ہوا پٹنہ مارکٹ سے گزر رہا تھا۔ پٹنہ مارکٹ، حسینوں کا بازار، دل پھینک عاشقوں کا نگار خانہ، پھر اسپتال جہاں نت نئے افسانے جنم لیتے ہیں۔ خدا بخش لائبریری، نادرات کا خزانہ، بے بہا ذخیرہ! کبھی تہہ نگاراں کی گہما گہمی میں کھو جاتی کبھی اپنے خیالات میں مستغرق ہو جاتی۔ یہاں کے ذرّے ذرّے میں اس کی محبت کی داستان بکھری تھی۔ یادوں کی بے شمار کرچیاں اس کے ذہن میں نشتر سے چبھونے لگیں۔ رکشے والے نے دیکھا کہ یہ کچھ نہیں بولتی تو ڈر سا گیا کیونکہ آگے شہر کا کم آباد حصہ تھا "حضور آپ کہاں جائیں گی؟"

"آں! یہ کون سی جگہ ہے؟"

"مہندرو آگیا"

"مہندرو آگیا؟ روک دو ـــــ اُف نہیں، سلطان گنج چلو"

"سلطان گنج؟ کس کے گھر؟؟"

"تم کس کس کو جانتے ہو؟"

"میں اسی محلّے میں تھانے کے پاس رہتا ہوں"

"ڈاکٹر اعجاز کو جانتے ہو؟"

"ڈاکٹر صاحب کو پورے شہر میں کون نہیں جانتا؟ آپ اُن کی مریض ہیں یا رشتہ دار؟"

"اُوہ! تمہیں کیا مطلب، کچھ ہوں!!" وہ بُری طرح جھنجھلا گئی۔ وہ کیا کہتی؟ کون سا روگ اس نے لگا رکھا ہے؟ ہ اس کا کیا رشتہ ہے؟؟؟

"معاف کیجیے حضور! غلطی ہو گئی"

ڈاکٹر اعجاز کے بنگلے کا احاطہ آگیا۔ ایک عریض و بسیط خطۂ زمین پر ایک خوشنما چھوٹا سا بنگلا سمندر کے بیچ بادبانی کشتی کی طرح کھڑا تھا۔ اندر

داخل ہو کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اندر سے روشنی کی آڑی ترچھی لکیریں کھڑکیوں سے چھن چھن کر بنگلے کے چاروں طرف لگے پودوں پر پڑ رہی تھیں۔ اس نے لرزتی ہوئی انگلی کال بیل پر رکھ دی۔ ٹرن، ٹرن، ٹرن کی آواز سے سارا بنگلا جھنجھنا اٹھا۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا جیسے اندر طوفان برپا ہو۔ سینے کے اندر دل یوں اچھل رہا تھا جیسے وہ اب باہر آکر ہی دم لے گا۔ چند ثانیوں کے بعد ایک نوجوان عورت باہر آئی۔ اس عورت نے اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا اور بے ساختہ بول اٹھی "آیئے مس شہلا، کھڑی کیوں ہیں؟ ڈرائینگ روم میں تشریف رکھیے"

"آپ نے میرا نام ...... ؟"

"یہ آپ کے چہرے سے مترشح ہے"

"میرے چہرے پر کیا ہے؟"

"چھوڑیے، آیئے میں شیریں ہوں۔ ڈاکٹر اعجاز کے ساتھ ایک سال سے کام کر رہی ہوں"

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی ہوئی شہلا نے پوچھا "ڈاکٹر اعجاز کہاں ہیں؟"

"وہ کلینک سے ایک گھنٹے میں آجائیں گے" شیریں نے جواب دیا۔

شیریں ڈاکٹر اعجاز کے خلوص، انکساری، غریب پروری، ہر دل عزیزی اور لگن کی رطب اللسان تھی اور شہلا محسوس کر رہی تھی کہ وہ سورج جس کی کشش اسے یہاں کھینچ لائی تھی اپنے محور سے ہٹ کر کسی دوسرے سیارے کی جانب جھک رہا ہے۔ زمین پر خوفناک بھونچال اٹھنے کو ہے۔ بھونچال جو اس کے وجود کو تہہ و بالا کر دے گا۔ وہ کھڑی ہو گئی کہ بغیر ملاقات کیے واپس لوٹ جائے لیکن اسی وقت ایک کار پورٹیکو میں آکر رکی۔ شیریں نے جھپٹ کر دروازہ کھولا اور ڈاکٹر کی پیشس قدمی کرتی ہوئی ڈرائنگ روم کی جانب آئی اور ڈاکٹر کو چھوڑ کر اندر چلی گئی۔

ڈاکٹر کی نظر اچانک شہلا پر پڑی تو ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس پر ایک عجیب سکتے کا عالم تھا۔ زمین پاؤں کے نیچے سے سرکتی ہوئی معلوم پڑ رہی تھی۔ کمرے کی دیواریں خونی پنجوں کی طرح بڑھتی ہوئی اس کا گلا دبوچنے کو چلی آرہی تھیں۔ ہر طرف شہلا ہی شہلا نظر آرہی تھی۔ ابھی نہ جانے وہ کتنی دیر تک اسی محویت اور استعجاب کے عالم میں ڈوبا رہتا کہ شہلا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے، چہرہ فرطِ جذبات سے تمتما رہا تھا لیکن الفاظ جیسے اس کے حلق میں منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ باوجود کوششوں کے وہ اپنے قدم نہ بڑھا سکی۔

"شہلا تم ..... ؟"

"جی ہاں ....." اور شہلا نے بیگ سے نکال کر خط میز پر رکھ دیا۔

اس نے خط دیکھا ہی تھا کہ اچھل پڑا۔ خط الٹ پلٹ کر دیکھا اور دہاڑا "یہ سازش ہے، میں نے یہ خط تمھارے پاس بھیجا ہے؟"

"بے شک آپ نے یہ خط شہلا کے پاس نہیں بھیجا، لیکن ذرا غور سے دیکھیے لکھا آپ نے ہی ہے، اچھی طرح یاد کیجیے ایک سال پہلے آپ نے ہی لکھا تھا"

ڈاکٹر گھائل پنچھی کی طرح شیریں کو گھورنے لگا۔ اس نے کندھے جھٹکا کر شان بے نیازی سے کہا "یہ اب اس قابل نہیں کہ میری شریک زندگی بن سکیں۔ انھیں اعلیٰ سوسائٹی کے ایٹی کیٹس معلوم نہیں نہ میں ان کے ساتھ اڈجسٹ (ADJUST) کر سکتا ہوں۔ میں اپنی زندگی نہیں برباد کر سکتا"

شہلا کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس نے چاہا کہ ایک بار اعجاز کو بھر نظر دیکھے اور ہمیشہ کے لیے راستے سے الگ ہو جائے لیکن اس کی کوشش کے درمیان آنسوؤں کا دریا حائل ہو گیا۔ وہ اپنا بیگ سنبھالتی ہوئی باہر جانے لگی۔

"ٹھہرو!" شیریں نے تحکمانہ انداز میں شہلا کو روکا۔

"انھیں جانے دو شیریں! ان کے لیے یہی بہتر ہے" ڈاکٹر نے عاجزانہ انداز میں شیریں سے کہا۔

"جانے دوں، شہلا کو جانے دوں؟ اور میں آپ کے ساتھ شادی رچا لوں؟ نہیں! شہلا بہن کی معصوم زندگی، بے لوث محبت کی لاش روندتی ہوئی میں حجلۂ عروسی تک نہ جا سکوں گی۔ میں ایک پل بھی

خوش نہیں رہ سکوں گی۔ ان کی یہ آنکھیں، ان کا آنسوؤں سے تر اور چہرہ میری زندگی کی ہر خوشی کو سانپ بن کر ڈستا رہے گا۔ میں جاتی ہوں ـــــ خدا حافظ!"

"شیریں، مائی ڈارلنگ! تم کو کیا ہو گیا؟ تم کہاں جا رہی ہو؟"

"مجھے کچھ ہوا نہیں ہے۔ میں جا رہی ہوں جہاں قسمت لے جائے۔ جس آستانے پر سجدہ ریزی کرنا میں فرض سمجھتی تھی، جس خدا کی پرستش میرا ایمان تھا وہ ہرجائی ہے وہ خدا نہیں پتھر کا صنم ہے پتھر کا صنم! جو معصوم زندگیوں سے کھیلا جاتا ہے جس کے لیے محبت کا لفظ دانہ دام ہے ایک حسین فریب!"

"تم کیا کہہ رہی ہو شیریں؟ تمھیں کس نے ورغلا دیا۔ شہلا نے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ذرا تو سمجھ سے کام لو۔"

"معاف کیجئے اس میں شہلا کا کوئی قصور نہیں۔ میں اپنا ایک پرانا البم تلاش کر رہی تھی کہ ایک ٹرنک میں یہ خط ملا جو آپ نے شہلا کو لکھا تھا لیکن پوسٹ نہیں کیا تھا آپ دیکھ لیجئے یہی خط ہے نا! اس کے علاوہ اور بھی بہت سے خطوط ملے جن سے میں سب کچھ جان گئی مجھے صرف شہلا بہن کا انتظار تھا کہ ان کی امانت انھیں سونپ دوں اور ... "

وہ میری محبت نہیں کم عقلی تھی سہلا کے لیے میرے دل میں آج بھی بڑا احترام ہے وہ میری رفیقۂ حیات نہیں بن سکیں یہ میری مجبوری ہے"

"خدا کے لیے اپنے الفاظ کو چبھتے نشتر نہ بنایئے۔ اگر محبت کرنے کا یہی انجام ملا تو لوگوں کو محبت کے نام سے گھن آئے گی لوگ اس لفظ پر تھوکیں گے اور وفا کا لفظ حرف غلط بن کر رہ جائے گا۔ خیر بحث سے کیا فائدہ خدا حافظ!"

"شیریں، شیریں، شیریں!" ڈاکٹر کی آواز فضا میں گونجتی رہی، کئی بار دیواروں سے بازگشت ہوئی اور پلک مارتے شیریں سارہ فراٹے بھرتی خاک اڑاتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

شہلا مبہوت ڈاکٹر اعجاز کی وارفتگی دیکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے ماضی کے واقعات چلتی پھرتی تصویروں کی طرح گھوم رہے تھے۔ ماں کا اشکوں سے بھایا چہرہ، باپ کا غصہ و غم سے سرخ چہرہ جب اس نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ وہ گھر سے نکل رہی تھی ـــــ

دور افتادہ گاؤں میں مدرسہ کی خدمت انجام دے کر نہ صرف اپنی گزر اوقات کرتی رہی بلکہ اعجاز کی مالی امداد کرتی رہی۔ اعجاز انگلینڈ جانے کے لیے جہاز پر سوار ہو رہا ہے اور روانہ ہونے سے پہلے رومال ہلا ہلا کر ٹاٹا کہہ رہا ہے، اعجاز انگلینڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹ آیا ہے برسوں کے خواب حقیقت بن رہے ہیں وہ دلہن بنی ہے شہنائیوں کے شور سے کان پھٹے جا رہے تھے، اعجاز شب عروسی میں اس کا گھونگھٹ الٹنے کو آگے بڑھا تھا کہ ایک دل خراش چیخ اس کے حلق سے نکلی! شہلا لڑکھڑا کر گری گرنے میں میز کے کونے سے سر ٹکرا گیا خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اعجاز نے بڑھ کر شہلا کا سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

ڈاکٹر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ وہ خاموش شہلا کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ رہا تھا۔ وہ پاگل کی طرح "شہلا، شہلا" پکارنے لگا جیسے شہلا اس سے کہیں دور چھپ کر کھڑی ہو

ڈاکٹر کی آواز شہلا کو بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہو بہت دور جیسے آسمانوں سے! اس نے آنکھیں کھولیں ـــــ آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی ایک عجیب کشش۔ گو سانس کی آمد و رفت میں ایک عجیب تلاطم تھا لیکن شہلا کے چہرے پر مکمل اطمینان و سکون تھا۔ وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو فضا کے گوشے گوشے سے نقرئی گھنٹیاں بجتی محسوس ہوتیں، کلیاں کھلکھلا اٹھتیں لیکن یہ عجیب مسکراہٹ تھی۔ پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں جیسے شراب کا نشہ چڑھ رہا ہو، چہرے پر اب بھی وہی معصوم مسکراہٹ تھی۔

"شہلا، شہلا، ہوش میں آؤ، میں ڈاکٹر کو ذرا ٹیلی فون کر دوں"

شہلا کی پلکیں پھر تھرائیں اور نرگسی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے شہلا نے اکھڑی اکھڑی سانسوں سے کہا "کیسا ہوش؟ تم ہمارے پاس ہو نا؟ پھر ڈاکٹر کی کیا ضرورت ہے؟ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جانا؟ نہیں جاؤ گے

(باقی صفحہ ۴۱ پر)

ڈاکٹر سیّد سلیمان حسین

مثنویاتِ دبستانِ لکھنؤ پر ایک نظر

اردو میں مثنوی نگاری کا آغاز دکن سے ہوا۔ دکنی ادب کا بیشتر شعری سرمایہ صنف مثنوی پر مشتمل ہے شمالی ہند میں لوگ اس کامیاب صنفِ سخن کو بھولے جا رہے تھے اور ہمارے شعرا بھی اسے مذہبی اور مقصدی تبلیغ کا آلۂ کار سمجھ کر فراموش کرنے لگے تھے چنانچہ دہلی کے ابتدائی دورِ شاعری میں ہمیں کوئی قابلِ قدر مثنوی نہیں ملتی۔ اس زمانے کی جو مثنویاں اب تک منظرِ عام پر آئی ہیں ان کو معمولی نظموں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

شمالی ہند میں سب سے پہلے سوداؔ اور میرؔ نے مثنوی نگاری کی طرف توجہ صرف کی۔ سوداؔ نے چھوٹی بڑی ۲۲ مثنویاں لکھیں اور مدح، ہجو، ادبی تنقید، خط و کتابت اور موسم جیسے موضوعات پر مثنویاں لکھ کر اس کا دائرہ وسیع کرنے کی کوشش کی مگر ان کی طبیعت غزل اور قصیدہ پر زیادہ جمتی تھی، اس لیے ان کی مثنویوں میں مبالغہ کاری اور تخئیل کی رنگ آمیزی بہت نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔

میرؔ نے سوداؔ سے زیادہ موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ انھوں نے محض ہجو اور مدح کو ہی اپنا شیوہ نہیں بنایا، بلکہ دنیا، مکان اور برسات کی مذمت کرکے مثنوی کو سماجی مسائل سے بھی آشنا کیا اس طرح شعرا کو پہلی بار مثنوی کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ ہوا میرؔ نے عشقیہ مثنویاں بھی نظم کیں، جن میں عشق کا فوق الفطرت انجام اس طرح نظم ہوتا ہے کہ عاشق، معشوق کے مرنے کے بعد مل جاتے ہیں۔ اس انداز کی مثنویوں کا اسلوب بیان نہایت سادہ ہوتا ہے جس میں عشق کی ہمہ گیری اور ہجر کی جانکاہی کی کیفیت بڑی کامیابی سے بیان کی جاتی ہے۔ میرؔ کی تقلید میں اس قسم کی مثنویاں لکھنؤ میں بھی لکھی گئیں مگر ان سے اردو مثنوی نگاری کی روایت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اردو میں اس عظیم روایت کو داستانی مثنویاں ظاہر کرتی ہیں۔

میرؔ کے زمانے تک شمالی ہند میں داستانی مثنویوں سے کوئی واقف نہ تھا۔ میر حسنؔ (م ۱۲۰۱ھ) نے پہلی بار لکھنؤ کی سرزمین پر اپنی مشہور زمانہ مثنوی سحر البیان (۱۱۹۹ھ) میں داستان کو داخل کرکے شاعری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ اس مثنوی میں میر حسنؔ کا انداز بیان ہر جگہ فطری ہے۔ انھوں نے قصہ نگاری کے تمام فرائض بحسن و خوبی پورے کیے ہیں۔ منظر نگاری، جذبات نگاری، کردار نگاری اور تہذیب کی مرقع کشی کی طرف خاص توجہ صرف کی ہے۔ زبان میں سادگی، لطافت اور شیرینی پائی جاتی ہے۔ اسی لیے میر حسنؔ کا اسلوب بیان اس قدر پسند کیا گیا کہ یہی داستانی مثنویوں کا مثالی نمونہ قرار پایا جس کی پیروی انیسویں صدی کے اواخر تک جاری رہی۔

نواب شجاع الدولہ (۱۱۶۶ھ تا ۱۱۸۸ھ) کے عہد کی سیاسی اور معاشی خوش حالی نے لکھنؤ کے ماحول میں ایک نئی بیداری کو جنم دیا تھا۔ ذہنی سکون اور اطمینان میسر ہونے کے سبب شعرا مکمل شعری اور جمالیاتی تجربے کی طرف مصروف ہو گئے۔ چنانچہ اسی زمانے سے لکھنؤ میں بیانیہ شاعری کو فروغ حاصل ہونا شروع ہو گیا۔

میرؔ ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ آئے تھے۔ یہاں انھوں نے کئی

مثنویاں لکھیں، جن میں شکار نامے، مثنوی دربیان جشن ہولی و کدخدائی نواب آصف الدولہ، جنگ نامہ اور مثنوی مرغبازاں وغیرہ شامل ہیں۔ لکھنؤ کے رنگین ماحول سے میر جیسے بوڑھے شاعر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ یہاں کے ماحول میں رہ کر وہ ایسے مست و سرشار ہوئے کہ دلی کو بھول کر لکھنؤ کی مدح و ثنا میں مصروف ہو گئے ؎

لکھنؤ دلی سے بھی بہتر ہے کہ کسو دل کی لاگ ایدھر ہے

اور ہولی کے جشن کے موقع پر وہ عہد پیری میں شباب کی باتیں کرنے لگے۔

آؤ ساقی قرار با ہم ہے کہ تماشاکناں پھریں خرم

زن رقاص پر نگاہ کریں کسو سادے سرِ حل کے راہ کریں

کسو دلبر کے کھینچ لیویں ہاتھ کسو محبوب کو اٹھائیں ساتھ

کسو خوش رو کے منھ پہ منھ رکھ لیں کنج لب کا کہیں مزا چکھ لیں

خوش تمو سے کریں ہم آغوشی کسو نازک بدن سے ہم دوشی

کہیں دو جام مے سے ہوں سرمست جا پڑیں گے کبھو اور دست بدست

کسو مہوش سے ہو دیں گے گلباز کھینچیں گے ایک دو دم اس کے ناز

میر حسن نے مثنوی سحر البیان کے علاوہ دس مثنویاں اور اپنی یادگار چھوڑیں جن میں مثنوی رموز العارفین اور گلزار ارم قابل ذکر ہیں۔ رموز العارفین سنہ ۱۱۸۸ھ کی تخلیق ہے۔ یہ پہلی بار مطبع سلطانی لکھنؤ سے سنہ ۱۲۶۰ھ میں شائع ہوئی تھی۔ اس مثنوی میں اخلاق، حکمت اور بے ثباتی دنیا کے مضامین نہایت موثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ مثنوی گلزار ارم سنہ ۱۱۹۲ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں میر حسن نے دلی میں کسی حسینہ سے اپنے عشق، لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی تعریف نظم کی ہے۔ فیض آباد کے ذکر میں وہاں کی طوائفوں کے ٹھاٹ باٹ، زیور، لباس اور ان کی کافر اداؤں کا ذکر زیادہ کیا ہے جس سے اس وقت کے معاشرے میں طوائف کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ بے فکرے نوجوانوں، لگوٹ بندھے والوں اور چرس کا دم لگانے والوں کے وسیع مشاہدے کا پتہ چلتا ہے۔

مرزا جعفر علی حسرت دہلی کی تباہی کے بعد فیض آباد پہنچے۔ جب لکھنؤ دارالسلطنت قرار پایا تو یہ بھی اپنے دوستوں کے اصرار سے لکھنؤ چلے گئے۔ عطاری کا پیشہ کرتے تھے۔ اکبری دروازے کے قریب ان کی دکان تھی۔ سنہ ۱۲۰۹ھ میں انتقال ہوا۔ ان کے کلیات میں تین مثنویاں شامل ہیں

۱۔ ہجو حکیم ۲۔ ساقی نامہ بہار ۳۔ طوطی نامہ۔ موخر الذکر مثنوی حسرت کی قابل فخر داستانی مثنوی ہے۔ اس میں انھوں نے راجہ طوطا رام اور پھیلوں کی شہزادی شکر پارہ کے عشق کی داستان نظم کی ہے۔

میر شیر علی افسوس (سنہ ۱۲۲۳ھ) نے لکھنؤ میں ایک مثنوی بہار سخن لکھی۔ اس میں نواب آصف الدولہ کے ہولی کھیلنے کا ذکر نہایت جوش و خروش سے کیا ہے۔ حکیم محمد جواد شمس فیض آبادی نواب ہوشنگ صاحب کے خواجہ سرا جواہر علی خاں کی سرکار سے وابستہ تھے۔ ان سے دو مثنویاں یادگار ہیں۔ ۱۔ پارسا نامہ ۲۔ مثنوی حسن و عشق۔ راسخ عظیم آبادی میر کے مقلد تھے۔ انھوں نے مثنوی کنشتِ عشق میں آصف الدولہ بہادر اور شہر لکھنؤ کی مدح کی ہے۔ اس مثنوی کا قصہ میر کی مثنوی دریائے عشق کا پرتو ہے۔ سعادت یار خاں رنگین جہانیاں جہاں گشت قسم کے آدمی تھے چنانچہ سنہ ۱۲۰۴ھ میں وہ بھی لکھنؤ آگئے۔ یہاں انھوں نے سنہ ۱۲۱۳ھ میں ایک مثنوی دل پذیر لکھی۔ اس میں شہزادہ مہ جبین اور نازمن کے عشق کی داستان نہایت دلکش انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اس مثنوی کا ایک خوش خط نسخہ بہ دستخط مصنف رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔

انشاء اللہ خاں انشا کے کلیات میں ۱۱ مثنویاں شامل ہیں۔ جرات کے کلیات میں ۳۵ مثنویاں ملتی ہیں جن میں چار عشقیہ قصوں پر مشتمل ہیں۔ غلام ہمدانی مصحفی (سنہ ۱۲۴۰ھ) نے لکھنؤ آکر متعدد مثنویاں لکھیں۔ جن میں مثنوی شعلۂ شوق، گلزار شہادت اور مثنوی بحر المحبت میں میر کی تقلید ملتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے موسم سے متعلق مثنویاں بھی لکھیں جن میں سودا کا تتبع ملتا ہے ایک مثنوی ہجو مودی خانۂ سلیمان شکوہ کے عنوان سے ہے۔

نواب مرزا محمد تقی ہوس، میر حسن کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مصحفی کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ انھوں نے دو قابل قدر مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ ایک مثنوی لیلیٰ مجنوں ہے جو نظامی کی فارسی مثنوی کا منظوم ترجمہ ہے۔ مگر اس میں قصہ شدت جذبات میں دب گیا ہے۔ ہوس نے دہلوی رنگ کی نہایت کامیابی سے پیروی کی ہے۔ ان کی دوسری مثنوی شہزادہ گل اور صنوبر پری کے عشق کے قصے پر مشتمل ہے۔ اس میں میر حسن کے رنگین اسلوب کی نہایت خوبی سے

تقلید کی ہے۔ لیکن اب تک یہ غیر مطبوعہ ہے۔ مونس اردو کے چند بہترین مثنوی نگاروں میں جگہ پاتے ہیں۔

ان تمام مثنویوں نے مثنویاتِ دبستانِ لکھنؤ کے لیے راہ ہموار کر دی تھی جس پر آنے والی نسلوں نے بڑی کامیابی سے طبع آزمائی کی۔ دبستانِ لکھنؤ کا باقاعدہ افتتاح شیخ امام بخش ناسخ (۱۲۵۴ھ) کرتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ لکھنؤ اسکول کی شاعری کی داغ بیل انشا، جرأت اور مصحفی کے دور سے پڑتی ہے کیونکہ خارجیت اسی دور سے ابھرنے لگی تھی اور مادی عشق کی مختلف شکلیں کھل کر سامنے آنے لگی تھی۔ سوز و گداز اور جذبات میں خلوص کی کمی کے ساتھ ساتھ کلام میں شوخی نمایاں ہونے لگی تھی پھر بھی مثنویات کے گہرے تنقیدی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ شعرا نے ابھی پورے طور پر دہلوی رنگ سخن کو نہیں چھوڑا تھا۔ ناسخ سے ۳۔ مثنویاں یادگار ہیں۔ ۱۔ سراج نظم ۲۔ مولود شریف ۳۔ شہادت نامہ۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہوتا ہے یہ مثنویاں مذہبی نوعیت کی ہیں جن میں لطف شاعری مقصود ہے لیکن بندشیں بحیثہ اور تراکیب دل آویز ہیں۔ پھر بھی ناسخ جیسے باکمال استاد کے مرتبے سے گری ہوئی ہیں۔

اس دور کی نمائندہ مثنوی پنڈت دیا شنکر نسیم (۱۲۶۰ھ) کی گلزار نسیم ہے۔ گلزار نسیم مصور کی بہترین تصویروں کا فردوس نظر مرقع ہے۔ یہ ہماری زبان میں آراستگی زبان اور طرز ادا کی چاشنی کا نادر نمونہ ہے۔ اس میں باکمال شاعر نے فوق الفطرت قصہ نظم کیا ہے جو پہلے سے نثر میں موجود تھا مگر جس شگفتگی اور چابکدستی کے ساتھ مصنف نے ایک طویل داستان کو اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے وہ الفاظ اور بیان پر حاکمانہ قدرت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ بڑے بڑے واقعات کو محض دو مصرعوں میں ادا کر دینا نسیم ہی کا حصہ ہے۔ یہ مثنوی اپنے دور کی صحیح آئینہ دار ہے چنانچہ اس میں اس دور کے جملہ خصوصیات نظر آتے ہیں۔ ادبی اور تاریخی دونوں حیثیتوں سے اسے ہم مثنوی سحر البیان (۱۱۹۹ھ) اور مثنوی زہرِ عشق (۱۲۷۷ھ) کی درمیانی منزل اور عظیم الشان ادبی سنگ میل کہہ سکتے ہیں۔ بعد میں آنے والوں نے اس کے اسلوب کی دل کھول کر پیروی کی اور متعدد مثنویاں اسی طرز میں لکھی گئیں۔

واجد علی شاہ اختر سے ۹ مثنویاں یادگار ہیں جن میں ۳ مثنوی داستانی ہیں۔ ۱۔ افسانۂ عشق ۲۔ دریائے تعشق ۳۔ بحر الفت

ان مثنویوں کے قصے بہت پیچیدہ اور فوق الفطرت عناصر سے مملو ہیں شاعر نے قصوں پر زیادہ زور دیا ہے جس کی بدولت ان کے شاعرانہ محاسن دب گئے ہیں۔ اختر کے یہاں میر حسن اور نسیم دونوں کے اسلوب کی کامیاب تقلید ملتی ہے لیکن شدتِ جذبات کی کمی ہے پھر بھی واجد علی شاہ اختر دوسرے درجے کے کامیاب مثنوی نگاروں میں جگہ پاتے ہیں۔ ان کی بیگم نواب عالم آرا بیگم عالم نے بھی ایک داستانی نظم کی جو میر حسن کے رنگ میں ایک نفیس کوشش ہے۔ اس میں عالم نے تخیل کے بجائے محاکات سے کام لیا ہے اور حقیقی تصویریں پیش کی ہیں۔ شاہزادے کے باغ کی بہاریں ملاحظہ ہوں ؎

دلِ پژمردہ کھل گیا اک بار — بوستاں کی نظر جو آئی بہار
سوسن تھی، کہیں کہیں نسترن — چڑیاں تھیں چمن کی سب رنگیں
یہ سمن میں نہ گل سمائے سے — اک طرف غنچے مسکرائے تھے
پہلوئے گل میں عندلیب کا شور — روشوں پر تو پھر رہے تھے مور
شور کرتے تھے آبشارِ چمن — لہریں لیتے تھے جوئبارِ چمن
باغ کی جس سے بڑھ گئی تھی بہار — سرخ طلوں کی سرخ وہ مہکار
جیسے جدول ہو سبز مینے کی — مہندی کی ٹٹیاں قرینے کی
موگرا، موتیا قطار قطار — کیاریوں میں درخت سب گلدار
شاعرے لے تھا متوالا — زور کیفیتوں پہ تھا لالہ

اس حسین باغ میں غروب آفتاب کے وقت شہزادی جہاں افروز کی سہیلیاں اصرار کرتی ہیں کہ کچھ دیر ٹھہر کر باغ کی سیر کر لیجیے۔ نواب عالم آرا بیگم عالم نے ان اشعار میں اپنی نادر الکلامی اور مشاقی کا ثبوت دیا ہے اور چند شعروں میں منظر کشی کا حق ادا کر دیا ہے ؎

دیکھنا، دونوں وقت ملتے ہیں — غنچہ و گل چٹک کے کھلتے ہیں
کیا چہکتے ہیں غل مچاتے ہیں — آشیانوں میں طائر آتے ہیں
شب مہ کا تو دیکھیے عالم — کھٹ کر ماہ بے چاند بھی اس دم
بیلا کھلتا ہے پھول بھی چن لے — گانوں کو بلا کے کچھ سن لیں

شہزادی کی آمدِ شباب کی تصویر دیکھیے۔ ؎

بارھویں سال میں قدم آیا   زلفِ مشکیں میں پیچ و خم آیا
آمد آمد ہوئی جوانی کی   غمزہ و ناز دل ستانی کی
ہوئی دل میں اُدھیڑ بُن پیدا   ہو گیا چوب تر میں گھن پیدا
خواہشیں دل کو گدگدانے لگیں   فتنۂ خفتہ کو جگانے لگیں
شکلیں بھانے لگیں بناوٹ کی   گھاتیں خود آ گئیں لگاوٹ کی

رُہان شاہ اور جوگنوں کے نقرے بازیوں میں گلزارِ نسیم کے اثرات
پائے جاتے ہیں۔ ؎

عرض کی اس نے کیوں لیا یہ جوگ   بولیں وہ پڑ گیا ہے ایک بجوگ
پوچھا ویرانہ کیوں تمھیں بھایا   بولیں اک بوم کا پڑا سایا
پوچھا کیوں پھر رہی ہو آوارہ   کہا تقدیر سے ہے کیا چارہ
پوچھا اس نے کہاں کی راہی ہو   بولیں یہ تم بھی کتنے واہی ہو

اس مثنوی کی زبان نہایت دلکش ہے۔ اشعار رواں دواں اور ترنم میں ہیں۔
بیگماتی محاورے کے اعتبار سے یہ مثنوی کامل العیار ہے۔ ؎

بکتے بکتے ہوئی میں دیوانی   ان کے دیدوں کا ڈھل گیا پانی
ہیکلی بادل ہیں یہ نگاہیں گی   دیکھنا کیسے گل کھلائیں گی
دیدہ کواری کا گر ہوائی ہو   ننگ و ناموس کی صفائی ہو
مجھ کو جو رنج ہے وہ کس سے کہوں   لوچ یہ بوڑھے جو جلے میں پھول
آنا خاطر میں کس کو لاتی ہے   گتے یہ ہاتھوں سے کھاتی ہے

اس دور کے مثنوی نگاروں میں خواجہ اسد علی کا مرتبہ
خاصا بلند ہے۔ انھوں نے مثنوی طلسمِ الفت اپنی یادگار چھوڑی
ہے۔ اس ضخیم مثنوی میں فوق الفطرت عناصر کی آمیزش بڑی خوبی
سے کی گئی ہے۔ یہ اپنے شعری محاسن کی بدولت اپنے زمانے کی تمام
مثنویوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ زبان بھی نہایت دلکش ہے۔ بیگمات کے
محاوروں کو خوب نظم کیا ہے۔ ؎

سراپا نگاری:۔ شہزادی عالم آرا کے حسن و جمال کی تصویر ملاحظہ ہو۔ ؎

اس تراقے سے تھی وہ مہ پارہ   کہ پھسلتا تھا پائے نظارہ
حسن و خوبی میں وہ بہت مغرور   سر سے پا تک بہ رنگ شعلۂ نور
مستِ صہبائے غمزہ و انداز   اٹھتا جوبن شباب کا آغاز

موتیوں کا گلے میں اک کنٹھا   آب میں ہر گہر ید بیضا
کان میں دو دو دانیاں سادی   جو کریں دل کی مفت بربادی
ناز سے ہر گھڑی وہ اٹھلانا   کان کے پیچھے بال سرکانا

کاندھوں پر وہ دوپٹا ململ کا   فالسائی رنگا ہوا ہلکا
نازکی میں حباب سا باریک   کتنا نادر جبا ہوا باریک

کس ادا سے غرض بہ رنگِ بہار   سوئے قصرِ چمن چلی وہ نگار
ناز سے پائنچے اٹھائے ہوئے   شرم سے جسم کو چرائے ہوئے
تمکنت اہتمام کرتی ہوئی   نازکی سے کلام کرتی ہوئی
نشۂ بادۂ شباب سے چور   چال مستانہ حسن پر مغرور

منظر نگاری:۔ شہزادی کے باغ کی بہاریں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ؎

جا بجا منظر ہے باد بہار   ہے وہ صحرا نمونۂ گلزار
چار سو چھائی ہے گھٹا گھنگھور   کوکتے ہیں کہیں ہزاروں مور
گھر کے آیا ہے ابر دریا بار   بھینی بھینی سی پڑ رہی ہے پھوار
قہقہہ زن کسی طرف ہیں چکور   کہیں کوئل کہیں پپیہے کا شور
ڈھاک پھولا ہے بور آیا ہے   لالۂ کوہ رنگ لایا ہے
کوڑیالا کھلا ہوا ہر جا   کہیں پھولا ہوا ہزار گلا
آسماں پر وہ کچھ کچھ ابر تنک   وہ شفق وہ نسیم صبح حنک
ابر میں کوندتی ہے یوں بجلی   مسی آلود لب پر جیسے ہنسی

جذبات نگاری:۔ وصل کے بعد شہزادی کی شرم و حیا کی
کیفیت اس طرح بیان کی ہے ؎

اٹھ کے بیٹھی تو وہ پری پیکر   جھینپی جھینپی ادا اداس مگر
فرطِ خجلت سے سر جھکائے ہوئے   عرقِ شرم میں نہائے ہوئے
دیر تک بس جھکی رہیں آنکھیں   دو گھڑی تک نہ چار کیں آنکھیں

واقعہ نگاری:۔ وزیرزادہ فوج لے کر شہر میں داخل ہوتا ہے۔ یہ خبر محل میں پہنچتی ہے تو کنیزانِ محل خوشی سے پھولے نہیں سماتیں۔ اس وقت کی چلتی پھرتی تصویریں قلق نے یوں پیش کی ہیں:

آمد آمد کی پڑ گئی اک دھوم — ہوگیا در پہ عورتوں کا ہجوم
کوئی جا کر کہیں نکھرنے لگی — کوئی دروازہ بند کرنے لگی
بولی اک نیک پہلے لوں گی — تب میں دروازہ کھولنے دوں گی

زبان:۔ بیگماتی محاورے اور روزمرہ کی چاشنی ملاحظہ ہو:

کوئی بولی چلو ذرا چھیڑیں — کوئی کہنے لگی کہ کیا چھیڑیں
کوئی بولی تو کیا نڈر ہے بُوا — کتنا دیدہ ولیل ہے تیرا
یہ ہیں انواہی ان کو ڈر کیا ہے — تو نہ جا تیرا کورا پنڈا ہے
شاید ان سے کبھی کا لگا ہے — جبھی دربردہ ہم پہ غصا ہے
طنز سے مسکرا کے فرمایا — خیلہ دیوانی ہے جو اس میں آ
دیکھ کر بولی وہ گل رعنا — حف نظر اپنی ابڑی دیکھ ذرا

مثنوی میں دلچسپ داستان کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کے دلکش اور حسین نمونے ملتے ہیں، جو اس کو اپنے دور کی دوسری مثنویوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ طلسمِ الفت لکھنؤ کی نمائندہ مثنوی ہے جس پر لکھنؤ والوں کو ہمیشہ ناز رہا ہے۔

اسی زمانے میں نواب مرزا شوق نے اپنی مشہور مثنویاں بہارِ عشق، فریبِ عشق اور زہرِ عشق پیش کیں۔ ان مثنویوں میں فوق الفطرت صنعت گری نہیں ملتی۔ یہ قصے دار مثنویوں میں حقیقت کی طرف پہلا قدم ہیں۔ ان کے حالات، واقعات، زبان اور محاورے پر اس تمدن کی مہریں لگی ہیں۔ لیکن ان مثنویوں کا سب سے بڑا وصف زبان ہے۔ شوق کو اپنے دور میں اچھے نام سے نہیں پکارا گیا اور ہر تذکرہ نویس نے ان کے کمالات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ ان کا اسلوب اپنے زمانے میں بہت پسند کیا گیا اور ان کے رنگ میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں۔ شوق نے اپنی مثنویوں میں خود کو ہیرو بنا کر پیش کیا تھا۔ لہٰذا دوسرے بہت سے شعراء نے بھی ان کی تقلید میں یہی طریقہ اختیار کیا اور آپ بیتیاں لکھنے لگے۔

ان مثنویوں سے اس عہد کی تہذیب، معاشرت اور سلطنت اودھ کی شان وشوکت کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔ یہاں بعض مثنویاں ایسی بھی لکھی گئیں جن میں انیسویں صدی کے نصف اوّل کے معاشرتی کوائف وآثار بڑی تفصیل سے ملتے ہیں۔ مثلاً میر تقی میر اور میر شیر علی افسوس کی مثنویاں ہولی کی تعریف میں اور میر ہی کی دوسری مثنویاں کدخدائی نواب آصف الدولہ اور مرغ بازاں وغیرہ۔ عہدِ واجد علی شاہ میں تجو لکھنوی نے مثنوی جلوۂ اختر میں لکھنؤ کے میلے ٹھیلوں اور جلسۂ رہس سے متعلق طویل مثنوی لکھی اور امان اللہ سحر نے شاہی جشن سے متعلق اپنے تاثرات پیش کیے۔ دلگیر لکھنوی نے امین آباد کی چہل پہل بیان کی اور رضا نے مثنوی صیدیہ میں شکار کے واقعات نظم کیے جنھیں پڑھ کر گزشتہ لکھنؤ کی تمام رنگینیاں آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔

شاہی زمانے میں لکھنؤ میں شاعری کا زوال ہوا۔ چنانچہ میر حسن کی مثنوی رموز العارفین (۱۱۸۸ھ) کے بعد کوئی قابلِ ذکر متصوفانہ اور عارفانہ مثنوی نہیں لکھی گئی۔ اس کے بجائے مذہبی مثنویوں کو فروغ حاصل ہوا۔ میر ضمیر (۱۲۷۲ھ) نے دو مذہبی مثنویاں معراج نامہ* اور مظہر العجائب اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان کے نامور شاگرد مرزا دبیر نے بھی فضائل اہلِ بیت اظہار مثنوی کے ذریعہ ظاہر کیے۔

مثنوی احسن القصص اور معراج نامہ* مرزا صاحب کے مجموعۂ کلام "دفترِ ماتم" کی پندرھویں جلد میں شامل ہیں۔ اس سے قبل کی چودہ جلدیں مراثی پر مشتمل ہیں۔ ناسخ تین مذہبی مثنویوں کے خالق ہیں۔ میر علی اوسط رشک نے بارھویں امام کی رجعت کے واقعات کو نظم کیا ہے۔ واجد علی شاہ نے حملۂ حیدری کا ترجمہ ہیبتِ حیدری کے نام سے پیش کیا۔ یہ مثنوی دو دفعہ چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ملا محمد باقر مجلسی کی مشہور تصنیف حیات القلوب کا ترجمہ نجات القلوب کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ مثنوی قلمی صورت میں ورثائے واجد علی شاہ اور کلکتہ کی اتحادیہ لائبریری میں محفوظ ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے دوسرے شعراء بھی مذہبی مثنویاں لکھتے رہے جن میں اسیر اور منیر شکوہ آبادی بھی شامل ہیں۔ لیکن دو شاعروں

کی تخلیقات معرکہ آرا ثابت ہوئیں۔ اول مثنوی بر فع لا معہ اس کو مرزا جعفر علی فصیح نے سنہ ۱۲۳۰ھ میں تمام کیا اور مطبع جعفری لکھنؤ نے سنہ ۱۲۶۲ھ میں شایع کیا، اور دوسری مثنوی کتاب ہے۔ جو دبیر کے مشہور شاگرد شیخ گوہر علی منیر کی لکھی ہوئی ہے اور سنہ ۱۲۸۷ھ میں چھپی تھی۔ یہ دونوں مثنویاں مناظرے کے طور پر لکھی گئیں۔

اس وقت جبکہ لکھنؤ میں کثرت سے مثنویاں لکھی جا رہی تھیں، ملک میں ہنگامۂ غدر اٹھ کھڑا ہوا۔ واجد علی شاہ کلکتے کے لیے روانہ ہوئے اور یہاں کی سجی سجائی محفل اجڑ گئی۔ شعراء کا غدر کی بدولت ذہنی سکون ختم ہو گیا اس لیے انھوں نے تلاشِ روزگار میں دوسرے مقامات کا رخ کیا۔ لیکن پھر بھی یہاں مثنوی نگاری پر زوال نہیں آنے پایا اور متعدد شعراء مثنویاں لکھتے رہے۔ چنانچہ کچھ نے رومانی اور کچھ نے داستانی مثنویاں نظم کیں اور کچھ نے غدر کے واقعات کو مثنوی کا جامہ پہنایا تو کچھ نے مذہبی اور معاشرتی کوائف کو قلم بند کیا۔

غدر کے بعد لکھنؤ اور اردو کی سب سے اہم مثنوی شوق کی زہرِ عشق ہے۔ زہرِ عشق کا قصہ سادہ اور بہت دردناک ہے اور اس میں دنیا کی بے ثباتی کو نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے جو غالباً غدر کی تباہی کا نتیجہ ہے۔ مثنوی میں شاعر نے ایک ایسی لڑکی کی محبت کا المیہ نظم کیا ہے جسے جاگیردارانہ سماج محبت کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ صفِ اول کی مانی ہوئی مثنوی ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ نمونے کے طور پر اس کے چند حصے ملاحظہ ہوں ؎

سراپا نگاری:۔ سوداگر کی بیٹی مہ جبیں کے حسن کی تصویر ملاحظہ ہو

سبزۂ نخلِ گل جوانی تھا   حسنِ یوسف فقط کہانی تھا
اس سن و سال میں کمال سلیق   چال ڈھال انتہا کی نستعلیق
چشمِ بد دور وہ حسیں آنکھیں   رشکِ چشمِ غزال چیں آنکھیں
تھا جو ماں باپ کو نظر کا ڈر   آنکھ بھر کر نہ دیکھتے تھے ادھر
تھی زمانے میں بے عدیل و نظیر   خوش گلو، خوش جمال، خوش تقریر
رخ پہ گیسو کی لہر آفت تھی   جو ادا اس کی تھی قیامت تھی
تھا یہ اس گل کا جامہ زیب بدن   سادی پوشاک میں تھے سو جوبن

جذبات نگاری:۔ مہ جبیں کے فراق کی کیفیت۔

چھلکے آنکھوں کے دونوں پیمانے   دل لگا آپ ہی آپ گھبرانے
گوشِ فریادِ قلب سننے لگے   خود بخود ہاتھ پاؤں دھننے لگے
دردِ دل غم کو آگیا جو پسند   سونا راتوں کا ہو گیا سوگند
موجِ الفت اسے ڈبونے لگی   ایک الجھن سی دل کو ہونے لگی
گھٹنے طاقت لگی جو روز بروز   آتشِ ہجر ہو گئی دل سوز
داغ جوں جوں جگر کے جلتے تھے   اشکِ گرم آنکھ سے نکلتے تھے
گرم نالے تھے لب پہ آہ تھی سرد   دل میں ہوتا تھا میٹھا میٹھا درد

اس مثنوی کا سب سے جاندار حصہ وہ ہے جبکہ مہ جبیں اپنے آہنی عزم و ارادے کے ساتھ عاشق کے پاس آخری بار ملنے کے لیے جاتی ہے۔ یہ منظر انتہائی دل دوز اور اثر انگیز ہے جس کی مثال اردو ادب میں مشکل سے ملے گی۔ محبوب سے مل کر مہ جبیں وصیتیں کرتی ہے اور بے ثباتیِ دنیا پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتی ہے۔ ؎

جائے عبرت سرائے فانی ہے   موردِ مرگ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے   آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر   ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم   آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
غیرتِ حور مہ جبیں نہ رہے   ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
کوئی لیتا کبھی اب نہیں ہے نام   کون سی گور میں گیا بہرام

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے   یہی دنیا کا کارخانہ ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحاں   پڑھتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَان
موت سے کس کو رستگاری ہے   آج وہ کل ہماری باری ہے
زندگی بے ثبات ہے اس میں   موت عینِ حیات ہے اس میں

زہرِ عشق میں دنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کے اعلیٰ مرقعوں کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے لطف اور روزمرہ کی صفائی کے بھی نادر نمونے ملتے ہیں اس لیے پوری مثنوی پڑھنے اور لطف لینے کے قابل ہے ؎

گیسو رخ پر پھیلے ہوئے ہیں   چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

عمر بھر کون کس کو روتا ہے　　کون صاحب کسی کا ہوتا ہے
آدماتی تھی تجھ کو ہنستی تھی　　میں ترے چھیڑنے کو ہنستی تھی
ہو نہیں کس بات پر خفا بولو　　اماں واری، ذرا جواب تو دو
پھل اٹھایا نہ زندگانی کا　　نہ ملا کچھ مزا جوانی کا
رنج و راحت جہاں میں توام ہے　　کبھی شادی ہے اور کبھی غم ہے
مرگ کا کس کو انتظار نہیں　　زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

غدر سے متعلق اس زمانے میں کئی شاعروں نے طبع آزمائی کی۔ واجد علی شاہ نے حزنِ اختر میں اپنی مجبوریوں اور مصائب کا ذکر کیا۔ محمد رضا عاشق شاگرد ناسخ نے مثنوی رشکِ ماہ تمام (۱۲۷۶ھ) میں لکھنؤ کی تباہیوں اور واجد علی شاہ کے کلکتے جانے پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ آغا حجو شرف نے افسانۂ لکھنؤ میں غدر کے واقعات کو نظم کیا اور راجہ رام پال سنگھ صغیر نے آئین اختر عرف لطف نامہ (آغاز ۱۲۷۳ھ انجام ۱۲۷۶ھ) میں عہد واجدی اور خصوصاً غدر کے واقعات بے کم و کاست بیان کیے۔ بادشاہ کی روانگیِ کلکتہ کی خبر چمن تک پہنچتی ہے۔ اس کا پھولوں، تیوں اور طائرانِ بوستاں پر ردِ عمل ملاحظہ ہو۔

چمن میں ہوا دار پہنچا جہاں　　ہوئے نعرہ زن طائرِ بوستاں
صدائیں یہ دینے لگے قمریے　　کہ با کامرانی سواری پھرے
عنادل نے دی شاہ کو یہ دعا　　کہ پھر ہو شگفتہ گلِ مدعا
گلِ اشرفی کو بہت تھی یہ چاہ　　کہ پہنچوں میں تا بازوئے بادشاہ
بڑھا بہرِ پابوس آبِ رواں　　درختوں سے جھک جھک پڑیں ڈالیاں
ادب سے جو سبزے نے چومی زمیں　　تو نرگس نے آنکھیں قدم پر ملیں
وہ بے آب برگ و شجر ہو گئے　　مگر اشکِ مردم سے تر ہو گئے
گلِ لالہ کے سینے پر داغ تھا　　خزاں دیدہ تھا جو گلِ باغ تھا

ان تمام مثنویوں کی تاریخی اور سماجی حیثیت ہے بعض بعض مقامات پر ان میں حسن بیان اور لطفِ زبان کے اچھے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔

غدر کے بعد داستانی مثنویوں میں خواجہ بادشاہ سفیر، عباس حسین ہوش، آغا علی شمس، طوطا رام شایاں، ولایت علی فردوس، احمد علی شوق اور منشی امیر اللہ تسلیم نے نام پیدا کیا۔ خواجہ بادشاہ سفیر خواجہ وزیر لکھنوی کے بیٹے تھے۔ انھوں نے مثنوی گلشن عشق ۱۲۸۵ھ میں تمام کی۔ سفیر نے وجہ تصنیف میں لکھا ہے کہ غدر کے بعد میں اکثر ملول رہا کرتا تھا۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ دل بہلانے کے کوئی مثنوی نظم کرو۔ ناچار مثنوی گلشن عشق نظم کرنا پڑی۔ اس میں ۱۵ ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ مثنوی کا ایک نہایت خوش خط باتصویر نسخہ ٹیگور لائبریری، لکھنؤ یونی ورسٹی میں محفوظ ہے۔ قصہ یہ ہے کہ شہزادہ مہ لقا جمال نگر کی شہزادی کی شادی کے سلسلے کی تین شرطیں پوری کرتا ہے۔ اوّل شاہ زریں کو اس کی محبوبہ سے ملواتا ہے۔ پھر طلسم کے بارہ برجوں کو فتح کرتا ہے۔ آخر طلسم چار بہار کی سیر کر کے کامیاب و کامران واپس ہوتا ہے اور شادی رچاتا ہے۔ قصہ نہایت پیچیدہ ہے اور بھرتی کے اشعار بہت پائے جاتے ہیں جس سے مثنوی کے بہترین حصے دب گئے ہیں۔ زبان کے اعتبار سے یہ مثنوی بھی اعلیٰ مقام رکھتی ہے لیکن سوز و اثر کی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ شہزادے کے فراق میں ماں کی حالت یوں بیان کی ہے۔

پیٹتی تھی کبھی وہ سر اپنا　　تھامتی تھی کبھی جگر اپنا
کبھی گر پڑتی تھی وہ غش ہو کر　　ہوش آیا تو یوں کہا رو کر
غم جدائی کا دے گئے واری　　ساتھ ماں کو نہ لے گئے واری
کس طرح دل کو اب تسلی دوں　　کون سا آسرا ہے جس پہ جیوں
جینے دے گی نہ مامتا ہم کو　　کس طرح سے بھلائیں اس غم کو
صاحبو کیوں کر آئے گا آرام　　چاند میرا نہ آیا کوئی شام
کس جگہ روٹھ کر وہ بیٹھا ہے　　تم کو معلوم حال اس کا ہے

شہزادے کی عشق پر وزیر زادی کی پریشانی ملاحظہ ہو۔

عطرِ خس کا کبھی سنگھاتی تھی　　کھلکھلا وہ کبھی ہنساتی تھی
صدقہ لا کر اتارتی تھی کبھی　　ہو کے مضطر پکارتی تھی کبھی
بےقراری سے گاہ روتی تھی　　فرطِ الفت سے جان کھوتی تھی

انیسویں صدی کے آخر میں مذہبی مثنویوں میں منیر شکوہ آبادی (معراج المضامین) اور محسن کاکوروی کی تخلیقات اپنی گوناں گوں

شاعرانہ خوبیوں کی وجہ سے نہایت اہم ہیں۔ ان مثنویوں میں لکھنوی رنگ شاعری کی نمائندگی کی گئی ہے۔ ان میں بلندیٔ مضمون، نازک خیالی، شوکت الفاظ، نادر تشبیہیں اور لطیف استعارے عجب لطف اور مزا دیتے ہیں۔ اسیر اور امیر مینائی کی مثنویاں ان کے آگے پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ اس دور میں بعض ہندو شعراء نے بھی مذہبی مثنویاں لکھیں جن میں طوطا رام شایاں شاگرد اسیر لکھنوی کا نام قابلِ ذکر ہے۔

منشی امیر اللہ تسلیم دورِ آخر کے سب سے کامیاب مثنوی نگار قرار دیے جاتے ہیں انھوں نے چار داستانی مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں نالۂ تسلیم، شامِ غریباں، صبحِ خنداں اور مثنوی دل و جان۔ ان میں مثنوی سحر البیان اور گلزارِ نسیم کے اسلوب کی بہترین تقلید کی گئی ہے۔ بعض مقامات پر رعایتِ لفظی اور ضلع جگت کا بھی زور پایا جاتا ہے لیکن جذبات نگاری، منظر نگاری اور واقعہ نگاری میں ان مثنویوں کا کوئی جواب نہیں زبان بھی اعلیٰ درجے کی ہے۔

غرض کہ یہ دبستانِ لکھنؤ کی مثنویوں کا مختصر سا خاکہ ہے۔ یہ مثنویاں لکھنؤ کے لیے ہی نہیں بلکہ پورے اردو ادب کا عظیم سرمایہ ہیں۔ ان کے علاوہ لکھنوی شعرائے نے بہت سی اور بھی مثنویاں لکھیں، مگر طوالت کی وجہ سے ان کے تذکرے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس مختصر سے تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے سر اگرچہ مثنوی کی ایجاد کا سہرا نہیں تو تجدید کا سہرا تو یقینی ہے۔ دکن کی کامیاب مثنویوں سے قطعِ نظر اس صنفِ سخن کو شمالی ہند میں لوگ بھولتے جا رہے تھے۔ اور شعراء بھی اس "مفید اور کارآمد صنفِ سخن" کو فراموش کرنے لگے تھے۔ لکھنؤ کی سیاسی خوش حالی، ایک آراستہ و پیراستہ تہذیب اور شائستہ تمدن اور یہاں کی پُر اطمینان زندگی کے زیرِ اثر لکھنوی شعراء نے اس کی آبیاری میں غیر معمولی حصہ لے کر اسے خشک و بے کیف شاعری کی تنگناؤں سے نکالا اور تمدن کی مختلف راہوں سے آشنا کیا۔ اس کی محفل میں دیوی دیوتاؤں اور پریوں سے لے کر انسانوں تک سبھی کو لا بٹھایا اور اسی ماورائی صنف میں مادی حقیقتوں کو بے کم و کاست بیان کیا۔ واقعات کی ترتیب، ربط و تنظیم کو اس طرح متعین کیا کہ آنے والے شعراء کے سامنے یہ صنف کامیاب شعری تجربوں کے امکانات کی ضامن بنی۔ کرداروں میں وہ جان ڈالی کہ خود اس دور کی تصویر بن گئے۔ جذبات نگاری اور نفسیاتی نکات کے بیان میں اس قدر کامیابی حاصل کی کہ آج بھی انسان اپنے دل کی دھڑکنوں کو اس سے ہم آہنگ پاتا ہے۔ خارجی نقشوں اور لفظوں کے طلسم سے وہ آئینہ خانہ بنایا کہ داخلیت اور خارجیت کی حدود مٹ کر قوسِ قزح کی شکل میں جگمگانے لگیں۔ زبان اور بیان میں کبھی سادگی اور نرمی سے تڑپایا اور کبھی لفظوں کی شان و شکوہ نے فکر و نظر کو گرمایا اور کبھی محاورے اور روزمرہ کی چاشنی سے وہ رنگ جمایا کہ لوگوں کو حقیقت کا دھوکا ہوا۔ اس طرح لکھنوی شعراء نے صنفِ مثنوی کو تازہ بہ تازہ، نو بہ نو محاسن سے مالا مال کر دیا جس کے بعد مثنوی کے اعلیٰ ترین شہ پاروں کا تذکرہ محض لکھنؤ کی تخلیقات کا تذکرہ بن گیا۔

★

پتھر کا صنم

(صفحہ ۳۳ کا بقیہ)

نا؟ نہیں . . . . . . جاؤ گے . .

اس نے اپنی ساری طاقت یکجا کر کے اپنی دم توڑتی باہوں کو اعجاز کی گردن میں حائل کر دیا ــــ ایک بار پھر نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اٹھ کر بیٹھ جائے لیکن تارِ نفس ٹوٹ گئے۔ سانس کا جو ہر سینے سے نکل گیا۔ باہوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ بے نور آنکھیں حسرتِ دیدار میں اب بھی کھلی تھیں۔

★

ماتا پرشاد استھانہ زینت بریلوی

باپو

جمالِ صبح سے بہتر جمالِ شام لائے تھے
وطن میں بادۂ انسانیت کا جام لائے تھے
دماغ و دل میں صوتِ ربطِ الہام لائے تھے
زبانِ آرزو پر قوم کا پیغام لائے تھے
اہنسا شانتی کی انجمن میں مسکرانے پر
جبینِ قوم پھر خم ہے وفا کے آستانے پر

صداقت آپ کی آئینۂ حسنِ صداقت تھی
محبت آپ کی میخانۂ جامِ محبت تھی
حقیقت آپ کی پیمانۂ درسِ حقیقت تھی
عقیدت آپ کی منجملۂ طرزِ عقیدت تھی
اہنسا شانتی تسلیم ہے دنیا زمانے کو
تمہارا درس کافی ہے زمانے کے جگانے کو

جوانوں میں وطن کے وقت کی رفتار پیدا کی
زبانِ دل میں تم نے قوتِ اظہار پیدا کی
نگاہِ آگہی میں حسرتِ دیدار پیدا کی
مزاجِ زندگی میں جرأتِ ایثار پیدا کی
کہیں تصویر بنتی ہے کہیں تحریر بنتی ہے
ابھی تک انجمن میں آپ کی تصویر بنتی ہے

تمہیں انسانیت کا دیوتا دنیا سمجھتی ہے
تمہیں عرفانیت کا دیوتا دنیا سمجھتی ہے
تمہیں حقانیت کا دیوتا دنیا سمجھتی ہے
تمہیں روحانیت کا دیوتا دنیا سمجھتی ہے
جنم دن پر وطن تم پر چڑھا کے پھولوں کو چڑھاتا ہے
سمادھی پر عقیدت سے زمانہ سر جھکاتا ہے

سمجھ کر سوچ کر ہر مقصدِ قومی کا افسانہ
اٹھا کر چل دیے ہاتھوں میں کشکولِ فقیرانہ
منایا قوم نے جب صدرِ محفل میر میخانہ
چلایا بادۂ انسانیت کا ایک پیمانہ
جنم دن شانتی اہلِ جہاں کو زیب دیتا ہے
جنم دن آپ کا باپو زمانہ یوں مناتا ہے

گاندھی جینتی

عروج سلولوی

اے مرے ساقی رہے آباد میخانہ ترا
جوش پر ہے آج الطاف کریمانہ ترا

ذرہ ذرہ ہے شرابِ مستی میں ڈوبا ہوا
چار جانب چھا گئی عیش و مسرت کی گھٹا

لے کے انگڑائی بہارِ جاودانی ہنس پڑی
گلستانِ ہند کی گویا جوانی ہنس پڑی

مرکے بھی جس کا رہے نام و نشاں پیدا ہوا
آج بھارت کا امیرِ کارواں پیدا ہوا

زندہ باد اے عظمتِ ہندوستاں کے پاسباں
زندہ باد اے یادگارِ باعثِ امن و اماں

جلوہ ہائے حسنِ آزادی کے پیکر زندہ باد
اے مرے مقبولِ خاص و عام لیڈر زندہ باد

بادۂ حسنِ عمل سے جب ہوا سرشار تو
وقت کی آواز سن کر ہو گیا بیدار تو

یوں سیاست کی زمیں پر بن کے چمکا آفتاب
آ گیا بھارت میں آزادی کی دیوی پر شباب

جشنِ آزادی کا نغمہ ہر طرف گانے لگا
پرچمِ ہندوستاں ہر سمت لہرانے لگا

تجھ سے قائم آج ملک و قوم کا ہے بانکپن
تو ہی تھا آنِ وطن شانِ وطن جانِ وطن

سرزمینِ ہند پر روشن رہے گا تیرا نام
جاتے جاتے دے گیا صلح و محبت کا پیام

تو گیا دے کر ہمیں درسِ عروجِ زندگی
ہم کو لازم ہے کریں دنیا میں تیری پیروی

اتحادِ باہمی کا پاس ہونا چاہیے
جذبۂ قومی کا کچھ احساس ہونا چاہیے

جب کبھی بھارت پہ کوئی وقت آ جائے شدید
بچہ بچہ ہندو مسلم کا بن جائے حمید

ستیش اروڑہ

مہاتما گاندھی
شخصیت اور کردار

ہندستان میں جدو جہد آزادی کی منزل کو حاصل کیے جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، اسی قدر یہ بات روشن سے روشن تر ہوتی جارہی ہے کہ گاندھی جی نے جدید ہندستان کی تعمیر کے لیے کس قدر عظیم کام کیا ہے۔ مہاتما گاندھی کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ انھوں نے مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے انسانی صلاحیتوں کا جاں گداز ہستی کے ساتھ استعمال کیا ہم سب یہ جانتے ہیں کہ مہاتما گاندھی جی نے لکھو کھا افراد پر مشتمل قوم کو اتحاد کی لڑی میں پرو دیا اور پوری قوم ان کی آواز پر متحد ہوگئی۔ اکثر و بیشتر اس امر کو بھی فراموش کر دیا جاتا ہے کہ انھوں نے کن نامساعد حالات میں قوم کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا۔

گاندھی جی نے ایک محکوم قوم کو اتحاد اور اخوت کے مضبوط رشتوں میں باندھا۔ اس دور میں قوم کا شیرازہ اس قدر بکھرا ہوا تھا کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ گاندھی جی نے اس قوم کو جو ٹکڑے ٹکڑے تھی، رقابتوں اور رشک و حسد کا شکار تھی اور جو علاقائیت پرستی کے جنون میں مبتلا تھی ایک متحرک اور فعال قوم کی شکل میں تبدیل کر دیا اور منتشر قوم ایک سیسے کی دیوار کی طرح مضبوط اور متحد ہوگئی۔

مہاتما گاندھی کی شخصیت کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے مختلف النوع شخصیتوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیا۔ اس سلسلے میں شری نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد، سردار پٹیل اور مولانا آزاد کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مہاتما جی نے ہر شخص کی اس بات کے لیے ہمت افزائی کی کہ وہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی شخصیت کو فروغ دے۔

عوام سے رابطہ

گاندھی جی نے بھارتی عوام سے جس طرح گہرا رابطہ قائم کیا اس کی مثال دورِ حاضر میں مشکل ہی سے ملے گی۔ سوال یہ ہے کہ ملک کے لکھو کھا عوام سے ان کی قربت کا راز کیا ہے۔ یوں تو اس کے اسباب بہت سے ہوسکتے ہیں لیکن میرے نزدیک سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ قوم کے ہر فرد اور ان کے درمیان ایک خاص قسم کی یگانگت تھی۔ قوم کے ہر فرد نے خود کو ان سے کسی نہ کسی شکل میں وابستہ کر دیا تھا۔ پوری قوم کو ان پر بھروسہ تھا۔ اور وہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتی تھی اور ان کا احترام کرتی تھی کیونکہ انھوں نے خود کو قوم کی بنیادی اقدار کے ساتھ مربوط کر دیا تھا۔ انھوں نے ثقافت کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔

منفرد بھارتی شخصیت

مہاتما گاندھی نے جو انداز فکر اپنایا وہ مکمل طور پر بھارتی انداز فکر تھا۔ اس خصوصیت کے باعث وہ عوام کے محبوب رہنما بن گئے اور عوام ان کے گرویدہ ہوگئے۔

مہاتما گاندھی کی زبان سے جو الفاظ نکلے وہ ستت ہوتے انھوں نے جس عمل و کردار کا ثبوت پیش کیا اس کی صداقت اور معیار ہی ان کی مقبولیت کا باعث بنے۔

اکثر و بیشتر ملکی رہنما عوام کو اپنی شیریں گفتار سے لبھاتے ہیں۔ گاندھی جی کا انداز اس روایتی طریق کار سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ زبردست قومی بحران کے اوقات میں ہی رہنماؤں اور عوام کے درمیان ربط فروغ پاتا ہے۔ گاندھی جی کے ساتھ یہ معاملہ نہ تھا۔ اس طرح کے بحران کے بعد بھی ان کے اور عوام کے درمیان رابطہ بدستور قائم رہتا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں اس طرح کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔ جس وقت ہمارے دور کی تاریخ لکھی جائے گی اس وقت گاندھی جی کا عوام سے گہرا تعلق ایک ایسا فلسفہ معلوم ہوگا جس کا مشکل سے ہی ذہن ادراک کر سکے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج کے دور میں یہ تعلق باعث تعجب و حیرانی ہے۔

گاندھی جی کی عظمت کا ایک راز یہ ہے کہ ان میں بلا کی خود اعتمادی تھی یہ دولت اس وقت حاصل ہوتی ہے جبکہ آدمی روایت پسند نہ ہو اور دلیل کے ساتھ ہر بات سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ تاہم یہ صفت

اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ انسان کے پاس کھلا ذہن ہو اور اس میں دوسروں کے نظریات و تجربات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہو۔ اس حقیقت کے باوجود کہ مہاتما گاندھی بھارتی نظریات پر کاربند تھے ان میں دوسروں کی دنیا سے استفادہ کرنے کی صلاحیت تھی حتیٰ کہ وہ روس کے ٹالسٹائی اور انگلینڈ کے رسکن جیسے دو متضاد انسانوں سے استفادہ کرنے کو خوش آمدید کہتے تھے۔

مہاتما گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف مسلسل جد و جہد کا درس دیا اور برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے ان کے موقف میں کوئی لچک نہ آئی۔ لیکن اس کے باوجود وہ انفرادی طور پر انگریز کا احترام کرتے تھے اور ان کی بحیثیت مجموعی شخصیت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ شائستگی کا فی جانا پہچانا لفظ ہے یہ گاندھی جی کی شخصیت کا ایک اہم حصہ ہے۔ بے شک وہ ایک شائستہ آدمی تھے۔ انھوں نے قوم کو شائستگی کے زیور سے آراستہ کرنے کی جد و جہد کی۔ لیکن وہ اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھے کہ دشمنوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ مہاتما گاندھی کو انتہائی بدکردار انسان میں بھی شائستگی کی کرن نظر آتی تھی انھوں نے تمام انسانوں کی شخصیتوں کے فروغ کے لیے کوشش کی۔

مہاتما گاندھی کے نزدیک انسان کو محض حالات اور واقعات ہی نہیں بناتے بلکہ اس کی اپنی کوششوں کو بھی دخل ہوتا ہے۔

مہاتما گاندھی نے مذہب اور حکومت کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کی کوشش کی تاہم انھوں نے اپنے مذہبی عقائد سے کبھی انکار نہیں کیا اور نہ ہی اس بات کے لیے دوسروں کی ہمت افزائی کی کہ اپنے مذہبی عقائد سے انکار کریں۔

مہاتما گاندھی بنیادی مذہبی اقدار کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور ایسی اقدار کو جن کو وہ مشترک سمجھتے تھے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

غربت کے خلاف جد و جہد

مہاتما گاندھی نے پوری قوت سے غربت کے خلاف جد و جہد کی تاہم اس کے ساتھ ہی انھوں نے سادگی پر زور دیا۔ انھیں طبقاتی کشمکش پر بڑی تشویش رہتی تھی۔ وہ سمجھتے کہ ایسی صورت میں جب کہ بغیر کسی روک ٹوک کے صنعت کاری کا عمل اپنے مضر اثرات ڈال رہا ہے، ضرورتوں کو محدود رکھنے کا اصول اپنانا چاہیے۔

زندگی کا معیار

گاندھی جی کو دیگر افراد سے ممیز کرنے والی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کے معیار کو بہتر بنانے پر ہمیشہ ہی خاص زور دیتے تھے مہاتما گاندھی کے نظریات اور ان کی فکر عالمگیر نوعیت کی ہے۔ وہ بھارت کے ایک عظیم سپوت ہیں اور ان کا تعلق ہر دور اور ہر انساں سے ہے۔

(بہ شکریہ پی۔ آئی۔ بی)

حکیم صاحب عالم — (صفحہ ۲۸ کا بقیہ)

کا موقع مل سکا تھا۔ انھوں نے تحریر فرمایا تھا کہ پاکستان خیرستان ہے یہاں دل نہیں لگتا، کوئی معقول صحبت نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے اپنی قومیت نہ بدلی ہے اور نہ بدلنے کا ارادہ ہے۔ قسمت نے ساتھ دیا اور اچھا ہو گیا تو پھر آؤں گا اور تم لوگوں سے ملاقات ہوگی۔ یہ خط اسی قلیل وقفہ میں لکھا تھا جب قدرے افاقہ محسوس کر رہے تھے۔ بہرحال یہ ثابت ہے کہ ان کو اپنے وطن عزیز سے تعلق خاطر تھا اور ان کے دل میں ہندوستان واپس آنے کی حسرت تھی۔ مگر یہ تمنا اس لیے پوری نہ ہو سکی کہ ہمارے پرانے تمدن اور ہماری معاشرت کی اس آخری یادگار کو کراچی کی خاک کا پیوند ہونا تھا۔ وہ نہ صرف عمائدین لکھنؤ بلکہ شرفائے لکھنؤ کی بھی مکمل اور بے نقص تصویر تھے۔ ان کے ایک مخلص دوست اور ایک ہوشمند قدرداں کی حیثیت سے جب ان کی یاد کرتا ہوں تو ان کی خوبیوں کا احاطہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ واقعات اس تیزی کے ساتھ حافظہ میں ابھرتے ہیں کہ ایک پر پوری طرح نظر جمنے نہیں پاتی کہ دوسرے محاسن سامنے آجاتے ہیں۔ یہ سوچ کر عقل دنگ ہو جاتی ہے کہ ایک چھوٹے سے انسان کے دل میں کتنی وسعتیں تھیں اور اس کی محبت میں کتنی گہرائیاں تھیں، کہنا پڑتا ہے کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

★

ہمارا وطن

اشرف مالوی

یہ ہمارا چمن ہے ہمارا چمن
یہ ہمارا وطن سب کا پیارا وطن

سورماؤں کا ویروں کا یہ دیس ہے
سنت رشیوں فقیروں کا یہ دیس ہے
پریم کے راہ گیروں کا یہ دیس ہے
پریم کے گیت گاتی ہے اس کی پون
یہ ہمارا وطن سب کا پیارا وطن

اس میں رادھا کا گیتوں بھرا ساز ہے
اس میں کانھا کی بنسی کی آواز ہے
اس کا اپنا نرالا ہی انداز ہے
سچ کیے اس نے لاکھوں دلوں کے سپن
یہ ہمارا وطن سب کا پیارا وطن

بودھ کے "جین کے" گیان کی روشنی
سچ تو یہ ہے بنی حاصل زندگی
جس کے کارن بنا آدمی آدمی
وہ ہیں ست اور اہنسا کے پیارے بچن
یہ ہمارا وطن سب کا پیارا وطن

رام کا اس میں آدرش پیغام ہے
اس میں سیتا کی سچائی کا نام ہے
اس میں لچھمن کی چاہت کا انعام ہے
جس کا شاہد ہے ہر گھر میں تلسی کتھن
یہ ہمارا وطن سب کا پیارا وطن

یہ الورا اجنتا کی مسکان ہے
یہ مٹھوں اور گپھاؤں کا استھان ہے
ہری ناتھ رامیشورم جس کی شان ہے
ہے ہری دوار کاشی یہاں ونداربن
یہ ہمارا وطن سب کا پیارا وطن

اس میں اجمیر کلیر فتح پور ہے
اس میں بہرائچ و دیوی بھی مشہور ہے
دلی اور لکھنؤ مرکز نور ہے
ان بزرگوں سے وحدت کی پھوٹی کرن
یہ ہمارا وطن سب کا پیارا وطن

لال قلعہ ہو یا جامع مسجد حسیں
ہے یہ تاریخ زندہ کہانی نہیں
گوردوارہ بھی دلی کا ہے دل نشیں
تاج دھرتی کے ماتھے پہ جیسے نگن
یہ ہمارا وطن سب کا پیارا وطن

اس میں کشمیر کی ہیں حسیں وادیاں
اس میں پنجاب کا حسن جادو بیاں
اس میں صبح بنارس کا پیارا سماں
اس میں شام اودھ کی نرالی پھبن
یہ ہمارا وطن سب کا پیارا وطن

جوشش و ٹیگور کی اس میں للکار ہے
میر و غالب کی غزلوں کی جھنکار ہے
یہ نرالا کے گیتوں کا اپہار ہے
کیوں نہ جادو جگائے پھر اس کی پون
یہ ہمارا وطن سب کا پیارا وطن

یہ نئے یگ کا زندہ چمتکار ہے
ہر طرف کارخانوں کی بھرمار ہے
ارتقا کی بہت تیز رفتار ہے
چمنیوں کا دھواں ہے انوکھا سپن
یہ ہمارا وطن سب کا پیارا وطن

وید پرکاش پھیلا دیا ہند سے
جاگرتی اس نے پائی کرم چند سے
اور سائنس بھابھا ہنرمند سے
اس کو نہرو نے بخشا ہے ایک سنگھٹن
یہ ہمارا وطن سب کا پیارا وطن

ہے دعا یہ چمن مسکراتا رہے
گیت خوشیوں کے اشرف سناتا رہے
اور ٹوٹے دلوں کو ملاتا رہے
ایکتا کا سندیسہ ہے آج فن
یہ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

مسعود سراج

مولوی عبدالحق اور خاکہ نگاری

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی ساری عمر اردو زبان و ادب کی خدمت میں گزار دی۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ وہ ایک بلند پایہ نقّاد، عظیم ادیب، زبردست محقق اور صاحب طرز انشاپرداز تھے۔ اردو کی کئی اہم تصانیف پر معرکۃ الآرا مقدمے لکھے۔ کئی قدیم کتابیں جو نایاب سمجھی جاتی تھیں ان کو از سر نو شائع کیا۔ لیکن ان کا بہترین تخلیقی کارنامہ "چند ہم عصر" ہے جس میں مختلف شخصیات کے خاکے شامل ہیں۔ اس مختصر مضمون میں ان کی خاکہ نگاری کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔

خاکہ نگاری صحیح معنوں میں شخصیت کی عکاسی ہے۔ اب تک خاکوں کے کئی اچھے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو یقیناً اس موضوع پر ایک عمدہ اضافہ ہیں اور یہ فن روز افزوں ترقی کرتا جا رہا ہے۔ ہمارے ادب میں اس موضوع پر کافی سرمایہ موجود ہے۔ خاکہ اور سوانح میں وہی فرق ہے جو ایک طویل ناول اور مختصر افسانہ میں ہوتا ہے۔ ایک اچھے خاکے میں خاکہ نگار اپنے ممدوح کی شخصیت کے تمام اہم پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ یوں تو کردار نگاری کے اچھے اچھے نمونے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں بھی مل جاتے ہیں جہاں ہیرو یا ہیروئن کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی جاتی ہیں، ان کے ماحول اور شخصیت پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ مگر چونکہ یہ محض خیالی ہیں ان کی بنیاد اصلیت اور صداقت پر نہیں ہوتی۔ اس لیے انھیں خاکہ یا خاکے سے قریب تر کہنا موزوں نہ ہوگا۔

اچھا خاکہ جسے ہم اسکیچ یا پن پورٹریٹ (PEN PORTRAIT) کہتے ہیں کسی کی شخصیت کا دلکش مطالعہ ہوتا ہے۔ خاکے میں کسی کی شخصیت پیش کی جاتی ہے۔ خاکہ نگاری ایک طرح کی تصویر کشی ہے جس میں کسی شخصیت کے بعض اہم پہلو پیش کیے جاتے ہیں۔ خاکہ نگار کے لیے غیر جانبداری، احساس تناسب، نفسیاتی مہارت ضروری ہے۔ جہاں خاکہ نگار بعض ایسے اہم پہلوؤں کو جو اس کی شخصیت کا احاطہ کر لیتے ہیں خواہ وہ اچھے ہوں یا برے، ہمدردانہ طور پر غیر جانبداری کے ساتھ، اختصار سے کام لے کر کم سے کم جملوں میں مختصر سے پیمانے پر پیش کرتا ہے وہ اپنے ممدوح کی شخصیت کے ایسے اہم پہلو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے کہ اس کی جیتی جاگتی تصویر ہماری آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

خاکہ نگاری کے کچھ نمونے قدیم تذکروں میں بھی ملتے ہیں۔ ان قدیم تذکروں میں آزاد کی "آب حیات" کافی اہمیت رکھتی ہے۔ آزاد نے بعض شعرا کا حلیہ اس طرح قلم بند کیا ہے کہ شاعر کی شخصیت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مگر آزاد نے جگہ جگہ بے جا مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اس لیے آزاد کے یہ قلمی خاکے، خاکہ نگاری کے شرائط کو پورا نہیں کرتے۔

اب تک خاکوں کے بیسیوں مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں مولوی عبدالحق کی "چند ہم عصر"، رشید احمد صدیقی کی "گنج ہائے گراں مایہ"، عبدالمجید سالک کی "یاران کہن"، چراغ حسن حسرت کی "مردم دیدہ"، شوکت تھانوی کی "شیش محل"،

محمد طفیل کی "صاحب" قابل ذکر ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کے مختلف مضامین میں نذیر احمد کی کہانی "کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی" اور ایک وصیت کی تعمیل کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور یہ دونوں مضامین خاکہ نگاری کی نہایت عمدہ مثالیں ہیں۔

مولوی عبدالحق اردو کے ایک بڑے انشا پرداز، دیدہ ور محقق اور بلند پایہ نقاد تھے۔ آخر عمر تک اردو کی ترقی و ترویج کے لیے نبرد آزما رہے۔ سالہا سال تک آپ رسالہ اردو کے مدیر رہے۔ آپ نے اردو ادب کی جو خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ "چند ہم عصر" میں مولوی صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے ایسے خاکے شامل ہیں جن کی مثال اردو زبان میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

عام طور پر خاکہ نگار کی نظر بڑی بڑی ہستیوں پر ہی پڑتی ہے مگر اس کے برعکس مولوی عبدالحق کے خاکوں میں جہاں مولانا حالی، وحیدالدین سلیم، سید علی بلگرامی اور مولانا محمد علی جیسی بڑی ہستیوں کو جگہ ملی ہے۔ وہاں نور خاں جیسے غریب سپاہی اور نام دیو جیسے غریب مالی کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مولوی عبدالحق انسانی عظمت کے دلدادہ ہیں۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں بعض معمولی شخصیتوں کو بھی غیر معمولی اور غیر فانی بنا دیا ہے۔ وہ امیروں، نوابوں اور رئیسوں کے مال و دولت سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ لوگوں میں شرافت، انسانی ہمدردی، محنت اور خلوص تلاش کرتے رہتے ہیں اور جس کسی میں یہ خوبی دیکھتے ہیں تو نہایت دیانت داری کے ساتھ ان کو سپرد قلم کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ نور خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنجاں مرنج اور وضع دار لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ ان کے بڑھاپے پر لوگوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی دیکھ کر دل میں امنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا تھا اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ تو میں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خاں ہوتے۔"

نام دیو کے خاکے میں لکھتے ہیں:

"جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے، حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی، خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں، وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچایا اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو یہ نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی تھا۔"

"وہ بہت سادہ مزاج، بھولا بھالا اور منکسر مزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا تنخواہ بھی کم تھی، اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا تھا کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔"

نور خاں اور نام دیو کے کردار پڑھ کر اس بات کا ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ مولوی عبدالحق انسانی عظمت کے شناسا ہیں۔ جن لوگوں میں آپ نے شرافت، انسانی ہمدردی اور جذبۂ مہر و محبت دیکھا ہے، ان کی شخصیتوں سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

مولوی عبدالحق کا اسلوبِ بیان خاکہ نگاری کے لیے موزوں ہے۔ خیالات کی متانت، بیان کی شگفتگی، اظہار بیان میں اعتدال، زبان میں محاوروں کی چاشنی نے ان کے خاکوں کو غیر معمولی مقبولیت عطا کر دی ہے۔ انھوں نے اپنے سارے

خاکے محبت اور عداوت کے جذبوں سے بالاتر ہو کر لکھے ہیں۔ وہ ہر شخص کے بارے میں بے لاگ رائے دیتے ہیں۔

مولانا محمد علی مرحوم کے خاکے میں جہاں انھوں نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے وہاں ان کی خامیاں بھی صاف صاف بیان کر دی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"وہ انگریزی کا بہت بڑا ادیب، زبردست انشا پرداز اور اعلیٰ درجے کا مقرر تھا لیکن جب لکھنے اور بولنے پر آجاتا تھا تو اعتدال اور تناسب دونوں نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے اور انمول جواہر پاروں کے ساتھ کنکر اور روڑے بھی بے تکلف چلے آتے تھے۔ وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وہ محبت و مروّت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اس کے جان نثار اور فدائی تھے۔ لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔"

مولانا وحیدالدین سلیم کے خاکے میں لکھتے ہیں۔

"وہ ایک جامع حیثیات شخص تھے۔ عربی اور فارسی کے جیّد عالم تھے۔ اردو زبان پر ان کی وسیع نظر تھی، خاص کر نئے الفاظ بنانے میں انھیں بڑا ملکہ تھا۔ ان کی کتاب "وضع اصطلاحات علمیہ" ایک حد تک ان کی وسعت نظر اور تبحرّ کی شاہد ہے۔ وہ اعلا درجہ کے نثار تھے اور شعر بھی خوب کہتے تھے..... گو ان کی عمر زیادہ نہ تھی، شاید ۶۸ سال کے لگ بھگ، لیکن انھوں نے کبھی صحت و صفائی کا خیال نہ رکھا اور نہ کبھی اپنے کھانے پینے کا کوئی معقول انتظام کیا۔ وہ ان چیزوں کو جانتے ہی نہ تھے۔ یہی ان کی بیماری اور بالآخر ان کی موت کا باعث ہوئی۔"

مولوی صاحب شمس العلماء ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی کی قابلیت اور علمیت کے دل سے معترف تھے۔ چنانچہ ان کے تبحرّ اور جامعیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"سید علی بلگرامی مرحوم ہندستان کے عہد جدید کے ان نامور علماء میں سے ہیں جنھوں نے علوم السنہ مشرقیہ و مغربیہ میں کمال پیدا کر کے ہند کے تمدن علمی ترقی اور روشن خیالی میں ایک نئی شان پیدا کر دی ہے۔ یہ لوگ درحقیقت جدید تعلیم کے رہبر و رہنما ہیں..."

اس کے ساتھ ساتھ ان کی بعض دوسری کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ اسی خاکے میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں!

"جب ان کے کام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کے علم کے مقابلہ میں ان کا عمل بہت ہی کم تھا..... دوسرے دکن کی آب و ہوا اور خاص کر یہاں کے حالات اس وقت کچھ ایسے تھے کہ آدمی کرتا بھی ہو تو کچھ نہ کر سکے... مرحوم میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وہ متلون مزاج تھے اور بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے یا حبّ جاہ میں ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو ان کے شان کے شایاں نہ ہوتی تھیں۔"

بعض خاکہ نگار جہاں کسی کی بعض خوبیاں بیان کرتے ہیں وہاں ان کی خامیوں کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کے یہاں ایسی منفی گرفت نہیں ہوتی۔ انھوں نے کبھی شخصیت کی کمزوریوں کو اجاگر کرنے کی بے جا کوشش نہیں کی۔ ایسے موقعوں پر وہ ابہام سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا وحیدالدین سلیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے، مگر بڑے سادہ طبیعت کے آدمی تھے، مصلحت، سلیقے اور صفائی کا داغ ان کے دامن پر نہ تھا:"

سید محمود کے خاکے میں لکھتے ہیں:

"وہ خواجہ حافظ کی غزلیں، قطعات ابن یمین اور عمر خیام

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

(خاکہ)

خلیل چچا

فرزانہ اعجاز

بڑی بڑی سرخ آنکھوں اور جوڑے حبڑے والے خلیل چچا کا حلیہ موچھیں نہ ہونے کے باوجود بھی کسی داروغہ سے بہت ملتا جلتا تھا۔ ان کا قد بھی اندازاً چھ فٹ تو ضرور ہوگا۔ میں جب بھی ان کو دیکھتی کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے قدرت نے ان کو پیدائشی طور پر داروغہ بنا کر بھیجا ہو۔ مگر دنیا کی ستم ظریفی کو کیا کیجیے کہ اتنے تنومند ہونے کے باوجود بھی ہمارے خلیل چچا مٹھائیوں اور کھلونوں کی دکان کرنے پر مجبور ہو گئے ــــ اُن کی دکان ہمارے مکان کے بالکل سامنے گلی میں تھی جس میں ایک پیسے کی ریوڑی والی مٹھائی سے لے کر کھلونے اور کاپی پنسل غرض بچوں کی ضرورت کی تمام چیزیں دستیاب ہو جاتی تھیں ــــ ایک در والی اس دکان میں ناگے سے ناچنے والی گڑیا، چابی والی موٹر، رنگ برنگی پنسلیں، سلیٹ غرض ہر چیز موجود رہتی تھی۔ بچوں کی قوم میں چند ماموں کے بعد خلیل چچا ہی قابل احترام سمجھے جاتے تھے۔ لیکن ہر بچے کے دل میں ان سے بے پناہ خوف بھی موجود رہتا تھا۔ یہ ایسا تضاد تھا کہ آج اتنی عمر آجانے کے بعد بھی میں یہ معما حل نہیں کر سکی ہوں۔

خلیل چچا کے والد پرانے زمانے سے ہی گلی میں دکان کیا کرتے تھے ان کی دکان کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ان کے یہاں نکاح نامے سے لے کر شکر چھوہارے اور دال چاول جیسی ساری اہم چیزیں مل جایا کرتی تھیں۔ دیوار میں لگے ہوئے بے شمار ڈبوں میں خشک میوے، گرم مسالے وغیرہ بھرے رہتے تھے۔ ایسے بھائیوں میں خلیل چچا کا دوسرا نمبر تھا۔ بڑے بھائی حافظ جی کے نام سے پہچانے جاتے تھے اور وہ صاف ستھرے کپڑے زیب تن کیے، خلوص و محبت کی مورت بنے اپنی دو در والی اس بڑی سی دکان میں ایک طرف بیٹھا کرتے تھے۔ اکثر ہم لوگوں کو ناریل اور بادام جیسی لذیذ چیزیں تحفتاً دیا کرتے تھے۔ ہاں تو بڑے بھائی تو حافظ ہو گئے رہے تھے لیکن کہا جاتا ہے کہ باوجود لاکھ کوشش اور مار پیٹ کے خلیل چچا بغدادی قاعدے سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ہاں انھوں نے پہلوانی ضرور سیکھ لی اور جب وہ اپنے کسرتی جسم کے ساتھ ایک ہنٹر ہاتھ میں دبا کر باہر نکلتے تو بڑے بڑے پہلوان ان کو سلام کرتے اور مانے ہوئے بدمعاش ان کو خلیل بھائی خلیل بھائی کہا کرتے تھے۔ ان کی ایک خصوصیت سوانگ بھرنا اور لوگوں کو ڈرانا بھی ہے۔ مزاح کے بغیر تو ان کا تصور مشکل ہے۔

ہمارے گھروں میں ان کا روز کا آنا جانا تھا اور چونکہ ان کی پرورش بھی ہمارے خاندان کے بچوں کے ساتھ ہوئی تھی اس لیے کچھ لوگ ان سے پردہ بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کا روز کا معمول تھا کہ دکان حافظ جی کی نگرانی میں دے کر دس بجے وہ ہمارے گھر ضرور آتے اور آتے ہی ہماری دادی کو بڑے مزاحیہ انداز میں درباری سلام کرتے اور پھر تخت کے کونے پر بیٹھ جاتے۔ ہماری دادی کو وہ چچی جان کہا کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فلاں وقت چچی جان پان بناتی ہیں بس وہ اسی وقت آتے اور کہتے کہ "چچی جان! تین سو ستر دن ہو گئے آپ نے مجھے پان تک نہیں دیا ہے میں بہت پریشان ہوں۔" یہ تمام باتیں وہ اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ نچا نچا کر کرتے۔ آخر میں ہماری دادی "چل ہٹ خلیل" کہہ کر ان کا پان ان کے حوالے کر دیتیں۔

ہر خاندان کی طرح ہمارے یہاں بھی آئے دن کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی ہی رہتی، کبھی کسی کا قرآن شریف ختم ہوتا، کبھی کہیں میلاد شریف ہوتا اور کبھی کہیں شادی خانہ آبادی کی تقریب ہوتی۔ ہاں کم از کم ہمارے گھر میں جب ایسی کوئی تقریب ہوتی تو کئی کام خلیل چچا کے ذمے کر دیے جاتے مثلاً تانبے کے برتنوں پر قلعی کروانا، شامیانوں کا انتظام کرنا اور کبھی کبھی بچّوں کی خوشی کے لیے رنگین بلبوں سے سجاوٹ بھی کرانا۔ وہ یہ تمام کام اتنی مستعدی سے انجام دیتے کہ یہ ذرا بھی خیال نہ ہوتا کہ یہ اس گھر کے فرد نہیں ہیں بلکہ ایک دکان کے مالک بھی ہیں جو بند پڑی ہے۔ اپنے کام میں مصروف رہنے کے درمیان وہ بچّوں سے مذاق بھی کرتے رہتے ہماری آپا کو ستاتے بھی جاتے۔ بڑوں کی نظر بچا کر وہ ایسا غضب کا ڈانس دکھاتے کہ ہم سب لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ کبھی ہماری آپا کو ستانے کی غرض سے کہتے "بی بی کیا بات ہے؟ آج کل خالہ بہت موٹی ہو رہی ہیں؟ کیا پھر چوری چوری چیزیں کھانے لگی ہیں؟" اتنا سنتے ہی اماں لکڑی کا چیلا لے کر ان کے پیچھے دوڑتیں اور ہم لوگ ہنستے رہتے۔

ایک بار خلیل چچا ایک ٹیلی گرام ہاتھ میں لے کر بڑے فکرمند ہمارے گھر آئے۔ وہ اس قدر سنجیدہ تھے کہ سب نے پوچھا خلیل کیا بات ہے۔ مگر ان کی نگاہیں بدستور تار کے مضمون پر جمی ہی رہیں جیسے وہ سچ مچ اس کو پڑھ رہے ہوں۔ ہم نے جھپٹ کر پوچھا کس کا تار ہے؟ دکھیں تو۔" تب انھوں نے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور بولے "ابی کس کا ہوتا، وہی انگلستان کی ملکہ کا ہے، کہتی ہیں حکومت ہم سے نہیں سنبھل رہی ہے آپ فوراً آجائیے۔ میں کئی بار کہہ چکا ہوں آئی نو سرنٹ پیری میں نہیں آسکتا۔" اب جا کر ہم لوگوں پر حقیقت واضح ہوئی اور قہقہے بلند ہونے لگے۔ اسی طرح ایک بار وہ اپنے گھر سے چلے۔ ہمارے گھر کے پاس کسی کا پلنگ دھوپ میں پڑا تھا آتے ہی اس پر گر پڑے اور تھوڑی دیر لمبی لمبی سانسیں لینے کے بعد بالکل بے سدھ ہو گئے۔ لوگ دوڑے ارے خلیل کو کیا ہو گیا۔ اس عرصے میں ان کی آنکھیں بھی چڑھ چکی تھیں۔ جیسے ہی ہماری آپا جن کو ہم لوگ اماں کہتے ہیں۔ ان کے پاس آئیں بس وہ ہڑبڑا کر اتنی زور سے اٹھے کہ اماں تو وہیں گر پڑیں اور باقی لوگ بھاگ گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ اماں نے ان کو خوب آڑے ہاتھوں لیا اور آدھی رات کو ان کی میت تک نکلنے کی دعا دینے لگیں۔ خلیل چچا پر بھلا کیا اثر ہوتا وہ ہنستے ہوئے اپنی دکان پر جا بیٹھے۔

ایک بار خلیل چچا کے گھر کوئی شادی تھی شادی سے فارغ ہو کر انھوں نے لال غرارہ اور قمیص لگا دوپٹا اوڑھ حالانکہ غرارہ ان کے بہت اونچا تھا۔ اوپر سے انھوں نے کالا برقعہ اس طرح اوڑھا کہ قمیص باہر لٹکتی رہے قصداً انھوں نے اپنا مردانہ جوتا نہیں بدلا۔ اب نقاب بند کر کے وہ سیدھے ہماری ممانی کے پاس آئے جو ان کے ساتھ کی کھیلی ہوئی نہیں اور ڈرنی بے حد تھیں صحن پار کر کے وہ بیر پر بیر رکھ کر تخت پر بغیر کچھ بولے بیٹھ گئے۔ نقاب ہنوز ان کے چہرے کو چھپائے رہی۔ ممانی نے جو اس مردانہ عورت کو دیکھا تو ڈریں اور سلائی کی مشین چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں اور بولیں "آپ کون ہیں اور کہاں گھسی آ رہی ہیں۔" جواب نہ پا کر وہ اور ڈریں اور بیچاری دالان سے اُٹھ کر سیدھی کمرے میں جا چھپیں۔ خلیل چچا نے ان کا دروازہ بند کر کے اٹھایا اور واپس جانے لگے۔ بیچاری ممانی تلملا اٹھیں تب جاتے جاتے خلیل چچا نے اپنی نقاب الٹی اور برقعے والی بی بی کی حقیقت عیاں ہوئی۔

خلیل چچا کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی دکان پر بیٹھے بیٹھے پھاٹک کے اندر آنے جانے والوں کی نگرانی بھی کرتے جاتے ہیں اکثر ان کی اس عادت نے ہم لوگوں کو چوری سے بال بال بچایا بھی ہے۔ ان کی عقاب جیسی آنکھیں اکثر بڑا کام کر جاتیں مشتبہ آدمی تو ان سے بچ کر کہیں جا نہیں سکتا ہے۔ اکثر انھوں نے چوروں کو پکڑا بھی لیا اور وہ پٹائی کی کہ عمر بھر یاد رہے ـــ ہم لوگ ان سے کہتے خلیل چچا آپ سی آئی ڈی یا پولیس میں سروس کر لیجیے۔ تو وہ بڑی رازدارانہ آواز میں کہتے "بی بی کسی سے کہیے گا نہیں میں سی۔ آئی۔ ڈی میں ہی کام کر رہا ہوں" ان کی اس بات میں کتنی حقیقت ہے کہ یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔

ایک مرتبہ ہمارے محلے میں ایک سنکی سی عورت نہ جانے کہاں سے آگئی وہ خبطی تو تھی ہی ساتھ ہی بے انتہا گندی بھی تھی یہاں تک کہ مردار چیزیں بھی بھون کر کھا جاتی اس کی اس عادت سے سارا محلہ عاجز تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود جب کئی سال تک وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو آخر کار معاملہ خلیل چچا نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک روز اس کی غیر موجودگی

یں انھوں نے سارا سامان نکلوا دیا مگر وہ عورت اتنی آسانی سے کہاں جانے والی تھی ۔۔۔ روتی پیٹتی وہ پھر آدھمکی۔ خلیل چچا بھی اپنی ہار کہاں برداشت کرسکتے تھے، ایک روز سویرے سویرے سنا کہ وہ عورت کسی کے آگے گھگھیا رہی ہے کہ "پولیس بھائی معاف کردیں ابھی ابھی جاتی ہوں بس تھوڑی دیر اور۔" پھر کسی کے غرّانے کی آواز آئی۔ جھانک کر دیکھا تو ایک داروغہ صاحب ہاتھ میں ہنٹر لیے اس کو فوراً نکل جانے کا آرڈر دے رہے تھے۔ ہم لوگ سوچنے لگے کہ یہ کون داروغہ ہیں جو بغیر بلائے پھاٹک میں آگئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر آواز آئی "عورت تو فوراً نکل میں سامنے والی بیٹھک میں بیٹھتا ہوں۔ جب تو چلی جائے گی تب ہی جاؤں گا۔" اب جو داروغہ جی نے منھ گھمایا تو معاملہ سمجھ میں آگیا۔ موٹر کارڈرائیوری کی وردی پہنے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے خلیل چچا ہی تھے۔ پولیس کے خوف کے باعث اس عورت نے ان کی طرف غور سے دیکھا تک نہیں ورنہ وہ ان "پولیس بھائی" کی حقیقت سمجھ جاتی۔ خیر اس ڈرامے سے اتنا فائدہ ہوا کہ وہ عورت ہمیشہ کے لیے بھاگ گئی۔

انگریزوں کے زمانے سے لے کر اب تک کے رجانے کتنے قصے خلیل چچا کو یاد ہیں۔ ان کے سینے میں ایسے خزانے دفن ہیں جن کی کوئی قیمت نہ ہو مگر ان کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ ان کو بکری پالنے اور باغبانی کرنے کا بے حد شوق ہے۔ جہاں وہ رہتے ہیں انھوں نے ایک طرف اپنی بکری باندھ رکھی ہے اور سارے میدان میں انار، بیر، بیلے اور گلاب کے کئی درخت لگا رکھے ہیں۔ فرصت کے اوقات میں خصوصاً رات کو وہ اس جگہ پلنگ ڈال کر سوتے ہیں۔ باغبانی کا ان کا شوق ہمارے بہت کام آرہا ہے۔ شہر کے نہ جانے کس کس باغ سے وہ ہمارے لیے پھولوں کے پودے لاتے رہتے ہیں۔ جب کسی ایسے پھول کی دریافت کرنا ہوتی جو مشکل سے ملا ہو تو پھر ہم گھنٹوں ان کی تعریف کرتے پھرتے یہ ناممکن ہو جاتا کہ اس پھول کا پودا ہم کو نہ ملے۔ وہ پودا لاتے اور بڑے فخر سے کہتے "لیجیے بیٹا! یہ دو رنگا گلاب ہے" کبھی کہتے "بٹیا یہ رات کی رانی ہے" کبھی دوہرا بیلا ہوتا اور کبھی آنکھ کا نشہ۔

اب تو وہ کبھی بیمار نہیں پڑے کم از کم ہماری یاد میں ۔۔۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے وہ پہلے والے خلیل چچا نہیں رہے۔ ان کے شانے جھکنے لگے ہیں، کچھ کمزور سے بھی ہو چلے ہیں اور سر کے بال بھی سفید ہو رہے ہیں۔ لیکن ان کی آنکھوں میں آج بھی وہی بہادری اور بے جگری کے رنگ نظر آتے ہیں جو شاید صرف انھیں کا حصہ ہیں۔

★

مولوی عبدالحق اور خاکہ نگاری ۔۔۔ (صفحہ ۴۸ کا بقیہ)

کی رباعیات پڑھتا اور مزے لیتا حتیٰ کہ اس پر عمل بھی کرتا۔ اب اخیر زمانہ میں سید محمود کو ایک شاندار انسانی کھنڈر کہا کرتا تھا لیکن کیا کھنڈر ہم کو عزیز نہیں ہوتے۔ کیا کھنڈروں کی وقعت ہمارے دل میں نہیں ہوتی؟"

مولوی عبدالحق صاحب کے طرز بیان میں شگفتگی ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی سے عبارتوں کی دلکشی اور بڑھ گئی ہے۔

"چند ہم عصر" مولوی صاحب کے لکھے ہوئے خاکوں پر مشتمل ہے۔ ان خاکوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں قدم قدم پر مولوی عبدالحق صاحب کی شخصیت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ خود ان کی سیرت کا عکس نظر آتا ہے اور ان کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

مولوی صاحب نے اپنی قلمی تصویروں میں ایسے رنگ بھرے ہیں گویا الفاظ میں جان ڈال دی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری نظروں کے سامنے ایک زندہ تصویر کھڑی کر دی ہے۔ مولوی صاحب کے زورِ قلم نے ان کے خاکوں کو غیر معمولی بنا دیا ہے۔

نیاز احمد صاحب کے الفاظ میں "چند خاکوں کا یہ مجموعہ اس وقت تک دلچسپی سے پڑھا جائے گا جب تک اردو میں غالب کے خطوط اور ابوالکلام آزاد کی عبادِ خاطر کا سکہ دلوں پر بیٹھا رہے گا۔"

★

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

خلیل الرحمٰن اعظمی

اشاعت مارچ ۱۹۷۲ء حجامت ۵×۹، ضخامت ۴۵۶ صفحات، قیمت بارہ روپے، شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک دراصل خلیل الرحمٰن اعظمی کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر موصوف کو اردو ادب میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی تھی اس تحقیقی مقالے کی تکمیل ۱۹۵۷ء میں ہوئی اور اس کی اشاعت مارچ ۱۹۷۲ء میں ہوئی ہے۔ مقالے کی تکمیل و اشاعت کی ۱۵ سالہ طویل درمیانی مدت کے دوران ترقی پسند تحریک جن مراحل و مسائل سے گزری ڈاکٹر خلیل الرحمٰن نے کتاب کے پس لفظ میں ان کا سرسری طور پر ذکر کرکے خاموشی اختیار کر لی ہے (پس لفظ ص ۴۲۸) جس کے نتیجے میں کتاب ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے درمیان ہونے والی کش مکش اور بعض دوسرے امور کے سلسلے میں خاموش رہتی ہے۔ اس مسئلہ پر خلیل الرحمٰن اعظمی کتاب کے مقدمے میں قلم طراز ہیں

"زمانۂ حال کے جن اور ادیبوں کا اس مقالے میں ذکر نہیں کیا گیا ہے اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کے سلسلے میں اس تحریک سے زیادہ متاثر نہیں رہے ہیں ویسے تلاش کرنے سے ان کی تحریروں میں ترقی پسند نظریات کا اثر دیکھا جا سکتا ہے اور اگر وہ کلی طور پر نہیں تو جزوی طور پر ضرور ترقی پسند کہے جا سکتے ہیں لیکن ان کو زیر بحث لانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔" (مقدمہ ص ۱۵)

عام قاری اس امر کو محسوس کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ موصوف کی یہ معذرتی تحریر کتاب کی کمی کو پورا کرنے میں ناکام رہتی ہے امید ہے کہ اگلے اڈیشن میں اس کمی کو دور کر دیا جائے گا۔

اس کے علاوہ کتاب میں پریم چند، جوش ملیح آبادی اور بعض دوسرے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی ادبی تخلیقات کو اس بنیاد پر نظر انداز کیا گیا ہے کہ یہ ادبی ہستیاں ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے سے قبل ہی اردو میں بلند ادبی قد و قامت اختیار کر چکی تھیں۔ اس عذر کو اگر قابل قبول بھی قرار دیا جائے تو بھی ترقی پسند تحریک کی تشکیل و توسیع میں پریم چند اور جوش ملیح آبادی کا حصہ نظر انداز کیے جانے کے قابل نہ تھا خصوصاً جوش کی شعری تخلیقات میں ترقی پسند تحریک کے عناصر و اثرات کے جائزے سے کتاب کی محرومی کتاب کی افادیت کو مجروح کرتی محسوس ہوتی ہے پریم چند اور جوش کے علاوہ بعض اور اہم ادیب اور شاعر بھی اس کتاب میں شامل ہونے سے محروم رہے ہیں مصنف نے انھیں بھی پریم چند اور جوش کی طرح ترقی پسند تحریک کے پیش روؤں کی صف میں شامل کیا ہے۔

کتاب میں مجنوں گورکھپوری اور رشید احمد صدیقی کی بحیثیت ممتحن رپورٹس کے بھی اقتباسات شامل ہیں جن میں تحقیقی مقالے کو سراہا گیا ہے۔

کتاب تین حصوں میں منقسم ہے تینوں حصوں کی تفصیلی فہرست مطالب کتاب کے آخر میں درج کی گئی ہے حصہ اول میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا تاریخی ارتقا پیش کیا گیا ہے یہ حصہ (ص ۱۹ سے ص ۱۲۰ تک) تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے اس حصے میں ترقی پسند تحریک کا پس منظر، تحریک کا آغاز، تحریک کی تاریخ میں آنے والے اہم موڑ اور دوسرے متعدد موضوعات پر اہم اور مفید مواد پیش کیا گیا ہے۔ البتہ تحریک کی تاریخ کا جائزہ ۱۹۵۶ء تک محدود رہا ہے۔

حصہ دوم میں ترقی پسند ادبی سرمائے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ حصہ (ص ۱۲۳ سے ص ۲۸۶ تک) تقریباً ۱۶۳ صفحات پر محیط ہے اس حصے میں ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ وجود میں آنے والے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے اس جائزہ میں ادب کی مختلف اصناف شامل ہیں جن میں شاعری، افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈراما نگاری، مزاح نگاری، تراجم، رپورتاژ، ڈائری اور مکاتیب وغیرہ سب ہی شامل ہیں ساتھ ہی ساتھ ان ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں پر بھی گفتگو کی گئی ہے جنھوں نے ان مختلف میدانوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے مختلف اصناف میں ترقی پسند تحریک نے ادب کی تاریخ میں جو نقش و نگار بنائے ہیں ان کو خلیل الرحمٰن اعظمی نے جو تصویر پیش کیا ہے اس حصے کی مدد سے ترقی پسند تحریک کی وسعت اور قدر و قیمت کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حصہ سوم میں ترقی پسند تنقید کا ایک تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے یہ حصہ (ص ۲۹۰ سے ص ۴۲۲ تک) تقریباً ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اس میں تحریک کے ادبی تصورات و نظریات، ترقی پسند تنقید کے پیچ و خم، ترقی پسند تنقید کے اثرات، روسی ادب سے مماثلت جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اہم ترقی پسند ناقدوں کی تنقید پر بھی بحث کی گئی ہے

کتاب کے آخر میں کتابیات کے تحت سلیقے سے ان کتب و رسائل کی طویل فہرست درج کی گئی ہے جن سے کتاب کی تیاری میں مدد لی ہے یہ فہرست اس موضوع پر دوسرے کام کرنے والوں کی اچھی رہنمائی کر سکتی ہے۔

خلیل الرحمٰن کی زیر بحث کتاب سے قبل ترقی پسند ادبی تحریک سے متعلق متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ترقی پسند ادب از عزیز احمد، ترقی پسند ادب از سردار جعفری، ترقی پسند ادب - ایک جائزہ از مہراج مہر وغیرہ شامل ہیں ان میں سے اول الذکر دو کتابیں تحریک کے روشن پہلوؤں پر زور دیتی ہیں تیسری کتاب میں تحریک کے تاریک پہلوؤں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ لیکن خلیل الرحمٰن اعظمی کی زیر تبصرہ کتاب میں ترقی پسند تحریک کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لینے کے دوران تصویر کے تاریک اور روشن دونوں پہلو پیش نظر رکھے گئے ہیں ۱۹۵۶ء تک تحریک جن نشیب و فراز سے دوچار ہوئی ہے ان کی تفصیل سے نشاندہی کی گئی ہے خوبیوں کے ساتھ تحریک کی خامیوں کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ البتہ بعض جگہ خامیوں پر گرفت ذرا سخت ہو گئی ہے معاملے میں بعض ان خامیوں کا تفصیلی بیان بے محل محسوس ہوتا ہے جنھیں تحریک کے پاسبانوں نے خود ہی بے راہ روی سمجھ کر رد کر دیا تھا۔ چنانچہ پیش نظر کتاب پر اپنے تبصرے کے دوران سید علی جواد زیدی نے بھی اس امر کو محسوس کرتے ہوئے لکھا ہے "جن خامیوں کو خود تحریک خود تسلیم کر لے اسے کم از کم اس توجہ کا درجہ تو ملنا ہی چاہیے جو نہ جانے کیا [illegible] کے معاملے میں روا رکھا ہے۔" (ماہنامہ آج کل نئی دہلی نومبر ۱۹۷۲ء ص ۴۶)

مقالے میں بعض مقامات پر مقالہ نگار کے نظریات سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی تنقید کے سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے مواد اور ہیئت پر اپنے تفصیلی بیان کے دوران جو لفظی بحث کی ہے وہ بال کی کھال نکالنے کے مترادف محسوس ہوتی ہے۔ یہ بحث کتاب کے نصف درجن صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

کتاب کے مقدمے میں ادب اور نظریے کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے

"ادب کی قدر و قیمت کے تعین میں ادیب کے نظریات سے مدد تو لی جا سکتی ہے مگر انھیں تنقید کی مکمل کسوٹی نہیں بنایا جا سکتا۔ ادبی تخلیق کا سرچشمہ زندگی کے دور رس اور ہمہ گیر تجربات ہیں اس لیے کوئی نظریہ بذات خود کسی ادب کے حسن اور اس کی عظمت کا ضامن نہیں ہو سکتا۔" (مقدمہ ص ۱)

فن کارانہ حسن کے ساتھ نظریہ ادبی تخلیقات کی عظمت کا ضامن ہوتا ہے یا نہیں یہ ایک بحث طلب نظریاتی مسئلہ ہے خلیل الرحمٰن اعظمی ادب میں نظریے کی اہمیت قبول کرنے کے حق میں نہیں یورپ اور امریکہ کی بعض تحریکات کے زیر سایہ ادب میں نظریے کو غیر ضروری قرار دینے کا نعرہ کافی زور و شور کے ساتھ اردو میں جدیدیت کی تحریک سے متعلق حلقوں میں بھی بلند کیا جا رہا ہے جہاں ادیب کے لیے (COMMITMENT) کمٹمنٹ ناقابل معافی جرم قرار دیا جا چکا ہے۔ ادب میں نظریے کے سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے تصورات میں امریکی 'تخلیقی تنقید' کے اثرات کی بازگشت بھی محسوس ہوتی ہے اور ملک کے سروں میں یہ وہی آواز ہے جس کی لے جدیدیت میں کافی تیز ہو گئی ہے

لیکن ان تمام امور کے باوجود ترقی پسند ادبی تحریک کے موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب اپنے دامن میں انتہائی مفید کارآمد مواد رکھتی ہے جسے منطقی ترتیب کے ساتھ دلکش اور دلچسپ اسلوب میں سلیقے سے پیش کیا گیا ہے جس کے لیے خلیل الرحمٰن اعظمی کو مبارک باد نہ پیش کرنا ناانصافی ہوگی اور انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ اس کتاب کو شائع کرنے کے لیے شکریے کی مستحق ثابت ہوتی ہے

——— کاظم علی خاں



ایرچیف مارشل تسری او۔ پی۔ مہرا وزیر اعلیٰ اتر پردیش، شری بہوگنا سے ودھان بھون
لکھنؤ میں ۲۵ جولائی ۱۹۷۴ء کو محو گفتگو

OCTOBER 1974

POST BOX No. 146
LUCKNOW.

Regd No. LW/NP. 17



گاندھی جی کی ایک یادگار تصویر۔ کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ دہلی (۱۹۴۰ء) میں پنڈت جواہر لال نہرو، خان عبدالغفار خاں، سردار پٹیل
اور مولانا ابو الکلام کے ساتھ

١٩٨٥



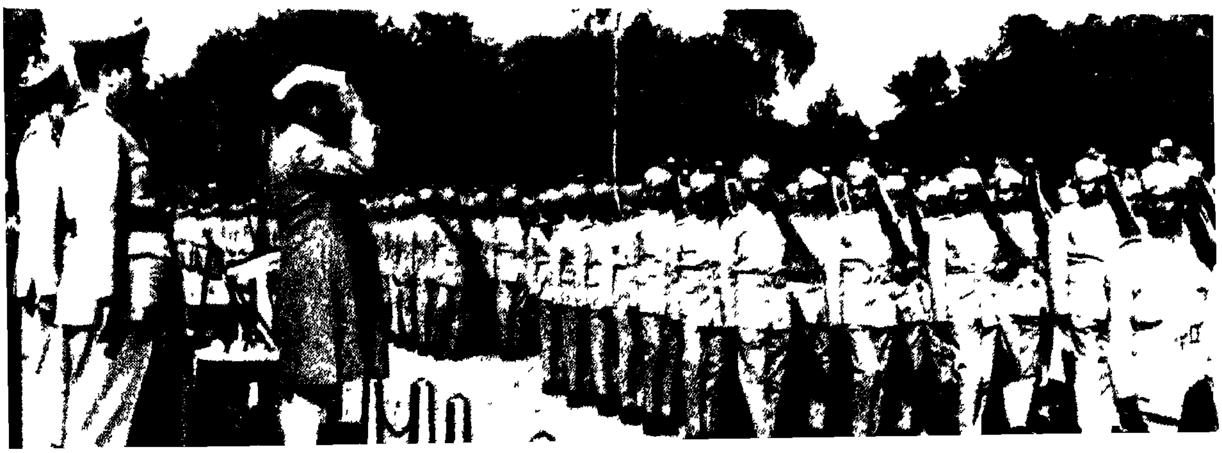


وزیراعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو دلو سنگھ گورنمنٹ ڈگری کالج میں تال میں "ہائی اسٹڈیز سیمینار" کا افتتاح کر رہے ہیں

وزیراعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے ۱۲ دسمبر ۱۹۷۴ء کو ریڈ کراس سوسائٹی کی جانب سے غریبوں کو کمبل تقسیم کیے۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے



وزیراعلیٰ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۴ء کو پولیس ٹریننگ کالج مرادآباد میں تقریب اسناد کے موقع پر پریڈ کی سلامی لیتے ہوئے



عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہرحال متفق ہو

نیا دور

جلد ۳۰ نمبر ۱۰-۱۱

جنوری، فروری ۱۹۷۵ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

سلشر: کماری سرلا ساہنی

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی

مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات، اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ انفارمیشن (سی) ڈپارٹمنٹ، یو پی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ، یو پی لکھنؤ

اپنی بات

چھبیس جنوری ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ پچیس سال قبل یعنی ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو آزاد جمہوریہ ہند کا دستور نافذ ہوا تھا جس کے تحت ملک میں ہر شخص کو بلا لحاظ مذہب و ملت آزادی کی نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے اور ترقی کرنے کا یکساں موقع دیا گیا۔ یہ دستور ہمارے ملک کے بزرگ اور آزمودہ کار سیاستدانوں، دانشوروں اور رہنماؤں کے ماہرانہ مرتب کیا تھا جس کی رو سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم یہاں ایک ایسا نظامِ حکومت قائم کریں گے جس میں صرف عوام کو بالادستی حاصل ہوگی۔ یہ انتہائی مسرت کا مقام ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوری نظام کو قائم ہوئے پچیس سال پورے ہو چکے ہیں۔ اگرچہ اس عرصے میں ملک کو کئی بار آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن ملک میں جمہوری اور پارلیمانی نظام کی جڑیں بہت گہرائی تک پہنچ چکی ہیں یہی وجہ ہے کہ اس کے پائے استقامت میں جنبش تک نہ ہوئی۔ ہمارے ملک کے ساتھ ساتھ اور بھی چند ملک آزاد ہوئے اور وہاں شروع شروع میں جمہوری حکومت بھی قائم ہوئی لیکن تھوڑے ہی عرصے میں بعض ملک زوال اور بحرانوں کا شکار ہو گئے اور اس کی صورت مسخ ہو کر رہ گئی۔ ہندوستانی جمہوریت کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ ناساعد حالات اور مختلف چیلنجوں کے باوجود ہمارا ملک اسی آن بان کے ساتھ نہ صرف ترقی کی منزل کی طرف گامزن ہے بلکہ دوسرے نو آزاد ملکوں کے لیے مینارہ نور بنا ہوا ہے۔ آزاد ہندوستان کے اس عظیم دن کی یادگار مناتے ہوئے ہم یہ عہد کرتے چلے آئے ہیں کہ ہندوستانی جمہوریت کی بقا و تحفظ اور ملک کی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے ہم کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ آج بھی ہمیں یہی عہد کرنا ہے اس لیے کہ بیرونی خطرے سے زیادہ اندرونی خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ اس وقت فسطائی رجحان رکھنے والی رجعت پسند اور فرقہ پرست جماعتیں ایک مرتبہ پھر متحدہ محاذ بنا رہی ہیں۔ ان جماعتوں نے اس عرصے میں الگ الگ اور بعض جماعتوں اور پارٹیوں کے ساتھ اتحاد کر کے کوششیں کر لیں۔ لیکن جب انھیں سوشلزم، سیکولرزم اور جمہوریت پر عوام کی غالب اکثریت کے عقیدے کو متزلزل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی تو اب وہ عظیم تر اتحاد کی کوشاں ہیں اور چاہتی ہیں کہ ملک کا موجودہ جمہوری نظام درہم برہم ہو کر پھر اسی طرح کا نظام قائم ہو جائے جس میں ملک کی دولت سمٹ کر چند افراد تک محدود رہے اور مٹھی بھر سرمایہ دار غریب عوام کا اسی طرح استحصال کر سکیں جس طرح وہ غیر ملکی دورِ حکومت میں کرتے رہے ہیں۔ انھیں یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ ان کی اجارہ داری ختم ہو جائے معاشی نابرابری دور ہو اور ایک غیر طبقہ واری نظام کا قیام پایۂ تکمیل کو پہنچے جو ہمارے جمہوری آئین کا نصب العین ہے۔ اس لیے اس وقت ہمیں سب سے زیادہ چوکس اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے تاکہ ان فسطائی رجحان رکھنے والی طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں اور وہ متحد ہو کر ہماری جمہوریت کے لیے خطرہ نہ بن سکیں۔

● زیرِ نظر شمارے کے ساتھ ہم نئے سال میں قدم رکھ رہے ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم قارئین نیا دور کو نئے سال کی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ پچھلے سال کے مقابلے میں یہ سال ہمارے لیے زیادہ خوشیوں، آسودگیوں اور اطمینان و سکون کا سال ثابت ہوگا۔ گزرنے والا سال جہاں سائنسی، صنعتی اور زرعی ترقی کے میدانوں میں ہندوستان کی فتح و نصرت کے لیے ایک قابلِ ذکر سال رہا وہاں اسے فسطائیت پسند عناصر کی سرگرمیوں اور بعض دوسرے حالات کے باعث چیلنجوں کا سال بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن مشکلات اور دشواریوں پر قابو پانے کے لیے اسی تیزی سے سرگرم عمل ہو جانا اور تخریبی عناصر کے ہتھکنڈوں کو ناکام بناتے رہنا عوام کی سیاسی بیداری، سوشلزم، سیکولرازم اور جمہوریت سے ہمارے گہرے عقیدے کا ثبوت ہے۔ یہ سال اس لحاظ سے بھی ایک اچھا سال نہیں رہا کہ اس کے دوران موت کی گرم بازاری رہی اور بہت سی اہم شخصیتیں جن میں عالم، دانشور، ادیب، فن کار اور سیاستداں شامل ہیں ہم سے چھین لیں۔ اردو دنیا کو دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے سربراہ جو ایک ممتاز عالم، دانشور، ادیب، مصنف اور صوفی شاہ معین الدین احمد ندوی سے محروم ہوگئی —— مولانا ردولی کے ایک ممتاز خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تکمیلِ علم کے بعد علمی و ادبی کاموں کے لیے انھوں نے دارالمصنفین کی فضا کو پسند کیا اور یہیں کے ہو رہے۔ دارالمصنفین کو تحقیق و تصنیف کا ایک ملک گیر ادارہ اور اس کی لائبریری کو ایک اعلیٰ درجے کی لائبریری بنا دینا شاہ صاحب کی اعلیٰ علمی استعداد اور بہترین انتظامی صلاحیت کا ثبوت ہے۔ معارف کا جو معیار سید سلیمان ندوی نے قائم کیا تھا مولانا نے اپنی ادارت میں برقرار رکھا۔ مرحوم شاہ صاحب نہایت سادگی پسند اور حق گو انسان تھے۔ طبیعت بڑی شگفتہ پائی تھی جیسا بچہ جو بھی ان سے ایک بار ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ ایسے شریف النفس انسان مشکل ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب کے سانحۂ ارتحال سے دارالمصنفین کو تو ایک عظیم نقصان پہنچا ہی ہے علم و ادب کو بھی ایسا نقصان پہنچا ہے جس کا پورا ہونا مشکل نظر آتا ہے۔

● لکھنؤ کی ایک اور مشہور شخصیت دسمبر میں اٹھ گئی۔ یہ تھے صدیق بک ڈپو کے مالک مولوی محمد صدیق۔ مولوی صاحب نے شروع سے قومی تحریکات میں حصہ لیا اور آخر وقت تک انھیں اس سے دلچسپی رہی۔ اگرچہ بعض امور میں وہ خود کو ہم آہنگ نہ رکھ سکے مگر ان کی قومی اور سماجی معاملات سے گہری دلچسپی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ پبلشر اور اردو کے خدمت گزار کی حیثیت سے مولوی صاحب بہت مشہور تھے۔ اپنے کاروبار کے سلسلے میں انھوں نے ہر شخص سے معاملہ ہمیشہ صاف رکھا۔ مرحوم صدیق صاحب کی موت ایک روایت کی موت ایک دور کا خاتمہ ہے۔

● دسمبر کا شمارہ "خسرو نمبر" کی حیثیت سے قارئین نیا دور کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اس خصوصی نمبر کی ضخامت تقریباً ۱۵۰ صفحات ہو جانے کے باعث قدرتی طور پر اس کی اشاعت میں تاخیر ہو گئی۔ نیا دور کی اشاعت میں مزید تاخیر نہ ہو اس لیے جنوری اور فروری ۱۹۷۵ء کے علاحدہ علاحدہ شمارے شائع نہ کر کے جنوری اور فروری کا مشترکہ شمارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

—— ایڈیٹر

جنوری، فروری ۱۹۷۵ء

صباح الدین عمر

بیگم اختر | سوانح، فن اور شخصیت

"وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے" اسی فرد کے لیے کہا جاتا ہے جس کی ذات میں پوری ایک انجمن کی خصوصیات مجتمع ہوگئی ہوں۔ ایسے لوگ کم پائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر بیگم اختر کے لیے بھی یہ کہا جائے کہ وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھیں تو یہ جملہ ان کی شخصیت کے لیے بالکل ناکافی ہوگا۔ وہ ایک انجمن نہ تھیں بلکہ ایک چراغ تھیں جس کے پرتو سے ہر جگہ انجمنیں نظر آتی ہیں۔ ان کی زندگی میں دو ایک بار بھی جو شخص ان سے ملا وہ بجا طور سے یہ کہہ سکتا تھا کہ ؎

یک چراغیست دریں شہر کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

دنیا انھیں "ملکۂ غزل" "ٹھمری کی رانی" "ایک خداداد آواز کی مالک" سمجھتی تھی۔ اپنی جگہ یہ حرف بہ حرف صحیح، لیکن وہ اس تعریف سے کہیں بلند، کہیں اونچی اور کہیں ارفع تھیں۔ یہ تعریف ان کی ہمہ گیر شخصیت کے صرف ایک پہلو کو سامنے لاتی ہے اور اس سے صرف "فن کار" بیگم اختر کا جلوہ نظر آتا ہے۔ مگر بیگم اختر "فن کار" ہی نہ تھیں، ان کی ذات ایک ایسے "انسان" کی ذات تھی جس کے لیے "پھرتا ہے فلک برسوں" میر ہی کے الفاظ میں اگر وہ یہ دعویٰ کرتیں تو بالکل بجا ہوتا ؎

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر ہوا ہے

ان کے مرنے سے سنگیت کی دنیا ہی ویران نہیں ہوگئی، شکستِ ساز و آواز ہی نہیں ہوئی، "لحن داؤدی" ہی قصہ پارینہ نہیں بن گیا بلکہ ان کی موت



نے آدمیت کو اشک ریز کر دیا، اخلاق گریہ کناں ہوگیا، وضع داری ماتم کرنے لگی، شرافت اپنے کو اکیلا محسوس کرنے لگی، نفاست کی آنکھیں بھر آئیں، سیر چشمی کا چشمہ خشک ہوگیا۔ ہمت کی کمر ٹوٹ گئی، رواداری کو دھکا پہنچا، غرض جتنے بھی اعلیٰ انسانی اقدار ہو سکتے ہیں ان کے لیے بیگم اختر کی وفات ایک حادثۂ عظیم ہوئی۔ وہ انسانیت کا دل تھیں اور اس دل کا چلے جانا "عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے"۔ وہ چالیس برس سے انجمن نہیں انجمن ساز بنی ہوئی تھیں۔ کوئی یہ تصور بھی نہیں کرتا تھا کہ وہ اتنی جلد اور یکایک ہم سے جدا ہو جائیں گی لیکن "یک بہ یک۔ دلوانگان زندہ رہیں محفل ہو برہم"! اور اب حالت یہ ہے کہ "مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے"۔

جو لوگ بیگم اختر سے ملے نہیں وہ شاید اسے مبالغہ سمجھیں لیکن یہ مبالغہ نہیں حقیقت بیانی ہے (اور وہ بھی غالباً نامکمل) ایسے حضرات سے میں صرف یہ عرض کروں گا کہ ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

خداداد آواز

ان کی آواز میں ایسی مٹھاس، ایسا رس، ایسی شیرینی اور ایسی دلکشی تھی کہ وہ سننے والوں پر جادو کا اثر کرتی تھی۔ یہ نعمتِ خداداد انھیں لڑکپن سے مرتے وقت تک حاصل رہی۔ عمر نے ان کی نقرئی آواز میں کوئی فرق نہیں ہونے دیا اور ان کے نغمے جس طرح ان کے عالمِ شباب میں سحر آگیں تھے اسی طرح ان کی زندگی کے آخری دن تک وہ مسحور کن رہے اور وہ چالیس برس سے زیادہ کی مدت تک "لائٹ کلاسیکل میوزک" یا ہندوستانی ہلکے شاستریہ سنگیت کی (جس میں ٹھمری، دادرا، غزل شامل ہیں) ممتاز ترین نمائندہ تسلیم ہوتی رہیں۔ لیکن بہ حیثیت فن کار کے بیگم اختر کی عظمت کا راز ان کی آواز ہی میں نہ تھا بلکہ ان کی عظمت یہ تھی کہ انھوں نے ہندوستانی لائٹ کلاسیکل میوزک کی سطح بلند کر دی۔ میر انیس نے اپنی شاعری کے متعلق بجا طور سے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انھوں نے "زمینِ سخن" کو "آسمان" کر دیا۔ جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے، بیگم اختر نے ٹھمری، دادرا اور غزل کو بھی زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔

ٹھمری کی رانی

بیگم اختر "ٹھمری کی رانی" کہی جاتی تھیں۔ یہ لقب بھی انھوں نے صرف اپنی آواز کے طفیل میں نہیں حاصل کیا تھا۔ وہ ٹھمری کے "پنجاب انگ" اور "پورب انگ" دونوں کی ماہر تھیں مگر انھوں نے ان دونوں انگوں کا امتزاج کر کے ایک تیسرا انگ ایجاد کر دیا تھا جو بیگم اختر انگ کہا جا سکتا ہے۔ اس نئے انگ نے ٹھمری کو ایک نیا انداز، ایک نیا لوچ اور ایک نیا موڑ دے دیا جو بیگم اختر کی دین تھا۔ یہ ان کا خاص رنگ تھا اور اس رنگ میں انھیں کوئی پا نہ سکا۔ ٹھمریاں ابھی تک عام طور سے ایسے راگوں میں گائی جاتی تھیں جیسے بھیرویں، تلنگ، تلک کامود، کافی، پہاڑی، پیلو وغیرہ۔ لیکن بیگم اختر نے انھیں دوسرے راگوں میں گانا شروع کر دیا مثلاً بھیم پلاسی، کلاوتی، چندر کونس، سارنگ وغیرہ۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ پکے گانے والے عام طور سے ٹھمری نہیں گاتے لیکن ایک زمانہ آئے گا جب ہر پکا گانے والا ٹھمری بھی گائے گا۔ ان کی ٹھمریاں بڑے ذوق و شوق سے سنی جاتی تھیں۔ ان کی گائی ہوئی بعض مشہور ٹھمریوں کے بول یہ ہیں:۔ کوئلیا مت کر پکار۔ تورے بنا نا ہیں چین۔ جب سے شیام سدھارے وغیرہ۔

دادروں میں اکثر وہ ایسے برجستہ اور برمحل اردو اشعار کا اضافہ کر دیتی تھیں کہ پکے گانوں کے شیدائیوں کا بھی جی چاہتا تھا کہ وہ ایسے ہی دادرے سنتے رہیں۔ وہ کہتی تھیں کہ اگر دادرا قاعدے سے گایا جائے تو بڑا مسحور کن ثابت ہوتا ہے۔

ملکۂ غزل

غزل گانے میں تو ان کا کوئی ثانی ہی نہیں ہوا۔ وہ صحیح معنوں میں "ملکۂ غزل" تھیں۔ غزل اس لحاظ سے ان کی ہمیشہ ممنون رہے گی کہ انھوں نے ہندوستانی موسیقی میں غزل کو اس طرح شامل کر دیا کہ اب وہ اس سے الگ ہی نہیں کی جا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی موسیقی میں غزل کا پہلے کوئی مقام ہی نہیں تھا۔ بیگم اختر نے غزل کو ہندوستانی موسیقی کے مختلف راگوں میں گانا شروع کیا اور ان کی غزل سرائی ایسی مقبولِ خواص و عوام ہوئی کہ اب گانے کی شاید ہی کوئی ایسی محفل ہو جس میں غزل نہ گائی جاتی ہو۔ بلکہ بیگم اختر نے اپنی عمر کے آخری دور میں غزل کو اتنا ہر دل عزیز بنا دیا تھا کہ اکثر محفلوں میں غزل کے سوا کوئی دوسری چیز گائی ہی نہ جاتی تھی اور ایسی محفلوں کا اعلان بھی "شامِ غزل" وغیرہ کے عنوان سے ہوتا تھا۔ یہاں پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ "ملکۂ غزل" بنانے میں صرف ان کی آواز کا ہی دخل نہ تھا بلکہ اس انداز کا بھی بہت بڑا حصہ تھا جس انداز سے وہ غزل گاتی تھیں۔ غزل گانے کے لیے موسیقی داں ہونے کے علاوہ غزل کے اشعار کا مفہوم اور اس کی روح کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ بیگم اختر غزل کی مغنیہ ہی نہ تھیں بلکہ فطرت نے انھیں ذوقِ سخن فہمی بھی دیا تھا۔ وہ جو غزل بھی گاتیں ان کے اشعار کا مفہوم ہی ان پر اچھی طرح واضح نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ ان اشعار کی روح کو بھی پا لیتی تھیں۔ اسی پاکیزگیِ مذاق کا نتیجہ تھا کہ ان کے غزل گانے میں بھی وہی تاثر پیدا ہو جاتا تھا جو غزل کے اشعار میں ہوتا تھا۔ غزل کے اچھے شعر سے صرف سخن فہم یا صاحبِ ذوق ہی صحیح معنوں میں لطف اندوز ہو سکتا ہے لیکن بیگم اختر کے اندازِ غزل سرائی سے وہ لوگ بھی متاثر ہو جاتے تھے جو اردو داں نہیں ہوتے تھے یا ان کا ذوقِ شعری اتنا بلند نہیں ہوتا تھا۔ بیگم اختر نے بہزاد لکھنوی، شکیل بدایونی —

لے کر میر، غالب، سودا، فانی، جگر مراد آبادی، فیض اور ملّا کی غزلیں گائی ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے متعدد دوسرے گم نام شاعروں کی غزلیں بھی گا کر انھیں مشہور کر دیا۔ انھوں نے بعض ایسے لوگوں کی بھی غزلیں گا کر اُن کا نام روشن کر دیا جن کے متعلق لوگ جانتے بھی نہ تھے کہ شعر کہتے ہیں۔ عمر کے آخری دور میں وہ اتنی غزل نواز ہو گئی تھیں کہ ایک مرتبہ ریڈیو کے "نیشنل پروگرام" میں ان سے کہا گیا کہ یہ "لائٹ کلاسیکل میوزک" کا پروگرام ہے، اس میں غزل نہ گائیے گا۔ تو انھوں نے پروگرام میں حصہ لینے سے ہی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "کیا آپ اس لیے غزل نہیں گوانا چاہتے کہ وہ اُردو کی صنف ہے؟" ریڈیو والوں کو آخر معذرت کرنا پڑی اور بیگم صاحبہ نے ٹھمری، دادرے کے ساتھ غزلیں بھی گائیں۔ یہ چھوٹا سا واقعہ ان کی غزل نوازی ہی کا نہیں، اُردو نوازی کا بھی ثبوت ہے۔

ابتدائی زندگی

یہ عظیم ہستی جس کی آواز میں "شعلہ سا لپک جائے" تھا، نوابین اودھ کے پہلے پایۂ تخت فیض آباد میں، اکتوبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئی۔ ماں کا نام مشتری بیگم تھا اور باپ کا سید اصغر حسین۔ خود ان کا شروع میں اختری نام تھا اور گھر والے بتّی کہتے تھے۔ (اُن کے بہت قریب کے لوگ آخر تک انھیں "بتّی" ہی کہتے رہے)۔ قاضی اشتیاق احمد عباسی (بیرسٹر، لکھنؤ) سے شادی کے بعد بیگم اختر عباسی ہوئیں اور دنیائے موسیقی میں تقریباً ۳۵ برس تک "بیگم اختر" کی حیثیت سے خراج تحسین حاصل کرتی رہیں۔

گھر پر قرآن مجید اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصے تک ایک اسکول میں بھی پڑھا۔ بعد میں آٹھویں نویں درجے تک انگریزی میں بھی استعداد حاصل کر لی۔ فطری صلاحیت اور فطری ذوق کی وجہ سے شروع ہی سے اُردو کا بڑا ستھرا مذاق پیدا ہو گیا جو روز بہ روز نکھرتا ہی رہا۔ شادی کے بعد گھر میں ادبی ماحول ملا۔ ملک کے اکثر شاعر جب لکھنؤ آتے تو ان کے گھر ضرور آتے اور کبھی کبھی بغیر کسی اہتمام کے مختصر سا مشاعرہ ہو جاتا۔ وفات سے چند سال پہلے غزلوں کے انتخاب کے سلسلے میں اساتذۂ اردو کے دواوین بھی زیر مطالعہ رہتے۔ بچپن ہی سے موسیقی کی تعلیم بھی دی جانے لگی تھی لیکن شاگرد کا فطری ذوقِ موسیقی اُسے استاد کے مقررہ قواعد کا پابند نہ کر سکا۔ اسی زمانے سے عوامی گیتوں اور عوامی دھنوں کی طرف جن میں سوز بھی تھا اور گداز بھی عوام کے دلوں کی دھڑکنیں بھی تھیں اور عوام کے جذبات کی عکاسی بھی، اُن کا میلان رہا اور اسی میلان نے آگے چل کر انھیں ایک طرزِ خاص کی موجد بنا دیا۔ بہرحال موسیقی کی ابتدائی تعلیم کے بعد استاد عطا محمد خاں (پٹیالہ والے) نے انھیں ہندوستانی لائٹ کلاسیکل میوزک کی تعلیم دی اور ان کے بعد کیرانہ گھرانے کے استاد عبدالکریم خاں کے بھائی، استاد عبدالوحید خاں نے پکّے گانے (شاستریہ سنگیت) یعنی خیال، دھرپد وغیرہ کی۔ لیکن بیگم صاحبہ نے اپنے فطری رجحان سے مجبور ہو کر لائٹ کلاسیکل میوزک ہی پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔

نو دس برس کی تھیں کہ محلّے ہی کے کچھ لوگوں کو ان کے گھر بھر سے دشمنی پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک رات ان کے گھر میں آگ لگا دی گئی۔ اس دشمنی کی بدولت ان کی والدہ انھیں لے کر گیا (بہار) چلی گئیں اور وہاں سے کلکتہ۔ کلکتہ ہی میں انھوں نے ۱۹۳۴ء میں بہار زلزلہ فنڈ کی ایک امدادی میوزک کانفرنس میں پہلی مرتبہ پبلک کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اس کانفرنس میں ملک کے مشہور ماہرینِ موسیقی مدعو کیے گئے تھے۔ بیگم اختر کا کوئی پروگرام اس میں نہیں رکھا گیا تھا (وہ "سامع" کی حیثیت سے اپنے استاد کے ساتھ کانفرنس میں گئی ہوئی تھیں۔ میوزک کانفرنس کا وقت ہو گیا تھا لیکن استادانِ فن کانفرنس میں پہنچے ہی نہ تھے۔ سننے والوں نے آخر عاجز آ کر جب احتجاج شروع کیا تو منتظمین نے بیگم صاحبہ کے استاد سے درخواست کی کہ انھیں کو براہِ کرم گوا دیجیے۔ (بیگم صاحبہ اگرچہ اس وقت تک پبلک میں نہیں گائی تھیں لیکن ان کی آواز اور پُرتاثیر گانے کی شہرت ہو چکی تھی)۔ استاد عطا محمد خاں نے (جن کی اس وقت وہ زیرِ تعلیم تھیں) ان سے اسٹیج پر آنے کی فرمائش کی۔ بیگم صاحبہ خود کہتی تھیں کہ پہلے تو مجھے بڑی وحشت ہوئی کہ اتنے بڑے مجمع کے سامنے کیسے گاؤں گی مگر ہمت کر کے میں نے ایک غزل گائی جس کا مطلع تھا:

تو نے بُتِ ہرجائی، کچھ ایسی ادا پائی · تکتا ہے تری صورت ہر ایک تماشائی

اور اس کے بعد ان کی ہمت جو بندھی تو تقریباً ایک گھنٹے تک گاتی رہیں اور مجمع استادانِ فن کو بھول کر اُن کے سحر آگیں نغموں سے مسحور ہوتا رہا۔ جب گا چکیں تو ایک کھدر پوش خاتون ان کے پاس آئیں اور کہا کہ "تمھارے گانے سے میں بہت خوش ہوئی اور اتنی دیر تک سنتی رہی لیکن آج میں نے تمھیں سنا ہے کل تم مجھے سننے آنا" یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔

بعد میں بیگم صاحبہ کو بتایا گیا کہ یہ تھیں مسز سروجنی نائڈو جن کی تقریر کل ہونے والی ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے اس میوزک کانفرنس سے پہلے ہی اُن کی آواز کی شہرت پھیل چکی تھی اور گراموفون کمپنیوں نے کئی سال پہلے ہی سے اُن کے گانوں کی ریکارڈنگ شروع کر دی تھی۔ ریکارڈنگ کا یہ سلسلہ آخر عمر تک رہا اور ان کے چار سو سے زیادہ ریکارڈ ہندوستان اور پاکستان میں ہر جگہ بجائے جاتے ہیں۔

بیگم اختر نے کچھ عرصے تک تھیٹر اور سنیما میں بھی کام کیا۔ سنیما کی فلموں میں وہ ۱۹۳۳ء میں داخل ہوئیں اور متعدد فلموں مثلاً روٹی، ایک دن کی بادشاہت، ممتاز بیگم وغیرہ میں کام کیا۔ انھوں نے کئی فلموں میں پلے بیک میوزک بھی دی مثلاً نل دمینتی، ناچ رنگ، احسان وغیرہ میں۔ ایک بنگالی فلم جلسہ گھر میں بھی انھوں نے بیک گراؤنڈ میوزک دی۔ اس فلم کو ۱۹۵۹ء میں روس کی ایک فلمی تقریب میں موسیقی کے اعتبار سے بہترین فلم قرار دیا گیا تھا۔ حکومت ہند نے بھی اسی بنیاد پر اس فلم کو انعام دیا تھا۔

بیرونی ممالک کے سفر

کم ہوں گے جنھوں نے ہندوستان بھر کا اتنا دورہ کیا ہو جتنا انھوں نے۔ وہ ریڈیو پروگراموں اور میوزک کانفرنسوں کے سلسلے میں شہر شہر بلائی جاتی تھیں اور وہاں جاتی تھیں۔ ہندوستان سے باہر بھی وہ کئی مرتبہ گئیں۔ اس مرتبہ تو حج کے سلسلے میں سعودی عرب جانا ہوا۔ پہلا حج ۱۹۶۲ء میں کیا۔ دوسرا ۱۹۶۵ء میں اور تیسرا ۱۹۶۹ء میں۔ اس کے علاوہ وہ کسی سرکاری یا غیر سرکاری ڈیلی گیشن کے رکن کی حیثیت سے وہ پاکستان، افغانستان، روس، ازبکستان، چیکوسلاواکیہ اور دوسرے یورپین کمیونسٹ ممالک اور نیپال گئیں۔ پاکستان میں مقیم ہندوستانی سفیر نے ۱۹۶۱ء میں یوم جمہوریہ کے موقع پر ایک جشن کیا تھا جس میں حصہ لینے کے لیے حکومت ہند نے ہندوستان سے کچھ آرٹسٹ بھیجے تھے۔ بیگم اختر کو خاص طور سے اس ڈیلی گیشن میں شریک کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء میں افغانستان کے جشن استقلال میں حصہ لینے کے لیے ہندوستان سے ایک ثقافتی وفد گیا تو بیگم صاحبہ اس وفد کی بھی ایک خصوصی رکن تھیں۔ اس موقع پر انھوں نے فارسی کی غزلیں سنائیں اور وہ اتنی پسند کی گئیں کہ محل شاہی میں بھی وہ غزلیں سنانے کے لیے مدعو کی گئیں۔ اس کے بعد وہ دو مرتبہ اور بھی افغانستان گئیں۔ اگست ۱۹۶۷ء میں وہ ایک غیر سرکاری وفد کے ہمراہ روس اور ازبکستان گئیں۔ ازبکستان میں انھوں نے تاشقند، سمرقند اور بخارا میں فارسی کی غزلیں سنائیں۔ اس کے بعد ۱۹۷۳ء میں وہ ایک بار پھر روس اور مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک میں ایک وفد کے ساتھ گئیں۔ اسی سال حکومت ہند کے ایک وفد کے ساتھ وہ نیپال بھیجی گئیں۔ ازبکستان، افغانستان اور نیپال میں تو ان کی گائی ہوئی غزلیں سمجھی بھی جاتی تھیں اور وہاں کے جس پروگرام میں انھوں نے حصہ لیا وہاں ایک خلقت اُمنڈ آتی تھی لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ روس اور چیکوسلاواکیہ، پولینڈ وغیرہ میں ان کا بڑا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ کناڈا سے بھی وہ مدعو کی گئی تھیں لیکن اپنی مصروفیات کے باعث نہیں جا سکیں۔ امریکہ اور کناڈا میں انھیں پھر بلانے کے انتظام کیے جا رہے تھے کہ سفر آخرت درپیش آگیا۔

اقبال مندی

بیگم اختر بڑی اقبال مند تھیں۔ بچپن سے انھوں نے جس چیز کی بھی خواہش کی وہ انھیں دستیاب ہوئی۔ اور یہ خوش قسمتی ہمیشہ ان کا ساتھ دیتی رہی۔ جب اسکول میں پڑھتی تھیں تو ایک استانی کے بال پسند آگئے۔ بظاہر اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ یہ بال انھیں مل جائیں گے لیکن انھوں نے طے کر لیا تھا کہ ان بالوں کا ایک ٹکڑا ہی سہی، وہ حاصل ضرور کریں گی۔ یہ سوچ کر انھوں نے اپنی کتابوں کے بستے میں ایک قینچی رکھ لی۔ اتفاق کی بات کہ ایک دن وہی استانی ایک خالی کمرے میں کرسی پر بیٹھی بیٹھی سو رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ ہمت کر کے ان کی پشت پر پہنچیں اور قینچی نکال کر ان کے بالوں کا ایک ٹکڑا کاٹ ہی لیا اور پھر جا کر اپنی والدہ سے بھی بتا دیا۔ بیگم صاحبہ خود یہ قصہ ہنس ہنس کر بیان کرتی تھیں کہ گھر میں اماں کی بے حد ڈانٹ کھائی مگر حرکت ایسی تھی کہ نہ استانی جی سے بتایا جا سکتا تھا نہ بال لوٹائے جا سکتے تھے۔

ان کی یہ اقبال مندی سفر میں ان کا بہت ساتھ دیتی تھی۔ کم ایسا ہوتا تھا کہ وہ ٹرین میں پہلے سے ریزرویشن کرا کے اسٹیشن پہنچتی ہوں مگر ہر مرتبہ سیٹ مل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ دہلی کے سفر میں میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ ان کی سیٹ کا ریزرویشن ہو گیا تھا۔ میں ویٹنگ لسٹ میں

تھا میری سیٹ کے لیے انھوں نے ریلوے کے دو چار آدمیوں سے کہا لیکن جب میں نے دیکھا کہ کسی صورت سے سیٹ نہیں مل رہی ہے تو میں نے ان سے کہا کہ میں واپس جاتا ہوں، آپ جائیے۔ بولیں "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سیٹ تو میں دلواؤں گی، تم کمپارٹمنٹ میں تھوڑی دیر کھڑے رہو۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئیں اور پانچ منٹ میں ہنستی ہوئی آئیں اور کہا "چلو سیٹ مل گئی ہے اور دیکھو تو کہاں ملی ہے۔" معلوم ہوا کہ لیڈیز کیبن میں ایک سیٹ خالی تھی۔ انھوں نے دو خواتین سے اجازت مانگی کہ میرا دیور میرے ساتھ چل رہا ہے اور اس کا جانا ضروری ہے۔ آپ یہاں اُسے لیٹنے کی اجازت دے دیں۔ لوگ ان کا اتنا احترام کرتے تھے کہ یہ اجازت مل گئی اور میں نے انھیں کے ساتھ لیڈیز کیبن میں سفر کیا۔ ایک مرتبہ انھیں سری نگر جانا تھا۔ وہ بغیر بکنگ کرائے ہوئے لکھنؤ کے ہوائی اڈے پہنچ گئیں۔ جہاز میں دہلی جانے کے لیے کہیں کوئی جگہ نہ تھی مگر انھوں نے کاؤنٹر پر اصرار کیا کہ انھیں ہوائی جہاز ہی سے دہلی جانا ہے ورنہ سری نگر کا ہوائی جہاز نہ ملے گا اور وہ اپنے پروگرام میں حصہ نہ لے سکیں گی۔ جہاز کا عملہ معذرت کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک مسافر نے ان سے کہا کہ بیگم صاحبہ آپ میرا ٹکٹ لے لیں، میں ٹرین سے چلا جاؤں گا۔

کسی ریاست کے گورنر ہوں یا وزیر اعلیٰ، بڑے سے بڑے سرکاری افسر ہوں یا ان کی بیویاں، کروڑپتی ہوں یا ملک التجار، عظیم شاعر ہوں یا ادیب، ان کا احترام کرتے تھے اور جس بات کے لیے بھی وہ کہتیں، اس سے کوئی انکار نہیں کر پاتا تھا۔ یہ ان کی اقبال مندی ہی تھی کہ انھیں دولت بھی ملی، عزت بھی ملی اور شہرت بھی۔ زندگی میں بھی حکومت اور عوام دونوں نے احترام کیا اور مرنے کے بعد بھی سارے ہندوستان میں ان کا سوگ منایا گیا۔ حکومت نے انھیں پہلے 'پدم شری' کے خطاب سے اور پھر مرگ 'پدم بھوشن' کے خطاب سے نوازا۔ مرکزی سنگیت ناٹک اکاڈمی نے انھیں اعزاز دیا۔ چالیس برس تک عوام کے دلوں پر حکمرانی کرتی رہیں۔ مرنے کے بعد ہندوستان کی ہر زبان کے اخبار اور رسالے نے ان پر اداریے لکھے اور ان پر مضامین شائع کیے۔ میّت جب لکھنؤ پہنچی تو ریاست کے وزیر اعلیٰ کی جانب سے جنازے پر پھول چڑھائے گئے اور گورنر اور ان کی اہلیہ بہ نفسِ نفیس تعزیت کے لیے آئے۔ ریاستی محکمہ اطلاعات نے جنازے کی تصویریں کھینچیں اور فلم تیار کیا۔ پارلیمنٹ میں حکومت کی طرف سے ان کی عظمت کا اعتراف کیا گیا۔

غرض اس دنیا میں ہی ان کی تقریباً ہر خواہش پوری ہو گئی۔ ایک چیز سے وہ البتہ محروم رہیں یعنی پیٹ کی اولاد سے۔ مگر یہ کمی اس طرح پوری ہو گئی کہ ایک دو نہیں سیکڑوں بلکہ ہزاروں افراد نے ہندوستان کے ہر شہر میں انھیں "امی" بنایا اور وہ بھی اولاد کی طرح ان سے محبت کرتی رہیں۔ اپنے گھر میں انھوں نے اپنے شوہر کی بھانجی عطیہ کو [illegible] بڑی بیٹی بنایا اور اسی طرح ان سے محبت کی۔ اپنی ماموں زاد [illegible] کو انھوں نے ہمیشہ سگی بہن سمجھا اور ان کی اولاد کو اپنی اولاد کی طرح [illegible] اور تعلیم و تربیت دی۔ [illegible] محبت، شفقت اور ممتا سے پیش آتی تھیں کہ اگر ان کے بطن سے کوئی اولاد ہوتی تو شاید اس کے ساتھ بھی اسی محبت نہ دکھاتیں۔

لکھنوی تہذیب کا مجسمہ

بیگم اختر اخلاق و رواداری اور لکھنوی تہذیب [illegible] کا مجسمہ تھیں۔ گفتگو میں ایسی دل کشی، متانت اور وقار کہ گھنٹوں بیٹھے ان سے بات کیجیے اور جی نہ بھرے۔ مزاج میں وہ نفاست کہ سوچ بھی نہیں جا سکتا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھی باتیں کر رہی ہیں کہ یکایک اٹھ پڑیں گی اور ایک کرسی یا میز سیدھی کرنے لگیں گی۔ (بات کرنے میں نظر پڑ گئی تھی کہ کرسی کا رُخ ٹھیک نہیں یا میز اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہے یا کوئی تنکا کہیں پڑا ہوا ہے۔) خوشبوات سے عشق۔ دنیا کے بہترین قسم کے سینٹ استعمال کرتی تھیں۔ باغیچے میں بہترین قسم کے گلاب لگوانے کا شوق انتہا کو پہنچا ہوا۔ لکھنؤ میں جب بھی ہوتیں، مالی کو برابر ہدایتیں دیتی رہتیں۔ گھر کے کمروں کی تزئین کا ہمیشہ خاص خیال رکھتی تھیں۔ پردوں سے لے کر پلنگ پوش اور چادر، ہر چیز پر نظر رہتی تھی۔ سادہ لباس پہنتی تھیں مگر اس میں بھی نفاست پسندی کا دخل ہوتا تھا۔

سیر چشمی اور فراخ دلی میں شاید بڑے بڑے رئیس بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک سابق والی ریاست کی دعوت کی۔ مہمانوں کی فہرست بننے لگی تو کہا کہ پچیس آدمیوں سے زیادہ نہ ہوں گے۔ لیکن دھیرے دھیرے یہ فہرست ڈیڑھ سو آدمیوں کی ہو گئی۔ کھانے کی فہرست

لکھوانے لگیں تو ۴ قسم کا گوشت لکھوا دیا۔ فہرست جب لکھوا چکیں تو میں نے کہا کہ میرے خیال میں اتنے قسم کا گوشت شاید مہمان کھا بھی نہ سکیں۔ گھر والوں نے بھی تائید کی تو میں نے کچھ قسمیں کاٹنا شروع کیں۔ آٹھ قسمیں رہ گئی تھیں کہ بول اٹھیں: "اب کچھ نہ کاٹنا۔ کسی کی دعوت کرو تو یا اپنے حسب حیثیت یا مہمان کی حیثیت کے مطابق۔ میری حیثیت تو کچھ نہیں، لیکن مہمان کی حیثیت کا تو خیال کرو۔" ایک مرتبہ ایک نئی موٹر خریدی۔ ایک نواب صاحب کے لڑکے آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے موٹر کی تعریف کی۔ جب وہ رخصت ہونے لگے تو اپنے ڈرائیور سے کہا: "یہ گاڑی نواب صاحب کی کوٹھی پر چھوڑ آؤ۔" نواب صاحب کے لڑکے نے ہزار ہزار کہا کہ یہ آپ کیا کر رہی ہیں، مگر بیگم صاحبہ نے جواب دیا کہ "آپ کو یہ گاڑی پسند ہے۔ میری آرزو ہے کہ اسے قبول کیجیے ورنہ میں سمجھوں گی کہ آپ نے میری توہین کی۔" نواب زادے نے بہت معذرت کی لیکن بیگم صاحبہ کسی طرح نہ مانیں اور گاڑی ان کی کوٹھی بھجوا دی۔ روپے کی کبھی پروا نہیں کی۔ ادھر روپیہ آتا ادھر وہ سوچنے لگتیں کہ اسے کس طرح خرچ کیا جائے اور جب سب خرچ کر ڈالتیں تو بے انتہا خوش ہوتیں۔

مذہبیت اور رواداری

بڑی مذہبی تھیں جس کا ایک ثبوت یہی ہے کہ تین مرتبہ حج کیا۔ نماز بھی پڑھتی تھیں اور روزے بھی رکھتی تھیں۔ اکثر دوران سفر بھی روزہ رکھ لیتی تھیں۔ پہلا حج کرنے سے قبل ہی روزہ نماز دونوں میں شدت پیدا ہو گئی تھی اور دوسروں کو بھی صوم و صلوٰۃ کا پابند دیکھنا چاہتی تھیں۔ اسی زمانے میں مجھ سے بھی تیسوں دن کے روزے رکھوا لیے۔ ہوا یہ کہ میں حسب معمول دفتر سے سیدھا ان کے گھر گیا۔ رمضان کا چاند نکل آیا تھا۔ مجھ سے کہا کہ کل میں روزہ رکھوں گی، تم روزہ رکھو یا نہ رکھو مگر میرے ساتھ افطار کرنا۔ میں نے کہا کہ جب افطار کرنا ہے تو روزہ رکھ کر آؤں گا۔ دوسرے دن مغرب سے قبل شام کو جب ان کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ سامنے کے صحن برآمدے میں دری فرش بچھا ہے، مصلے بچھے ہیں، کئی رحلوں پر قرآن مجید رکھے ہیں اور خود تلاوت میں مصروف ہیں۔ مجھے دیکھ کر آنکھ سے کہا کہ وضو کر آؤ۔ میں وضو کر کے آیا تو نماز کا اشارہ کیا۔ نماز پڑھ چکا تو قرآن مجید کی طرف اشارہ کیا۔ روزہ کھلنے میں پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے تو کہا اب ختم کرو، روزہ کھولنے کا وقت آ گیا۔ جب رات کو واپس ہونے لگا تو بولیں، روزہ چاہے نہ رکھنا مگر کل پھر افطار سے قبل پہنچ جانا ضروری ہے۔ میں نے اقرار کر لیا۔ دوسرے دن چلتے وقت کہا کہ ایک بات کا وعدہ کرو گے؟ میں نے کہا فرمائیے۔ بولیں: "یہ وعدہ کرو کہ جتنے روزے میں رکھوں گی اتنے تم بھی رکھو گے۔" مجھے معلوم تھا کہ اس سے قبل وہ مہینے میں چار پانچ سے زیادہ روزے نہیں رکھ پاتی تھیں۔ میں نے اقرار کر لیا لیکن جب ایک ہفتہ گزر گیا اور روزے کی شدت میں کمی نظر نہ آئی تو میں نے گھر والوں سے دریافت کیا کہ اس مرتبہ کیا ارادے معلوم ہوتے ہیں۔ جواب ملا کہ گھر کے بچوں کو حکم ہے کہ کوئی بے روزہ دار لڑکا میرے سامنے نہ آئے۔ میں نے پھر دریافت کیا کہ بھائی صاحب (ان کے شوہر عباسی صاحب) کا کیا حال ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ تہجد گزار ہو گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے تیس روزے میں نے رکھے۔ اس کا ثواب مجھے ملا یا بیگم صاحبہ کو، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔

ایک زمانے میں عرصے تک پابندی سے دفتر کے بعد ان کے گھر چلا جاتا تھا۔ ایک رات وہاں جا کر ایک کلب چلا گیا۔ دوسرے دن جب وہاں پہنچا تو انھوں نے دریافت کیا کہ کل کہاں تھے۔ میں ان سے جھوٹ نہیں بول پاتا تھا۔ میں نے صاف صاف بتا دیا۔ کچھ نہ بولیں۔ رات میں وہیں کھانا کھا کر جب گھر واپس ہونے لگا تو کہنے لگیں کہ سامنے با ترجمہ حدیث کی کتاب رکھی ہے۔ کچھ حدیثیں سنا دو۔ میں نے سنانا شروع کیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد بولیں "تھک گئے ہو گے، چائے پی لو۔" یہ کہہ کر چائے بنانے کے لیے کہا۔ میں نے کہا بارہ بج چکے ہیں، اب گھر جاؤں گا۔ کہا کہ آج یہیں سو رہنا، اپنے گھر ٹیلیفون کر دو یا میں کہے دیتی ہوں۔ خیر، میرے گھر فون کر دیا گیا اور چائے پینے کے بعد میں پھر حدیثیں سنانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے نیند آنے لگی تو پھر چائے بنوائی گئی۔ اس کے بعد بامعنی قرآن مجید پڑھنے کا حکم دیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد چائے پی۔ غرض یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا، یہاں تک کہ ساڑھے تین کے قریب وقت ہو گیا تو مجھ سے کہا کہ چلو تہجد کی نماز پڑھو، میں بھی پڑھوں گی۔ تہجد کی نماز پڑھی تو پھر قرآن مجید پڑھنے کے لیے کہا۔ اب سپیدۂ سحر نمودار ہونے کے قریب تھا۔ کہا کہ صبح کی نماز بھی پڑھ لو اور پھر سو رہو۔ نماز پڑھ کر میں نے دریافت کیا کہ آخر کس خطا پر مجھے اتنی

پھر جگوایا گیا تو بولیں "رات بھر کلب میں جاگتے رہے، اگر آج کی رات اللہ کی عبادت میں گزار دی تو کیا ہوا؟" ایک زمانے میں محرم بھی دس دن تک بڑی شدت سے مناتی تھیں۔ محرم کے زمانے میں فیض آباد چلی جاتیں اور وہاں لکھنؤ کے متعدد ماتمی انجمنوں کو مدعو کرتیں۔ تعزیہ کا جلوس بھی نکالتیں۔ لکھنؤ میں مستقل قیام کے بعد یہاں بھی مجالس کا سلسلہ جاری رہا۔ بنگلے کا ایک کمرہ "امام باڑہ" بنا دیا جاتا اس امام باڑے کے علم، پٹکے وغیرہ دیکھنے کی چیزیں تھیں۔

اپنے مذہب سے انھیں شغف ضرور تھا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ مذہبی تعصب کی کوئی جھلک بھی ان کے دل کے کسی گوشے میں پائی جاتی تھی۔ ان کی شاگردوں میں قریب قریب سب ہی غیر مسلم تھیں اور ہندوستان کے ہر شہر میں پائی جاتی تھیں۔ سب سے یکساں محبت کرتی تھیں اور سب انھیں 'امی' کہتے تھے۔ خود بیگم صاحبہ انھیں 'بیٹے' یا 'بیٹی' ہی سے مخاطب کرتی تھیں۔ اسی رشتے سے یہ تمام شاگرد ان کے شوہر کو 'ابا' کہہ کر پکارتے تھے۔

عزم و ہمت

بڑی آرام پسند تھیں۔ گرمیوں میں ان کے سونے کے کمرے میں کولر بھی لگا ہوتا اور پنکھے بھی چلتے رہتے۔ اگر باہر جانے کا پروگرام نہ ہوتا تو کئی کئی دن تک کمرے سے نہ نکلتیں۔ صبح نو ساڑھے نو بجے بیدار ہوتیں۔ لیکن اگر سفر درپیش ہوتا تو چاہے دو بجے رات تک جگی ہوں، صبح پانچ بجے اٹھ جاتیں۔ گھر پر اکثر چائے پلنگ ہی پر منگوا لیتیں لیکن ملنے سے لمبے سفر پر اکیلے روانہ ہو جاتیں اور دوران سفر سارا انتظام خود کرتیں۔ گرمی کا موسم ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتا لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ اپنے فارم "پسند باغ" (جہاں اب ابدی استراحت فرما رہی ہیں) مہینوں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں ان کے نو بجے چلی جاتیں، دن بھر کھیتوں کی دیکھ بھال کرتیں اور شام کو گھر لوٹتیں۔

ان کے ایک عزیز بنّن صاحب کا انتقال ہوا تو بیگم صاحبہ کے پیروں میں پھوڑے نکلے ہوئے تھے۔ ایک پیر میں آپریشن ہو چکا تھا۔ دوسرے پیر کا آپریشن ہونا باقی تھا۔ چلنا پھرنا کیا پلنگ سے ہل نہیں سکتی تھیں۔ بنّن صاحب کے گھر سے جب ان کی مٹی نکلی تو وہاں پہنچ نہ سکی تھیں۔ شام کو مجھے دفتر ٹیلیفون کیا کہ بنّن بھیا قبرستان میں کس جگہ دفن ہوئے ہیں؟ میں نے کہا "موٹر وہاں تک جا نہیں سکتی، قبر تک پہنچنے کے لیے دو تین فرلانگ نہایت ناہموار زمین پر چلنا پڑے گا اس لیے فی الحال وہاں جانے کا قصد نہ کیجیے۔" بولیں۔ "میں نے یوں ہی پوچھا تھا۔" دفتر کے بعد شام کو ان کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ قبرستان گئی ہیں۔ رات کے ساڑھے نو بجے واپس آئیں۔ جب موٹر سے اترنے کے لیے کہا گیا تو خفا ہو گئیں۔ "میرے پیروں کی حالت جانتے ہو۔ میں موٹر سے اتر کر کمرے تک جا سکتی ہوں؟" میں نے کہا آپ تو پانچ چھ فرلانگ چل کر آ رہی ہیں، دو قدم اور چلنے کی ہمت کیجیے۔ جواب دیا۔ "قبر تک جانا تو میرا فرض تھا۔ اب ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔" آخر بڑی مشکلوں سے کسی نہ کسی طرح اپنے کمرے تک پہنچیں۔

بیماری اور وفات

جب وہ پہلی مرتبہ روس گئیں تو وہاں انھیں اپنے ایک بازو میں درد کی شکایت پیدا ہوئی۔ وہیں کے ڈاکٹروں کو دکھایا گیا اور انھوں نے کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ وہاں سے واپسی پر بھی کبھی اسی طرح کے درد کی شکایت کرتی تھیں۔ سنہ ۱۹۶۷ء میں ان پر پہلی مرتبہ ہلکا قلبی دورہ پڑا۔ لیکن ڈاکٹروں کی ممانعت کے باوجود چند ہی روز بعد پلنگ سے اٹھ کر تھوڑا بہت چلنے لگیں اور پندرہ دن کے بعد ہی ایک پروگرام میں حصہ لینے کے لیے باہر روانہ ہو گئیں۔ دوسرا قلبی دورہ ۲۵ جولائی ۱۹۷۴ء کو پڑا۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام پر اصرار کیا۔ کچھ دنوں تک تو ضرور آرام کیا لیکن طبیعت پوری طرح سنبھل نہ پائی تھی کہ پھر سفر کرنے لگیں لیکن اس مرتبہ یہ ہوا کہ جب کبھی سفر سے لوٹ کر آتیں تو تکان محسوس کرتیں۔ دو ایک بار پروگرام کے بعد سانس کی تکلیف ہوئی۔ گھر واپس آتیں تب بھی سست رہتیں۔ اسی عالم میں احمد آباد، پونہ وغیرہ کے دورے پر چلی گئیں۔ ۲۶ اکتوبر کو احمد آباد میں ایک پروگرام تھا۔ پروگرام کے بعد اپنے ہوٹل واپس آئیں۔ تقریباً تین بجے رات کو وہیں تیسرا قلبی دورہ پڑا۔ فوراً اسپتال میں داخل کی گئیں۔ دوسرے دن طبیعت کچھ بہتر ہوئی مگر تیسرے دن پھر خراب ہو گئی۔ احمد آباد سے لکھنؤ دوسرے دن اطلاع کی گئی۔ اطلاع ملتے ہی عطیہ بانو اور بیگم حسنا

کے بہنوئی مختار صاحب احمد آباد کے لیے روانہ ہوگئے اور وہاں ۳۰ ر اکتوبر کی صبح پہنچ گئے۔ اس وقت بیگم صاحبہ کو سانس کی تکلیف زیادہ تھی دن بھر یہی حالت رہی اور ۳۰ ر اکتوبر ۱۹۷۴ء کو رات میں تقریباً ساڑھے آٹھ بجے آنکھیں بند کرلیں۔ سفر کرتے کرتے تھک گئی تھیں ؎

پھرتے پھرتے عاقبت، آنکھیں ہماری بند گئیں
سو گئے بیہوش، تھے ہم راہ کے ہارے ہوئے

برادر محترم عباسی صاحب ۳۰ ر اکتوبر کی شام کو دہلی روانہ ہوگئے تھے اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز احمد آباد جانے والے تھے مگر دہلی سے آگے نہ جاسکے اور بیگم صاحبہ خود ایک تابوت میں بند ان سے ملنے ۳۱ ر اکتوبر کو دہلی کے ہوائی اڈے پہنچ گئیں، دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز میت کانپور لائی گئی اور کانپور سے کار کے ذریعہ تقریباً ساڑھے چار بجے ان کے مکان (۱۔ فان بریک ایوینو۔ لکھنؤ) پہنچی۔ دہلی اور لکھنؤ والوں کو یہ نہیں معلوم ہوسکا تھا کہ تدفین کہاں اور کب ہوگی۔ پھر بھی دہلی میں جسے جسے معلوم ہوا وہ ہوائی اڈے پر میت کے جہاز کا منتظر تھا۔ اخباروں میں انتقال کی خبر شائع ہوگئی تھی اس لیے لکھنؤ میں صبح سے ہی سارے شہر کے ٹیلیفون آرہے تھے اور میت پہنچتے پہنچتے گھر پر سوگواروں کا ایک کثیر مجمع اکٹھا ہوگیا تھا۔ رات کے آٹھ بجے جنازہ "پسند باغ" لے جایا گیا اور وہیں مسجد میں تقریباً ساڑھے نو بجے اپنی والدہ کے پہلو میں دفن کردی گئیں۔

اور اس طرح وہ چراغ جس کے پرتو سے چالیس سال تک انجمنیں بنتی رہتی تھیں، بجھ گیا۔ ۲۶ ر اکتوبر ۱۹۷۴ء کی شام کو احمد آباد کے لوگ ان کے نغموں سے مسحور ہو رہے تھے اور ۳۱ ر اکتوبر کی رات کو ان کے جنازے کو کاندھا دیا جا رہا تھا ؎

دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بہ دست و جنازہ بر دوش است

تہذیب و شرافت، اخلاق و مروت، وضع داری اور ملنساری، بے تعصبی اور رواداری، بلند ہمتی اور عالی حوصلگی، ان کے ساتھ رخصت ہوگئیں۔ ان کے بعد بہ یک وقت یہ ساری خوبیاں کسی ایک فرد میں مجتمع نہ ہوسکیں گی۔ "اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے"۔ اب باتیں اور یادیں رہ گئی ہیں۔ آنسو اور آہیں رہ گئی ہیں۔ وہ آواز جو فردوسِ گوش تھی اب ہمیشہ کے لیے خموش ہوچکی ہے۔

★

کلیمہ تسنیم

بیگم اختر کی یاد میں

نغمگیِ شمعِ شبستانِ غزل
وہ مدھر تان کہ عنوانِ غزل

آبشاروں کا ترنم رقصاں
ہائے اردو وہ تری جانِ غزل

نغمہ و شعر کا گلشن اجڑا
بیگم اختر تھی بہارانِ غزل

بزم کیوں لگتی ہے سُونی سُونی
ایک آواز تھی فیضانِ غزل

تیر چھوٹا کہ صدا کا بجرا
اس کی آواز تھی پیکانِ غزل

دل گرفتہ ہے زلیخائے سخن
اب وہ شعلہ ہے نہ وہ شانِ غزل

ویسے تسنیم ہیں فن کار بہت
اختری سا نہیں عرفانِ غزل

وقار خلیل

نیا سال

زندگی ساز اٹھاتی ہے نئے سال کے ساتھ
رقص کرتی ہے، مچلتی ہے نئے سال کے ساتھ

آرزوؤں کے چھلکتے ہوئے میخانوں میں
صبح سج دھج کے نکلتی ہے نئے سال کے ساتھ

فکر و احساس کے ویرانے مہک جاتے ہیں
جیسے پُروائی سی چلتی ہے نئے سال کے ساتھ

اِس کا احساس بھی ہوتا ہے شبِ غم ٹوٹی
شام تنہا نظر آتی ہے نئے سال کے ساتھ

مہر و مہتاب کے ہمراہ وفا کی دیوی
زینہ زینہ ہی اترتی ہے نئے سال کے ساتھ

گھر کے آنگن سے، دریچوں سے در و بام تلک
روشنی پھیلتی جاتی ہے نئے سال کے ساتھ

کذب و تفریق کی، اوہام کی بجھ جاتی ہے شمع
اک نئی شمع جل اٹھتی ہے نئے سال کے ساتھ

خسرو متین خسرو

سالِ نو

نئے سال نے پھر یہ مژدہ سنایا
زمانہ نے آگے قدم اک بڑھایا
دلوں میں ہے جذبہ خوشی کا سمایا
ہر اک شادماں ہے، ہر اک مسکرایا
نیا سال خوشیوں کا پیغام لایا

بہاریں ہیں چھائی ہوئی آج ہر سو
چمن میں بھی پھیلی ہے ہر سمت خوشبو
دلوں کو ہے بھائی پپیہے کی 'پی ہو'
درختوں پہ کوئل نے نغمہ سنایا
نیا سال خوشیوں کا پیغام لایا

جہالت کے شعلوں کو پھر سے بجھائیں
جہاں میں دیے علم و فن کے جلائیں
ترقی کے رستے پہ چلنا سکھائیں
پلٹ دیں ذرا ملک و ملت کی کایا
نیا سال خوشیوں کا پیغام لایا

فروزاں دلوں میں ہو شمعِ محبت
زمانے سے کافور ہو ساری ظلمت
وطن پیارا اپنا بنے مثلِ جنت
یہ دن آج خسرو خدا نے دکھایا
نیا سال خوشیوں کا پیغام لایا

فضا ابنِ فیضی

غزل

شعورِ فن کو یہ آشفتہ خو پکارے گا
رہو گے چُپ تو قلم کا لہو پکارے گا

ادب سے رشتۂ دانش بجا سہی، لیکن
ہنروروں کو جنوں کو بہ کو پکارے گا

وہ دیکھ! ڈوب گیا آخری ستارہ بھی
یہ شب کے پچھلے پہر کس کو تو پکارے گا

یہ میکدے بھی گزرگاہ ہیں سرابوں کی
خود اپنی پیاس کو اک اک سُبو پکارے گا

سب اپنے زخم کے ٹانکے ادھیڑنے میں ہیں گم
سنے گا کون جو ذوقِ رفو پکارے گا

مرادِ جود ہے صحرا کی دھوپ، کیوں اس کو
وہ سایۂ شجرِ آرزو پکارے گا

یوں ہی بھریں گے نہ قاتل ہمیشہ بے پروا
انھیں بھی کوئی بریدہ گلو پکارے گا

ترے دیارِ زیاں سے جو لوٹ آئے بھی
ہمیں غبارِ رہِ جستجو پکارے گا

نہ اس قدر بھی سخن ناشناس بن کے جیو
تمھیں ہمارے قلم کا لہو پکارے گا

مرزا جعفر حسین

ڈاکٹر ہکّو — لکھنؤ کی ایک دلنواز شخصیت

پنڈت ہری ہرناتھ ہکّو شہر لکھنؤ کے اصلی باشندے نہیں تھے، مگر کشمیری النسل ہوتے ہوئے اور ایک ممتاز گھرانے میں پیدا اور پرورش پانے کے سبب سے ان کی فطری اور خداداد ذہنیت پر جلا ہو گئی تھی۔ ایک طویل مدت تک لندن میں تعلیم حاصل کرنے اور اس کے بعد وہیں برکار رہنے کی وجہ سے ان کے مزاج میں مشرقی اور مغربی تہذیب کا ایک حسین امتزاج پیدا ہو گیا تھا۔ مہذّب اور شائستہ تھے، حسین و خوبرو تھے، جامہ زیب تھے، خوش کلام، خوش خو اور خوش [illegible] تھے۔ انسانی ہمدردی سے بھرا ہوا دل پہلو میں تھا اور زبان شیریں تھی۔ ان آخرالذکر خصوصیات کی بدولت وہ جہاں کہیں بیٹھ جاتے مرجع خاص و عام ہو جاتے تھے۔ امیروں سے زیادہ غریب، جن کی ہمیشہ تعداد زیادہ رہی، ان کے قدردان تھے۔ طبیعت کی نفاست اور مالی اعتبار سے خوشحالی کی بدولت بہت اچھا کھاتے تھے، بہت اچھا پہنتے تھے اور بڑی صفائی اور آرام سے زندگی بسر کرتے گئے۔ ان کی تعلیم ختم ہوتے ہی ان کے والد مرحوم نے اپنے ہم پایہ خاندان میں ان کی شادی کر دی تھی۔ ابھی تو عمر تھے کہ صاحب اہل و عیال ہو گئے مگر مقدر کچھ اور ہی تھا۔ جو بچہ پیدا ہوا وہ جل بسا اور کچھ ہی مدت کے بعد اہلیہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان مصائب میں پھنس کر دماغی توازن کچھ بگڑ چلا تھا جس کا تدارک [illegible] ان کے عم محترم نے جو اس وقت خوشحال تھے ان کو مزید تعلیم کے لیے لندن بھیج دیا۔ وہاں انھوں نے مختلف ڈاکٹری کے تعلیمی اداروں سے کئی ڈگریاں حاصل کر لیں لیکن پہلی جنگ عظیم چھڑ جانے کے سبب ہندستان واپس نہیں آسکے اور وہیں ایک ہسپتال میں ملازمت مل گئی۔ نوکری

اچھی تھی، کامیاب ڈاکٹر تھے مگر دل میں اپنے وطن کی محبت موجزن تھی اس لیے لڑائی ختم ہونے کے بعد ہندستان آئے اور لکھنؤ کو اپنا جائے قرار و قیام پسند کر لیا۔ اپنے ساتھ معقول پس انداز سرمایہ لائے تھے جس سے ایک اچھا مکان سکونت کے لیے کرایہ پر لے لیا اور ایک اچھی موٹر سواری کے لیے یہاں آتے ہی خرید کر لی۔ ابتداءً چوک کے ایک دواخانہ میں، جو تخمیناً ۵۰ برس قبل ختم ہو گیا، طباعت کے لیے بیٹھنے لگے تھے۔

میری اور ان کی عمر میں بہ مشکل سات یا آٹھ برس کا فرق تھا۔ اس سے زیادہ مجھ سے بڑے نہیں تھے اس لیے ہم لوگوں کے درمیان بہت جلد بے تکلفی ہو گئی جو دوستی کی اس منزل تک پہنچی جس کی مثال اس زمانہ کے دوستانہ روابط میں کہیں نہیں ملے گی۔ شروع شروع میں ان کے پاس ہمیشہ کی مصروفیت بہت کم تھی اس لیے اپنے ادبی ذوق کی سیرابی کے لیے بھی خواہاں رہتے تھے۔ میرے ہمراہ شعرا کے یہاں بھی گئے، میر خورشید حسن عرف دولھا صاحب عروج کی مرثیہ خوانی بھی سنی اور مولانا سید سبط حسن صاحب مرحوم کی مجلسوں میں بھی بہت اشتیاق سے شرکت کرتے تھے ادبی ذوق بہت پاکیزہ تھا، تھوڑا سا فارسی مذاق بھی تھا۔ ہمارے باہمی روابط میں ان کی اس ادبیت کو بھی دخل تھا۔

[illegible] اور ان کے درمیان محض ایک [illegible] اور ڈاکٹر [illegible] نہیں تھا۔ ہم لوگوں کا جہاں تک بس چلتا [illegible] دو [illegible] روزانہ ہی تو دوسرے اور تیسرے روز ضرور ملاقات ہوا کرتی تھی اور ان ملاقاتوں میں دنیا بھر کے تذکرے ہوا کرتے تھے۔ ہماری دوستی میں اس لیے اور زیادہ وسعت ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر ہکّو طبیعتاً ملاقاتیں کرنے اور دوستی کرنے کے خوگر نہیں تھے۔

ان کے احباب کا زمرہ مختصر سے مختصر تر تھا۔ مالی اعتبار سے کافی خوشحال تھے لیکن پھر بھی پریشانیاں تھیں جن کا اظہار غالباً میرے علاوہ اور کسی کے سامنے انھوں نے نہیں کیا۔ ان کی پرائیویٹ زندگی میں کوئی چھوٹا یا بڑا واقعہ ایسا کبھی نہیں رونما ہوا جس کے تفصیلات تک انھوں نے مجھے نہ بتائے ہوں۔ ایک طرف تو دوستانہ اعتماد اس حد تک پہنچا ہوا تھا تو دوسری طرف وہ خود میرے حالات جانتے رہنے کی فکر میں رہتے تھے۔ کسی دوست کی پریشانی اور مصیبت میں مدد کر دینا ایک بات ہے لیکن ایسا دوست کہاں پیدا ہو سکتا ہے جو ہمہ وقت اس فکر میں رہے کہ اس کے دوست کو کیا کیا تکلیفیں ہیں اور اس کو کیا کیا ضرورتیں درپیش ہیں۔ تفحص و تجسس کرنا اور اس کے بعد بغیر طلب اپنے دوست کی ضروریات فراہم کرنا اور اس کی پریشانیاں دور کرنے کی کوشش کرنا صرف ڈاکٹر بکو کا کام تھا یہ شرافت اور محبت و دوستی کا یہ معیار اور اصول ڈاکٹر بکو کا اپنا ہی خاص طرۂ امتیاز تھا۔

ذاتی تعلقات اور ذاتی روابط کے سلسلہ میں کسی مزید بات کا تذکرہ کرنا سعی لاحاصل اور خود ستائی پر محمول کرنے ہوئے اب کچھ ایسے واقعات بیان کروں گا جن سے نہ صرف ان کے ثقافتی کردار بلکہ ان کی عظیم المرتبت شخصیت کا بھی اندازہ ہو سکے۔ شہر لکھنؤ میں پرانے اطباء مریضوں کا علاج خدمت خلق کے لیے قربۃً الی اللہ کرتے تھے اور ڈاکٹروں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کی نظریں مریضوں کی جیبوں پر رہتی ہیں۔ مریض بچے یا مر جائے ان لوگوں کو اپنی فیس ہی سے غرض رہتی ہے — اطبائے لکھنؤ میں بعض ہستیاں خود اپنے گھر سے خوشحال تھیں۔ بعض لوگ اپنے مطب کے ساتھ دواخانے بھی کھولے ہوئے تھے جو ان کے رزق کے لیے ان کے کفیل تھے، بعض اطباء عمائدین شہر کے دامن دولت سے وابستہ تھے، ڈاکٹر بکو کی طرح کا کوئی بھی طبیب نہیں تھا، جن کے پاس نہ خاندانی متروکہ تھا، نہ کسی رئیس سے وابستگی تھی اور نہ جس کا کوئی دواخانہ کفیل تھا۔ لیکن پھر بھی انھوں نے اس شہر کے گراں قدر روایات کو قبول ہی نہیں کیا بلکہ ان کا احترام بھی کرتے تھے۔ وہ تن تنہا آئے اور بے سہارے ایک چھوٹے سے دواخانہ میں جس کا مالک غیر تھا، صرف اپنی قابلیت کے بل بوتے اور رازقِ حقیقی کی امداد کے بھروسے پر بیٹھ گئے لیکن پہلے ہی دن سے فلاح عامہ کے لیے اعلا ترین اصول مرتب کرکے ان پر سختی کے ساتھ زندگی بھر عمل کرتے رہے۔ کسی عالمِ دین سے خواہ اس کا تعلق کسی مذہب و ملت سے کیوں نہ ہو، فیس نہیں لیں گے، کسی طالب علم سے کوئی منفعت حاصل نہیں کریں گے، ہر ڈاکٹر حکیم اور وید کی خدمت بلا معاوضہ کریں گے، ہر غریب کی ہر طرح امداد کریں گے، جھوٹا سرٹیفکٹ کسی قیمت پر نہیں دیں گے اور سچے سرٹیفکٹ کی کوئی فیس وصول نہیں کریں گے، اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحبان انجکشن لگانے کی فیس علیحدہ سے چارج کرتے تھے، ڈاکٹر بکو نے اس آمدنی کو بھی اپنے اوپر ناجائز کر لیا تھا، رفتہ رفتہ یہ بھی ہو گیا تھا کہ ناداروں کو قیمتی سے قیمتی دوائیں بھی بلاقیمت پیش کرنے لگے تھے اور یہ بھی طے کیا تھا کہ مطب میں غریب اور ناداروں کو بغیر پہلے دیکھے ہوئے کسی خوشحال کے گھر فیس کے لیے دیکھنے نہیں جائیں گے۔ ان اصولوں پر عمل کرنے کے بعد آمدنی کے بہت سے ذرائع از خود بند ہو گئے تھے مگر خدا نے ان کی نیت اور ارادوں میں اتنی برکت دی کہ وہ بہت قلیل مدت میں نہ صرف زبردست شہرت کے مالک ہوئے بلکہ مالی حیثیت سے بھی شہر میں ایک کامیاب ترین ڈاکٹر تھے۔ ان کی آمدنی ہمیشہ ان کے ضروریات بلکہ تمام تفریحی مشاغل کو پورا کرنے کے بعد بھی کثرت سے فاضل ہوتی تھی۔

غریب نوازی کا یہ حال تھا کہ فیس لینے کی نیت سے مریض کے یہاں جانے کے بعد بھی جب عسرت کا نقشہ سامنے آ جاتا تو فیس قبول کرنا تو درکنار خود اپنی جیب سے بھی کچھ کھو آتے یا دے آتے تھے صرف ایک واقعہ عرض کیا جاتا ہے جو ان کی غریب نوازی کے علاوہ دلجوئی اور خاطر نوازی کی خصلت کو بھی واضح کرتا ہے۔ ایک غریب ضعیفہ، جو حسین آباد کی رہنے والی تھی، اپنے بڑھاپے کے واحد سہارے کو بغرض علاج لے کر مطب میں حاضر ہوئی۔ مریض اس کا نواسا اور کڑیل جوان لڑکا تھا جس کے علاوہ اس بڑھیا کا اور کوئی لڑکا لڑکی نواسا نواسی کوئی عزیز بھی زندہ نہیں بچا تھا ظاہر ہے کہ اس ضعیفہ کا کیا حال رہا ہوگا۔ لڑکا متعدد امراض میں مبتلا تھا جن میں ایک کالا آزار بھی تھا۔ ڈاکٹر نے علاج شروع کیا، غالباً تین چار روز کے بعد سے دوائیں بھی بلاقیمت دینے لگے۔ فرماتے تھے کہ مریض کو ڈولی پر گھر سے یہاں لانے

تک روزانہ کرایہ دینا ہوگا وہی خرچ اس عورت کے لیے کیا کم ہے۔ بہرحال بلاقیمت دوائیں دے کر، بلامعاوضہ علاج و تیمارداری کر کے اس مریض کو اچھا کیا۔ یہاں تک تو کوئی بات ان کا طرز زندگی دیکھتے ہوئے حیرت خیز نہیں تھی مگر میں خود یہ دیکھ کر گھبرا گیا کہ دوران علاج میں شبرات کا حلوہ اس عورت نے ایک میلے کپڑے میں اور ایک مٹی کی رکابی پر ڈاکٹر صاحب کو پیش کیا تو انھوں نے ایک لوزا اٹھا کر فوراً کھا لی۔ وہ خلاف وقت کوئی چیز نہیں کھاتے تھے اور صفائی کے اصول غیر معمولی طور پر سختی کے ساتھ ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کے اس لوز کھا لینے سے دونوں عادات میں تبائن تھا۔ میں نے مزاجاً کچھ کہہ دیا تو فرمایا کہ "زیادہ سے زیادہ میری صحت کو اس حلوا کھا لینے سے کچھ نقصان ہو جائے گا لیکن اگر میں نہ کھاتا تو نہ صرف ضعیفہ کا دل ٹوٹتا بلکہ مریض کو بھی دکھ ہوتا۔ اب اس کا دل خوش ہو گیا۔ میری دوائیں بھی زیادہ سودمند ہوں گی۔"

ایک طرف غریبوں کے ساتھ یہ تلطف تھا دوسری طرف روسا و امراء کی تشفی اور دربار داری کرنا بالکل نہیں جانتے تھے۔ مہاراجہ صاحب محمود آباد نہ صرف بہت بڑے رئیس تھے بلکہ اپنے وقت کی بہت بڑی مقتدر شخصیت تھے۔ چھوٹی مہارانی صاحبہ مرحومہ کے بڑے صاحبزادے محمود حسن خان سلمہ اللہ تعالیٰ جو مہاراجہ کی جان و روح تھے دو دار حال علیل ہوئے یوں بیماری میعادی بخار کی تھی جو اپنے وقت ہی سے اچھی ہوتی ہے مگر جب تک وہ صحت یاب نہ ہوئے ڈاکٹروں کی ایک ایک دن میں متعدد بار طلبی ہوا کرتی تھی۔ مرض شباب پر پہنچا تو شہر کے تمام ممتاز اور مقتدر ڈاکٹروں کا بورڈ طلب کر لیا تھا۔ ہر ڈاکٹر مقررہ وقت پر پہنچ گیا تو ڈاکٹر ہکو کو بلانے کی اس لیے اور زیادہ ضرورت تھی کہ وہ ماہر تپ و بخار کی حیثیت سے بہت اونچی شہرت کے مالک ہو چکے تھے۔ متعدد بار آدمی بلانے آیا اور عین وقت پر سواری کے لیے موٹر بھی آ گئی۔ مہاراجہ کے ملازم خاص نے عرض کی کہ آپ چلے چلیں، مشورت کے فوراً بعد اسی گاڑی پر بلا تاخیر بھیج دیا جائے گا۔ مگر ڈاکٹر صاحب کسی طرح راضی نہ ہوئے تو فرمایا کہ "آپ مہاراجہ صاحب کو میرا بہت بہت آداب کہہ دیجیے گا اور عرض کر دیجیے گا کہ خدا نے آپ کو ماشاء اللہ بہت دولت دی ہے آپ جس کے آگے سولہ، بتیس اور چونسٹھ روپیہ پھینک دیں گے۔ وہ دوڑتا ہوا آئے گا مگر میرے سامنے یہ دقت ہے کہ اتنے مریض دور دراز کے دیہاتوں سے چھکڑوں اور لڑھیوں پر لد کر میرے یہاں آئے ہوئے ہیں ان کو میں کس کے اوپر چھوڑ کر آؤں۔ مطب ختم کرتے ہی آ جاؤں گا" اس وقت غالباً گیارہ بجے تھے اور ان کا مطب ایک ڈیڑھ بجے تک چلتا تھا۔ مہاراجہ صاحب کا آدمی مایوس ہو کر چلا گیا مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد فون آ گیا کہ اب آپ زحمت نہ کیجیے گا۔ انھوں نے بہت اچھا کہہ کر فون رکھ دیا۔ پیشانی پر شکن نہیں آئی اور اپنے غریب مریضوں کی طرف پورے خلوص کے ساتھ متوجہ رہے۔ البتہ مہاراجہ صاحب محمود آباد نے باوجود فن پرست، منزلت شناس اور قدرداں رئیس ہونے کے ڈاکٹر ہکو کی طرف پھر کبھی رخ نہیں کیا۔

ہر دیانت دار ڈاکٹر یا طبیب کا یہ اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ اپنے مرضاء کے علاج اور صحیح مشورہ میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے۔ وہ اس اصول کے برتنے میں نہ صرف غیر معمولی طور پر محتاط تھے بلکہ ان کو یہ فکر بھی رہتی تھی کہ ان کا مریض اچھا ہو جائے۔ جتنا زیادہ پیچیدہ مرض ہوتا یا ایسا مریض مل جاتا جس کو دوسرے ڈاکٹر جواب دے چکے ہوتے تھے وہ ایسے مریضوں پر بہت زیادہ توجہ فرماتے اور کسی نہ کسی طرح اچھا کر دینے کی فکر میں لگے رہتے۔ عزیزوں اور تیمارداروں سے زیادہ مریض کی خود ان کو فکر لگی رہتی تھی، ان کی معلومات ایک بحر ناپیدا کنار تھیں اور وہ اپنی کامیاب تشخیص کے لیے بڑے بڑے انگریز ماہرین فن اور سول سرجن سے تحریراً اور تقریراً برابر خراج تحسین حاصل کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں کیا بلکہ اب تک یہ دستور ہے کہ پرائیوٹ ڈاکٹروں کے سرٹیفکٹ ناکافی ہوتے ہیں اور سرکاری دفتروں میں سول سرجن کا دستخطی یا نیم دستخطی مصدقہ سرٹیفکٹ کارآمد ہوتا ہے لیکن کرنل بیگلے نے جب وہ ڈائرکٹر آف ہیلتھ اینڈ میڈیکل سروس تھے یہ عام حکم نافذ کر دیا تھا کہ ڈاکٹر ہکو کے اسناد کو کسی مزید تصدیق کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی ذات سے غریب مریضوں کو ایک طرف اگر سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں کفایت ہو جاتی تھی تو دوسری طرف وہ سول سرجنوں سے سفارش کر کے غریبوں کا بلا حق الخدمت کام کرا دیتے تھے۔ اپنی انھیں خصوصیات کی بدولت وہ "غریب کا ڈاکٹر" کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔

رئیسوں اور امیروں سے ایک گونہ بے اعتنائی کے باوجود کئی راجہ ان کے اس حد تک معتقد ہوگئے تھے کہ وہ خود ان کی ناز برداری کرنے لگے تھے اور ڈاکٹر بکّو کی خاطر اور مرضی ان کو بہت عزیز تھی۔ ایسے رئیسوں اور تعلق داروں میں شہر لکھنؤ کے بہت سے امراء کے علاوہ راجہ صاحب اوئیل، راجہ پیاگ پور مرحوم اور راجہ صاحب نان پارہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ راجہ صاحب اوئیل سے ایک حد تک دوستانہ تعلقات ہوگئے تھے، راجہ صاحب اب تک ان کو یاد کرکے سرد آہیں بھرنے لگتے ہیں۔

ڈاکٹر بکّو کھانوں میں بھی اچھا اور بلند مذاق رکھتے تھے۔ جب تک ان کی والدہ حیات رہیں ان کے گھر میں گوشت نہیں پک سکتا تھا لیکن بغیر گوشت کی غذا میں بھی بہت لذیذ پکتی تھیں۔ ان کو کھانے سے زیادہ دو وقت اچھے اور خوش ذائقہ ناشتہ کی فکر رہتی تھی جس میں مفید اور کارآمد میووں اور پھلوں کی مقدار بہتات کے ساتھ رہتی تھی۔

طعام کی طرح لباس میں بھی طبیعت بہت نفاست پسند تھی۔ بہت اچھا اور انتہائی صاف و شفاف کپڑے پہنتے تھے ابتداً کوٹ پتلون پہنتے اور ہیٹ لگاتے تھے۔ دور سے دیکھنے میں اجنبی لوگوں کو امتیاز نہیں ہوتا تھا اور وہ ان کو انگریز سمجھتے تھے۔ صاف ستھرا شین چہرہ، بلند و بالا قامت، جسم گٹھا ہوا، ہاتھ پاؤں قوی، بیحد خوب صورت انسان تھے برسوں کے بعد روسائے لکھنؤ کی ملاقاتوں کا یہ اثر پڑا کہ ہندوستانی کپڑے پہننا شروع کردیے وہ گرمیوں میں جامدانی کے انگرکھے اور جامدانی کی ٹوپیاں پہننے لگے تھے، چوڑی دار پائجاموں پر یہ لباس بہت بھلا لگتا تھا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ لباس انھیں کے لیے اور وہ اس لباس کے لیے خلق ہیں۔ ایک نیا جوڑا ہر روز بدلتے تھے جو دن بھر کی دوڑ دھوپ اور شہر بھر میں گشت لگانے کے سبب سے شام تک میلا ہو جاتا تھا۔ پھر وہ وقت آیا کہ جامدانی کے تھان آسانی سے ملنا دشوار ہوا اور بالآخر ان کی آمد ہی ختم ہوگئی۔ جامدانی کے انگرکھے چھوڑے تو کھادی کی شیروانی اختیار کرلی۔ جاڑوں میں سرج کی شیروانی اور گرمیوں میں عموماً نفیس اور باریک کھادی کی شیروانی پہنتے تھے۔ کھادی اور زیادہ جلد میلی ہوجاتی تھی۔ اس لیے کبھی کبھی شام ہی کو کپڑے بدل لیتے تھے۔ جوتا ابتداءً بلکہ برسوں تک ولایتی پہنا کیے۔ ان کے جوتوں کا پارسل ولایت سے آیا کرتا تھا۔ بیحد حوصلہ مند انسان تھے اپنے شوق کی چیز بڑی تعداد میں رکھتے تھے چنانچہ سوٹ پہنے تو الماریاں بھری رہیں۔ انگرکھے پہنے تو ان کی بہتات رہی اچکنیں بنیں تو بنتی چلی گئیں، جوتے ہمیشہ ایک درجن سے کم کبھی نہیں رہے۔ خیر و خیرات کا مادہ طبیعت میں بہت تھا، ملازمین اور متوسلین کے ساتھ بہت دریادل تھے۔ کسی چیز کا شوق جب بدلتا تو سارا ذخیرہ تقسیم ہوجایا کرتا تھا۔

لباس و طعام کے علاوہ ان کے دوسرے شوق باغبانی اور کتے پالنا تھا۔ ان کے یہاں ہمیشہ السیشین کتے پلے رہتے تھے۔ ایک جوڑے سے کبھی کم کتے نہیں رہے ان جانوروں کی خدمت ان کو بہت عزیز تھی ایک ملازم ان کے لیے مخصوص تھا مگر وہ خود اپنے سامنے ان کو کھانا کھلواتے اور اپنی نگرانی میں نہلواتے تھے۔ یہ کتے ہر وقت انھیں کے کمرہ میں رہتے تھے، رات کو ان کے سونے کا بھی وہیں بند و بست رہتا تھا۔ طبیعتاً بیحد مشقت پسند تھے۔ اپنے ذاتی کام خود اپنے ہاتھ سے کرلیتے تھے اور کسی کام کے کرلینے میں نہ ان کو تکلف ہوتا تھا اور نہ شرم آتی تھی۔

ہوتے ہوئے اپنے انھیں چچا کے بچوں کو جنھوں نے ان کو ولایت بھیج کر پڑھوایا تھا، اپنی اولاد کی طرح اپنے پاس رکھ لیا۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا، یہی ان کے لیے سرمایۂ حیات تھے، بعد میں ان کی اولاد اور بیوہ بہن بھی ساتھ میں رہنے لگی تھیں۔ لڑکیوں کو پڑھا لکھا کے شادیاں کیں اور صاحب زادے کو ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے ولایت بھیجا ڈاکٹر صاحب کی تمنا تھی کہ وہ ان کو اپنا جانشین بنا کے چھوڑیں گے لیکن جس طرح ان کی اور تمنائیں پوری نہیں ہوئیں اسی طرح یہ حسرت بھی دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ ان صاحب زادے نے فارغ التحصیل ہوکر اور ڈاکٹری پاس کرکے لندن ہی میں شادی کرلی اور وہیں بس گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا سا خاندان اب دو بھائی بہن پر مشتمل تھا جو ایک بڑی وسیع و عریض کوٹھی میں آباد تھا۔

کوئی اکیس سال کی بات ہے میں ضرورتاً چند روز کے لیے فیض آباد چلا گیا تھا وہیں دفعتاً ۶، فروری سنہ ۱۹۵۴ء کو صبح کے اخبار میں ان کی تصویر دیکھی اور یہ خبر پڑھی کہ ان کا قتل ہوگیا۔ اسی سانحہ کا مجھے پہلے سے دھڑکا لگا ہوا تھا مگر وقوعہ واقعہ کی اتنی جلد توقع نہیں تھی۔ ان کی موت نے میرے

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

م لکھنوی

باپو کی یاد

کل جس نے جگایا تھا ہم کو خود آج وہ انساں سوتا ہے
بے لڑے بھڑے جگ جیت لیا اب فاتحِ میداں سوتا ہے

سامانِ حیاتِ انسانی انسان کو جس نے بخشے تھے
جمنا کے مقدس دامن میں وہ بے سر و ساماں سوتا ہے

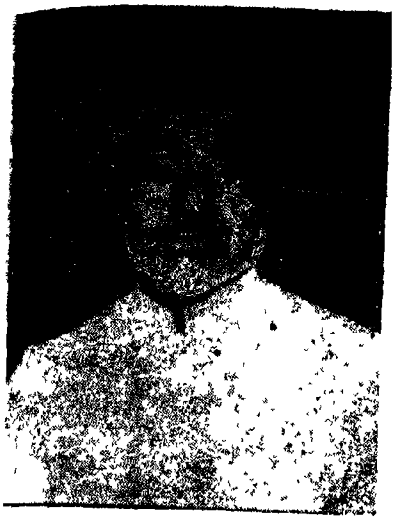
سر آنکھوں پر اپنے رکھتا تھا جو تیرے ہمیشہ چرنوں کو
افسوس کہ اے بھارت ماتا وہ تیرا نگہباں سوتا ہے

جس نے کہ وطن کے ذرّوں کو سورج کی طرح چمکایا تھا
چُپ چاپ وہ آنکھیں بند کیے آزادی کا خواہاں سوتا ہے

بھارت کا ستارہ ڈوبا ہے ہر سمت یہی اب چرچا ہے
ہندو کا پریمی سوتا ہے مُسلم کا نگہباں سُوتا ہے

آکاش پہ غم کے بادل ہیں جنتا کا ہردے بیکل ہے
اب پاپ کا دیوتا جونکا ہے اور نیک دل انساں سوتا ہے

اَب پریم کی بنسی کون بجا کر ہم کو سُنائے اے اسلم
جو پریم کنھیا اپنا تھا وہ صاحب فرماں سُوتا ہے



سید محمد ازہر شاہ قیصر

مولانا عبیداللہ سندھی

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی ایک مشہور مجاہد اور مفکر تھے ۔ ملک کی آزادی کی تحریک میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ ۱۹۱۵ء میں ریشمی خطوط کی سازش کے سلسلہ میں ہندستان سے نکلے اور ان کے استاد حضرت شیخ الہند نے انھیں ایک خاص مشن پر کابل بھیجا تھا۔ کابل میں سات۔ آٹھ سال تک مولانا کا قیام رہا۔ امیر شاہ امان اللہ اور ان کے والد شاہ حبیب اللہ سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ افغانستان کی اس وقت کی سیاست پر مولانا کے فکر ورائے کا زبردست اثر تھا۔ امان اللہ خاں نے تو اپنی زندگی کے بڑے معرکے مولانا کی زیر ہدایت انجام کو پہنچائے ۔ مولانا کابل سے نکل کر روس اور ترکی پہنچے، ان دونوں ممالک کے سیاسی انقلاب مولانا کی نگاہوں کے سامنے گزرے اور دونوں ملکوں کے ارباب سیاست پر مولانا کی عظمت کا خاص اثر تھا۔ آخر میں بارہ سال ممدوح نے مکہ مکرمہ میں گزارے ۔ اس طرح ۲۵ سال کی طویل جلاوطنی کے بعد ۱۹۳۹ء میں مولانا کانگریسی وزارتوں کی خصوصی تحریک پر ہندستان واپس آئے۔

مولانا ایک سکھ خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔ اوائل عمر میں وہ مسلمان ہوگئے اور حضرت شیخ الہند کے پاس علم حاصل کرنے دیوبند آئے ۔ دیوبند میں حضرت شیخ الہند آپ کے استاد تھے ۔مولانا سید انور شاہ کشمیری، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی، آپ کے مدرسہ کے ساتھی تھے تعلیم کے سلسلہ میں آپ دیوبند میں کئی سال مقیم رہے ۔ پھر سندھ چلے گئے ۔ وہاں ایک مدرسہ قائم کیا ، رسالہ نکالا ، پریس نصب کیا ، کتابیں لکھیں اور اپنے اسلوب فکر پر طلبہ کو ڈھالتے رہے ۔ ایک خاص موقع پر ان کے استاد حضرت شیخ الہند نے جو اپنے زمانہ میں برطانوی حکومت کے خلاف ایک مجاہدانہ تحریک کے علمبردار تھے ۔ مولانا عبیداللہ سندھی کو واپس دیوبند بلالیا۔ جہاں تک

گاندھی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، مولانا عبدالباری فرنگی محلی جیسی مقتدر شخصیتیں آپ کی قیادت میں کام کرتی تھیں مولانا سندھی اپنے استاد کے سیاسی کاموں کے راز دار ٹھہرے ۔ مولانا انور شاہ کشمیری کو استاد نے اپنے علمی منصب پر دارالعلوم میں فائز کیا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی حضرت شیخ الہند کی زبان تھے ۔مولانا حسین احمد مدنی ان کے دست و بازو اور مولانا آزاد کا قلم ان کا قلم تھا۔ حضرت شیخ الہند ہندستان کی آزادی کی تحریک میں بیرونی ممالک سے امداد کے خواہاں تھے ۔ اس کام کے لیے انھوں نے زبردست جدوجہد کی تھی اور یہی تحریک ریشمی رومال کے نام سے مشہور ہے ۔ مولانا سندھی کو جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اس تحریک کے سلسلے میں اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے غیر ملکوں میں ہزاروں تکلیفوں کو جھیلتے اور مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کے ۲۵ سال گزارے اور اسی مقصد میں وہ ڈٹے رہے۔

جب ۱۹۳۹ء میں مولانا کی واپسی کی تحریک اٹھی تو مولانا سے اپنے قدیم تعلقات کی بنا پر دیوبند اپنے اس گم شدہ فرزند کی بازیابی کا خاص طور پر خواہشمند ہوا۔ ہم سب کی خواہش تھی کہ جس مرد مجاہد کے عزم و حوصلہ کی بہت سی داستانیں ہم نے دارالعلوم کے رفقاء، اساتذہ اور طلبہ سے سن رکھی ہیں۔ اسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیں ۔ غرض ایک دن شام کو مولانا دہلی سے بغیر کسی اطلاع کے دیوبند پہنچے اور لوگوں نے انھیں اس حالت میں پایا کہ وہ اسٹیشن سے سیدھے مدرسہ کی مسجد میں پہنچ کر شکرانہ کی دو نفلیں پڑھ رہے تھے ۔ دیوبند آنے کی اطلاع آپ نے

پہلے سے اس لیے نہیں دی تھی کہ دیوبند ان کا علمی زاد بوم تھا۔ اس لیے وہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ یہاں ان کا کوئی شاندار استقبال کیا جائے۔ دوسرے دن مولانا صبح کے وقت راقم الحروف کے گھر پر تشریف لائے۔ گرمی کا موسم تھا۔ رات کو دیر تک دوستوں سے گپ شپ رہی اور وقت پر سونے کا موقع نہ ملا۔ اس لیے میں اپنے مردانہ مکان میں صبح ۸ بجے تک پڑا سوتا رہا میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک بوڑھا انسان سب سے آگے ہے۔ اور اس کے پیچھے پچاس ساٹھ آدمیوں کا ہجوم ہے۔ میں نے مولانا کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لیے پہچان نہ سکا۔ مولانا نے میری حیرت کو ختم کرنے کے لیے پیش قدمی فرمائی اور ارشاد ہوا "عبیداللہ سندھی" ـــ اور پھر مجھے سینہ سے لگالیا، پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا کہ یہ میرے رفیقِ درس اور رفیقِ فکر مولانا انور شاہ کاشمیری کی نشانی ہے۔

میری والدہ محترمہ مولانا سے اس وقت سے نیاز رکھتی تھیں جب مولانا دیوبند میں تشریف فرما تھے۔ میرے والدِ مرحوم سے ان کے خصوصی تعلقات تھے اور ان کا ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ والدہ نے چائے کا انتظام کیا۔ چائے کے وقت مولانا شبیر احمد عثمانی کے علاوہ اور کئی بزرگ بھی موجود تھے مولانا بڑی بے تکلفی سے چائے پیتے جاتے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے اسی مجلس میں انھوں نے بڑی شفقت سے مجھ سے کہا "مکہ مکرمہ میں اردو کے رسالہ میں تمہارا ایک مضمون ہم نے پڑھا۔ تم ہمارے ساتھ رہو ہم تمہیں کام کرنے کا ڈھنگ بتلادیں گے"۔ میں نے برجستہ جواب دیا کہ حضرت یہ جھگڑا میرے بس کا نہیں۔ آپ خانہ بدوش آدمی ہیں، ۲۵ سال کے بعد اب گھر واپس آئے ہیں کابل، روس، ترکی اور حجاز کی زمین ناپتے رہے ہیں۔ فقر و فاقہ میں آپ کی زندگی بسر ہوئی ہے اپنا عیش و آرام آپ نے تج دیا ہے، میں غریب ان مصیبتوں کو جھیلنے کے لیے حوصلہ کہاں سے لاؤں گا مولانا اس پر ہنس دیے۔

وطن کی واپسی کے بعد مولانا چھ سات سال زندہ رہے۔ دیوبند دہلی اور لاہور میں بارہا ان سے ملاقات ہوئی۔ مگر سیاسی مباحث پر کبھی میں نے ان سے گفتگو نہیں کی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ میں خود کوئی عملی سیاسی آدمی نہیں سیاسیات سے بہت معمولی سا تعلق ہے اور یہ معمولی سا تعلق طویل بحث و مناظرہ کی الجھنوں کو گوارہ نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ مولانا اپنی عظیم الشان سیاسی جد و جہد میں ناکام ہوجانے کے باعث بے حد چڑچڑے اور غصہ ور ہوگئے تھے جس ملک اور قوم کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کے ۲۵ سال دیارِ غیر کی ٹھوکریں کھانے اور غربت کی ناقابلِ برداشت تکالیف جھیلنے میں گذار دیے تھے اور جس کی بہتری اور سودمندی کے خیال نے اس مردِ مجاہد کی جوانی کو بڑھاپے کے ضعف و نقاہت میں بدل دیا تھا، اسے اپنے فرائض سے اتنا غافل اور اپنی ذمہ داریوں سے اتنا بے فکر پاکر انھیں غصہ آجاتا تھا۔ بگڑ جاتے تھے۔ ڈانٹ دیتے تھے اور خفا ہوجاتے تھے۔ میرا مولانا سے بار بار سامنا ہوا۔ مگر محض اس خیال سے کہ اگر کوئی سوال کیا تو خواہ مخواہ بگڑ جائیں گے، کبھی مولانا کی بساطِ علم و فکر کے اطراف و جوانب پر ہاتھ نہیں ڈالا، ان کی مجلس میں حاضر ہوا از خود جو کچھ انھوں نے فرمایا وہ سن لیا، جو کچھ انھوں نے کہا اسے باور کیا اور اٹھ کر واپس آگیا۔

البتہ لاہور میں ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ میں کشمیر سے واپس آتے ہوئے شیرانوالہ دروازہ میں اپنے بزرگ مولانا احمد علی صاحب کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا اور یہی جگہ لاہور میں مولانا کا مسکن اور مستقر تھی رات کو سوتے وقت وہاں صرف میں اور مولانا سندھی تھے۔ میری زبان سے اس وقت بے ساختہ نکلا کہ مولانا آپ دیوبند تشریف رکھتے تو اچھا تھا وہاں درس و تدریس کا مشغلہ رہتا یا اپنا سیاسی کام کرتے۔ میں نے دیکھا کہ میری اتنی سی بات سے مولانا کے تیور بدل گئے۔ اور درشت لہجہ میں فرمایا کہ ہمیں اس طرح کے مشوروں کی حقیقت معلوم ہے ہم جانتے ہیں کہ ہمیں مستقبل میں کیا کرنا ہے۔

میں نے فوراً بات بدل دی عرض کیا کہ مولانا لاہور میں بہت گرمی ہے میں تو کشمیر سے واپس آکر گرمی بہت زیادہ محسوس کر رہا ہوں اور آپ کو تو اختلاجِ قلب کا مرض ہے اس گرمی میں تو آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی مولانا سمجھ گئے کہ اس نے بات بدل دی ہے انھوں نے اپنا غصہ تو پی لیا مگر چارپائی سے اٹھ گئے اور صحن میں چہل قدمی فرمانے لگے۔ کچھ ایسے انداز میں رک رک کر ٹہل رہے تھے کہ گویا ماضی کی بہت سی داستانیں انھیں یاد آگئی ہوں، بہت ساری تلخیاں اور بہت سے دکھ درد جاگ اٹھے ہوں۔ آسمان پر چاند اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا عمارت کی چوتھی منزل پر ایک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک سکوت، ایک سناٹا، ایک افسردگی اور ایک گہری اور طویل خاموشی۔ مولانا عبیداللہ سر برہنہ تھے۔ آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے۔ اور میں شرمندگی اور ندامت سے گڑا جاتا تھا کہ میں نے کہاں کی بات کہاں چھیڑ دی میرے منھ سے کیا نکل گیا اور میں نے مولانا کو کیوں یہ تکلیف دی۔

آخری ملاقات مولانا مرحوم سے یہیں دیوبند میں مولانا شبیر احمد عثمانی

کے مکان پر ہوئی۔ مولانا عثمانی دارالعلوم سے الگ ہو چکے تھے۔ سیاسی فکر کے لحاظ سے انھوں نے لیگ کی رہنمائی قبول کرلی تھی۔ مگر اس ساری مجلس میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ آخر میں مولانا سندھی نے مولانا عثمانی سے فرمایا کہ ہم نے جامعہ ملیہ میں بیت الحکمت کے نام سے اپنا ادارہ قائم کردیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ استاد مرحوم کی اس یادگار کے سلسلے میں ان کے اور شاگرد بھی ہمارا ہاتھ بٹائیں اور ہم فخریہ کہہ سکیں کہ اس کام میں ہمارے قدیم احباب بھی ہمارے معاون ہیں؛ اس لیے آپ بیت الحکمت کے سلسلے میں ہمیں چندہ دیں اور ہماری ذاتی درخواست رہے کہ یہ چندہ ایک روپے سے کم نہ ہو۔

مولانا عثمانی نے فوراً پچاس روپے حاضر کیے اور کہا کہ تیس روپے آپ کے ذاتی مصارف کے لیے ہیں۔ اور بیس روپے بیت الحکمت کے چندہ کے لیے اور نہیں خوب یاد ہے کہ مولانا نے باہر نکل کر یہ بیس روپے اپنے نواسہ عبیداللہ انور کو جو ان دنوں دیوبند میں پڑھتے تھے، دیدیے اور فرمایا کہ دہلی تک کا کرایہ ہمارے پاس ہے۔ یہ روپیہ تم لو۔ یہاں یہ بات بتادینی بھی ضروری ہے کہ اس مرد مجاہد کی زندگی عجیب طرح گذری دہلی میں اوکھلے کی جامع مسجد تک آنے کے لیے ان کے پاس تانگہ یا ٹرام کا کرایہ نہیں ہوتا تھا اور یہ بوڑھا اور ضعیف آدمی میلوں کا یہ چکر پیدل پورا کرتا تھا۔

اخبار میں مولانا سندھی کی وفات کی خبر آئی کہ سندھ کے کسی گاؤں میں اس مرد مجاہد اور مشرق کے اس مفکر جلیل کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت کئی دوست جمع تھے ایک نے کہا کہ علم اور سیاسی فکر کا ایک ستون گر گیا، دوسرے نے کہا اسلامیات کے ایک زبردست عالم نے وفات پائی تیسرے نے کہا ایک سخت جان اور جفاکش لیڈر کی موت۔ چوتھا بولا کہ ناکام ترین لیڈر اور مجھے یہ آخری بات پسند آئی۔ حقیقتاً مولانا ایک ناکام ترین لیڈر تھے۔ اپنی تحریک کی ناکامی اپنے دوستوں کی خود غرضیاں، ہندستانی قوم کی بے شعوری اور ناسمجھی ۲۵ سال کی طویل جلاوطنی اور اس مدت طویل میں ہزاروں میل کا پیدل سفر کئی کئی وقت کا فاقہ اور ہر قسم کی تکلیفیں، پھر وطن واپس آکر یہاں کے فرقہ دارانہ شور اور شر میں اپنے سمجھے اور سلجھے ہوئے فکر کی ناقدری، طبقہ علماء کا جمود و قدامت پسندی اور انگریزی پڑھے لکھے ہوئے لوگوں کی بے راہ روی۔ یہ مسلسل مصائب اگر اس شخص کے دماغ پر برا اثر نہ ڈالتے اور اسے بھی کسی صاف اور ہموار میدان میں کام کرنے کا موقع ملتا تو یقیناً ہندستان کی تاریخ آزادی میں عبیداللہ سندھی کا نام گاندھی جی۔ شری سبھاش چندر بوس۔ پنڈت جواہر لال نہرو مولانا آزاد۔ سردار پٹیل اور راجندر پرشاد۔ کے ساتھ لکھا جاتا مگر آج مولانا کو اور ان کے کارناموں کو، ان کی محنتوں اور مشقتوں کی صحیح تفصیل جاننے والا طبقہ بہت ہی محدود ہے، زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جنھوں نے زندگی میں بھی مولانا کو۔ دیوانہ، ملحد، پاگل کہا اور اب بھی اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔

ایک دوست نے بتایا کہ مولانا نے ایک دفعہ فرمایا کہ مجھے پاگل کہو مگر میری بات سن لو اگر تم نے میری بات مان لی تو میری دیوانگی کی قیمت ادا ہو جائے گی۔

اللہ اللہ عجیب لوگ تھے جو خود کو مٹا کر قوم کو بنا گئے۔ جنھوں نے اپنی زندگی برباد کرلی مگر ملک اور قوم کی تباہی ان سے نہ دیکھی گئی، جنھوں نے اپنی ساری زندگی، زندگی کی ساری راحتیں، زندگی کے سارے ولولے، زندگی کا سارا عیش اپنے مقصد پر قربان کردیا، زندگی کے اس خاص موڑ پر جب یہاں انسانیت شرافت اور مروت کا لفظ ہی رہ گیا ہے اور ایک انسان دوسرے کو کھا جانے پر آمادہ ہے، اس ایثار نفسی، خلوص اور عام انسانیت و محبت کا کیا تصور ہو سکتا ہے یہ صرف شاید تاریخ کی، کوئی بھولی بسری کہانی ہو، زمانہ قدیم کا کوئی گیا گزرا ہوا قصہ اور پچھلے زمانہ جاہلیت کا کوئی غیر دانشمندانہ تخیل مولانا عبیداللہ سندھی اس شریف اور انصاف پرست دور کی ایک یادگار تھے جب ہندو مسلمان میں سیاسی طور پر کوئی امتیاز نہیں تھا کہتے ہیں کہ مولانا جب کلکتہ گئے تو سبھاش چندر بوس نے جو ان دنوں اپنی آزاد ہند فوج کا خیال لے کر خفیہ طور سے ہندستان سے بھاگ جانے کا ارادہ کر رہے تھے، ایک رازدارانہ مجلس میں کئی گھنٹہ مولانا سے بات چیت کی۔ سبھاش چندر بوس مولانا کا بیحد احترام اور عزت کرتے تھے۔ چھوٹوں کی طرح ان کی خدمت کرتے تھے۔ اور پروانہ وار ان پر فدا تھے۔

★

ارشاد للیانوی

عنوانِ بہار

کرتی ہے بادِ صبا گلشن میں اعلان بہار
ہو رہا ہے ہر طرف بھارت میں سامانِ بہار

جس طرف دیکھو نظر آتا ہے فیضانِ بہار
دیکھنے کی چیز ہے جوشِ فراوانِ بہار

دستِ قدرت نے سنوارا عالمِ اسباب کو
موتیوں سے بھر دیا شبنم نے دامانِ بہار

ہر زباں سے سُن رہا ہوں نغمۂ جمہوریت
مدتوں کے بعد بر آیا ہے ارمانِ بہار

روح ہے جمہوریت کی اتحادِ باہمی
گوشِ دل سے آج سُن لیں ہمصفیرانِ بہار

ہم، وطن کی لاج ہر قیمت پہ رکھیں گے ضرور
جان دے کر بھی نہ جانے دیں گے فیضانِ بہار

آنچ ہم آنے نہ دیں گے آبرو پہ ہند کی
خواہ کچھ بھی ہو، بڑھائیں گے مگر شانِ بہار

دیکھ کر جمہوریت کی یہ نرالی آن و بان
جھومتے ہیں کس خوشی سے نونہالانِ بہار

کس قدر ہر دل پہ ہے چھایا ہوا کیف و سرور
اللہ اللہ! اہلِ گلشن پر یہ احسانِ بہار

دیکھ کر ارشاد بھارت کی بہارِ جانفزا
لکھ دیے اشعار کچھ ہیں زیرِ عنوانِ بہار

شاکر جبرولی

درد کا آنچل

یہ دل جو کل بھی تھا ویراں، ہے آج بھی ویراں
کہ اس چمن پہ بہاروں کا اختیار نہیں

رہا ہے بھلا کس کو یادوں پہ قابو
خیال اُن کے آتے ہیں آتے رہیں گے
یہ ٹوٹے ستارے، رمیدہ یہ آہو
نہ جانے کہاں قہر ڈھلتے رہیں گے
فضاؤں میں ہے ان کے گیسو کی خوشبو
وہ یہ شمع کب تک جلاتے رہیں گے
ہم اُس سے جو نکھرا ہے چاہت کا جادو
بہاروں کا مکھڑا سجاتے رہیں گے
ہر اک زخم پر گیت گاتے رہیں گے
ستم کو بھی رنگیں بناتے رہیں گے

جو ہم کو رات کے کٹنے کا انتظار نہیں
یقین صبح ہے پر صبح سے قرار نہیں

شعاعوں نے قہر کی چوٹ دی بڑھ کر رگِ جاں پر
ستارے نوکِ نشتر بن کے پہلو میں اتر آئے
یہ اپنا اضطراب اور چار سو یہ شب کا سناٹا
نہ اس کروٹ سحر آئے نہ اس کروٹ سحر آئے
بڑی مدت پہ آیا تو خیالِ یاریوں آیا
کوئی بھولا ہوا جیسے وطن میں لوٹ کر آئے
بہت چاہا کہ قابو میں دل وحشت اثر آئے
مگر دیوانۂ فطرت بھلا اور راہ پر آئے

خرد تو کیا ہے جنوں کا بھی اعتبار نہیں

رشید الدین

دستورِ ہند کے چند خاص نکات

ہندستان کے قومی دستور کو نافذ ہوئے پورے ۲۵ سال کا عرصہ ہو رہا ہے اور اس بار ہم اس کی سلور جوبلی منا رہے ہیں۔ اس ربع صدی میں یہ دستور جس قدر کامیاب رہا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ دراصل ہندستان جیسے ملک کے لیے جہاں ہر صوبہ میں ایک نئی زبان اور نیا کلچر ہے اور جہاں کئی مذاہب اور کئی مکاتب خیال کے لوگ بستے ہیں ایک مکمل اور جامع دستور بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر امبیدکر اور ان کے ساتھی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے برسوں کی محنت اور جانفشانی کے بعد ایک ایسا دستور مرتب کیا جو اس ملک کے حالات کے عین مطابق تھا۔ اس کی ہر دفعہ اپنے اندر خاص معنی اور مفہوم رکھتی ہے اور اس کے ہر ہر فقرے پر کئی کئی دن بحثیں ہوتی رہیں۔ اس دستور نے ہند میں رائج برسوں کے اونچ نیچ، ذات پات اور نسل و مذہب کے فرق کو یک لخت ختم کر دیا۔ یہ جتنا ضخیم ہے اتنا ہی لچکدار بھی ہے اور جتنا نظری ہے اتنا ہی عملی بھی ہے۔ اس میں دنیا کے تمام دساتیر کی روح موجود ہے جو صحیح جمہوری اصولوں پر مرتب کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں قسم قسم کے پھول موجود ہیں لیکن اس کے باوجود اس کی اپنی ایک انفرادیت بھی ہے۔ اگر آپ کو کثرت میں وحدت کا جلوہ دیکھنا ہے تو اس دستور کا مطالعہ کیجئے۔

ہندستان کے دستور کے چند نکات جو خاص اہمیت کے حامل ہیں اور جن کی وجہ سے یہ اتنا مکمل اور جامع نیز جاذب نظر ہونے کے ساتھ ساتھ کارآمد ثابت ہوا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) سب سے پہلے دستور کی تمہید ہے جسے ہم اس کی روح بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس تمہید میں صاف لفظوں میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ ہندستان ایک مقتدر عوامی جمہوریہ ہوگا۔ دستور کی بنیاد انصاف، حریت، مساوات اور آزادی جیسے زرّیں اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ نیز تمہید میں یہ امر بھی درج کر دیا گیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کے اصلی مالک عوام ہوں گے۔

(۲) ہندستان کے قومی دستور کی دوسری خاص بات یہ ہے کہ اس میں دنیا کے تمام دساتیر کا نچوڑ جمع کر دیا گیا ہے۔ اس دستور کے مرتب کرنے سے قبل ڈاکٹر امبیدکر اور ان کے ساتھی دنیا کے تمام خاص خاص ممالک کے دورہ پر گئے اور وہاں کے دساتیر کا تفصیلی مطالعہ کیا اور انھیں عملی طور پر رائج بھی دیکھا۔ اس کے بعد طویل مباحث اور غور و خوض کے بعد جو باتیں ان دساتیر میں اچھی تھیں اور جو ہندستان میں قابل نفاذ تھیں انھیں اس دستور میں شامل کیا گیا۔ چنانچہ ہمارے دستور میں امریکہ، برطانیہ، فرانس، اسپین، سوئیزرلینڈ، آسٹریلیا اور کینیڈا کے دساتیر کی اچھی چیزیں موجود ہیں۔

(۳) ہندستان کا دستور وفاقیہ یعنی فیڈرل ہے۔ اس طرح یہاں وفاقی طرز مملکت قائم ہے۔ ہندستان ایک وسیع و عریض ملک ہے اور ایک وفاقی مملکت کے لیے جتنی چیزیں ضروری ہیں وہ سب یہاں پائی جاتی ہیں اور حق تو یہ ہے کہ یہاں اس سے زیادہ موزوں اور کوئی طرز مملکت نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں کے ملک کا

سارا نظم و نسق ریاستوں اور مرکز کے درمیان تقسیم ہے۔ ۹۷ امور مرکزی حکومت کے تحت، ۶۶ ریاستی حکومتوں کے تحت اور ۴۷ امور مشترک ہیں۔ اس طرح ہندستان ایک وفاقی مملکت ہے جہاں مرکز ریاستوں کے مقابلہ میں نسبتاً طاقتور ہے۔

(۴) ہندستان کا دستور عام حالات میں وفاقی ہوگا لیکن مفاجاتی صورت حال کے تحت یہ کسی بھی وقت عارضی طور پر وحدانی دستور میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ مفاجاتی صورت حال بیرونی حملہ یا اندرونی خلفشار کسی بھی طرح رونما ہو سکتا ہے جس کے بعد صدر جمہوریہ کو ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے وسیع اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔ پچھلے ۲۵ سال میں کبھی ایسا موقع نہیں آیا۔

(۵) کوئی بھی دستور مرتب ہونے کے بعد حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتا۔ حالات کے لحاظ سے اس میں ترمیمات کی جا سکتی ہیں۔ ہندستان کا دستور جتنا ضخیم ہے اتنا ہی لچکدار بھی ہے۔ اس میں بہ آسانی ترمیم کی جا سکتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں دو تہائی کی اکثریت سے کوئی بھی ترمیم پیش کی جا سکتی ہے البتہ بعض دفعات میں ترمیم کے لیے ۵ فی صد ریاستوں کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہے۔ پچھلے پچیس سال میں ہمارے دستور میں متعدد ترمیمات ہو چکی ہیں اور بعض تو بڑی اہمیت کی حامل ترمیمات ہیں۔

(۶) ہندستان میں جہاں امریکہ کی طرح صدارتی جمہوریت قائم ہے وہیں انگلستان کی طرح پارلیمانی طرز حکومت بھی رائج ہے۔ ہندستان کے صدر جمہوریہ امریکہ کے صدر کی طرح مقتدر نہیں بلکہ انگلستان کے صدر مملکت (بادشاہ یا ملکہ) کی طرح برائے نام اور اعزازی ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ برطانیہ کا صدر مملکت موروثی ہوتا ہے جب کہ ہندستان کے صدر ہر پانچ سال کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔

(۷) امریکہ کی طرح ہندستان بھی ایک وفاقی مملکت ہے لیکن یہاں وہاں کی طرح شہریت کا دوہرا طریقہ قائم نہیں ہے۔ امریکہ میں ایک شہری کو ایک وقت میں دو شہریوں کے حقوق حاصل رہتے ہیں، یعنی ایک تو وہ اپنی ریاست کا شہری ہوتا ہے اور دوسرے مرکزی حکومت کا۔ مگر اس کے برخلاف ہندستان میں مرکز اور ریاست ہر دو کے لیے ایک ہی حق شہریت ہے جو یقیناً ایک عمدہ اور سہل چیز ہے۔

(۸) ہندستان ایک وفاقی مملکت ہے اور ایک وفاقی ملک میں انتظام مرکز اور ریاست دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندستان کی بیشتر ریاستیں ایسی ہیں جن کی ایک الگ زبان ہے اور باشندوں کا رہن سہن بھی جداگانہ ہے۔ ایسی صورت میں اتحاد اور یک جہتی کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ چنانچہ ہمارے دستور میں اس کا بھی خیال رکھا گیا ہے اور تین طرح سے اس کو مستحکم کیا گیا ہے۔ ایک تو نظام عدلیہ واحد ہی ہے اس کے علاوہ بنیادی حقوق بھی ایک ہی ہیں نیز مرکز اور ریاستوں کے لیے ایک ہی یعنی مشترکہ سول سروس رائج ہے۔

(۹) بنیادی حقوق ہندستان کے جدید دستور میں خاص اہمیت کے حامل ہیں جنھیں ہم شخصی آزادی اور جمہوریت کی معراج کہہ سکتے ہیں۔ بنیادی حقوق کے تحت ہندستان کے شہریوں کو چند حقوق دیے گئے ہیں جن کا روبہ عمل لانا ہر ریاستی اور مرکزی حکومت کا فرض ہے۔ اگر کہیں ان پر عمل نہیں ہو رہا ہے یا کسی شہری کو اس سے محروم کیا جا رہا ہے تو وہ اس کے خلاف کسی بھی مقامی عدالت میں مقدمہ دائر کر سکتا ہے۔ چند بنیادی حقوق حسب ذیل ہیں:

حق مساوات، حق آزادی، حق مذہب و عقیدہ، تعلیمی و تمدنی حق وغیرہ۔

(۱۰) بنیادی حقوق کی طرح ہندستان کے دستور میں شہریوں کے لیے ہدایتی اصول بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ اسپین اور آئرلینڈ کے دساتیر سے اخذ کیے گئے ہیں۔ لیکن ان میں اور بنیادی حقوق میں فرق یہ ہے کہ بنیادی حقوق کا اطلاق ہر حال میں لازمی ہے لیکن ہدایتی اصولوں کا اطلاق لازمی نہیں۔ ان کے روبہ عمل

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

مقاصدِ جمہوریت

ساحر بھوپالی

جشنِ جمہوریت تم مناؤ مگر
جو مقاصد ہیں ان پر بھی رکھو نظر

یہ ہمارے ہی ووٹوں کی محتاج ہے ۔ یعنی اپنے لیے اپنا ہی راج ہے
بول بالا ہے ہر سمت جمہور کا ۔ اب تو ہر اک کے سر پر رکھا تاج ہے

خود غرض مت بنو یہ بڑا پاپ ہے
اس پہ شیطانیت کی لگی چھاپ ہے

اب زبان و قلم پر بھی بندش نہیں ۔ اب دلوں میں یہاں جائے رنجش نہیں
ہیں برابر اب اس کی نگاہوں میں سب ۔ کیا یہ جمہوریت ہی کی بخشش نہیں

ایکتا ہی کا پرچار ہر دم کرو
تاکہ جمہوریت اور مضبوط ہو

جتنے ہندو مسلماں سکھ عیسائی ہیں ۔ سب ہیں اک قوم آپس میں سب بھائی ہیں
مذہبوں میں نہیں بیر رکھنا روا ۔ سارے جمہوریت ہی کے شیدائی ہیں

سب کو سینے سے اپنے لگاتے چلو
اور قدم اپنا آگے بڑھاتے چلو

سب کی آواز مل کر اک آواز ہو ۔ سب کے دل کا یہی ایک بس راز ہو
ہر طرف ہند میں ہو وہ امن و اماں ۔ جس پہ جمہوریت کو سدا ناز ہو

امن ہی سے ترقی بھی وابستہ ہے
امن ہی سے خوش حالی بھی وابستہ ہے

وہ کرو جس سے صنعت ترقی کرے ۔ وہ کرو جس سے حرفت ترقی کرے
خود کفیل اس کو اب تم بنا کر رہو ۔ تاکہ بھارت کی عظمت ترقی کرے

پھر گھٹا یہ مصیبت کی چھٹ جائے گی
ملک سے یہ غریبی بھی مٹ جائے گی

تم سے طالب ہے جمہوریت کام کی ۔ دیکھو بیکار جائے نہ کوئی گھڑی
جی چرانا مشقت سے اچھا نہیں ۔ کام کر جاؤ ایسا کہ ہو نام بھی

مل کے سب بامِ رفعت پہ ڈالو کمند
تاکہ دنیا میں بھارت رہے سربلند



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۵ دسمبر ۱۹۷۴ء کو وکٹوریہ پارک لکھنؤ میں
ایک عظیم الشان جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے

گورنر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی اور وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا ۲ دسمبر ۱۹۷۴ء کو اموسی ہوائی اڈے پر
جمہوریہ صومالیہ کے صدر جنرل محمد سیاد بری کا استقبال کر رہے ہیں





نائب صدر جمہوریہ شری بی ڈی جتی کانپور میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو منعقدہ آریہ سماج کی صد سالہ تقریبات کے افتتاح کے موقع پر جلسۂ عام کو خطاب کر رہے ہیں



گورنر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی
۷ دسمبر ۱۹۷۴ء کو پولیس لائن لکھنؤ
میں
پولیس کی سالانہ پریڈ کی سلامی
لے رہے ہیں



گورنر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی
۳ نومبر ۱۹۷۴ء کو لال بارہ دری
میں
"بچوں کا ادب نمائش"
دیکھ رہے ہیں



گورنر ڈاکٹر ایم جیا ربڈی
یوم یرحیم کے موقع ر
یرحیم فنڈ
میں
عطیہ دیے ہوئے



وریراعلی تری ہیم ولی سدں ہوگساہ ۵ ر دسمبر ۱۹۷۶ء
کو اتر پردیش امداد باہمی کتائی مل اتاوه
کی عمارت کی توسیع کا
نگ میاد
رکھتے ہوئے

وریراعلی تری ہیم دلی ں ہوگسانے ۶ دسمبر ۱۹۷۶ء کو نومی نکتے اسکیم کے تحت ۷۷-۱۹۷۶ء کے
دوراں اعلیٰ کارکردگی کے سلسلے میں کارکنوں اور افسروں کو انعامات تقسیم کیے تصویر میں لکھنؤ
ڈویژن کے کمشنر تری پرتھوی ناتھ چتر ویدی کو انعام دیتے ہوئے ۔







بیگم اختر

اے محبت ترے انجام پہ رونا آیا



آخری قیام گاہ
کو
روانگی سے قبل میت کی گل پوشی
پھول مالائیں رکھی جارہی ہیں

آخری سفر
نماز جنازہ





کوثر چاندپوری   (افسانہ)

زندگی نام ہے .....

اس کی زندگی نہ جانے کتنے مرحلوں سے گزر چکی ہے کسی زمانہ میں وہ پرانی بوتلیں اور ٹین کے ڈبے بیچا کرتا تھا پھر زنگ آلود بولٹ نٹ اور کیلیں فروخت کرنے لگا اور آج کل ایک سادھو کے پاس دم سادھنے کی مشق کر رہا ہے صبح کو سانس روک کر گرد کی کٹیا میں بیٹھا رہتا ہے۔ شام کو کارپوریشن کی عمارت کے سامنے چادر بچھائے بھیک مانگتا رہتا ہے۔ کسی سے کچھ کہتا نہیں صرف دھیمی آواز میں اشلوک پڑھتا ہے سڑک سے آنے جانے والے گزرتے رہتے ہیں۔ بعض اُسے مکار سمجھ کر رنگے سیار کے نام سے پکارتے ہیں اور نفرت و حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے نکل جاتے ہیں۔ انھیں اس سماج میں جس میں جگہ جگہ سوشلزم کی گھنٹیاں بجتی سنائی دیتی ہیں گداگری کا پیشہ بالکل اچھا نہیں لگتا، سوشلزم اور بھک مری ان کے شعور میں کڑواہٹ سی بھر جاتی ہے اور وہ کچھ تھنکار کر تھوک دیتے ہیں جیسے ساری تلخی اگل دی ہو۔ کچھ ایسے نرم دل بھی آتے ہیں جو پانچ کا سکہ چادر پر پھینک کر ہمدردانہ انداز میں کہتے ہیں دیکھو سونا نہیں فٹ پاتھ پر سردی بہت ہے ٹھنڈی لہر آگئی ہے شملہ میں برف بہت گری ہے رین بسیرے میں چلے جانا وہاں اوڑھنے کو کمبل ملے گا۔" وہ کسی کی نہ سنتا، اشلوک گنگنائے جاتا، کنکھیوں سے پھینکے ہوئے سکے کو دیکھ کر جل بھن جاتا، سوچتا بس یہی ایک سکہ تھا جب میں سورج ڈوبتے ہی وہ پیسے اکٹھا کرتا۔ مشکل سے روپئے سوا روپئے کی ریزگاری ہاتھ آتی، نوٹ ایک بھی نہ ہوتا۔ اتنے پیسوں میں دو آدمی پیٹ نہیں بھر سکتے تھے وہ اور اس کا بیٹا نرائن ساتھ ہی رہتے تھے، نرائن بڑا پیٹو تھا۔ ایک وقت میں کئی کئی روٹیاں کھا جاتا پھر دن بھر بیڑیاں پھونکتا۔ دو دو گھنٹے بعد چائے پیتا۔ کارپوریشن کی بلڈنگ کے دن میں کئی چکر لگاتا، جتنے پیسے چادر پر بکھرے ہوتے اٹھا کر مٹھی میں بھینچ لیتا اور دیوار سے ٹیک کر گالیاں بکنے لگتا۔

"دان کا رواج ہی اٹھتا جا رہا ہے دنیا سے۔ لوگ تحور بان بھرنے میں لگے ہوئے ہیں سبھا جاتے ہیں۔ اسّی روپے کا ٹکٹ لے کر کرکٹ کا میچ دیکھتے ہیں۔ بھگوان کو کون یاد کرتا ہے سالا۔"

وہ بات دھیرے کرتا گالی بہت اونچی آواز سے دیتا۔

جتنی بڑی ہوئی گالی ہوتی آواز اتنی ہی اونچی ہو جاتی!

اچانک نرائن اقتصادیات اور معاشیات کے موضوع پر بولنے لگتا ______

ہر چیز مہنگی ہوتی جاتی ہے۔

بیڑی کے دام کتنے اونچے ہو گئے۔ بنڈل اٹھارہ پیسے میں مل رہا ہے۔

چائے کا کپ چالیس پیسے کا ہو گیا۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے

وہ ایک دم بپھر جاتا ہے، چیخ کر بڑی بڑی گالیاں دینے لگتا ہے مخاطب ایک نہیں ساری دنیا ہوتی ہے، پنواڑی، ہوٹل کے منیجر، اناج کے بیوپاری اور کارپوریشن کے ممبر جن کو الیکشن میں اس نے ووٹ دیا تھا۔

ذرا دیر بعد سڑک کے ایک گندے ہوٹل میں جا کر وہ چائے پیتا ہے۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ ٹوٹی ہوئی چرخ چوں بولتی کرسی پر بیٹھا رہتا ہے میز پر مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں لوائے پھٹے پرانے کپڑے پہنے بالٹی میں

چھوٹی پیالیوں کو غوطے دیتا رہتا ہے۔ نرائن حسب معمول ہوٹل میں بیٹھا
بیڑی پی رہا تھا، قریب ہی ڈھول بجنے کی آواز آئی اور لمحہ بہ لمحہ قریب آتی
گئی سڑک پر عجیب تماشا ہو رہا تھا بالکل نیا اور انوکھا۔ ایک نوجوان دھوتی
باندھے کھڑا تھا۔ سارا بدن ننگا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوڑا تھا۔ وہ ننگی
پیٹھ پر لگاتار کوڑے مارتا اور ڈھول زور زور سے بجتا رہتا۔ نوجوان
کے آگے فٹ پاتھ پر پیسے برسنے لگتے، دس اور بیس کے چمک دار سکوں
کی موسلادھار بارش ہونے لگتی۔ آنے جانے والے کھڑے ہوتے گئے۔
سڑک پر زبردست ہجوم ہو گیا سب کی جیبیں خالی ہونے لگیں، ڈھول بجانے
والے نے سکے اٹھا لیے اور آگے بڑھ گیا۔ آٹھ دس دکانیں چھوڑ کر اسی
نے پھر ڈھول بجانا شروع کر دیا۔ اس کا ساتھی مست ہو کر پیٹھ پر اسی طرح
کوڑے برسانے لگا اور سکوں کے ستارے ٹوٹ کر زمین چومنے لگے نرائن
کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اسے یہ دھندا بہت اچھا معلوم ہوا رات کو اس
نے باپ سے سارا قصہ کہا اور ایک کوڑا لانے کی فرمائش کرتے ہوئے بولا:

بابو تم ڈھول بجانا نہیں جانتے، جتنے دنوں دم سادھے رہے، اگر
ڈھول بجانا سیکھتے تو میں کل ہی سڑک پر کوڑے مارنے کا کرتب دکھا کر
اتنے پیسے کما لیتا کہ دونوں وقت خوب ڈٹ کر روٹی کھاتا۔

بھیک کوئی نہیں دیتا بسنسار میں کنجوسی بڑھتی جا رہی ہے۔

کوڑے مارنے کا دھندا بڑے مزے کا ہے۔

اس کا باپ گھاسی سنجیدہ ہو گیا۔ کچھ دیر سوچ کر بولا:

کوڑوں کی چوٹ نہ تم سہ سکتے ہو نہ میں، کوئی اور ہی ترکیب نکالوں
گا۔ گھبراؤ مت بیٹا۔

وہ سوچتا اور کھنکھاتا رہا۔ جھگی میں خالی پیپے پر رکھا دیا ٹمٹما
کر بجھ گیا۔ گھاسی نے بیٹے کو آواز دے کر پوچھا

سو گیا نرائن

جاگ رہا ہوں بابو

دھیرج رکھ بیٹا، دھن بہت مل جائے گا۔ خوب کھانا سندھی
ہوٹل میں تنوری روٹیاں۔

وہ کیوں کر؟

کل بتاؤں گا۔ دوکانیں کھلتے ہی لٹھے کی تین میٹر لمبی چادر
لے آنا۔

کیا کرو گے بابو؟

پوچھنے کی ضرورت نہیں، سب کچھ معلوم ہو جائے گا تجھے۔

اگلے روز شام کے دھندلکے میں نرائن چپ چاپ اداس
اداس پارک کے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ دو گز کے فاصلہ پر ایک لاش لٹھے
کی سفید چادر سے ڈھکی رکھی تھی، پارک میں ٹہلتے ہوئے لوگ چلتی پھرتی نگاہوں
سے دیکھتے اور چادر پر ایک روپیہ کا نوٹ یا کوئی اٹھنی پھینک کر منہ ہی منہ
میں کچھ بڑبڑاتے آگے بڑھ جاتے۔ پیچھے سے کوئی اور آ جاتا۔ وہ بھی اگلے کی
تقلید کرتا۔

کچھ دیر بعد یہ ایک بوڑھی عورت نئی نویلی دلہن کو ساتھ لیے مندر
سے نکلی دور سے لاش پر نگاہ پڑی۔ اس نے سہم کر جلدی سے بہو کا ہاتھ پکڑ
اپنے پیچھے کر لیا اور تیزی سے ہونٹ ہلانے لگی، شاید رام رام ست کا
جاپ کر رہی تھی، دس بیس قدم چل کر اس نے بہو کو خوب لمبا گھونگھٹ
کاڑھنے کی ہدایت کی تاکہ لاش پر نظر نہ پڑ سکے اور ہاتھ بڑھا کر پانچ روپے
کا نوٹ چادر پر ڈال دیا اور تیزی سے سڑک کی طرف چلی گئی۔

نرائن کا جی چاہا دوڑ کر نوٹ اٹھا لے مگر کچھ سوچ کر رک گیا،
دیر تک جھکا لاش کی چھاتی دیکھتا رہا، سورج ڈوب چکا تھا پارک کے
لیمپ روشن ہو گئے۔ ٹہلنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا سب کے دلوں
میں گداز پیدا ہو گیا تھا۔ وہ نوٹ پھینک کر اپنا جی ہلکا کر رہے تھے۔ چادر
بھرتی جا رہی تھی، روپئے دو روپئے اور پانچ روپئے کے نوٹ ہوا کے
ہلکے ہلکے جھونکوں سے پیپل کے پتوں کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ لوگ
لمبے لمبے ڈگ بھرتے پارک سے نکل جاتے، گیٹ پر پل بھر کے لیے ٹھہرتے
بھیانک انداز سے پیچھے مڑ کر دیکھتے اور چلے جاتے۔ دھیرے دھیرے
آمد و رفت کم ہو گئی۔ دس بجے بالکل سناٹا ہو گیا۔ نرائن نے لاش
پر سے چادر اٹھائی، اچھی خاصی بوجھل تھی وہ بہت خوش ہوا، باپ کو
مندر کی طرف سے باہر نکل جانے کا اشارہ کیا۔ گھاسی دوسری چادر
اوڑھ کر احتیاط سے دیوار کی اوٹ میں دور تک چلا گیا۔ نرائن بھی باہر
سڑک آیا۔ دو تین فرلانگ چلنے کے بعد دونوں ساتھ ہو گئے۔ بات
کسی نے نہیں کی۔ جھگی میں پہنچ کر نرائن نے ماچس گھسی اور دیا جلا کر

نوٹوں اور سکّوں کی گنتی کی۔

کتنے ہیں ؟ گھاسی نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

نرائن نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا، گن چکا تو باپ کے کان سے منہ لگا کر بولا۔

بابو پینتالیس۴۵ ہیں پینتیس۳۵ کے نوٹ اور دس کی ریزگاری

گھاسی مسکرایا ایسی مسکراہٹ عمر میں پہلی بار ہی ہونٹوں پر آئی تھی اس میں فخر، مسرت اور دولت مندی کی چمک، مٹھاس اور خوشبو تھی۔

مہینہ بھر میں تو ہم سارے بھنگی جھونپڑی والوں کا کریا کرم کر دیں گے، نرائن نے مذاق کے موڈ میں کہا۔

گھاسی ہنس کر بولا

دم سادھنے کا کرتب آج کام آیا ہے ہو گرو تیری

پھر وہ دھندا چل نکلا۔ دونوں شام کو آگے پیچھے چلتے کسی نئی کالونی میں چلے جاتے اور سورج چھپتے ہی گھاسی مر کر کسی کونے میں پڑ رہتا' نرائن اوپر چادر ڈال دیتا دان کی ورشا ہونے لگتی۔ ایک روز نرائن نے کہا :

کل میں مروں گا بابا

پاگل ہوا ہے۔ گھاسی جھنجھلا گیا۔ بھانڈا پھوٹ جائے گا سانس روک کر دھیرے دھیرے چھاتی پھلائے بغیر ہوا اندر کھینچنا بچوں کا کا کھیل نہیں، بڑی جان جوکھم کا کام ہے۔

★

دستور ہند کے چند خاص نکات —— (صفحہ ۲۳ کا بقیہ)

(صفحہ ۲۳ کا بقیہ)

نہ لانے پر کسی عدالت میں مقدمہ دائر نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کا مقصد حکومت کو ہدایت اور مشورہ دینا ہے۔ اب یہ حکومت کا اختیاری فعل ہے کہ وہ اس پر عمل کرے یا نہ کرے۔ چند ہدایتی اصول حسب ذیل ہیں :

(۱) حکومت کو چاہیے کہ ہر شہری کے لیے تعلیم لازمی قرار دے۔
(۲) حکومت کو چاہیے کہ ہر شہری کو روزگار فراہم کرے۔
(۳) حکومت کو چاہیے کہ شہریوں کے اخلاق و کردار کا خیال رکھے۔ وغیرہ۔

(۱۲) زبان کا مسئلہ ہندستان میں بڑی اہمیت کا حامل ہے مگر ہمارے دستور میں اسے بڑی عمدگی کے ساتھ حل کر دیا گیا ہے دستور ہند میں دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ہندی کو ہندستان کی سرکاری اور قومی زبان قرار دیا گیا ہے جب کہ ریاستوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی متعلقہ زبانوں میں نظم و نسق چلائیں۔

(۱۳) ہندستان کا قومی جھنڈا ترنگا اور قومی ترانہ رابندر ناتھ ٹیگور کا بنگالی گیت "جن گن من" قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بنکم چندر چیٹرجی کے بنگالی گیت بندے ماترم کو بھی قومی درجہ دیا گیا ہے۔ عام طور پر سرکاری تقریبات کے افتتاح کے طور پر بندے ماترم گایا جاتا ہے جب کہ اختتام پر جن گن من۔

ان ہی مندرجہ بالا (۱۲) خاص نکات پر ہندستان کا موجودہ قومی دستور مشتمل ہے۔

★

غزل

رشید کوثر فاروقی

گلوں سے آئے تری بوئے پیرہن جیسے
ترا خیال کھلائے چمن چمن جیسے

یہ کون کشمکشِ زندگی میں یاد آیا
پرائے دیس میں مل جائے ہم وطن جیسے

عجیب چیز ہیں حُسنِ ذہین کی آنکھیں
نیا خیال کوئی تشنۂ سخن جیسے

یہ کیف دورِ محبت کی ابتدا میں نہ تھا
تری نگہ سے ڈھلے بادۂ کہن جیسے

جہاں جہاں سے تمھارے قدم گزرتے ہیں
مہکتے جاتے ہیں نسرین و نسترن جیسے

نظر کا شوق سے اٹھنا، حیا سے جھک جانا
ادھوری بات کہے طفلِ نوسخن جیسے

کہاں سے نغمہ و نکہت چرا کے لائے ہو تم
چھلکتی آنکھ، چھلکتا ہوا بدن جیسے

مری نظر کی ادا آفرینیاں، توبہ
تمھارا حسن بھی ہو میرا حسنِ ظن جیسے

کشاکشِ المِ روزگار کس سے کہوں
لگا ہوا ہے تمناؤں کو گہن جیسے

ہر ایک سانس ہے زنجیرِ آہنیں گویا
ہر ایک موجِ ہوا حلقۂ رسن جیسے

قریب آتی ہے منزل مگر نہیں آتی
نظر سے مل کے پلٹ جاتی ہے کرن جیسے

قضا بھی ساتھ رہی، زندگی بھی ساتھ رہی
نفس نفس نے بُنا عمر بھر کفن جیسے

وداع بھی ہے یہی زندگی وصال بھی ہے
چلی ہو میکے سے سسرال کو دلھن جیسے

غالب

شاہد ماہلی

رفعتِ فکر و تخیل کا سراپا کہیے
معنی و ہیئت و اسلوب میں تنہا کہیے

ایک اک لفظ میں نیرنگیِ رموز و اسرار
حق تو یہ ہے کہ حقائق کا خزانہ کہیے

آسماں فکر کا، خورشید فن و حکمت کا
کوہ مضموں کا تو الفاظ کا دریا کہیے

تیری اک ایک غزل ایک سراپائے جمال
اک زمانے کو ترا عاشقِ شیدا کہیے

ہو سکے گا تیری قیمت کا تعین کیوں کر
بحرِ ہستی کا تجھے گوہرِ یکتا کہیے

بخشی وہ روح کہ جی اٹھی زبانِ اردو
شاعری اس کو نہ کہیے دمِ عیسیٰ کہیے

تیرے افکار کو کہیے جو متاعِ امروز
تیرے اشعار کو آئینۂ فردا کہیے

ہمسری کس سے ہو ممکن تری گویائی کی
کل کو جز کہیے کبھی قطرہ کو دجلہ کہیے

"خامہ انگشت بدنداں کہ تجھے کیا لکھیے؟
ناطقہ سر بہ گریباں کہ تجھے کیا کہیے؟"



ایس ایس شاستری

ڈاکٹر چنّا ریڈی — میری نظر میں

گورنر اترپردیش ڈاکٹر چنّا ریڈی جنگ آزادی کے آزمودہ کار مجاہد، ایک قابل ایڈمنسٹریٹر، نہ جھکنے والے جانباز، دبے کچلے عوام کے ترجمان اور ان سب خوبیوں کے علاوہ ایک دردمند انسان ہیں۔ اس ۵۵ سال کی عمر میں بھی وہ نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا ساڑھے تین دہائی کا سیاسی کردار بڑے اہم نتائج اور نصب العین کا حامل رہا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹری پاس کرنے کے فوراً ہی بعد وہ سیاسی دنیا میں داخل ہو گئے جبکہ وہ ابھی جوان ہی تھے۔ دوران تعلیم ہی وہ اپنی اعلیٰ تخلیق، پاکیزہ خیالات اور کٹر قوم پرور خیالات کے لیے مشہور ہو گئے تھے۔ ان کے ساتھی اور استاد، یکساں طور پر ان کا احترام کرتے تھے۔ میڈیکل کالج کے پرنسپل نے جوان کی خداداد قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے ان سے محبت کرتے تھے ایک مرتبہ اشارۃً کہا کہ وہ گاندھی ٹوپی پہننا چھوڑ دیں (نظام شاہی میں اس کا پہننا جرم تھا) ورنہ خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ ڈاکٹر ریڈی نے ایسی بیباکی سے انکار کیا کہ پرنسپل صاحب ان کے دلیرانہ جواب کی وجہ سے ان پر مزید کرم فرمانے لگے۔ ڈاکٹر ریڈی کا سیاسی دنیا میں داخلہ ایک اہم مسئلہ تھا کیونکہ اس زمانے میں آندھرا پردیش کے پرانے رہنما سیاست میں نئے خون کے داخلے سے خوش نہ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو ہر ایک موقع پر جدوجہد کرنا پڑی۔ وہ ابھی جوان ہی تھے کہ اسٹیٹ کانگریس کے جنرل سکریٹری چن لیے گئے اور ہر طبقہ کی طرف سے اپنی مستعدی، انتظامی مہارت اور جذبہ رہنمائی کی بنا پر داد تحسین حاصل کی۔

وہ سابق حیدرآباد اسٹیٹ کی آندھرا مہا سبھا (جو ایک سیاسی ادارہ تھا) کے روح رواں اس وقت بن گئے۔ جبکہ حیدرآباد اسٹیٹ میں کمیونسٹ لیڈر مسٹر روی نرائن ریڈی اور مسٹر بادم ایلا ریڈی کا طوطی بول رہا تھا۔ انھوں نے آندھرا مہا سبھا میں ایک ایسے محاذ کی تنظیم کی جس نے کمیونسٹوں کو جنرل الیکشن میں شکست فاش دی۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب نے کمیونسٹوں کو شکست دے کر کانگریس کی بالادستی ریاست میں قائم کر دی جب مشیرآباد میں پہلا کانگریس اجلاس منعقد ہوا تو ڈاکٹر ریڈی نے نظام شاہی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس طرح یہ تحریک ایک عوامی تحریک میں تبدیل ہو گئی۔

پولیس ایکشن کے بعد ڈاکٹر ریڈی ترقی کی منزلیں طے کرتے گئے اور پراونشل پارلیمنٹ میں ڈپٹی وہپ منتخب ہو گئے اور جب ڈاکٹر راما کرشنا راؤ نے ریاست میں اپنی عوامی کابینہ بنائی تب سب وزیروں میں ڈاکٹر ریڈی سب سے کمسن وزیر تھے۔ ان کو اس کابینہ میں محکمۂ غذا اور زراعت کا وزیر مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا کیونکہ اس وقت ریاست میں راشننگ تھی اور غذائی حالت سنگین ہو چلی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے پورے محکمے کی ازسرنو تنظیم کی۔ نااہل افسران کو نکال کر ہوشیار اور مستعد افسران کو مقرر کیا اور ان کے اچھے کاموں کے لیے ان کی تعریف

تحسین بھی کی۔ انھوں نے راشننگ بالکل ختم کر دی۔ انھوں نے راجیندر نگر میں آندھرا پردیش زراعتی یونیورسٹی قائم کر کے ایک نئے دور کا آغاز کیا اور اس مقصد کے لیے تقریباً ۵۰۰۰ ایکڑ زمین حیدرآباد کے قرب و جوار میں حاصل کی۔ اپنی ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر اس عظیم کام کو تھوڑے وقت میں انجام دے کر صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو اس یونیورسٹی کا افتتاح کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

ریاست میں غذا اور زراعت کے کام کو بحسن و خوبی انجام دینے کی وجہ سے اس وقت مرکزی وزیر غذا جناب رفیع احمد قدوائی مرحوم کی مخصوص توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی اور مرتے دم تک ڈاکٹر صاحب سے وہ خلوص و محبت کا اظہار کرتے رہے۔ غذائی کانفرنسوں میں رفیع صاحب کو ڈاکٹر صاحب کی حمایت حاصل رہا کرتی تھی اور میسور و بمبئی وغیرہ کو جو غلہ کی کمی کے علاقے تھے جوار اور موٹے اناجوں کی حیدرآباد سے مدد دی جاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے زراعتی یونیورسٹی راجیندر نگر میں "قدوائی کالج" قائم کر کے رفیع صاحب مرحوم کی ایک شاندار یادگار بھی قائم کر دی ہے۔ ڈاکٹر ریڈی کا دوسرا کارنامہ "کسانوں کا فورم" قائم کرنا تھا۔ جس کے ذریعہ نوجوان لڑکے جو زراعتی یونیورسٹی سے نکلتے تھے ان کے لئے نئے طریقے اور اصولوں سے کھیتی کرنے کے وسائل فراہم کرنا تھا۔ یہ فورم ڈاکٹر ریڈی اور شری پنجاب راؤ دیش مکھ کا رہین منت ہے۔ ہندستان کی طرف سے جب غذائی اور زراعتی وفد روم گیا تو ڈاکٹر ریڈی اس کے ڈپٹی لیڈر رہے۔

ڈاکٹر ریڈی نے پنجاب راؤ دیش مکھ کے ساتھ مل کر آل انڈیا بیک ورڈ کلاس فیڈریشن بھی قائم کیا۔

۱۹۵۶ء میں پردیش کی صدارت کے مسئلے پر ڈاکٹر ریڈی صاحب اور چیف منسٹر کرشنا راؤ جی سینئر کانگریس ہائی کمانڈ سے اختلاف ہو گیا تھا لیکن آخر کار ڈاکٹر ریڈی اپنے حسب منشا شری جے۔ وی نرسنگھ راؤ کو کانگریس کا صدر منتخب کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اس کے بعد نرسنگھ راؤ جی برہمانند ریڈی جی کی کابینہ میں ڈپٹی چیف منسٹر بھی ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر ریڈی کا بعد میں منصوبہ بندی، مالیات اور پنچایت راج منسٹری کا دور جناب برہمانند ریڈی کی کابینہ میں بہت روشن اور تابناک رہا ہے۔ لال فیتہ شاہی اور افسر شاہی کے دباؤ کو ختم کر کے ہر معاملے میں فوری فیصلہ کر کے ڈاکٹر ریڈی نے اپنے محکموں میں نئی روح اور رجحان پیدا کر دی تھی۔ انھوں نے اسمبلی میں پنچایت بل کو اپنی ذہانت سے پاس کرایا جس کے ذریعہ عوامی نمائندوں کو کافی اختیارات حاصل ہوئے۔ موصوف نے ہی محکمہ جاتی منصوبہ بندی کا سلسلہ شروع کیا جس کے ذریعہ ہم پورے پردیش کی منصوبہ بندی کا جائزہ تھوڑے وقت میں کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر ریڈی جب یونین فولاد منسٹر ہوئے تو وہاں بھی انھوں نے اپنی بھرپور صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ موصوف نے محکمہ میں نئے ضوابط رائج کئے۔ فولادی پروجیکٹوں میں مرکزی ناوابستگی کا رواج چلایا گیا۔ اس کے علاوہ موصوف کے زمانے میں لوہے اور کوئلے کا کنٹرول ختم کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں تلنگانہ کے عوام تلنگانہ پرجا سمیتی کے تحت اس ناانصافی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ جو اس علاقہ کے لوگوں کے ساتھ کی جا رہی تھی۔ اس تحریک نے نہ صرف پردیش اور مرکز کو اچنبھے میں ڈال دیا بلکہ اس کا انجام یہ ہوا کہ برہمانند ریڈی حکومت کو استعفا دینا پڑا۔ حکومت کا نظام پردیش میں ٹوٹ چکا تھا۔ تلنگانہ سمیتی کے تمام لیڈران کو مع ڈاکٹر ریڈی کے گرفتار کر کے راجا مندری جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔ گو کہ ڈاکٹر ریڈی اس وقت سرکار سے تلنگانہ کے عوام کی جانب سے انصاف کرنے کے لیے لڑ رہے تھے۔ پھر بھی موصوف نے شریمتی اندرا گاندھی کی اس وقت پوری مدد کی جب کانگریس میں زبردست پھوٹ پڑ گئی تھی ـــ اور پچاس سے زیادہ تلنگانہ سمیتی کے اسمبلی ممبروں نے شری وی وی گری کو اپنا ووٹ دیا جس کی وجہ سے ان کے دشمن ششدر رہ گئے۔ ۱۹۷۱ء میں جب پارلیمنٹ کا الکشن ہوا تو ڈاکٹر ریڈی نے تلنگانہ پرجا سمیتی کی جانب سے چودہ میں ۱۱ سیٹیں جیت لیں اور یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ پورے ہندستان میں کانگریس کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ دراصل ڈاکٹر ریڈی کی ذہانت، قابلیت ہر دلعزیزی اور شاندار رہنمائی کا بیّن ثبوت ہے۔

اس شاندار جیت کے بعد ڈاکٹر ریڈی نے اپنی تلنگانہ پرجا سمیتی ختم کر دی۔ اور اپنے ساتھیوں کو لے کر دوبارہ کانگریس میں شامل ہو گئے۔ شریمتی اندرا گاندھی نے اس قدم پر لبیک کہا اور جب ریاست میں جنرل الیکشن ہوا تب کانگریس نے اپنے منشور میں یہ بات شامل کر لی کہ تلنگانہ

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

شبابِ للت

تجدیدِ عزم

دیکھا مری آنکھوں نے انجام غلامی کا
کٹ کٹ کے گرا کیسے ہر دام غلامی کا

پُر ہول اندھیروں کے لشکر کی کمر ٹوٹی
جمہور کے سورج کی جاں بخش کرن پھوٹی

ماحول غلامی کا افسون و اثر بدلا
صدیوں میں کہیں اپنا اندازِ نظر بدلا

مے خانے کو ساقی نے دستور نیا بخشا
آئین نیا بخشا، منشور نیا بخشا

تفریق و تعصب کی ہر ریت مٹا دی ہے
آئین کی نظروں میں ہر فرد مساوی ہے

اس ملک میں کوئی بھی مذہب نہیں سرکاری
بنیادِ حکومت ہے انصاف و رواداری

ہاتھ آیا ہے محنت سے اب ہم کو مقام اپنا
پائندہ و محکم ہے جمہوری نظام اپنا

باوصف مصائب ہم کرتے رہے کام اپنا
بے وجہ نہیں لوگو اب وقت غلام اپنا

ایثار سے جیتی ہے حالات کی ہر بازی
ہم مردِ مجاہد ہیں، ہم وقت کے ہیں غازی

اغیار کے حملوں کا سیماؤں پہ منہ موڑا
دشمن کے تکبّر کا پل بھر میں بھرم توڑا

کی پیش روی ہم نے سائنس میں صنعت میں
کھیتی میں تجارت میں کسبِ زر و دولت میں

فیضان سے بجلی کے گھر گھر کو ضیا بخشی
تعلیم و ثقافت سے ذہنوں کو جلا بخشی

سرکاری شفاخانے کتنے ہی کیے جاری
کی صحتِ عامہ کی یوں ہم نے نگہداری

چاکِ غمِ عسرت کو محنت سے سیا ہم نے
معیارِ حیات اپنا خود اونچا کیا ہم نے

خودداری سے جینے کا حق سب کو دیا ہم نے
جمہور کی قدروں کو بالیدہ کیا ہم نے

ہنگامے اٹھانے سے کچھ بات نہیں بنتی
باتیں ہی بنانے سے کچھ بات نہیں بنتی

گرتے ہیں سدا کاہل معراج کے زینے سے
بنتی ہیں قوی قومیں، خون اور پسینے سے

وقت اہلِ عمل اپنا باتوں میں نہیں کھوتے
سوتی ہے خدائی جب یہ لوگ نہیں سوتے

سچی ہے لگن جن کی جو کام کے رسیا ہیں
وہ لوگ ہی ملت کے ہر دکھ کا مداوا ہیں

جمہور کی قدروں پر پختہ ہے یقیں اپنا
بھارت کی پرستش ہی ہے مذہب و دیں اپنا

اعجازِ مشقت ہم دنیا کو دکھا دیں گے
صحراؤں کو پل بھر میں گلزار بنا دیں گے

نعروں کو حقیقت کا ملبوس پنہا دیں گے
بھارت سے غریبی کا ہر نقش مٹا دیں گے

بھارت کی معیشت کو مضبوط بنانا ہے
دیوارِ وطن کو یوں اب سیسہ پلانا ہے

سچ کر کے دکھا دیں گے ہم ہند کا ہر سپنا
جو گردشِ دوراں نے کچھ ساتھ دیا اپنا

کرامت علی کرامت

جدید شاعری - ایک تجزیہ

"شاعری کیا ہے؟" کی طرح "جدید شاعری کیا ہے؟" بھی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے طرح طرح کے مفروضات کا سہارا لیا گیا ہے۔ لیکن یہ مفروضات اب بھی جدید شاعری کے لامتناہی ابعاد (INFINITE DIMENSIONS) کا احاطہ کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ لہٰذا "جدید شاعری" کی ترکیب کثرتِ توضیح کے باوجود ہنوز تشنۂ تعبیر ہے۔ اس کے دو سبب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ لفظ "جدید" کرم خوردہ لغت کا فرسودہ یا نیم مردہ لفظ نہیں بلکہ اس کی نبض میں ہمیشہ تازگی، توانائی اور زندگی کے آثار رواں دواں ہیں۔ ظاہر ہے کہ "زندگی" کے تصور کی طرح لفظ "جدید" کا تصور بھی ارتقاء پذیر اور تغیر پسند ہے اور اسے کسی جامد "ریاضیاتی تعریف" کے حصار میں مقید یا نظربند نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ لفظ "شاعری" بذاتِ خود اضافی حیثیت کا حامل ہے اور اس کی بابت شاعر اور قاری دونوں کے ردِعمل میں اس قدر تغیرات (FLUCTUATIONS) پائے جاتے ہیں کہ کسی ایک قدرِ مطلق کو ادبی معیار کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

جس طرح "شاعری" اضافی حیثیت کی حامل ہونے کے باوجود "اچھی شاعری" کی اثر آفرینی زمان و مکاں کی حد بندیوں سے آزاد ہوتی ہے، اسی طرح "جدید شاعری" کی اثر آفرینی بھی زمان و مکان کی حدوں کو توڑ سکتی ہے بشرطیکہ یہ "اچھی جدید شاعری" ہو یعنی اس میں "اچھی شاعری" اور "جدید شاعری" دونوں کے اوصاف بدرجہ اتم موجود ہوں۔ چونکہ ادب بذاتِ خود قانونِ ارتقاء کا پابند ہے، اس لیے "فردا کی جدید شاعری" کی شکل یقیناً وہ نہیں ہوگی جو "امروز کی جدید شاعری" کی ہے، لیکن وہ جدید شعراء جو موجودہ حیات کی بوقلمونی پر گہری نظر رکھتے ہیں اور زندگی کو ایک ناقابلِ تقسیم کلیت (TOTALITY) کی شکل میں دیکھنا پسند کرتے ہیں، ان کے کلام کی اہمیت امتدادِ زمانہ کے باوجود برقرار رہے گی۔ میر اور غالب کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ یہ شعراء اپنے اپنے دور کے تجرباتی شاعر تھے لیکن ان کے کلام میں اب بھی ایک طرح کی تازگی محسوس کی جاتی ہے اور ان کی شاعری کے بعض نمونوں میں ہم اب بھی اپنی صدی کی دھڑکنیں محسوس کرتے ہیں۔ ایسا بھی ہے کہ ہم ان کے بعض ایسے اشعار پر سر دھنتے ہیں جن میں ان شعراء کے ہم عصر قارئین کے لیے کوئی دلکشی نہیں تھی۔ اسی طرح آج میر اور غالب کے جو اشعار ہمیں متاثر کرتے ہیں، ممکن ہے آنے والی نسل کو ان سے مختلف اشعار متاثر کریں یا یہ بھی ممکن ہے کہ زمانۂ قدیم کے قارئین کو جو اشعار پسند تھے، انھیں کو مستقبل میں پھر سے قبولِ عام کا درجہ نصیب ہو۔ لیکن مختلف ادوار میں ان عظیم شاعروں کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ ان لوگوں نے زندگی کو مختلف زاویوں سے محض دیکھا ہی نہیں بلکہ اسے اپنی زبان سے چکھا ہے، اس کے سرد و گرم کو اپنے اوپر آزمایا ہے، نیز اسے مختلف خانوں میں نہ بانٹ کر ایک اکائی، ایک وحدت کی شکل میں پیش کیا ہے۔ دراصل انسان کی جبلت میں کچھ ایسی داخلی مناسبت و مطابقت کارفرما ضرور ہے

جو مختلف ادوار کی تجرباتی شاعری میں نئے نئے اسالیب اور نئی نئی اصنافِ سخن کا روپ دھار کر خود کو ظاہر کرتی رہتی ہے۔ اگرچہ بادی النظر میں "جدیدیت" روایت سے انحراف نظر آتی ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو "جدیدیت" کا تسلسل "روایت" کے کسی نہ کسی پہلو سے ضرور جا ملتا ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے "جدیدیت" کو "بغاوت" کا درجہ دے دیں تو کم از کم اتنا تو ضرور ماننا پڑے گا کہ "بغاوت" کی بھی ایک روایت ہوتی ہے چاہے یہ بغاوت تہذیب و ثقافت کی دنیا میں رونما ہو یا رقص، موسیقی، مصوری اور شعر و ادب کی دنیا میں۔ مجھے تو غالب اور اقبال کی شاعری میں بھی اسی بغاوت کی توسیع نظر آتی ہے جو ان سے قبل، امیر خسرو کے ہندستانی سنگیت، دورِ مغلیہ کی مصوری اور شاہ ولی اللہ کی مذہبی تجدید و اصلاح میں رونما ہوئی تھی۔ اس موقع پر، اقبال کا یہ شعر یاد آرہا ہے:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

اس شعر کی حمایت میں ذیل کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں:

(۱) آزاد شاعری اور منثور شاعری کو (جس کا تجربہ انگریزی زبان میں والٹ وھٹ مین نے اور جرمنی زبان میں اپولینئر نے شروع کیا تھا) جدید شاعری سے مختص کیا جاتا ہے، لیکن اس کی مثالیں کسی نہ کسی شکل میں زمانۂ قدیم کے اعلیٰ ادب میں بھی مل جاتی ہیں۔ دورِ حاضر کی طرح، عہدِ ماضی کی کلاسیکل لٹریچر میں بھی شاعری کے لیے صوتی آہنگ کے پہلو بہ پہلو معنوی آہنگ (یا ایلیٹ کے الفاظ میں "خیالات کی موسیقی") کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ بقولِ حالی، قدیم عرب میں "جو شخص معمولی آدمیوں سے بڑھ کر کوئی موثر اور دل کش تقریر کرتا تھا، اسی کو شاعر جانتے تھے۔ محقق طوسی اساس الاقتباس میں لکھتے ہیں کہ عبری اور سریانی اور قدیم فارسی شعر کے لیے وزن حقیقی ضرر رساں تھا۔"

(مقدمہ شعر و شاعری)

سنسکرت میں شاستر (علوم و فنون) اور کاویہ (شاعری) ان دونوں کو دو الگ الگ اصناف قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ اس زمانے میں افسانے، انشائیے اور ناول جیسی نثری تحریروں کا وجود نہیں تھا، اس لیے سنسکرت کی تنقید میں "کاویہ" سے متعلق جو کچھ بحث کی گئی ہے وہ بنیادی طور پر فنِ شاعری سے متعلق ہے (اس وقت ڈراموں کا ذکر بھی "کاویہ" یا شاعری کے تحت ہوا کرتا تھا)۔ بہرحال، عہدِ حاضر میں لفظ "کاویہ" کو وسیع معنوں میں "ادب" کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن زمانۂ قدیم کے سنسکرت نقادوں نے اسے شاعری ہی کے لیے استعمال کیا تھا۔ سنسکرت میں کاویہ یا شاعری دو حصوں میں منقسم تھی (۱) پدیہ کاویہ (منظوم شاعری) (۲) گدیہ کاویہ (منثور شاعری)۔ جہاں کالی داس، بھاربی، ماگھ وغیرہ منظوم شاعری کے لیے مشہور تھے وہیں دنڈی، بان بھٹ وغیرہ نے منثور شاعری میں اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔ یہاں اس امر کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ سنسکرت کی منظوم شاعری میں بلینک ورس (نظمِ معرا) کا استعمال عام ہے اور قافیے کی پابندی بہت کم نظر آتی ہے (اس قول کی تصدیق کرنی ہو تو آپ بھگوت گیتا ہی اٹھا کر دیکھ لیجیے) اردو اور فارسی کی عام رباعی کی طرح سنسکرت کے وشم ورت (विषम वृत्त) کے چاروں مصرعے الگ الگ بحروں میں ہوتے ہیں۔ چمپو اور ناٹک میں نظم و نثر کا حسین و جمیل امتزاج ہوتا ہے۔ غرض کہ جدید شاعروں کے نزدیک نظمِ معرا، آزاد نظم اور منثور شاعری کا مزاج اور ان کے برتنے کا طریقہ نیا ہے، لیکن اس کا تصور بالکل نیا نہیں ہے۔

(۲) علامت پسندی (SYMBOLISM)، پیکریت (IMAGISM)، مکعبیت (CUBISM) وغیرہ کو جدید آرٹ اور شاعری سے منسوب اور مختص کیا جاتا ہے۔ لیکن ان سب کا سراغ ہمیں کسی نہ کسی شکل میں مذہبی عقائد و تصورات میں مل جاتا ہے۔ ینگ نے ثابت کیا ہے کہ مختلف مذاہب میں جتنی دیومالائی اور اساطیری داستانیں ہیں، وہ علامتی حیثیت رکھتی ہیں اور ان داستانوں میں جو مہملات (ABSURDITIES) ہیں، ان میں نسلی یادداشت اور اجتماعی لاشعور کی سطح پر ایک طرح کا ربط و تسلسل برقرار رہتا ہے۔ اسی طرح

ہندو مذہب میں بُت پرستی کا جو فلسفہ ہے (یعنی غیر مرئی ہستی پر توجہ مرکوز کرنے کے لیے مرئی پیکر کی ضرورت پر زور دینا)، اس کا تعلق "پیکریت" سے ہے۔ "مکعبیت" کی قدیم ترین مثال پوری کے جگن ناتھ جی کے چوبی پیکر میں مل جاتی ہے۔ عیسائیت اور اسلام میں جنت و دوزخ کا تصور نیکی اور بدی کے فرحت بخش اور تکلیف دہ پہلوؤں کی "علامت" نہیں تو اور کیا ہے؟

(۳) جدید آرٹ اور شاعری کے سلسلے میں ڈارون کے نظریۂ "تنازع للبقاء" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس نظریہ کے تحت انسان کو توارث (HEREDITY) اور ماحول (ENVIRONMENT) کی پیداوار تصور کیا جاتا ہے اور "انسان" کا تسلسل جانوروں کی ارتقائی کڑی سے ڈھونڈ نکالا جاتا ہے۔ ہندو مذہب میں جو گوتر (गोत्र) کا سلسلہ ہے (یعنی مختلف لوگوں کا آبائی سلسلہ مختلف جانوروں سے قرار دیا جاتا ہے)، اس کی مشابہت بڑی حد تک نظریۂ ڈارون سے پائی جاتی ہے۔ بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ خود ڈارون سے تقریباً دو سو سال قبل یعنی سترھویں صدی عیسوی میں مرزا عبدالقادر بیدل فرما گئے ہیں:

ہیچ شکلے بے ہیولیٰ قابلِ صورت نہ شد
آدمی ہم پیش ازاں کادم بود بوزینہ بود

(۴) جدید آرٹ اور شعر و ادب کی تشکیل میں نظریۂ فرائڈ کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس میں "جنس" کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اسے تحت الشعور اور لاشعور کی ایک متحرک قوت قرار دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے قدیم سنسکرت ادب اور کونارک اور کھجوراہو کے سنگی مجسموں میں جنس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ نظریۂ فرائڈ کے زیرِ اثر بعض جدید شاعروں کے یہاں جنسی آزادی و بے راہ روی کی عکاسی نظر آتی ہے۔ لیکن زمانۂ قدیم کے کلاسیکی لٹریچر میں بھی ہمیں اس کی مثالیں بکثرت مل جاتی ہیں۔

تو کیا "جدید" اور "قدیم" میں واقعی کوئی فرق نہیں؟ ادب کی بابت گفتگو کرتے ہوئے کیا ہم اقبال کے مذکورہ قول کو من و عن قبول کر سکتے ہیں؟ جی نہیں۔ اقبال کے نزدیک زمان و مکان کا جو تصور ہے، اس میں "حال" ہی ایک زندہ اور متحرک حقیقت ہے اور ماضی یا مستقبل کو کوئی مقام حاصل نہیں۔ لیکن یہاں ہمیں اقبال کے اس نظریۂ زمان و مکان سے بحث نہیں بلکہ "ادب میں قضیۂ جدید و قدیم" کے امکانات پر بحث کرنا مقصود ہے۔ اقبال کے اس قول سے کہ "زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک" اسی حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ زمان و مکاں اور حیات و کائنات کا نظام ایک ہے (اور اس میں وقتاً فوقتاً جو معمولی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں وہ قابلِ لحاظ ہیں) لیکن اس نظامِ حیات و کائنات کو دیکھنے کا انداز اضافی حیثیت کا حامل ہے اور مختلف ادوار کے شعراء یا ایک ہی دور کے مختلف شعراء کے یہاں زاویۂ نظر میں انحراف پیدا ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات اس انحراف کے باوجود مختلف زاویۂ نظر میں کسی حد تک یکسانیت بھی پائی جاتی ہے۔ غرض کہ زاویۂ نظر میں اسی انحراف کی بنا پر "قضیۂ جدید و قدیم" کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

بعض ادوار ایسے ہوتے ہیں جو اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ انفرادی خصوصیت لاتے ہیں کسی مخصوص دور سے وابستہ یہ خصوصیت دراصل اُس دور کے فنکاروں کے طبعی میلانات کا مشترک عادِ اعظم (H.C.F) ہوتی ہے۔ سٹ تھیوری کی زبان میں، اسے ان میلانات کا تقاطع (INTERSECTION) کہا جا سکتا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ کسی دور میں اس تقاطع کا وجود بھی ہو مثلاً شیکسپیر کے عہد میں اس طرح کے کسی تقاطع کا وجود نہیں تھا۔ لیکن دورِ وکٹوریہ کے انگریزی شعراء میں کچھ نہ کچھ مشترک میلان (بالفاظ دیگر تقاطع کا وجود) ہونے کی وجہ سے انھیں گروپ بنا کر "رومانی شعراء" کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ اسی طرح اردو کی قدیم شاعری میں دلّی اور لکھنؤ ان دونوں مقامات سے وابستہ دو الگ الگ شعری رجحانات کا ذکر آتا ہے۔ اقبال کے ہم عصر شعراء میں کوئی ایسا "مشترک میلان" یا "تقاطع" نہیں تھا۔ اس کے بعد "میلانات کا تقاطع" ترقی پسندوں کے دور میں بھی وجود میں آیا اور جدیدیوں کے دور میں بھی۔ ظاہر ہے کہ جدیدیوں

کا مخصوص ذہنی رجحان اپنے پیش رووں کے طبعی میلان سے مختلف ہے۔ ایسے میں "قضیۂ جدید و قدیم" کو محض "دلیلِ کم نظری" کہہ کے کس طرح ٹالا جا سکتا ہے؟ البتہ اعلیٰ ادب میں "جدید" اور "قدیم" کا فرق ان معنی میں مٹ جاتا ہے کہ ہر دور کا قاری اس میں اپنی وارداتِ قلبی سن پاتا ہے۔ یہ بات کسی دور کے محض اعلیٰ ادب میں ممکن ہے، اس دور کے عام شعری رجحان میں نہیں

میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ "جدید شاعری" کی کوئی ریاضیاتی تعریف پیش کرنا ممکن نہیں۔ لہٰذا "جدید شاعری کی تعریف کیا ہے؟" کے بجائے "جدید شاعری کی پہچان کیا ہے؟" اسی نہج پر گفتگو ہونی چاہیے۔ جدیدیت کی پہچان کے سلسلے میں اب تک جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ کچھ اس طرح ہیں:

(۱) انیسویں صدی کے وسط میں انقلابِ فرانس کے بعد کی سیاسی، سماجی، اقتصادی، سائنسی اور علمی انقلابات کے زیرِ اثر "جدید شاعری" کا رجحان معرضِ وجود میں آیا اور بیسویں صدی پہلی جنگِ عظیم کے فوراً بعد سنِ بلوغ کو پہنچ گیا۔ دوسری جنگِ عظیم سے اس رجحان کو مزید تقویت ملی اور مغربی ادب کا یہ رجحان دنیا کی تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں میں پھیل گیا۔ جنگ کے دوران زندگی کی اعلیٰ قدریں درہم برہم ہو جاتی ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں نے موجودہ طرزِ حیات میں انتشار پیدا کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید شعراء کے دل میں صنعتی تہذیب کے خلاف بے یقینی اور بے تعلقی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ دورِ وکٹوریہ کے رومانی شعراء نے "انسان" کی شان میں تعریف و توصیف کی جو عمارت قائم کی تھی وہ جدید شاعر کی نظر میں مسمار ہو کر رہ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مایوسی، کرب، اضطراب، محزونی اور غیر محفوظیت کا احساس۔ یہ تمام صفتیں جدید شاعری کا طرۂ امتیاز بن گئیں۔

(۲) سائنسی علوم اور ٹکنالوجی کی عمومیت کے ساتھ ساتھ نظریۂ عملیت (PRAGMATISM) کو فروغ حاصل ہوا۔ ذاتی مفاد پرستی کی بنا پر جہاں ہر طرف خلوص، دوستی، رواداری کا قلعہ منہدم ہوتا ہوا نظر آیا، وہیں انسان کے رویہ میں بنیادی فرق یہ پیدا ہوا کہ وہ مروجہ اقدار کو سعادت مندی سے بے چون و چرا قبول کرنے کے بجائے ان کو قدم قدم پر چیلنج کرنے لگا۔ بات بات پر تشکیک کا شکار ہونے لگا حتیٰ کہ حیات بعد الموت اور خالقِ مطلق کی ہستی کے بارے میں بھی اپنی تشکیک کا اظہار کرنے لگا۔ ان تمام باتوں کی عکاسی جدید شاعری میں نظر آتی ہے۔

(۳) علم النفس میں فرائڈ کی تحت الشعور اور لاشعور کی دریافت جدید شاعری اور جدید آرٹ کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ فرائڈ نے اپنے اندر تحت الشعور اور لاشعور کی ایک وسیع دنیا کا سراغ لگایا جو نامعلوم صدیوں اور انجان تہذیبوں کا نچوڑ اپنے دامن میں رکھتی تھی۔ دورِ جدید کا انسان "شعور" کی کارفرمائی کے تحت جنگ، خوں ریزی اور طرح طرح کے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ لہٰذا جدید شاعری شعوری عمل کی شر انگیزی سے گھبرا کر تحت الشعور اور لاشعور کی دنیا کی طرف راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ذات کے خول میں محبوس ہو کے رہ جاتا ہے۔ کبھی وہ ذات کے کرب کا اظہار کرتا ہے تو کبھی خواب، مالی خولیا، واہمہ اور پاگل پن کے لاشعوری عوامل یا دیومالائی اساطیر سے وابستہ اجتماعی لاشعور اور نسلی یادداشت سے مواد فراہم کرتا ہے۔

(۴) آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت نے زمان و مکاں کا جو نیا تصور پیش کیا ہے، وہ فلسفۂ حیات و کائنات کے لیے بنیادی انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نئے فلسفہ سے متاثر ہو کر جدید شعراء کو احساس ہونے لگا کہ "وقت" کا شعور داخلی ہے اور یہ شعور خود ہمارے اپنے اندر جنم لیتا ہے۔ اس احساس سے مغلوب ہو کر، جدید شعراء نے ماضی، حال و مستقبل کے لامتناہی سلسلوں کے درمیان "حال" کا اضافی مقام متعین کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے انھیں اپنی ذات کے بحرِ بے کنار میں غوطہ زن ہو کر جس طرح "وقت" کی رفتار کا اندازہ لگانا پڑا اس کی عکاسی بھی جدید شاعری میں ملتی ہے۔

(۵) جدید شاعری کا ایک اور موضوع "جدید معاشرے کا تنہا انسان" ہے۔ جدید شاعر کو ہجوم میں تنہائی اور مادی فراوانی

میں روحانی تشنگی کا احساس ہے۔ لہٰذا جدید شاعری میں اس احساس کی پُر خلوص عکاسی نظر آتی ہے۔

(٦) جدید شاعری میں زبان کا استعمال زیادہ غیر رسمی، زیادہ داخلی، شخصی اور زیادہ عام فہم ہوتا ہے بالفاظ دیگر، روزمرہ کے وہ الفاظ جن سے ہمارا صدیوں کا رشتہ رہا ہے لیکن جسے ادب کے پرانے سجادہ نشین بارگاہ ادب میں کوئی جگہ نہیں دے رہے تھے، انھیں جدید شعرا نے درجۂ اعتبار بخشا۔

یہ سب کچھ درست لیکن . (اس کے ساتھ ایک "لیکن" بھی ہے)۔ لیکن کیا جدید شاعری کی پہچان صرف انھیں اصولوں پر ختم ہے؟ کیا ان اصولوں کی کسوٹی جدید شاعری کے لا متناہی ابعاد کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے کافی ہے؟ ان سوالوں کا جواب پانے کے لیے "جدید شاعری" کی وجہِ تسمیہ پر غور کرنا ہوگا۔ جو ایک بنیادی سوال ہے۔ (جدید تنقید میں "جدید شاعری" کی اصطلاح دراصل "عصری شاعری" اور "جدت پسند شاعری" ان دونوں اصطلاحوں سے الگ معنی میں مستعمل ہے۔)

اس نقطے پر کسی کو اختلاف نہیں کہ "جدید شاعری" وہ ہے جس میں جدید حسیت (MODERN SENSIBILITY) کا اظہار ہو۔ "جدید حسیت" سے کیا مراد ہے؟ "جدید حسیت" دراصل اس مخصوص قسم کی ذہنی اور نفسیاتی پیچیدگی کا نام ہے جس سے "جدید انسان" اس دورِ شکست و ریخت اور اس دورِ ابتلا سے دوچار ہوا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ "جدید انسان" کسے کہا جائے گا؟ اس دور میں جہاں ایک طرف ننگے آدمی واسی آباد ہیں، وہیں خلا، اور ہپّی بھی موجود ہیں۔ لہٰذا اس زمانے میں سانس لینے والے ہر انسان کو "جدید انسان" کی نمائندگی کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا۔ ینگ کا خیال ہے کہ صحیح معنوں میں "جدید انسان" خال خال ہی نظر آتا ہے۔ چنانچہ ینگ کہتا ہے :

"THE MODERN MAN OR LET US SAY AGAIN THE MAN OF THE IMMEDIATE PRESENT IS RARELY MET WITH THERE ARE FEW WHO LIVEUP TO THE NAME. FOR THEY MUST BE CONSCIOUS TO A SUPERLATIVE DEGREE, SINCE TO BE WHOLLY OF THE PRESENT MEANS TO BE FULLY CONSCIOUS OF ONE'S EXISTENCE AS A MAN. IT REQUIRES THE MOST INTENSIVE AND EXTENSIVE CONSCIOUSNESS WITH A MINIMUM OF UNCONSCIOUSNESS."

(SPIRITUAL PROBLEM OF MODERN MAN BY C. A. JUNG).

ینگ تو خیر "چند لوگوں" کی بات کرتا ہے، لیکن میں کہوں گا کہ "ایک آدمی" بھی اس معیار پر پورا نہیں اترا۔ کیونکہ "جدید انسان" بننے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کو اپنے وجود کا مکمل شعور ہو اور "اپنے وجود کا شعور" ایک ایسی اضافی شے ہے جو تکمیلیت کی حد کو کبھی نہیں پہنچ سکتی چاہے انسانی علوم کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائیں۔ (کیونکہ انسانی علوم بذاتِ خود اضافی حیثیت کے حامل ہیں) لہٰذا ینگ کا معیار ایک آئیڈیل معیار ہونے کے باوجود عملی طور پر سود مند ثابت نہیں ہو سکتا۔ میری رائے میں "جدید حسیت" اور "جدید انسان" ان دونوں ترکیبوں کو الگ الگ طور پر نہ دیکھ کر صفات اور ذات کو ملا کے ایک کر دینے کی ضرورت ہے۔ یعنی "جدید حسیت سے مملو جدید انسان" وہ ہے جو موجودہ صنعتی تہذیب کے زیر اثر نئی ذہنی پیچیدگیوں سے دوچار ہے۔ نئی ذہنی پیچیدگیاں وہ ہیں، جن سے ماضی کا انسان (یعنی صنعتی انقلاب سے قبل کا انسان) دوچار نہیں ہوا تھا۔ (ہم اس مضمون میں آئندہ، "جدید حسیت سے مملو جدید انسان" کو سہولت کے لیے صرف "جدید انسان" کے نام سے پکاریں گے۔) چونکہ شاعر کو بجا طور پر کائنات کا شعوری مرکز قرار دیا گیا ہے، اس لیے "جدید انسان" کی ذہنی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا عرفان فلسفی، ماہر انسانیات، ماہر عمرانیات، سائنس داں، سیاست داں وغیرہ کی بہ نسبت ایک باشعور شاعر ہی کو سب سے زیادہ ہوگا۔ لہٰذا میری نظر میں، جدید شاعری ایسی شاعری ہے جس میں جدید انسان اور صرف جدید انسان اپنی تمام ذہنی اور نفسیاتی پیچیدگیوں خوبیوں

اور خامیوں، امیدوں اور مایوسیوں، فراوانیوں اور محرومیوں کے ساتھ محور و مرکز بنتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جدید شاعری کا ایک حصہ وہ ہے جو محض عصری تقاضے پر پورا اترتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی مقبولیت اور ادبی اہمیت ختم ہو جائے گی لیکن صرف انھیں معنوں میں اس کی تاریخی اہمیت برقرار رہے گی جن معنوں میں میر سوز، میر اثر، رند وغیرہ کے کلام کی تاریخی اہمیت اب بھی برقرار ہے، اور دوسرا حصہ وہ ہے جو اپنے دامن میں عصریت کے پہلو بہ پہلو دائمی اقدار بھی رکھتا ہے۔ جدید شاعری کا یہ حصہ یقیناً زندہ رہے گا۔

جدید انسان کا منفی اور مثبت دونوں طرح کا کردار ہے۔ جہاں ایک طرف وہ خودکشی پر آمادہ ہے، وہیں دوسری طرف اس کے اندر زندہ رہنے اور طوفانِ حوادث سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ ہے جہاں ایک طرف ہپی بن کر نیم وحشی دور کی طرف مراجعت کرنا چاہتا ہے، وہیں دوسری طرف خلائی سفر انجام دے کر اپنے نظم و ضبط سے انتہائی مہذب ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ جہاں ایک طرف وہ غیر محفوظیت، خوف، تردد اور انتشار کے عالم میں مبتلا ہے وہیں اس انتشار کے عالم سے خود کو باہر نکال لانے کی جد و جہد میں مصروف بھی ہے۔ (اس اعتبار سے وجودیت پسندی کا فلسفہ اس کے مقصدِ حیات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔) غرض کہ جہاں جدید کردار کے متعدد تاریک پہلو ہیں، وہیں چند روشن پہلو بھی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے اکثر ہم عصر نقادوں سے میرا نظریۂ جدیدیت اس اعتبار سے مختلف ہے کہ میں جدید انسان جبکہ دوسرے نقاد میرے ہم نوا نہیں ہیں۔ اگر کسی جدید شاعر کو جدید انسان کے مثبت کردار سے کوئی فطری دلچسپی نہیں ہے تو میں تنقید کے ذریعہ اسے مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ اس پہلو سے لازماً دلچسپی لے۔ لیکن جس جدید شاعر کے یہاں یہ مثبت کردار فطری طور پر ابھرتا ہے، اسے میں جدید شاعری کے زمرے سے محض یہ کہہ کے خارج کر دینا نہیں چاہتا کہ مایوسی و بے یقینی، تشویش و تردد و نیز غیر محفوظیت کا احساس ہی جدید شاعری کی بنیادی پہچان ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ ہماری جدید شاعری میں "جدید انسان" ــــ کا مثبت کردار سرے سے ابھرا ہی نہیں ہے، لیکن جدید نقادوں نے جدید شاعری کے اس پہلو کی جانب توجہ نہیں دی یا دانستہ طور پر بے اعتنائی برتی ہے اور اسے بہ نظر اعتبار کا درجہ دینے سے گریز کیا ہے۔ علاوہ ازیں عظیم شاعری کی تخلیق کے لیے ضروری ہے کہ شاعر اپنے طور پر "پورے آدمی" کی دریافت کی کوشش کرے اور زندگی کی بوقلمونی کو اپنے فن میں جذب کر لے۔ (اس نوعیت کی کوشش غالب، اقبال، ٹیگور، ڈبلیو بی ییٹس وغیرہ کے یہاں آپ کو بآسانی نظر آئے گی۔) لہٰذا ایسے جدید شعرا جن کے یہاں بوقلمونیِ حیات کی عکاسی اور پورے آدمی کی دریافت کی سعیِ جمیل پائی جاتی ہے، (یعنی جن کی تخلیقات میں جدید انسان کا مثبت اور منفی دونوں طرح کا کردار ابھرتا ہوا نظر آتا ہے) اور جن کی نظر میں زندگی مختلف خانوں میں بٹی ہوئی نہیں ہے، ان کی بقائے دوام کی ضمانت بآسانی پیش کی جا سکتی ہے۔

★

قاسم شبیر نقوی

جشنِ جمہور

قوم کو عشق کا آئینہ دکھانا ہے ہمیں — ملک کو امن کی تصویر بنانا ہے ہمیں
پستیٔ غم سے غریبوں کو اٹھانا ہے ہمیں — دلِ انساں ابھی سوتا ہے جگانا ہے ہمیں
جشنِ جمہور کسی طرح منانا ہے ہمیں

ابھی انساں کو شعورِ غمِ انساں ہی نہیں — ابھی آزادی کا مقصود نمایاں ہی نہیں
جس سے دشتِ عمل کا جادہ چراغاں ہی نہیں — تیرگی ہوش کی محفل سے مٹانا ہے ہمیں
جشنِ جمہور کسی طرح منانا ہے ہمیں

ابھی آوارگیٔ فکر و نظر باقی ہے — ابھی ماحول پہ ظلمت کا اثر باقی ہے
دردِ احساس بہ اندازِ دگر باقی ہے — شوق کی روح کو آزاد بنانا ہے ہمیں
جشنِ جمہور کسی طرح منانا ہے ہمیں

زندگی میں ہے جو عظمت ابھی معلوم نہیں — کیا ارادوں میں ہے قوت ابھی معلوم نہیں
فکر و احساس کی قیمت ابھی معلوم نہیں — ابھی جینے کا بھی معیار بنانا ہے ہمیں
جشنِ جمہور کسی طرح منانا ہے ہمیں

ابھی دینا ہے گلستاں کو حفاظت کا شعور — لالہ و گل کو درخشانی و نکہت کا شعور
یعنی ہر فرد کو خودداری و جرأت کا شعور — برق کی زد سے نشیمن کو بچانا ہے ہمیں
جشنِ جمہور کسی طرح منانا ہے ہمیں

ارضِ گوتم پہ جلانا ہے محبت کا چراغ — ارضِ نانک میں لگانا ہے حقیقت کا سراغ
ارضِ سرمد کو بنانا ہے صداقت کا ایاغ — ارضِ گاندھی کو تشدد سے بچانا ہے ہمیں
جشنِ جمہور کسی طرح منانا ہے ہمیں

ابھی آزادیٔ تخئیل و عمل مبہم ہے — یعنی احساسِ اسیری کا وہی عالم ہے
اعتماد اپنی حقیقت پہ ابھی کم کم ہے — ایک مرکز پہ خیالات کو لانا ہے ہمیں
جشنِ جمہور کسی طرح منانا ہے ہمیں

کس نے دیکھی ہے ابھی اپنے گلستاں کی بہار — کس نے ڈھونڈے ہیں ابھی اپنی زمیں کے انوار
کرکے پرواز خلا میں نہیں جانا درکار — اپنے ذروں کو مہ و نجم بنانا ہے ہمیں
جشنِ جمہور کسی طرح منانا ہے ہمیں

شادان عارف بنکوی

اپنی دھرتی

اے مرے پیار کی پونجی مرے نغموں کے دیار
یہ ترا روپ یہ سج دھج، یہ جوانی، یہ نکھار
لڑکھڑاتے ہوئے لمحوں پہ یہ بھرپور شباب
تین موسم کی یہ بھرپور ترنگی سی بہار
آج میں تیرے لیے گیت نئے لایا ہوں
اپنی دھرتی پہ کئی سال کے بعد آیا ہوں

نئے ماحول نئے دور میں ہم آئے ہیں
نئے بھارت نئی دھرتی پہ قدم آئے ہیں
ہم پہ کیا کیا نہ فرنگی نے ستم ڈھائے تھے
جھیل کر کتنے زمانے کے ستم آئے ہیں
اپنے کسانے سے بھی کچھ روز میں گھبرایا ہوں
اپنی دھرتی پہ کئی سال کے بعد آیا ہوں

اب سے پہلے تو یہی شکل رہا کرتی تھی
زخم بوتے تھے یہاں بھوک اُگا کرتی تھی
یہ زمیں آگ سے نفرت کی تھی جھلسی جھلسی
کھیت کھلیان سے بس دھول اڑا کرتی تھی
آج ہر شے پہ نظر ڈال کے للچایا ہوں
اپنی دھرتی پہ کئی سال کے بعد آیا ہوں

پتھروں کو بھی نچوڑا گیا ندیوں کے لیے
پربتوں کو بھی تراشا گیا ریلوں کے لیے
روشنی دوڑ گئی گاؤں کے بازاروں تک
اب کہاں کوئی ٹھکانا ہے اندھیروں کے لیے
میں اسی دیس کا اک روپ ہوں اکسایا ہوں
اپنی دھرتی پہ کئی سال کے بعد آیا ہوں

اک صدی بعد مرے دیس کی صورت بدلی
بدلی بیماری غربت وہ جہالت بدلی
چولھے ٹھنڈے ہیں نہ اب کھیت مرے پیاسے ہیں
میرے چوپال میرے گاؤں کی حالت بدلی
نئے جیون کی میں سوگندھ یہاں لایا ہوں
اپنی دھرتی پہ کئی سال کے بعد آیا ہوں

ہوگا اس بات سے انکار کسے بھارت میں
ہے بڑا فرق پرانے میں نئے بھارت میں
آج چھبیس برس بعد جو دیکھا تو یہاں
جل رہے ہیں نئی دنیا کے دیے بھارت میں
دیر تک اپنی ترقی پہ میں اترایا ہوں
اپنی دھرتی پہ کئی سال کے بعد آیا ہوں

شکور ارمان سنبھلی

(افسانہ)

آج اور کل

"شمی! مجھے تمہارا یہ عریاں لباس قطعی پسند نہیں ہے اب تم جوان ہوگئی ہو ـــــ ایسا لباس مت پہنا کرو" رضیہ نے اپنی چھوٹی بہن شمی کے لباس کو حقارت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"واہ باجی واہ! آپ بھی کیا دقیانوسی باتیں لے کر بیٹھ گئیں؟ ارے باجی! اب وہ زمانہ ختم ہوگیا ہے جب عورتیں لمبا چوڑا لبادہ پہنا کرتی تھیں اور خود کو کپڑوں کی گٹھری بنائے رکھتی تھیں اب تو زمانہ بہت آگے جاچکا ہے" شمی نے اپنے نیم عریاں اور چست لباس کو دیکھ کر اپنی باجی کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوے کہا۔

"چل ہٹ یہاں سے۔ میری سمجھ میں نہیں آتی تیری یہ بے حیائی ـــــ" رضیہ نے شمی کو ڈانٹا۔

"آپ ہی انھیں سمجھایئے خالد بھائی ـــــ" شمی نے پاس ہی کرسی پر بیٹھتے ہوے خالد سے استدعا کی۔

"بھئی تم سمجھا تو رہی ہو میں انھیں کیا سمجھاؤں؟" خالد نے مسکراتے ہوے جواب دیا۔

شمی نے ایک بار پھر اپنے نیم عریاں چست لباس اور اپنے جسم کا جائزہ لیا اور چھوٹا سا دوپٹہ گلے میں ڈال کر تیکھی نظروں سے اپنی باجی کی طرف دیکھا۔

"آیئے خالد بھائی! یہ تو ہمیشہ ایسی ہی باتیں کیا کرتی ہیں یہ تو کنویں کی مینڈک ہیں باہر نکلیں تو معلوم ہو کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے ـــ آج اور کل میں کتنا فرق ہے۔" شمی کہتے ہوے دروازے کی طرف بڑھی۔

"آپ نہیں چلیں گی ـــــ؟" خالد نے رضیہ سے سوال کیا۔

"جی نہیں! مجھے اس طرح سیر سپاٹے کرنا پسند نہیں ہے۔ میں معافی چاہتی ہوں" رضیہ نے انکساری سے جواب دیا۔

"میں سمجھتا ہوں اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ بہتر ہے آپ بھی چلیں" خالد نے ایک بار پھر اصرار کیا۔

"آپ مجھے مجبور نہ کیجیے۔ شمی تو آپ کے ساتھ جا ہی رہی ہے۔" رضیہ نے برجستہ جواب دیا اور خالد ناامید ہو کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

ہوٹل رین بو (RAIN BOW) کا مخصوص ہال قریب قریب بھر چکا تھا، صرف چند میزیں ہی خالی پڑی تھیں۔ شمی اور خالد بھی کونے میں بڑی میز پر بیٹھ گئے۔

"ہلو ـــــ ڈیر شمی! اچانک ایک نوجوان اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوے آگے بڑھا۔

"آیئے مسٹر نور!" شمی نے نور کا ہاتھ پکڑ کر پاس والی کرسی پر بٹھلاتے ہوے کہا۔

"آپ کی تعریف؟" نور نے خالد کو دیکھ کر شمی سے سوال کیا۔

"میرا نام خالد ہے ـــــ" خالد نے از خود اپنا تعارف کراتے ہوے ہاتھ بڑھایا۔

"یہ میرے خالہ زاد بھائی ہیں ـــــ لکھنؤ سے آئے ہیں۔ لکھنؤ یونی ورسٹی میں لکچرار ہیں"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ـــــ شمی نے ذکر تو کیا تھا کہ آپ آنے والے ہیں غائبانہ تعارف تو ہو ہی چکا تھا آج شرف ملاقات بھی حاصل ہوگیا ـــــ لیکن آپ آئے کب؟" نور نے مخلصانہ انداز

میں بات شروع کی۔

"مجھے تین چار روز ہو گئے آئے ہوئے ——" خالد نے رسمی طور پر جواب دیا۔

"اچھا بتایئے آپ لوگ کیا پئیں گے کافی، چائے یا کچھ اور؟" شمی نے بیرے کو آتے دیکھ کر سوال کیا۔

"میں تو چائے پینا چاہتا ہوں" خالد نے جواب دیا۔

"پھر تو میں بھی خالد صاحب کا ساتھ دوں گا ——" نور نے بے تکلف ہوتے ہوئے کہا۔

"اور آپ؟" خالد نے شمی سے سوال کیا۔

"بیرا میرے ٹیسٹ سے واقف ہے ——" شمی نے بیرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر میں بیرا دو چائے اور ایک وہسکی لے کر آ گیا۔

آرکسٹرا کی مدھم دھنوں پر رقص ہو رہا تھا۔ ہال میں کبھی فُل روشنی ہو جاتی تو کبھی رنگ برنگی روشنیاں قوس و قزح کے منظر پیش کرنے لگتیں۔ چائے پینے کے بعد نور نے شمی کو کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نور اور شمی رقص کرنے والوں کے غول میں جا ملے اور خالد بیٹھا ہوا مسکراتا رہا —— کافی دیر تک شمی کبھی نور کے ساتھ کبھی شہاب کے ساتھ اور کبھی کسی اور اجنبی نوجوان کے ساتھ رقص کرتی رہی اور جب تھک کر چور ہو گئی تو چہرے پر آئے ہوئے پسینے کو رومال سے جذب کرتے ہوئے خالد کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

"آپ تو بہت اچھا رقص کر لیتی ہیں" خالد نے مسکراتے ہوئے شمی کی تعریف کی۔

"شکریہ خالد صاحب!" شمی نے فرطِ مسرت سے خالد کو خالد بھائی کے بجائے خالد ہی کہہ کر خطاب کیا۔

بیرے نے دو کھانے لا کر سامنے رکھ دیے۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" خالد نے کھانا ختم کرتے ہوئے سوال کیا۔

"کچھ دیر موتی پارک میں گھوم لیں اس کے بعد سیدھے گھر ہی چلیں گے۔" شمی نے عجیب و غریب انداز سے جواب دیا۔

شمی نے بیرے کو پے مینٹ کیا اور پھر دونوں موتی پارک روانہ ہو گئے۔

موتی پارک کی خوب صورتی اپنے پورے شباب پر تھی۔ جگہ جگہ عورتیں اور مرد گھوم رہے تھے کوئی بنچ پر بیٹھا تھا تو کوئی گھاس پر لیٹا تھا۔ شمی اور خالد بھی پارک میں ایک طرف جا کر بیٹھ گئے وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ ایک ہپی کٹ بالوں والا نوعمر لڑکا شمی کی طرف بڑھا۔

"سوئیٹ شمی! آج کئی دن میں نظر آئی ہو تم؟"

"ہاں نسیم! دراصل یہ ہمارے خالد بھائی آ گئے تھے اس لیے نہ آ سکی" شمی نے خالد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب!" نسیم نے خالد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"مجھے بھی آپ سے مل کر مسرت ہوئی اور خصوصاً یہ دیکھ کر کہ آپ ہماری شمی کے گہرے دوست ہیں۔"

اچانک نسیم نے شمی کو مخاطب کیا۔

"ڈیر شمی —— میں ایک منٹ تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں" (پھر خالد کی طرف دیکھ کر) "معاف کیجیے گا آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"نہیں! نہیں۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے ——" خالد نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

شمی اور نسیم چند گز کے فاصلے پر جا کر باتیں کرنے لگے اور خالد پارک کا جائزہ لینے لگا —— چند منٹ کے بعد نسیم مسکراتا ہوا چلا گیا اور شمی خالد کے پاس آ گئی۔

"یہ میرا کلاس فیلو ہے —— بڑا ہونہار ہے۔ میری بڑی عزت کرتا ہے۔"

"وہ تو صورت سے ہی ظاہر ہے —— آدمی واقعی شریف اور بے تکلف معلوم ہوتا ہے۔" خالد نے شمی کی تائید کی۔

اچانک شمی نے خالد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"آپ میری اس بے تکلفی سے ناراض تو نہیں ہیں ——" شمی نے قدرے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"بالکل نہیں ——" خالد نے بے ساختہ جواب دیا۔

"دراصل میں بے تکلفی کو ہی بہتر سمجھتی ہوں —— مجھے صفیہ باجی کی طرح تکلف اچھا نہیں لگتا۔ آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟"

"بڑا پیارا سوال کیا ہے" خالد مسکراتے ہوئے بولا ۔۔۔ "ارے کہاں آپ اور کہاں آپ کی باجی؟ ۔۔۔ وہ تو بالکل بدھو ہیں بدھو ۔۔۔ بالکل دیہاتی۔"

"کیا بتاؤں خالد صاحب؟ میں نے ان سے کئی بار کہا ہے کہ زمانے کے ساتھ چلو ۔۔۔ دقیانوسی طور طریقوں کو چھوڑ دو ۔۔۔ مگر وہ میری ایک نہیں سنتی ہیں کہتی ہیں تو تو بے وقوف ہے۔"

شمی نے کچھ اداس ہوتے ہوئے کہا۔

"چھوڑیے ان کی بات۔ وہ بھی کوئی انسان ہیں ۔ مجھے تو آپ کی عادت پسند ہے ۔۔۔" خالد نے تعریفی نظروں سے شمی کو دیکھا اور شمی کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا ۔۔۔ اچانک موتی ٹا در ے گیارہ بجائے۔

"اوہ گیارہ بج گئے ۔۔۔ چلیے خالد صاحب! امی جان انتظار کر رہی ہوں گی" شمی نے کہا اور دونوں اسکوٹر رکشا پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

"لیجیے چائے پی لیجیے ۔۔۔" علی الصباح ہی رضیہ نے خالد کے سامنے چائے رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے آپ خود لے آئیں؟

"کیا ہو گیا اگر میں لے آئی۔ گھر آئے مہمان کی خاطر کرنا ہمارا فرض ہے۔"

رضیہ نے نگاہیں جھکائے آہستہ سے جواب دیا۔ اس نے پھر کہا۔

"کیا میرے لانے پر کوئی اعتراض ہے آپ کو ۔۔۔"؟

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں میں نے تو ایسا نہیں کہا ۔۔۔" خالد نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

"خیر چھوڑیے ۔۔۔ ممکن ہے میں غلط سمجھ گئی ہوں" رضیہ نے جلدی سے بات ختم کی۔

اچانک شمی اپنے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے داخل ہوئی اس نے اس وقت باریک لباس پہن رکھا تھا جس کو دیکھتے ہی خالد اور رضیہ نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں خالد بھائی ۔۔۔"؟

"کچھ نہیں! میں تمہاری باجی کو سمجھا رہا تھا کہ تم بھی شمی کی طرح ایڈوانس ہو جاؤ ۔۔۔"

"ارے بھائی صاحب! یہ اور ایڈوانس ہو جائیں؟ ۔۔۔ انھیں تو ان کپڑوں سے ہی نفرت ہے ان کے پہننے کے لیے تو بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔ یہ تو خوش نصیب لوگ ہی پہن سکتے ہیں۔"

شمی نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ۔۔۔ رضیہ نے شمی کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

"شمیم!" اچانک امی جان کی آواز آئی۔

"جی امی جان!" شمی نے کہا اور دوڑ کر امی جان کے پاس پہنچ گئی۔

"کم نصیب! کم سے کم سر پر دوپٹہ تو رکھ لیا ہوتا ۔۔۔ تو بھی کتنی بے شرم ہو گئی ہے۔"

"آج پھر بھول ہو گئی امی! کم سے کم آپ ہی مجھے یاد دلا دیتیں۔"

شمی نے کہا اور پلنگ پر پڑا دوپٹہ اٹھا کر گلے میں ڈال لیا۔

"امی! آپ نے تو اسے بالکل سر پر چڑھا رکھا ہے ۔۔۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ ہی ختم ہو گیا اس کی نظروں میں" رضیہ نے شکایت کی۔

"ہاں بیٹی۔ تو ٹھیک کہتی ہے ۔۔۔ یہ سب تیرے ابا جان کی لاڈ کا نتیجہ ہے۔"

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد خالد اپنے ایک دوست کے یہاں چلا گیا ۔۔۔ اور شمی کالج چلی گئی۔ رضیہ نے خالد کا کمرہ صاف کیا۔ ادھر ادھر بکھری ہوئی چیزوں کو قرینے سے لگانے کے بعد غسل کیا اور صاف ستھرا لباس پہن کر گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ قریب دو بجے خالد اپنے دوست کے گھر سے واپس ہوا۔ رضیہ مسہری پر بیٹھی ہوئی کسی رجسٹر کے مطالعہ میں مصروف تھی اُسے یہ بھی احساس نہ تھا کہ خالد بڑی دیر سے اس کے پاس کھڑا ہے ۔۔۔ وہ تو اس وقت چونکی جب خالد نے سوال کیا۔

"کیا میں آپ کا یہ رجسٹر دیکھ سکتا ہوں؟"

"آپ؟" وہ ایک دم چونک کر کھڑی ہو گئی اور دوپٹہ اپنے سر پر رکھ لیا۔

"آیئے تشریف رکھئے" اس نے کہا۔

"آپ نے شاید ابھی کھانا بھی نہ کھایا ہو گا۔ پہلے آپ کھانا کھا لیجیے" رضیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ تکلیف نہ کیجیے میں کھانا کھا کر آیا ہوں ۔۔۔۔" خالد نے کہا اور رضیہ بیٹھ گئی۔

"لیجیے ۔۔۔۔" رضیہ نے رجسٹر خالد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"امداد باہمی انجمن" خالد نے جیسے ہی رجسٹر ہاتھ میں لیا پڑھ کر بھونچکا رہ گیا۔

"کیا کوئی انجمن قائم کر رکھی ہے آپ نے؟" خالد نے سوال کیا

"جی ہاں!" رضیہ نے نگاہ نیچی کیے ہوئے جواب دیا۔

"اس انجمن کی اس وقت پچاس خواتین ممبر ہیں۔ خوش قسمتی سے میں اس کی صدر ہوں۔"

"بہت خوب! لیکن کیا آپ یہ بتانے کی تکلیف کریں گی کہ اس کے اصول کیا ہیں اور کیا کیا کام ہیں اس کے ۔۔۔۔"؟ خالد نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"بہت معمولی اصول ہیں ۔۔۔۔ ہماری انجمن غریب گھرانوں کو آسان قسطوں پر قرضہ دیتی ہے ۔۔۔ اور گھریلو صنعتوں کو بڑھانے کے لیے ہر ممکن امداد کرتی ہے ۔۔۔ ان صنعتوں کی جانچ کے لیے ہم لوگ اکثر خود بھی دورہ کرتے ہیں اب تک قریب ڈیڑھ سو گھرانوں کو چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے لیے ہم روپیہ دے چکے ہیں اور تمام صنعتیں کامیابی کے ساتھ چل رہی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ کام کوئی مشکل نہیں ہے ۔۔۔ جہاں ہماری سرکار دوسری یوجناؤں کو کامیابی کے ساتھ چلا رہی ہے وہ اس یوجنا میں بھی کامیاب ہو سکتی ہے ۔۔۔۔ ہمارے سامنے خاندانی منصوبہ بندی (پریوار نیوجن) کی مثال موجود ہے۔ پہلے لوگ اس سے نفرت کرتے تھے لیکن اب بہ خوشی اس کو اپنا رہے ہیں"

خالد نے پوری فائل کا بغور مطالعہ کیا اور مسکراتے ہوئے رضیہ کو واپس کر دی ۔۔۔۔ رضیہ نے ایک نظر خالد کو دیکھا ۔۔۔ اور نہ جانے کس خیال میں کھو گئی۔ خالد بھی رضیہ کے سادے لباس اور حسن میں کھو گیا۔ ایک حقیقی زندگی اس کے سامنے تھی۔

چار بجے شمی کالج سے آ گئی وہ عجیب قسم کا لباس پہنے ہوئے تھی جس میں سے اس کا ہر عضو نمایاں تھا۔ رضیہ نے اس کو نفرت بھری نظروں سے دیکھا اور منہ پھیر لیا ۔۔۔۔ خالد نے بڑی للچائی اور پیاسی نظروں سے اس کے جسم کا جائزہ لیا اور مسکراتا ہوا اپنے کمرہ میں چلا گیا۔

"کہیے خالد بھائی۔ آپ کا دل لگ گیا یا نہیں؟" شمی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"جہاں تم جیسی ترقی پسند لڑکی ہو وہاں کس کا جی نہیں لگے گا ۔۔؟"

"کیوں بنا رہے ہیں آپ مجھے!"

"میں بنا نہیں رہا ہوں بلکہ حقیقت بیان کر رہا ہوں" پھر اس نے شمی کے کانوں کے پاس اپنا منہ لے جاتے ہوئے کہا ۔۔۔۔ "اس قاتل جوانی سے کتنوں کا شکار کر چکی ہو اب تک"؟

وہ جھینپ کر رہ گئی ۔۔۔۔

"صرف ایک" وہ مسکرانے لگی۔

"کون؟"

"رضیہ باجی ۔۔۔۔ جنھیں میری جوانی اور لباس پر حسد ہے ۔۔"

اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے شمی جھیل کے کنارے کھڑی تھی اور خالد تھوڑے فاصلے پر ملاح سے گفتگو کر رہا تھا ۔۔۔۔ کہ اچانک جمیل نے آتے ہی شمی کے رخساروں کو چوم لیا اور شمی صرف مسکرا کر رہ گئی ۔۔۔۔ خالد نے بھی جمیل کی یہ حرکت دیکھی لیکن ایسا انجان بن گیا جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو ۔۔۔۔ ملاح نے کشتی کنارے پر لگا دی اور خالد اور شمی کشتی میں سوار ہو گئے۔

"مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے ۔" خالد نے شمی سے کہا۔

"دراصل یہ میری ایک ہابی ہے ۔۔" شمی نے بڑے فخر سے جواب دیا۔

"دیکھا جائے تو ٹھیک بھی ہے زندگی میں رکھا ہی کیا ہے ۔۔۔۔ وہ بھی کوئی انسان ہے جس کے دوست و احباب نہ ہوں ۔۔۔۔" خالد نے بھی شمی کی تائید کی۔

"ہاں خالد صاحب! زندگی چار ہی دن کی تو ہے ۔۔۔۔ اس کو چاہے رو کر گزار دو چاہے ہنس کر۔"

"بات بالکل صحیح کہہ رہی تم ۔۔۔۔"

"میں ان لوگوں کو تو قطعی پسند ہی نہیں کرتی جو اپنی زندگی ایک

ہی محور پر گھمائے رہتے ہیں، ایک ہی دائرے میں خود کو محدود کر دیتے ہیں۔ جیسے ہماری رضیہ باجی ——— زندگی رعنائیوں، رنگینیوں اور تابانیوں کا ہی نام ہے ——" شمیّ نے بحث شروع کی۔

"جوانی بھی بار بار نہیں آتی ———" خالد نے ایک اور لقمہ دیا۔

"جوانی سے لطف اندوز ہونا کیا بری بات ہے آپ خود ہی بتایئے خالد صاحب ———"

"واقعی تمھارے خیالات بہت وسیع ہیں ——— میں ان کی دل سے قدر کرتا ہوں ——"

کشتی کنارے پر لگ چکی تھی۔ خالد اور شمیّ اتر کر موتی پارک میں داخل ہو گئے۔

"آیئے خالد صاحب ادھر بیٹھیں گے ——" شمیّ نے ایک پیڑ کے سائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ——— پہلے تو خالد نے کچھ سوچا لیکن پھر اُدھر ہی چل دیا۔

آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی ——" شمی نے بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"کوئی لڑکی پسند نہیں آئی تھی ——"

"اب آگئی ؟" شمیّ نے بے قراری سے سوال کیا۔

"ہاں!"

"کون ؟" شمیّ کا دل دھڑکنے لگا۔

"میرے دل میں ہے ——" خالد نے مسکراتے ہوئے کہا شمیّ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

"مجھے آپ کی مسکراہٹ بڑی پیاری لگتی ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ ہونٹ ———" شمیّ نے اپنا چہرہ خالد کی طرف لے جاتے ہوئے کہا ——— خالد ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"چلو شمیم! جذبات میں بہنا اچھا نہیں ہے ———" خالد نے جھنجھلاتے ہوئے کہا اور شمی نے ندامت سے گردن جھکا لی۔

اس طرح قریب پندرہ دن تک خالد شمیم عرف شمیّ کے ساتھ کلبوں، پکچر ہاؤس، جھیلوں، پارکوں اور پارٹیوں میں گھومتا رہا اور اس کے بوائے فرینڈس، کلاس فیلوز سے ملتا رہا اور اس کے جسم کی نمائش کو دیکھتا رہا۔

پھر ایک دن وہ اپنے گھر جانے لگا ——— چلتے وقت شمیّ نے بڑی پیاری پیاری باتیں کیں بڑی آؤ بھگت کی ——— بڑی قسمیں دلائیں اور خود کو بہترین لڑکی ثابت کرنے کی کوشش کی۔

"آپ نے کچھ نہیں کہا ——"؟ خالد نے رضیہ سے بھی سوال کیا۔

"شمیّ نے سب کچھ تو کہہ دیا ہے آپ سے"

"پھر بھی کچھ تو ———"؟ خالد نے اصرار کیا۔

وہ خاموش رہی ——— آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"اپنی خیریت سے مطلع کیجیے گا ——" دروازے پر پہنچ کر رضیہ نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے خالد سے کہا۔ اور ہونٹوں میں دوپٹے کا آنچل دبا کر منہ پھیر لیا۔

خالد کا دل دھک سے رہ گیا۔

ایک ہفتے بعد شمیّ کو خالد کا خط ملا

"شمی! امید ہے تم بہ خیریت ہوگی ——— شاید تمھیں اس کا علم نہ ہو ——— کہ میں تمھارے گھر کس مقصد سے گیا تھا۔ اپنی امّی جان کی خواہش کے مطابق مجھے تم دونوں بہنوں میں سے کسی ایک کے ساتھ شادی کرنا ہے ——— اس لیے یہ پرکھنے کے لیے کہ تم میں سے کس کو میں اپنی شریک حیات منتخب کروں میں نے تمھارے گھر پندرہ دن قیام کیا۔ اس عرصے میں میں نے تمھارا اور تمھاری باجی رضیہ کا بہ غور جائزہ لیا۔ جس روش اور فیشن کو تم نے اختیار کیا ہے وہ ترقی کی نہیں بلکہ تنزلی کی راہیں ہیں۔ ان سے سماج، ملک اور قوم کا اخلاق و کردار پستی کی طرف جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمیں دقیانوسی روشوں اور روایتوں کو چھوڑ کر نئے نئے طریقے اور نئی نئی منزلیں اختیار کرنا چاہیے لیکن اس کے دوسرے طریقے ہیں بے شرمی اور بے حیائی سے سیر سپاٹے کرنا ترقی پسند ہونے کی علامت نہیں ہے۔ یہ تو صرف بربادی کے آثار ہیں نیم عریاں لباس پہننا اور جسم کی نمائش کرنا نہ تو آج ہی لوگ پسند کرتے ہیں اور نہ کل ہی پسند کرتے تھے ——— تم نے آزاد خیالی کو فیشن پرستی پر تولنے کی کوشش کی ہے۔

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

اظہر علی فاروقی

پھر چلیں گے گھاٹ

عنوان ایک کڑی کا ٹکڑا ہے جو اس طرح ہے اور بہت مشہور ہے:

چھوٹی موٹی روٹیاں پکا لے دھوبنیا، پھر چلیں گے گھاٹ
تین چیزیں مت بھولیے حقّہ تماکھو آگ

یہ ہدایت ہے ایک دھوبی کی اپنی بیوی کو۔ وہ دھوبی جس کے بارے میں خواجہ حسن نظامی نے اس عنوان سے "سن کہ ایک دھوبی کا فقدی گھاٹ پر" ملا رموزی نے اپنے کئی مضامین میں اور راقم الحروف نے اپنے انشائیات کے مجموعہ نوک زبان میں اور بہتیرے دوسرے قلم کاروں نے اس کا عجیب عجیب تعارف کرایا ہے، مگر ان بولوں کی طرف غالباً پہلی بار اشارہ کیا جا رہا ہے جو دھوبی گھاٹ پر کپڑے دھوتے وقت اور زیادہ تر فرصت کے اوقات میں رات کے وقت لاشعوری طور پر اُگل دیتا ہے جن میں ترنگ ہے، مستی ہے اور درد آگیں کسک بھی۔ یہ اس کے گیت ہیں جنھیں وہ وقت گزارنے اور اپنے دلی جذبات ظاہر کرنے کے لیے گاتا ہے۔

دھوبیوں کے گیت کئی قسم کے ہوتے ہیں:

(۱) شُمِرَن۔ اس کے تحت وہ تمام اصناف آجاتی ہیں جنھیں ہم حمد، نعت اور منقبت سے تعبیر کرتے ہیں۔ شُمِرَن ہندی لفظ سُمِرَن کا اپ بھرنش (مسخ شدہ لفظ) ہے۔ اس میں وہ خدا، رسول، انبیاء، پنج تن، اولیاء اللہ اور خصوصیت سے خواجہ اجمیری، مدار شاہ اور دوسرے غیر معروف پیروں کی تعریف میں گیت بنا بنا کر گاتا ہے اور اُن کی شمرن کرتا ہے۔

ہیئت کے لحاظ سے شمرن زیادہ تر ہندی کے اشلوک اور کنڈلیوں میں ہوتے ہیں۔ کنڈلی چھند کی ایک قسم ہے جس میں چھ مصرعے ہوتے ہیں جس کو دھوبی کونڈلی یا چھ کڑیا کہتے ہیں۔ شروع کے دو مصرعے ایک دوہا بناتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک رولا (ٹکڑا) چھند جوڑ کر کنڈلی کی ہیئت کی تکمیل کی جاتی ہے۔ دوہے میں (۱۳ × ۱۱) چوبیس ماترائیں اسی طرح رولا بھی ۲۴ ماتراؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ تیسرے مصرعے میں دوسرے مصرعے کے آخری بول ضرور آتے ہیں۔ گاتے وقت پہلے دو مصرعوں کو استھائی اور تیسرے کو انترا سمجھنا چاہیے۔ اب آپ پہلے ہندی کی ایک کنڈلی پڑھیے اور اس کے ساتھ دھوبیوں کی شمرن، کنڈلی کی ہیئت میں پڑھ کر دونوں کا موازنہ کیجیے:

سائیں اَدَسَر[۱] کے پرے، کوتہ سہے دکھ دند[۲]
جائے بکانے ڈدم گھر، دے راجا ہری چند
دے راجا ہری چند کریں مرگھٹ رکھواری[۳]
دھرے تپسوی بھیس پھریں ارجن بل دھاری[۴]
کہہ گردھر کوی رائے، تپے وہ بھیم رسوئی
کو نہ کرے گھٹ کام پرے ادسر کو سائیں

دھوبیوں کی شمرن کا نمونہ یہ ہے:

---

[۱] موقع یہاں مطلب ہے برا وقت [۲] مصیبت [۳] رکھوالی نگراں [۴] شہ زور۔ طاقت ور

ہم پہ مہر خدا کی، مولا کی ہیں بخششیں
کلہ میرے جگر میں ہے، بسا کلیجے بیچ
بسا کلیجے بیچ، ہمیں کلمے سے ہے پار اُترنا
کوئی تو جاوے جنت کو کسی کو دوزخ بھرنا ہے
استاد مرے یوں کہتے ہیں غضب خدا سے ڈرنا ہے
خوف تو مجھ کو اس دن کا ہے جس دن مجھ کو مرنا ہے
گاؤں ترل گان سنو تم، باری تعالیٰ
دوجے نبی رسول سبھوں کو پار اُتارا
بی بی فاطمہ اور محمد لے لو علی کا نام
سمرو حسن حسین کو جن کے درست ایمان
ان پانچوں کو سمر کے میں گاؤں ترل گان
ان سب نے صدقے میں اپنے ہمیں اُتارا پار

دھوبی دوسرے کو کبھی کونڈلی کہتے ہیں، لیکن یہ کنڈلی کی ہیئت اور عروضی پابندیوں سے بے نیاز ہے، اس سلسلے کے کچھ گیت ایسے ہیں جنھیں سن کر مسلمان دھوبیوں کی فراخ دلی کی داد دینا پڑتی ہے یہ مسلمان صوفیاء اور درویشوں کی تعلیم کے اثر سے دھوبی بیچ مچ رام اور رحیم کو ایک سمجھنے لگے اور وہ اپنے سمروں میں ہندو دیوی دیوتاؤں کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ ایک سمرون پڑھیے۔ کوئی دھوبی کسی غیر معروف درویش روشن علی کی مدح کرنا چاہتا ہے اور درمیان میں ماتا سرسوتی کا سمرن کرتا ہے:

خدا تیری بڑی خدائی کل عالم کیا پیدا
ربا! تجھ سے لگایا دھیان
سمروں ماتا سرسوتی پھر روشن کا کروں بیان
وہ روشن درویش بڑے اللہ کے پیارے

(بریلی۔ روہیلی لہجہ)

(۲) حقانیاں۔ سمروں کے بعد اس سلسلے میں حقانیاں آتی ہیں۔ حقانیوں کی ہیئت زیادہ تر چھند اور کنڈلیوں کی طرح ہوتی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے ان میں سب کی سب مذہبی چیزیں ہوتی ہیں۔ معراج، معجزات، قیامت، جنت، دوزخ، قبر کا عذاب، فرشتوں کا آنا اور بازپرس کرنا۔ اپنے اپنے اعمال کی سزا بھگتنا اور جزا پانا۔ حج، قربانی وغیرہ وغیرہ کا بیان ہوتا ہے اور ان پڑھ دھوبیوں کی دلچسپی کو سراہنا پڑتا ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

چھٹا سینہ نور کا کھلا چمیلی پھول
اوّل پیدا جگ کیا پیچھے پیدا نور
اعمال برے قبر میں بھیا بھگتیں گے ہم آپی جی
اتنی خبر نہیں بندے کو دن ہوگا یا راتی۔ جی
لکھنے والے نے لکھ بھیجا فرشتہ قبر میں آوے گا
ماشاں کی اس کی آنکھیں ہوں گی گرز بھی ہاتھ میں لاوے گا
جو تو بندہ خدا کا ہوگا صاف صاف بتاوے گا

(رامپور۔ محلہ گوئیا تالاب۔ روہیلی لہجہ)

بس حقانیوں میں ایسے الفاظ اور بندشیں آجاتی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ گیت کاری ان پڑھ دھوبیوں کا کام نہیں ہے بلکہ ان کی یادداشت ہی لائق ستائش ہے اگرچہ پیر سے اور حستو دھوبی ساکن گوئیا تالاب رامپور ہمارے اس خیال کی تردید کرتے رہے کہ انھیں لوگوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ مثلاً معراج کا بیان پڑھیے:

آئے تھے جبرئیل امین براق کو لائے
پیر کی تھی وہ شب مہینہ رجب کا تھا لئے
وقت سواری کے ہونے کا کی شوخی براق
جبریل امین یوں بول پڑے کیا کرتا براق
جبریل سے بولا براق میں یہ عرض کروں
میری ہے عرض داشت نبی سے پوری پاؤں
محشر کے روز پسند کیجیے آپ سب مجھے

(رامپور۔ روہیلی لہجہ)

اس میں یہ مصرعے ملاحظہ فرمایئے:

رفرف پہ ہوئے سوار پاس حبیب عرش کے آئے
ہوا ادھر سے سوال کہ اب نعلین آتا۔ میں

حضرت کو ملا جواب، اجی حضرت کو ملا جواب
آپ سے کیا پردا! ہے پردا منسوخ
پہنے آپ سراسر آئیں یہ مجھ کو منظور
تھا پردہ لامکاں، نبی کو پاس بٹھایا

یہ سب کچھ پیارے دھوبی نے گا گا کر لکھایا اور میں اپنا شبہہ ظاہر کرتا رہا اور وہ دونوں برابر تردید کرتے رہے اور اس پر زور دیتے رہے کہ یہ سب کچھ برجستہ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ دیکھیے میں اپنے حریف کو چنوتی دے رہا ہوں:

اور کیا کچھ باتیں ہوئیں مولی سے تبلا سب کو مرت کر دیہ
مرت کر دیہ اجی گاؤ یا چپ ہو جاؤ

اور حسنو دھوبی نے چند منٹ بعد اس کا جواب دیا۔ جب تک اس نے جواب میں نہیں گایا پیارے برابر "مرت کر دیہ اجی گاؤ یا چپ ہو جاؤ" رٹتا رہا۔

یہ چیز بہت کچھ لاؤنی گائکوں کے مقابلے سے ملتی جلتی ہے جس کو وہ دنگل کہتے ہیں۔ سمردں اور حقانیاں گانے کا طرز لاؤنی اُپ راگ ہے جو خیال کی ایک تبدیل شدہ صورت ہے۔ ڈھولک، لکڑی کے ڈنڈے اور ریچ بچی اس کی سنگت کے موسیقی آلات ہیں۔ ڈھولک طبلے کے تین تال کہروا سے ملتے جلتے بولوں پر بجائی جاتی ہے۔

(۴) کھنڈ۔ دھوبی جن گیتوں کو کھنڈ کہتے ہیں ان کی تعریف ذرا دشوار ہے۔ ہیئت کے لحاظ سے کھنڈوں کو آپ مثنوی کے تحت رکھ سکتے ہیں۔ ان میں دو دو مصرعے یکساں ردیف اور قافیہ کے ہوتے ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے ان میں برجستہ مکالمے آتے ہیں۔ ایک گویا کسی چیز کا بیان پیش کرتا ہے، اور دوسرا اس کی تردید میں کوئی دوسرا بیان پیش کر دیتا ہے اور پہلے گائک کے چیلنج کا جواب دیتا ہے۔ ایسے برجستہ مکالمائی مقابلے، جو لاؤنی دنگلوں سے مماثلت رکھتے ہیں بڑے دلچسپ تو ہوتے ہی ہیں ساتھ ہی ساتھ تعجب خیز بھی۔ ایسے برجستہ مکالمے سن کر ناممکن ہے کہ آپ ان اَن پڑھ گانے والوں کی جولانیٔ طبع کی داد نہ دیں۔ مثال کے طور پر ایک مکالمہ لیجیے۔ بریلی دروازہ رام پور کے پیر بخش گھوسی نے ریل گاڑی کا بڑا طویل بیان دیا اور آخر میں چیلنج کے طور پر کہا:

ایسی ریل کہہ کے کوئی گائے گویا

اور پیارے دھوبی نے فوراً اس کا جواب دیا:

ریل کو تیری فیل کیا ہم نے دنگل کے درمیان
جہاز چلا جو ولایت سے آیا ہندستان

یہ مکالمہ بڑا طویل ہے۔ یہ طریقہ لاؤنی دنگلوں کی پھڈکے بازی کے مثل ہوتا ہے۔

دراصل کھنڈ ہندی لفظ کھنڈن یا کھنڈت کا مخفف ہے جس کے معنی ہی تردید کرنے کے ہیں۔ اس ضمن میں وہ واقعاتی قصے بھی آتے ہیں جو مسلمان درویشوں کے ساتھ پیش آئے۔ روشن درویش اور جوگی جے پال کا مقابلہ۔ خواجہ اجمیری اور آنا ساگر کا واقعہ۔ غازی میاں اور کسی ٹھاکر کا مقابلہ بڑے طویل مکالمائی گیت ہیں۔ روشن درویش اور جوگی جے پال کا مقابلہ سے کچھ ٹکڑے ملاحظہ فرمایئے۔ روشن درویش جو دھوبیوں میں روشن پھکڑ کے نام سے مشہور ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے ساتھی بتائے جاتے ہیں ان کا مزار بھی اجمیر میں ہے۔ اس کھنڈ کا عنوان ہے "سُمروں ماتا سرسوتی روشن کا کروں بیان"

تارا گڑھ سے چلے روشن پہنچے ساگر تال
بستر دیا جما ہو آں کتھا قدرت کا خیال
بستر دیا جما اسی ساگر کے کنارے
وہ روشن درویش بڑے اللہ کے پیارے

انھوں نے ساگر کے پانی سے وضو کیا۔ نماز پڑھی اور ان کے پاس کچھ لوگ ملنے آئے۔ اسی اثناء میں انھیں ایک حیرت انگیز چیز دکھائی دی۔

اس پانی میں دیپک دیا ایک دکھائے
وہ سَیہ لگے سوچنے کیا اڑتے ہیں شعلے رے

کسی طرح ان لوگوں نے رات گزاری۔ صبح کو ایک گوالن دہی بیچنے آئی۔ کسی نے اس دہی کو اوپر سے چھو دیا اور گوالن بگڑنے لگی۔ راجا سے جاکر شکایت کی۔ راجا نے روشن بھکڑ کو بلوا کر انگلی کاٹنے کا حکم دیا:

تارا بولے نوک پر اس کی کٹوا ئو
پاوے درد کمال دودھ کی دھا بہاؤ

اور انگلی کاٹ دی گئی۔ اس کی خبر جب رانی کو ہوئی تو وہ گھبرائی اور راجا کو برا بھلا کہا۔ روشن درویش نے زمین کھود کر اپنی انگلی زمین کے سپرد کی تو انگلی فریاد کرتی ہے:

دھرتی ماں کو چلے سونپ کے پیچھے سے پور پکاری
اور انگلی نے کہا روشن سن بات ہماری
کفر بیچ چلے چھوڑ کیا تقصیر ہماری

اور روشن درویش اس کو اس طرح تسلی دیتے ہیں:

خاطر جمع راکھیو انگلی مت دل میں گھبرائے
تو جیں دین کی لاؤں تیرا ایلدا[۱] نوں میں آئے

یہ کھنڈ بہت طویل ہے اور اس کے مصرعوں میں کہیں کہیں اختلاف بھی ہے۔ پیارے دھوبی گوئیا تالاب رام پور، ننھے دھوبی قلعہ بریلی۔ حیاتی دھوبی پیلی بھیت نے الگ الگ مصرعے بتائے ہیں۔

(۴) **عشقیہ قصے**۔ یہ قصے مثنویوں کے طرز میں ہیں اور خیال کی جلتی لے اور لاونی دھن میں گائے جاتے ہیں۔ سندر پردیپ اور مالی کے لڑکے کا عشقیہ قصہ۔ گوجری اور ایک درویش کا عشق۔ پنہاری اور بنیے کا عشق چھبیلی بھٹیاری کا قصہ۔ اور اسی طرح کے بہتیرے عشقیہ قصے رواج پذیر ہیں جو بہت طویل ہیں۔ ایسے منظوم غنائی قصوں کو اگر عوامی مثنویاں کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ یہاں دھوبیوں کے حافظے اور قوت یادداشت کی ستائش کرنا پڑتی ہے۔ ایسے قصوں کو سنتے وقت جو چیز سننے والے کو چونکا دیتی ہے وہ ہے ہیروئن کا سراپا۔ ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

گوری[۲] کرے سب سنگار گلے میں بڑ[۳] موتی کا مالا
کیا صفت کروں چہرے کی گویا چو گرد چاند سے اعلا
شرمائی اندر کی حور جس دم سرمہ[۴] آنکھ میں ڈالا
کیا قد بوٹا سا بنا بدن مان[۵] گند روئی کا گالا

ایک پنہارن سے ملیے

پنہاری پن گھٹ چلی دھرے گگریا سیس
بدن سلونا سا ملا عمر اٹھارہ بیس

ایک گوجری آرہی ہے، اُسے دیکھیے کہ وہ کیا کیا زیور پہنے ہے:

نازک دیننہ[۶]، کمر کی پتلی، سولہ کیے سنگار
روپ دیکھ رتن شہزادہ ہو گیا عاشق زار
انوٹ بچھوے گھنے، پاؤں میں پائل بھاری
چوڑی چھتے دار پڑی جھا نجن پہ ساری
پور پور میں چھلّے پہنے باذوبند پر اٹے
چھتیوں اوپر پڑا ڈھولنا جگنو کرے بہار
چمپ[۷] کلی اور ہار گلے دو رّ لی[۸] پہ چمکے
ٹیکا دیوے بہار ماتھے پہ بندیا چمکے
کیس[۹] کاڑھ چوٹی کو باندھا پھر کے مانگ سیندور
پری اندر کی بن رہی تھی ایسا اس پہ نور

ایسے عشقیہ قصے زیادہ تر بڑے طویل ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد بھی بہت زیادہ بتائی جاتی ہے چنانچہ رام پور کے ایک دھوبی نے ان کی تعداد ساڑھے تین سو سے زیادہ بتائی ہے۔ ایک دوسرے دھوبی نے اس سے بھی زیادہ بتائی۔

یہ گیت سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو مثنویوں کی تقلید میں بنائے گئے ہیں اور ان کا تجربہ آتارنے کی عوامی کوشش ہے۔ یہ قصے گیتوں سے زیادہ عوامی شاعری کے ضمن میں آتے ہیں۔ چھبیلی بھٹیاری کے قصے کے بارے میں یہ بول پڑھیے اور

---

[۱] بدلہ [۲] حسینہ [۳] بڑے [۴] گویا روئی کے گالے کی طرح نرم [۵] بدن [۶] چمپا کلی (گلے کا ایک زیور) [۷] بال۔

غور فرمایئے کہ پانچ سال میں یہ قصّہ نظم ہوا ہے جس میں ۶۰۷ شعر ہیں:

سن بتیس سے شروع سن جب تینتیس آئی
چوتھی گئی جب بیت چھبیلی آدھی بنائی
پینتیس چھتیس بیت گئی تھی بیتے سات سو ساٹھ
ساٹھ سات کا جوگ ملایا سینتیس میں کری تیاّر
لے کے رب کا نام محمدؐ بیچ وسیلہ
سمرے چار دیار چھبیلی کتھا بنایا

تخلص کی بہار دیکھیے:

پیارے جنوں کی شاعری نیا نکالا گیان
پیارے ادھوبی رہے رنگیلا گانے کے درمیان

(۵) برہا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برہا جدائی اور دکھ درد کے گیت ہوں گے مگر بات ایسی نہیں ہے۔ برہوں میں حسن و عشق کی باتیں اور جذبات ہوتے ہیں ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ برہوں کی ہیئت مختلف ہوتی ہے۔ زیادہ تر کنڈلی اور چھند کی ہیئت ہوتی ہے۔ گانے کا انداز اہیروں کے برہوں، گڈریوں کے چہکروں سے بالکل ملتا جلتا تو نہیں ہے پھر بھی گانے کی لے خیال میں کہی جانے کے باوجود بڑی تیز اور اونچی ہوتی ہے:

آنکھیں تیری کاٹ کیٹلی بھویں کرے ہیں رنگ
[illegible]تھیں تیری ناگنی تو ہے میری پرسند[1]

"ہیں پرسند" کے ساتھ دو ٹکڑے SSI SSI اور ایک ٹکڑا ISI بڑھا کر تیسرا مصرعہ انترا کے طور پر اٹھایا جائے گا۔

ہے مری پرسند پیاری کہ اب کیوں کرے قتل میرا
جب ہی سے میں نے ہوش سنبھالا پہلا عشق کیا تیرا
تیری گلی میں آؤں جاؤں چوتھا پھیرا ہے میرا
کنگرا تو کنواں کھدایا پتھر کا ہے چوبارا

اس پہ پریئیں مل مل نہائیں چاند سورج کا تارا
ایک پلنگ بچے آ مل سو دیں
سینے بیچ ' لگا بھالا SSI SSI ISS

(۶) سنگار۔ شرنگار رس کی نقل ہے اور گیتوں کی ایک مستقل صنف جس میں عورتوں کے رنگ روپ کپڑوں اور زیورات اور سنگار وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ ملبوسات اور زیورات پر کام کرنے والوں کے لیے یہ عوامی شاعری بے حد کارآمد ہے:

دوتر[2] کرے سنگار پہنے دھانی جوڑا
مسرو[3] کا تمان[4] کھینچ انگیا کا ڈورا
کرتی پہن سمال[5] اوڑھنی شال دوشالا
کرن پھول اور پہنے جھمکے چندرکلی کا ہالا
کنگن پہنے سوا لاکھ کے جھانجھن کی جھنکار
چوڑی پہنی چھین پہنی پچھیلا[6] دے چہکار
خوب کیا سنگار پہن کے سارا زیور
باندھ سیس سمال مانگ میں بھر کے گوہر
بال بال میں موتی سینچے ڈالا عطر پھلیل
چابے پان جمالی مسّی رہی آئینہ دیکھ
رہی آئینہ دیکھ حسن کو خوب نکھارا
قد بوٹا سا بنا بدن سانچے میں ڈھالا
ماتھے پہ بندا چمکے گلے چمک رہی مال
سہج سہج[7] پگ دھرے دھرن[8] پہ چلے چیتر کی چال
ایسا روپ دیا اس رب نے بنی عرش کی حور
شرمادے دیکھ پری بھی اس کو تھا ایسا اس پہ نور

یہ تو ہوئیں موٹی موٹی قسمیں۔ ان کے علاوہ دھوبیوں کے اور بہت سے گیت ہیں جو کسی نہ کسی طرح انھیں اقسام کے تحت آتے ہیں یہاں پر ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کر دینا ضروری ہے

---

[1] پسند۔ محبوب [2] سنسکرت لفظ دو تہر کا بگڑا ہوا۔ دختر۔ لڑکی [3] مشروع ایک قسم کا کپڑا [4] لہنگا [5] سنبھال [6] چوڑہ چھین۔ پچھیلا ہاتھ کے زیور ہیں۔ پچھیلا سب سے پیچھے پہنا جاتا ہے [7] آہستہ آہستہ [8] زمین پر چکور کے مثل ناز سے چلتی ہے۔

کہ دھوبیوں کے گیتوں کا جہاں کہیں بھی ذکر آتا ہے، وہاں فوراً لچاری کہہ دیا جاتا ہے۔ دراصل لچاری موضوع اور مضمون کے لحاظ سے گیتوں کی کوئی قسم نہیں ہے بلکہ یہ گانے کا ایک طرز ہے جسے لوگ لچاری کہتے ہیں۔ ایک گیت جو لچاری میں گایا جا سکتا ہے وہی لادنی (خیال) میں بھی گایا جاتا ہے۔ ایک گیت ٹپہ جیسے جو دھوبی عام طور پر لچاری طرز میں گاتے ہیں:

اب تم مگن میں ہو دن رات نئی شادی کے ہونے سے
نئی نئی جب شادی ہوئی جورو، گھر میں آئی
مات پتا کی خبر نہ لی جورو کو لاتا دودھ ملائی

اسی طرز میں گایا جانے والا ایک دوسرا گیت ہے جو بہت نام مشہور اور مقبول ہے:

گھر سے چلی دھوبن گھاٹ کو سولہ کیے سنگار
سر پہ ہانڈی کلپ کی اس کے کندھے پہ بانس تناؤ
دھوبی بالے کھیل مت دانے بیل کھڑا کر میں بھی چلوں تیرے ساتھ
تیرے بیل کی ٹال بجے گی میرے بچھوؤں کی جھنکار
تیرے گھاٹ نا جاؤں دھوبیا کہ تیرا رٹپنا گھاٹ
پاؤں پھسلی مری ہانڈی ٹوٹی پہلے جوبنا بارم بار
تیرے گھاٹ نا جاؤں دھوبیا کہ تیرے لونڈے ڈھیل
بہیّاں مروڑے چوڑا توڑے دے مارے بچھاوٹ بیچ
تیرے بیل کی ٹال بجے گی میرے بچھوؤں کی جھنکار

☆

۱؎ گلے میں رسی سے بندھی گھنٹی ۲؎ شریر۔ بدمعاش ۳؎ لاکھ کی چوڑیوں کا جوڑا۔

آج اور کل

(صفحہ ۴۲ کا بقیہ)

م نے یہ نہیں سوچا کہ ہمیں فیشن پرستی کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کے دوسرے مسائل کو بھی حل کرنا ہے۔ تم نے صرف اب تک حسن و شباب کی آزادی سے نمائش کرنا ہی سیکھا ہے۔ تمہارے سیکڑوں دوست ہیں سیکڑوں شیدائی ہیں تمہاری نظر میں عزت و عفت کوئی چیز نہیں ہے مجھ کلبوں وغیرہ کے چکر لگانے اور وقت ضائع کرنے سے کہیں زمانہ بدلا جاتا ہے زمانہ بدلا جاتا ہے سوشل کام کرنے سے۔ مذہب و ملت، اونچ نیچ کے فرق کو دور کرنے سے۔ میں تمہاری باجی کے خیالات، ان کے اصول اور کردار کی قدر کرتا ہوں ——— انھیں اسی شریک حیات بنا کر مجھے بڑی خوشی ہوگی ——— میں نے اپنی رائے سے اپنی امی جان کو آگاہ کر دیا ہے اور شاید انھوں نے تمہارے والد محترم کو بھی خط لکھ دیا ہے۔ اب میں تم سے اجازت چاہتا ہوں شاید تمھیں کسی کلب یا جھیل پر نور، جمیل یا کسی نئے دوست سے ملنے کی جلدی ہو ——— اپنی باجی رضیہ سے میرا سلام کہہ دینا ——— اور خیریت بھی کہہ دینا ——— اور ہاں یہ بھی بتا دینا کہ میری چھوٹی بہن عطیہ نے بھی خواتین کی ایک امداد باہمی انجمن قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے اس کو تمہاری امداد کی جلد ہی ضرورت محسوس ہوگی۔

شمی! آخر میں میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ نور میرا گہرا دوست ہے جس کے مکان پر میں تمہارے گھر پہنچنے سے ایک دن پہلے قیام کر چکا ہوں، اس نے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا ———

اچھا ——— خدا حافظ

تمہارا

خالد جمال

خط پڑھتے ہی شمی کا سارا بدن اسّی سال کے بڈھے کی طرح لرزنے لگا اس کی آنکھوں میں اشکوں کا سیلاب امنڈ آیا ——— اچانک رضیہ وہاں آ پہنچی شمی نے خط رضیہ کی طرف بڑھا دیا ——— اور خود دوڑ کر اپنے فیشن ایبل کپڑوں کا بکس اٹھا کر کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔

☆

غزلیں

بشیر فاروقی

یہ مسئلے حیات کے ہم نے اٹھائے ہیں
ہم خود ہی اپنی ذات کو زنداں بنائے ہیں

میں تو بڑھا تھا، شوخ حسیں رنگ دیکھ کر
کیا علم تھا وہ ہاتھوں میں شعلے چھپائے ہیں

دامن بچا کے ہم سے اب اے زندگی نہ جا
ہنس ہنس کے تیرے ناز ہمیں نے اٹھائے ہیں

نقشہ میں جیسے جھیل ہو دریا ہوں شہر ہوں
یوں زندگی نے خواب سہانے دکھائے ہیں

اب تم کہیں بھی جاؤ گے پہچان لیں گے لوگ
یہ چہرے کھل چکے ہیں جو تم نے لگائے ہیں

سُن لو! کہ ہم غبارِ پسِ کارواں نہیں
منزل پہ چھوڑ کر تمھیں ہم لوٹ آئے ہیں

سمجھوتہ کر نہ پائے جو حالات وقت سے
دنیا نے ان کی راہ میں کانٹے بچھائے ہیں

برسوں کے بعد آج ملے ہیں وہ اے بشیر
دل میں جراحتوں کے چمن مسکرائے ہیں

جعفر عسکری

گزر رہے ہیں شب و روز اک سفر کرتے
رہِ حیات سے کس سمت ہم سفر کرتے

علاج تشنہ لبی گر نہیں تو کیا غم ہے
تلاش ہم بھی کوئی ساغرِ نظر کرتے

اگا نہ کوئی شجر خواہشوں کے صحرا میں
خیال خشک ہوا اس زمیں کو تر کرتے

شکستگی میں رہا ایک حوصلہ اکثر
عبور ہم بھی مضافاتِ بحر و بر کرتے

سفر ہے اپنا اندھیرے سے روشنی کی طرف
لگے گا وقت سیہ منزلوں کو سر کرتے

قدم قدم پہ کھڑی ہیں عدو کی دیواریں
طویل راہ کو کس طرح مختصر کرتے

تمام شہر ہوا مقتلِ وفا جعفر!
ملے جو کوئی مسافر تو باخبر کرتے

ڈاکٹر خلیل احمد مشیر

حالی کی شاعری کا اصلاحی پہلو

حالی کے مزاج میں بلا کی سادگی، سنجیدگی، متانت اور کسر نفسی تھی وہ اپنے عصر کے بدلتے ہوئے ہر مزاج سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان کے دل میں قوم کے لیے درد اور سینے میں سوز تھا۔ وہ ملک میں قومی عزت و وقار کے خواہشمند تھے۔ وہ آئین نو اور طرز کہن کا ایک حسین امتزاج ہندستانی تہذیب میں دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی نثر و نظم دونوں کو اس حصول کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کے قلم کی ہر جنبش ملک و قوم کی بھلائی کے لیے تھی۔ وہ ہمیشہ قوم کی خوشحالی اور ترقی کے لیے کام کرتے رہے۔

ان کے تمام ادبی کارناموں میں نیاپن، پختگی اور اصلاحی رنگ نمایاں ہے۔ انھوں نے خلوص دل اور پوری لگن سے نظم و نثر میں اصلاحات کی ہیں۔ ان کا ہر کام جگر کاوی اور جانفشانی کا غماز ہے جو دلوں پر اثر کرتا ہے حالی کی تخلیقات نواہائے جگر سوز ہیں جن سے پژمردہ دلوں میں بھی حرکت پیدا ہوتی ہے۔

انھوں نے بدلتے ہوئے عصری حالات کو سمجھا اور مغربی ادب کو سامنے رکھ کر نئے ادبی رجحانات کو شعر و سخن میں پیش کیا۔ حالی نے اپنے نظریات کی ترجمانی خود ان الفاظ میں کی ہے:

"غزل کی حالت فی زمانہ نہایت ابتر ہے وہ محض ایک بے سود اور دوراز کار صنف معلوم ہوتی ہے چونکہ شاعر کو مبسوط اور طولانی مسلسل نظمیں لکھنے کا ہمیشہ موقع نہیں مل سکتا اور اس کی قوت متخیلہ بے کار نہیں رہ سکتی اس لیے بسیط خیالات جو وقتاً بعد وقت شاعر کے ذہن میں فی الواقع گزرتے ہیں، تازہ کیفیات جن سے اس کا دل روزمرہ کسی واقعہ کو سن کر یا کسی حالت کو دیکھ کر [illegible] ہوتا ہے ان کے اظہار کا کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ بعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتے ان کو قطعہ یا رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جا سکتا ہے اور چند بسیط خیالات جو ایک دوسرے سے کچھ تعلق نہیں رکھتے وہ غزل کے سلسلہ میں بشرطیکہ ردیف اور قافیہ کی ناقابل برداشت قیدیں کسی قدر ہلکی کر دی جائیں منسلک ہو سکتے ہیں۔"

یہی وہ شعری مجبوریہ تھا جس کی روشنی میں حالی کو یہ کہنا پڑا ؎

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

کیونکہ غزل ایک بے لطف کہانی تھی جس میں عشق و محبت، رنج و غم اور وصل و فراق کے خیالی مضامین اندھا مذاق شاعری تھا۔ حالی نے غزل کے اس روایتی انداز کی جو تصویر پیش کی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو:

گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر ... نہ رہی بیر وہ مضمون سمجھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو ہے وہ کہانی بے لطف ... گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں ... لیجیے داغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچیے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر ... کیجیے درد جدائی کی کبھی نقالی
تاکہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح ... وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہ پھر اس کی بھی وہی ہو نہ مثل ... "تجربہ جوں پیر شود پیشہ کند دلالی"

حالی غزل کے مخالف نہیں تھے۔ وہ غزل میں وسعت مضامین چاہتے تھے وہ اسے بے وقت کی راگنی اس لیے تصور کرتے تھے کہ اس میں جدید رجحانات کی شدید کمی تھی اس میں کارآمد اور مفید مضامین نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ

غزل سے تفننِ طبع کا کام لینے کے بجائے تنقیدِ حیات کا کام لینا چاہتے تھے وہ شاعری کو اس کے افادی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے اسی لیے کھل کر اور اعلانیہ کہتے ہیں ؎

سخن میں پیروی کی گر سلف کی
انھیں باتوں کو دہرانا پڑے گا

کیونکہ حالی کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ روایتی شاعری سے اجتماعی زندگی کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے سلف کی پیروی کرنا چبے چبائے نوالے چبانے کے مصداق ہوگا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ان تمام مضامین سے اعراض کیا ہے جو خالص روایتی تھے۔ انھوں نے شاعری میں جو کچھ پیش کیا وہ انفرادی مسائل نہیں، ان کا تعلق کسی فرد سے نہیں بلکہ عوام سے ہے اور وہ اجتماعی زندگی کے ترجمان ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری ذاتی معاملات اور شخصی واردات کے بجائے اجتماعی حالات کی عکاسی کرتی ہے۔

حالی نے بدلتے ہوئے حالات میں مغربی ادب کو بخوبی پرکھا۔ اس کے گہرے مطالعے نے ان کے دل و دماغ پر ایک گہرا اثر چھوڑا۔ اس طرح ان کی معلومات کے لیے نئے دروازے اور نئی راہیں کھل گئیں اور وہ مغربی ادب کے شیدائی ہو گئے۔ جیسا کہ ان کے ان جملوں سے واضح ہے۔

"انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔"

یہی وہ راز تھا جس نے حالی کے منہ سے یہ شعر نکلوایا ؎

حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اس طرح حالی نے شاعری کو ایک نیا موڑ دکھایا۔ اب شاعر کو شعر و ادب کی ایک نئی منزل اور ایک نئی راہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ حالی نے ابتدا سے ہی ایک نئی راہ ڈھونڈھ نکالی تھی۔ انھوں نے بھی روایتی رنگ کو اپنایا ہے۔ انھوں نے بھی اپنی ابتدائی شاعری میں سلف کی پیروی کی ہے اور ان کی سینکڑوں ایسا میوں پر ناز کیا ہے۔

حالی کی ہیں اگر یہی بد ابیانیاں
لے گا نہ کوئی نام ظہیر و رشید کا

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو ۔ یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق ۔ اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنوں کے بعد ۔ شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں ۔ نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے ۔ غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

حالی کے اس روایتی نظریے میں اس وقت نمایاں تبدیلیاں ہوئیں جب انھیں سر سید اور آزاد کی صحبتوں میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا۔ ان ادیبوں کی ہم نوائی نے حالی کو شاعری کا ایک نیا رخ دکھایا جس کا حالی نے فخریہ اعتراف یوں کیا ہے:

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر ۔ شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

شاعروں کے ہیں سب انداز سخن دیکھے ہوئے ۔ دردمندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ

تم تو حالی یہی طرز اپنی نیا ہے جاؤ ۔ طرز شعر فصحا و بلغا اور سہی

ایسی غزلیں سنی نہ تھیں حالی ۔ یہ کہاں سے نکالی تو نے بیاض

حالی بہت ہی خاموش طبیعت تھے۔ ان کی مستقل مزاجی نے انھیں اپنے کام میں جٹے رہنے کی دعوت دی۔ انھوں نے جس نئی طرز فکر کو شاعری میں ڈھالا تھا اس کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں، نکتہ چینیوں کا بازار گرم ہوا، اعتراضات کی بوچھاریں ہوئیں تاہم انھوں نے کسی ایک کی پروا نہ کی اور اپنے مزاج کے مطابق شاعری میں اصلاح کرتے رہے۔ حالی شاعری میں لفظی صنعت گری کے خلاف ہیں۔ وہ شاعری میں افادیت پر زور دیتے ہیں۔ انھوں نے الفاظ کی بندش سے زیادہ مضمون کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ شاعری میں افادیت، اثر آفرینی، اور سلاست روی کو مقدم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ شاعری کے روایتی انداز پر وہ اس طرح نکتہ چینی کرتے ہیں:

ہو دل ٹھٹھول کا جہاں نام فصاحت ۔ واں کون لگا ماننے حالی کے سخن کو

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا | یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا
اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی | بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

غرض حالی شاعری میں مقصدیت اور افادیت کے قائل تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شعر و ادب سے اصلاح و تبلیغ کا کام لیا ہے۔ ان کی شاعری قوم ملک کے بدلتے ہوئے حالات کی ترجمانی ہے۔ اس میں قوم کی ریوں حالی بھی ہے اور رفتار بھی۔ اس میں اگر ایک طرف قوم کی اصلاح ہے تو دوسری طرف معاشرہ پر تنقید بھی۔ مختصر یہ کہ حالی کی شاعری گوناگوں تجربوں اور رنگارنگ کیفیتوں کی ترجمان ہے۔

حالی نے ایک نقاد کی حیثیت سے شاعری میں اصلاحیں کیں۔ ماہر اخلاقیات کی رو سے شاعری کو کذب و افترا اور بے حیائی سے بچایا اور ایک سچے شاعر کی طرح شعر میں صداقت اور اصلیت کے جوہر بھرے۔ غرض حالی نے شاعری کو صالح اور تندرست خون دیا جس سے شعر و ادب میں ایک نئی روح اور نئی امنگ دوڑ گئی۔

حالی کی مشہور "مسدس" کے یہ بند ملاحظہ ہوں جن کی روشنی میں ان کے شعری نظریے کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے:۔

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر | عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر | ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے | عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے | مقرر جہاں نیک و بد کی جزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

دوسری نظم "شعر سے خطاب" بھی ملاحظہ ہو۔ اس نظم کے تمام اشعار شعر و سخن پر ایک مکمل تنقید کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شعر کے لیے حالی نے جو اصول مرتب کیے وہ یہ ہیں۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں | پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام | ہاں سادگی سے آئیو ہرگز نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں | تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو
حیب جائے اپنے سچ سے کہے حاد لوئیں گر | اونچا ابھی نہ کر علم امتیاز تو
عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا | محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو

حالی کا یہ شعری نظریہ ہماری شاعری میں آج بھی اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ ان کے بتائے ہوئے رنگ سخن سے متعدد جدید شعرا نے استفادہ کیا ہے اور آنے والی نسلیں بھی مستفید ہوتی رہیں گی۔ اب شعر و سخن کا جدید تصور سماجی، سیاسی، اقتصادی اور ملکی تبدیلیوں کا رہین منت ہے۔ تغیر پذیر مادی حالات نے ہمارے شعر و ادب کو کئی نئے مسائل حیات دیے ہیں اور ان حالات میں ہمارے شاعر اور ادیب کیا کردار ادا کر سکتے ہیں اس کی طرف حالی نے ہماری توجہ مرکوز کی ہے۔ اب شعر و سخن محض وجد کرنے اور سر دھننے کا ادبی سرمایہ نہیں بلکہ کچھ ضروری مسائل کو حل کرنے، ہماری قومی عظمت کو بیدار کرنے اور ہمارے اخلاق کو بلند کرنے کا موثر ذریعہ ہے جس کی پیش قدمی حالی نے کی ہے۔

★

ڈاکٹر ھکوؑ

(صفحہ ۱۶ کا بقیہ)

زندگی کا سارا مزا لوٹ لیا تھا، دو روز تک دماغ و دل ماؤف رہے اور تیسرے روز لکھنؤ واپس آیا۔ پھر کہاں ڈاکٹر ہکو اور کہاں میں!

فیض آباد سے واپسی پر یہ اندوہناک خبر بھی سنی کہ ان کے قتل کے پہلے ان کے کتے مر گئے تھے، غالباً ان کو زہر دے دیا گیا تھا۔ یہ سانحہ ایسا تھا جس سے ان کو چونک اٹھنے کے لیے زبردست جھٹکا پہنچنا چاہیے تھا گر وہ ایمان و ایقان کی ایک ایسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار تھے جس کو بڑے سے بڑا زلزلہ بھی جنبش میں نہیں لا سکتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ ان کا قتل ہوا اور شہر بھر میں جس نے بھی یہ المناک خبر سنی دم بخود رہ گیا۔ در و دیوار نے ان کا غم منایا اور ہر طرف صف ماتم بچھ گئی۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

★

یہ ہے اپنا ہندستان

عبرت بہرائچی

سندر سندر کوہستان
راجستھانی ریگستان
گنگا جمنا کا میدان
جس میں کلیوں کی مسکان
بوس اور شیکھر کی جو جان
جو ہے ٹیپو کا ارمان
نہرو تھے جس پہ قربان
جس میں باپو کا بلدان
جس میں خواجہ ہیں مہمان
جو ہے خسرو کا استھان
جس میں نانک کا ہے گیان
جو ہے گوتم کا ابھیمان

مندر مسجد کی یہ جان
جس میں گیتا اور قرآن
جس میں ملتا ہے ایمان
جس میں سنتوں کی تان
گزرے تلسی سے ودوان
جس میں میرا کے ہیں گان
پیدا جس سے ہیں رس کھان
جس میں غالب کا دیوان
ندیوں کے ہیں جس میں جال
جس کا سندر نینی تال
جس کی مٹی مالا مال
رشیوں منیوں کی جو جان

کانٹا کانٹا جس کا پھول
جس کی ماٹی ہے بھبھول
جس کا رکشک ہے ترسول
جس کو حاصل ہے سمان
میٹھی میٹھی جس کی زبانی
اوڑھے چندریا ہو دھانی
امرت روپی جس کا پانی
جس کا دنیا پہ احسان
جس کے دم سے ہے اجیارا
جس کا کرہ کرہ ہے نظارا
سب کی آنکھوں کا جو تارا
عبرت جس پہ ہے قربان

قدم بڑھائے چلیں

مہدی پرتاپگڈھی

پھر ایک اور سفر کا چلو کریں آغاز
عجب نہیں کہ ترقی کا در ملے پھر باز
یہ فاصلہ کہ جو حائل ہے آج اور کل میں
چلو! یہ رات کا صحرا عبور کر جائیں
اٹھو! یہ خون کا دریا عبور کر جائیں
یہ مانتا ہوں کہ ہر لمحہ ہے ستم ساماں
دل و جگر میں اترتا ہے صورت پیکاں
ہر آن ہوتے ہی جاتے ہیں کچھ گراں حالات
ہر آن ذہنوں کو تخریب کرتی ہے مصلوب
ہمارا جذبۂ تعمیر تو نہیں معتوب
سیاہ رات سے ہرگز نہ ہوں گے ہم مرعوب
گزرتی ساعتیں آواز دیتی جاتی ہیں
یہ رات! سخت و گراں، جلد بیت جائے گی
سکون لے کے پھر اک نئی صبح آئے گی
ہم ایک اور سفر کا چلو کریں آغاز
کسی طرح کریں انسانیت کو سرافراز
جہاں میں امن و مسرت کے پھر کریں در باز
دیئے جلاتے چلیں ہم شعور و محنت کے
جہاں میں گاڑ دیں جھنڈے بشر کی عظمت کے
بجھا دیں شعلے چلو! نفرت و کدورت کے
مظاہرے کریں ہر گام پہ محبت کے

جب اپنے ذہنوں میں پیدا ہو عزم گل بیزی
مزاج سنگ کو آئے شعور شیشہ گری
سرور نو سے دل کائنات مہک اٹھے
گل نشاط سے ساری زمیں مہک اٹھے

یوسف ناظم

عشق کا تعلق جیب سے

گرم چیزیں یوں صحت کو نقصان پہنچاتی ہیں لیکن دو چیزوں کا گرم ہونا بہت ضروری ہے۔ پہلی چیز ہے کھانا ویسے دیکھا جائے تو کھانا، چاہے کیسا ہی کیوں نہ ہو، بڑی کار آمد چیز ہے اور ہر قسم کی ردّی چیز کھائی جا سکتی ہے لیکن پکے ہوئے کھانے کی بات ہی اور ہے۔ اگر جنت میں بھی دہکتے ہوئے کوئلوں پر پکا ہوا کھانا دستیاب ہوتا تو شاید ہم دنیا کا رخ بھی نہ کرتے۔ کھانے کا لطف ہی اٹھانا ہے تو صرف پکا ہوا کھانا کافی نہیں، یہ کھانا گرم بھی ہونا چاہیے۔ گرم کھانے میں وہی لطف ہے جو عمر خیام کی رباعی میں ہے۔ آدمی چاہے کتنا ہی گرم مزاج ہو گرم کھانا اسے بالکل ٹھنڈا کر دیتا ہے اور آدمی قلفی کی طرح پگھل جاتا ہے۔ ٹھنڈا کھانا مجبوری کے طور پر کھانا پڑے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ریاضی کا کوئی سوال حل کرنا پڑ رہا ہو۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ شوہر اگر کھانے کے وقت پر گھر نہ پہنچے تو کھانا ٹھنڈا اور بیوی گرم ہو جاتی ہے دسترخوان پر گرم بیوی مفید نہیں ہوتی۔

دوسری گرم چیز جو زندگی گزارنے کے لیے بہت ضروری ہے گرم جیب ہے۔ وہ جیب جو صرف فیشن کی ترقی کا باعث ہو، زندگی کے اہم مسائل حل نہیں کر سکتی۔ صحیح جیب اسی جیب کو کہا جائے گا جو گرم ہو۔ گرم جیب کے کمالات بے حساب ہیں۔ یہ آدمی کو راکٹ کے بغیر آسمانوں میں اڑائے رکھتی ہے۔ آدمی کی جیب گرم ہو تو کلچرل جلسوں کی صدارت، ادبی محفلوں کی نظامت، محلّے والوں کی قیادت، اور بڑے لوگوں کی رفاقت، اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے۔ لیکن یہ صدارتیں اور رفاقتیں، معمولی چیزیں ہیں ان سب چیزوں سے بڑھ کر گرم جیب والوں کو جو چیز نصیب ہوتی ہے وہ عشق کی کرامت ہے۔ جیب گرم نہ ہو تو عاشق تھوڑی دور آگے چلنے کے بعد ریورس میں چلنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اگر وہ خود واپس نہ لوٹے تو اس کی محبوبہ استعفا دے دیتی ہے اور عشق اکیلے آدمی کا کام نہیں اس میں ایک اور شریک کار ضروری ہے۔ اسے چاہے رفیق کہیے یا فریق۔ عشق کے میدان میں اب مجنوں کی دیوانگی اور فرہاد کی مردانگی کام نہیں آتی عشق کی شرط اب یہ نہیں ہے کہ عاشق دودھ کی نہر کھود دے۔ اگر اس کی جیب میں آئس کریم اور کلک شیک کے لیے رقم نہیں ہے تو عاشق کو اپنا عشق اچھے دنوں کی امید میں ملتوی کر دینا چاہیے اور کسی چڑیا خانے میں جا کر بندروں کے پنجرے کے سامنے کھڑے ہو جانا چاہیے کہا جاتا ہے کہ ناکام عاشق کا دل بہلانے کے لیے بندروں سے بہتر اور کوئی جانور اب تک پیدا نہیں ہوا۔

عشق کا تعلق اگر جیب سے نہ ہوتا تو لوگ اپنی اپنی محبوباؤں سے ہرگز ہرگز شادی نہ کرتے۔ وہ شوہر جو پہلے اپنی محبوبہ کے عاشق اور اب اس کے شوہر ہیں، کہتے ہیں کہ محبوبہ کے ساتھ شادی کر کے اسے گھر میں بیوی بنا کر رکھنا اتنا مہنگا نہیں جتنا محبوبہ کے ساتھ ہر شام کو باہر گھومنا مہنگا تھا محبوبہ کی فرمائش اور بیوی کی فرمائش میں فرق یہی ہے کہ ان میں سے ایک حکم ہے اور ایک درخواست۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بیوی کی آسائش پر اتنا خرچ نہیں آتا جتنا محبوبہ کی آرائش پر آتا ہے۔ لیکن عشق کے لیے شادی کی آرائش کوئی رکاوٹ نہیں۔ جیب گرم ہے تو صرف ایک عشق، عشق نہیں کہلاتا۔ پہلا عشق، ابتدائی عشق کی تعریف میں آتا ہے اور ایک عشق کو غالب نے صلل داغ کا نام دیا ہے عشق تعداد میں بہت ہوں تو انھیں فال نیک سمجھا جاتا ہے اعلا سوسائٹی میں شادی سے پہلے عشق لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے کیوں کہ شادی کے بعد بیوی سے عشق نہیں کیا جا سکتا اس عمل سے سوسائٹی پر برا اثر پڑتا ہے۔ شادی سے پہلے لڑکے لڑکی کا میل ملاپ، ریہرسل کہلاتا ہے۔ پبلک کے سامنے ڈراما پیش کرنے سے پہلے، مشق ضروری ہے شادی کو اگر پریمیر شو کا نام دیا جائے تو شادی سے پہلے کے میل ملاپ کو پریس شو کہا جا سکتا ہے عاشق کی جیب جتنی گرم ہوگی اس کی قسمت میں اسی حساب سے بے شمار پریس شو ہوں گے۔ اگر عاشق کی جیب بہت ہی گرم ہو تو اس کی پوری زندگی پریس شو کرتے کرتے گزر سکتی ہے۔

اس لیے ایک تجربہ کار باپ نے اپنے نوجوان لڑکے کو نصیحت کی کہ عاشقی اور شراب نوشی میں سے وہ کوئی ایک چیز اختیار کرے۔ سعادت مند بیٹے نے پوچھا کہ آپ میرے لیے کس چیز کو پسند کریں گے۔ عاشقی یا شراب نوشی۔ تو عقل مند باپ نے مشورہ دیا کہ میاں شراب نوشی تو بڑھاپے میں بھی کی جا سکتی ہے — فرزند ارجمند اسی مشورے پر عمل کر رہے ہیں۔ لیکن دنیا میں ایسے ہونہار بیٹے کتنے ہیں؟

عشق کا تعلق جیب سے ہوتا ہے اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ عشق میں محبوباؤں کو خوابوں کی شہزادی اور عاشقوں کو خوابوں کا شہزادہ کہا جاتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ شہزادیاں اور شہزادے مفلس نہیں ہوا کرتے۔ اپنے اپنے خوابوں کی شہزادیوں اور شہزادوں کے انتظار میں یہ لوگ اپنی شادیاں ملتوی نہیں کرتے۔ ایک لڑکی کو البتہ اس کے خوابوں کا شہزادہ شادی سے

پہلے ہی مل گیا اس لڑکی کی سہیلی نے جب اس سے پوچھا کہ آخر تم فیروز کو اتنا کیوں پسند کرتی ہو تو اس لڑکی نے جواب دیا کچھ نہیں بس فیروز کی چھوٹی چھوٹی چیزیں مجھے بہت پسند ہیں مثلاً اس کا چھوٹا سا بنگلہ، چھوٹی سی ریس کار، چھوٹی دخانی کشتی اور اس کی چھوٹی سی آئل کمپنی۔ شاید اس لڑکی کی خواہش یہ بھی ہو کہ اگر فیروز سے اس کی شادی ہو جائے تو اور چیزوں کی طرح فیروز کی عمر بھی چھوٹی ہی ہو۔ ایسی محبوبائیں صرف ایک ہوتے ہیں مطمئن نہیں ہوا کرتیں لاٹری کا انعام زندگی میں دو چار بار ملے تو کیا حرج ہے'

زمانہ اب اتنا تیز بھاگ رہا ہے کہ پیدل عشق اب اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ عشق کے لیے اب وہ موٹر کار درکار ہے جس میں شوفر کی نشست بائیں طرف ہوتی ہے۔ جس موٹر کار میں دائیں طرف بیٹھ کر کار چلانا پڑے اس میں عاشق صرف بایاں ہاتھ ہی اسٹیرنگ سے اٹھا سکتا ہے اور عشق بائیں ہاتھ کا کھیل نہیں عشق میں سیدھے ہاتھ سے بل ادا کرنے پڑتے ہیں۔

پہلے زمانے میں عشق کرنے کے ٹھکانے بھی کم تھے بلکہ تھے ہی نہیں۔ اب ہر بڑے شہر میں لوّ لین (LOVE LANE) قائم ہے اس دور میں ہر شخص کی ضرورتیں پوری ہونی چاہئیں۔ کوچۂ عشق میں آدمی تنہا بھی جائے تو خالی ہاتھ واپس نہ ہوتا۔ لیکن پہلے ہی اپنا انتظام کر لینا مفید ہوتا ہے۔

محبوبائیں اب عاشقوں کے لکھے ہوئے لمبے چوڑے محبت ناموں سے خوش نہیں ہوتیں انھیں عاشق کے صرف وہ دستخط پسند آتے ہیں جو چیک پر کیے گئے ہوں اور سب سے اچھے دستخط وہ ہوتے ہیں جو سادے چیک پر کیے جائیں۔ سادے چیک پر دستخط کرنے والے کو عاشق صادق کا خطاب دیا جاتا ہے پہلے عشق کرنے کے لیے سر کی سلامتی ضروری تھی اب صرف جیب سلامت رہے تو کسی محبوبہ کی مجال نہیں کہ وہ عاشق کی ملامت کرے۔ اب عشق کرنے کے لیے اعلا درجے کے مکالمے بولنا ضروری نہیں۔ صرف جیب کی کھنک کافی ہے۔

دنیا میں جب تک روپیہ ایجاد نہیں ہوا تھا عشق بھی نمودار نہیں ہوا تھا۔ روپے کے چلن اور عشق کے چلن کی عمریں تقریباً ایک ہی ہیں۔ دو چار سال کے فرق کو فرق نہیں گنا جاتا۔

★

ڈاکٹر ایم چنا ریڈی۔ میری نظر میں۔ (صفحہ ۳۰ کا بقیہ)

(صفحہ ۳۰ کا بقیہ)

کو مراعات دی جائیں گی۔ دراصل ڈاکٹر ریڈی کی جد و جہد اور مسلسل قربانیوں کا یہ شاندار نتیجہ تھا۔

ڈاکٹر ریڈی بڑے جانباز اور نڈر انسان ہیں۔ وہ اپنی دھن کے پکے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی لگن میں ہر وقت مشغول رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھی ہمیشہ ان پر مکمل اعتماد اور بھروسہ کا اظہار کرتے ہیں ان کا سیاسی کردار ہنگامی اتار چڑھاؤ سے بھرپور ہے اس موقع پر بھی ان کے ساتھی ان کے پیچھے آہنی دیوار کی طرح کھڑے رہے۔ کیوں نہ ہو ڈاکٹر صاحب نے بھی تو اپنے ساتھیوں کو کبھی بھی امتحان کے وقت دھوکا نہیں دیا۔

ڈاکٹر ریڈی میں ایک مقناطیسی جوہر ہے جو نوجوانوں اور طلباء پر جادو کا اثر کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ ان سے رابطہ رکھتے ہیں اور اس رشتہ کو قایم رکھنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اگر ایک طرف خدا نے ان کو ایک اچھی توانائی اور تندرستی عطا کی ہے تو دوسری طرف وہ عوام سے بھرپور پیار و محبت کا اظہار کرتے ہیں اور وہ گیتا کے اصول "نشکام کرم" کو صرف مانتے ہی نہیں بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہیں پابندی اوقات اور ہر معاملہ کی تفصیل سے باخبر رہنا ان کا سب سے بڑا وصف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی کاہلی اور نااہلی کے شکار نہیں ہوتے۔ ایک سچے دوست کی حیثیت سے ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور وقت پڑنے پر وہ اپنے دوست کا ساتھ اسی طرح دیتے ہیں کہ ان کی ہر دلعزیزی پر بھی آنچ آنے کا خطرہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ بڑے ذکی اور فہیم ہیں اور دشمن پر بھرپور حملہ کرنا خوب جانتے ہیں بڑے جذباتی ڈھنگ سے وہ بات چیت کرتے ہیں اور بحث مباحثے میں سننے والے کو اپنے دلائل سے قائل کر لیتے ہیں ان کو تمام بنیادی مسائل پر پوری طرح سے عبور حاصل ہے

ڈاکٹر ریڈی کا گورنری پر فائز ہونا انھیں کے الفاظ میں سیاست کا ایک دوسرا موڑ ہے۔ وزیر اعلیٰ بھوگنا جی کے ساتھ وہ ایک مکمل ٹیم کے حصہ دار بنیں گے۔ دونوں کی عمریں لگ بھگ ایک ہیں اور یہ امید کی جاتی ہے کہ ڈاکٹر چنا ریڈی اپنے وسیع تجربات اور سیاسی پس منظر کی بنا پر اتر پردیش کو ملک کی کسی ریاست سے پیچھے نہ رہنے دیں گے۔

★

افتخار احمد فخر

پروفیسر نثار اٹاوی مرحوم ــــ دبستانِ سیماب کا ایک نمائندہ شاعر

نثار حسین نام، نثار تخلص۔ وطنِ مالوف اٹاوہ (یوپی)، تاریخ ولادت یکم مارچ ۱۹۱۴ء[۱]۔ آبائی پیشہ تجارت و کاشت کاری تھا۔ ۱۹۲۹ء میں ہندی مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ انٹر کالج اٹاوہ میں داخلہ لیا مگر خانگی مجبوریوں کی بناء پر انجمن ہدایت الاسلام میں معلمی اختیار کرلی۔ چونکہ تعلیمی رجحان بہت تھا اس لیے دوران ملازمت میں سلسلۂ تعلیم جاری رکھا اور تعلیمی مدارج بہت جلد طے کرلیے ۱۹۳۲ء میں اردو مڈل کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۳۳ء میں اردو اعلیٰ قابلیت اور انگریزی مڈل کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۳۴ء میں الہ آباد بورڈ سے ہائی اسکول کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور ۱۹۳۵ء میں ہندی دستیش دوگتا کا امتحان بھی پاس کیا۔ فارسی اور سنسکرت میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ آگرہ یونیورسٹی سے درجہ اول میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ تقریباً چالیس سال سے اسلامیہ کالج اٹاوہ کے شعبۂ اردو سے منسلک رہے اور عرصہ سے اس کالج کے شعبۂ اردو کے صدر تھے۔

۱۹۶۶ء میں یوپی گورنمنٹ نے پروفیسر نثار اٹاوی کی تعلیمی سماجی اور ادبی خدمات کے پیش نظر مبلغ پانچ سو روپیہ نقد، سند اور مڈل سے نوازا۔ زمانہ طالب علمی میں اپنے اسکول کے صدر مدرس جناب غفور رشید اٹاوی سے فیض حاصل کیا۔ نثار احمد صاحب ۱۹۳۲ء میں علامہ سیماب اکبرآبادی کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہوئے[۲]۔ غزلیات کے علاوہ رباعیات اور نظمیں بھی کہتے تھے۔ چونکہ آزادیٔ وطن کی تحریک سے بھی وابستہ رہے اس لیے خاص طور پر نظموں میں سیاست ہی کو موضوعِ سخن بنایا۔

۲۴ فروری ۱۹۳۵ء کو انہوں نے سیماب لٹریری سوسائٹی کا افتتاح کیا۔ اس سے قبل "بزم ادب"، اٹاوہ کے آپ سکریٹری بھی رہے۔ نثار (اٹاوی) کے تلامذہ کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ زندگی کے ابتدائی دور میں بیشتر آلام و مصائب سے سابقہ پڑا جس نے طبیعت میں سوز و گداز پیدا کردیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار نہایت پُرتاثیر ہوتے ہیں۔

۱۹۳۴ء میں استاد علامہ سیماب سے فارغ الاصلاح ہونے کی سند پائی[۳]۔ چونکہ اٹاوہ سے آگرہ کچھ زیادہ دور نہیں ہے اس لیے انھیں اپنے استاد کی خدمت میں حاضر رہنے کے بیشتر مواقع ملے۔ حضرت سیماب خود بھی نثار اٹاوی کو ان کے علم اور ان کے فکر و نظر کی وجہ سے بہت چاہتے تھے۔ انھیں حضرت سیماب سے بے حد قربت حاصل رہی۔

(۱) آپ کی تصانیف میں "ماہ و انجم"، مکتبہ شان ہند دہلی سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی جس میں ۱۹۵۲ء تک کی غزلیات اور رباعیات کا انتخاب ہے۔

(۲) جدید تاریخ ادب اردو (نظم) پرنسپل عبدالشکور کے ساتھ انھوں نے

---

[۱] حضرت اعجاز صدیقی نے ناگپور یونیورسٹی سے لکھا ہے جو غالباً درست نہیں۔ ملاحظہ ہو "شاعر" مئی جون ۷۴، ۶۹ ص ۱۳۔ [۲] "کاروانِ نمبر" شاعر آگرہ میں ۱۹۳۲ء درج ہے۔ ص ۲۳ حکمۃ الوارث "مبئی پ سیماب نمبر" میں سن تلمذ ۱۹۳۱ء درج ہے ص ۱۵۷۔ [۳] حکمہ مدیر "شاعر" ممبئی نے لکھا ہے کہ "نثار اٹاوی ۱۹۳۴ء میں والد مرحوم علامہ سیماب کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے تھے اور جلد ہی سال میں فارغ الاصلاح ہو گئے تھے" ملاحظہ ہو "شاعر" بمبئی مئی و جون ۱۹۷۴ء ص ۱۳۔

مرتب کی تھی مگر ہنوز اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی ہے۔

(۳) حسرت موہانی نے سوانح و انتخاب ہندی میں ہے [1]

نثار اٹاوی کا کلام ملک کے معروف جرائد و اخبارات میں شائع ہو کر اہلِ نظر اور صاحب ذوق حضرات سے خراجِ تحسین وصول کرتا رہا ہے۔ آغاز شاعری میں بھی روایت پرستی کے باوجود ان کے یہاں حقیقی جذبات و تاثرات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

الم پسند طبیعت ازل سے لایا ہوں قدم قدم پہ غم زندگی بکار مجھے
مری نظر نے کیا جذب رنگ لالہ و گل مری بلا سے اگر موسم بہار نہ ہو

پھر آہستہ آہستہ ان کے لہجہ میں یا یہ مضامین میں ندرت اور انداز بیان میں شگفتگی پیدا ہونے لگی جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے [2]

کی آپ نے دفا تو بصد شکریہ قبول تھی بھی مجھے وفا کی، تمنا نہیں بھی تھی
یہ بھی بجا کہ در نہ ترا کرسکے تلاش یہ بھی ہوا کہ ہم ترے در سے گذر گئے
گذر جاتی ہے ساری زندگی بجلی کے سایہ میں بڑی مشکل سے ہوتا ہے مذاق آشیاں پیدا
یقیں والے پرستارِ توہّم ہو نہیں سکتے جو منزل آشنا ہیں، وہ کبھی گم ہو نہیں سکتے
سنے گا کون ایسے ڈوبنے والوں کی فریادیں جو دریا میں ہم آوازِ تلاطم ہو نہیں سکتے
یقیناً رہبر منزل کہیں پر راہ بھولا ہے وگرنہ قافلے کے قافلے گم ہو نہیں سکتے

ماحول کی عکاسی اور حیات پر تنقید کے وقت بھی فن کی نزاکتوں اور احساس جمال کی لطافتوں سے نثار اٹاوی بے اعتنائی نہیں برتتے بلکہ اپنے فن کو اس معیار پر بھی برقرار رکھنے کی انھوں نے پوری کوشش کی ہے۔ بقول ناز تشنہ پرتابگڈھی "نثار اپنی غزلوں سے نظم کا کام لیتے ہوئے بھی تغزل کے تیور خراب نہیں ہونے دیتا۔ اور غزل کا مزاج پہچانتے ہوئے بھی اس کی خصوصیات کو برقرار رکھتا ہے اور نثار کی یہی کامیابی اس کے شاندار مستقبل کی ضامن ہے" [3]

اثر لکھنوی نے ان کی تصنیف "ماہ و انجم" کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ :-
"نثار صاحب ان معدودے چند شاعرانِ حال میں ہیں جنہوں نے جدّت اور تازگی کے ساتھ ساتھ ماضی کی روایات کو پسِ پشت نہیں ڈالا۔ ... بلکہ قدیم ہئیت برقرار رکھتے ہوئے گلہائے نو بہ نو کھلائے ہیں ... نثار صاحب کے کلام میں اچھی شاعری کی تمام تر خصوصیات موجود ہیں" [3]

اور اسی ماہ و انجم کے مقدمے میں پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے نقد و تبصرہ کی روشنی میں یہ رائے دی ہے کہ :

"یہ درست ہے کہ ان کے اشعار میں میر کا درد، غالب کی رفعت، حالی کی گہرائی اور اقبال کی گیرائی نہیں ہے لیکن ان کی اپنی انفرادیت ہے جو جلد یا بدیر ہماری شاعری میں اپنی جگہ حاصل کر کے رہے گی۔"

دوسری جگہ رقمطراز ہیں "ان کی بہت سی غزلوں میں ماحول کا سیاسی رنگ پایا جاتا ہے۔ جن میں تیز نشتر ہیں گہرا طنز ہے اور تعمیری وار نقار کے جذبے۔ ان غزلوں سے نثار کی سیاسی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ شعر کی لطافت مجروح نہیں ہو سکتی وہ ایسے لطیف اشاروں اور کنایوں سے بات کرتے ہیں جو دل میں چبھ جاتی ہے" [3]

میں غریب شہر ہوں کیا خبر مجھے غم کی شام کہاں ہوئی
نہ چراغ انجم و مہ جلے، نہ جرس بجے نہ اذاں ہوئی

کیسے ایسی بارش میں بجلیوں کو ٹھکرا دوں
گرتی پڑتی آتی ہیں میرے آشیانے تک

حفاظت خود ہی کر لیتی ہے تقدیس چمن اپنی
جو وقت آئے تو گل کی پنکھڑی تلوار ہوتی ہے

میکشو خونِ تمنا ہی سہی
کچھ نہ کچھ چھلکا تو خالی جام سے!

نثار اٹاوی کے کلام پر یہ رائیں اور ان کے مندرجہ بالا اشعار کافی پرانے ہیں۔ مگر ادھر آٹھ دس سال میں نثار نے اپنی غزل کو ایسے ارتقاء اور ارتفاع تک پہنچا دیا ہے جس پر اردو غزل بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔

فکر و اسلوب کی تازگی کے اعتبار سے نثار اٹاوی صف اول کے غزل گو شعراء میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔ لیکن افسوس کہ ان کی طرف نقادانِ عصر حاضر نے وہ توجہ نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے۔ خود نثار اٹاوی صدر جہ

---

[1] انھوں نے سادہ ہندی بحور میں بھی متعدد غزلیں کہیں۔ یہ غزلیں رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔ اور پھر ہندی رسم الخط میں "دھرتی میرے پیار کی" کے نام سے شائع ہوئیں۔ اس مجموعہ میں کچھ نظمیں بھی تھیں" ملاحظہ ہو "شاعر" مئی و جون ۴، ص۱۳ [2] شاعر ممبئی۔ مارچ اپریل ۱۹۵۲ء، ص۹ تا ص۱۵

[3] ماہ و انجم ص۵، ص۱۲

بے نیاز اور خاموش قسم کے انسان تھے۔ اور نہ ہی عام طور پر اپنا کلام اشاعت کے لیے مقتدر ماہناموں کو بھیجتے تھے۔ کبھی کبھی رسالہ شاعر بمبئی میں ان کا تازہ کلام نظر سے گزرتا تھا۔ اسی رسالہ سے انکی ایک نئی غزل بطور نمونہ کلام پیش کی جارہی ہے:

مجھے تو حسن کی معصومیت سے ڈر ہی لگے — اگر وہ عیب بھی کوئی کرے ہنر ہی لگے
نسار اہل زمانہ کا سنگ باری ہے — ہدف ہے کون؟ یہ مطلب نہیں کہ ہی لگے
مرا فسانۂ ہستی ہے کس قدر دلچسپ — تمام عمر کہوں پھر بھی مختصر ہی لگے
سما گئی ہے وہ صورت کچھ ایسی نظروں میں — خدا کبھی سامنے آجائے تو بشر ہی لگے
جنوں نے گوشۂ صحرا میں آکے کیا پایا! — یہاں بھی ہیں وہی ویرانیاں کہ گھر ہی لگے
بہت بلند سہی میری فکر کی پرواز! — مگر اڑوں تو تماشائے بال و پر ہی لگے
فریب خوردگیٔ انتظار، ارے توبہ — ہر ایک پاؤں کی آہٹ قریب در ہی لگے
سمٹ سمٹ کے میں رہا ہر ایک سے تا در — سحر بھی راہ میں وا ماندۂ سفر ہی لگے
مزاج عشق ازل ہی سے ہے برا ہمی — شتار آگ کا شعلہ بھی رہگزر ہی سے لگے

راقم الحروف کو اپنے ریسرچ کے دوران شتار اٹاوی سے مراسلت کا موقعہ ملا وہ بڑے پرخلوص صلح کل اور امن پسند انسان نظر آئے۔ استفسارات کے جوابات اور مواد کی فراہمی کی نشاندہی میں بڑی فیاضی سے کام لیتے تھے۔ اپنے استاد مرحوم علامہ سیماب اکبرآبادی سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ ان پر کئی مضامین لکھے ہیں۔ نقوش لاہور کے مکاتیب نمبر میں استاد مرحوم کے چند خطوط بھی اشاعت کے لیے دیے تھے۔ اور شخصیات نمبر میں اپنے استاد سیماب اکبرآبادی کی شخصیت پر ایک حاصل مضمون سپرد قلم فرما کر حق شاگردی ادا کر دیا ہے۔ اپریل ۷۶ء کے شمارہ شاعر میں ان کی ایک غزل اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ شاید یہ میری آخری غزل ہو۔ مجھے کینسر ہو گیا ہے جو لاعلاج مرض ہے۔ کسے خبر تھی کہ واقعی یہ ان کی آخری غزل ہوگی کیونکہ اس کے ایک ماہ بعد ہی ۶ مئی ۷۶ء کو وہ اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ افسوس کہ بالآخر ایک انسان شاعر چل بسا۔

آخری بار شتار اٹاوی اکتوبر ۷۲ء میں سر سنگار سمند کے مشاعرے میں شرکت کی غرض سے بمبئی بھی آئے تھے اور پھر ۳۰ نومبر ۷۳ء کو شتار اٹاوی مرحوم نے مدیر شاعر بمبئی کو اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ .... ادھر میرے ریٹائرمنٹ کی تاریخ یکم مارچ ۷۶ء ہے۔ توسیع ملازمت کے لیے درخواست دے رہا ہوں اگر صحت نے ساتھ دیا تو کچھ نہ کچھ توسیع ہو جائے گی۔ (اسی خط کے آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ) اگر صحت ٹھیک رہی تو انشاء اللہ اسی سال مئی و جون میں بمبئی کا ایک سفر ہوگا۔ راقم (ان کی بڑی بچی) کو بڑودہ سے لے کر بمبئی کی سیر کرتا ہوا آگرہ واپس آؤں گا۔ اس قدر دور کے رشتہ کا بھی تو ایک فائدہ ہے"[1]

مگر اس خط کے ۵-۶ ماہ بعد ہی ۶ مئی ۷۶ء کو بجائے بمبئی کے سفر کے انہوں نے سفر آخرت اختیار کیا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے کسے خبر تھی کہ مئی و جون ۷۶ء میں محترم اعجاز صدیقی کو اپنے موقر جریدہ میں "ایک چراغ اور بجھا" کے تحت انہیں تعزیتی مضمون لکھنا پڑے گا۔ اپنے اس مضمون میں اعجاز صاحب رقمطراز ہیں کہ:

" . مرحوم سے کم و بیش چالیس سال کا نہایت گہرا قلبی تعلق تھا۔ والد مرحوم علامہ سیماب اکبرآبادی کے تلامذہ میں انہیں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ وہ اپنے استاد کے بھی بہت چہیتے تھے۔ بڑا دخل تھا انہیں حضرت علامہ کے مزاج میں . تقسیم سے صرف ایک سال قبل ۱۹۴۶ء میں والد صاحب قبلہ نے انہیں لکھا کہ گزشتہ ۲۰-۲۵ سال میں آئے ہوئے خطوط سے کئی بورے بھر گئے ہیں۔ ان میں سے اہم خطوط گرمیوں کی تعطیلات میں آکر چھانٹ دیجیے۔ چنانچہ وہ آئے اور بیس دن آگرہ میں رہ کر یہ اس کام کو انجام دیا۔"[2]

اس بیان سے مرحوم شتار اٹاوی کی دبستان سیماب سے وابستگی اور نمائندگی کا گہرا ثبوت ملتا ہے اور حضرت مرحوم پروفیسر ضیا بدایونی کی پیشنگوئی بھی درست ثابت ہوتی ہے جس کا تذکرہ اوپر ہوا۔ وہ فرماتے ہیں:

" ادھر سات آٹھ سال سے مرحوم نے روایت سے اپنا دامن بالکل بچا لیا تھا اور ایک ایسا موڑ آیا تھا جو فکر و اسلوب کے اعتبار سے اردو غزل کے دور جدید کا بہترین نمونہ تھا۔ ان کے یہاں کافی انفرادیت ابھر آئی تھی۔ اردو کے ممتاز غزل گو شعرا میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔ کئی نوجوان شعرا کی انہوں نے تربیت کی تھی۔ اور اپنے بعض ایسے خواجہ تاشوں کو بھی انہوں نے مشورۂ سخن دیا جو استاد کی زندگی میں تشنہ اور کمزور رہ گئے تھے . . تقریباً سبھی مشاہیر شعرا سے ان کے روابط و مراسم تھے۔ اور سب ان کی قدر کرتے تھے۔ بے حد خلیق، ملنسار، ہنس مکھ، منکسر مزاج انسان تھے۔ لانبا قد، چھریرا بدن، مشاعروں میں شیروانی، چوڑی دار پائجامہ اور ٹوپی پہن کر شریک ہوتے تھے۔ ترنم میں پڑھنا چھوڑ چکے تھے۔ اور دس بارہ برس سے تحت اللفظ پڑھتے تھے"

---

[1] شاعر بمبئی، مئی و جون ۷۶ء، ص ۱۱ [2] شاعر بمبئی، مئی و جون ۷۶ء، ص ۹-۱۰

سیف بجنوری

غزل

کیا حشر بپا وہ دمِ رفتار کرے ہے
ہر گام پہ سو فتنوں کو بیدار کرے ہے

اس شوخ سے آنکھیں جو کوئی چار کرے ہے
اپنے لیے خود گور وہ تیار کرے ہے

دل ہی کسی ڈھب سے جو نہ بہلے تو کروں کیا
کوشش تو بہت اپنی سی غمخوار کرے ہے

تم کو یہ سمجھ کر بھی کہ دشمن ہو وفا کے
دل کوئی تمھیں دے ہی تو ایثار کرے ہے

آ آ کے دمِ نزع مجھے یاد وہ ظالم
مشکل کو مری اور بھی دشوار کرے ہے

ہوتا نہیں احساس ہی آزارِ نہاں کا
اس ناز سے وہ پرسشِ بیمار کرے ہے

سچ بات یہاں کہنا قیامت ہے کہ دنیا
حق گو کو سپردِ رسن و دار کرے ہے

بت خانے سے کچھ کام ہے دل کو نہ حرم سے
دن رات طوافِ درِ دلدار کرے ہے

ہوتا نہیں دم بھر کو تری یاد سے غافل
کچھ ایسا ترے نام سے دل پیار کرے ہے

رات آنکھوں میں کٹتی ہے تڑپتے ہوئے اے سیفؔ
اس درد سے نالے کوئی بیمار کرے ہے

اشرف مالوی

امر باپو

کون کہتا ہے مر گئے گاندھی
موت گاندھی کو آ نہیں سکتی

جسم مرتا ہے آتما ہے امر — یہی لکھا ہے وید کے اندر
ابھی گاندھی کا نام زندہ ہے — نام ان کا امر ہوا مر کر
آتما کو نہ موت آئے گی
موت گاندھی کو آ نہیں سکتی

حوصلے جن کے پست ہوتے ہیں — خوابِ غفلت میں مست ہوتے ہیں
بیٹھنے والے رکھ کے ہاتھ پہ ہاتھ — آپ اپنی شکست ہوتے ہیں
اس سے واقف تھے خوب گاندھی جی
موت گاندھی کو آ نہیں سکتی

جو اٹھا ظلم کے مٹانے کو — سوئے انسان کو جگانے کو
غیر ممکن ہے خود وہ سو جائے — جو جگاتا رہا زمانے کو
فیض ان کا ہے آج بھی جاری
موت گاندھی کو آ نہیں سکتی

بے سہاروں کا جو سہارا ہے — اس نے ہر ایک روپ دھارا ہے
سر کچلنے کو آیا ہے کوئی — ظلم نے جب بھی سر ابھارا ہے
دوستو بات یہ ہے گیتا کی
موت گاندھی کو آ نہیں سکتی

سچ تو یہ ہے مقام گاندھی کا — چاند تاروں سے ہے بہت اونچا
مٹی چھونے کی یادگاروں سے — آج انسان کچھ نہ پائے گا
تم بنو خود مثالِ گاندھی کی
موت گاندھی کو آ نہیں سکتی

بھکمری دیس سے مٹانا ہے — جو گرے ہیں انھیں اٹھانا ہے
خود جیو دوسروں کو جینے دو — یادِ گاندھی کی یوں منانا ہے
ورنہ اک ڈھونگ ہوگی ہر برسی
موت گاندھی کو آ نہیں سکتی

پی۔ جی۔ گوکھلے

آئین میں اس قدر ترمیم کیوں

دنیا کے مختلف ملکوں میں ویسے تو کئی تحریری آئین رائج ہیں مگر ہمارے ملک کے آئین کی نوعیت قدرے مختلف ہے۔ اس میں اب تک کل ۳۴ ترمیمات کی جا چکی ہیں۔ ترمیمات کی اس کثرت کی بنا پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ آئین میں حد سے زیادہ پیوندکاری کی جا رہی ہے لیکن اگر ہم ان ترمیمات کا گہری نظر سے مشاہدہ کریں تو پتہ چلے گا کہ یہ ترمیمات دراصل ہماری حکومت کی ان کوششوں کی آئینہ دار ہیں جو ملک میں سماجی نظام کے ایک نئے دور کے آغاز کے سلسلے میں کی جا رہی ہیں تاکہ قوم ترقی کی نئی بلندیوں سے ہم کنار ہو سکے۔ ہمارے آئین میں جو اہم ترمیمات کی گئی ہیں اگر ہم ان کے اسباب اور مقاصد کا مطالعہ کریں تو ظاہر ہوگا کہ یہ ترمیمات ان دشواریوں پر قابو پانے کے لیے کی گئی ہیں جو کہ ملک میں ایک ایسے نئے سماجی نظام کے قیام کی راہ میں حائل تھیں جو ہمارے آئین سازوں کی فکر کا محور تھا۔

آئین میں اب تک جو ۳۴ ترمیمات کی جا چکی ہیں ان میں ۱۲ ترمیمات نہایت اہم نوعیت کی ہیں۔ ان اہم ترمیمات میں پہلی، چوتھی، چھٹی، آٹھویں، نویں، ۱۷ویں، ۲۳ویں، ۲۴ویں، ۲۵ویں، ۲۶ویں، ۲۸ویں، اور ۳۰ویں ترمیمات شامل ہیں۔ آیئے اب ہم ان اہم ترمیمات پر ایک نظر ڈالیں۔

آئین میں سب سے پہلی اہم ترمیم ۱۹۵۱ء میں ملک کی بدلتی ہوئی سماجی اور اقتصادی صورتحال کے پیش نظر کی گئی تھی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں آئین کی دفعہ ۱۹ (۱) (جی) کے تحت ملک کے تمام شہریوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی پیشہ یا کام، تجارت یا کاروبار کر سکتے ہیں۔ لیکن مفاد عامہ کے پیش نظر اگر حکومت چاہے تو قانون نافذ کر کے شہریوں کے اس حق پر مناسب پابندیاں عائد کر سکتی ہے۔ ویسے تو یہ فقرے اپنی جگہ بڑے جامع اور وسیع ہیں اور اس کے مطابق حکومت کسی بھی چیز کو قومی تحویل میں لینے کی اسکیم بنا سکتی ہے۔ تاہم یہ محسوس کیا گیا کہ آئین کی دفعہ ۱۹ (۶) میں ترمیم کر کے اس امر کی مزید وضاحت کر دی جانی چاہیے تاکہ اس سلسلے میں کسی قسم کے شک کی گنجائش باقی نہ رہے۔

اس موقع پر آئین کی جس دوسری دفعہ میں ترمیم کی گئی وہ تھی دفعہ ۳۱ کیونکہ اس دفعہ کے سلسلہ میں کئی ایسی دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں جن کی آئین مرتب کرتے وقت کوئی امید نہیں کی گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ریاستی مجالس قانون ساز نے دفعہ ۳۱ کی ذیلی دفعہ (۴) اور (۶) کے تحت اصلاحات اراضی سے متعلق جو اقدامات منظور کئے ان کی قانونی حیثیت کے بارے میں ایک بحث اٹھ کھڑی ہوئی۔ عدالتوں میں مقدمہ بازی شروع ہو گئی جس کی وجہ سے ان اہم اقدامات پر عمل درآمد میں کافی تاخیر ہونے لگی اور اس سے بہت لوگ متاثر ہونے لگے۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ ضروری ہو گیا کہ آئین میں ترمیم کر کے اصلاحات اراضی کے سلسلے میں درپیش قانونی دشواریوں پر قابو پایا جائے۔ چنانچہ دفعہ ۱۹ میں مناسب ترمیم کر کے زمینداری کے خاتمہ سے متعلق قوانین نیز ریاستی سرکاروں کے کچھ خصوصی قوانین کو آئینی طور پر جائز قرار دیا گیا۔ پارلیمنٹ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کئی دوسری دفعات میں بھی معمولی ترمیمات کیں تاکہ آئندہ پیدا ہونے والی مشکلات پر

قابو پایا جاسکے۔

آئین کی دفعہ ۴۶ سرکاری پالیسی کے لئے ایک رہنمایانہ اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس دفعہ میں کہا گیا ہے کہ حکومت کو عوام کے کمزور طبقوں کے تعلیمی اور اقتصادی مفادات کو فروغ دینے نیز ان کو ہر قسم کی سماجی ناانصافیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے خصوصی توجہ کرنا چاہیئے۔ اس دفعہ کے مطابق اگر حکومت عوام کے کسی بھی پس ماندہ طبقے کی تعلیمی اقتصادی اور سماجی بہتری کے لیے کوئی خصوصی بندوبست کرے تو اس سلسلے میں کسی قسم کا امتیاز نہ برتا جاسکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے آئین کی دفعہ ۱۵ میں مناسب ترمیم کی گئی

آئین میں چوتھی بار جو ترمیم کی گئی وہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت ہی اہم ہے۔ اس ترمیم کا مقصد آئین کی متعدد دفعات کو ملک کے سماجی نظام کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا تھا۔

دفعہ ۳۱ کی ذیلی دفعہ (۱) اور (۲) کے مطابق حکومت مفاد عامّہ کے پیش نظر شہریوں کی کسی بھی جائداد کو لازمی طور پر حاصل کرنے کی مجاز ہے سپریم کورٹ کے کچھ ججوں نے ان دفعات کے بڑے وسیع معنی نکالنا شروع کردیئے تھے۔ چنانچہ یہ ضروری سمجھا گیا کہ مفاد عامّہ کے پیش نظر پرائیویٹ جائداد کو لازمی طور پر حاصل کرنے کے بارے میں حکومت کے اختیار کی از سر نو تشریح کی جائے اور یہ واضح کردیا جائے کہ حکومت کا یہ اقدام دیگر قوانین کے تحت شہریوں کی جائداد کی قرقی کے اقدام سے بالکل مختلف ہے۔

کچھ ججوں نے اپنے فیصلوں میں بنیادی حقوق کی جو تشریح پیش کی اس سے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے کئی فلاحی اقدامات مثلاً زرعی زمین کی ملکیت کے تحت تعین، لگان دینے والوں کے حقوق شہری اور دیہی علاقوں کی مناسب منصوبہ بندی، گندی بستیوں کی ترقی وغیرہ سے متعلق اقدامات کے سلسلے میں شدید مشکلات پیدا ہوگئیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ ملک کی معیشت کے مفاد کے پیش نظر حکومت کو معدنیات اور تیل کے تمام وسائل کو کلی طور پر اپنے انتظام میں لے لینا چاہیے۔ نیز کسی بھی لائسنس، کانکنی کے پٹوں نیز اس قسم کے دیگر معاہدوں کی شرائط کو حسب ضرورت منسوخ کرنے یا ان میں ترمیم کرنے کا اختیار بھی حاصل ہونا چاہیے۔ عوام کو پانی اور بجلی فراہم کرنے والے اداروں کو بھی سرکاری انتظام میں لینے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

حکومت کو یہ اختیار دینا بھی ضروری ہوگیا تھا کہ وہ عوام کے مفاد کے پیش نظر نیز کسی بھی تجارتی یا صنعتی ادارے یا اس قسم کی دیگر املاک کو اپنے کنٹرول میں لے سکتی ہے اور ان اداروں کے انتظام کو بہتر بنا سکتی ہے۔ حکومت کو یہ اختیار بھی ملنا ضروری تھا کہ وہ عوام کے مفاد کے پیش نظر دو یا اس سے زیادہ کمپنیوں کو آپس میں ضم کرنے یا کسی ادارے کو ایک کمپنی سے دوسری کمپنی کو منتقل کرنے کا حکم جاری کرسکتی ہے۔ ان تمام مقاصد کے حصول کے لئے آئین میں چوتھی ترمیم کا سہارا لیا گیا۔

چھٹی ترمیم بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑی اہم ہے یہ ترمیم ۱۹۵۶ء میں ٹیکس سے متعلق تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کے بعد عمل میں آئی۔ اس کمیشن نے مختلف ریاستوں کے درمیان تجارت کے مسئلے اور تجارتی اشیاء پر لگائے گئے ٹیکس کا جائزہ لینے کے بعد جو سفارشیں پیش کیں ان کو عمل میں لانے کے لیے آئین میں ترمیم کرنی پڑی۔

آئین کی دفعہ ۳۳۴ کے تحت پسماندہ ذاتوں اور پسماندہ قبیلوں نیز اینگلو انڈین فرقہ کے امیدواروں کے لیے نشستوں کے ریزرویشن کی مدت آئین نافذ ہونے کے دس سال تک مقرر کی گئی تھی۔ دس سال کی یہ مدت ختم ہوجانے کے بعد بھی یہ محسوس کیا گیا کہ ان افراد کے لیے نشستوں کے ریزرویشن کی ضرورت ہنوز باقی ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں آئین میں آٹھویں ترمیم کرکے ریزرویشن کی مدت میں توسیع کی گئی۔ اس سلسلہ میں ۱۹۶۹ء میں بھی ایک ترمیم کی گئی جو کہ ۲۳ویں ترمیم تھی۔

۱۹۶۰ء میں نویں ترمیم عمل میں آئی۔ یہ ترمیم اس لیے اہم ہے کہ اس کا مقصد بھارت کے بعض علاقوں کو پاکستان کے حوالے کرنا تھا۔ کیوں کہ ان علاقوں کے بارے میں بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان معاہدے ہوچکے تھے۔

۱۷ویں ترمیم بھی جو کہ ۱۹۶۴ء میں ہوئی تھی بڑی اہم ہے اس کے تحت آئین کی دفعہ ۳۱ (اے) میں درج انگریزی لفظ "ESTATE" (اسٹیٹ) کی دوبارہ تعریف کی گئی اور اصلاحات آراضی سے متعلق بعض قوانین کی وضاحت کی گئی۔

گو لک ناتھ کیس میں سپریم کورٹ نے خود اپنے ہی ایک فیصلے کو بدل دیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ پارلیمنٹ آئین کے تمام ابواب میں جن میں بنیادی حقوق سے متعلق باب بھی شامل ہے ترمیم کرنے کی مجاز ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر ۱۹۷۱ء میں آئین میں ۲۴ ویں ترمیم کی گئی۔ اس موقع پر دفعہ ۳۶۸ میں ترمیم کر کے یہ واضح کر دیا گیا کہ پارلیمنٹ پورے آئین میں ترمیم کرنے کی مجاز ہے۔

بینکوں کو قومی تحویل میں لینے کے سرکاری اقدام کے بارے میں سپریم کورٹ نے اپنے ایک فیصلے میں کہا کہ آئین کے تحت بینک کے مالکوں کو معاوضہ ملنا چاہیئے۔ نیز معاوضے کی رقم کے سوال کو عدالتوں میں لے جایا جا سکتا ہے کہ معاوضہ کی شکل میں بینک کے مالک کو جو رقم دی گئی ہے وہ جائیداد کسی مالیت کے اعتبار سے مناسب ہے یا نہیں۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے ایک مشکل صورت حال پیدا ہو گئی۔ اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے آئین میں ۲۵ ویں ترمیم کرنی پڑی جس کے مطابق آئین میں لفظ "معاوضہ" کو نکال کر اس کی جگہ لفظ "رقم" شامل کیا گیا۔

سابق رجواڑوں کو حکومت کی طرف سے صرف خاص کے طور پر جو رقم ادا کی جاتی تھی نیز ان کو جو بے شمار خصوصی مراعات حاصل تھیں وہ منصفانہ سماجی نظام کے تصور کے بالکل منافی تھیں۔ چنانچہ اس سلسلے کو ختم کرنے کے لیے ۱۹۷۱ء میں آئین میں ۲۶ ویں ترمیم کی گئی۔

۱۹۷۲ء میں ۲۸ ویں ترمیم عمل میں آئی۔ اس ترمیم کے تحت آئی۔ سی۔ ایس افسروں کی تمام خصوصی مراعات ختم کر دی گئیں اور ان کی حیثیت مرکزی سرکار کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ملازمین کی تمام حیثیت کے مساوی کر دی گئی۔ ۱۹۷۳ء میں ۳۰ ویں ترمیم عمل میں آئی جس کا مقصد یہ تھا کہ سپریم کورٹ میں سماعت کے لیے صرف اہم قانونی معاملات لیے جائیں تاکہ سپریم کورٹ میں کام کا بار کم ہو سکے۔

پارلیمنٹ یا ریاستی اسمبلی کے ممبروں کی دل بدل کی وجہ سے ملک میں ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے ۱۹۷۴ء میں آئین میں ۳۳ ویں ترمیم کرنی پڑی۔

اس طرح آئین میں کی جانے والی اہم ترمیمات کا ایک مختصر جائزہ لیا گیا۔ بقیہ ۲۲ ترمیمات معمولی نوعیت کی ہیں کیونکہ وہ زیادہ تر قواعد وضوابط سے متعلق ہیں۔ یہ ترمیمات چناؤ حلقوں کی حد بندی ریاستوں کی از سر نو تنظیم آئین میں درج بعض دفعات کی تشریح وغیرہ جیسے معاملات کے ارد گرد گھومتی ہیں اس طرح ہم نے دیکھا کہ آئین میں کی جانے والی تمام ترمیمات کا مقصد صرف یہ ہے کہ ملک میں سماجی انصاف کی فضا قائم کی جائے اور ترقیاتی سرگرمیوں کی رفتار تیز کی جائے تاکہ قوم کے بین الاقوامی وقار میں اضافہ ہو سکے لیکن یہ کام صرف حکومت انجام نہیں دے سکتی۔ اس کے لیے ملک کے تمام لوگوں کو مل جل کر محنت کرنا ہوگی۔

★

نقد و تبصرہ: (تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

فنِ سپہ گری۔ مصنفہ استاد مبارک حسین۔ کاغذ سفید چکنا، کتابت طباعت دیدہ زیب، کتاب مجلد، ٹائٹل موضوع کا موثر ترجمان، ملنے کا پتہ سید مبارک حسین (استاد)۔ احاطہ مرزا علی خاں۔ چوک لکھنؤ۔ قیمت: ۷ روپے

فن سپہ گری کا اخلاق سے ایک گہرا ربط ہے۔ اخلاقی صفات ہی کی بناء پر ادب میں فن سپہگری کے تذکرہ کے ساتھ کردار نگاری کی تکمیل میں بھی مدد ملتی تھی اور اس میں آفاقیت کا پہلو نمایاں ہو جاتا تھا۔ ہمارے سائنسی عہد میں نئے نئے تباہ کن اسلحے ایجاد ہو گئے ہیں لیکن انسان کے اخلاقی معیار میں گراوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ جدید اسلحوں نے فن سپہ گری اور اخلاقی صفات کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑی ہے مشین نے انسان کو بھی ایک بے شعور اور بے حس مشین میں بدل دیا ہے مشین اس کی محکوم نہیں بلکہ حاکم بن گئی ہو لیکن پھر بھی ورزش، صحت جسمانی کا تحفظ اور دفاع کی صلاحیت تمام افراد کے لیے ضروری ہے۔

اس موضوع پر کتابیں نایاب ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ استاد سید مبارک حسین نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ استاد مبارک حسین صاحب اپنے فن کے مانے ہوئے استاد ہیں۔ ان کے فن کی پوری قدر تو وہی کر سکتا ہے جو خود اس سے واقف ہو لیکن ایک مرتبہ مجھے بھی ان کے کمالات کا مظاہرہ دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ عام حاضرین ان کی مہارت پر ششدر رہ گئے تھے۔ فن سپہ گری کے ماہرین میں موصوف کو ایک اہم مقام اس لیے حاصل ہو گیا ہے کہ موصوف نے اپنے تجربات کو تصنیف کی شکل دے دی ہے جس سے عام لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی یہ تصنیف قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ نیز ہماری خواہش ہے کہ موصوف اس موضوع پر پھر قلم اٹھائیں تاکہ فن سپہ گری کے بہت سے پہلو جو تشنہ رہ گئے ہیں ان پر بھی روشنی پڑ جائے اور اس سے قدر شناسانِ سپہ گری مستفید ہو سکیں۔

——— شہید صفی پوری۔

"ماہ و انجم"۔ مرتب: سیف بجنوری، مطبوعہ: دلی آرٹ پریس بجنور، یو۔ پی۔ ملنے کا پتہ: قاضی اکرم سیفی۔ اسکول روڈ بجنور۔ یو پی۔ ضخامت: ۱۶۰ صفحات، قیمت ——— پانچ روپے پچاس پیسے

ماہ و انجم اظہار رامپوری مرحوم اور ان کے ممتاز تلامذہ کے کلام پر مشتمل ایک شعری مجموعہ ہے جو کتابت و طباعت، ترتیب و تدوین کے اعتبار سے دیدہ زیب ہے۔ اظہار رامپوری اگرچہ بڑی حد تک روایتی غزل کے شاعر تھے لیکن اس روایتی شاعری میں بھی جو استادانہ فن، گہرائی، تڑپ، معنی آفرینی اور غم دوراں دکھائی دیتا ہے وہ بہت سے فنکاروں کے یہاں خال خال نظر آئے گا۔ فکر و فن کا توازن، لفظوں کی سلاست اور لہجہ کی نرمی اور شگفتگی ان کے کلام کو دو آتشہ بنا دیتی ہے۔ نمونے کے طور پر اظہار رامپوری کے صرف تین شعر ملاحظہ ہوں۔

تازگی تھی چمن میں نہ رنگ پھولوں میں ——— بہار کو بھی تمہارے بغیر دیکھا ہے
سرد رجاں تھا تم اپنے تھے وقت اپنا تھا ——— خیال ہے کبھی ہم نے بھی خواب دیکھا ہے
کچھ اپنی کہو کچھ میری سنو، آئے ہو تو کوئی بات کرو
اس طرح جو چپ چپ بیٹھے ہو تصویر کا دھوکا ہوتا ہے

تلامذہ کا کلام بھی معیاری اور لائق مطالعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجموعہ کلام اسم با مسمیٰ ہے اور لائق مرتب سیف بجنوری مستحق مبارکباد ہیں۔

——— امیر احمد صدیقی

زخموں کے گلاب۔ مجموعہ کلام۔ صلاح الدین نیر۔ صفحات: ۱۱۰ قیمت مجلد: ۲ روپے ۵۰ پیسے۔ ملنے کا پتہ: صلاح الدین نیر۔ ۳۴۴-۶-۲۰ بانا ہ وہ جب لال۔ حیدرآباد۔ ۲

زخموں کے گلاب صلاح الدین نیر کا مجموعۂ کلام ہے جو موصوف کی فکر و نظر کا پورے طور پر آئینہ دار ہے۔ ان کے یہاں غم جاناں بھی ہے اور غم دوراں بھی۔ وہ فسانۂ دردِ دل بھی سناتے ہیں اور حکایت روزگار بھی۔ اگر ایک طرف وہ عشق کے لطیف احساسات، نازک خیالات اور قلبی واردات کے بیان پر پوری قدرت رکھتے ہیں تو دوسری جانب عوامی جذبات، انسانی معاملات اور آفاقی حالات کی صحیح تصویر اتارنا بھی خوب جانتے ہیں۔ ان کا ادب برائے ادب نہیں برائے زندگی ہے۔ صلاح الدین نیر کا یہ مجموعہ تین حصوں میں منقسم ہے پہلے حصہ میں غزلیں ہیں جن کا رنگ و آہنگ موجودہ نئی غزل سے مماثلت رکھتا ہے تاہم خاصے کی چیز ہے ملاحظہ ہو ؎

اتنے لگے ہیں زخم کہ دل بولتا نہیں ——— آئینہ اپنا بھید کبھی کھولتا نہیں
میرے بدلے ہوئے لہجے کی شکایت کیوں ہے ——— چوٹ لگتی ہے تو آواز بدل جاتی ہے
اجل کے سلسلے میں بھی پاس وضعداری ہے ——— پڑی ہے پاؤں میں زنجیر رقص جاری ہے

مجموعہ کے دوسرے اور تیسرے حصوں میں سیاسی، سماجی، واقعاتی، شخصی اور رومانی نظمیں ہیں جو اپنے طرز اظہار، شدت احساس، ضبط و نظم اور پختگی فکر کے لحاظ سے اعلیٰ مرتبہ کی حامل ہیں۔

صلاح الدین نیر ایک کامیاب شاعر ہیں ان کے لیے یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ وہ مجموعی طور پر غزل کے شاعر ہیں یا نظم کے بلاشبہ وہ دونوں میدانوں کے شہسوار نظر آتے ہیں اور زخموں کے گلاب اس دعویٰ کا روشن ثبوت ہے۔

——— قمر سیوانی



مارچ ۱۹۷۵ء

نیا دور

جلد ۳۰ نمبر ۱۲

مارچ ۱۹۷۵ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: کماری سرلا ساہنی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرسالانہ: پانچ روپے
ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ انفارمیشن (سی) ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ
خط وکتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ - لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

عنوانات

سرورق: جاوید حسن

اپنی بات

نیا دور کے سابقہ شمارے میں ہم نے نئے سال کا استقبال کرتے ہوئے توقع ظاہر کی تھی کہ نیا سال آسودگیوں، خوشیوں اور شادمانیوں کا سال ہوگا لیکن جہاں تک اردو دنیا کا تعلق ہے اس کے لیے یہ سال بھی سازگار نہیں کہلائے گا کیونکہ نئے سال کے آغاز ہی میں اردو زبان و ادب اور صحافت کی چند بڑی اہم اور قدآور شخصیتوں کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا۔ ان کے اٹھ جانے سے اردو دنیا میں ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا پر ہونا بہت ہی مشکل نظر آرہا ہے۔ ان عظیم المرتبت شخصیتوں میں ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر اعجاز حسین، سردار دیوان سنگھ مفتوں اور علامہ حیرت بدایونی قابل ذکر ہیں

<u>ڈاکٹر مسیح الزماں</u> : اردو کے ایک سنجیدہ ادیب، بلند پایہ نقاد اور مورخ تھے۔ ۸ فروری ۷۵ء کو الہ آباد میں حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ان کی عمر کل ۵۲ سال کی تھی۔ اتنی کم عمری میں انھوں نے مختلف موضوعات پر اہم اور قابل قدر کتابیں لکھ کر ملک بھر میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے اردو مثنوی اور ڈرامہ نگاری پر جو قابل قدر تحقیقی کام کیا ہے وہ اردو ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر تھے اور جلد ہی صدر شعبہ ہونے والے تھے لیکن موت نے مہلت ہی نہ دی۔ مرحوم ملک کے بزرگ ادیب اور مشہور محقق پروفیسر مسعود حسن رضوی کے خویش تھے کیا خبر تھی کہ پروفیسر مسعود صاحب کو اس عالم ضعیفی میں ایسے دردانگیز اور جانکاہ حادثے سے دوچار ہونا پڑے گا۔ خدا پروفیسر موصوف کو اور مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے نہ صرف ادیب، دانشور، محقق اور ایک قابل استاد کی حیثیت سے اپنا سکہ منوا لیا تھا بلکہ اپنی منکسر مزاجی، نرم گفتاری اور متانت و سنجیدگی کے لیے بھی مشہور تھے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ایک بار ملنے کے بعد بار بار ان سے ملنے کو دل نہ چاہے۔ راقم السطور سے بھی مرحوم کو جو محبت و تعلق خاطر تھا اس کی بنا پر یہ غم اس کا ذاتی غم بن گیا ہے۔

<u>ڈاکٹر سید اعجاز حسین</u> : ۲۳ فروری ۷۵ء کو اردو کے مشہور و معروف اور ممتاز ادیب و نقاد، ڈاکٹر سید اعجاز حسین اس دار فانی سے کوچ فرما گئے۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۷۶ سال کی تھی۔ ایک شفیق استاد، ناقد اور ادیب کی حیثیت سے مرحوم کا مقام بہت بلند تھا۔ مرحوم کی عمر کا بیشتر حصہ الہ آباد ہی میں درس و تدریس میں گزرا۔ آپ ایک عرصے تک الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ رہے اور آخر میں اس شعبہ کے صدر ہو کر سبکدوش ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد بھی آپ اردو زبان کی ہمہ تن خدمت خاموشی کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ آپکے شاگردوں میں مرحوم پروفیسر سید احتشام حسین اور مرحوم ڈاکٹر مسیح الزماں آسمانِ ادب پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ آپ آخر عمر تک متعدد علمی، تعلیمی اور ادبی اداروں سے منسلک رہے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں مختصر تاریخ ادب اردو، اردو ادب آزادی کے بعد اور اردو شاعری کا سماجی پس منظر بہت مشہور ہیں۔

<u>سردار دیوان سنگھ مفتوں</u> : اردو کے بزرگ اور بیباک صحافی سردار دیوان سنگھ مفتوں کا ۸۶ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم ہفتہ وار 'ریاست' دہلی کے ایڈیٹر تھے۔ یہ اخبار انھوں نے ۱۹۲۴ء میں نکالا تھا۔ انھوں نے اپنے رشحات قلم سے اس ہفتہ وار اخبار کو جلد ہی ایک اہم اور معیاری پرچہ بنا دیا تھا۔ ان کے قلم میں بلا کی طاقت اور زور تھا۔ انھوں نے اپنے زور قلم سے بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے جرأت مند قلم سے اردو صحافت کا سر فخر سے اونچا کر دیا تھا۔ مرحوم ایک عرصے سے صاحب فراش تھے اور بالآخر ۲۶ جنوری ۷۵ء کو دہلی میں وفات پا گئے۔ مفتوں صاحب کی صحافتی خدمات فراموش نہ کی جا سکیں گی۔

<u>علامہ حیرت بدایونی</u> : اردو کے بزرگ شاعر اور ادیب علامہ سید حسن حیرت بدایونی کا ۱۵ فروری کو حیدرآباد میں ۸۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ اگرچہ آپ بدایوں کے مردم خیز خطے سے تعلق رکھتے تھے لیکن ایک عرصہ دراز سے آپنے حیدرآباد میں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی تھی۔ مرحوم اردو اور فارسی کے زبردست عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے ہی حاضر جواب، بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ آپ جس محفل میں بھی ہوتے اس پر چھا جاتے۔ اردو کی مشہور افسانہ نگار جیلانی بانو آپ کی صاحبزادی ہیں۔ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ اور پسماندگان کو صبر دے۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

——— ایڈیٹر

غزل

حیات لکھنوی

یوں مجھ کو پوچھتے ہیں وہ مشق جفا کے بعد
جیسے کسی کو بخش دے کوئی سزا کے بعد

پابندیوں کا بار کہاں دوشِ حسن پر
وہ اور بے نیاز ہے عہدِ وفا کے بعد

ٹوٹا ہے اتحادِ طلسمِ سکوتِ سنگ
کتنی صدائیں گونج اٹھیں اک صدا کے بعد

وہ مجھ کو غرق کر گیا بحرِ ثواب میں
آنکھوں میں ایک اشکِ ندامت خطا کے بعد

احساسِ ہجر و وصل کو لے جائیے کہاں
خوشبوئے گل اداس ہے بادِ صبا کے بعد

اے منکرِ وجودِ حقیقت ذرا بتا
کتنے خدا ملے ہیں تجھے اک خدا کے بعد

مرکز کوئی نہیں ہے جبینِ نیاز کا
بکھرے سجودِ شوق ترے نقشِ پا کے بعد

شاید اسی لیے وہ مجھے مل نہیں سکا
کچھ اور مدعا بھی نہ تھا اس دعا کے بعد

دوشیزگیٔ حسن کو تابِ نظر کہاں
پھیکا سا اک جمال ہے رنگِ حیا کے بعد

مرگِ سلام، لذتِ مے لے گئی حیاتؔ
ویران مے کدے ہوئے اک پارسا کے بعد

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

لکھنؤ مرقع خسروی کے آئینے میں

اردو میں اودھ کی تاریخ سے متعلق کتب بہت کم شائع ہوئی ہیں۔ سب سے پہلی کتاب کمال الدین حیدر کی تاریخ سوانحات سلاطین اودھ کے نام سے دو جلدوں میں سنہ ۱۸۷۹ء میں نول کشور پریس سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے عرصے کے بعد سنہ ۱۹۱۹ء میں نجم الغنی رام پوری کی ضخیم تاریخ اودھ پانچ جلدوں میں نول کشور نے شائع کی۔ ان کے علاوہ سید محمد ابوالحسن کی آئینہ اودھ مطبع نظامی کان پور نے سنہ ۱۸۸۰ء میں اور میور پریس دہلی نے بلاقی داس کی گلدستہ اودھ شائع کی تھی لیکن آئینہ اودھ دراصل سلاطین ہند اور قصبات اودھ کی تاریخ ہے آخری باب جس میں مولف کو سلاطین اودھ کا ذکر کرنا تھا بوجوہ لکھنے سے رہ گیا۔ اور کتاب ناتمام صورت ہی میں شائع کرنا پڑی۔ گلدستہ اودھ بہت مختصر کتاب ہے اور کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن ان سب چھوٹی بڑی کتابوں سے پہلے شیخ عظمت علی رند کاکوروی نے ایک تاریخ اودھ "مرقع خسروی" کے نام سے لکھی تھی جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی اور ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونی ورسٹی میں قلمی صورت میں موجود ہے (نشان نمبر ۴۶۲۳۹)۔ یہ شیخ عظمت علی صاحب کون تھے ان کا ترجمہ "تذکرہ مشاہیر کاکوری" (ص ۲۰۴) سے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:-

"شیخ عظمت علی متخلص بہ ناؔمی ابن شیخ سلامت علی، ابن شیخ محمد غنی، ابن شیخ غلام حسن، ابن شیخ محمد مسیح ابن ملا بدیع الزماں، ابن ملا محمد رضا، ابن ملا محمد اشرف، ابن ملا عبدالقادر نبیرۂ مخدوم شیخ بھیکہ رح۔ ولادت ان کی بتاریخ ۲۲ ماہ جمادی الآخر سنہ ۱۲۲۶ھ (مطابق ۱۸۱۱ء) ہوئی۔ "بخت یاور باد" مادۂ تاریخ ولادت ہے۔ یہ نہایت قابل و رنگین مزاج وضع دار شخص تھے۔ شعر خوب کہتے تھے۔ ناؔمی تخلص تھا اور زمرۂ شعرا میں بھی نامی گرامی تھے۔ ان کی تصانیف میں ایک مکمل دیوان اردو میں موجود تھا جس میں علاوہ غزلوں کے قصائد و قطعات و تاریخ و رباعیاں وغیرہ بھی تھیں۔ تغزل میں ایک خاص رنگ تھا اور اکثر مضامین نئی بندش اور ترکیب سے نظم کیے گئے تھے۔ ان کے چند اشعار تذکرۂ گلدستہ سخن سے نقل کر کے درج ذیل ہیں۔

بجا ہے جا بکھرے ہیں بس چاند سے رخ پہ گیسو ورق مصحف ناطق کے ہیں سطر گیسو
پیچ میں ان کے حسینان جہاں پھنستے ہیں اپنا اقبال میں رکھتے نہیں ہمسر گیسو
لوگ گھبرا کے ابھی چاند گہن سمجھیں گے دیکھو آنے نہ دو عارض کے برابر گیسو
بستر خواب پہ بو باس سے اپنے ہر شب نکہت گل کی بچھا دیتے ہیں چادر گیسو
رات ہو جائے گی دن کی یہ خطر ہے ناؔمی بڑھتے بڑھتے نہ چھپا لیں رخ انور گیسو

دوسری کتاب تاریخ تھی سلطنت اودھ کی نہایت مفصل جو اپنی ذاتی تحقیق سے مسجع و مقفیٰ رنگین عبارت اردو میں لکھی تھی جس کا نام مرقع خسروی ہے۔

یہ فطرتاً نہایت شگفتہ مزاج یار باش تھے۔ لطف صحبت پر جان دیتے تھے۔ شاعری کے شوق نے ایک طرح کی مزاج میں وارستگی اور غنا پیدا کر دی تھی جس سے ہمیشہ مرنج و مرنجاں رہے۔

انھوں نے بتاریخ ۷ ماہ ربیع الآخر روز چہارشنبہ سنہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۱۸۹۳ء بعمر ۸۵ سال بمقام مفتی گنج لکھنؤ انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔"

خود مولف نے مرقع خسروی کے دیباچہ میں اپنا حال اور وجہ تالیف کتاب اس طرح بیان کی ہے:-

بیان وجہ تالیف کتاب وکیفیت مولف خراب۔

اس ہیچ مداں کج مج بیاں محمد عظمت علی علوی کاکوروی ابن شیخ
سلامت علی نے ابتدائے سن طفولیت سے کنار شفقت والدین میں
بہت بہ ناز و نعمت پرورش پائی اور کمال تنعم جناب عم اکرم قبلہ منجم
جواد الدولہ مظفر الملک مفتی محمد مہدی علی خاں بہادر منصور جنگ سے
تا حد بلوغ بڑے چین اٹھائے۔ پھر آخر عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ
میں بصرف مکرمت نواب روشن الدولہ بہادر وزیر اعظم اور توجہ خالص
راجہ لعل جی صاحب بخشی مکرم سے جو جناب والد کے دوست تھے پندرہ
سولہ برس کے سن میں برائے نام اسم پچاس روپیہ ماہواری پر نوکر ہوگیا یا
مقرر ہوا۔ زر تنخواہ خادم لاتا رہا۔ بعد ۱۲۴۶ھ میں جب عم اکرم محترم
معظم الیہ کو چکلہ داری سنڈیلہ کی ہوئی تب خوب حکومت کی۔ پھر ۱۲۵۳ھ
ابتدائے جلوس حضرت محمد علی شاہ میں تفقد نواب منتظم الدولہ بہادر وزیر اعظم
سے گوشہ گیر مسند وزارت ہو کر زانو نشین دربار عظمت بار ہوا اور بعد چندے
تحصیلداری پرگنات ملاوٗں و جھلاری سے سرفراز کیا گیا۔ تب سے تا آخر
۱۲۷۲ھ میں برس برابر بہ تقرب وزارت ہر عہد میں تحصیلداری پرگنات عمدہ
ہر نظامت اور عہدہ نامیہ امامت اور منصرمی محالات حضور وغیرہ میں گیا بتمر
وغیرہ میں کاربردار رہا۔ پھر جب عملداری سرکار انگریز بہادر کی ملک اودھ
میں ہوئی تب باوصف حضوری حکام عالی مقام علی التخصیص ڈاکٹر
مسٹر سمن صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر لکھنؤ سے فارغ البالی رہی نوکری
قبول نہیں کی۔ پھر ایام غدر میں خانہ نشین رہا اور بہ تحفظ آبرو گوشہ گیر
تھا۔ بعدہٗ جب دوبارہ عملداری سرکار کی ہوئی تو مختاری اور کارکنی
سرکار مرزا رفیع الشان بہادر خلف محمد علی شاہ کے واسطے حصول دکان
اور پیروی مقدمات اجرائے تنخواہ وغیرہ کی بہ توقیر تمام رہا۔ اب چند
روز سے حالت بیکاری ہے اور فیض مرحمت جناب ملکہ معظمہ سے
امیدواری ہے۔

الغرض ایسے ہنگام جمعیت نظام میں ایک دن بیٹھے بٹھائے جو لہر
اٹھائی تو یہ سوجھی کہ واقعات لکھنؤ ابتدائے حکومت نواب برہان الملک
سے جو امور ناگہانی حوادث آسمانی انقلاب ریاست وغیرہ قسم کے ظہور
میں آئے ہیں بے کم و کاست زبان اردو میں مسجع، بامحاورہ رنگین سلیس
میں رقم کیجیے، یادگار حیات چھوڑیے کہ معاملات ذہنی ہمیشہ حافظے میں نہیں
رہتے آئندہ کسی کے علم و وقوف کے کام نہیں آتے۔ بس ایک تو یہیں
اور دوسرے ہمارے بعد والوں کو کیا خبر رہے گی کہ اگلا زمانہ کیسا تھا،
کس پر کیا گزرا، حاکمان ماسبق سے کون کس طرح کا تھا، آخر کس نے کیا
کیا کیا۔ اس لیے حال اگلا جو کتب معتبرہ میں پایا اور آخر عہد نصیر الدین
حیدر بادشاہ خلد منزل سے جتنا آنکھوں سے دیکھا، صاف صاف مسجع
روزمرہ میں بلا کم و کاست لکھا۔ خوشامد اور نفسانیت کو ہرگز دخل نہ
دے کر چودہ مقدمے اور ایک خاتمے پر خاتمہ کیا۔ نام تاریخی ہجری
"مرقع خسروی" رکھا اور حال اس زمانے تک کا لکھا کہ جب امید سلطنت
کا خاتمہ ہوا۔ بادشاہ قمر کی صورت دائرہ قلعہ ولیم فورٹ کلکتہ سے نکلے ۱۲۸۶ھ
اور مرزا ولی عہد بہادر ولایت انگلینڈ سے پھر آئے۔"

اس تاریخ کی کتاب کی خوبی یا خامی یہ ہے کہ یہ اپنے دور کے اسلوب انشا
پردازی کے مطابق مسجع عبارت میں لکھی گئی ہے۔ مصنف خود لکھنوی دبستان
کا شاعر ہے اس لیے بہت سے موقعوں پر خصوصاً عہد واجد علی شاہ کی مختلف
تقریبات کا بیان کرتے ہوئے وہاں انداز بیان بہت شاعرانہ ہوگیا ہے
بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی داستان گو داستان سنا رہا ہے تاریخ نہیں لکھ
رہا ہے۔ اس تاریخ کی کتاب میں جو باتیں چشم دید لکھی ہیں وہ خوب تفصیل
سے لکھی ہیں مسجد ہنومان گڑھی کا قضیہ یا غدر ۵۷ء کے حالات
بہت تفصیل سے دیے ہیں لیکن سجع کے علاوہ رعایت لفظی اور کنایوں
اور ضلع جگت کا التزام ہر جگہ قائم رکھنے کی کوشش کی ہے جس سے ادبی
لطف تو پیدا ہو جاتا ہے لیکن واقعات نگاری کو اس سے کوئی فائدہ نہیں
پہنچتا۔

مذکورہ بالا کتاب کے چودہ مقدموں میں سے گیارھواں مقدمہ لکھنؤ
کی مشہور عمارتوں اور علم و فن و ادب کے مشاہیر کے تذکروں سے متعلق ہے۔
اگرچہ اس باب میں مصنف نے بہت اختصار سے کام لیا ہے اور جس کے لیے
معذرت بھی کی ہے لیکن اس خیال سے کہ اب سے سو برس پہلے کے لکھنؤ کا
کچھ اندازہ ہو سکے مرقع خسروی کا یہ مکمل باب ہدیہ ناظرین کیا جا رہا
ہے ——— (نورالحسن ہاشمی)

مقدمہ یازدہم بیان عمدہ مکانات و باغات وغیرہ عمارات شہر اور

تفصیل علما و ہنروران دہر اور نشان درگاہوں عبادت خانوں
نامور کا ہندو مسلمان استھان معبر کا

"مکانات میں سب سے عمدہ جائے پُرفضا، کوٹھی مارٹین کی یادگار زمانہ عجائبات ترکیبی کی نشانہ، فرحت کی جا ہے اس کی نادر قطع ہے۔

امام باڑوں میں نواب آصف الدولہ بہادر کا امام باڑہ اور اس کا رومی دروازہ۔ یہ دونوں قصر مختصر کی صورت بے لکڑی کے سہارے آسمان فرسا ہیں۔ نمونۂ قدرت خدا ہیں۔

باغوں میں سب سے اول عیش باغ جائے فرحت و فضا ہے۔ جہاں بھر کی جس میں وسعت و صفا ہے۔ اور ما سوا اس کے حسن باغ، بند باغ، وزیر باغ، الماس باغ، بادشاہ باغ، سکندرا و نصرت باغ، سب کے سب لاثانی گلستان ارم کی نشانی۔

درگاہوں میں بعد برکت پناہ جناب عباس علیہ السّلام کی اولیا اللہ والوں میں درگاہ تاب گاہ حضرت شاہ نصر اللہ خلوتی کی، ایک عمدہ پرفضا بلند ٹیلے پر لب گومتی گنو گھاٹ کے کنارے آشکار ہے۔ ایک جانب جس کے آبادی شہر کی اور دوسری طرف کوسوں کا میدان سبزہ زار ہے۔ حضرت موصوف ولایت پناہ متوکل علی اللہ عہد اکبر بادشاہ میں ہادی طریقت تھے۔ زیبندۂ سریر عزلت تھے۔ ایک مرتبہ اکبر بادشاہ دلی سے واسطے زیارت قدوم فیض لزوم کے تشریف لائے۔ شاہانہ تجمل سے حضرت نے دروازہ حجرے کا ہرگز نہ کھولا، ناچار بے نیل مرام پھر گئے۔ بعد ازاں پھر مخدوم حضرت شیخ بھیکا قدس سرہ العزیز ولی کامل کا کوروی حافظ و قاری عالم عالی کے ساتھ آئے۔ تب بمقتضائے ہدایات آیتہ کریمہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ و پاس حرمت و وقار ہم تاب خود ملاقات کی۔ کچھ دیر بحرمت صحبت رہی۔ پھر رخصت ہوئے۔ اور چند کلمے دعائیہ اور پند کے سُنے۔ اسی ہنگام میں بادشاہ نے ایک مسجد ہم پہلوئے حجرہ مقدسہ بنوا دی، اپنی یادگار چھوڑی۔ وہ آج تک رکن دین کی طرح قائم ہے۔ مرجع اہل صلوٰۃ و صائم ہے۔ چنانچہ حضرت نے سوائے اجابت عرض تعمیر مسجد کی اور کوئی وجہ مدد معاش وغیرہ قبول نہ فرمائی۔ اچھے توکل سے بسر کی۔ مابین سخن بادشاہ نے مریدانہ و مخلصانہ حضرت سے کہا کہ:۔ در درویش را دربان نہ باید۔ درجواب

آپ نے فرمایا بہ باید تا سگ دنیا نہ آید۔

اور مقابل میں اس ٹیلے کے جانب شرقی ایک اور ٹیلہ جو وقت آبادی لکھنؤ کے شیوخ گنو گھاٹ کے تصرف میں آیا۔ اس پر حضرت شیخ حسام الدین اہل اللہ کا مزار ہے۔ وہاں کی بھی برکت و فضا خوش گوار ہے۔ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ سے لے کر تا سلطنت محمد علی شاہ مجہدی نامی ایک نیک صفات جگت آشنا مرد باکیف و صفا ساکن ٹیلہ مذکور پابجو ہر مہینے کی جلسہ راگ و رقص قوالان باکیف و ہنر اور پری رخاں بہر بڑے وہاں کیا کرتے تھے۔ اس میں خوب خوب مجمعے اور جمگھٹے ہوئے۔

اور متصل امام باڑہ نواب آصف الدولہ بہادر کے ایک ٹیلہ مزار اقدس شاہ پیر محمد ولی کا بڑی منزلت کی جا تھا کہ وہ بعد غدر کے قلعہ میں آ گیا اور علاوہ اس کے ٹیلہ شاہ بخارا مرد کامل باصفا کا تھا جو سڑک میں آ کر خاک میں مل گیا۔ یہ حضرت بھی اچھے ہو گزرے۔ اجداد میں بعض شیوخ لکھنؤ کے تھے۔ درگاہ حضرت شاہ چھیڑا فقیر کامل بھی جائے پُرنور ہے اور بہ سبب اتصال خانہ ہائے ارباب نشاط کے گلی اس کی شہر میں مشہور ہے۔ درگاہ شاہ مینا ولی صاحب ولایت کی آج تک مرجع انام زیارت گاہ خاص و عام فیض بخش ارباب باطن ہے، جہاں پر لطف مراقبے اور مکاشفے کا حجت کی طرح علانیہ حاصل اور ممکن ہے۔ ہر چند نوچندی جمعرات کو وہاں جلسے راگ اور رنگ کے اور نرے رقص و آہنگ کے بڑے بڑے مجمعوں سے ہوا کرتے ہیں۔ تمام حاجت مند اور شوقین جمع رہتے ہیں۔ اور اہل اللہ مراقب ہوتے ہیں۔ رنڈیاں، رقاص وغیرہ کل اہل کسب ابتدائے نمود میں واسطے حصول مراد اور شہرت کے معتقدانہ اپنے اپنے لوازمے اور ساتھیوں سمیت اپنی نوچیوں اور نوخیزوں کو لاتی ہیں۔ بس یہیں سے نمود اور شہرتیں پاتی ہیں۔

درگاہ شریف مینا بازار کی آبادی میں نور افشاں تھی، مگر اب بعد غدر کے میدان قلعہ رومی دروازے والے میں آ کر گھر گئی۔ الّا اب بھی جیسے تیسے یہ مزار اقدس برکت مظہر ہے۔ وہیں جمگھٹے عرس اور بسنت اور جلسے نوچندیوں کے ہوا کرتے ہیں۔ بلکہ میدان جو غل و غش سے صاف ہو گیا ہے اور زیادہ تر بہ فراغت لطف رہا کرتے ہیں اسی فیض سے بعضے لکھنؤ کو مینا نگری کہتے ہیں۔ سب ہندو مسلمان شیعہ سُنّی بخلوص مانتے ہیں اور متصل اس مزار شریف کے مزار اقدس و اطہر و برکت اظہر حضرت مخدوم اعظم ثانی کا ہے مقبول

خدا نامی کا ہے جہاں مشہور و معروف بلکہ چشم دیدہ و منقول ہے کہ اگلے زمانے میں مردہ ہندو کا جو ادھر ہو کر نکل جاتا تھا پھر نہ جلتا تھا۔ اب وہ بھی میدان میں ہو گیا اور آگے پنج محلے میں واقع تھا۔ ٹیلہ درگاہ شاہ عبدالجلیل کا بھی مشہور ہے، جہاں جھیلا اکولی کے میلہ کا ہونا دستور ہے۔ وہاں جابجا صحبت افیونیوں کی رہتی ہے۔ بڑی کیفیت ہوتی ہے۔

ٹیلہ حضرت خواجہ باسط کا عین آبادی میں قریب سرائے معالی خاں[1] کے ہے۔ عہد نواب آصف الدولہ میں یہ حضرت تھے۔ اب وہاں ان کی درگاہ بنی ہے اور وہاں بھی عہد شاہی تک ہر جمعرات اور عرس میں خوب ناچ و رنگ قوالی حال و قال کی صحبت رہی۔ میر علی صاحب مرثیہ خواں نامی گرامی ذیشان راگ میں اکمل الانسان ان کے یگانے عزیز قریب تھے۔ اور میر ظہور الدین مرد کامل اطلاقت یکتائے فن فرد مفرد صحیفۂ علم مجلس کی ذات سے وہاں بھی نور برسا کیے۔ کہتے ہیں کہ حضرت مخدوم سوائے کمال علم و فن موسیقی کے علوی میں بھی عامل بے بدل تھے۔ واقعی جذب قلوب کے ایران کے والا ہیں کے اکثر دن دیکھے و سنے۔

درگاہ مولانا عبدالرحمن موحد باللہ کی قریب درگاہ حضرت شاہ مینا ولی کے بڑی شان و عظمت کی ہے۔ جس میں دن رات نور کے جلوے رہتے ہیں۔ اور عرس دیوسوں[2] کے میلوں اور مجمعوں سے ہوا کرتے ہیں۔ حال و قال کی صحبت کا مزا ہے۔ قوالی راگ اور مردانے ناچ سے ایک حظ اٹھتا ہے۔ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ تک حضرت مقدس اس عالم میں فیض رساں تھے۔ ہمہ اوست کے سچے معرے ان کے محیط زمین و زماں تھے۔ بارے خوب کیفیت و معقولیت سے حضرت اس یکتا کلمہ پر قادر اور یک زبان رہے۔ اس میں لوگوں نے بہت کڑے کڑے امتحان کیے۔

چنانچہ ایک مرتبہ چند بیہودہ لایعقل متحد الوضع نے مسجد میں مقام قیام حضرت میں عصر کے وقت پاس جا کر قرابنیں جھونک دیں اور کہا کہ یہ بھی تہ ہے یا نہیں؟ تب بھی حضرت نے اس حال میں بھی انھیں تیوروں سے وہی حق کی یک زبانیاں کہیں۔ اور وہ سب گولیاں ادھر ادھر دیوار پا کھو میں مسجد کی جا لگیں۔ درگاہ حضرت خواجہ حسن مرد، و برادر خواجہ حسین درگیوں میں فرد، رحمۃ اللہ کی متصل درگاہ جناب حضرت عباس علیہ السلام کے قریب چوک کے، بے مثال بنی۔ حضرات مرحومین نے اپنی حیات میں بڑی شان و توکل سے بسر کی۔ میاں قطب اعظم صاحب ایک صاحبزادے رنگین مزاج خوش طبع، بارس صاحب ذوق و شوق تھے۔ وہ عہد غازی الدین حیدر بادشاہ میں بتقرب فقیرانہ نواب معتمد الدولہ بہادر وزیر کی صحبت میں بڑھے۔ انھوں نے بسنت کے جلسے وہاں اس نفاست و تکلف سے کیے کہ نام رہ گئے۔ مگر اب کوئی صاحب اس خاندان میں اس منزلت اور کام کے نہیں ہیں۔ گمنام ہر کہیں ہیں۔

درگاہ شاہ کفایت اللہ صاحب مغفور کی منڈیاؤں میں بہبود مشہور ہے۔ وہاں بھی ہر سال دسوں کے عرس میں مجمع مشائخین اور اہل عرفان کا کا ہونا دستور ہے۔

نقش قدم خیر مقدم جناب رسالتمآب حبیب رب العالمین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم محلہ نوستہ میں ہے۔ اُسے سرتاج سب زیارتوں اور درگاہوں کا کہیے۔ میر ناصر علی وغیرہ کی زمینداری میں ایک جائے پُر نور و تجلی میں یہ نقش قدم مبارک پتھر کے ٹکڑے پر علاوہ افروز ہے۔ ہر بسنت کی پہلی کو وہاں مجمع خلائق سے صورت عقد پروین گویا آفتاب نیم روز ہے۔ کربلاؤں میں میر حیدر بخش کی کربلا سب سے اول وضع، بقول دلوں کی مقبول ابتدائے عہد جنت مکان سعادت علی خاں میں بنی۔ پھر اس کی برکت اور نمود اسی پھیلی کہ آج تک زیارت گاہ امیر و غریب و خلایق شہر ہے۔ ہر چہلم اور جو جیدی میں وہاں بہت جمعیت کا بڑا مقر ہے۔ مجمع حسینوں اور مراد والوں کا حد تحریر میں نہیں آسکتے۔ واقعی کثرت میں اور رونق میں انجم فلک کی سی دیکھی وہاں کی صحنچیوں اور کوٹھوں پر چار چار آٹھ آٹھ روز پیشتر سے صدہا عورت مرد زیارتی کا انبوہ ہوتا ہے۔ ایک سے ایک اپنی شان و شکوہ دبادٹ میں اپنے کو اعلیٰ کہتا ہے۔ اور متصل اس کے حاجی مینا کی کربلا ہے۔ اس میں ٹھنڈک اور سایہ داری اشجار کا مزہ ہے۔ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ سے مصری کی بغیا کے رستے ایسے بڑھے کہ اس نے سب کربلاؤں کی رونق کے دانت کھٹے کر دیے۔ وہ منت اور مراد بس

---

[1] دیسہ کی جمع بنائی ہے۔

کی علانیہ سربراہ اور وہاں کی لذت زیارت پر قند مکرر کا اشتباہ ہزاروں چلّے بندھے کھلی کھلی مرادوں کے عقدے کھلے کسی نے ایک آم کے درخت کے نیچے ایک بار خاص شیر کی صورت دیکھی بیان کی، بس تب سے اس درخت کی سب سے زیادہ وقعت بڑھی۔ ہزاروں لال چلّے اس میں بندھ گئے۔ ایسے کہ پتیوں سے زیادہ سرسبز تھے۔ باقی اور بہت سی کربلائیں ہیں۔ اکثر لینے اپنے معمولی طور پر دفن تعزیوں کی جائیں ہیں۔

مقاموں میں اگلا قدیم شیخ عبدالرحیم مرحوم شیخ زادوں کا یادگار دارالاحتشام نداں محل ہے جس کی عمارت سنگین نظافت دل نشین اب تلک بے خلل ہے۔ دیواروں پر یہ صفا ہے کہ آدمی کے قد کے سایہ کا پرتو سوجھتا ہے۔ باقی محکمی اور پختگی کا کیا کہنا۔

اس کے سوا مسجد اور مقبرہ نواب ابوالمکارم خاں شیخ کالٹ دریائے گومتی بہت ہی پرفضا تھا۔ مکارم نگر کی آراضی زمینداری پر بنا تھا۔ مگر اب بعد غدر کے مسجد گھد گئی وہ آبرو و رونق جاتی رہی۔

شیخین دروازہ ملا ہوا مبارک محل اور تیج محلے سے بہت عمدہ تھا۔ وہ بھی قلعہ میں رومی دروازے کے آگیا۔ مسجدوں میں شاہ پیر محمد صاحب کی مسجد بہت وسیع اور سربلند ہے۔ ہر ایک کو پسند اس کے پاس مسجد امام باڑہ نواب آصف الدولہ کی۔ بھلا اس عمارت آصفی کا کیا کہنا۔ اور مسجد میاں تحسین اور میاں الماس کی بہت خوب وسیع ہے۔ اچھی رفعت اس میں دی ہے۔ سب سے اعلیٰ ترجمعہ مسجد بنوائی ہوئی محمد علی شاہ کی مصطفیٰ آبادی مشہور وسعت ولطافت جس کی حوصلۂ عارف سے زیادہ جا کہ مسجد کا ڈھلا ہوا اور سایہ بلندی آسمان سے ملا ہوا۔

تالابوں میں شہر کے اندر تالاب راجہ ٹکیٹ کا ایسا جس کی وسعت آبداری کی تھاہ نہ ملے، بہت اچھا۔ ناکوں پر شہر کے ایک طرف تالاب فتح علی خاں اور ایک طرف بخشی تھرحند کا۔ پھر عہد محمد علی شاہ میں حسین آباد کا تالاب کہ ہمت حاتم دابر دئے حم سے دوتا۔ اس کی وسعت وخوبی نے سارے تالابوں کی آب وتاب گرد کردی۔ سب کی اچھائی خاک میں ملادی۔

ہنود کے معابد کا جو ہر ایک طرف سورج کنڈ ایسا مقام دل پسند کہ تعریف میں جس کی طلاقت کا ذہن کندا اور دوسری جانب کو علی گنج کے تیرتھ کا چھند۔

قصبات اور بیرونجات میں اول درگاہ سید سالار مسعود غازی کی قصبہ بہرائچ میں شہرۂ آفاق اس ملک اودھ کی سرزمین پُر برکات میں طاق ہے۔ جہاں ہر سال جیٹھ کے مہینے میں اتوار کو ایسا میلا ہوتا ہے کہ منزلوں سے لوگ آتے ہیں ہزار از دہام رہتا ہے۔ مرد وزن بے حد بے شمار آتے ہیں۔ اور اپنے اپنے اعتقادات کے مطابق ہر قسم کی مرادیں پاتے ہیں۔

قصبہ ردولی میں درگاہ حضرت شاہ عبدالحق کی ہے۔ جہاں یوسف کے عرسوں کے مصارف قیاس سے باہر ہیں، آثار کرامات ظاہر ہیں کہ ماہ جمادی الثانی میں عرس کی تاریخوں میں ہر ایک کا دل بے اختیار ادھر کو کھچتا ہے۔ آدمی دلی آگرہ اجمیر تک کا آتا ہے۔ اس میں تکلف یہ کہ جو جہاں سے جس سواری جتنے آدمیوں سے آئے کرایہ حیثیت کا پائے اور کھانے میں شیر مال پلاؤ تحفہ جتنا کھاؤ۔ پھر چلتے وقت حسب حیثیت ہر کہ خلعت ملتا ہے۔ اس میں تھان پگڑی وغیرہ لباس ہر ایک کو اس کی لیاقت کا۔ اس جہت سے بڑے بڑے مجمع ہوتے ہیں۔ مشائخین و معتقدین تماشہ بین شوقین جنگل گتھل ہر قسم کے آدمی آتے ہیں۔ ہندو مسلمان دوکان دار تک کھانا اور صرف پاتے ہیں۔ ہر چند کچھ دیہات معافی کے ہیں مگر نہ اتنے کہ ایسے اور اتنے مصارف کو کفایت کریں۔ یہ صرف تصرف کراماتی ہے۔ فقیر کی یاتی (؟) ہے۔

اسی طرح قصبہ سلون میں عرس ہوتا ہے وہاں بھی یہی نقشہ ہے مگر وہاں مدد معاش بھی خوب ہے۔ ہر وقت کی نوبت، مسافرین آیندہ و روندہ کا یہی اسلوب ہے۔

قصبہ بستی میں درگاہ شاہ عبدالرزاق کی ہے۔ وہاں بھی برکت بڑی ہے۔

قصبہ کاکوروی میں درگاہ مخدوم شیخ بھیکھا قدس سرہٗ العزیز اور درگاہ شیخ سعدی اس میں درگاہ حضرت شاہ کاظم کی وہ نمود میں بے بدل ہے کہ سعادت جس کی ضرب المثل ہے۔ اور نزدیک میں درگاہ قدسی پایگاہ قبہ نور برکات کا ظہور مثال چرخ ہفتمین سایہ عرش بریں حضرت شاہ کرامت علی ولی مرشد کامل حق سے متصل کی ہے۔ وہ بھی بڑے شرف کا مقام ہے۔

برکت نظام دید کے قابل ہے۔ دیوے کے عرس میں خدا ساز مجمع ہوتے ہیں کیفیت حال و قال پہ لوگ وجد کرتے ہیں۔ کوئی جا بُدا نہیں کوئی حاجت نہیں ہے۔ بہرکیف مصداق قول "خدا خود میرسامانست ارباب توکل را" بالیقین ہے۔

قصبہ لاہرپور میں درگاہ شاہ مجا قلندر کی زیارت گاہ ہے۔ خاندان قلندریہ کی رکن رفاہ ہے۔ قصبہ کھیری میں درگاہ حافظ چھیدا میاں احداد حافظ محرم علی صاحب کی ہے وہاں بھی بڑی رونق ہے۔ قصبہ کچھوچھہ کی درگاہ بڑی عظمت وجودت کی ہے۔ جہاں بھوت پریت جلتے اترتے ہیں، مدتوں سے لوگ مسحور آسیب زدہ آکر اچھے ہوتے ہیں۔

تیرتھ اہل ہنود کے شہر خاص میں سے بڑا مقام اودھ کرام کالکا جی کا مندر سب سے بہتر چوک کے متصل ہے جہاں نور ساں تجلی ہے۔ صبح کو ہر روز تمام شہر کے اچھے برگزیدہ لوگ مرد و عورت اکثر پوجا کو آتے ہیں مرادیں مانگتے ہیں ہار پھول چڑھاتے ہیں۔ بعد اس کے سندھی جو بیٹیاں والی جس کی پرستش اور پوجا سب سے نرالی کالی جی کا چوک میں وہ پرتاپ کہ جہاں سینکڑوں مرد و عورت پوجاری بخوبی کامیاب، گولہ گنج میں بھیروں ناتھ جی کا استھان ہے وہاں اور بھی حرمت ذی شان ہے۔

اطراف شہر میں اول سے اول رام و لچھمن کی اجودھیا ہے۔ جہاں ہر سال لاکھوں آدمی کا میلہ ہوتا ہے۔ دوسرے نیمسار مصر کھ لالتا بھوانی کا استھان، تیسرے گولا گوکرن مکنتھ لشان۔

عالموں اور ہنرمندوں کا بیان:- اگلے زمانے میں علمائے اہل سنت میں مولانا عبد العلی صاحب فرنگی محلی محقق بخصائل ملکوتی جن کا ہند میں عدیل نہیں۔ اس میں سلمناؑ[1] کے سوا حاجت دلیل نہیں۔ بعد ان کے مولوی انوار ان میں نور علیٰ نور کے آثار۔ عالم باعمل لاریب ارخاصان حدائے لم یزل اور ان کے صاحب زادے مولوی نور کرامت ظہور فی ربانا مولوی ظہور اللہ صاحب، مولوی ولی اللہ و مولوی مست اللہ و مولوی عبد الرزاق اور مولوی عبد الوالی اور مولوی عبد الحکیم اور مولوی لطف اللہ اور مولوی عبد الحئی مدظلہ، یہ سب ایک سے ایک اعلیٰ سبحان اللہ ہر ایک ان حضرات ملکوتی صفات میں کامل الیقین جملہ علوم میں متبحر اور زہد و ورع کے معدن، مسائل کی طرح مسلم الثبوت، ارکان دین کی صورت قائم اور مضبوط۔

اور علمائے امامیہ اثنا عشریہ پاکیزہ باطنہ میں پہلے سب سے اچھوں میں اچھے بانی مبانی رکن تہذیب و اجتہاد جناب مولوی دلدار علی صاحب عالم مہذب اور صاحب زادے اُن کے بڑے نام و نمود علم و فضل میں یکتا۔ جناب میرن صاحب سید العلماء اور میر سید محمد مجتہد العصر دونوں وحید و یکتا عالم ماورائے لاجواب گویا اس دین کے آسمان کے آفتاب و ماہتاب۔ تمام اہل شہر کے اس جگہ کے عالموں سے افضل اور باایں ہمہ علم ثروت دنیا بھی حاصل، پھر میر سید محمد صاحب کے صاحبزادے میر بندہ حسن عہدہ اجتہاد میں فائق اور سید نقی صاحب و سید تقی صاحب سید العلماء کے صاحبزادے علم و فضل کی رونق۔ باقی میر سید حسین فخر العلماءؒ اپنے طور کے عالم کامل اور ایک گونہ ریاضت خاطر خواہ پر مائل۔

حکیموں میں عہد سابق کے شفائی خاں ارسطوئے زماں جن کے نسخے میں شفا اور نام میں صحت کا کلمہ اور ہم عصر ان کے حکیم مرزا صادق بہرے اور حکیم مرزا رضی ذکی سبحان اللہ واہ جی طبیب حاذق سچی تشخیص کے جنھوں نے مادر زاد بہرے اچھے کیے تیسرے چوتھے میر بندہ حسین اور مرزا حکیماں ان کے سب سے الگ تھلگ نرالے ڈھنگ، مریض کو پرہیز سے بچا دیں محض طاقت کا لحاظ رکھ کر جس چیز پر رغبت ہو کھلا دیں۔ اور محمد یوسف اشرف آبادی اگرچہ ان میں کم سن تھے لیکن ذہانت اور جودت طبع کے پتلے حکیم شرف الدین صاحب حکیم لاثانی شاگرد جن کے نامی گرامی اور فی زمانا حکیم الملوک صاحب حدب و سلوک تند مزاج بے احتیاج۔ حکیم مرزا محمد علی صاحب ذی کمال بے مثال بڑے تجربہ کار عمل طب میں نامور علاج میں بے خطر، صاحب عزت بڑے منہ کے کڑوے تھے اس لیے امیر و غریب وزیر و بادشاہ ان کے ڈر سے اور خیال سے بد پرہیزی سے پرہیز کرتے بہت جلد شفا پاتے۔ واقعی یکتا جنھوں نے ایک ایک مرض کا دس دس طرح کا نسخہ لکھا۔ عجب عجب علاج کیے۔

---

[1] ہم نے تسلیم کر لیا مان لیا۔

معزز سلاطین وعمایدرہے۔ انھیں کے ہم عصر حکیم مرزا علی خاں بادشاہی حکیم مرد باوضع وسلیم یہ علما لاجواب تھے۔ اور قانونًا آبحیات تھے۔ بڑے نامی گرامی اچھی دستگاہ کے آدمی اور ان کے برادر آغا علی خاں بھی اچھے بہت بڑھ کر ہوئے۔ باقی مرزا پناہ علی اور حکیم شاہ علی دونوں یکتائے زماں، خود نسخے اُن کے مریضوں کی شفا تھے۔ دیکھنے سے صحت کے مزے آتے۔ اسی زمانے کے حکیم مرزا غازی تھے خاصے حکیم بڑے نامی ہو گزرے۔ اور حکیم پناہ علی خاں کے ہم سبق، واحد ایک اُستاد کے شاگرد، ہم عصر جناب حکیم مرزا غضنفر صاحب استاد مؤلف یادگار سلف فرشتہ خصلت ارسطو حکمت۔ ہاتھ میں جن کے شفا، بات میں تاثیر دعا نسخے ان کے صحت کا کام کرتے۔ اجرائے دوائی خطا سے ڈرتے بعد ان کے ہم نام حکیم غضنفر فیض آبادی یہ بھی مرد یار باش خوش بیان حکیم نامی گرامی اور حکیم بندہ رضا خاں خوش نصیب بخت یاور ہمہ جواں کا کیا کہنا کہ وہ نواب مبارک محل صاحبہ کے دل حبیب معالج تھے، حتی کہ ان کے مالک دشامل وشبقہ ہوئے۔

باقی اب کے حکیموں میں حکیم غلام علی مرزا حسن حکیم میر محمد جعفر حکیم مرزا محمد وغیرہ اچھے اور اچھے آپ ان میں تھے حکیم سید علی صاحب اور حکیم حیدر علی صاحب مرد باوضع حکیم چُنے ہوئے اُن کے علاوہ ان سب میں مُسن اور حد کے تجربہ کار یکتا حکیم بنا صاحب پرانے تجربہ کاروں کے جواب جن کا اب کا جواب نہیں۔ اُن سے بہتر اب اس شہر میں ایک کا حساب نہیں۔ انھوں نے مدت العمر خانہ داری تاہل کی نہیں کی۔ تجرد میں گذرانی۔ در نیولاکسی امیر وغریب کے گھر پر نہیں جاتے۔ گھر بیٹھے جو آوے شفا پاوے باقی ان کے بھائی اور بھتیجے شاگرد حکیم حیدر علی اور حکیم علی حسین صاحب حاجی بھی بڑے مشاق نامی، انھیں کے ہم عصر حکیم یعقوب وہ بھی بہت خوب، قسمت کے دھنی دولت اور اولاد کی طرف سے بھی غنی بہتیروں سے بہتر۔ فی الحال خوش خصال وسیع الاخلاق کریم الوفاق حلیم ومنکسر لاجواب حکیم میر نواب مفتی گنجی کا کیا کہنا۔ اے واہ سبحان اللہ اور خاص واجد علی شاہ بادشاہ کے حکیموں میں شفاالدولہ حکمت الدولہ صحت الدولہ سید مرزا اور میر آغا طبیب الدولہ اور ان میں سے بڑے نامی گرامی مسیح الدولہ حکیم مرزا علی حسن کے صاحب زادے بہت اچھے بڑے رتبے کے۔

تذکرۂ شعراء

شاعروں میں عہد سابق کے ملک الشعرا مرزا رفیع السودہ شاعر بے بدل استاد بے خلل۔

ولہ:۔ ناوک نے اس کے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

دوسرے فخر الشعرا، استاد یکتا محی الدین مذاق شاعری شاعر بے نظیر میر تقی میر۔ ولہ:۔

آنکھیں اس کی شرم آلودہ خاک میں ہم کو ملائیں گی
کیا یہ نگاہیں نیچی نیچی ایدھر اودھر جائیں گی

تیسرے کامل بالقوا، صاحب دل باصفا یکتائے عالم درد، خواجہ میر درد۔

ولہ:۔ ارض وسما کہاں تری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے یہ کہ جہاں تو سما سکے

ان کے بعد میاں سوز اور جرأت دونوں بہت بامذاق و باکیفیت سوز:

التہاب دل سے خاطرات سے کچھ ناساز ہے
کچھ نہیں معلوم یارب سوز ہے یا ساز ہے

میاں جرأت:

غم میں بسر اپنی زندگی کی ہم نے تو فقط تری خوشی کی

آگے انشاء اللہ خاں انشا اور ظہور اللہ خاں نوا اس فن کے یکتا، سبحان اللہ۔

انشا:۔ برق کو چھیڑ قدم معدن سیماب پہ رکھ
ہاتھ لیکن نہ کسی کے دل بیتاب پہ رکھ

نوا:۔ برنگ نقش پا جب میں نے اُس در کی زمیں پکڑی
اٹھانے کو نہ میرے پھر کسی نے آستیں پکڑی

استاد مسلم الثبوت گہر گو معنی، جو نامی، میاں مصحفی باصفا، اس فن کے بحر وبر میں دریا جنھوں نے سیکڑوں شاعر بنا دیے، دیوان کے دیوان لوگوں کو کہہ دیے۔ ولہ:

قدم اس دھج سے پڑتا ہے مرے اُس غارتِ جاں کا
کہ دل ہر ہر قدم پر لوٹتا ہے گبر و مسلماں کا
جسے منظور ہو اُس لب کا بوسہ کیوں ذقن چوسے
کنوئیں پر بھی کہیں جاتا ہے پیاسا آبِ حیواں کا

اور میاں بیتاب کامل الفن سنجیدہ سخن، فارسی گو، بہت اچھے اُس عہد کے نامی۔ ولہ:

دمے کز سختی جانم دم شمشیر می خندد
بخود گریم کہ بر من ہر جوان و پیر می خندد

طالب علی خاں عیشی تخلص، عجب پیاری زبان کا آدمی، شاعر پُر رس رنگیں سخن — ولہ:

کسی گل کی رہی ہے بسکہ مجھ کو جستجو برسوں
صبا کی طرح آوارہ پھرا ہوں کو بکو برسوں

وہ مکیں ہوں کہ توڑا محتسب نے جب کہ میخانہ بغل میں میں پھرا دامانِ صحرا جن کا گلو برسوں (کذا)

اور ان سے الگ خوش طرز و رنگین بیان پاکیزہ زبان یگانی سخن میر حسن نے مثنوی بے نظیر ایسی کہی کہ پھر آج تک ویسی نہ ہوئی۔ ولہ:

اس بت نے جو ہم سے گفتگو کی
اُمید بر آئی — آرزو کی

متاخرین میں میاں مصحفی کے دیکھنے والے اچھوں سے اچھے استاد وقت صید سخن دل کش خواجہ حیدر علی آتش بڑے نازک خیال ہو کے ہوئے طرار بے مثال یگانہ آفاق ٹھیٹھ مشتاق ہزاروں میں ایک لاکھوں میں یک لطافت سخن کی اُن سے اور وہ سخن کی۔ ولہ:

جگہ مطلع کی کھنچوائیں گے نقشِ روئے جاناں کا
کہ تا ہو مطلعِ خورشید مطلع اپنے دیواں کا

اور اُن کے جواب، استاد لاجواب اچھوں میں انتخاب، سب میں فائق شیخ امام بخش ناسخ جن کی استادی کی ثنا بے سود ہے، دور دور نمود ہے۔ ولہ

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

الغرض اب شہر و دیار میں اکثر انھیں دونوں یکتاؤں کے شاگرد ہیں۔ اپنی اپنی طرز و وضع میں فرد ہیں اور ماسوا ان کے منشی منظر علی صاحب اسیر میاں مصحفی کے دیکھنے والے اپنے وقت کے میر اب اُن کا جواب نہیں اور کسی کا حساب نہیں۔ ولہ:

نبض بیمار جو اے رشک مسیحا دیکھی
آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

ان کے سوا شیخ عبدالرؤف شفق میاں مصحفی کے شاگرد مشہور پاکیزہ سخن ماہر فن۔ ولہ:

گر شبِ وصل ہم آغوش وہ گلرو ہو جائے
یار دامن بھی در خلد کا بازو ہو جائے

اور میاں غافل اچھوں میں شامل۔ ولہ

نگاہِ یار ہم سے آج بے تقصیر پھرتی ہے
کسی کی کچھ نہیں چلتی ہے جب تقدیر پھرتی ہے

میاں مسرور بہت دور قدیم پاکیزہ سخن شاعر شاگرد میاں مصحفی۔ ولہ:

دل کیا جلے گا نالۂ بلبل کی آگ سے
گلچیں کا ہاتھ جب نہ جلا گل کی آگ سے

گرچہ اب شہر میں شیخ ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد اکثر ہیں پر نامی نامور ہیں الآ سب میں اوّل کامل سخن سنج، لاجواب سخن وروں میں انتخاب بلند فکر معنی نگار نازک خیال مضمون آفریں قابل تحسین عالی فہم ذی کمال شیخ ناسخ کے دیکھنے والے بہت اچھے شاعر بے نظیر خواجہ وزیر۔ ولہ:

حسن عارض عارضی تھا کھل گیا خط کے آنے سے لفافہ کھل گیا

نہیں ہے نو وہ خط میں جلوہ حسنِ روئے جاناں کا
عیاں ہے تخت پریوں کے جھرمٹ میں سلیماں کا

اور میر علی اوسط رشک مرزا محمد رضا برق میاں تجر مرزا حاتم علی مہر وغیرہ بہت سے نامی شاعر اچھے — اور خواجہ صاحب کے تلامذہ میں سے یکتائے سخن بے نظیر مرزا منشی بار یاش معنی رس باصفا مہر دبیر صبا اور سید محمد خاں رند اور میر دوست علی خلیل اور مرزا جو شرف میر عباس تسلیم میر علی حسن حزیں ایک سے ایک اعلیٰ بے عدیل اپنی اپنی فکر میں کامل سخن کے حاصل۔

صبا: سر اکاٹ کے پچھتائے گا جھوٹی پھر کس کی قسم کھائیے گا
آپ کہتے ہیں کہ جا جاتا ہوں پھر اکیلے بھی تو گھبرائیے گا

زندؔ :۔ صدمے سناؤں خاک دلِ بے قرار کے
آنکھیں کھلی ہیں بند ہیں تختے مزار کے

مرزا محمد رضا برقؔ :۔ دیکھیے حالتِ دل درد سے کیا ہوتی ہے
روح نام شبِ فرقت سے فنا ہوتی ہے

مرزا حجو شرفؔ :۔ پھڑک کے جان نہ دبتا تو آہ کیا کرتا
نفس سے اور نکلنے کی راہ کیا کرتا

مہرؔ :۔ کیا جانے بتو اس میں ہے منظور خدا کیا
تم دیر میں آ بیٹھے تو کعبے میں رہا کیا

سلیمؔ :۔ اے جاں اپنا بیٹھ گیا دل یہ غم ہوا
غیروں نے تیرے ناز اٹھائے ستم ہوا

چھوڑی زمین نہ کوچۂ قاتل کی جم گیا دشمن ہمارے سر کا ہمارا قدم ہوا

خلیقؔ :۔ دل منحرف ہے مجھ سے کچھ انقلاب ہوگا
جس گھر میں پھوٹ ہوگی وہ گھر خراب ہوگا

حزیںؔ :۔ صورت آہو جو آنکھ اُن کو عنایت ہوگئی
دیکھتے ہی دیکھنے والوں کو وحشت ہوگئی

میاں سحرؔ :۔ نقاب میں نہیں بے وجہ منھ چھپائے ہوے
کسی غریب کا آتے ہیں دل دکھائے ہوے

میر علی اوسط رشکؔ :۔ پڑتی مری نگاہ ہے تجھ پر گھڑی گھڑی
آنکھیں تری بدلتی ہیں تیور گھڑی گھڑی
نامہ بری کے جرم پہ ہوتا ہلاک سنہے
پھڑکا رہا ہے یار کبوتر گھڑی گھڑی

پھر اگلے پچھلے زمانے میں شامل استاد کامل نواب عاشور علی خاں صاحب اگرچہ کچھ بہت نہ کہتے تھے مگر صدہا شاعر بنادیے نہایت سنجیدہ سخن ماہر فن۔ ولہ۔

کہ کس نازنیں صیاد کی فرقت میں یاد آئی
کہ مرغ روح کو ہے خواہش پرواز عنقائی

اور میر تقی صاحب میرؔ کے صاحبزادے میر کلو عرشؔ اچھوں کے اچھے خوش فکر و موزوں طبع، کیا کہنا۔ ولہ :۔

ضعیفی میں جوانی کا زیادہ جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

اور ان کے دیکھنے والے شیخ محمد جان شادؔ، الگ رنگ کے شاعر، استاد معانی، سخن کے ماہر فن، عاشقانہ طرز سخن دری میں سربلند و سرفراز — ولہ :۔

تھاموں دل و جگر کیا صدمہ ہے جسم و جاں پر
دو ہاتھ کل ہیں یارب رکھوں کہاں کہاں پر

نوابؔ مرزا تقی خاں ہوسؔ، میاں مصحفیؔ کے دیکھنے والے شگفتہ جی کے ہر ہیئے۔ (کذا)

گئے جی سے تو فائدہ اتنا ہوا غم ہجر کے رنج و الم سے چھٹے
یہ فراغ الم نہ وہاں بھی ملا یہ غم اب رہا کہ وہ ہم سے چھٹے

اور مقربانِ واجد علی شاہ بادشاہ میں خواجہ اسدؔ، قلقؔ، مرزا مہدی، قبولؔ، شیخ مہدی ذکیؔ مخاطب بہ ملک الشعرا بوجہ شاگردی قطب الدولہ خواجہ اسدؔ :۔

شہرت تھی میرے نالہ و چشم پرآب کی
کہتے ہیں لوگ پھبتیاں برق و سحاب کی
تشبیہ اس کی کھینچ کے مانی نے چاہی داد
تصویر بول اٹھی مرے حاضر جواب کی

ذکیؔ :۔ ساقی کا عکسِ چینِ جبیں کا شراب میں
موج ہلال ہے قدحِ آفتاب میں

فی الحال نازک خیال اچھوں میں اچھے بے مثال سخن داں و سخن سنج و سخن گو نیکو فہم و نکوداں و نکوجو ذی رتبہ بلند مرتبہ نواب محمد حسن خاں شیداؔ، نواب رمضان علی خاں کے صاحبزادے، اے واہ سبحان اللہ ان کا کیا کہنا — ولہ :۔

چمن سینچا یہاں تک باغباں نے خون بلبل سے
کہ آخر پھوٹ نکلا رنگ ہو کر عارضِ گل سے

باقی مرزا محمد رضا طورؔ اور مرزا امان علی سحرؔ بھی اچھے خوش فکر۔

طورؔ :۔ مے دے کہ نہ دے بادۂ احمر تو نہیں ہے
کچھ پیرِ مغاں ساقیٔ کوثر تو نہیں ہے

سحرؔ :۔ کیفیت شراب ہے ساقی کے نام سے
دل مست ہو رہا ہے محبت کے جام سے

کمسنوں میں بڑی فکر کے میر سید محمد جعفر تخلص امید منصف الدولہ
ے صاجزادے مجتہد العصر کے پوتے نقہ کہنے والے بہت اچھے۔ دلہ:۔

توق کچھ ملکِ عدم کا کم نہیں   وہ چلے جاتے ہیں جن میں دم نہیں

تہ جیں کثرت زار سخن و ران ذلہ ربائے خوان لغمارا تم ہیچمدان متخلص
ی ۔ دلہ :۔

سرت کا مزلہ ہے دلِ مایوس وفا سے   پوچھے کوئی منزل کی کڑی آبلہ پا سے
ت درِ محبوب سے پھرتی نہیں تیلی   ضد باندھی ہے آنکھوں نے مرے قبلہ نما سے
لفت تھی کہ آفت تھی سمجھ میں نہیں آتا   اللہ پلک مارتے کیا ہو گیا کیا سے
چھوڑا ان کو عبث جان نہ دے جائے گی نامی   یہ بت ابھی کیا تجھ کو ملائیں گے خدا سے

مرثیہ گویوں میں اگلے میاں نصیح، میاں خلیق، میاں ضمیر، میاں دلگیر
یہ لوگ شہر کی زینت اور یہاں کی حرمت ہو گزرے۔ وہ مذاق و قدرت نہ
ہو سکی اور نہ ہے۔ مگر فی زمانہ میر انیس صاحب، میر ببر علی نام اور مرزا
بیر صاحب سلامت علی نام ایسے ہوئے کہ دیکھے نہ سنے جنھوں نے
شہرستان سخن میں جھنڈے گاڑ دیئے اور بلند تلاشی کی اوج

حد سے سوا بڑھائی۔ مرثیہ کی زمین کو آسمان بنا دیا۔ چراغ آفتاب و مہتاب
کا اپنی روشنی فکر سے گل کر دیا۔ بندشیں اچھے اچھوں پر نہ کھلیں بلند پایاں
آسمان کے تارے توڑ لائیں۔ درحقیقت اس فن کے یکتا، آفتاب و
ماہتاب سے ہمتا۔ سوا ان کے اب کسی کی ہستی نہیں۔ واقعی ایسی کسی کو
سوجھتی نہیں اور جس نے کہا کچھ نہ سنا، بلکہ نہ کہنا اچھا۔ وہی اس طرز
کے موجد ہیں۔ اور تحت لفظ مرثیہ پڑھنے میں بھی فرد مفرد ہیں۔ ہر چند
اور بھائی میاں انیس کے مونس و انس اور صاجزادے مرزا کے
میاں اوج بھی یکتا ہیں۔ ان کی زبان گویا ہیں لیکن وہ وہی ہیں۔
لاریب اس طرز و تلاش کے موجد اصلی ہیں۔ یادگار مرزا دبیر
بصفت اسپ :۔

طے ہر قدم پہ ایک مہینے کی راہ ہے
اس پر ہلال نعل کی رویت گواہ ہے

یادگار میر انیس :۔

سرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
پانی کنوئیں میں اترا تھا سائے کی چاہ سے

اور مرثیہ خوانوں میں خواجہ باسط صاحب کے مزید دیکھا، مُردہ نے اور سُر
کے مسیحا۔ اگلے کاملوں اور نایکوں کی یادگار علم موسیقی کے عالم باوقار
میر علی صاحب یگانۂ روزگار، معاذ اللہ ان کو نایک کہا تو واقعی
ننگ ہے کہ ہر کامل اس فن کا ان کے میزان کردی میں پاسنگ،
الا اس میں ایسی دانست اور سوجھ بوجھ پائی کہ میاں تان سین
وغیرہ کی گو رہتا ہوئی۔ وہ سوز راگ و رنگ کے تائے کہ اچھے اچھوں کے
خیال میں نہ آئے۔ دور دور کے کامل سننے کو آتے اور جھک کر کان پکڑتے۔
راگ راگنی میں ان کے وہ اثر کہ چرند پرند تک سن کر بے خود ہو جاتے انسان تو
بشر۔ اور باایں ہمہ کمال، وضع داری ایسی تھی کہ سوائے اپنے گھر کے
کہیں امیر کیا، بادشاہ، کے یہاں زبان نہ کھولی چنانچہ جنت
آرام گاہ نواب سعادت علی خاں اسی حسرت دید اور شنید میں
رہے اور خفا بھی ہوئے مگر یہ رہ گئے۔ ان کے شاگردوں میں مولوی قومی
ہر دل آدمی اور میاں احمد علی عطائی خاصی سوجھ بوجھ کے تھے باز و
اور حوالی ان کے رہے۔ اور بعد میر علی صاحب کے ہم عصر ان کے

نواب سلطان علی خاں اس کام کے بڑے نامی ذی شعور اور نواب
حسین علی خاں سالار جنگ (جبکی) خوش گلو مشہور۔ نواب سلطان
علی خاں کے سُروں نے بہت دل گداز کیے۔ بہتوں کے بازار سرد
کر دیئے۔ اور نواب حسین علی خاں خوش گلو نے تو کلیجے نکال لیے ۔
جلت پھرت آواز کی دیکھی نہ جاتی۔ حلق میں گویا ہڈی نہ تھی۔ تانیں
متعلیں، دکھاتیاں، روحیں روشن ہو جاتیاں۔

باقی اور مرثیہ خواں غیر تحت لفظ خواں سوز خوانی میں سُریلے
نامی گرامی احمد علی خاں اور میر ذکی وغیرہ کی گنتی نہیں۔ یہ تو اریخ
ہے اسم نویسی نہیں۔ کتاب خوانوں میں میر محمد علی نابینا جن کا اس
وقت میں ثانی نہ تھا، انھیں نے اس راہ کو اچھا دیکھا اور بعد ازاں
ان کے ملا محمد زماں اور منشی غلام مرتضیٰ بلبل ہزار داستاں اور
نثر تحت لفظ میر اسرار علی نے ایسی پڑھی کہ ادغام مقدمہ تواریخ اور
حدیث سے مصائب بیانی میں حد کر دی۔

گویوں میں ہم عصر میر علی صاحب کے میاں شوری ٹپہ باز، نایاب
زمانہ، تان سین کے سے دم ساز اور ان کے بعد جانی اور غلام رسول

میاں اور سکھن دکھن کیسی کامل دھرپت اور خیال کے حاکم معقول، اب خیر زمانے میں میاں فضل علی، کاظم علی قوالی میں ایسے ہوئے کہ ان کے بھی نام تھے۔

بارے عہد سلطنت واجد علی شاہ بادشاہ میں ان فن والوں کی خوب پرستش ہوئی۔ دور دور سے لوگ آئے۔ اچھی صحبت رہی۔ ربابیئے، بین کار، سرود یے، کیسی کامل الفن اپنے کام کے یگانے۔ میاں جعفر، چھجو جان، گیاں خاں بہادر خاں، پیار خاں، حیدر خاں، غلام حسین خاں بین کار، رحیم سین دھرپت والے، ایسے کہ جن کے سامنے بڑے بڑے اس فن کے کامل منہ نہ کھول سکے۔ بخشو نے طبلہ ایسا بجایا کہ ناہید فلک نے حیرت سے ہاتھ دے مارا، اس کے سوا سارنگی بان نے ایسی بجائی کہ کسی نے کبھی اس پر طعن نہ کی۔

باقی درنیولا ایک اندھا عطائی چکارا ایسا بجاتا ہے کہ اچھے اچھے کاملوں کے ہوش اڑاتا ہے۔ ناچنے والوں میں پرکاش کھٹک کا ناچ ایسا سحر حلال جس کی آدجاد خیال میں نہ آئے ناہید فلک دیکھ کر چکرائے۔ اور کشمیریوں میں قائم علی بڑا کامل بلکہ اس فن کا مقصود حاصل۔ باقی رنڈیوں اور کسبیوں کا شمار نہیں کہ میرا کلک مرقع نگار نہیں۔

حافظوں میں حافظ و قاری وارث علی صاحب نامی تھے ایسے کہ مطلق ویسے دیکھنے میں نہ آئے۔ اب حافظ احمد علی خاں کا شہر میں کیا دور دور جواب نہیں۔ بہر صورت ان کی مدحت کا حساب نہیں۔ آواز وہ خوش آہنگ رنگین دیدہ در کہ بے اختیار سننے کو جی چاہے اور یادِ خدا کی ادا ایسی کہ شانِ خدا کی یاد آئے۔ لقمہ کھانا کیسا ان کے سامنے کسی حافظ کی دال نہ گلتی۔ اور رمضان المبارک کی تراویحوں میں روز کھڑے کھڑے دم بھر میں ایک قرآن کی نوبت آتی۔

قاریوں میں ملا محمد زماں اور احمد علی یک چشم وغیرہ ایسے ایسے کہ لکھے نہیں جاتے۔ حرف کیا جو ایک حرف بتشدد مد زبان سے نہ نکلے۔

خوش نویسوں میں حافظ ابراہیم اور حافظ مرزا حسن رضا عطاردِ رقم اور حافظ نور اللہ والد حافظ ابراہیم کے اور مرزا علی رضا جواہر رقم، جنھوں نے ندرت نگاریوں میں قلم توڑ دیے۔ اور دائرے حروف کے آفتاب کے ہالے سے ملا دیے، خط نسخ میر بندہ علی یک چشم نے ایسا لکھا کہ چشم بد دور اچھے اچھوں کو دیسا نہ آیا۔

علم ریاضی کے ماہر اور عامل اوّل مفتی محمد خلیل الدین خاں کاکوری سفیرِ سلطانی اس فن کے علم و عمل میں طاق تھے اور مولوی اسماعیل صاحب بھی بڑے مشاق تھے۔

علم حدیث میں یکتا مرزا حسن علی صاحب، امے صلِّ علیٰ اور مولوی فضلِ حق صاحب اور مولوی ولی اللہ صاحب اور مولوی سلامت اللہ صاحب، سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

علم تیراندازی میں میاں حسین بخش تیرانداز اور تیرساز بہبل اور سبحان علی خاں وغیرہ۔ وہ وہ جوان جن کے تیر و کمان پر شہاب ثاقب اور قوس قزح قربان۔

داستان گویوں میں اگلے زمانے کے میر قاسم علی، میر احمد علی لاثانی اور فی زمانا حکیم وارث علی اور رابنا پرشاد نے ایسی کہی کہ نہیں سنی۔ ان کی داستان اچھے اچھوں نے مانی ہے باقی اور سب کہانی ہے جن کی دس دس دن ایک ہی تلازمے میں بات رہی ایک طرح پر مہینوں دن رات اوقات رہی۔ الغرض دورِ دوراں کا نام ہے آگے قصہ تمام ہے۔

پیراکوں میں میرک صاحب نے کھڑی اور چھتی کی پیرائی ایسی تیری کہ مردم آبی کو شرم آئی۔ پانی میں خاک اڑائی۔ جیسے دریا میں آدھے دھڑ کی پتلی لگا دے۔ اور سوا ان کے خواجہ باقی اور میاں ہیموں اور میر احمد علی مخاطب بہ میر مچھلی ایسے استاد کہ جنھوں نے اس میں بڑی آبرو پائی۔ دریا کی آب و تاب بڑھائی۔

پٹہ بازوں میں یکتا میاں عظیم اللہ جن کے پٹے کے آدجاد کوئی کیا پوچھے۔ آنکھ کا سرمہ نکال لیں تو خاک نہ سوجھے۔ لکڑی بانک کے فن میں اگلے بنکیت پھنکیت استاد زمانہ شیخ نجم الدین اور رستم خاں، میر تقی میر محمدی وغیرہ فی زمانا مرزا بہادر علی بیگ مفتی گنجی یکتا، جن کے بانک کے پیچ باندھے ہوئے کسی سے نہ کھلے اور گتکے سے پرسکی سونا سپر آفتاب سے اتار لیں۔ اور بہادر علی بیگ تیر اور گولی کے کاٹنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے غلہ اور تیر کا سینٹھا

کاٹتے تو میں نے بھی دیکھا۔ میر کلو اور میر اکبر علی برچھیت ایسے ہوئے
کہ ایک عالم سے نوک کی لے گئے۔

شہ زوروں میں میر امام علی اور میر ولایت علی وہ تھے جن کا جواب
نہیں اور نیشا (کذا) اور قیاس سے باہر، واہ جی وا اور رہبر میر ان
صاحب اشرف آبادی کا کیا کہنا، جنھوں نے پھاٹک دو سو آدمی کی
طاقت کا ایک ہلکے ہاتھ سے چڑھا دیا۔ اور فی زمانا مرزا احمد حسین، مرزا
سیتا کو توال کے بھانجے ایسے کہ دیکھے نہ سنے۔ اچھے جوان بڑے
زوروں کے پہلوان۔ ایک چوکی پتھر کی بہت بھاری ایک ہاتھ سے
اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دی جو پھر آج تک کسی سے ہل نہ سکی۔

کشتی گروں میں اوّل سبحان خاں اور حیدر، میر بہادر علی سید
سالمین میر الہٰی بخش، میر لچو اور رشیدی لندھور حبشی نیک خو، پہلوان
یہ ایسے ایسے جو کبھی آسمان سے نہ جھکے ایک زمانے کو چت کیا
آپ اوپر ہی رہے۔

بانکوں میں نامی گرامی بے بدل اور ضرب المثل شیخ عابد، اور
حسن علی خاں مرزا جہانگیر بیگ فاضل خاں مرزا قربان بیگ صاحب
اتم حال ایسے تھے کہ جن پر بانکپن ختم ہے۔ علاوہ اس کے با وضع اور
سلیم الطبع آبرو والے ایک خوش خو، ململ کے کرتے اور انگرکھوں میں
کڑے رہے۔ تکمیل وضع پر اڑے رہے۔ گورنر جنرل کے روبرو نہ ٹکے
آئی پر نہ چوکے۔ اور مرزا قربان بیگ کو اب تک سب نے دیکھا کہ اس اسّی
نوے برس کے بڑھاپے کے سن میں شبنم اور ململ کے کرتے کے سوا
سب جاڑوں میں ایک دو پٹہ کے سوا چادر تک کاندھوں پر نہ ڈالا
اور جوانی میں نواب سعادت علی خاں کی سواری میں دو گھڑی کے
تڑکے ایام سرما میں اسی طرح سے جاتے رہے اور بغلوں کے پسینے
دکھلاتے رہے۔ سپر ان کی اچھی زبردست تین آدمیوں کا بوجھ تھی
پر وہ بے علی بند ہمیشہ مہتواسے (کذا) رکھنے پھول سا سمجھتے۔

صنّاعوں میں نواب حسین علی متخلص اثر نواب حیدر بیگ خاں
کے بیٹے نے دانت کی ڈبیا وغیرہ ایسی تراشی بھائی کہ بے مبالغہ مکھی لے
اڑتی۔ باقی اور ہر قسم کی نادر چیزیں وہ تراشیں جن کا جواب نہیں خوبی
اور نزاکت کا حساب نہیں۔ اور میر منور رکھیداں مفتی گنجی نے مٹی کی الائچی

ڈلی ایسی بنائی کہ وزیر بادشاہوں نے بڑے بڑے سمجھداروں نے
دھوکے کی طرح کھالی۔

خواجہ بدرالدین صاحب رسالہ دار خوش بیان شیریں سخن مرزا نامی
گرامی علم مصاحبت میں لاثانی انھوں نے طوطے اور کوّے صحرائی ایسے
سدھائے اور اڑائے کہ اشاروں میں آدمی کی صورت سمجھ کا کام کرتے، پر
جہاں سے اڑائیں، پاس کے سوا کہیں نہ جائیں۔ کبوتر بازوں میں محسن
نامی اور میر حسن علی نے کبوتر ایسا بنایا اور گانٹھا کہ مرغ زریں بن
گیا۔ تاج و چونچ کے علاوہ رنگ رنگ کے پر تمام اصلی پروں سے
گانٹھ دیتے۔ ایسے کہ کہیں پر معلوم نہ دیوے۔ اس میں موقلم تحریریں
اور بیلیں گلستان جو ایک گجرے کی صورت ہوتیاں۔

رمّالوں میں میر غلام حسین سعادت گنجی ایسے کمال کے آدمی کہ نہ
ہونی آگے کی خبر دیں۔ قرعہ پھینکیں تو عقدۂ لاحل کھولیں۔ غائب
کو حاضر دکھا۔ کوئی حکم پٹ نہ پڑتا۔

نجومیوں میں مرزا فدا حسین نجومی بادشاہی تاثیر کواکب سے تحقیقی
حکمی آگاہی، زمانہ چکر کھائے تو بھی ان کا سا ہاتھ نہ آئے۔ مولوی محمد نے
تپنگ ایسا اڑایا کہ ستار کی ڈور پر تپنگ تپا سا کھینچا اور چٹکی کے اشاروں
پہ بہت بڑھ کر کام کرتا۔ حلیت بھرت میں یکتا۔ ہر کہیں پیچ اکھاڑ دیتا
رہتا۔ اور چھوٹے تکل چار انگل کی تیج پانے پہ اوروں نے اڑائی (کذا)
جس نے ذری سی بت پر فلک پہ ہوا باندھ کر آسمان پہ تھگلی لگائی۔

میر نقش علی نے شطرنج ایسی کھیلی وہ کام کیا کہ چرخ شعبدہ
باز پر مہرے آئے اُن کو مات تمام کیا۔ گھوڑے خیالی ایسے دوڑائے
کہ لوگوں کے رخ چھوٹ گئے۔

مہاجنوں میں شاہ بہاری لال کا مثل نہ تھا نہ ہے بشاہی
ان کی بڑی عمدہ حلوہ کی تھی۔ عہد غازی الدین حیدر بادشاہ میں شاہ
نے، بہت اچھے رہے۔

اچھوں میں اچھا پنڈت دلا رام کشمیری جیکلہ دار بانگر کا سب سے
بہتر، بڑا نیک نیت، آدمی تونگر، اس کی نیکی اور نیک نیتی کا بیان
ہے کہ یہ اچھوں کے زمرہ کا نشان ہے۔ جس نے اپنے جیتے اور مرتے
بڑا نام کیا۔ تماشہ بینی اور خوش دلی کے ساتھ خیر کا کام کیا یہاں تک

کہ بارہ دری بہت بڑی محلہ حویلیاں میں حاجت روائی خاص و عام غربا اور اہل محلہ ہمسایہ کے لئے بنوا کر وقف کر دی۔ اور اس میں شادی اور غمی وغیرہ کے جملہ ضروریات دریاں، چاندنیاں، نمگیرے، قناتیں جھاڑ کنول، مرتکیاں، دیوارگیریاں، دنگل قالین، دیگیں خوان، خوان پوش وغیرہ تیار کر کے بھر دیے۔ اب تک جو غریب امیر رئیس ہمسایہ آتا ہے۔ بے تکلف کوٹھوں سے نکلوا لیتا ہے آج تک وہی چیز جاری ہے، بارے یہ خیر باقی ہے۔

بیان حقیقت غریب و عجیب: قیاس سے باہر سچ مچ نہایت خوش بختی کا ثمر جس کو طلسم حیرت افزا کہیے یا سراسر تصرف افضال جناب سید الشہدا سمجھیے۔ چلیے حقیقت بخشو اور خدا یار خاں کی ہے جن کی شہرت اور نمود نرالی ہے۔ یہ دونوں ہمدم شخص مجہول الوضع حقیر الجثہ پیشہ آرائش سازی کا کرتے اس میں جو ملتا اپنی گزران عیالی رکھتے۔ اس میں ان کی کارستانی اور بلند نامی اور خوش نیتی اور علو ہمتی کی بات خدا ساز ہے۔ انبار سے بہت بڑی بات ہے۔ بلکہ سراسر کرامات ہے۔ ایسے یک کہ لکھنؤ سے شہر میں وہ دونوں ایک۔ یہ عشرۂ محرم میں تعزیہ رکھتے اور ۲۶ صفر کو اٹھاتے۔ اس ٹھاٹ سے کہ دو ایک شب و روز پیشتر سے بہت سی دیگیں پلاؤ اور سالن تلی ہوئی ترکاری کی تیار ہوتیں اور اس میں سے ایک ایک طباق بڑا بھرا ہوا اور ایک ایک قفلی اسی کے موافق کی اور دو دو خمیری روٹیاں۔ ہزار ہا آدمی مجلسی کو بٹتیں۔ اور علاوہ اس کے سولہ سترہ اٹھارہ علم جناب عباس علیہ السلام کے فلک فرسا ہوتے اور ان کے نیچے غول کے غول غٹ کے غٹ چار چار، پانچ پانچ سو آدمی برہنہ سر ماتم کناں سینہ زنان ساتھ ہوتے۔ سوا ان کے لیے گروہ پیچھے دیگیں پلاؤ سالن کی مسلم ہر مقام پر مجمعوں کے پہنچائی جاتیاں اور وہاں ان کے طور پر تقسیم ہوتیاں۔ باقی اور سب لوازمے اس کے حقے تماکو (تمباکو) اگر یہ افیون کو بیلے وغیرہ بے پرسش بے انتہا ہر شخص کے لائق وفائق آ گئے مزدور اور سقے اور کہاروں کی گنتی نہیں۔ کثرت ہر قسم کی جلوس و ضروریات کی قیاس میں آتی نہیں۔ ہاتھی، سانڈنیاں، پلٹن سوار، رسوار، چوبدار، علم دار جھنڈے والے کل امرائے شہر اور شہریار کی سرکار سے آتے۔ سب علی قدر حال وقت رخصت انعام اور کرایہ پاتے۔ اس ٹھاٹھ سے تعزیہ معالی خان کی سرائے سے کربلا کو جاتا اور اہتمام میں اس کے ہر شریف گویا اپنی جان لڑا دیتا۔ تمام شہر کے لوگ زن و مرد بوڑھے بچے لنگڑے لولے سر چوک سے لیکر تا سعادت گنج و کربلا چھتوں اور کوٹھوں اور دو رویہ سڑک پر ہوتے۔ اور اسی کے لیے لوگ دو دو روز پیشتر سے کمرے کوٹھے کرایہ کو لیتے اس میں اکثر عمائد امرا بلکہ خود بادشاہ مستدعی رہے کہ کسی قدر یہ ہم سے لے لیکن کسی سے ایک حبہ کا لینا کسی طرح قبول نہ کیا۔ ہاں نہ ہی شرکت جلوس کی التجا البتہ کرتا۔ الحاصل یہ وضع اور قطع درحقیقت ایک کہانی ہے۔ بے شک برکات اور عجائبات کی نشانی ہے ورنہ کیا بساط اور اوقات ان غریب مزدوری پیشہ کی۔ چنانچہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ سے اب تک ہر سال یہی حال ہے گو بعد غدر کے وہ دونوں قضا کر گئے۔ پھر بھی کچھ کچھ ان کی عورات کی تدبیر اور حسن نیت سے وہ برکت بحال ہے۔ نام باقی رہ گیا ان کا انجام بخیر ہوا۔

الغرض ایسے ایسے لوگ استاد و کامل و نامور اس شہر میں تھے اور اب بھی پڑے ہیں، جن کے جھنڈے نام و نمود کے گڑے ہیں۔ آگے کتاب کو طول ہوتا ہے۔ مقدمہ فضول ہوتا ہے۔ واللہ بس باقی ہوس۔

★

محوی صدیقی

غزل

نہ وہ شباب نہ گلگشتِ لکھنؤ باقی
عجب کہ اے دلِ زندہ ابھی ہے تو باقی

نہ پوچھ اب تو نہیں کوئی آرزو باقی
ابھی تو ہے تہِ خنجر رگِ گلو باقی

ابھی ہے دل میں ترا ذوقِ جستجو باقی
ابھی ہے چاند ستاروں سے گفتگو باقی

ہنسیں نہ غنچہ و گل میرے چاک دامن پر
کہ اس جنوں میں بھی ہے ہمّتِ رفو باقی

گلوں کو ہے یہ گلہ گل فروش و گل چیں سے
کہ گل رخوں میں نہیں ذوقِ رنگ و بو باقی

انھیں سے پوچھ مری داستانِ تشنہ لبی
جو بزمِ عیش میں ہیں ساغر و سبو باقی

اس اپنی زندگیِ بے مزہ پہ مرتا ہوں
نہ کوئی غم نہ مسرت نہ آرزو باقی

تمام عمر پریشانیِ نظر نہ گئی
جو تم ملے تو رہی اپنی جستجو باقی

ہماری خاک کے ذرّوں کی یہ پرافشانی
ہنوز ہے ترے جلووں کی جستجو باقی

ملا کے خاک میں ہم کو کسی نے کیا پایا
جو آرزو نہیں، ہے خونِ آرزو باقی

قفس میں ہے کوئی ہم سا اسیرِ صیّاد
رہی ہے ولولۂ شوقِ رنگ و بو باقی

جنونِ عشق کو دینا ذرا کوئی آواز
ہنوز دل میں ہے کچھ پاسِ آبرو باقی

ضمیر زندہ ہے محوی، تو ہم سمجھتے ہیں
ابھی رگوں میں ہے اسلاف کا لہو باقی

مارچ ۱۹۰۵ء

نثار احمد صدیقی

ایک نا تحقیق غزل

دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان کے کلاسیکی شاعروں کے دواوین کا بھی مطالعہ کرنے سے بعض ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن پر قاری کو شک گزرتا ہے کہ یہ شعر یا تو الحاقی ہیں یا مرتب نے غلط فہمی کی بنیاد پر انھیں شریک کر لیا ہے۔ اس طرح کے بہت سے اشعار کے بارے میں تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ الحاقی ہیں یا غلط فہمی کے باعث شعرا کے دواوین میں شریک کر لیے گئے ہیں۔ بہرحال ایسے مسائل پر اردو کے مستند محققین نے بہت کچھ کام کیا ہے لیکن دورِ حاضر میں ان پر کم توجہ دی جا رہی ہے۔ حالانکہ ادب میں تخلیق و تنقید کے ساتھ تحقیق کی بڑی اہمیت ہے۔ تحقیق کے بغیر ادب میں تشکیک و غلط فہمی، الجھاؤ اور پیچیدگی کا جال سا بچھ جاتا ہے۔ کیونکہ کسی شعر یا کسی تخلیق کا غلط انتساب تذکروں یا تنقیدی ادب میں ایک بار راہ پا جاتا ہے تو وہ ہمارے محققین کی سہل پسندی کے باعث نقل ہوتا اور تحقیق کے میدان میں نو واردوں کے لیے گمراہی کا سبب بنتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں غالب سے منسوب کی جانے والی ایک غزل کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ اس غزل کو شوکت عظیم صاحب نے میرے حوالے کیا تھا اور جس دن سے میں نے یہ غزل پڑھی ہے، اس فکر میں ہوں کہ محققین سے رابطہ پیدا کر کے اس کی صداقت کا پتہ لگایا جائے۔ جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بھی عرض کر دوں کہ تقریباً پانچ چھ سال قبل یہ غزل موضوعِ تحقیق بنی تھی۔ بہرحال بعض محققین کی رائے میں یہ غزل غالب کی ہو سکتی ہے لیکن جب تک کوئی مستند ثبوت ہاتھ نہیں آ جاتا صرف قیاس کی بنا پر اسے تسلیم کر لینا درست نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر واقعی یہ غزل غالب کی ہے تو پھر اسے بعد میں شائع ہونے والے دیوان میں شامل کیوں نہیں کر لیا گیا۔ غزل یہ ہے:

ہر جستجو عبث جو تری جستجو نہ ہو
دل سنگ و خشت ہے جو تری آرزو نہ ہو

وہ آہ رائیگاں ہے نہ لگ جائے جس سے آگ
ان آنسوؤں پہ خاک کہ جن میں لہو نہ ہو

ممکن نہیں ہے حسنِ حقیقت کا دیکھنا
آئینہ مجاز اگر رو بہ رو نہ ہو

ہے کیف بادہ ہیچ ہے بے رنگ گل فضول
وہ حسن کیا کہ جس میں حقیقت کی بو نہ ہو

جی بھر کے خوب حسرت و ارماں کو رو چکا
اب آرزو یہ ہے کہ کوئی آرزو نہ ہو

غالب نمازِ عشق کی مقبولیت محال
جب تک کہ اپنے خونِ جگر سے وضو نہ ہو

میں نے اس سے متعلق ایک مراسلہ "ایک دعوتِ فکر" کے عنوان سے ہماری زبان (علی گڑھ) میں شائع کرایا تھا۔ اس مراسلے کے نیچے ادارہ کے جانب سے مندرجہ ذیل نوٹ تھا:

"یہ غزل مراسلہ نگار کو کہاں سے ملی ہے، اس کا خط میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس غزل کو غالب سے کن لوگوں نے منسوب کیا ہے اس کا بھی کوئی حوالہ نہیں ہے۔ یہ باتیں واضح ہونی چاہیے۔" (ادارہ)

پھر میں نے ادارہ و قارئین "ہماری زبان" کے معلومات کے لیے ایک

دعوتِ فکر کے بارے میں" عنوان سے یوں تحریر کیا تھا:

"بقول جناب شوکت عظیم صاحب آج سے تقریباً پانچ چھ برس قبل ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی طرف سے غالب اکیڈمی کے زیرِ اہتمام ایک ادبی اجتماع کیا گیا تھا، جس میں ایک مغنی شریک تھا۔ اس نے ترنم سے یہ غزل پڑھی تھی۔ اس کا نام محمد ایوب خاں معروف بہ بتن دیوانہ تھا، محلہ سورگراہ اجمیر شریف کا رہنے والا تھا۔ ہندستان کے مشہور موسیقار چاند خاں جو شاعر تھا اور چاند بیا تخلص کرتا تھا، وہ اُن ہی کے خاندان کا ایک فرد تھا۔ ڈاکٹر حکم چند نیّر نے اس مغنی سے اس غزل کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ "ایسے پرانے بکس سے ایک قدیم بیاض کے منتشر اوراق میں یہ غزل درج ملی تھی۔ حکم چند نیّر اور دوسرے لوگوں نے بہت سے سوالات کیے۔ لیکن مغنی پوری تفصیل سے جواب نہیں دے سکا اور اس نے کہا کہ "میرے خاندان کے کچھ بزرگ افراد تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے ہیں ان سے دریافت کرنے کے بعد جواب تشفی بخش دوں گا۔" حکم چند نیّر اپنے مضمون "غالب کی ایک غزل" میں جو یونم حیدرآباد میں شائع ہوا تھا، تحریر کیا ہے کہ اس مغنی سے بہت دنوں تک خط وکتابت کی لیکن عدم جواب کی صورت میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔"

مندرجہ بالا مراسلہ شائع ہونے کے فوراً بعد جناب مطہر ہوشیارپوری کا ایک مختصر مضمون "نثار احمد صدیقی کے مراسلے کے بارے میں" کے عنوان سے شائع ہوا جو مندرجہ ذیل ہے:

"مذکورہ غزل کا مقطع اور غزل کے تیور دیکھ کر بلا ہچکچاہٹ یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ یہ غزل غالب کی ہے۔ کیونکہ دیوان غالب میں اس قبیل کے کافی شعر مل جاتے ہیں۔ مثلاً

خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خوں چکاں نہیں

ہے ننگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عار دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے

اس کے علاوہ دل کو سنگ وخشت اور کیفِ بادہ کو ہیچ وغیرہ کہنا بھی معمولاتِ غالب میں شامل ہے۔ مگر مقطع میں "نمازِ عشق" کی ترکیب غالب کا تخلص ہونے کے باوجود اس بات کی غماز ہے کہ یہ غزل غالب کی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دیوان غالب میں لفظ "نماز" کا کہیں ذکر نہیں ہے اور غالب وہ شاعر ہے جو اپنی پسندیدہ تراکیب والفاظ کو بار بار استعمال کرتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ غزل غالب کی نہیں ہے تو پھر کس کی ہے۔ اس کے لیے ہمیں ایسا شاعر ڈھونڈنا ہوگا جس کے کلام میں ترکیب ومضامین غالب کو بکثرت استعمال کرنے کی سعی پائی جاتی ہو۔ ایسے شاعر اردو میں دو ہیں ایک فانی اور دوسرے یوسف حسین علی خاں ناظم۔ مگر ان دونوں کے مطبوعہ دواوین میں یہ غزل نہیں ملتی۔ فانی کا تو خیر اسلوب وبیان ہی غالب سے مختلف ہے۔ ہاں ناظم کا اسلوب وبیان ومضامین اکثر غالب والے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ناظم کا کلام کلی غالب کی کاوش واصلاح کا مرہونِ منت ہے گو ناظم کے مطبوعہ کلام میں یہ غزل شامل نہیں ہے، "تاہم اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ یہ غزل ناظم کی ہے۔ ۱۹۶۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کے قلمی نسخوں میں ایک نسخہ بعنوان ۵۰۲ مصحف موجود تھا۔ اس میں "ہو نہ ہو" "آرزو نہ ہو" کی ردیف وقافیہ میں ایک سو غزلیں نقل ہیں۔ غالباً یہ کسی مشاعرہ کی روداد ہے۔ بر نسخہ میں غزل ناظم کے تخلص سے موجود ہے مگر مطلع میں تھوڑا سا تفاوت ہے۔ "ہر جستجو عبث جو تری جستجو نہ ہو" کی جگہ "وہ جستجو نہیں جو تری جستجو نہ ہو" تحریر ہے۔ نسخہ کے آخر میں کسی غیاث الدین رام پوری کی مہر ثبت ہے اور اس کے نیچے "دوشنبہ ۱۸ رجادی الثانی ۱۲۸۵ھ بہ مطابق سی۔ ام ومبر ۱۸۶۳ء درج ہے" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رام پور کے کسی طرحی مشاعرہ کے لیے یہ غزل غالب نے یوسف حسین خاں ناظم والی رام پور کے لیے کہی ہوگی اور کسی طے شدہ معاملہ یا کسی مصلحت کی بنا پر مقطع میں اپنا تخلص لکھ دیا ہوگا جس کو نواب نے خود ناظم میں بدل دیا ہوگا۔"

مندرجہ بالا مضمون سے پوری بات سمجھ میں تو آجاتی ہے لیکن ایک سوال پھر بھی تشنہ رہ جانے کی وجہ سے "یہ غزل کس کی ہے" کے حوالے سے کچھ سوالات کیے جو مندرجہ ذیل ہیں :

" تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ غزل غالبؔ کی ہے یا ناظمؔ کی؟ کیونکہ مضمون نگار نے آگے تحریر کیا ہے کہ یہ غزل غالبؔ کی تھی جو کسی مصلحت کی بنا پر مقطع میں غالبؔ کی جگہ ناظمؔ کر دیا گیا، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ غزل ناظمؔ ہی کی ہو اور لوگ غالبؔ سے منسوب کر رہے ہوں۔ مضمون نگار اپنے استدلال کے سلسلے میں ایسے مستند حضرات کے نام پیش کریں جنھوں نے "وہ سخن" دیکھا ہو، تب ہی کوئی ٹھوس قدم اٹھایا جا سکتا ہے ۔"

لیکن اب تک ان سوالوں کا جواب نہیں مل سکا۔ خود مضمون نگار صاحب بھی اس کے بعد خاموش ہو گئے۔ البتہ جب یہ سلسلہ "ہماری زبان" میں چل رہا تھا تو میں اس درمیان چند ماہر غالبیات اور دیگر محققین سے خط و کتابت کے ذریعے اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذیل میں اس سلسلے کے چند دانشوروں اور محققوں کے جوابات نقل کیے جاتے ہیں۔

مولانا امتیاز علی عرشی

(۱) " . . . آپ کی مرسلہ غزل میں نے پڑھی۔ یہ غزل غالبؔ کی ہے یا نہیں۔؟ اس بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، ہاں۔! یہ ضرور ہے کہ غالبؔ کا کسی مجموعۂ کلام میں اس کا پتہ نہیں۔ نہ کسی ایسے معتبر شخص کی زبانی سنی گئی جو غالبؔ سے خصوصی علاقہ رکھتا ہو۔

ادھر گزشتہ ۲۵۔۳۰ برس میں غالبؔ کے نام سے بہت سی غزلیں کہہ کہہ کر شائع کی جا چکی ہیں۔ چونکہ یہ غالبؔ کے کلام کو سامنے رکھ کر کہی گئی تھیں اور کہنے والے پڑھے لکھے صاحب ذوق اصحاب تھے، اس لیے ان میں غالبؔ کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ اس بنا پر اکثر اصحاب نے دھوکا کھایا اور آج تک دھوکا کھا رہے ہیں۔ مگر مخزن راز کے ہاتھوں یہ راز طشت از بام ہو چکا اس لیے میں بغیر مستند شہادت کے صرف رنگ تغزل کو دیکھ کر کسی شعر کو غالبؔ کا نہیں مانتا یہ غزل بھی میرے نزدیک جعلی ہے غالبؔ کی نہیں ہے۔

سیاد

(۲)"۔۔۔۔۔ رنگ کلام کوئی دلائل نہیں ہے۔ بسا اوقات
یا متبع اسی رنگ میں غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ رہا اس کا مقطع ناظرؔ
تو ان کے دیوان کے کسی ایڈیشن میں یہ غزل نہیں ہے۔!

پروفیسر احتشام حسین (مرحوم)

نثار صاحب!

خط ملا، رنگ کلام سے غالبؔ کی غزل ہے لیکن میں یقین سے
کہہ سکتا۔ آپ مالک رام سے خط و کتابت کیجیے شاید وہ کچھ بتائیں۔

ابرارحسنی گنوری (مرحوم)

". . . . . یہ غزل غالبؔ کی نہیں ہے" ان کے کسی شاگرد کی
معلوم ہوتی ہے لیکن میں بغیر مستند شہادت کے کسی شاگرد کا نام بھی
لے سکتا ہوں۔

شمس الرحمان فاروقی

. . . . جس غزل کے بارے میں آپ نے استفسار کیا ہے
تک مجھے یاد آتا ہے) نواب یوسف علی خاں ناظمؔ شاگرد غالبؔ کی ہے
شیخ محمد اکرم صاحب کا کہنا ہے کہ ناظمؔ کے نام سے جو غزلیں مشہور ہیں
خود غالبؔ کی کہی ہوئی ہیں۔ حالانکہ یہ بات دل کو جچتی نہیں کیونکہ غا
اور ناظمؔ میں سلسلہ تلمذ زیادہ دن قائم نہیں رہ سکا۔ ناظمؔ کا دیوا
رام پور لائبریری میں موجود ہے۔ آپ امتیاز علی عرشی کے صا
زادے جناب اکبر علی خاں صاحب کو خط لکھیے۔ شاید کچھ پتہ چ
ویسے اس غزل کے سلسلے میں حکم چند نیرؔ کا مضمون "صحیف
کے غالبؔ نمبر میں چھپا ہے۔ انھوں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ غزل ک
ہے۔ غزل غالباً ناظمؔ ہی کی ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

غالبؔ کے چند شاگردوں نے ان کے رنگ میں شاعری کی ہے۔ کیونکہ
غزل میں غالبؔ کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے
یہ غزل نواب یوسف ناظمؔ کی ہے۔ ویسے آپ چند اصحاب سے معلو
کریں تو بہتر ہوگا۔

پروفیسر کرامت علی کرامت

آپ نے غالبؔ کی جس غزل سے متعلق لکھا ہے اس کے بارے میں میری دا

ہے کہ یہ غالب کی نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں بعض ترکیبیں ایسی ہیں جو بعد میں ہمارے ادب میں آئی ہیں۔"

پروفیسر علی حیدر ملک

۔ ۔ ۔ غالب کی غزل کے متعلق ابھی میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں ویسے یہ غزل غالب کے اصل تیور سے عاری معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات محض غزل دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔

ظہیر غازی پوری

۔ ۔ ۔ غالب کی غزل کے متعلق میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ غزل ناظم کی ہے لیکن مستند شہادت نہ رہنے کی وجہ سے خاموش رہنا بہتر سمجھتا ہوں۔

ان اقتباسات نیز میرے استفسار اور جوابی تحریر کی روشنی میں محققین اور ماہر غالبیات یہ فیصلہ کریں کہ یہ غزل غالب کی ہے یا ناظم کی لیکن جو فیصلہ بھی ہو وہ مستند شہادت کی روشنی میں ہونا چاہیے اس لیے میں ماہر غالبیات و محققین کو ایک بار پھر دعوت فکر دیتا ہوں تاکہ اس غزل کے بارے میں حقیقت حال واضح ہو جائے اور تحقیق کی صنف میں ایک گراں قدر اضافہ ہو۔ امید ہے کہ ادبا اور شعرا توجہ دیں گے۔

★

غزل

منظر سلطانپوری

بڑا مہیب، بڑا دردناک منظر تھا
نظر کے سامنے اک کرب کا سمندر تھا

چمک رہا تھا جو تارا ہمارے ماتھے پر
وہ اک سلگتی ہوئی رات کا مقدر تھا

وہ گفتگو سے تو لگتا تھا کس قدر مخلص
مگر چھپائے ہوئے آستیں میں خنجر تھا

جو خواب ٹوٹ گیا ٹوٹ کے بکھر بھی گیا
مرے خیال کا وہ اک حسین منظر تھا

کیا تھا جس نے تجھے سارے گاؤں میں بدنام
وہ آدمی تو مرے جسم ہی کے اندر تھا

یہ اور بات ہے ہم اس سے کام لے نہ سکے
مگر شعور کا جوہر ہمارے اندر تھا

کبھی بھی تان کے چادر نہ سو سکا منظر
اک ایک لمحہ مرے وقت کا ستمگر تھا

عشرت ظہیر

(افسانہ)

پگھلتا وجود ابھرتا وجود

وہ اپنے وسیع گارڈن میں ایزی چیئر پر لیٹی (JAMES JOYCE) کی (ULYSSES) کے اوراق میں شعور کی رو میں بہتے بہتے اپنی بے ربط زندگی کے سلسلے کو مربوط کرنے کی غیر شعوری کوشش کرنے لگی خزاں کی آمد آمد تھی درختوں کے پتے زردی مائل ہو چکے تھے۔ جن پتوں پر خزاں پوری طرح حاوی ہو چکی تھی۔ وہ پیڑ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور ایزی چیئر کے ارد گرد پھیلتے جا رہے تھے ـــــ ایسے ہی خزاں زدہ پتوں میں سے ایک رباب کے چہرے کو چھوتا ہوا اس کی کھلی کتاب پہ آگرا، وہ چونک پڑی، اس نے پتے کو ہاتھ میں لیا، درخت کی جانب تکا جہاں سے یہ گرا ہوگا، اور یک لخت اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ باغ میں ہوا کے ہلکے ہلکے خوشگوار جھکڑ چل رہے تھے، لیکن اسے لگا، جیسے آندھیاں چل رہی ہوں۔ اس نے سوچا کل تک ان پتوں پر بہار تھی۔ ان کا سبز سبز رنگ ان کی بھرپور زندگی کی گواہی دے رہا تھا، اور آج کچھ بھی نہیں! وہ خوش کن لمحات کہاں گئے ـــــ؟ اس کی نگاہیں ایزی چیئر کے ارد گرد پھیلے پتوں پر پھسلتی چلی گئیں ـــــ درخت سے کٹ کر یہ کس قدر بے بس ہو گئے ہیں! ہوا کا ہلکا سا بھی جھونکا انہیں جدھر چاہے اڑا لے جائے گا ـــــ اچانک اسے لگا یہ زرد زرد اداس اداس پتے نہ ہوں بلکہ اس کی زندگی کی کتاب کے کھلے اوراق ہوں، اس کی زندگی کے رباب کے ٹوٹے ہوئے بے جان تار ہوں ـــــ اچانک اس کا دل بے چین ہو اٹھا اور وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی ـــــ "چرمر چرمر" کرتے ہوئے ان پتوں پر گزرتی ہوئی وہ بیڈ روم میں جا کر بے سدھ سی گر پڑی۔ اختر بالکل اچانک ہی اس کی زندگی سے کٹ گیا تھا اور اس دن بھی وہ [illegible] بیڈ روم میں آکر بے سدھ سی گر پڑی تھی، جانے اس دن اختر کو کیا ہو گیا . . . . .

چلتی ٹرین کے انجن کا دھواں اگلتا ہوا یہ روپ پتہ نہیں کیوں اختر کو اتنا سندر لگتا کہ وہ جب بھی سفر کرتا، انجن کے بعد والے ڈبے میں ہی بیٹھتا اور جب ہوا کے دوش پر انجن کا سفید سفید سیاہ سیاہ دھواں پیچھے کی طرف فضا میں تیرنے لگتا وہ فٹ بورڈ پر کھڑا ہو کر اس منظر میں کھو جاتا جانے ان دھوؤں میں اتنی کشش کہاں سے آجاتی ـــــ! لیکن اختر کے لئے یہ نئی بات تو نہ تھی، پھر اس دن اسے کیا ہو گیا تھا ـــــ؟

مسہری پہ بے سدھ پڑے پڑے رباب کو نیند آگئی اور دل کا غبار آنکھوں میں سما گیا پھر چاروں طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ سفید سفید، سیاہ سیاہ دھوؤں کے مرغولے میں اچانک ہی اسے اختر کا سنہرا چہرہ نظر آگیا، بس ایک لمحہ کے لئے، اور پھر! اور پھر گاڑھا گاڑھا بھیانک اور سیاہ دھواں چھوڑتی ہوئی ٹرین یوں گزر گئی کہ اختر ان میں کھو کر رہ گیا ـــــ!

شام کا اندھیرا کائنات کو اپنی آغوش میں پوری طرح لے چکا تھا ملازمہ نے آکر رباب کو جگایا۔

"بی بی جی! نیند میں آپ رو رہی تھیں؟"

"رو کہاں رہی تھی، دیکھتی نہیں دھواں ہی دھواں پھیلا ہے، آنکھوں میں پانی آگیا ہوگا"

"یہ دھواں کہاں ہے بی بی جی" ملازمہ نے حیرانی سے چاروں

دیکھا ــــ رباب اسے جواب دیئے بنا ہی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی
باتھ روم کے شیشے میں اس نے اپنا عکس دیکھا تو دل پر چوٹ سی پڑی،
آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے پڑ گئے تھے، سرخ و سپید چہرہ دھواں
دھواں ہو رہا تھا اور ماتھے پر جھومر کے لٹکتی ہوئی لٹوں میں چند ایک
بال چاندی کے تار سے چمک رہے تھے۔ اس نے سوچا ماضی کے
خوش کن لمحات یا بہار کے دن صرف دو سال کی مدت ہی میں ان سفید
سفید سیاہ دھوؤں میں گم ہو گئے۔ اور اب ان کی سیاہی
ایک اور گہری ہوتی جا رہی ہے، اور یہ میرے حال کو پوری طرح
ڈھک چلے ہیں، اور مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں، یہ مستقبل کی
طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

"اب میں کیا کروں، میں کیا کروں ــــ"

باتھ روم سے نکل کر وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی جانے سے کیا سوچ رہی تھی کہ
اسی وقت سات سال کا خوبصورت سا لڑکا اندر داخل ہوا یہ نیلم کا لڑکا
تھا۔

"آنٹی! ہمارے یہاں کا ٹیلی فون خراب ہو گیا ہے، ممی نے ٹیلیفون
یہاں فون کرنے کے لیے کہا ہے۔"

"تو دیکھ لو ــــ" رباب نے بجھے بجھے سے لہجے میں کہا اور بچے کو حسرت
بھری نگاہ سے دیکھنے لگی ــــ اس نے سوچا، آج اختر ہوتا تو کیا ہمارے
گھر کا رباب اتنی ہی خاموش ہوتا، کیا اس کے ایک ایک تار
یوں ہی جدا ہو کر بکھر گئے ہوتے ــــ وہ تو شادی کے پہلے سب
سال آزادی سے گذارنا چاہتے تھے، کسے پتہ تھا دو چار برسوں
میں اس قدر ویرانی چھا جائے گی ــــ سات سال ہو گئے میرے
من کے سورج کو ڈوبے ــــ اختر کہا کرتا تھا، میں ہر جگہ تمہارے
ساتھ رہوں گا۔ روشنی میں، تاریکی میں، لیکن اب وہ باتیں بکھر چکی
ہیں اس اندھیارے میں خود اختر بھی تو گم ہو چکا ہے ــــ لیکن
اس دن اختر کو ہو کیا گیا تھا، فوٹ بورڈ پر سفر کرنا تو اس کا معمول
تھا۔ آج وہ ہوتا تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔ !

بچہ رباب کے دل کے تار کو چھیڑ کر جا چکا تھا۔
اس رات رباب ذرا بھی سو نہ سکی، ایک نامعلوم سی خلش تھی

ایک ان دیکھا احساس تھا جو کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا، وہ دردہ کروٹ
پر کروٹ بدل رہی تھی سوچ رہی تھی۔ سلگ رہی تھی ــــ

دوسرے دن کالج جانے کو اس کا دل ذرا بھی نہ چاہ رہا تھا لیکن
سارا دن یوں خالی خولی گزارنا بھی اس کے بس میں نہ تھا مجبوراً وہ کالج
کے لیے روانہ ہو گئی۔ اس دن اس نے میک اپ کچھ گہرا کیا تھا دراصل
وہ اپنے چہرے پر پھیلتے ہوئے دھوئیں کو مستقبل کی راہ سے ہٹا دینا
چاہتی تھی اسے مستقبل کی فکر تھی، اسے مستقبل چاہئے تھا ــــ!
اسٹاف روم روز کی طرح قہقہوں سے گونج رہا تھا اگرچہ اس
کے کلاس کا گھنٹہ ہو چکا تھا، لیکن اس نے محسوس کیا کہ آج وہ بکھر سی
گئی ہے۔

"ہلو رباب۔"
"ہلو" اس نے ۔۔۔ کہا اور ۔۔۔ فیروزہ ہمدانی کی طرف دیکھا
ان کی آنکھوں ۔۔۔ کی ۔۔۔ چمک تھی
"چلو کینٹین میں بیٹھتے ہیں" پروفیسر فیروزہ ہمدانی نے رباب کو اپنی طرف
کھینچتے ہوئے کہا۔
"کینٹین میں بیٹھے ہی پروفیسر ہمدانی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا"
رباب ۔۔۔ تمہاری جوانی ڈھلتی جا رہی ہے، تم اپنا غم
تم ہی جانو، لیکن میری آنکھوں میں آج بھی وہ سیاہ رنگ کو دیکھا
جا سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ خاموش رہی اس نے پروفیسر ہمدانی کی باتوں کا کوئی جواب
نہ دیا وہ بولتی رہی، بولتی رہی ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے قبل پروفیسر ہمدانی کو ایسے
موقعوں پر بار بار چھیڑ چکی تھی، آج پتہ نہیں رباب کو کیا مانع ہو گیا تھا
پروفیسر ہمدانی کو معلوم کیوں ڈھیل دے رہی تھی جذبات کے
اظہار کے لیے الفاظ کو تول رہی تھی پتہ نہیں کیوں آج اسے لفظوں کی
کم مائیگی کا احساس شدت سے ہو رہا تھا ــــ
اس رات جب وہ بستر پر گئی تو اور بھی بے چین تھی پچھلے سات سالوں
سے وہ جس اذیت کو برداشت کرتی آئی تھی، اچانک ہی اس نے گھٹن اور
بے چینی کا روپ دھار لیا اور اسے مضطرب کر رہا تھا ــــ!
صبح ستار بابا کے بیٹے اسے یاد آیا کہ اختر ایکسیڈنٹ سے چند

روز قبل کہہ رہا تھا:

رباب! زندگی کی راہوں میں اکثر وہ لمحہ بھی آتا ہے جب بھیانک اور غلط راستے ایسے پرپیچ ہو جاتے ہیں کہ وہ بڑے سمندر دکھائی دیتے ہیں ...... ایسے ہی سمندر جیسے آسمان کی جانب تیرتا ہوا سفید سفید دھواں ..... انسان کی قوت مدافعت اگر مضبوط ہو تو وہ ان منفی لہروں کو منتشر کر دیتا ہے، نہیں تو مثبت لہریں ایسے ہی کھو جاتی ہیں جیسے اوپر آسمان میں جا کر دھوئیں کے مرغولے ... "

رباب باتھ روم سے باہر آئی تو اس نے محسوس کیا، شاید باتھ کا پانی کافی ٹھنڈا تھا، جس نے انگاروں کو سرد کر دیا تھا ـــــ اور اب اس کا دل دھلے آسمان کی طرح صاف تھا لیکن آنکھیں پھر بھی ویران ـــ! تاہم ان ویران آنکھوں سے بھی وہ مثبت اور منفی لہروں کا رقص دیکھ سکتی تھی۔

چند دنوں کے بعد کالج میں گرمی کی لمبی تعطیل شروع ہونے والی تھی اس نے سوچا، یہ چھٹیاں اختر کی چھوٹی بہن شاہدہ کے یہاں گزارو‌ں گی۔ اختر شاہدہ سے انتہائی محبت سے پیش آتا تھا۔ شاہدہ اس کی بھی تو بڑی اچھی سہیلی تھی بلکہ پہلے تو سہیلی ہی تھی لیکن اختر کی موت کے بعد یہ دونوں رشتے ٹوٹ گئے۔ سارے رشتے ٹوٹ گئے! پتہ نہیں اختر کا پاؤں فوٹ بورڈ سے کیسے پھسل گیا .. "

رباب جب شاہدہ کے یہاں پہونچی تو اس نے بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ خوشی کے آنسو دونوں کے پلکوں کو بھگو گئے۔ گلے مل کر اپنے آنسو دونوں نے ہی بڑی خوبصورتی سے چھپا لیے ـــ!

کبھی کبھی شاہدہ کے پیارے پیارے بچوں کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی لیکن وہ ان منفی لہروں کو منتشر کر دیتی۔ آہستہ آہستہ ان بچوں میں اس نے اپنے وجود کو سمیٹنا سیکھ لیا۔ ایک رات، صرف ایک رات ایسا ہوا کہ اس نے شاہدہ کو فیروز کی باہوں میں سمٹتے ہوئے ایک ساعت کے لیے دیکھ لیا جو اسے گھنٹوں تڑپاتی رہی۔ لیکن صبح ہوتے ہوتے بھیانک اور غلط راستے کی سرنگ کے جال سے اس نے خود کو نکال لیا ـــــ

اور ـــ! اور پھر چھٹیاں یوں بیت گئیں۔ جیسے شروع ہی نہ ہوئی ہوں۔ واپس جانے کی اس کی ذرا بھی خواہش نہ ہوئی لیکن خوشی اور بے فکری کے ایام اس طرح پھر ہو گئے جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو۔

خورشید سے اسے اس درجہ انسیت ہو گئی تھی کہ اسے چھوڑ کر جانے کا اس کا دل ہی نہ چاہ رہا تھا، اس نے گمبھیر لہجہ میں شاہدہ سے کہا بھی تھا:

"گھر میں تنہا رہتے رہتے اوب گئی ہوں، تم کہو تو خورشید کو ساتھ لیتی جاؤں، اسے کوئی تکلیف نہ محسوس ہونے دوں گی مزے سے پڑھے گا۔ کھیلے گا اور میرا دل بھی الٹے سیدھے خیال کی یورش سے آزاد رہے گا ـــ"

"اس کے ڈیڈی جانے دیں تب نا!" وہ کہیں جانے ہی نہیں دیتے، ابھی بچہ بھی ہے ہم سے الگ رہ بھی نہ پائے گا۔ اور تمھیں تنگ کر ڈالے گا۔ بڑا ہونے دو میں خود پہونچا دوں گی۔"

رباب کا دل بجھ سا گیا آتے آتے اس نے خورشید پر حسرت بھری نگاہ ڈالی اور دکھ کے ساتھ سوچا، دوسرے کا بچہ دوسرے ہی کا ہوتا ہے ـــــ اور یوں جو چنگاری بجھ سی گئی تھی، آنچ دینے لگی ـــ!

رباب اپنے وسیع گارڈن میں ایزی چیئر پر لیٹی JAMES JOYCE کی کتاب "('A PORTRAIT OF THE ARTIST') میں منہمک تھی کہ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اس نے کتاب بند کر دی اور آنکھیں موند کر ایزی چیئر پر لیٹی لیٹی بارش کے چھینٹوں سے لطف لینے لگی۔ تقریباً بیس پچیس منٹ بعد وہ وہاں سے اٹھی اور اندر باتھ روم میں چلی گئی۔ اس رات اس کا بدن پھر کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا ـــ!

اس دن پروفیسر عادل کی پارٹی میں بڑی رونق تھی۔ بڑی گہما گہمی اور چہل پہل تھی! لیکن رباب پھر بھی تنہا اور اکتائی ہوئی تھی ـــ رات گئے



صدر جمہوریہ جناب فخرالدین علی احمد کی ۱۰ دسمبر کو اموسی ہوائی اڈے پر آمد
تصویر میں گورنر اتر پردیش ڈاکٹر ایم چنا ریڈی اور وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری
ہیم وتی نندن بہوگنا صدر جمہوریہ کا استقبال کر رہے ہیں

صدر جمہوریہ کی لکھنؤ میں [illegible] ایکال [illegible] سے سپاسنامہ پیش کیا گیا





گورنراترپردیش شری ایم چنا ریڈی ۲۶ جنوری کو پریڈ گراؤنڈ پر فوج، پولیس اور این سی سی کی مشترکہ سلامی لے رہے ہیں







[illegible] جناح اسپورٹس سٹیڈیم [illegible] ہاکی ٹیم کی کھلاڑیوں سے مصافحہ [illegible]







مریا علی تمتر نی میم وتی سدن سوگما امریدنتیں آرکا نیور لکھنؤ میں
۲ حنوری کو مایجی دت ورات اورسوات ستی کی استاق
کرتے ہیں

و یا علی ، ریذتیں یونانی میڈیکل کالج کا یو میں
۲۲ د ن کو مدنی ہال کا سنگ مادر رکھے ہوے

تہیدا سمارک لکھنؤ پر ۳ حنوری کو رام دھن کسانی اور
دیپ دال کا ایک مسط دات ، ورمہ مالات تتری برائی دت
تیواری دیپ ال کر رہے ہیں ▼





تک شراب اور موسیقی کا پروگرام چلتا رہا، اور رباب تنہائی کے احساس میں تڑپ محسوس کرتی رہی، جوان جوڑوں کو رقص کرتے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہی ــــــ سسکتی رہی ــــ!

واپسی کے وقت ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی اور وہ پروفیسر ہمدانی کی کار میں بیٹھی انگاروں پر لوٹ رہی تھی ــــ پروفیسر ہمدانی نے محسوس کیا کہ اب نہ جانے کسی وقت بھی ابل سکتی ہے ــ!

پروفیسر ہمدانی کی کوٹھی پہنچتے پہنچتے بارش تیز ہو چکی تھی، حالانکہ رباب کا مکان بھی چند قدم کے فاصلے پر تھا، لیکن پروفیسر ہمدانی نے اسے روک لیا۔ پروفیسر ہمدانی کا کمرہ گرم اور پرسکون تھا ــــ رباب کو ایسا ہی محسوس ہوا۔

رات کے پچھلے پہر رباب پروفیسر ہمدانی کی کوٹھی سے باہر نکلی تو بارش ختم ہو چکی تھی اور سویرا ہوتا معلوم پڑ رہا تھا ــــ اس سویرے کے بارے میں سوچتے سوچتے، جس کے آثار ابھی سے نظر آرہے تھے، وہ چلی جا رہی تھی کہ اچانک اس کا پیر کیچڑ میں جا پڑا اور اسے اپنا سارا وجود کیچڑ میں دھنستا معلوم ہوا، پھر چاروں طرف دھواں دھواں سا ہونے لگا اور اس نے اپنے وجود کو اس میں تحلیل ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ گھبرائی اور گھبرا کر دھوئیں کی چادر سے پار دیکھنے کی کوشش کرنے لگی افق پر آفتاب طلوع ہو رہا تھا ــــ!

★

ــــ کے ــــ یگانہ اور صفی

ــ کا یہ مضمون جون ۱۹۷۴ء میں "لکھنؤ
کے زیر عنوان تقریر کی شکل میں نشر
کے پیش نظر اسے آل انڈیا ریڈیو کے
ع کیا جا رہا ہے۔ (اڈیٹر)

میں آئے۔ یگانہ اور صفی کے معاملے میں بھی ان ہی اسباب کی کارفرمائی رہی۔ یگانہ عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں اقامت کی غرض سے لکھنؤ آئے۔ پھر ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ ہی کے ایک شریف گھرانے میں شادی کرلی۔ یگانہ شاعر تھے، نقاد تھے، محقق تھے اور زباں دانی کے ساتھ صاحب زبان ہونے کے بھی مدعی تھے۔ یگانہ کے ایک استاد شاد عظیم آبادی تھے۔ لکھنؤ کے شعراء اور نقاد، شاد کو نہ تو شاعر ماننے کے لیے تیار تھے، نہ صاحب زبان جانتے۔ جنوری سنہ ۱۹۰۹ء کے دو شماروں میں اور اکتوبر سنہ ۱۹۰۹ء کے ایک شمارہ میں اودھ پنچ میں شاد کی غزلوں پر اعتراضات کیے گئے اور ان کی زباں دانی پر کھل کر چوٹیں کی گئیں۔ جنوری میں جو اعتراضات شائع ہوئے، وہ نقاد لکھنوی کے نام سے تھے اور اکتوبر میں جو مراسلہ شائع ہوا، وہ سخن پرداز کے نام سے تھا۔ ان مراسلوں کے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں۔

حضرت شاد کی سخن سنجی (اودھ پنچ، جنوری ۱۹۰۹ء)

"ڈیر پنچ۔ خان بہادر سید علی محمد صاحب، شاد عظیم آبادی کو میں جانتا ہوں کہ وہ پرانے سخن سنج ہیں۔ بہت دنوں کے بعد ان

سبادور کے قلمی معاونین سے گزارش ہے کہ وہ اشاعت کے لیے اپنا تخلیقات خوشخط، واضح اور حاشیہ چھوڑ کر صفحے کے صرف ایک جانب لکھنے کی زحمت فرمائیں۔ مسودات پنسل، ڈاٹ پن یا بہت باریک خط میں لکھے ہوئے نہ ہوں اور نہ ان کی کاربن کاپی بھیجی جائے ورنہ ان کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا اور ادارہ انہیں معذرت کے ساتھ واپس کرنے پر مجبور ہوگا۔ ہر مسودہ پر مضمون نگار یا شاعر کا نام اور پتہ بھی صاف صاف درج ہونا چاہیے تاکہ عدم اشاعت کی صورت میں اسے واپس کرنا ممکن ہو سکے۔

مارچ ۷۵ء

کاکلام آج اتفاق سے دیکھ لیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ مشق کرتے کرتے ان کی طبیعت فن اور صحت محاورات کے کوچوں میں راست رو ہوگئی ہوگی لیکن مجھے افسوس کے ساتھ یہ سمجھنا اور کہنا پڑا کہ قلمرو زباں دانی میں اب تک ان کی کج روی ویسی ہے جیسی رفتار کی ابتدا میں کسی بچے کی ہوتی ہے۔"

پھر ان کے اشعار پر اعتراضات کیے ہیں۔ دو ایک مثالیں یہ ہیں۔

وہ ذبح کرکے مری لاش سے یہ کہتے ہیں
تڑپ رہا ہے کہ منھ دیکھتا ہے تو میرا

"لاش وہ جسم ہے جو جان نکل جانے کے بعد بےحس و حرکت رہ جاتا ہے۔ اس کا تڑپنا کیسا؟ بالفرض حضرت شاد کی خاطر اور ان کی سخن سنجی کے اعجاز سے لاش تڑپنے بھی لگے تو پھر میں کہوں گا کہ لاش مونث ہے۔ اس کے واسطے 'تڑپ رہا ہے' اور 'منھ دیکھتا ہے' بھی جائز نہیں۔ اس شعر کو بار بار چند رسالوں میں حضرت شاد یوں ہی چھپوا چکے ہیں۔ لہٰذا یہ نا دل کر یہ جائے کہ مونث کے ضمیر مذکر چھپ گئی، قابل پذیرائی نہ ہوگی۔ میں اس شعر کو درست کیے دیتا ہوں۔ یہ بہتر ہو کہ حضرت شاد مہاراجہ سمجھ کر اسی طرح صحت فرمالیں۔

وہ ذبح کرکے یہ کہتے ہیں اپنے بسمل سے
تڑپ رہا ہے کہ منھ دیکھتا ہے تو میرا

حضرت شاد فرماتے ہیں:

اک عزم فسخ نہیں ہے دل ناشکیب کا
ایسے پڑے ہوئے ہیں بہت اپنی جیب میں

یقیناً "شکیب" کا ک مکسور ہے اور "جیب" کا ج مفتوح ہے۔ آخر قافیہ کیوں کر درست ہوا۔ غلط اور بہتر میں لکھتا ہوں غلط۔ اس مطلع کی درستی میرے اختیار سے باہر ہے۔ اس لیے کہ نہ میں ارباب لغات کے خلاف مفتوح کو مکسور قرار دے سکتا ہوں، نہ مکسور کو مفتوح۔ جیب سے قبل 'اپنی' میں یائے معروف تحریر ہے یا تو حضرت شاد جیب کو مونث سمجھے یا حضرت کا تب۔ بہر حال، میں آگاہ کیے دیتا ہوں کہ لفظ جیب مذکر ہے۔

خان بہادر حضرت شاد عظیم آبادی کی سخن سنجی

حضرت شاد فرماتے ہیں۔

سب یہ کہتے ہیں کہ اب حصہ بھی نا ممکن ہے
اس سے پہلے ترے غمزوں کا اک اندازہ بھی تھا

"حصہ" کے افزائے حضرت کی ناواقفیت زبان کا پتہ ملے گا۔ آپ نے "انداز" کو بجائے "اندازہ" فرمایا، حالانکہ غلط ہے۔

فرماتے ہیں۔

شاد چیکی سی لگی رہتی ہے برسوں اب تو
وہی میں ہوں کہ کبھی زمزمہ پرداز بھی تھا

"چیکی" سی کیا چیز ہے؟ ہم بتائیں۔ یہ ایک چڑیا ہے جو حضرت شاد کے نخل سخن سنجی کی شاخ پر آشیانہ بنائے ہوئے ہے۔ اے جناب "چیکی" نہیں "چپ" لگی رہتی ہے۔ فرمائیے محاورہ یوں ہی ہے؟ آپ نے تو خدا جانے کہاں کی زبان کہہ دی۔ خیر صاحب۔ مصرعے کو یوں درست فرمالیجیے۔

شاد کیہ چپ سی لگی رہتی ہے برسوں اب تو

حضرت شاد ٹینوی کی غزل (اودھ پنچ اکتوبر ۱۹۰۴ء)

ڈیر پنچ۔ حضرت شاد عظیم آبادی کی ایک غزل جولائی ۱۹۰۹ء کے مخزن میں چھپی ہے۔ جس کا مطلع حسب ذیل ہے۔

غیر کی یاد مجھے نزع میں گر آئے گی
یہ بھی اے طرۂ گیسو ترے سر آئے گی

میں تو غور کرتے کرتے تھک گیا، لیکن اس مطلع کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا۔ خدا جانے پہلے مصرعے کو دوسرے مصرعے سے کیا ربط ہے؟ غیر کی یاد۔ عالم نزع اور طرۂ گیسو کے سر آنے سے کیا تعلقات ہیں۔ میں نے مجبور ہو کر اپنی عاجز طبیعت سے فیصلہ کیا کہ شعر تو حضرت نے فرما دیا لیکن معنی ابھی نہیں پہنائے ہیں۔

میں نہایت تمنا سے التجا کرتا ہوں کہ حضرت شاد یا "مخزن" کے سخن فہم اڈیٹر صاحب غرض کوئی مجھے اس مطلع کا مطلب سمجھا دے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میرا فہم اس کا مطلب سمجھنے سے معذور ہو گیا ہے۔ بالفرض شعر بامعنی ہوتا تو دوسرے مصرع کی ردیف بہ اعتبار

محاورہ صحیح کے "جائے گی" درست ہوتی، نہ کہ آئے گی"۔
ممکن ہے کہ شاد کی غزلوں میں زبان وبیان اور شاعری کی غلطیاں بتانے کا سلسلہ اودھ پنچ میں آگے بھی چلا ہو۔

ان اعتراضوں کے پس منظر میں لکھنؤ والوں کا یہ جذبہ تھا کہ وہ پٹنہ کو ادبی مرکز ماننے کے لیے تیار نہ تھے، نہ وہاں کے کسی شاعر کو شاعر یا زباں داں۔ جب یگانہ کے استاد شاد کو لکھنؤ والے شاعر ماننے پر تیار نہ تھے تو پھر یگانہ کس گنتی کس شمار میں تھے۔ چنانچہ یگانہ نے لکھنؤ والوں پر جو کھل کر چوٹیں کیں ان کا ایک سبب ان کے استاد کی ادبی اہانت بھی ہو سکتا ہے۔

یگانہ کو لکھنؤ والے شاید برداشت کر لیتے۔ مگر انھوں نے تو "ہم چو من دیگرے نیست" کا نقارہ بجانا شروع کر دیا۔ لکھنؤ کے شعرا کو جہلا میں شامل کرنا شروع کر دیا۔ عظیم آباد کو اردو کا مرکز منوانے پر اصرار کرنے لگے ـــــ وہ لوگ جو بات بات پر دلی کی مسلمہ ادبی حیثیت کو تذکیر تانیث، روزمرہ اور محاورے کے معمولی اختلافات کو بہانہ بنا کر برابر چیلنج کر رہے ہوں، وہ بھلا عظیم آباد کے ایک نوجوان کو کس طرح صاحب زبان اور مسلم الثبوت شاعر تسلیم کرتے۔

میرے سامنے "چراغ سخن" کا ایک مطبوعہ نسخہ ہے جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا تھا۔ یگانہ نے اس رسالے میں "صاحب زبان" اور "زباں داں" کی بحث بڑے فلسفیانہ انداز میں چھیڑنے کی کوشش کی ہے اور ہندستان کے ان خطوں کا ذکر کیا ہے جن کے بسنے والوں کو وہ صاحب زبان مانتے تھے۔ ان مقامات میں پٹنہ (عظیم آباد) کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ لکھنؤ کے لوگ پٹنہ کو اردو کی ٹکسال نہیں مانتے تھے۔ یگانہ نے اپنی دوسری تحریروں میں صاف صاف لفظوں میں یہ شکایت کی ہے کہ لکھنؤ والے عظیم آباد کے لوگوں کو نہ صاحب زبان مانتے ہیں نہ زباں داں۔ اس سے بالواسطہ ان کے وطن کی ادبی حیثیت پر تو حرف آنا ہی تھا، اسی کے ساتھ براہ راست خود یگانہ کی ادبی حیثیت بھی مجروح ہوتی تھی۔

لسانی جھگڑے اور علاقائی عصبیت صرف سیاست میں ہی کار فرما نہیں ہوتے، بلکہ علمی اور ادبی مسائل میں بھی ان کی ریشہ دوانیاں دیکھنے میں آتی رہی ہیں۔ چنانچہ اس جذبے کے تحت کبھی ہمارے ایک عظیم اور مستند عالم کے قلم سے بھی اب سے اکیس سال قبل یگانہ کے متعلق ایک جملہ نکل ہی گیا۔ انھوں نے فرمایا: "جو شاید اصلاً تو بہاری ہے مگر اب مدت سے لکھنؤ پر مسلط ہے" یہ بھی ایک وجہ تھی جس کے باعث یگانہ کو لکھنؤ میں برداشت نہ کیا گیا۔

یگانہ کی انانیت شاعرانہ تو لکھنؤ کے بیشتر شعرا کو ہیچ و پوچ سمجھتی تھی اور صفی و عزیز جیسے شاعروں کو بھی "میاں صفی" اور "میاں عزیز" کے تحقیر آمیز انداز سے تحریراً مخاطب کرتی تھی اسی انانیت نے انھیں یاس سے یگانہ بنایا اور غالب شکن و شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز کا مصنف بنایا اور اپنے مجموعۂ کلام کا نام "نشترِ یاس" رکھوایا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی شاعرانہ اپج اور ادبی صلاحیتوں کے اعتبار سے لکھنؤ کے بیشتر شعرا کے مقابلے میں بہت بلند تھے۔ مگر یہ کیا ضروری تھا کہ وہ اپنی اس بلندی کو ہر شخص پر لادتے پھرتے اور دوسروں کی آنکھ کا تنکا MAGNIFYING GLASS میں رکھ کر پیش کرتے۔

"نشترِ یاس" پر یگانہ نے مرزا اوج، میر عارف، نواب انجم اور اس عہد کے دوسرے اساتذہ سے تقریظیں لکھوائیں جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے مخالفین یہ دیکھ لیں کہ ایسے زعمائے ادب بھی یگانہ کے قائل تھے۔ لیکن معیار پارٹی نے جس کے روح رواں یگانہ کی زبان میں "رلجہ نل" جناب صفی تھے، نہ تو نواب انجم کی سند کو قبول کیا، نہ جناب عارف اور جناب اوج وغیرہم کے سرٹیفکٹوں کو قابل اعتنا جانا۔ نواب انجم کو اگلے وقتوں کے غزل گویوں میں شامل کر کے ٹال دیا اور مرزا اوج کو سلام اور مرثیے کا شاعر کہہ کر ان کی شاعرانہ حیثیت و اہمیت کو بزعم خود ختم کر دیا۔

یگانہ اور صفی کی پارٹی میں (صفی میں نہیں) جو مخالفت ہوئی اور اس مخالفت نے شدت ہی نہیں بلکہ تلخی اور ابتذال کا جو رنگ اختیار کیا، اس کی وجہ خود یگانہ کی مزاجی کیفیت بھی تھی۔ وہ غالب کے اس شعر کے بھرپور مصداق تھے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

"نشترِ یاس" کی اشاعت پر شاید اتنی مخالفت نہ ہوتی مگر خود یگانہ

راوی ہیں کہ انھوں نے لکھنوی شعراء کے ادبی زعم کو باطل کرنے کی غرض سے ایک اشتہار نکالا جس میں اس دور کے اساتذہ پر اعتراضات کیے۔ ظاہر ہے اس کے خلاف ردعمل ہونا فطری تھا۔ چنانچہ آتش لکھنوی کے نام سے فارسی زبان میں ایک رجز کہہ کر شائع کرایا گیا اور چوک میں تقسیم ہوا۔ اس رجز کے چند اشعار آپ بھی سنیں :۔

نما ید اگر روئے خود ہمچو قیر — بہ دل یاس را زیدہ دو زم بہ تیر
کہ در قلب مومن نہ گنجد ہراس — بود در دل کافراں جائے یاس
دل کافراں ہمچو دود رخ بود — ز دو زخ بیے یاس مطبخ بود
بہ قرآں کہ خواندیم لا تقنطو — تفو بر رخ یاس اینکر تفو
شکستم بہ دل یاس را نشترے — کہ چوں من نہ باشد سخن گسترے
غلط فہمی یاس کردیم رفع — دگر نہ بود از رجز ہیچ نفع

"آیاتِ وجدانی" کے دیباچہ نگار نے اس رجز کے مصنف آتش لکھنوی کے متعلق لکھا ہے کہ اسے شعر کی تقطیع کرنا بھی نہیں آتی۔ وہ نظم کیا لکھتا۔ اس دیباچہ نگار کا خیال ہے کہ یہ نظم خفی لکھنوی کی ہے سیاق و سباق عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ خفی لکھنوی اصل میں صفی لکھنوی کا نام رکھا گیا ہے۔

"نشترِ یاس" کی اشاعت پر جو ہنگامہ برپا ہوا، وہ اشتہاروں اور اخبار و رسائل تک محدود نہ رہ کر مجلسوں اور محفلوں تک پہنچا چنانچہ منصور نگر، لکھنؤ میں شفق کے یہاں ایک مشاعرے میں صفی کے بھائی ظریف لکھنوی نے یگانہ کی موجودگی میں ایک نظم پڑھی جس کے دو شعر ڈاکٹر معصوم رضا راہی نے اپنی قابل قدر تصنیف "یاس یگانہ چنگیزی" میں نقل کیے ہیں۔ شعر یہ ہیں :

شاعروں نے نہ یا کیا اسے زٹیل سمجھے
میرے دیوان کی آٹھ آنے جو قیمت ٹھہری

سندیں دے کے بناتے ہیں مجھے سب شاعر
لکھنؤ والوں کی سنجیدہ ظرافت دیکھی

یہ واقعہ ڈاکٹر راہی نے یگانہ کی خود نوشت کا حوالہ دے کر لکھا ہو کہ ان حالات نے یگانہ سے ان کا مشہور "ترانہ" لکھایا، جسے "ترانۂ شقشقیہ" کا لقب خود یاس نے دیا۔ اسلامی تاریخ میں "خطبۂ شقشقیہ" کی تلمیح سے ہر ذی علم واقف ہے۔ "ترانے" کے بعض اشعار یہ ہیں :

منم کہ چارہ گر دردِ آشنائے خودم — منم کہ دردِ خدادارم و دوائے خودم
منم کہ سر نمی آرم بہ سجدۂ ناحق — منم کہ در رہِ حق محوِ نقشِ پائے خودم
منم کہ لکھنؤ را جانِ تازہ دادم — منم خدائے سخن یاس و ناخدائے خودم

ڈاکٹر راہی کی رائے ہے کہ "غالب شکن" اور "شہرت کاذبہ" کا مصنف کوئی خود رد پودا نہیں تھا۔ یاس کے یگانہ بننے کی ساری ذمے داری میرزا واجد حسین کے سر نہیں آتی۔ یہ بوجھ اٹھانے میں عزیز، محشر، صفی، آرزو، ثاقب، ماہر القادری، شاہد دہلوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور نیاز فتح پوری کو بھی ہاتھ لگانا پڑے گا۔"

لکھنؤ میں معیار پارٹی نے یگانہ کے خلاف جو محاذ قائم کیا تھا اس کے متعلق خود یگانہ کی زبانی سنیے :

"لکھنؤ کے چند کج بیندیے شاعروں نے مل کر ایک جتھا قائم کیا تھا۔ اور شہر کے اساتذہ حکیم جلال اور رشید وغیرہ کو بھی پھانسنا چاہا تھا۔ مگر جب سے اس جانب کا قدم لکھنؤ میں آیا، سارا طلسم ٹوٹ گیا، بساط الٹ گئی۔ کچھ ایسے قدرتی اسباب جمع ہوئے کہ جنابِ صفی جو اس جتھے کے سرغنہ تھے، الگ ہو گئے۔ راجہ ان کے الگ ہوتے ہی بجھڑ دیران ہو گئی۔"

لکھنؤ کے جس دورِ شاعری میں یگانہ نے اپنا علم بلند کرنا چاہا اس میں صفی، محشر، ثاقب، آرزو اور عزیز کا طوطی بولتا تھا۔ ان شعراء کی شرکت کے بغیر لکھنؤ اور بیرون لکھنؤ کا کوئی مشاعرہ کامیاب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ دستاویزی ثبوت اور اس عہد کے ثقہ لوگوں کے بیانات سے صفی اور یگانہ کی بالواسطہ آویزش کا پتہ چلتا ہے۔ براہ راست کوئی مواد باوجود تلاش بسیار کے فراہم نہیں ہو سکا۔

۵ نومبر ۲۲ء کو الہ آباد میں ایک مشاعرہ تھا۔ اس میں یگانہ اور صفی دونوں موجود تھے۔ شیخ ممتاز حسین جون پوری مرحوم کے حوالے سے ڈاکٹر راہی نے لکھا ہے کہ صفی صاحب نے فرمایا کہ اگر یگانہ مشاعرہ میں شرکت کریں گے تو وہ شریک نہ ہوں گے۔ چنانچہ یگانہ نے از خود شرکت سے انکار کر دیا۔

یگانہ نے صفی اور عزیز کے اشعار پر اعتراضات کیے اور یہاں تک لکھ دیا کہ صفی زحافات سے ناآشنا تھے۔ صفی کے ان دو شعروں کا کھل کر مذاق اڑایا:

منھ میں کف، ہاتھ پہ سر، پاؤں میں زنجیر بہار
درِ زنداں پہ کھنچی یوں مری تصویر بہار
سنگ مدفن کو مرے غور سے دیکھا کس نے
خاک میں دوڑ گئے رشتۂ تاثیر بہار

ان اشعار پر جو اعتراضات کئے تھے ان کی عبارت درج ذیل ہے:

منھ میں کف اور ہاتھ پر سر ہے، نہ معلوم کس کا سر ہاتھ پر ہے۔ کیونکہ اگر اپنا ہی سر بریدہ ہاتھ میں ہے تو پھر کف کس منھ میں ہے تن تو سر باقی نہ رہا۔ اور اگر اسی سر بریدہ کے دہن کف آلود کی طرف اشارہ ہے تو سبحان اللہ۔ پھر نہ معلوم پاؤں میں زنجیر بہار کیسی۔ اول تو یہ تصویر ہی سر سے پاؤں تک (منھ میں کف، ہاتھ پہ سر، پاؤں میں زنجیر بہار) مضحک ہے۔ دوم یہ کہ نہیں معلوم، تصویر کھنچی کس کی۔ تصویر بہار کھنچی یا تصویر قائل؟ کیونکہ ایک لفظ تصویر کی اضافت دو دو طرف۔ (یعنی مری اور بہار) سوائے مہمل ہونے کے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مری تصویر کے ساتھ "بہار" کی ردیف بالکل بیکار ہے۔ مگر ان حضرات کے نزدیک ردیف محض ایک بیکار شے ہے۔ شعر سے کوئی معنوی تعلق ہونا ضروری نہیں۔ گویا ایک سخن تکیہ ہے کہ اثنائے کلام میں جا و بیجا ٹھونس دیا جاتا ہے۔"

"وہی مثل ہے کہ راجہ دیکھا، رانی دیکھی، حلق میں لکڑی کبھی نہ دیکھی۔ شاید جناب صفی نے ہائی پاور (HIGH POWER) کی کوئی خوردبین ایجاد کی ہے جس سے رشتۂ تاثیر بہار کا بہت غور سے معائنہ فرمایا ہے۔ ورنہ آج تک رشتۂ تاثیر بہار کسی نے دیکھے نہ سنے۔ ایجادِ بندہ اگرچہ گندہ، سنگ مدفن کو کسی نے غور سے دیکھا اور خاک میں رشتۂ تاثیر بہار دوڑ گئے۔ آخر اس کا حاصل کیا ہوا۔"

زحاف سے نابلد ہونے کے الزام میں پہلے ان کا ایک مصرع پیش کیا ہے جسے موزوں بتایا ہے ع
وقت وقت آنے دو، وقت آنے دو، پھر ہم کو بتا دیں گے

پھر کہا ہے کہ جب لوگوں نے یہ مصرع ناموزوں بتایا تو اسے بدل کر موزوں بنانے کے لیے غلط مصرع کہہ ڈالا، جو ناموزوں ہونے کے ساتھ ساتھ دہقانیت کا بھی حامل ہے۔ بدلا ہوا مصرع یوں لکھا ہے:

وقت آنے دو، وقت آنے، پھر تم کو بتا دیں گے

"چراغ سخن" کے خاتمے پر "تحفے" کے عنوان سے یگانہ کی زبان میں "لکھنؤ کے حسد شعار مسلمان دوستوں" کو یہ تحفہ پیش کیا گیا ہے، اور آخر میں یہ عبارت درج ہے۔ راقم آپ کا خادم زبردست نہ زیردست یاس آتش پرست۔"

"زبردست نہ زیردست" کے ایہامی انداز کی جانب جناب عرشی نے اشارہ فرمایا۔ آتش پرست کی ترکیب اس ادبی نزاع پر پوری روشنی ڈالتی ہے جس کے باعث یگانہ غالب شکنی پر تل گئے تھے۔ اس مختصر تقریر میں یہ ممکن نہیں ہے کہ اس بحث پر اجمالاً بھی روشنی ڈالی جائے جو برسوں تک یاس یگانہ چنگیزی میں اور اس عہد کے غالب پرستوں میں شدت کے ساتھ جاری رہی۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر ہوئی تھی۔ بعد میں مالک رام صاحب کی کتاب "وہ صورتیں الٰہی" کا ذکر آیا اور مجھے اس کو پڑھنے کا شدت سے اشتیاق پیدا ہوا۔ اس لیے کہ عزیزی عرشی زادہ سلمہ نے مجھ سے کہا کہ اس کتاب میں یاس یگانہ چنگیزی پر بھی ایک مضمون ہے جس میں اس نزاع کا بھی تذکرہ ہے جو یگانہ اور صفی میں ہوئی تھی چنانچہ یہ کتاب مجھے مولانا عرشی کے یہاں دیکھنے کو ملی۔ میں اپنی تقریر میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جہاں تک صفی صاحب مرحوم کا تعلق ہے ان سے اور یگانہ سے براہ راست کوئی نزاع نہیں ہوئی تھی۔ یہ نتیجہ میں نے بہت سی کتابیں پڑھ کر اور "غالب شکن" کے مخاطب اور محقق عصر پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب سے مراسلت کرنے کے بعد نکالا تھا۔ اس لیے مالک رام صاحب کی کتاب پڑھنے کی فکر اور بھی زیادہ لاحق ہوئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں نے اپنی تقریر میں اس نزاع کی ضمن میں جو باتیں کہی ہیں ان کی تردید ہو جائے اس لیے کہ یگانہ مالک رام صاحب کے ہمعصروں میں تھے اور ان کے بڑے قریبی دوستوں میں بھی۔ میں نے جب کتاب پڑھی تو مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ مجھ سے تحقیق میں کوئی

غلطی نہیں ہوئی۔ اس اطمینان کے ساتھ میں نے مالک رام صاحب کی کتاب کے اس مضمون سے جو یگانہ کی بابت ہے استفادہ بھی کیا۔ مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ نواب انجم نے ایک رباعی "سیارے" میں شائع کرائی، رباعی یہ ہے:

اس عہد میں ہیں پانچ شاہان سخن
حقا کہ انھیں کے دم سے ہے شان سخن
جاوید و عروج و عارف و اوج و رشید
یہ پنجتنِ پاک ہیں ایمان سخن

رباعی کے جواب میں "سبع سیارہ" کے نام سے صفی کے بھائی ظریف لکھنوی نے سات (۷) رباعیاں کہیں جو درج ذیل ہیں:

زیبا ہے کہو گر انھیں شاہان سخن
یا فارس و یکہ تازِ میدان سخن
گر پنجتن پاک سے دوگے تشبیہ
انجم تمھیں سب کہیں گے شیطانِ سخن

جب مدح سرائی کی لیاقت نہ رہی
پیری میں عبث نظم کی تکلیف سہی
زیبا نہیں اس طرح کی پھبتی انجم
پنج تنِ پاک کی کبھی ایک کہی

تعریف کے دائرے میں یوں حد سے بڑھے
کیا خوب نئے پنج تنِ پاک گڑھے
"سیارے" میں دیکھ کر رباعی ایسی
انجم پہ نہ کیوں ہر ایک لاحول پڑھے

گو مومنو شاعرہ ہے بڑھیا انجم
معلوم نہیں بکتی ہے کیا کیا انجم
جاوید و عروج و عارف و اوج و رشید
ان پنجتنِ پاک کی نعتہ انجم

مدّاح ہیں پنجتن کے مطلق پانچوں
شیعہ ہیں علی کے برحق پانچوں
خود پنجتنِ پاک بنیں اور خوش ہوں
انجم کی طرح نہیں ہیں احمق پانچوں

مذہب ہے تمھارا کیا بتا دو انجم
کچھ اپنے عقائد تو سنا دو انجم
تصنیف کیے پنجتن پاک تو خوب
اب بارہ امام بھی بنا دو انجم

ہو ایسا خوشامدی تو کیا چارہ ہے
انجم میں ہوا بھری ہے غبارہ ہے
آتی ہے یہ نقارۂ گردوں سے صدا
تو مرتبہ گو نہیں بھٹیارہ ہے

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے تحریر فرمایا:

"میں اپنے اس خیال پر قائم ہوں کہ یگانہ اور صفی کی آویزش ایک بے حقیقت افسانہ ہے۔ لیکن اپنے اس خیال کے ثبوت فراہم کرنے کی مجھ میں سکت نہیں آپ اس تقریر کو کسی رسالہ میں شائع کرنا چاہتے ہیں ضرور شایع کیجیے۔ شاید کوئی میرا ہم خیال نکل آئے جو اپنے خیال کے ثبوت بھی پیش کر دے۔"

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

★



قدم قدم پہ مہکتے ہیں پھول خوشیوں کے
مچل رہی ہے فضاؤں میں خوشبوؤں کی پھوار
نظر نظر سے چھلکتی ہے کیف و سرمستی
نفس نفس میں گھلا جاتا ہے سرور و خمار

دمکتے ہونٹوں پہ رقصاں بہار کے نغمے
چمکتے چہروں پہ ہیں انبساط کے سائے
ادا ادا میں ہے اک بے خودی و مدہوشی
ہیں انگ انگ پہ عیش و نشاط کے سائے

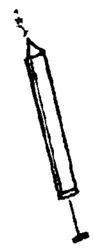
ہر ایک سمت ہیں ہنگامہ ہائے رقصِ طرب
ہر ایک سمت ہے رنگوں کی ریشمی برسات
ہر ایک سمت عبیر و گلال کے جلوے
ہر ایک سمت مچلتے ہیں جھومتے نغمات

کہیں ہیں ڈھولک و دف کی لہکتی تانوں پہ
جھنکتے جھانجھ و مجیرے کی مست جھنکاریں
کہیں ہیں چہلیں، کہیں کیچڑوں کے ہیں چھینٹے
کہیں بھری ہوئی پچکاریوں کی بوچھاریں

ہے دور دور تلک رقص و وجد کا عالم
کھلے کھلے ہوئے ہر سو دلوں کے غنچے ہیں
جدا ہیں حسن و لطافت میں رنگ و بو میں مگر
یہ سارے ایک ہی گلزار کے شگوفے ہیں

نہ کوئی فرق "من و تو" نہ فرق رام و رحیم
نہ کوئی ادنیٰ و اعلیٰ، نہ مفلس و زردار
نہ آج ہے کوئی تفریق مذہب و ملت
کہ جیسے ایک ہی مسلک کے سب ہیں پیروکار

صلائے عام ہے ہر فرد ہر بشر کے لیے
چلو کہ جشنِ مسرت منائیں ہولی کا
جگا کے سازِ محبت پہ پیار کا سرگم
چلو کہ جامِ اخوت لنڈھائیں ہولی کا



ہولی

حضور سہوانی

آج ہر چیز سے، ہر اک شے سے
رنگ کچھ اس طرح نمایاں ہے
جیسے رنگینیاں زمانے کی
چپے چپے کی آج مہماں ہیں

یوں ہے بکھرا ہوا زمیں پہ گلال
جیسے پھولی ہو آسماں پہ شفق
دلِ مردہ میں دیکھتے ہی جسے
دوڑ آئی ہے زندگی کی رمق

کیوں نہ ہر فرد ہو نہایا ہوا
جب کہ ہر ہاتھ میں ہے پچکاری
کیوں نہ ہر اک لباس پہ اے دوست
مختلف رنگ کی ہو گلکاری

ہر طرف، تھوڑے تھوڑے وقفے سے
دیکھ کر رنگ و نور کی برسات
ایسا لگتا ہے جیسے قوسِ قزح
آج مر مر کے پا رہی ہے حیات

مختلف رنگ میں ہے ڈوبا ہوا
کوئی آنچل ہو یا ہو پیراہن
آج مشغول رنگ پاشی ہیں
نوجواں، پیر، طفل، مرد و زن

اس کے آنے پہ ہو گئے سب ایک
ایکتا کا نشان ہے ہولی
جس سے دل کا غبار دھلتا ہے
ایک ایسا نہان ہے ہولی

محمد عبدالرشید

شرح دیوانِ غالب اور نظم طباطبائی

ایک جائزہ

غالب کی شاعری کی عظمت و مقبولیت کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک دیوان غالب کے جتنے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اور جتنی شرحیں اس کی لکھی گئی ہیں اتنی کسی اردو شاعر کی نہیں لکھی گئیں۔

مولانا حالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی لاجواب تصنیف یادگارِ غالب میں مرزا غالب کی سیرت و شاعری پر ایک محققانہ تبصرہ کر کے اہلِ ذوق کو غالب فہمی کی دعوت دی۔ ان کے بعد بہت سے اہلِ قلم دیوان غالب کو اپنی سخن سنجی اور شعر فہمی کا معیار بنا کر اس کی شرح نگاری کی طرف مائل ہوئے۔

دیوان غالب کی قدیم شرحوں میں سب سے زیادہ مفید و قابلِ قدر شرح پروفیسر سید علی حیدر نظم طباطبائی کی ہے۔ نظم طباطبائی کے ذوقِ شاعری نے دبستانِ لکھنؤ میں نشو و نما پائی تھی۔ انھوں نے امیر و داغ کا زمانہ دیکھا تھا۔ شعر و شاعری سے ان کو فطری لگاؤ تھا۔ طباطبائی اردو، فارسی و عربی ادب میں فاضلانہ استعداد رکھتے تھے۔ وہ نظام کالج حیدرآباد دکن میں السنۂ مشرقیہ کی پروفیسری کے عہدے پر عرصہ تک فائز رہے تھے۔

علامہ طباطبائی نے حلِ اشعارِ غالب کے ضمن میں زبان و محاورہ کے مفید نکات، لکھنؤ اور دہلی کے محاوروں کا باہمی فرق، علمِ بیان کے بعض ضروری مسائل، عروض و قافیہ کے کچھ اہم اصول، تذکیر و تانیث کے بعض کارآمد قاعدے بھی بیان کیے ہیں جو زبان و ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے نہایت مفید ہیں۔ ان فوائد کے علاوہ شعر گوئی یعنی ایک مصرع پر پیش مصرع لگا کر پورا شعر بنانے کی مثالیں بھی شارح نے تحریر کی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ اپنی مشقِ شاعری کی مثال میں ع "اس لیے تصویرِ جاناں ہم نے کھچوائی نہیں" پر اپنے لگائے ہوئے بیس پیش مصرعے لکھتے چلے گئے ہیں۔ دوسری جگہ غالب کے مصرع "ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" پر اپنی جودتِ طبع کے سترہ نمونے پیش کیے ہیں۔ یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں کہ شرح طباطبائی کے بعض ایسے بیانات شارح کے موضوعِ تحریر سے خارج ہیں مگر ادب کے طالب علموں کے لیے ان کی افادی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

شرح طباطبائی کی نمایاں خصوصیت اس کا تنقیدی حصہ ہے دوسرے شارحینِ غالب کی طرح طباطبائی نے تشریحِ مطالبِ اشعار پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ جابجا اُن پر نقد و تبصرہ بھی کیا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر یہ شرح تمام دوسری شرحوں میں ممتاز ہے اور یہی چیز ہمارے اس مقالہ کا موضوعِ خاص ہے۔

غالب کے اچھے شعروں کی بے انتہا داد دینے کے علاوہ علامہ طباطبائی نے بعض اشعار پر اپنی آزادانہ رائیں اور بے باکانہ اصلاحیں پیش کی ہیں۔ جابجا الفاظ میں رد و بدل اور کانٹ چھانٹ کی ہے جن سے راقم کو اتفاق نہیں ہے۔ شرح کا یہ حصہ ادبی حیثیت سے سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہے مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے آج تک غالب کے کسی شارح یا نقاد نے طباطبائی کی ان نکتہ چینیوں

کی صحت یا غلطی کے بارے میں اظہار رائے نہیں کیا۔

اس لیے ذیل میں ہم شرح طبا طبائی کے وہ تنقیدی حصے جن میں غالب کے بعض اشعار کی بے حد تعریف کی گئی ہے یا جن اشعار پر شارح نے اصلاحیں تجویز کی ہیں اپنی رائے کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اصابت رائے کا فیصلہ ناظرین کے فہم سلیم کے حوالے کرتے ہیں۔ طبا طبائی کی تنقیدات پر نقد و نظر سے پہلے یہاں ہم انگریزی ادب کے مشہور ادیب مورخ پروفیسر سینٹسبری کا یہ ظریفانہ لیکن بالکل صحیح قول نقل کر دینا ضروری سمجھتے ہیں :

" اگر کوئی مصنف یہ دعویٰ کرے کہ میں نے ایسی کتاب لکھی ہے جس میں کوئی غلطی نہیں ہے تو وہ مسخرہ جھوٹا ہے اور جو شخص کسی دوسرے سے ایسی کتاب لکھنے کی امید رکھے جس میں کوئی غلطی نہ ہو تو وہ اس سے بڑھ کر لغو ہے۔"

غالب کے بعض اچھے اشعار کی ستائش کے موقع پر طبا طبائی نے وہ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود غالب کو بھی اپنے شعر کے اعجاز کی خبر نہ تھی۔ کسی اچھے شعر پر پہونچ کر شارح کا ذوق شعری ایسا بے قابو ہو جاتا ہے کہ وہ مطلب نگاری کو چھوڑ کر بے ساختہ داد سخن دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کاش دوسرے شارحین غالب نے بھی یہی روش اختیار کی ہوتی تو غالب کے اکثر اشعار کی معنوی خوبیاں جو منظر عام پر نہیں آئی تھیں معلوم ہو جاتیں اور ان شارحین کا معیار سخن سنجی بھی متعین ہو جاتا۔

غالب کی غزل کا ایک مطلع ہے ؎

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہ سہی

امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

اس کی تعریف میں علامہ طبا طبائی لکھتے ہیں " اس شعر پر اگر غالب خدائے سخن ہونے کا دعویٰ کریں تو خدا گواہ ہے کہ زیبا ہے۔"

ہماری رائے میں شعر مذکور کا انداز بیان طنز و مزاح کا عمدہ نمونہ ہے لیکن مضمون شعر کسی بلند خیال یا حقیقت پر مبنی نہیں ہے اس لیے اس تحسین کا مستحق نہیں۔ غالب ؎

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

طبا طبائی :۔ " اس شعر کی تعریف حد امکان سے باہر ہے" (ہماری رائے میں یہاں بھی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے)

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستان نہیں

بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

طبا طبائی :۔ " اس شعر کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل سکتے" (شارح کو اس "رہ گزر" کی وضاحت کرنا ضرور تھا کیونکہ اسی لفظ پر شعر کی خوبی منحصر ہے)

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی

بجا کہتے ہو۔ سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

طبا طبائی :۔ " بندش اس کی سحر کے مرتبہ تک پہونچ گئی ہے"۔

صرف بندش الفاظ کا نام اگر شاعری ہے تو یقیناً یہ شعر سحر و اعجاز کے مرتبہ تک پہونچ گیا ہے۔

اس شوق ستائش کے باوجود حیرت ہے کہ غالب کے مشہور شعر ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

پر پہونچ کر طبا طبائی کا مذاق سخن سنجی بالکل صامت ساکت رہتا ہے وہ اس کی شرح میں صرف اس قدر لکھ کر کہ " یعنی مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو بات اس نے کہی میرے دل کی کہی" گزر جاتے ہیں۔

اب ہم ذیل میں غالب کے اشعار پر طبا طبائی کی مجوّزہ اصلاحیں اپنی رائے کے ساتھ پیش کرتے ہیں :۔ (غالب)

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے

تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

اصلاح طبا طبائی :۔ " (تیرا مرے آگے) کی جگہ اگر (میرا ترے آگے) ہوتا تو شعر کا حسن بہت زیادہ ہو جاتا مگر زمین خلاف ہونے سے مصنف نے الٹ دیا اور اس میں بھی ایک معنی پیدا ہو گئے کہ تو اپنی بے اعتنائی یا حسن کو میری آنکھ سے دیکھ اور اسی پر قیاس کر لے کہ تیری مفارقت میں میرا کیا حال ہوگا۔"

راقم الحروف کے نزدیک شعر کا مطلب یہ ہے کہ عاشق اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ اپنی مفارقت میں میرا حال کیا پوچھتے ہو اسی سے قیاس کر لو کہ جب تم میرے سامنے ہوتے ہو تو میرے شوق و اضطراب کا اثر تمھارے چہرے سے بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اب تمھیں بتاؤ کہ تمھاری جدائی میں میرے اضطراب کا کیا حال ہوگا۔ تقریباً یہی مضمون غالب کے ایک اور شعر میں بیان ہوا ہے ؎

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرہ سے ہو ظاہر غمِ پنہاں اپنا

طباطبائی کی اصلاح کے مطابق دوسرے مصرع میں اگر بجائے (تیرا مرے آگے) کے (میرا ترے آگے) ہوتا تو تکرارِ معنی کی وجہ سے حُسنِ معنوی بہت کم ہو جاتا۔ (غالب)

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

شرح طباطبائی :۔ "سزا و عقوبت کے معنی ایک ہی ہیں اس تکرار کے سبب سے پہلا مصرع سُست ہو گیا ہے۔"

راقم :۔ سزا اور عقوبت کے معنی اور ان کے محلِّ استعمال میں فرق ہے۔ کسی صغیرہ گناہ پر سرزنش، گوشمالی، یا تنبیہ کو سزا دینا کہتے ہیں اور عُقوبت کے معنی ہیں عذاب تعزیر یا حد شرعی قائم کرنے کے۔ کبیرہ گناہوں کی پاداش عقوبت اور صغیرہ جرائم کا تاوان سزا ہے۔ سزا عارضی اور عقوبت دائمی یا دیرپا ہوتی ہے۔ اس معنوی فرق اور محلِ استعمال کو سمجھنے کے بعد اعتراض رفع ہو جاتا ہے۔ (غالب)

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

شرح طباطبائی :۔ "بزم کا لفظ اس شعر میں مقتضائے مقام سے گرا ہوا ہے اس سبب سے کہ مصرع معشوق کی زبانی ہے اور اس کے محاورے کی نقل ہے اور لفظ بزم اس کے محاورہ کا لفظ نہیں ہے۔"

راقم :۔ شارح کو بزم کی جگہ دوسرا لفظ جو معشوق کی اصطلاح ہو اور مقتضائے مقام کے مطابق ہو تجویز کرنا چاہیے تھا لیکن بزم کی جگہ کوئی دوسرا لفظ جو عیش و نشاط کی محفلوں اور حسن و عشق کی جلوہ گاہوں کے لیے مستعمل ہو آج تک وضع نہیں ہوا۔ معشوق کی محفل اس نام سے مشہور ہے۔ کسی عاشق یا معشوق کو اس کے مفہوم کے متعلق غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ غالب کے حسب ذیل شعر میں عاشق معشوق سے تخاطب میں اسی لفظ کو بہ ترکیب اضافی استعمال کرتا ہے مگر وہاں شارح نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

غالب ؎

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

طباطبائی :۔ "اس شعر میں (ہاں) اپنے محل پر نہیں (کیوں) کا مقام ہے۔"

راقم :۔ اس شعر میں "ہاں" کلمہ تنبیہ کا فائدہ دیتا ہے اور خبردار ہوشیار کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس کا شمار حروف فجائیہ (INTERJECTIONS) میں بھی ہوتا ہے جو الفاظ جوش یا جذبے کی حالت میں بے تحاشا زبان سے نکل جاتے ہیں جیسے ہے ہے، اوہو، ہائے وغیرہ۔ عارف کے مرثیہ میں وفورِ الم اور شدّت جذبات کے اظہار کے موقع پر ہاں کا استعمال تنبیہ کے لیے بالکل برمحل ہے۔ "کیوں" حرف استفہام ہے جو کس سبب سے یا کس لیے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ "کیوں" استفہامیہ کا یہ مقام نہیں کہ ان کے استعمال سے ساری شعریت فنا ہو جائے گی۔

غالب ؎

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

شرح طباطبائی :۔ "یہاں "کیوں" سے "کیا" زیادہ اچھا معلوم

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

حیدر بیگ کاشف جوہر بجنوری

غزل

مری وفا، مرے دیوانہ پن کی بات آئی
جہاں بھی خدمت دار و رسن کی مات آئی

چمن میں جب کسی غنچہ دہن کی بات آئی
ترے شباب ترے بانکپن کی بات آئی

کہاں کہاں نہ چھڑا قصۂ حیات و ممات
کہاں کہاں نہ تری انجمن کی بات آئی

قفس میں جب بھی نشیمن کا تذکرہ آیا
ستم ظریفیِ اہلِ چمن کی بات آئی

حیاتِ عشق نئے مرحلوں میں جب الجھی
کسی کی زلفِ شکن در شکن کی بات آئی

جہاں جہاں بھی ہوا کوئی تبصرہ فن پر
وہاں وہاں مرے طرزِ سخن کی بات آئی

میں اک مسافرِ راہِ جنوں ہوں اے جوہر
کبھی نہ میری زباں پر تھکن کی بات آئی

بسنت کمار بسنت

غزل

غضب کی بات ہوتی ہے، ستم کی بات ہوتی ہے
اسی مہ وش کی چشم و زلفِ خم کی بات ہوتی ہے،

زمیں سے عرش تک اہلِ کرم کی بات ہوتی ہے
نیاز و ناز خوبانِ ارم کی بات ہوتی ہے

یہ میخانہ ہے مے چھلکاؤ پی لو، جتنی جی چاہے
یہاں ہر وقت رند و جامِ جم کی بات ہوتی ہے

ابھی کیسے پئیں ہم جام اٹھائیں کس طرح ساقی
ابھی مقدارِ مے کے بیش و کم کی بات ہوتی ہے

بتانِ شوخ کے تھے تذکرے جس بزم میں کل تک
وہیں پر آج شیخِ محترم کی بات ہوتی ہے

زباں کھولیں تو ناداری، کہیں کچھ تو ہو رسوائی
حضور ان کے بہر صورت بھرم کی بات ہوتی ہے

ہمیں نے اہلِ کعبہ کو دیا ہے نورِ عرفاں کا
ہمیں سے زاہدو، دیر و حرم کی بات ہوتی ہے

بھٹک کر جب کوئی راہی پہنچ جاتا ہے منزل پر
ہمارے جادہ و نقشِ قدم کی بات ہوتی ہے

چمن میں شوخ وہ شانہ بہ شانہ ہے بسنت اپنے
خرامِ ناز و بوئے صبحدم کی بات ہوتی ہے

محمّد خالد عابدی

(طنزیہ و مزاحیہ خاکہ)

عہد

میرے ایک پڑوسی ہیں لطافت صاحب غضب کے بخیل قارون سے بھی کئی قدم آگے۔ باپ دادا کا دیا ہوا ان کے پاس کافی سرمایہ موجود ہے۔ محلہ کے کچھ بزرگ کہتے ہیں کہ یہ لطافت صاحب جوانی میں بلا کے تیز طرّار تھے۔ عوامی زبان میں شاید بہت چالو تھے۔ اپنے ہی باپ کو طرح طرح سے پریشان کر کے تمام جائیداد اپنے نام کرالی۔ مرحوم کو یقین دلایا کہ جب چھوٹے بھائی سمجھ دار ہو جائیں گے تو ان کی ذمّہ داری میں ہی اٹھاؤں گا اور شادی بیاہ کے بعد سب کا جتنا حصّہ ہوگا انھیں سونپ دوں گا۔

مظلوم باپ نے بھی سر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے لطافت صاحب کی تجویز پر بغیر غور و خوض کے کئی ضروری و غیر ضروری کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ لطافت صاحب کے باپ بھی اس خوف سے سبکدوش ہو گئے جس کی اٹھتے بیٹھتے فکر رہتی تھی۔ کہتے ہیں کہ لطافت صاحب کے دادا نے اپنے پڑوسی کی زمین کا کچھ حصّہ ہڑپ کر لیا تھا وہ بے چارہ پڑوسی ترک وطن کے ساتھ اب ترک دنیا بھی کر گیا۔ آج لطافت صاحب اس زمین پر ناجائز قبضہ کئے بیٹھے ہیں بلکہ آرام سے اس زمین پہ لیٹتے ہیں، سوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ لطافت صاحب چالو ہونے کے ساتھ ہی بے حد بخیل واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنی ضرورتیں دوسروں کے سہارے پوری کرتے ہیں۔ گویا دوسروں کے شانے پہ رکھ کر بندوق چلاتے ہیں (گو کہ انہیں غلیل چلانا بھی نہیں آتی) وہ ایک دن صبح ہی صبح آدھمکے۔ میں ناشتہ کے لیے بیٹھ ہی رہا تھا کہ ان کی ہنکار سن کر کھڑا ہو گیا دروازہ کھولا تو حضرت لطافت نہایت بے ہنگم طریقے سے مسکرا رہے تھے۔

"اندر تشریف لایئے ــــ!" نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ان کا استقبال کیا۔

گھوڑے کی طرح دانت نکال کر وہ ہنسے اور میرے قدموں کی تقلید کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ کر صوفے پر دھنس گئے۔

"کہئے کیسے زحمت فرمائی ــــ؟" میں نے رسمی جملہ ادا کیا۔

وہ آرام سے صوفے سے ٹک گئے اور میری الماری پر نظر ٹھہر جماتے ہوئے بولے۔

"ماشاءاللہ آپ نے کتابیں تو خوب جمع کر رکھی ہیں!"

میری کتابیں بلا قیمت نیلام ہوتی نظر آئیں۔

لطافت صاحب اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مجھ پر غالب آ گئے اور میں انکار نہ کر سکا اس مروت میں وہ تقریباً آدھ درجن کتابیں لے کر چلتے بنے۔ میری آنکھیں کٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ کتابیں تو لے کر چلے گئے لیکن میری حالت زار دیکھنے کے قابل تھی۔ مجھے کسی کل چین نہ آ رہا تھا۔

لطافت صاحب ایک ہفتے کے وعدے سے کتابیں لے گئے تھے۔ لیکن جب دوسرا ہفتہ ختم ہونے لگا تو مجھے تشویش ہوئی میں بھی صبح ہی صبح ان کے گھر پہنچ گیا دروازہ پر دستک دی۔ جواب ندارد۔ دوبارہ گیارہ تک دستک دی تو کہیں کسی ذی ہوش کے کان پر جوں رینگی۔ ایک بچہ آیا اور دروازہ نیم وا کر کے بولا۔

"کیا ہے ــــ؟"

"اپنے پاپا سے کہنا کہ اختر صاحب آئے ہیں" ــــ میں نے اطلاع کرائی۔

لطافت صاحب جس جگہ رہتے ہیں اس کے گرد و نواح میں اتنی گندی نالیاں ہیں کہ میرا وہاں کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔ گو کہ میرے دونوں کانوں میں عطرِ حنّا اور عطرِ حس کے پھوے ٹھنسے ہوئے تھے۔ گلی کی بادِ سموم میں عطر کی قلعی کھل گئی کہ یہ عطر نقلی ہیں ورنہ یہ بھی اپنی مہک کا کچھ نہ کچھ ضرور مظاہرہ کرتے۔

میں گھڑی دیکھتے دیکھتے کلینڈر دیکھنے والا تھا کہ بچے نے جواب دیا۔

"پاپا نہیں ہیں ---!"

"کس نے بتایا کہ پاپا گھر میں نہیں ہیں؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا

"پاپا نے بتایا ہے۔" بچّے نے نہایت بے اعتنائی سے کہا (شاید بچّے کو سچ بولنے کی تلقین کی گئی ہوگی)۔

میں اپنا منھ لٹکائے اپنے گھر واپس آگیا اور عہد کر لیا کہ آئندہ کبھی کسی کو کوئی کتاب، اخبار، یا رسالہ نہیں دوں گا میں نے مارے غصّے کے دفتر سے چوری کیا ہوا ایک اسٹینسل نکالا اور اس پر ایک مختصر سی عبارت لکھی۔

نمبر ا۔ "کیا آپ مانگ کر کھاتے ہیں؟"

نمبر ۲۔ "کیا آپ مانگ کر پہنتے ہیں؟"

اگر نہیں تو پھر

"آپ مانگ کر اخبار، رسالے اور کتابیں کیوں پڑھتے ہیں؟"

جب کافی تعداد میں مذکورہ بالا عبارت کے پرنٹ نکل آئے تو میں نے بہ درنما گوند سے ایک ایک پرچی اپنی تمام کتابوں کے سرِ ورق کے صفحات میں چسپاں کر دی۔ میں دل ہی دل میں خوش ہونے لگا کہ اب جو بھی میری کتاب جبراً قہراً مانگ کر لے جائے گا وہ پڑھ کر خود ہی پشیمان ہوگا۔ جب وہ کتاب مجھے واپس کرنے آئے گا تو اس کی آنکھوں میں شرم سوجیں مارے گی اور میں مارے خوشی کے اپنی باریک باریک مونچھوں پر تاؤ دوں گا۔ (حالانکہ مجھے مونچھ رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں کیونکہ میں نے آج تک کوئی بہادری کا کارنامہ انجام نہیں دیا۔ یہاں تک کہ میں اپنی گلی کے ایک خونخوار کتّے کو نہیں مار سکا۔ تو پھر نہ جانے کس بات کی۔؟)

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ میں نے عہد کر لیا تھا کہ میں اب کسی کو بھی کتاب نہیں دوں گا لیکن میں اس درجہ عہد شکن واقع ہوا کہ ایک محترمہ کو کتاب دیدی جب کہ قرآن کی وہ آیت مجھے اچھی طرح یاد تھی۔ کہ وَاَوفُوا بالعهد اِنّ العهدَ كانَ مسئولاہ (جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اپنا عہد پورا کرو کیونکہ عہد کے متعلق بازپرس ہوگی۔) محترمہ فرحت دس دن کے وعدہ سے کتاب لے گئی تھیں اور میں نے اپنے اندازے کے مطابق کلینڈر میں ایک مہینہ بعد کی تاریخ میں سرخ نشان (خاندانی منصوبہ بندی کا نہیں) ثبت کر دیا تھا کہ اس تاریخ تک اگر کتاب نہ آئے تو میں انھیں "ریمائنڈ" کراؤں۔

تقریباً دو ماہ بعد میں پھر لطافت صاحب کے یہاں پہنچ گیا۔ اس بار انھوں نے نہایت شرافت کا ثبوت دیا کہ مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا لطافت صاحب مجھے کمرے میں بٹھا کر اندر کسی دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اتفاقیہ میری نظر جو مسہری کے نیچے پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری دی ہوئی کتابوں میں سے ایک کتاب بری طرح زخمی پڑی ہوئی ہے۔ مجھے اپنی اولاد کو اس حالت میں دیکھ کر بے حد افسوس ہوا۔ میں صوفے پر سے اٹھا اور اپنے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک کر ایک ہاتھ کو لمبا کر کے اس کتاب کو کھینچ لیا کتاب کیا ہوگئی تھی گویا کسی پرائمری کلاس کے طالب علم کی رف کاپی۔ جگہ جگہ بچوں نے جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کے سوالات حل کرنے کی مشق کی تھی۔

اس سانحے سے میں لطافت صاحب کے لیے اچھی رائے نہیں رکھتا۔ (اور ان کی بیوی میرے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتیں کیوں؟ اسے راز رہنے دیجئے؟) تھوڑے ہی وقفے کے بعد لطافت صاحب ہاتھ میں لیلیٰ پیڈ لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے مارے خوف کے وہ کتاب جہاں سے اٹھائی تھی وہیں پھینک دی اور حیرت سے اس لیلیٰ پیڈ کو دیکھنے لگا لطافت صاحب کہنے لگے

"معاف کیجئے گا حضرت صاحب یہ میرے بچے منصف کے چیز رہیں!"

"جی! چیز...!" میں نے حلق کا تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں چیز، کسی کی بھی کوئی کتاب دیکھی بس بازار میں جا کر فروخت کر آئیں گے اور فلم دیکھ کر حق چوری ادا کر دیں گے ---!"

میرے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ لطافت صاحب اپنے،

دلی عہد چھبٹن کو مارنے کے لیے یہ بیدلائے تھے۔ کیونکہ گھر کی ملازمہ نے بتایا ہے کہ چھبٹن میاں ابھی ابھی کمرے میں سے پانچ چھ کتابیں چھپاکر باہر لے گئے ہیں۔ اب مجھے یقین کامل ہوگیا کہ جب ڈاکو مان سنگھ اور سلطانہ ڈاکو کے گروہ کے لوگ یہاں پناہ گزیں ہیں تو پھر ہو نہ ہو میری کتابیں بازار فروخت ہونے گئی ہیں۔ اور مستحق ہے انعام و اعزاز کے لیے وہ محترمہ ملازمہ جنہوں نے یہ دیکھ لیا کہ چھبٹن میاں کتابیں چرا کر بازار فروخت کرنے گئے ہیں (ایسی عورتوں کو محکمۂ سراغ رسانی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنا چاہیے)

مجھے اُن آدھ درجن کتابوں کا بہت صدمہ ہے جو لطافت صاحب نے تلف کردیں۔ میں نے ایک شاعر دوست کو پابند کیا ہے کہ وہ میری کتابوں پر ایک نوحہ لکھیں۔

وقتی جذبے کے تحت میں نے پھر عہد کیا کہ اب آئندہ کسی کو کوئی کتاب نہیں دوں گا۔ کشاں کشاں ایک ماہ گزرنے کے بعد محترمہ فرحت آئیں اور انھوں نے میری وہ کتاب واپس کردی جو گزشتہ ماہ دو دن کے وعدے سے لے گئی تھیں۔ ان کے لیے میرے دل میں عزت پیدا ہوگئی اور میں سوچنے لگا یقیناً ان محترمہ کی رگوں میں کسی شریف کا خون دوڑ رہا ہے ورنہ جو کتاب لے کر جاتا ہے وہ اس طرح دُنیا سے روپوش ہوجاتا ہے جس طرح کسی دُکان سے کوئی شخص ادھار کرکے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دُکان پر جانے سے توبہ کرلے۔ یعنی پیسے بھی گئے اور گاہک بھی۔

میں نے کتاب کی دستیابی پر ان محترمہ کا شکریہ ادا کیا وہ محترمہ مسکراتی ہوئی میری بیوی سے علیک سلیک کرکے چلی گئیں۔ میں وہ کتاب لے کر اپنی مسہری پر دراز ہوگیا اور دوبارہ اسی کتاب کو پڑھنے کی سعی کرنے لگا کیونکہ وہ کتاب رومانی خطوط کا مجموعہ تھی۔ جیسے ہی میں نے ورق گردانی شروع کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ تقریباً تین صفحے نہایت بے دردی سے پھٹے ہوئے ہیں۔ میں مارے غصے کے جھنجھلا کر رہ گیا۔

میرا غصہ ابھی ماند نہیں پڑا تھا کہ ہماری سالی صاحبہ آگئیں سب سے پہلے انھوں نے اپنا مطالبہ اپنی باجی صاحبہ کے گوش گزار کیا انھوں نے جواب میں ایک ہنکار بھری اور میری طرف اشارہ کردیا۔ دیگر سالیوں کے مقابلہ میں چھوٹی سالی کے حقوق زیادہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کی آمد کی وجہ دریافت کی۔ وہ نہایت معصومیت سے کہہ رہی تھیں۔

"دولھا بھائی کیا آپ کے پاس لذیذ کھانے پکانے کی کوئی کتاب ہے؟"

میں ان کی اس مطلوبہ کتاب پر چونک پڑا۔ میں ہمیشہ کی طرح سچ بولا "نہیں" ذرا ملاحظہ فرمایئے۔ میری تمام کتابیں جو خالص ادبیات پر مشتمل ہیں اس ذخیرے میں فن طعام، فن کشیدہ کاری، بچوں کی پرورش کس طرح کریں یا اپنے شوہر پر کس طرح غالب ہوں وغیرہ وغیرہ موضوعات پر کہاں سے کتابیں آئیں۔ یہ میری بچپن سے بچپن سالہ عمر میں پہلا اتفاق تھا کہ ایسی انوکھی "ڈیمانڈ" آئی ہو۔

میں روز افزوں کتابوں کی طرف سے متفکر ہونے لگا۔ جو شخص بھی کتاب لے جاتا بجائے کتاب واپس کرنے کے کوئی نہ کوئی داغ یا قلق دے جاتا۔ میں وقتاً فوقتاً اس کی ٹیس محسوس کرتا رہتا۔

آج رات کا واقعہ سنئے میرے مالک مکان نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے مقصد کی طرف مجھے مائل کرتے ہوئے بولے۔

"میاں میرے چھوٹے بیٹے کو مصوری کا بہت شوق ہے اگر تمھارے پاس کوئی ایسی کتاب ہو جس میں داغ دہلوی کی کوئی خوبصورت تصویر ہو تو عنایت فرما دیجئے۔ کتاب ایک ہفتے کے اندر اندر واپس کر دے گا!"

قبل اس کے کہ میں ان کی بات کا جواب دیتا اپنے دل میں سوچنے لگا کہ حضرت مالک مکان کی فرمائش ہے کہ داغ دہلوی کی کوئی خوبصورت تصویر ....." لیکن حقیقت یہ ہے کہ داغ دہلوی نہایت بدصورت تھے (شاید اس زمانہ میں غازہ، کریم، پاوڈر، وغیرہ کا جنم نہیں ہوا تھا ورنہ وہ بھی بدصورت سے قبول صورت ہوجاتے)

مجھ میں فی البدیہہ شعر موزوں کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے نہایت وثوق سے کہا۔

"یہاں حضور ایسی تو کوئی کتاب نہیں ہے؟"

انکار سنتے ہی ان کے چہرے پر انتقامی غصے کے آثار نمایاں ہوگئے اپنے بھوپالی بٹوے میں سے کتری ہوئی چھالیاں نکال کر چبانے لگے

ہوئے بولے:

"آپ نے ابھی تک دوسرے مکان کا انتظام نہیں کیا؟ بھئی مجھے بارش سے پہلے پہلے مکان کی از سر نو تعمیر کرانا ہے"!

وہ اپنا تیرا بی بیئر چھوڑ کر نہایت بے اعتنائی سے اخبار کی سرخی پڑھنے لگے۔ میں نے سوچا سمندر میں رہ کر مگر مچھ سے بیر قطعی ممکن نہیں فی الحال بھوپال میں کوئی مکان کرائے پر یا چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا جس پر میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کرا سکوں ملنا ممکن نہیں ہاں فیکٹری اور ڈاکیہ کھولنے کے لیے جہاں چاہیں جگہ مل سکتی ہے میں نے ہتھیار ڈالنا مناسب سمجھا اور ایک بار پھر میرا کتاب نہ دینے کا عہد کھٹائی میں پڑ گیا۔

ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو جس طرح چپکے سے میں کرایہ ادا کر دے آتا ہوں اسی طرح ایک پرانی کتاب (میرے والد کی پیدائش کے زمانے کی) جس میں داغ دہلوی کی تصویر بھی دے آیا مالک مکان کے صاحبزادے نے کتاب واپس کرنے میں بہت ہی سرعت سے کام لیا۔ وہ محترم مجھے دوسرے ہی دن صبح کتاب واپس کر گئے۔ میں نے حسب عادت اپنے اطمینان کی خاطر کتاب کے اوراق کا باریکی سے معائنہ کیا اور متعلقہ صفحہ جس پر داغ دہلوی کی تصویر کا عکس تھا، دیکھا تو اس تصویر پر ڈاٹ پین کے نہ مٹنے والے گہرے نقوش نے تصویر کو مسخ کر دیا تھا۔ میں صبر کر کے بیٹھ رہا۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ صاحبزادے نے تصویر کے نیچے کاربن رکھ کر ڈاٹ پنسل سے کافی طاقت صرف کر کے اس تصویر کا عکس لیا ہے۔ یہ صاحبزادے مصور تو کیا مصور کے ایک معمولی برش کے برابر بھی نہیں ہیں۔ وہ ایک مڈل اسکول کے طالب علم ہیں اور شاعروں کی تصویروں کا پوسٹ مارٹم کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ذرا آپ ہی ایمانداری سے فیصلہ کیجیے کہ کیا ان صاحبزادے میں مصور بننے کے کچھ جراثیم ہیں۔ اور والد ماجد کا طرہ یہ کہ "مصور" (جب ہم میٹرک میں بائیلوجی کے طالب علم تھے تو اکثر ہمارے والدین اس طرح متعارف کراتے کہ آپ سے ملیے آپ ہیں ہمارے ولی عہد اختر، ڈاکٹری پڑھ رہے ہیں۔ اور فخر سے ہمارا سر تو اونچا نہیں اٹھتا تھا ہاں البتہ جسم اتنا فربہ ہو جاتا کہ جسم سے جکڑی ہوئی بنیائن تار تار پیرہن ہونے کا احساس دلاتی تھی۔)

جب کتابوں کی فکر نے مجھے رقیب کی حرکتوں کی طرح پریشان کر دیا تو میرے ذہن میں آیا کہ اس طرح کتابوں کے بارے میں سوچ سوچ کر تو میں پاگل ہو جاؤں گا اور شناسا و غیر شناسا حضرات بید ریغ میری کتابوں کا ستیا ناس بلکہ ساڑھے ستیا ناس کر دیں گے۔ جو پیسہ مجھے اپنی صحت پر اور اپنی گھر گرہستی پر خرچ کرنا چاہیے تھا وہ میں کتابوں پر خرچ کر دیتا ہوں جس کے صلے میں مجھے محرومیاں، ناکامیاں ملتی ہیں۔ تو کیوں نہ میں انھیں کسی لائبریری میں دیدوں لیکن نہیں ایک بار ایک لائبریرین نے مجھے بری طرح جھڑک دیا تھا اس دن سے میں لائبریرین قوم سے للہی بغض و عناد اور نفرت کرتا ہوں پھر سوچا کیوں نہ انھیں ردی میں فروخت کر دوں لیکن ردی کے تاجر اردو کی کتابیں ردی میں (ہر حالت میں) بہت سستی خریدتے ہیں۔

کتابوں کے سلسلے میں میرے ساتھ عوام کا جو رویہ رہا ہے، ہمارے اہل خانہ کا رویہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اکثر ہماری بیگم صاحبہ نے رمضان میں سحری کے وقت ہمارے ضروری اخبار، رسالے، جلا جلا کر کھانا گرم کر کر کے کھلایا ہے۔ اللہ انہیں اس کا اجر دے گا۔

ہماری بیگم صاحبہ کتابوں، اخباروں، رسالوں اور ڈائجسٹوں کو اپنی "سوت" تصور کرتی ہیں ملاحظہ فرمائیے محترمہ کی ذہنیت ہمارے والد بھی کچھ کم نہیں ہیں یہ دل شکن تحریک انھیں کی چلائی ہوئی ہے۔ جس نے آج انقلابی صورت اختیار کر لی ہے

اس روز تو میرا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے بچا جب میں نے ایک دوست کو کتاب دینے سے انکار کر دیا وہ دوست طیش میں آکر کہنے لگا۔ ارے یار تمہارے پاس سینکڑوں کتابیں چوری کی ہیں دیکھو کس کس کی مہریں ثبت ہیں ان پر ــــ؟" غصے کے مارے میری وہ کیفیت تھی کہ جی چاہا اس کا گلا گھونٹ دوں لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ میرا مذہب غصہ کرنے اور انتقام لینے کو منع کرتا ہے اور قتل کے جرم میں دفعہ ۳۰۲ کے تحت بیس سال کی سزا ہے۔ میں نے سوچا خیر میں اس دوست کا (اب دشمن) کسی افسانے میں یا ڈرامے میں ولین کا کردار اور اصلی نام (مع شجرے کے) دے کر دھجیاں اڑاؤں گا کہ

یہ بھی کیا یاد رکھے گا۔

ہاں میں اس الزام کا اقرار کرتا ہوں کہ میری بیشتر کتابوں پر سرکاری مہریں ثبت ہیں، لیکن ان ملازمین کو کیا کیجئے جو لائبریریوں سے، اسکولوں اور کالجوں سے کتابیں سرقہ کرکے بازار میں کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور مجھ جیسا بے دقوف کندن کے بھاؤ انھیں خرید کر ایک روحانی مسرت محسوس کرتا ہے

میں نے گھر والوں کو خبردار کر دیا ہے کہ میری بغیر اجازت جس نے بھی الماری میں ہاتھ لگایا اس کا ہاتھ توڑ دوں گا۔ (چاہے علاج و معالجے کا سارا خرچ مجھے ہی برداشت کیوں نہ کرنا پڑے) میں نے یہ بھی دیکھا کہ میری گرجدار آواز سے بچے اور بیوی کچھ سہم گئے ہیں۔

اب میں وقتاً فوقتاً یہ عمل دہراتا رہتا ہوں خدا کا شکر ہے کہ ایک سال ختم ہونے کو آیا کوئی حادثہ یا واردات نہیں ہوئی۔ میں نے الماری میں تالا بھی، وہ مضبوط ڈالا ہے کہ چابی لگانے کے باوجود بڑی کوششوں سے کھلتا ہے۔

اکثر مشاعروں، ہوٹلوں اور دیگر مقامات پر میرے دوستوں، شناساؤں نے طعنے تشنیع دیئے ہیں کہ "لوگوں کے پاس دو چار کتابیں کیا جمع ہو گئیں کہ خدا بخش اور نیشنل لائبریری کے خواب دیکھ رہے ہیں"۔ یہ کچھ بے اصول اور غافل لوگوں میں تو، میں ضرور برا ہوا لیکن میری کتابیں پھٹنے، گم ہونے، تبادلہ ہونے سے بچ گئیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں ٹی۔ بی اور کینسر جیسے مہلک امراض سے بچ گیا کیونکہ میرے محلے کے ایک نیم ڈاکٹر (ابھی ڈاکٹری کے پہلے سال میں زیر تعلیم ہیں) انے مجھے بتایا کہ اس طرح کتابوں کے پیچھے جلنے، کڑھنے اور غصہ کرنے سے تم سے کئی مہلک امراض وابستہ ہو جائیں گے۔ مجھے اپنی صحت بہت پیاری ہے۔ کیونکہ میری سابقہ محبوبہ جو۔ ٹی۔ بی میں انتقال فرما گئیں، ان مرحومہ کی ہدایت تھی کہ اپنی صحت کا خیال رکھنا یہ ہماری نئی تہذیب کی دین ہے کہ والدین اور بزرگوں کی نافرمانی کر دا در محبوبہ کی ہدایت پر عمل پیرا ہو۔ نئی تہذیب زندہ باد، میری کتابیں پائندہ باد۔"

شرحِ دیوانِ غالب (ص ۳۶ کا بقیہ)

ہوتا ہے۔ کیا عجب ہے کاتب کا تصرف ہو۔"

راقم :۔ "کیوں"، پر "کیا" کی ترجیح کی کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ پہلے مصرع میں "یہ کیا انداز ہے" کہنے کے بعد دوسرے مصرع میں بھی "کیا" سے استفہام گھر کی دربانی سونپنے میں شبہ ظاہر کرتا ہے اور مخل فصاحت ہے "کیوں سونپی ہے" بالکل صحیح ہے۔ غالب ؎

ابھرا ہوا نقاب میں ہے انکی ایک تار مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

شرح طباطبائی :۔ "یعنی معشوق پر کسی کا آنکھ ڈالنا گوارا نہیں۔ تار نقاب پر بھی نگاہ رقیب کا وہم گزرتا ہے اس وہم کا بیان اور طرح سے بھی ہو سکتا تھا مگر مصنف نے تار نقاب کو اختیار کیا کوئی وجہ ترجیح کی نہیں معلوم ہوتی مثلاً ؏ بیٹھے ہو شعاع رد ترن در سے ذرا الگ + مرتا ہوں میں الخ۔ عارض پہ ان کے پڑتی ہے عقد گہر کی چھوٹ + مرتا ہوں میں الخ"

راقم :۔ شاعر کے تار نقاب کو اختیار کرنے کے لیے وجہ ترجیح یہ ہے کہ نقاب جو چہرے کے لیے حجاب اور مانع نظر ہے اسی میں شاعر کی قوت واہمہ نے ایک ایسی چیز اختراع کی ہے جس غیر کی نگاہ کا وہم ہوتا ہے۔ تار نقاب اور تار نظر میں جو مشابہت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ نقاب کے ابھرے ہوئے تار کو دیکھ کر عاشق کو یہ اندیشہ ہوا کہ یہ رقیب کی نگاہ تو نہیں ہے جو در پردہ اپنا کام کر رہی ہے۔ تار نقاب کے مضمون کو شاعر نے دوسرے شعر میں بھی بیان کیا ہے ؎

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

شارح طباطبائی نے غالب کے مصرع پر اپنے دو پیش مصرعے جو لگائے ہیں ان کی ثقالت ظاہر ہے۔

شرح طباطبائی کی مذکورہ بالا مباحثوں کے ذکر سے ہمارا مقصد اس کی منقصت نہیں ہے۔ ہم کو اس کی بہت سی خوبیوں کا اعتراف ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو ادب میں پروفیسر نظم طباطبائی نے شرح نگاری کا ایک بلند اور قابل تقلید معیار قائم کیا ہے اور جب تک دیوان غالب پڑھا جائے گا شرح طباطبائی بھی اہل علم میں قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

اترپردیش کابینہ میں توسیع

نئے وزرا کے سوانح حیات

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کی زیر قیادت اترپردیش کابینہ میں گزشتہ ۱۴ فروری کو توسیع کی گئی اور نو نئے کابینی وزیروں نے راج بھون کے دربار ہال میں حلف لیا۔ نئے وزیروں کے نام یہ ہیں ——— شری جگدیش سرن اگروال، بیگم محسنہ قدوائی، ڈاکٹر چرن سنگھ، شری ریبوتی رمن سنگھ، شری ویریندر ورما، شری نرائن سنگھ، شری لوک پتی ترپاٹھی، شری شیو پرشاد سنگھ اور شری عمار رضوی۔ ذیل میں ان وزرا کے حالات زندگی اور ان کو سپرد کیے جانے والے قلمدان درج کیے جاتے ہیں ———

شری جگدیش سرن اگروال

شری جگدیش سرن اگروال ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے اور ۱۹۳۷ء میں ایل ایل۔ بی، پاس کیا۔ بریلی میں دیوانی کے وکیل کی حیثیت سے وکالت شروع کی۔ ایک ٹرم تک بہلی بار ایسوسی ایشن کے سکریٹری اور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک میونسپل بورڈ بریلی کے چیرمین رہے۔

سیاسیات سے دلچسپی رکھنے کے علاوہ آپ نے ہر طرح کی سماجی سرگرمیوں میں عملی حصہ لیا ہے۔ بریلی روٹری کلب کے بانی ممبر اور سوشل ٹرسٹ کے صدر ہیں۔ یہ ٹرسٹ بریلی میں مردوں کے ایک شانتی لاش گھاٹی کا انتظام کرتا ہے اور ہولی و عید ملن جیسی سیکولر سرگرمیوں کو فروغ دینے میں پیش پیش رہتا ہے۔ شری اگروال ۱۹۵۵ء سے مسلسل اترپردیش انٹرمیڈیٹ بورڈ کے ممبر اور گزشتہ دس برس سے تعلیمی اداروں کو تسلیم کرنے والی کمیٹی کی چیرمین بھی ہیں۔ آپ نے متعدد تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں ایک درجن سے زیادہ ڈگری اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کے صدر یا سکریٹری ہیں۔ دو ٹرم تک آپ کانپور یونیورسٹی کے خازن رہے، اب اس کی مالیاتی کمیٹی اور سمپورنانند سنسکرت یونیورسٹی، وارانسی کی انتظامیہ کے رکن ہیں۔ دیہی اور کھادی صنعت بورڈ کے ابتدائی زمانے میں دو ٹرم تک اس کے سرگرم ممبر رہے۔ دس برس سے زیادہ عرصہ سے اترپردیش گڑ اور کھنڈساری ایسوسی ایشن کے صدر چلے آرہے ہیں۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۶۷ء تک ہندوستانی مرکزی گنا کمیٹی (حکومت ہند) میں اترپردیش کی نمائندگی کی۔

شری اگروال کانگریسی سیاست میں ۱۹۲۷ء سے ہی گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں، کئی برس تک اترپردیش اور کل ہند کانگریس کمیٹی کے ممبر رہے دو ٹرم تک اترپردیش کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے امتیازی خدمات انجام دیں اور اس وقت اس کی اکزیکیٹو کمیٹی کے رکن ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں اترپردیش اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور دو ٹرم کے لیے تخمینہ کمیٹی کے چیرمین رہے۔

آخر میں آپ اترپردیش اسمبلی کے اسپیکر ہوئے اور ۱۹۶۹ء تک اپنے فرائض جس امتیاز کے ساتھ انجام دیے اس کی مثال کم ملتی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں کانگریس سرکار کے خاتمے پر آپ نے بھی استعفیٰ دے دیا لیکن ایس وی ڈی حکومت کی سبھی یونٹوں نے ان پر اپنے مکمل اعتقاد کا اظہار کیا اور ان کی درخواست پر آپ نے اسپیکر کے عہدے پر برقرار رہنا منظور کر لیا۔

آپ ۱۹۷۰ء میں اترپردیش ہاؤسنگ بورڈ کے چیرمین ہوئے اور ۱۴ فروری ۱۹۷۵ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ آپ شمالی ہندوستان

سے ہاؤسنگ ڈولپمنٹ کارپوریشن کے ایک ڈائرکٹر بھی ہیں۔

آپ ۱۹۷۴ء میں روہیلکھنڈ گریجویٹ حلقہ انتخاب سے اترپردیش لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۶ فروری ۱۹۷۵ء کو آپ نے بہوگنا کابینہ میں بحیثیت کابینی وزیر حلف لیا، اور آپ کو لوکل سیلف گورنمنٹ اور رہائش کے محکموں کی ذمہ داریاں سپرد کی گئیں۔

بیگم محسنہ قدوائی

بیگم محسنہ قدوائی ۱۹۳۲ء میں قصبہ دریاآباد، ضلع بارہ بنکی کے ایک مجاہدین آزادی اور سماجی اصلاح کے کاموں میں مصروف ممتاز خاندان میں پیدا ہوئیں۔ آپ کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ہوئی۔ آپ نے اپنے ماموں سابق مرکزی وزیر مرحوم جناب شفیق الرحمان قدوائی کی رہنمائی میں، جو مہاتما گاندھی کے سچے پیرو تھے اپنے ضلع میں سماجی خدمت کے کاموں میں حصہ لینا شروع کیا۔ خاتون کی فلاح و بہبود، مظلوموں اور دبے کچلے لوگوں کی مدد اور سماجی برائیوں کو دور کرنے کے سلسلہ میں آپ کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ بیگم قدوائی نے غریب اور نادار بچوں کے لیے جو متعدد اسکول اور بے سہارا خواتین کے لیے سلائی، کڑھائی اور بنائی کے جو مرکز قائم کیے وہ سماج کے کمزور طبقوں کی بہبود سے ان کی گہری لگن اور دل چسپی کا زندہ ثبوت ہیں۔

بیگم قدوائی ۱۹۶۰ء میں لیجسلیٹو کونسل کی ممبر نامزد ہوئیں اور ۱۹۷۳ء میں وزیر ریاست برائے غذا و رسد مقرر کی گئیں۔ آپ ۱۹۷۴ء میں ضلع بارہ بنکی کے ریدلو حلقہ انتخاب سے اسمبلی کی ممبر منتخب ہوئیں۔

بیگم قدوائی امن کمیٹی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے سوویٹ یونین کا بھی دورہ کر چکی ہیں۔ اس وقت آپ سیوک سماج کی آرگنائزر اور مہیلا کلیان سیوک سماج، بارہ بنکی کی کنوینر ہیں۔

آپ نے ۱۶ فروری ۱۹۷۵ء کو کابینی وزیر کی حیثیت سے حلف لیا اور انھیں ہریجن و سماجی فلاح کے محکمے کی ذمہ داریاں سپرد کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر چرن سنگھ

ڈاکٹر چرن سنگھ یکم اپریل ۱۹۱۱ء کو موضع ڈیل چک ضلع گورداس پور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے گورنمنٹ میڈیکل کالج امرتسر سے ۱۹۳۵ء میں ایل۔ ایس۔ ایم۔ ایف کیا اور رام گڑھ مغل پورہ لاہور میں پرائیویٹ پریکٹس شروع کی اور وہیں سیاسیات میں بھی سرگرم حصہ لینے لگے۔

تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ آ گئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ اپنے ساتھ تقریباً دس ہزار پناہ گزینوں کو بہ حفاظت نکال لائے اور عالم باغ لکھنؤ میں ان کی آبادکاری کا انتظام کیا۔ شہر کانگریس کمیٹی کے ممبر اور اس کی اکزیکیٹو کمیٹی کے مستقل مدعوئین میں شامل رہے۔ اس کے علاوہ اترپردیش کانگریس کمیٹی کے ممبر اور پھر اس کے ایک نائب صدر رہے۔ لکھنؤ میونسپل کارپوریشن کے ممبر منتخب ہوئے اور چار برس تک برابر کارپوریٹر رہے۔ ۱۹۶۲ء میں اترپردیش ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ بورڈ کے ممبر نامزد ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں لیجسلیٹو کونسل کے ممبر نامزد کیے گئے۔ آپ سدگار کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کے سکریٹری اور صدر رہے۔ انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن کے نائب صدر منتخب کیے گئے۔ گرو نانک سبھا ناکہ ہنڈولہ کے صدر، اترپردیش سکھ پرتی ندھی بورڈ کے نائب صدر اور اترپردیش سرکار کے ادارہ جاتی سرمایہ سے متعلق کمیٹی کے ممبر رہے۔

پچھلے عام چناؤ ۱۹۷۴ء میں لکھنؤ سے اترپردیش کے سابق وزیر اعلیٰ شری سی۔ بی۔ گپتا کو ہرا کر اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ تعلیمی معاملات سے ڈاکٹر صاحب کو خاص دل چسپی ہے۔ آپ متعدد تعلیمی اداروں کے بانی ہیں۔ سماجی کاموں میں بھی گہری دل چسپی لیتے ہیں۔ کھیل کود اور کتاب بینی آپ کے پسندیدہ مشاغل ہیں۔

بہوگنا وزارت میں ۱۶ فروری ۱۹۷۵ء کو آپ نے کابینی وزیر کے عہدے کا حلف لیا۔ اور محکمہ آب کاری کی ذمہ داریاں آپ کو سونپی گئیں۔

شری پربھو نارائن سنگھ

شری پربھو نارائن سنگھ ۱۹۱۹ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ بنارس ہندو یونی ورسٹی سے وکالت پاس کی۔ ۱۹۳۰ء میں جب آپ درجہ پانچ میں پڑھ رہے تھے نمک ستیہ گرہ میں حصہ لیا اور کچھ عرصہ تک حراست میں رہے طلبا کی مختلف کل ہند اور ریاستی تنظیموں میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۱ء تک ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ جنگ آزادی کے سلسلے میں ۱۹۴۲ء

میں ڈی، آئی، آر کے تحت گرفتار ہوئے اور تین برس بعد ۱۹۴۵ء میں رہا کیے گئے۔ سوشلسٹ طاقتوں کو مستحکم بنانے کی غرض سے ۱۹۴۸ء میں اچاریہ نریندر دیو اور ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کے ہمراہ کانگریس سے علاحدہ ہو گئے اور بنارس ضلع سوشلسٹ پارٹی کے کئی برس تک صدر رہے۔ سوشلسٹ پارٹی کی کل ہند ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور سنیکت سوشلسٹ پارٹی کے پارلیمانی بورڈ کے صدر رہے۔ ۱۹۵۲ء میں لوکل باڈیز حلقۂ انتخاب سے اتر پردیش ودھان پریشد کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۹۵۸ء تک اس کے ممبر رہے ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۲ء تک پارلیمنٹ کے ممبر رہے ۱۹۶۴ء میں ریاستی ودھان پریشد کے دوبارہ ممبر منتخب ہوئے، ۱۹۶۷ء میں سنیکت ودھائک دل وزارت کے اندر اتر پردیش کابینہ میں وزیر صنعت و صحت کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں ریاستی ودھان پریشد کے تیسری بار ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں ریاستی کابینہ میں وزیر مال مقرر ہوئے۔ وزیر اعظم کی اپیل پر سوشلسٹ طاقتوں کو متحد کرنے کی غرض سے ۱۹۷۲ء میں پھر کانگریس میں شامل ہو گئے۔

بہوگنا وزارت میں ۱۷ فروری ۱۹۷۵ء کو کابینی وزیر کی حیثیت سے حلف لیا اور آپ کو میڈیکل، صحت، اور خاندانی منصوبہ بندی کے محکمے سپرد کیے گئے۔

شری وریندر ورما

شری وریندر ورما ۸ ستمبر ۱۹۱۷ء کو شاملی ضلع مظفر نگر (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ آپ نے میرٹھ سے بی۔اے۔ ایل، بی، پاس کیا۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ تک ڈسٹرکٹ بورڈ مظفر نگر کے صدر اور ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۲ء تک یو۔پی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر رہے اور ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۴ء میں بھی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور تا حال ممبر ہیں۔ آپ ۱۹۵۹-۶۰ء میں ریاستی وزارت میں نائب وزیر امداد باہمی مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۸ء امریکہ، انگلینڈ، ڈنمارک، فرانس، جرمنی، اٹلی، سوئزرلینڈ اور ٹرکی کا سفر کیا۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۵ء تک یو۔پی کوآپریٹیو کین یونین فیڈریشن کے وائس چیرمین رہے۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک مظفر نگر ضلع کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۵۱-۵۹ء تک مظفر نگر ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر، ۱۹۶۴-۶۷ء اور ۱۹۷۳-۷۴ء کے دوران یو۔پی کانگریس کمیٹی کے ممبر اور ۱۹۶۱-۶۷ء و ۱۹۷۳-۷۴ء کے دوران کل ہند کانگریس کمیٹی کے ممبر رہے۔ ۱۹۶۴-۶۶ء کے دوران ڈسٹرکٹ کوآپریٹیو بینک کے منیجنگ ڈائرکٹر رہے۔ کل ہند گنا پروڈیوسرس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری رہے۔ ۱۹۶۸-۷۳ء کے لیے انڈین شوگرکین ڈولپمنٹ کونسل گورنمنٹ آف انڈیا کے چیرمین مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۰-۷۱ء میں اتر پردیش کابینہ میں آب پاشی، بجلی اور محکمے داخلہ کے وزیر رہے۔ ۱۷ فروری ۱۹۷۵ء کو آپ نے کابینی وزیر کی حیثیت سے حلف لیا ہے اور زراعت کا محکمہ آپ کے سپرد کیا گیا ہے۔ آپ کاشت کاروں اور ان کے مسائل میں گہری دل چسپی لیتے ہیں۔

شری نارائن سنگھ

شری نارائن سنگھ موضع بنرا ضلع مظفر نگر میں ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے آگرہ یونی ورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶ ء میں ضلع پریشد کے چیرمین ہوئے اور ۱۹۷۰ء میں ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ پچھلے عام چناؤ میں ضلع مظفر نگر سے اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔ آپ کاشت کاری میں خاص دل چسپی رکھتے ہیں۔ آپ نے ۱۷ فروری ۱۹۷۵ء کو بہوگنا سرکار میں بحیثیت وزیر حلف لیا اور آپ کو امداد باہمی اور نگہداشت مویشیان محکموں کی ذمہ داریاں سپرد کی گئیں۔

شری لوک پتی ترپاٹھی

شری لوک پتی ترپاٹھی کی پیدائش ۱۵ مئی ۱۹۲۷ء کو بنارس کے ایک مہذب تعلیم یافتہ اور خوش حال گھرانے میں ہوئی۔ آپ پنڈت کملاپتی ترپاٹھی کے سب سے بڑے صاحب زادے ہیں۔ بنارس ہندو یونیورسٹی سے ۱۹۴۹ء میں بی۔اے کی ڈگری لی، اس کے بعد آپ نے کاروبار اور کاشت کاری پر زیادہ توجہ دی۔ آج آپ ایک بہترین زراعتی فارم اور ایک کارخانہ کے مالک ہیں۔

شری ترپاٹھی تین مرتبہ دنیا کا دورہ کر چکے ہیں۔ امریکہ اور جنوبی افریقہ کو چھوڑ کر آپ نے دنیا کے تقریباً ہر ملک کی سیاحت کی ہے۔

آپ ۱۹۷۴ء کے ضمنی چناؤ میں ضلع مرزاپور کے راج گڑھ حلقہ انتخاب سے اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ پھر اسی حلقہ انتخاب سے ۱۹۷۴ء کے عام چناؤ میں دوبارہ کامیاب ہوئے۔

شری ترپاٹھی ۱۶ فروری ۱۹۷۵ء کو بہوگنا وزارت میں کابینی وزیر مقرر کیے گئے اور آپ کو کھیل کود اور جیل کے محکموں کی ذمہ داریاں سپرد کی گئیں۔ مطالعہ، سیاحت اور کاشت کاری آپ کے پسندیدہ مشاغل ہیں۔

شری شیو پرشاد سنگھ

شری شیو پرشاد سنگھ ۱۳ ستمبر ۱۹۱۱ء کو موضع مدن تمسی ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے، لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ ایل ایل، بی پاس کیا۔ ۱۹۵۸ء میں جیل گئے۔ سوشلسٹ تحریک کے سلسلے میں تین ماہ جیل میں رہے، اس وقت آپ لکھنؤ شہر سوشلسٹ پارٹی کے سکریٹری تھے۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک لیجسلیٹو کونسل میں حزب مخالف کے لیڈر اور ۶۵-۱۹۶۴ء میں ایشورنس کمیٹی کے چیرمین رہے۔ ۱۹۶۷ء میں کانگریس میں شامل ہوئے اور پردیش کانگریس کمیٹی کے ممبر چنے گئے اور پردیش کانگریس کی اکزیکٹیو کمیٹی میں مستقل طور سے مدعو کیے جاتے رہے ہیں۔ آپ لکھنؤ یونیورسٹی اکزیکٹیو کونسل کے ممبر نامزد کیے گئے اور لکھنؤ یونیورسٹی کے اعزازی خازن بھی مقرر ہوئے۔ ۷۲-۱۹۷۱ء سے لکھنؤ یونیورسٹی اکزیکٹیو کے نمائندہ ممبر ہیں۔ ۷۰-۱۹۶۹ء سے برابر وزیر ریاست برائے الفاف رہے ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۳ء تک اتر پردیش کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری رہے۔ اور یو۔ پی کانگریس کے لیے منتخب ممبروں کی کانگریس اسکریننگ کمیٹی کے چیرمین مقرر ہوئے۔ ۷۴-۱۹۷۳ء میں وزیر ریاست برائے علاج وصحت اور خاندانی منصوبہ بندی رہے۔ بہوگنا وزارت میں وزیر تعمیرات عامہ کی حیثیت سے ۱۶ فروری ۱۹۷۵ء کو حلف لیا۔

شری عمّار رضوی

آپ ۲۸ مارچ ۱۹۳۹ء کو محمود آباد ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئے آپ نے محمود آباد اور لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ پہلے پہل شیعہ ڈگری کالج لکھنؤ میں لکچرار مقرر ہوئے۔ پھر کالج کے شعبہ انگریزی کے صدر ہو گئے۔ اس وقت آپ اسی کالج کے پرنسپل ہیں۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی دعوت پر ۱۹۶۹ء میں کانگریس میں شامل ہوئے۔ آپ سیتاپور ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر اور یو۔ پی کانگریس کمیٹی اور کل ہند کانگریس کمیٹی کے ممبر ہیں ۱۹۷۴ء کے عام چناؤ میں محمود آباد حلقہ انتخاب سے صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ آپ مختلف سماجی اور ثقافتی تنظیموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کو تعلیمی سرگرمیوں کی توسیع و ترقی سے خاص دلچسپی ہے۔ ۱۶ فروری ۱۹۷۵ء کو بہوگنا وزارت میں آپ بحیثیت کابینی وزیر شامل ہوئے اور آپ کو تکنیکی، ثانوی اور بیسک تعلیم کے محکموں کی ذمہ داریاں سپرد کی گئیں۔ مطالعہ اور شکار آپ کے پسندیدہ مشاغل ہیں۔

★

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ سنہ ۱۸۶۷ء (سنہ ۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ نیادور کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کیے جاتے ہیں۔

(۱) مقام اشاعت	لکھنؤ
(۲) وقفہ اشاعت	ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری اشوک در۔ ہندستانی سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ اتر پردیش، الہ آباد۔
(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ	کماری سرلا ساہی۔ ہندستانی ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش، لکھنؤ۔
(۵) اڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری خورشید احمد۔ ہندستانی اڈیٹر نیادور محکمۂ اطلاعات، لکھنؤ۔
(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمایے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔	نیادور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں سرلا ساہی اعلان کرتی ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) سرلا ساہی (پبلیشر)